A-PDF Merger DEMO : Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

منٹو کے سو بہترین افسانے

(افسانے)

حصہ اول

Presented by: S A M I

فہرست

آخری سلیوٹ

آنکھیں

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں

اس کا پتی

اللہ دتا

الو کا پٹھا

انتظار

اولاد

ایکٹریس کی آنکھ

بانجھ

باسط

بچنی

بسم اللہ

بغیر اجازت

بلاؤز

بلونت سنگھ مجیٹھیا

بھنگن

بیگو

پریشانی کا سبب

پہچان

آخری سلیوٹ

یہ کشمیر کی لڑائی بھی کچھ عجیب و غریب تھی۔ صوبیدار رب نواز کا دماغ ایسی بندوق بن گیا تھا جس کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔

پچھلی بڑی جنگ میں وہ کئی محاذوں پر لڑ چکا تھا مارنا اور مرنا جانتا تھا چھوٹے بڑے افسروں کی نظروں میں اس کی بڑی توقیر تھی، اس لیے کہ وہ بڑا بہادر نڈر اور سمجھدار سا ہی تھا۔ پلاٹون کمانڈر مشکل کام ہمیشہ اسے ہی سونپتے تھے اور وہ ان سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا دل میں بڑا ولولہ، بڑا جوش تھا۔ بھوک پیاس سے بے پرواہ صرف ایک ہی لگن تھی، دشمن کا صفایا کر دینے کی، مگر جب اس سے سامنا ہوتا تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں بعض دوست دکھائی دیتے، بڑے بغلی قسم کے دوست، جو پچھلی لڑائی میں اس کے دوش بدوش، اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑے تھے، پر اب جان کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔

صوبیدار رب نواز سوچتا تھا کہ یہ سب خواب تو نہیں پچھلی بڑی جنگ کا اعلان۔۔۔۔۔ بھرتی، قد اور چھاتیوں کی پیمائش، پی ٹی، چاند ماری اور پھر محاذ۔۔۔۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، آخر جنگ کا خاتمہ، پھر ایک دم پاکستان کا قیام اور ساتھ ہی کشمیر کی لڑائی، اوپر تلے کتنی چیزیں رب نواز سوچتا تھا کہ کرنے والے نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے تا کہ دوسرے بوکھلا جائیں اور سمجھ نہ سکیں۔ ورنہ یہ بھی کوئی بات تھی کہ اتنی جلدی اتنے بڑے انقلاب برپا ہو جائیں۔

اتنی بات تو صوبیدار رب نواز کی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ کشمیر حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں کشمیر کیوں حاصل کرنا ہے، یہ بھی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے کہ پاکستان کی بقاء کے لیے اس کا الحاق اشد ضروری ہے، مگر نشانہ باندھتے ہوئے اسے جب کوئی جانی پہچانی شکل نظر آ جاتی تھی تو وہ کچھ دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ وہ کس غرض کے لیے لڑ رہا ہے، کس مقصد کے لیے اس نے بندوق اٹھائی ہے، اور وہ یہ غالباً اسی لیے بھولتا تھا کہ اسے بار بار خود کو یاد کرانا پڑتا تھا کہ اب کی وہ صرف تنخواہ، زمین کے مربعوں اور تمغوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے وطن کی خاطر لڑ رہا ہے، یہ وطن پہلے بھی اس کا وطن تھا، وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اب اسے اپنے اسی ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا جو کبھی اس کا ہمسایہ ہوتا تھا، جس کے خاندان سے اس کے خاندان کے پشت ہا پشت کے دیرینہ مراسم تھے۔ اب اس کا وطن وہ تھا جس کا پانی تک بھی اس نے کبھی نہیں پیا تھا، پر اب اس کی خاطر، ایک دم اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ جاؤ، یہ جگہ جہاں تم نے ابھی اپنے گھر کے لیے دو اینٹیں بھی نہیں چنیں، جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزا ابھی تک تمہارے منہ میں ٹھیک طور پر نہیں بیٹھا، تمہارا وطن ہے۔۔۔ جاؤ اس کی خاطر پاکستان سے لڑو۔۔۔۔۔۔۔ اس پاکستان سے جس کے عین دل میں تم نے اپنی عمر کے اتنے برس گزارے ہیں۔

رب نواز سوچتا تھا کہ یہی حال ان مسلمان فوجیوں کا ہے جو ہندوستان میں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں وہاں ان سب سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا یہاں آ کر انہیں اور تو کچھ نہیں ملا البتہ بندوقیں مل گئی ہیں۔ اسی وزن کی، اسی شکل کی، اسی

مارکہ اور چھاپ کی۔

پہلے سب مل کر ایک ایسے دشمن سے لڑتے تھے جن کو انہوں نے پیٹ اور انعام واکرام کی خاطر اپنا دشمن یقین کر لیا تھا۔ اب وہ خود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے سب ہندوستانی فوج کہلاتے تھے اب ایک پاکستانی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمان ہندوستانی فوج تھے رب نواز جب ان کے متعلق سوچتا تو اس کے دماغ میں ایک عجیب گڑبڑ سی پیدا ہو جاتی۔ اور جب وہ کشمیر کے متعلق سوچتا تو اس کا دماغ بالکل جواب دے جاتا۔۔۔۔۔۔ پاکستانی فوجی کشمیر کے لیے لڑ رہے تھے یا کشمیر کے مسلمانوں کے لیے؟ اگر انہیں کشمیر کے مسلمانوں ہی کے لیے لڑایا جاتا تھا تو حیدر آباد، اور جونا گڑھ کے مسلمانوں کے لیے کیوں انہیں لڑنے کے لیے نہیں کیا جاتا تھا اور اگر یہ جنگ ٹھیٹ اسلامی جنگ تھی تو دنیا میں دوسرے اسلامی ملک ہیں وہ اس میں کیوں حصہ نہیں لیتے۔

رب نواز بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ باریک باریک باتیں فوجی کو بالکل نہیں سوچنا چاہئیں اس کی عقل موٹی ہونی چاہئے۔ کیونکہ موٹی عقل والا ہی اچھا سپاہی ہو سکتا ہے، مگر فطرت سے مجبور کبھی کبھی وہ چور دماغ سے ان پر غور کر ہی لیتا تھا اور بعد میں اپنی اس حرکت پر خوب ہنستا تھا۔

دریائے کشن گنگا کے کنارے اس سڑک کے لیے جو مظفر آباد سے کرن جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے لڑائی ہو رہی تھی۔۔۔۔ عجیب و غریب لڑائی تھی رات کو بعض اوقات آس پاس پہاڑیاں فائروں کے بجائے گندی گندی گالیوں سے گونج اٹھتی تھیں۔

ایک مرتبہ صوبیدار رب نواز اپنی پلاٹون کے جوانوں کے ساتھ شب خون

مارنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ دور نیچے ایک کھائی سے گالیوں کا شور اٹھا پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے بھوت مل کر ناچ رہے ہیں اور زور زور کے قہقہے لگا رہے ہیں وہ بڑبڑایا "خنزیر کی دم ۔۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔"

ایک جوان نے گونجتی ہوئی آوازوں سے مخاطب ہو کر یہ بڑی گالی دی اور رب نواز سے کہا "صوبیدار صاحب گالیاں دے رہے ہیں اپنی ماں کے یار"

رب نواز یہ گالیاں سن رہا تھا جو بہت اکسانے والی تھیں اس کے جی میں آئی کہ بڑن بول دے مگر ایسا کرنا غلطی تھی، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر جوان بھی چپ رہے، مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو انہوں نے بھی گلا پھاڑ پھاڑ کے گالیاں لڑھکانا شروع کر دیں ۔۔۔۔۔۔ رب نواز کے لیے اس قسم کی لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے جوانوں کو دو تین مرتبہ خاموش رہنے کے لیے کہا، مگر گالیاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ جواب دیئے بنا انسان سے نہیں رہا جاتا تھا۔

دشمن کے سپاہی نظر سے اوجھل تھے رات کو تو خیر اندھیرا تھا، مگر وہ دن کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ صرف ان کی گالیاں نیچے پہاڑی کے قدموں سے اٹھتی تھیں اور پتھروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ہوا میں چلی جاتی تھیں۔ رب نواز کی پلاٹون کے جوان جب ان گالیوں کا جواب دیتے تھے تو اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ نیچے نہیں جاتیں، اوپر کو اڑ جاتی ہیں اس سے اس کو خاصی کوفت ہوتی تھی ۔۔۔۔ چنانچہ اس نے جھنجھلا کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

رب نواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بوٹوں سے لدی پھندی ہوتی تھی اور اترائی کی

طرف گنجی کشمیری ہتو کے سر کی طرح۔ کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجا ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے چیڑ کے لمبے تناور درخت، جن کے بچے ہوئے دھاگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ پھسل پھسل جاتے تھے۔

جس پہاڑی پر صوبیدار رب نواز کی پلاٹون تھی، اس کی اترائی درختوں اور جھاڑیوں سے بے نیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ بہت ہی خطرناک تھا مگر سب جوان بخوشی تیار تھے۔ گالیوں کا انتقام لینے کے لیے وہ بہت بے تاب تھے۔ حملہ ہوا اور کامیاب رہا۔ دو جوان مارے گئے۔ چار زخمی ہوئے، دشمن کے تین آدمی کھیت رہے، باقی رسد کا کچھ سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

صوبیدار رب نواز اور اس کے جوانوں کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ دشمن کا کوئی زندہ سپاہی ان کے ہاتھ نہ آیا جس کو وہ خاطر خواہ گالیوں کا مزا چکھاتے۔ مگر یہ مورچہ فتح کرنے سے وہ ایک بڑی اہم پہاڑی پر قابض ہو گئے تھے۔ وائرلیس کے ذریعے سے صوبیدار رب نواز نے پلاٹون کمانڈر میجر اسلم کو فوراً ہی اپنے حملے کے اس نتیجے سے مطلع کر دیا تھا اور شاباش وصول کر لی تھی۔

قریب قریب ہر پہاڑی کی چوٹی پر پانی کا ایک تالاب سا ہوتا تھا۔ اس پہاڑی پر بھی تالاب تھا، مگر دوسری پہاڑیوں کے تالابوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا اس کا پانی بھی بہت صاف اور شفاف تھا۔ گو موسم سخت سرد تھا۔ مگر سب نہائے، دانت بجتے رہے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ ابھی اس شغل میں مصروف تھے کہ فائر کی آواز آئی۔ سب ننگے ہی لیٹ گئے تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار رب نواز خاں نے دوربین لگا کر نیچے ڈھلوانوں پر نظر دوڑائی، مگر اسے دشمن کے چھپنے کی

جگہ کا پتا نہ چلا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک اور فائر ہوا اور اس کے فوراً بعد ایک نسبتاً چھوٹی پہاڑی کی واڑھی سے اسے دھواں اٹھتا نظر آیا اس نے فوراً ہی اپنے جوانوں کو فائر کا حکم دیا۔

ادھر سے دھڑا دھڑ فائر ہوئے، ادھر سے بھی جواباً گولیاں چلنے لگیں۔۔۔ صوبیدار رب نواز نے دوربین سے دشمن کی پوزیشن کا بغور مطالعہ کیا وہ غالباً بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے محفوظ تھے۔ مگر یہ محافظ دیوار بہت ہی چھوٹی تھی زیادہ دیر تک وہ جمے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان میں سے جو بھی ادھر ادھر ہٹتا، اس کا صوبیدار رب نواز کی زد میں آنا یقینی تھا۔

تھوڑی دیر فائر ہوتے رہے۔ اس کے بعد رب نواز نے اپنے جوانوں کو منع کر دیا کہ وہ گولیاں ضائع نہ کریں صرف تاک میں رہیں جونہی دشمن کا کوئی سپاہی پتھروں کی دیوار سے نکل کر ادھر یا ادھر جانے کی کوشش کرے اس کو اڑا دیں۔ یہ حکم کر اس نے اپنے الف ننگے بدن کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا" خنزیر کی دم۔۔۔۔۔۔ کپڑوں کے بغیر آدمی حیوان معلوم ہوتا ہے۔"

لمبے لمبے وقفوں کے بعد دشمن کی طرف سے اکا دکا فائر ہوتا رہا یہاں سے اس کا جواب کبھی کبھی دے دیا جاتا۔ یہ کھیل پورے دو دن جاری رہا۔۔۔۔ موسم یک لخت بہت سرد ہو گیا۔ اس قدر سرد کہ دن کو بھی خون منجمد ہونے لگتا تھا، چنانچہ صوبیدار رب نواز نے چائے کے دور شروع کرا دیئے۔ ہر وقت آگ پر کیتلی دھری رہتی۔ جونہی سردی زیادہ ستاتی ایک دور اس گرم گرم مشروب کا ہو جاتا۔ ویسے دشمن پر برابر نگاہ تھی۔ ایک ہٹتا تو دوسرا اس کی جگہ دوربین لے کر بیٹھ جاتا۔

ہڈیوں تک اتر جانے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ جب اس جوان نے جو پہرے دار تھا، بتایا کہ پتھروں کی دیوار کے پیچھے کچھ گڑبڑی ہورہی ہے۔ صوبیدار رب نواز نے اس سے دوربین لی اور غور سے دکھا۔ اسے حرکت نظر نہ آئی لیکن فوراً ہی ایک آواز بلند ہوئی اور دیر تک اس کی گونج آس پاس کی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتی رہی۔ رب نواز اس کا مطلب نہ سمجھا اس کے جواب میں اس نے اپنی بندوق داغ دی۔ اس کی گونج دبی تو پھر ادھر سے آواز بلند ہوئی، جو صاف طور پر ان سے مخاطب تھی رب نواز چلایا ''خنزیر کی دم بول کیا کہتا ہے تو!''

فاصلہ زیادہ نہیں تھا رب نواز کے الفاظ دشمن تک پہنچ گئے، کیونکہ وہاں سے کسی نے کہا ''گالی نہ دے بھائی''

رب نواز نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا اور بڑے جھنجھلائے ہوئے تعجب کے ساتھ کہا ''بھائی؟۔۔۔۔۔'' پھر وہ اپنے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر چلایا ''بھائی ہوگا تیری ماں کا جنا۔۔۔۔۔۔۔۔یہاں سب تیری ماں کے یار ہیں!''

ایک دم ادھر سے ایک زخمی آواز بلند ہوئی ''رب نواز!''

رب نواز کانپ گیا۔۔۔۔۔۔یہ آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے سر پھوڑتی رہی اور مختلف انداز میں، رب نواز۔۔۔۔۔۔رب نواز، دہراتی بالآخر خون منجمد کردینے والی سرد ہوا کے ساتھ جانے کہاں اڑ گئی۔

رب نواز بہت دیر کے بعد چونکا ''یہ کون تھا'' پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا ''خنزیر کی دم!''

اس کو اتنا معلوم تھا ٹیٹوال کے محاذ پر سپاہیوں کی اکثریت 2/9 رجمنٹ کی ہے۔ وہ بھی اسی رجمنٹ میں تھا۔ مگر یہ آواز تھی کس کی؟ وہ ایسے بے شمار آدمیوں کو جانتا تھا۔ جو کبھی اس کے عزیز ترین دوست تھے کچھ ایسے بھی جن سے اس کی دشمنی تھی، چند ذاتی اغراض کی بناء پر لیکن یہ کون تھا جس نے اس کی گالی کا برا مان کر اسے چیخ کر پکارا تھا۔

رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا، مگر پہاڑی کی ہلتی ہوئی چھدری داڑھی میں اسے کوئی نظر نہ آیا۔ دونوں ہاتھ کا بھونپو بنا کر اس نے زور سے اپنی آواز ادھر پھینکی'' یہ کون تھا؟۔۔۔رب نواز بول رہا ہے۔۔۔۔۔۔رب نواز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رب نواز''

یہ رب نواز، بھی کچھ دیر تک پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا رہا۔ رب نواز بڑبڑایا'' خنزیر کی دم!'' فوراً ہی ادھر سے آواز بلند ہوئی'' میں ہوں۔۔۔۔ میں ہوں رام سنگھ!''

رب نواز یہ سن کر یوں اچھال جیسے وہ چھلانگ لگا کر دوسری طرف جانا چاہتا ہے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا'' رام سنگھ؟'' پھر حلق پھاڑ کے چلایا'' رام سنگھ؟۔۔۔۔ اوئے رام سنگھا۔۔۔۔۔۔۔۔ خنزیر کی دم!''

'' خنزیر کی دم'' ابھی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر پوری طرح گم نہیں ہوئی تھی کہ رام سنگھ کی پھٹی پھٹی آواز بلند ہوئی'' اوئے کمہار کے کھوتے!''

رب نواز پھوں پھوں کرنے لگا جوانوں کی طرف رعب دار نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا'' بکتا ہے۔۔۔ خنزیر کی دم!'' پھر اس نے رام سنگھ کو جواب دیا''

اوئے باباٹ کے کڑاہ پرشاد۔۔۔۔اوئے خنزیر کے جھٹکے''

رام سنگھ بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ رب نواز بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پہاڑیاں یہ آوازیں بڑے کھلنڈرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف اچھالتی رہیں۔۔۔۔صوبیدار رب نواز کے جوان خاموش تھے۔

جب ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو ادھر سے رام سنگھ کی آواز بلند ہوئی ''دیکھو یار ہمیں چائے پینی ہے!''

رب نواز بولا ''پیو۔۔۔۔عیش کرو''

رام سنگھ چلایا ''اوئے عیش کس طرح کریں۔۔۔۔سامان تو ہمارا ادھر پڑا ہے''

رب نواز نے پوچھا ''کدھر''

رام سنگھ کی آواز آئی ''ادھر۔۔۔۔جدھر تمہارا فائر ہمیں اڑا سکتا ہے''

رب نواز ہنسا ''تو کیا چاہتے ہو تم۔۔۔۔خنزیر کی دم!''

رام سنگھ بولا ''ہمیں سامان لے آنے دے''

''لے آ!'' یہ کہہ کر اس نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا

رام سنگھ کی تشویش بھری آواز بلند ہوئی ''تو اڑا دے گا کمہار کے کھوتے!''

رب نواز نے بھنا کر کہا ''بک نہیں اوئے سنتو کھسر کے پھوے''

رام سنگھ ہنسا ''قسم کھا نہیں مارے گا!''

رب نواز نے پوچھا ''کس کی قسم کھاؤں!''

رام سنگھ نے کہا ''کسی کی بھی کھا لے!''

رب نواز ہنسا ''اوئے جا۔۔۔۔منگوالے اپنا سامان''

چند لمحات خاموشی رہی، دوربین ایک جوان کے ہاتھ میں تھی اس نے معنی خیز نظروں سے صوبیدار رب نواز کی طرف دیکھا۔ بندوق چلانے ہی والا تھا کہ رب نواز نے اسے منع کیا ''نہیں۔۔۔۔نہیں!''

پھر اس نے دوربین لے کر خود ہی دیکھا۔ ایک آدمی ڈرتے ڈرتے پنجوں کے بل پتھروں کے عقب سے نکل کر جا رہا تھا۔ تھوڑی دور اس طرح چل کر وہ اٹھا اور تیزی سے بھاگا اور کچھ دور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ رکا۔ پھر تیزی سے پتھروں کی محفوظ دیوار کی طرف بھاگا اور بالآخر وہاں پہنچ گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو رب نواز نے اپنی بندوق چلا دی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی رب نواز کا قہقہہ بلند ہوا۔ یہ دونوں آوازیں مل کر کچھ دیر جھنجھناتی رہیں۔ پھر رام سنگھ کی آواز آئی ''تھینک یو۔''

''نو مینشن'' رب نواز نے یہ کہہ کر جوانوں کی طرف دیکھا ''ایک راؤنڈ ہو جائے''

تفریح کے طور پر دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔۔۔۔۔۔پھر خاموشی ہو گئی رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا پہاڑی کی داڑھی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پکارا ''چائے تیار کر لی رام سنگھا؟''

جواب آیا ''ابھی کہاں اوئے لمبہار کے کھوتے!''

رب نواز ذات کا کمہار تھا جب کوئی اس کی طرف اشارہ کرتا تھا تو غصے سے اس

کا خون کھولنے لگتا تھا۔ ایک صرف رام سنگھ کے منہ سے وہ اسے برداشت کر لیتا تھا اس لیے کہ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ایک ہی گاؤں میں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں کی عمر میں صرف چند دن کا فرق تھا۔ دونوں کے باپ، پھر ان کے باپ بھی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک ہی سکول میں پرائمری تک پڑھتے تھے اور ایک ہی دن فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور پچھلی بڑی جنگ میں کئی محاذوں پر اکٹھے لڑے تھے۔

رب نواز اپنے جوانوں کی نظروں میں خود کو خفیف محسوس کر کے بڑبڑایا ''خنزیر کی دم۔۔۔۔۔ اب بھی باز نہیں آتا۔'' پھر وہ رام سنگھ سے مخاطب ہوا ''بک نہیں اوئے کھوتے کی جوں۔''

رام سنگھ کا قہقہہ بلند ہوا رب نواز نے ایسے ہی شست باندھی ہوئی تھی تفریحاً اس نے لبلبی دبا دی تڑاخ کے ساتھ ہی ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ رب نواز نے فوراً دور بین لگائی اور دیکھا کہ ایک آدمی نہیں، رام سنگھ پیٹ پکڑے، پتھروں کی دیوار سے ذرا ہٹ کر دوہرا ہوا اور گر پڑا۔

رب نواز زور سے چیخا ''رام سنگھ!'' اور اچھل کر کھڑا ہو گیا، ادھر سے بیک وقت تین چار فائر ہوئے ایک گولی رب نواز کا دایاں بازو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اب دونوں طرف سے فائر شروع ہو گئے۔ ادھر کچھ سپاہیوں نے گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر پتھروں کے عقب سے نکل بھاگنا چاہا۔ ادھر سے فائر جاری تھے مگر نشانے پر کوئی نہ بیٹھا۔ رب نواز نے اپنے جوانوں کو اترنے کا حکم دیا تین فوراً ہی مارے گئے، لیکن افتاں و خیزاں باقی جوان دوسری پہاڑی پر پہنچ

گئے۔"

رام سنگھ خون میں لت پت پتھریلی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں مسکرا کر اس نے کہا "اوئے کمہار کے کھوتے، یہ تو نے کیا کیا۔"

رب نواز، رام سنگھ کا زخم اپنے پیٹ میں محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ مسکرا کر اس پر جھکا اور دو زانو ہو کر اس کی پٹی کھولنے لگا "خنزیر کی دم، تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا۔"

پٹی اتارنے سے رام سنگھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ درد سے وہ چلا چلا پڑا۔ جب پٹی اتر گئی اور رب نواز نے زخم کا معائنہ کیا جو بہت خطرناک تھا تو رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ دبا کر کہا "میں اپنا آپ دکھانے کے لیے باہر نکلا تھا کہ تو نے۔۔۔۔اوئے رب کے پتر۔۔۔۔فائر کر دیا۔"

رب نواز کا گلا رندھ گیا "قسم وحدہ، لاشریک کی۔۔۔۔میں نے ایسے ہی بندوق چلائی تھی۔۔۔۔مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو کھوتے کا سنگھ باہر نکل رہا ہے۔۔۔مجھے افسوس ہے!"

رام سنگھ کا خون کافی بہہ نکلا تھا۔ رب نواز اور اس کے ساتھی کئی گھنٹوں کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ اس عرصے تک تو ایک پوری مشک خون کی خالی ہو سکتی تھی۔ رب نواز کو حیرت تھی کہ اتنی دیر تک رام سنگھ زندہ رہ سکا ہے۔ اس کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے گا۔ ہلانا جلانا غلط تھا، چنانچہ اس نے فوراً وائرلیس کے ذریعے سے پلاٹون کمانڈر سے درخواست کی کہ جلدی ایک ڈاکٹر روانہ کیا جائے۔ اس کا دوست رام

سنگھ زخمی ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کا وہاں تک پہنچنا اور پھر وقت پر پہنچنا بالکل محال تھا۔ رب نواز کو یقین تھا کہ رام سنگھ صرف چند گھڑیوں کا مہمان ہے پھر بھی وائرلیس پر پیغام پہنچا کر اس نے مسکرا کر رام سنگھ سے کہا ''ڈاکٹر آ رہا ہے۔۔۔۔ کوئی فکر نہ کر۔''

رام سنگھ بڑی نحیف آواز میں سوچتے ہوئے بولا '' فکر کسی بات کی نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ بتا میرے کتنے جوان مارے ہیں تم لوگوں نے؟''

رب نواز نے جواب دیا ''صرف ایک!''

رام سنگھ کی آواز اور زیادہ نحیف ہو گئی تیرے کتنے مارے گئے؟

رب نواز نے جھوٹ بولا ''چھ!'' اور یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نظروں سے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔

''چھ۔۔۔۔۔ چھ!'' رام سنگھ نے ایک ایک آدمی اپنے دل میں گنا ''میں زخمی ہوا تو وہ بہت بد دل ہو گئے تھے۔۔۔۔ پر میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ کھیل جاؤ اپنی اور دشمن کی جان سے۔۔۔۔ چھ۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے!'' وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں چلا گیا ''رب نواز۔۔۔۔ یاد ہیں وہ دن تمہیں۔۔۔۔۔''

اور رام سنگھ نے بیتے دن یاد کرنے شروع کر دیئے۔ کھیتوں کھلیانوں کی باتیں سکول کے قصے 2/9 جاٹ رجمنٹ کی داستانیں۔۔۔۔۔ کمانڈنگ افسروں کے لطیفے اور باہر کے ملکوں میں اجنبی عورتوں سے معاشقے ان کا ذکر کرتے ہوئے رام سنگھ کو کوئی بہت دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ ہنسنے لگا تو اس کے ٹیس اٹھی مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ زخم سے اوپر ہی اوپر ہنس کر کہنے لگا '' اوئے سور کے

ٹل۔۔۔۔یاد ہے تمہیں وہ مڈم۔۔۔۔۔"

رب نواز نے پوچھا"کون؟"

رام سنگھ نے کہا" وہ۔۔۔۔۔۔اٹلی کی۔۔۔۔کیا نام رکھا تھا ہم نے اس کا۔۔۔۔۔بڑی مارخور عورت تھی!"

رب نواز کو فوراً ہی وہ عورت یاد آ گئی" ہاں، ہاں۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔مڈام منیتا فنیتو۔۔۔ پیسہ ختم،۔تماشا ختم۔۔۔۔پر تجھ سے کبھی کبھی رعایت کر دیتی تھی مسولینی کی بچی!"

رام سنگھ زور سے ہنسا۔۔۔۔اور اس کے زخم سے جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا نکل آیا سرسری طور پر رب نواز نے جو پٹی باندھی تھی وہ کھسک گئی تھی اسے ٹھیک کر کے اس نے رام سنگھ سے کہا" اب خاموش رہو"

رام سنگھ کو بہت تیز بخار تھا۔اس کا دماغ اس کے باعث بہت تیز ہو گیا تھا بولنے کی طاقت نہیں تھی مگر بولے چلا جا رہا تھا۔کبھی کبھی رک جاتا۔جیسے یہ دیکھ رہا ہے کہ ٹینکی میں کتنا پٹرول باقی ہے کچھ دیر کے بعد اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، لیکن کچھ ایسے وقفے بھی آتے تھے کہ اس کے ہوش و حواس سلامت ہوتے تھے۔انہی وقفوں میں اس نے ایک مرتبہ رب نواز سے سوال کیا"یار! سچ سچ بتا، کیا تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہئے!"

رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا"ہاں، رام سنگھا!"

رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا"نہیں۔۔۔۔میں نہیں مان سکتا۔۔۔۔تمہیں ورغلایا گیا ہے۔"

رب نواز نے اس کو یقین دلانے کے انداز میں کہا ''تمہیں ورغلایا گیا ہے۔۔۔۔۔۔قسم پنجتن پاک کی۔۔۔۔''

رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ پکڑ لیا ''قسم نہ کھا یار۔۔۔۔۔ٹھیک ہوگا'' لیکن اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کو رب نواز کی قسم کا یقین نہیں۔

دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے پلاٹون کمانڈنٹ میجر اسلم آیا اس کے ساتھ چند سپاہی تھے، مگر ڈاکٹر نہیں تھا۔ رام سنگھ بے ہوشی اور نزع کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ مگر آواز اس قدر کمزور اور شکستہ تھی کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ میجر اسلم بھی 2/9 جاٹ رجمنٹ کا تھا اور رام سنگھ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ رب نواز سے سارے حالات دریافت کرنے کے بعد اس نے رام سنگھ کو بلایا۔۔۔۔''رام سنگھ۔۔۔۔۔۔رام سنگھ!''

رام سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں لیٹے لیٹے اٹینشن ہو کر اس نے سلیوٹ کیا لیکن پھر آنکھیں کھول کر اس نے ایک لحظے کے لیے غور سے میجر اسلم کی طرف دیکھا اس کا سلیوٹ کرنے والا اکڑا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا۔ جھنجھلا کر اس نے بڑبڑانا شروع کیا'' کچھ نہیں اوئے رام سیاں۔۔۔۔بھول ہی گیا تو سور کے تلا۔۔۔۔۔کہ یہ لڑائی۔۔۔۔۔۔۔یہ لڑائی؟''

رام سنگھ اپنی بات پوری نہ کر سکا بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس نے رب نواز کی طرف نیم سوالیہ انداز میں دیکھا اور سر د ہو گیا۔

8 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆☆

آنکھیں

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں!

یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موٹر کار کی ہیڈ لائٹس، جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے، آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ وہ بہت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں، میں خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کر سکتا ہوں لیکن معاف کیجئے گا، ان آنکھوں کے معاملے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ خوبصورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود ان میں بے پناہ کشش تھی۔

میری اور ان آنکھوں کی ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی۔ میں اس ہسپتال کا نام آپ کو بتانا نہیں چاہتا، اس لیے کہ اس سے میرے اس افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا

بس آپ یہی سمجھ لیجئے کہ ایک ہسپتال تھا، جس میں میرا ایک عزیز آپریشن کرانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔

یوں تو میں رواداری کا قائل نہیں، مریضوں کے پاس جا کر ان کو دم دلاسہ دینا بھی مجھے نہیں آتا۔ لیکن اپنی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے جانا پڑا تاکہ میں اپنے مرنے والے عزیز کو اپنے خلوص اور اپنی محبت کا ثبوت دے سکوں۔

یقین مانئے کہ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ہسپتال کے نام ہی سے مجھے نفرت ہے، معلوم نہیں کیوں۔۔۔۔۔ شاید اس لیے کہ ایک بار بمبئی میں اپنی بوڑھی ہمسائی کو جس کی کلائی میں موچ آ گئی تھی، مجھے جے جے ہسپتال میں لے جانا پڑا

تھا۔وہاں کیوژوالٹی ڈیپارٹمنٹ میں مجھے کم از کم ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا وہاں میں جس آدمی سے بھی ملا،لوہے کے مانند سرد اور بے حس تھا۔

میں ان آنکھوں کا ذکر کر رہا تھا جو مجھے بے حد پسند تھیں۔

پسند کا معاملہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔بہت ممکن ہے، اگر آپ یہ آنکھیں دیکھتے تو آپ کے دل و دماغ میں کوئی ردعمل پیدا نہ ہوتا۔یہ بھی ممکن ہے کہ آپ سے اگر ان کے بارے میں رائے طلب کی جاتی تو آپ کہہ دیتے ''نہایت واہیات آنکھیں ہیں'' لیکن جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا،تو سب سے پہلے مجھے اس کی آنکھوں نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

وہ برقع پہنے ہوئے تھی،مگر نقاب اٹھا ہوا تھا۔اس کے ہاتھ میں دوا کی ایک بوتل تھی اور وہ جنرل وارڈ کے برآمدے میں ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جو بڑی تھیں، نہ چھوٹی، سیاہ تھیں نہ بھوری، نیلی تھیں نہ سبز،ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔میرے قدم رک گئے وہ بھی ٹھہر گئے اس نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا ''تم سے چلا نہیں جاتا!''

لڑکے نے اپنی کلائی چھڑائی اور تیزی سے کہا ''چل تو رہا ہوں۔۔۔۔۔۔تو تو اندھی ہے!''

میں نے یہ سنا تو اس لڑکی کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا اس کے سارے وجود میں صرف اس کی آنکھیں ہی تھیں جو مجھے پسند آئی تھیں

میں آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے پلکیں نہ جھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا ''ایکسرے کہاں لیا جاتا ہے؟''

اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں ایکسرے ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک دوست کام کر رہا تھا، اور میں اسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا'' آؤ، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔''

لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے ڈاکٹر صادق کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایکسرے لینے میں مصروف ہیں۔

دروازہ بند تھا اور باہر مریضوں کی ایک بھیڑ لگی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے تیز و تند آواز آئی ''کون ہے ۔۔۔۔ دروازہ مت ٹھوکو''

لیکن میں نے پھر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صادق مجھے گالی دیتے دیتے رہ گیا'' اوہ ۔۔۔ تم ہو!''

''ہاں بھئی ۔۔۔۔ میں تم سے ملنے آیا تھا۔ دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو''

'' آجاؤ اندر!''

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے کہا'' آؤ ۔۔۔۔۔۔ لیکن لڑکے کو باہر ہی رہنے دو!''

ڈاکٹر صادق نے ہولے سے مجھ سے پوچھا ''کون ہے یہ؟''

میں نے جواب دیا ''معلوم نہیں، کون ہے ۔۔۔ ایکسرے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھ رہی تھی میں نے کہا چلو، میں لیے چلتا ہوں''

ڈاکٹر صادق نے دروازہ اور زیادہ کھول دیا۔ میں اور وہ لڑکی اندر داخل ہو گئے۔

چار پانچ مریض تھے ڈاکٹر صادق نے جلدی جلدی ان کی سکریننگ کی، اور انہیں رخصت کیا۔ اس کے بعد کمرے میں ہم صرف دو رہ گئے میں اور وہ لڑکی۔

ڈاکٹر صادق نے مجھ سے پوچھا ''انہیں کیا بیماری ہے؟''

میں نے اس لڑکی سے پوچھا ''کیا بیماری ہے تمہیں؟۔۔۔۔ ایکسرے کے لیے تم سے کس ڈاکٹر نے کہا تھا؟''

اندھیرے کمرے میں لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جواب دیا ''مجھے معلوم نہیں، کیا بیماری ہے۔۔۔۔۔ ہمارے محلے میں ایک ڈاکٹر ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ایکسرے کرالو''

ڈاکٹر صادق نے اس سے کہا کہ مشین کی طرف آئے۔ وہ آگے بڑھی تو بڑے زور کے ساتھ اس سے ٹکرا گئی۔ ڈاکٹر نے تیز لہجے میں اس سے کہا۔۔۔۔ ''کیا تمہیں سجھائی نہیں دیتا۔''

لڑکی خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے اس کا برقع اتارا اور اسکرین کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے سوئچ اون کیا۔ میں نے شیشے میں دیکھا تو مجھے اس کی پسلیاں نظر آئیں۔ اس کا دل بھی ایک کونے میں کالے سے دھبے کی صورت میں دھڑک رہا تھا۔

ڈاکٹر صادق پانچ چھ منٹ تک اس کی پسلیوں اور ہڈیوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے سوئچ آف کر دیا اور روشنی کر کے مجھ سے مخاطب ہوا ''چھاتی بالکل

صاف ہے۔"

لڑکی نے معلوم نہیں کیا سمجھا کہ اپنی چھاتیوں پر جو کافی بڑی بڑی تھیں دوپٹے کو درست کیا اور برقع ڈھونڈنے لگی۔

برقع ایک کونے میں میز پر پڑا تھا میں نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے حوالے کر دیا ڈاکٹر صادق نے رپورٹ لکھی اور اس سے پوچھا۔۔۔۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے برقع اوڑھتے ہوئے جواب دیا "جی میرا نام۔۔۔۔۔میرا نام حنیفہ ہے"

"حنیفہ!" ڈاکٹر صادق نے اس کا نام پرچی پر لکھا اور اس کو دے دی "جاؤ، یہ اپنے ڈاکٹر کو دکھا دینا"

لڑکی نے پرچی لی اور قمیض کے اندر اپنی انگیا میں اڑس لی۔

جب وہ باہر نکلی تو میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے پیچھے تھا لیکن مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ڈاکٹر صادق نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا تھا اسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس بات کا یقین تھا کہ اس لڑکی سے میرا تعلق ہے۔ حالانکہ جیسا آپ جانتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔۔۔۔۔سوائے اس کے کہ مجھے اس کی آنکھیں پسند آ گئی تھیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے تھا اس نے اپنے ساتھی لڑکے کی انگلی پکڑی ہوئی تھی جب وہ تانگوں کے اڈے پر پہنچے تو میں نے حنیفہ سے پوچھا "تمہیں کہاں جانا ہے؟"

اس نے ایک گلی کا نام لیا تو میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہا ''مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے۔۔۔۔میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا''

میں نے جب اس کا ہاتھ پکڑ کر تانگے میں بٹھایا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری آنکھیں ایکسریز کا شیشہ بن گئی ہیں۔ مجھے اس کا گوشت پوست دکھائی نہیں دیتا تھا۔۔۔۔صرف ڈھانچہ نظر آتا تھا۔۔۔۔لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔وہ بالکل ثابت و سالم تھیں، جن میں بے پناہ کشش تھی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھوں لیکن یہ سوچ کر کہ کوئی دیکھ لے گا، میں نے اس کے ساتھی لڑکے کو اس کے ساتھ بٹھا دیا اور آپ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

تانگہ چلا تو حنیفہ مجھ سے مخاطب ہوئی ''تم کون ہو؟''

''میں۔۔۔میں سعادت حسن منٹو ہوں''

''حسن من گو۔۔۔۔۔۔یہ من ٹو کیا ہوا؟''

''کشمیریوں کی ایک ذات ہے''

''ہم بھی کشمیری ہیں''

''اچھا؟''

''ہم کنگ وائس ہیں!''

میں نے مڑ کر اس سے کہا ''یہ تو بہت اونچی ذات ہے''

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھیں اور زیادہ پرکشش ہو گئیں

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں۔لیکن وہ

آنکھیں جو حنیفہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پر کشش تھیں، معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ وہ قطعاً خوب صورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں کھب رہی تھیں۔

میں نے جسارت سے کام لیا اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کو جو اس کے ماتھے پر لٹک کر اس کی ایک آنکھ کو ڈھانپ رہی تھی، انگلی سے اٹھایا اور اس کے سر پر چسپاں کر دی۔۔۔اس نے برا نہ مانا۔

میں نے اور جسارت کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اس پر بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اپنے ساتھی لڑکے سے مخاطب ہوئی ''تم میرا ہاتھ کیوں دبا رہے ہو؟''

میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لڑکے سے پوچھا ''تمہارا مکان کہاں ہے؟''

لڑکے نے ہاتھ کا اشارہ کیا ''اس بازار میں!''

تانگے نے ادھر کا رخ کیا بازار میں بہت بھیڑ تھی ٹریفک بھی معمول سے زیادہ تانگہ رک رک کے چل رہا تھا سڑک میں چونکہ گڑھے تھے، اس لیے بڑے زور کے دھچکے لگ رہے تھے۔ بار بار اس کا سر میرے کندھوں سے ٹکراتا تھا، اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے زانو پر رکھ لوں اور اس کی آنکھیں دیکھتا رہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کا گھر آ گیا لڑکے نے تانگے والے سے رکنے کے لیے کہا۔ جب تانگہ رکا تو وہ نیچے اترا۔ حنیفہ بیٹھی رہی میں نے اس سے کہا ''تمہارا گھر آ گیا ہے''

حنیفہ نے مڑ کر میری طرف اپنی عجیب و غریب آنکھوں سے دیکھا "بدرو کہاں ہے؟"

میں نے اس سے پوچھا "کون بدرو؟"

"وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا"

میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جو تانگے کے پاس ہی تھا "یہ کھڑا تو ہے"

"اچھا۔۔۔۔۔!" یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا "بدرو! مجھے اتار تو دو"

بدرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکل سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا پچھلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا "کیا بات ہے۔۔۔۔یہ خود نہیں اتر سکتیں؟"

بدرو نے جواب دیا "جی نہیں۔۔۔۔ان کی آنکھیں خراب ہیں۔۔۔۔۔دکھائی نہیں دیتا۔"

☆☆☆☆☆☆

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں

یہ دنیا بھی عجیب و غریب ہے۔۔۔۔۔۔خاص کر آج کا زمانہ۔۔۔۔۔۔قانون کو جس طرح فریب دیا جاتا ہے اس کے متعلق شاید آپ کو زیادہ علم نہ ہو۔۔۔۔۔آج کل قانون ایک بے معنی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ادھر کوئی نیا قانون بنتا ہے ادھر یار لوگ اس کا توڑ سوچ لیتے ہیں اس کے علاوہ اپنے بچاؤ کی کئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔

کسی اخبار پر کوفت آنی ہو تو آیا کرے اس کا مالک محفوظ و مامون رہے گا۔ اس لیے کہ پرنٹ لائن میں کسی قصائی یا دھوبی کا نام بحیثیت پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر کے درج ہوگا اگر اخبار میں کوئی ایسی تحریر چھپ گئی جس پر گورنمنٹ کو اعتراض ہو تو اصل مالک کے بجائے وہ دھوبی یا قصائی گرفت میں آجائے گا۔اس کو جرمانہ ہوگا یا قید،جرمانہ تو ظاہر ہے اسے اخبار کا مالک ادا کر دے گا۔مگر قید تو وہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن ان دو پارٹیوں کے درمیان اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر قید ہوئی تو وہ اس کے گھر اتنے روپے ماہوار پہنچا دیا کرے گا ایسے معاہدہ میں خلاف ورزی بہت کم ہوتی ہے۔

جو لوگ ناجائز طور پر شراب بیچتے ہیں ان کے پاس دو تین آدمی ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں جن کا صرف یہ کام ہے کہ اگر پولیس چھاپہ مارے تو وہ گرفتار ہو جائیں اور چند ماہ کی قید کاٹ کر واپس آجائیں تو اس کا معاوضہ ان کو معقول مل جاتا ہے۔

چھاپہ مارنے والے بھی پہلے ہی سے مطلع کر دیتے ہیں کہ ہم آ رہے ہیں۔ تم اپنا انتظام کر لو۔۔۔ چنانچہ فوراً انتظام کر لیا جاتا ہے لیکن مالک غائب ہو جاتا ہے اور وہ کرائے کے آدمی گرفتار ہو جاتے ہیں۔۔۔ یہ بھی ایک قسم کی ملازمت ہے لیکن دنیا میں جتنی ملازمتیں ہیں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

میں جب امین پہلوان سے ملا تو وہ تین مہینے کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا میں نے اس سے پوچھا "امین اس دفعہ کیسے جیل میں گئے"

امین مسکرایا "اپنے کاروبار کے سلسلے میں"

"کیا کاروبار تھا"

"جو رہا ہے وہی ہے"

"بھئی بتاؤ تو۔۔۔"

"بتانے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں مگر خواہ مخواہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔"

میں نے تھوڑے سے توقف کے بعد اس سے کہا۔۔۔ "امین تمہیں آئے دن جیل میں جانا کیا پسند ہے"

امین پہلوان مسکرایا "جناب۔۔۔ پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ لوگ مجھے پہلوان کہتے ہیں حالانکہ میں نے آج تک اکھاڑے کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔ ان پڑھ ہوں۔۔۔ کوئی اور ہنر بھی مجھے نہیں آتا۔۔۔ بس جیل جانا آتا ہے وہاں میں خوش رہتا ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔۔۔ آپ ہر روز دفتر جاتے ہیں کیا وہ جیل نہیں۔"

میں لاجواب ہو گیا "تم ٹھیک کہتے ہو امین! لیکن دفتر جانے والوں کا معاملہ دوسرا ہے۔۔۔۔ لوگ انہیں بری نگاہوں سے نہیں دیکھتے"

"کیوں نہیں دیکھتے ضلع کچہری کے نئے منشی اور کلرک ہیں انہیں کون اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔۔۔۔ رشوتیں لیتے ہیں۔۔۔ جھوٹ بولتے ہیں اور پرلے درجے کے مکار ہوتے ہیں مجھ میں ایسا کوئی عیب نہیں۔۔۔۔۔ میں اپنی روزی بڑی ایمانداری سے کماتا ہوں۔"

میں نے اس سے پوچھا "کس طرح؟"

اس نے جواب دیا "اس طرح کہ اگر کسی کا کام کرتا ہوں اور قید کاٹتا ہوں جیل میں محنت مشقت کرتا ہوں اور بعد میں اس شخص سے جس کی خاطر میں نے سزا بھگتی تھی۔ مجھے دو تین سو روپیہ ملتا ہے تو یہ میرا معاوضہ ہے اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔ میں رشوت تو نہیں لیتا۔۔۔ حلال کی کمائی ہوں لوگ مجھے غنڈہ سمجھتے ہیں۔۔۔ بڑا خطرناک غنڈہ۔۔۔۔۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آج تک کسی کے تھپڑ بھی نہیں مارا۔ میری لائن بالکل الگ ہے۔"

اس کی لائن واقعی دوسروں سے الگ تھی۔۔۔۔۔۔۔ مجھے حیرت تھی کہ تین چار مرتبہ قید کاٹنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ بڑا سنجیدہ مگر گنوار قسم کا آدمی تھا جس کو کسی کی پروا نہیں تھی قید کاٹنے کے بعد جب بھی آتا تو اس کا وزن کم از کم دس پاؤنڈ زیادہ ہوتا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا "امین کیا وہاں کا کھانا تمہیں راس آتا ہے"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "کھانا کیسا بھی ہو۔۔۔ اس کا

راس کرنا آدمی کا اپنا کام ہے۔۔۔۔۔۔مجھے دال سے نفرت تھی لیکن جب پہلی مرتبہ مجھے وہاں کنکروں بھری دال دی گئی اور ریت ملی روٹی، تو میں نے کہا۔۔۔۔امین یار۔۔۔۔۔یہ سب سے اچھا کھانا ہے، کھا اور خدا کا شکر بجا لا۔ چنانچہ میں ایک دو روز ہی میں عادی ہو گیا۔۔۔مشقت کرتا کھانا کھاتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے گنجے کے ہوٹل سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔''

میں نے ایک دن اس سے پوچھا ''تم نے کبھی کسی عورت سے بھی محبت کی ہے''

اس نے اپنے دونوں کان پکڑے۔۔۔۔۔۔''خدا بچائے اس محبت سے مجھے صرف اپنی ماں سے محبت ہے''

میں نے اس سے پوچھا ''تمہاری ماں زندہ ہے''

''جی ہاں۔۔۔۔۔خدا کے فضل و کرم سے۔۔۔۔۔۔بہت بوڑھی ہے لیکن آپ کی دعا سے اس کا سایہ میرے سر پر دیر تک قائم رہے گا اور وہ تو ہر وقت میرے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا مجھے نیکی کی ہدایت کرے۔''

میں نے اس سے کہا ''خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے پر میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں کسی عورت سے محبت ہوئی ہے یا نہیں دیکھو جھوٹ نہیں بولنا''

امین پہلوان نے بڑے تیز لہجے میں کہا ''میں نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔۔۔۔۔میں نے کسی عورت سے محبت نہیں کی''

میں نے پوچھا ''کیوں۔۔۔۔۔''

اس نے جواب دیا ''اس لیے کہ مجھے اس سے دلچسپی ہی نہیں''

میں خاموش رہا

تیسرے روز اس کی ماں پر فالج گرا اور وہ راہی ملک عدم ہوئی۔ امین پہلوان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا وہ سوگوار مغموم اور دل شکستہ بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک رئیس کی طرف سے اسے بلاوا آیا۔ وہ اپنی عزیز ماں کی میت چھوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کیوں میاں صاحب آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔

میاں صاحب نے کہا ”تمہیں کیوں بلایا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ایک خاص کام ہے“

امین نے جس کے دل و دماغ میں اپنی ماں کا کفن دفن تیر رہا تھا پوچھا

”حضور یہ خاص کام کیا ہے“

میاں صاحب نے سگریٹ سلگایا ”بلیک مارکیٹ کا قصہ ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج میرے گودام پر چھاپہ مارا جائے گا سو میں نے سوچا کہ امین پہلوان بہترین آدمی ہے جو اسے نمٹا سکتا ہے۔“

امین نے بڑے مغموم اور زخمی انداز میں کہا ”آپ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”بھئی خدمت ودمت کی بات تم مت کرو۔۔۔۔۔۔بس صرف اتنی سی بات ہے کہ جب چھاپہ پڑے تو گودام کے مالک تم ہو گے۔ گرفتار ہو جاؤ گے زیادہ سے زیادہ جرمانہ پانچ ہزار روپے ہو گا اور ایک دو برس کی قید“

”مجھے کیا ملے گا“

”جب وہاں سے رہا ہو کر آؤ گے تو معاملہ طے کر لیا جائے گا“

امین نے میاں صاحب سے کہا ''حضور یہ دور کی بات ہے جرمانہ تو آپ ادا کر دیں گے لیکن قید تو مجھے کاٹنا پڑے گی آپ باقاعدہ سودا کریں''

میاں صاحب مسکرائے ''تم سے آج تک میں نے کبھی وعدہ خلافی کی ہے۔۔۔۔پچھلی دفعہ میں نے تم سے کام لیا اور تم کو تین مہینے کی قید ہوئی تو کیا میں نے جیل خانے میں ہر قسم کی سہولت بہم نہ پہنچائی تم نے باہر آ کر مجھ سے کہا کہ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔۔۔۔اگر تم کچھ عرصے کے لیے جیل چلے گئے تو وہاں تمہیں ہر آسائش ہو گی۔''

امین نے کہا ''جی۔۔۔۔یہ سب درست ہے۔۔۔۔لیکن۔۔۔۔''

''لیکن۔۔۔۔۔کیا؟''

امین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ''میاں صاحب۔۔۔۔۔میری ماں مر گئی ہے۔''

''کب''

''آج صبح''

میاں صاحب نے افسوس کا اظہار کیا ''کفنا دفنا دیا ہو گا''

امین کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے گئے ''میاں صاحب! ابھی کچھ بھی نہیں ہو سکا۔۔۔۔میرے پاس تو اپنے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔''

میاں صاحب نے چند لمحات حالات پر غور کیا اور امین سے کہا ''تو ایسا کرو۔۔۔۔میرا مطلب ہے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔۔۔۔تمہیں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔۔تم گودام پر جاؤ اور

اپنی ڈیوٹی سنبھالو‘‘

امین نے اپنی میلی قمیص کی آستین سے آنسو پونچھے’’ لیکن میاں صاحب میں۔۔۔۔۔میں اپنی ماں کے جنازے کو کندھا بھی نہ دوں‘‘

میاں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا’’ یہ سب رسمی چیزیں ہیں مرحومہ کو دفنانا ہے سو یہ کام بڑی اچھی طرح سے ہو جائے گا تمہیں جنازے کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے تمہارے ساتھ جانے سے مرحومہ کو کیا راحت پہنچے گی۔۔۔۔وہ تو بے چاری اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔۔۔اس کے جنازے کے ساتھ کوئی بھی جائے۔۔۔۔۔کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔اصل میں تم لوگ جاہل ہو۔۔۔۔۔۔میں اگر مر جاؤں تو مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے جنازے میں کس کس عزیز اور دوست نے شرکت کی تھی۔ مجھے اگر جلا بھی دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میری لاش کو چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیا جائے تو مجھے اس کی کیا خبر ہوگی۔ تم زیادہ جذباتی نہ بنو دنیا میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اپنی ذات کے متعلق سوچا جائے۔۔۔۔میں پوچھتا ہوں تمہاری کمائی کے ذرائع کیا ہیں۔‘‘

امین سوچنے لگا چند لمحات اپنی بساط کے مطابق غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا’’ حضور میری کمائی کے ذرائع آپ کو معلوم ہیں مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں‘‘

’’میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تمہیں میرا کام کرنے میں کیا حیل و حجت ہے میں تمہاری ماں کی تجہیز و تکفین کا ابھی بندوبست کیے دیتا ہوں اور جب تم جیل سے

واپس آؤ گے تو“

امین پہلوان نے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا ”تو آپ میرا ابھی بندوبست کر دیں گے“

میاں صاحب بوکھلائے ”تم کیسی باتیں کرتے ہو امین پہلوان“

امین پہلوان نے ذرا درشت لہجے میں کہا ”امین پہلوان کی ایسی کی تیسی آپ یہ بتایئے کہ مجھے کتنے روپے ملیں گے۔۔۔۔ میں ایک ہزار سے کم نہیں لوں گا“

”ایک ہزار تو بہت زیادہ ہیں“

امین نے کہا ”زیادہ ہے یا کم۔۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔۔ میں جب قید کاٹ کر آؤں گا تو اپنی ماں کی قبر پختہ بناؤں گا سنگ مرمر کی۔۔۔۔۔۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔“

میاں صاحب نے اس سے کہا ”اچھا بھئی ایک ہزار ہی لے لینا“

امین نے میاں صاحب سے کہا ”تو لائیے اتنے روپے دیجیے کہ میں کفن دفن کا انتظام کر لوں۔۔۔۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔“

میاں صاحب نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا۔۔۔۔ ”لیکن تمہارا کیا بھروسہ ہے“

امین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو کسی نے ماں بہن کی گالی دی ہے ”میاں صاحب آپ مجھے بے ایمان سمجھتے ہیں۔۔۔۔ بے ایمان آپ ہیں۔۔۔۔ اس لیے کہ اپنے فعلوں کا بوجھ میرے سر پر ڈال رہے ہیں“

میاں صاحب موقع شناس تھے انہوں نے سمجھا کہ امین بگڑ گیا ہے چنانچہ اس نے فوراً اسے اپنی چرب زبانی سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن امین پر کوئی اثر نہ ہوا۔

جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ غسال اس کی ماں کو آخری غسل دے چکے ہیں۔ کفن بھی پہنچایا جا چکا ہے امین بہت متحیر ہوا کہ اس پر یہ مہربانی کس نے کی ہے۔۔۔میاں صاحب نے۔۔۔۔لیکن وہ تو سودا کرنا چاہتے تھے۔

اس نے ایک آدمی سے جو تابوت کو سجانے کے لیے پھول گوندھ رہا تھا پوچھا ''یہ کس آدمی نے اہتمام کیا ہے''

پھول والے نے جواب دیا ''حضور آپ کی بیوی نے''

امین چکرا گیا۔۔۔۔وہ اپنے شدید تعجب کا مظاہرہ کرتا مگر خاموش رہا پھول والے سے صرف اتنا پوچھا۔۔۔۔۔۔''کہاں ہیں وہ۔۔۔''

پھول والے نے جواب دیا ''جی اندر ہیں۔۔۔۔۔۔۔آپ کا انتظار کر رہی تھیں''

امین اندر گیا تو دیکھا کہ ایک نوجوان، خوبصورت لڑکی اس کی چارپائی پر بیٹھی ہے۔۔۔۔امین نے اس سے پوچھا ''آپ کون ہیں۔۔۔۔یہاں کیوں آئی ہیں''

اس لڑکی نے جواب دیا ''میں آپ کی بیوی ہوں یہاں کیوں آئی ہوں یہ آپ کا عجیب و غریب سوال ہے''

امین نے اس سے پوچھا ''میری بیوی تو کوئی بھی نہیں بتاؤ تم کون ہو؟''

لڑکی مسکرائی

''میں۔۔۔۔ میاں۔۔۔۔دین کی بیٹی ہوں۔۔۔۔ان سے جو آپ کی
گفتگو ہوئی میں نے سب سنی۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔''

امین نے کہا

''اوراب کہنے کی ضرورت نہیں''

☆☆☆☆☆☆

اس کا پتی

لوگ کہتے تھے کہ نھو کا سر اس لیے گنجا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے اس بیان میں کافی صداقت تھی کیونکہ سوچتے وقت نھو ہمیشہ سر کھجلایا کرتا ہے کیونکہ اس کے بال بہت کھردرے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے بار بار کھجلانے سے اس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے۔ اگر اس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصہ ضرور چمکتا مگر میل کی زیادتی کی وجہ سے اس کی حالت بالکل اس توے کی سی ہو گئی ہے جس پر ہر روز روٹیاں پکائی جائیں مگر اسے صاف نہ کیا جائے۔

نھو بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ اکثر اپنے خیالات کو کچی اینٹیں سمجھتا تھا اور کسی پر فوراً ہی ظاہر نہیں کرتا تھا اس کا یہ اصول تھا کہ خیال کو اچھی طرح پکا کر باہر نکالنا چاہیے تھا تاکہ جس عمارت میں بھی وہ استعمال ہو اس کا ایک مضبوط حصہ بن جائے۔

گاؤں والے اس کے خیالات کی قدر کرتے تھے اور ہر بات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے لیکن اس قدر افزائی سے نھو اپنے آپ کو اہم نہیں سمجھنے لگا تھا جس طرح گاؤں میں شمبھو کا کام ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہنا تھا۔ اسی طرح اس کا کام ہر وقت دوسروں کو مشورہ دیتے رہنا تھا وہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص صرف ایک کام کے لیے پیدا ہوتا ہے چنانچہ شمبھو کے بارے میں چوپال پر جب کبھی ذکر چھڑتا تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کھاد کتنی بدبودار چیز ہے پر کھیتی باڑی اس کے بنا سوہی

نہیں سکتی شمو کے ہر سانس میں گالیوں کی باس آتی ہے ٹھیک ہے پر گاؤں کی چہل پہل اور رونق بھی اسی کے دم سے قائم ہے اگر وہ نہ ہو تو لوگوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ گالیاں کیا ہوتی ہیں، اچھے بول جاننے کے ساتھ ساتھ برے بول بھی معلوم ہونے چاہئیں۔

نھتو بھٹے سے واپس آ رہا تھا اور حسب معمول سر کھجاتا گاؤں کے کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا لالٹین کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ سر سے علیحدہ کیا۔ جس کی انگلیوں سے وہ بالوں کا ایک میل بھرا گچھا مروڑ رہا تھا وہ اپنے جھونپڑے کے تازہ لپے ہوئے چبوترے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ سامنے سے اسے کسی نے آواز دی۔

نھتو پلٹا اور اپنے سامنے والے جھونپڑے کی طرف بڑھا جہاں سے مادھو اسے اب ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔

جھونپڑے کے چھجے کے نیچے چبوترے پر مادھو، اس کا لنگڑا بھائی اور چودھری بیٹھے تھے ان کے انداز نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں سب کے چہرے کچی اینٹوں کی مانند پیلے تھے مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا ایک کونے میں طاقچے کے نیچے روپا کی ماں بیٹھی تھی غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

نھتو نے دور ہی سے معاملے کی نزاکت محسوس کی اور قدم تیز کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔

مادھو نے اشارے سے اس کو پاس بیٹھنے کو کہا نھتو بیٹھ گیا اور اس کا ایک ہاتھ

غیر ارادی طور پر اپنے بالوں کے اس گچھے کی طرف بڑھ گیا جس کی جڑیں کافی ہل چکی تھیں اب وہ ان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے بالکل تیار تھا۔

مادھو اس کو اپنے پاس بٹھا کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے کپکپاتے ہونٹ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن فوراً نہیں کہہ سکتا۔ مادھو کا لنگڑا بھائی بھی خاموش تھا اور بار بار اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے آخری ٹنڈ منڈ حصے پر جو گوشت کا ایک بدشکل لوتھڑا سا بنا ہوا تھا، ہاتھ پھیر رہا تھا، روپا کی ماں طاقچے میں رکھی ہوئی مورتی کی مانند گونگی بنی ہوئی تھی اور چودھری اپنی مونچھوں کو تاؤ دینا بھول کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔

نتھو نے خود ہی بات شروع کی "تو۔۔۔۔۔۔"

مادھو بولا "نتھو بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بات کیا ہے میں کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔۔۔۔ چودھری! تم ہی جی کڑا کر کے سارا قصہ سنا دو۔"

نتھو نے گردن اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولا اور زمین پر لکیریں بناتا رہا۔

دوپہر کی اداس فضا بالکل خاموش تھی، البتہ کبھی کبھی چیلوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور جھونپڑے کے داہنے ہاتھ گھورے پر جو مرغ کوڑے کو کرید رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی مرغ کو دیکھ کر بول اٹھتا۔

چند لمحوں تک جھونپڑے کے چھجے کے نیچے سب خاموش رہے اور نتھو معاملے کی نزاکت اچھی طرح سمجھ گیا۔

روپا کی ماں نے روتی آواز میں کہا ''میرے پھوٹے بھاگ! ۔۔۔۔۔اس کو تو جو کچھ اجڑ نا تھا اجڑی، مجھ ابھاگن کی ساری دنیا برباد ہو گئی ۔۔۔۔۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟''

مادھو نے کندھے ہلائے اور نتھو سے مخاطب ہو کر کہا ''کیا ہو سکتا ہے؟ بھئی میں یہ کلنک کا ٹیکا اپنے ماتھے پر لگانا نہیں چاہتا۔۔۔۔ میں نے جب اپنے لالو کی بات روپا سے پکی کی تھی تو مجھے یہ قصہ معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔ اب تم لوگ خود ہی وچار کرو کہ سب کچھ جانتے ہوئے میں اپنے بیٹے کا بیاہ روپا سے کیسے کر سکتا ہوں؟''

یہ سن کر نتھو کی گردن اٹھی، وہ شاید یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ لالو کا بیاہ روپا سے کیوں نہیں ہو سکتا ابھی کل تک سب ٹھیک ٹھاک تھا اب اتنی جلدی کیا ہو گیا کہ روپا لالو کے قابل نہیں رہی۔ وہ روپا اور لالو دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور سچ پوچھو تو گاؤں میں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے وہ کون سی بات تھی جو اسے ان دونوں کے بارے میں معلوم نہ تھی روپا اس کے سامنے پھولی پھلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اس کے گال پر ایک زور کا دھپا بھی مارا تھا اور اس کو اتنی مجال نہ ہوئی تھی کہ چوں بھی کرے حالانکہ گاؤں کی سب چھوکریاں چھوکرے گستاخ تھے اور بڑوں کا بالکل ادب نہ کرتے تھے روپا تو بڑی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ باتیں بھی بہت کم کرتی تھی اور اس کے چہرے پر کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ کوئی شرارت بھی کر سکتی ہے پھر آج اس کی بابت یہ باتیں کیوں ہو رہی تھیں۔

نتھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اس کے اندر رہنے والوں کا حال معلوم تھا

مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ چودھری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چنوا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا اور ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے۔۔۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو اپلوں پر پرسرام اور گنگو کی چخ چخ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور سالگ رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے حالانکہ وید جی نے منع کیا تھا کہ ان کو مرچوں والی کوئی شے نہ دی جائے۔۔۔ نھو حیران تھا کہ ایسی کون سی بات جو اسے معلوم نہیں تمام خیالات اس کے دماغ میں ایک دم آئے اور وہ مادھو کاکا سے اپنی حیرت دور کرنے کی خاطر سے کوئی سوال کرنے ہی والا تھا کہ چودھری نے زمین پر طوطے کی شکل کرتے ہوئے کہا ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ بچے کی ماں بن جائے گی''

تو یہ بات تھی کہ نھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں اس نے اپنے بال زیادہ تیزی سے مروڑنے شروع کر دیئے۔

مادھو کاکا نھو کی طرف جھکا اور بڑے دکھ بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا'' بیٹا! تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بات روپا سے پکی کی تھی اب میں تم سے کیا کہوں۔۔۔ ذرا کان لاؤ ادھر'' اس نے ہولے سے نھو کے کان میں کچھ کہا اور پھر اسی لہجے میں کہنے لگا'' کتنی شرم کی بات ہے میں تو کہیں کا نہ رہا، یہ میرا بڑھاپا اور یہ جان لیوا دکھ اور تو اور لالو کو بتاؤں کیا دکھ ہوا ہو گا۔۔۔ تمہیں

انصاف کرو کیا لالو کی شادی اب اس سے ہو سکتی ہے۔۔۔لالو کی شادی تو ایک طرف رہی، کیا ایسی لڑکی ہمارے گاؤں میں رہ سکتی ہے۔۔۔کیا اس کے لیے ہمارے یہاں کوئی جگہ ہے؟''

نھتو نے سارے گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اسے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں روپا اپنے والد سمیت رہ سکتی تھی۔ البتہ اس کا ایک جھونپڑا تھا۔ جس میں وہ چاہے کسی کو بھی رکھتا پچھلے برس اس نے کوڑھی کو اس میں پناہ دی تھی حالانکہ سارا گاؤں اسے روک رہا تھا اور اسے ڈرا رہا تھا کہ دیکھو نھتو یہ بیماری بڑی چھوت والی ہوتی ہے ایسا نہ ہو کہ کہیں تمہیں چمٹ جائے لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے من نے اچھا سمجھا کوڑھی اس کے گھر میں پورے چھ مہینے رہ کر مر گئی لیکن اسے بیماری ویماری بالکل نہ لگی اگر گاؤں میں روپا کے لیے کوئی جگہ نہ رہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ اسے ماری ماری پھرنے دیا جائے۔ ہرگز نہیں، نھتو اس بات کا قائل نہ تھا کہ دکھی پر اور دکھ لاد دیئے جائیں اس کے جھونپڑے میں ہر وقت اس کے لیے جگہ تھی۔

وہ چھ مہینے تک اس کوڑھی کی تیمارداری کر سکتا تھا اور روپا کوڑھی تو نہیں تھی۔۔۔۔۔۔کوڑھی تو نہیں تھی، یہ سوچتے ہوئے نھتو کا دماغ ایک گہری بات سوچنے لگا۔۔۔۔۔روپا کوڑھی نہیں تھی، اس لیے وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق بھی نہ تھی۔ اسے کیا روگ تھا؟۔۔۔کچھ بھی نہیں، جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے تھے، وہ تھوڑے ہی دنوں بچے کی ماں بننے والی تھی، پر یہ بھی کوئی روگ ہے اور کیا ماں بننا کوئی پاپ ہے؟ لڑکی عورت بننا چاہتی ہے اور عورت ماں، اس کی اپنی استری ماں

بننے کے لیے تڑپ رہی تھی اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ وہ جلدی ماں بن جائے، اس لحاظ سے بھی روپا کا ماں بننا کوئی جرم نہ تھا۔ جس پر اسے سزا دی جائے یا پھر اس رحم کا مستحق قرار دیا جائے وہ ایک کی بجائے دو بچے جنے۔ اس سے کسی کا کیا بگڑتا تھا وہ عورت ہی تو تھی مندر میں گڑی ہوئی دیوی تو تھی نہیں، اور پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے تھے مادھو کا کے لڑکے سے اس کی شادی ہوتی تو بھی کبھی نہ کبھی بچہ ضرور پیدا ہوتا۔ اب کون سی آفت آ گئی تھی یہ بچہ اب جو اس کے پیٹ میں تھا کہیں سے اڑ کر تو آ نہیں گیا تھا شادی بیاہ ضرور ہوا ہوگا، یہ لوگ باہر بیٹھے آپ ہی فیصلے کر رہے ہیں اور جس کی بابت فیصلہ ہو رہا ہے اس سے کچھ پوچھتے ہی نہیں، گویا بچہ وہ نہیں بلکہ یہ خود جن رہے ہیں عجیب بات تھی، اور پھر ان کو بچے کی کیا فکر پڑ گئی تھی، بچے کی فکر یا تو ماں کرتی ہے یا اس کا باپ۔۔۔۔باپ؟۔۔۔۔۔۔۔اور مزہ دیکھئے کہ کوئی بچے کے باپ کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے نتھو کے دماغ میں ایک بات آئی اور اس نے مادھو کا کا سے کہا ”کا کا! جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے مجھے بڑا دکھ ہوا پر تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ روپا کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔۔ہم سب اپنے اپنے جھونپڑوں کو تالے لگا دیں تو بھی اس کے لیے ایک دروازہ کھلا رہتا ہے۔“

چودھری نے زمین پر طوطے کی آنکھ بناتے ہوئے کہا ”توبہ کا!“

نتھو نے جواب دیا ”ان کے لیے جو پاپی ہوں۔۔۔۔۔۔روپا نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ وہ نردوش ہے۔“

چودھری نے حیرت سے مادھو کاکا کی طرف دیکھا اور کہا ''اس نے پوری بات نہیں سنی۔''

مادھو کا لنگڑا بھائی اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

نتھو روپا کی ماں سے مخاطب ہوا ''ابھی سن لیتا ہوں۔۔۔۔۔۔روپا کہاں ہے؟''

روپا کی ماں نے اپنی کھردری انگلیوں سے آنسو پونچھے اور کہا ''اندر بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہے۔''

یہ سن کر نتھو نے اپنا سر ایک بازو سے کھجایا اور اٹھ کر جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔

روپا اندھیری کوٹھری کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے میلے کچیلے کپڑوں میں اندھیرے کے اندر وہ گیلی مٹی کا ایک ڈھیر سا دکھائی دے رہی تھی جو باتیں باہر ہو رہی تھیں ان کا ایک ایک لفظ اس نے سنا تھا۔حالانکہ اس کے کان اس کے اپنے دل کی باتیں سننے میں لگے ہوئے تھے جو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔نتھو اندر آنے کے لیے اٹھا تو وہ دوڑ کر سامنے کھٹیا پر جا پڑی اور گدڑی میں اپنا سر منہ چھپا لیا۔

نتھو نے جب دیکھا کہ روپا چھپ گئی ہے تو اسے بڑی حیرت ہوئی اس نے پوچھا ''ارے مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟''

روپا رونے لگی اور اپنے آپ کو اور کپڑے میں لپیٹ لیا۔وہ بغیر آواز کے رو رہی تھی مگر نتھو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ روپا کے آنسو اس کے تپتے ہوئے دل پر گر

رہے ہیں اس نے گدڑی کے اس حصہ پر ہاتھ پھیرا جس کے نیچے روپا کا سر تھا اور کہا "تم مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟"

روپا نے سسکیوں سے جواب دیا "روپا نہیں چھپتی نتھو۔۔۔۔۔۔۔وہ اپنے پاپ کو چھپا رہی ہے۔"

نتھو اس کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا "کیسا پاپ۔۔۔۔۔تم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔۔۔اور اگر کیا بھی ہو تو اسے چھپانا چاہیے، یہ تو خود ایک پاپ ہے۔۔۔۔میں تم سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں مجھے یہ بتا دو کہ کس نے تمہاری ہنستی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے ہیں کس نے اس بالی عمر میں تمہیں پاپ اور پن کے جھگڑے میں پھنسا دیا ہے"

"میں کیا کہوں؟" روپا یہ کہہ کر گدڑی میں اور سمٹ گئی نتھو بولتا تھا اور روپا کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اسے اکٹھا کر رہا ہے اسے سکیڑ رہا ہے۔

نتھو نے بڑی مشکل سے روپا کے منہ سے کپڑا اٹھایا اور اسے اٹھا کر بٹھا دیا روپا نے دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو چھپا لیا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا اس سے نتھو کو بہت دکھ ہوا ایک تو پہلے اسے یہ چیز ستا رہی تھی کہ ساری بات اس کے ذہن میں مکمل طور پر نہیں آتی اور دوسرے روپا اس کے سامنے رو رہی تھی۔ اگر اسے ساری بات معلوم ہوتی تو وہ اس کے یہ سارے آنسو روکنے کی کوشش کر سکتا تھا جو میلی گدڑی میں جذب ہو رہے تھے مگر اس کو سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہ تھا کہ روپا تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اس نے پھر اس سے کہا "روما تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔۔۔۔۔نتھو بھیا

تم سے پوچھ رہا ہے اور وہ کوئی غیر تھوڑی ہے، جو تم یوں اپنے من کو چھپا رہی ہو۔۔۔تم روتی کیوں ہو غلطی ہو ہی جایا کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ا لو کی کسی اور سے شادی ہو جائے گی اور تم اپنی جگہ خوش رہو گی۔۔۔تمہیں دنیا کا ڈر ہے تو میں کہوں گا کہ تم بالکل بیوقوف ہو، لوگوں کے جو جی میں آئے کہیں، تمہیں اس سے کیا۔۔۔۔۔۔۔غلطی کر کے اپنے آپ کو دوسروں کے حوالے کر دینا تو میری سمجھ میں سب سے بڑی غلطی ہے۔۔۔۔۔جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس کے آگے کیا ہو گا۔۔۔۔۔۔تم دوسروں کی بابت نہ سوچو، اپنی فکر کرو، سب سے زیادہ ضروری چیز اس وقت تم ہو اور سچ پوچھو تو اپنی ذات ہی ہمیشہ سب سے ضروری ہوتی ہے۔۔۔۔۔رونے دھونے سے کچھ نہ ہو گا روپا، آنسو بھری آنکھوں سے نہ تم مجھے ہی ٹھیک طور سے دیکھ سکتی ہو اور اپنے آپ کو۔۔۔۔رونا بند کرو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔"

روپا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے، وہ دل میں سوچتی تھی کہ اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جو دنیا کو معلوم نہیں یہی سوچتے ہوئے اس نے نھو سے کہا "نھو بھیا! مجھ سے زیادہ تو دوسروں کو معلوم ہے میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ میں سوچتی تھی ایک سپنا تھا، یوں تو ہر چیز سپنا ہوتی تھی، پر یہ سپنا بڑا ہی عجیب ہے کیسے شروع ہوا کیونکر ختم ہوا۔ اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دن جو میں کبھی خوشی سے گزارتی تھی آنکھوں میں آنسو بننا شروع ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔میں گھڑا لے کر اچھلتی، کودتی، گاتی کنوئیں پر پانی بھرنے گئی پانی بھر کر جب واپس آنے لگی تو ٹھوکر لگی اور گھڑا اچکنا چور ہو گیا، مجھے بڑا دکھ ہوا، میں

نے چاہا کہ اس ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے اٹھا کر جھولی میں بھر لوں پر لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا نقصان میرا ہوا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ مجھ سے ہمدردی کرتے، پر انہوں نے الٹا مجھے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گویا گھڑا ان کا تھا اور توڑنے والی میں تھی اور اس روڑے کا کوئی قصور ہی نہ تھا جو راستے میں پڑا تھا اور جس سے دوسرے بھی ٹھوکر کھا سکتے تھے۔۔۔۔۔۔تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو، مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔"

نھو کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں کا گچھا مروڑنے لگیں اس نے بڑے اضطراب سے کہا "میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ وہ ہے کون؟"

"کون؟"

"وہی۔۔۔۔۔۔وہی۔۔" نھو اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا

روپا کے سینے سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی "وہ پہلے جتنا نزدیک اب اتنا ہی دور ہے۔"

"میں اس کا نام پوچھتا ہوں۔۔۔۔۔اور جانتی ہو میں تم سے اس کا نام کیوں پوچھتا ہوں؟۔۔۔۔۔اس لیے کہ وہ تمہارا پتی ہے۔۔۔۔۔۔اور تم اس کی پتنی ہو۔۔۔۔۔تم اس کی ہو اور وہ تمہارا۔۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔"

نھو اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ روپا نے دیوانہ وار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھٹے ہوئے لہجہ میں کہا "ہولے ہولے بولو نھو ہولے ہولے بولو، کہیں وہ۔۔۔۔۔جو میرے ہردے میں نیا جیو ہے نہ سن لے کہ اس کی ماں پاپن ہے۔۔۔۔۔نھو اسی ڈر کے مارے تو میں سوچتی نہیں زیادہ غم نہیں کرتی کہ اس کو

کچھ معلوم نہ ہو۔۔۔۔۔۔ پر بیٹھے بیٹھے کبھی میرے من میں آتا ہے کہ میں ڈوب مروں اپنا گلا گھونٹ لوں، یا زہر کھا کے مر جاؤں۔"

نھتو نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا وہ سوچ رہا تھا ایک دو سیکنڈ غور کرنے کے بعد اس نے کہا "کبھی نہیں۔۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، تم کیوں مرو۔ یوں تو موت سے چھٹکارا نہیں، سب کو ایک دن مرنا ہے پر اسی لیے تو جینا بھی ضروری ہے۔۔۔۔ میں پڑھا لکھا نہیں، میں کوئی پنڈت نہیں، پر جو پچھ میں نے کہا ہے ٹھیک ہے تم مجھے اس کا نام بتا دو۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا اور اسے مجبور کروں گا کہ وہ تمہارے ساتھ بیاہ کر لے اور تمہیں اپنے پاس رکھے۔۔۔۔۔۔ وہی تمہارا پتی ہے"

نھتو پھر روپا کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا "لو میرے کان میں کہہ دو۔۔۔۔۔ وہ کون ہے؟۔۔۔۔۔ روپا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں گا"

روپا نے جواب دیا "تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو نھتو! پر جس آدمی کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو کیا وہ بھی کچھ کرے گا؟۔۔۔۔۔ وہ تو مجھے بھول ہی چکا ہو گا"

نھتو نے کہا "تمہیں دیکھتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔۔۔۔ باقی چیزوں کی یاد اسے میں دلاؤں گا۔۔۔۔۔ تم مجھے اس کا نام تو بتاؤ۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ استری اپنے پتی کا نام نہیں لیتی، پر ایسے موقع پر تمہیں کوئی لاج نہ آنی چاہیے۔"

روپا خاموش رہی، اس پر نھو اور زیادہ مضطرب ہو گیا ”میں تمہیں ایک سیدھی بات سمجھاتا ہوں اور تم سمجھتی ہی نہیں ہو، پگلی! جو تمہارے بچے کا باپ ہے وہی تمہارا پتی ہے۔۔۔اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں تم بس آنسو بہائے جاتی ہو، کچھ سنتی ہی نہیں ہو۔۔۔۔۔میں پوچھتا ہوں اس کا نام بتانے میں ہرج ہی کیا ہے۔۔۔۔لو، تم نے تو اور رونا شروع کر دیا ہے اچھا بھئی ہیں زیادہ باتیں نہیں کرتا، تم یہ بتاؤ کہ وہ ہے کون۔۔۔۔تم مان لو میں اس کا کان پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آؤں گا۔“

روپا نے سسکیوں میں کہا ”تم بار بار پتی نہ کہو نھو۔۔۔۔۔میری جوانی، میری آشا، میری دنیا، کبھی کی ودھوا ہو چکی ہے۔۔۔۔تم میری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ سارے بال ہی نوچ ڈالوں۔۔۔۔۔۔نھو اب کچھ نہیں ہو سکے گا۔۔۔میری جھولی کے بیر زمین پر گر کر۔۔۔۔سب کے سب موری میں جا پڑے ہیں۔ اب انہیں باہر نکالنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔۔اس کا نام پوچھ کر تم کیا کرو گے۔۔۔لوگ تو اب میرا نام بھول جانا چاہتے ہیں۔“

نھو تنگ آ گیا اور تیز لہجے میں کہنے لگا ”تم۔۔۔۔۔تم بیوقوف ہو۔۔۔۔میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا“

وہ اٹھ کر جانے لگا تو روپا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا ایسا کرتے ہوئے اس کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا۔

نھو نے اس کی گیلی آنکھوں کی طرف دیکھا ”بولو؟“

روپا بولی ”نھو بھیا! مجھے مارو مجھے خوب پیٹو، شاید میں اس طرح اس کا نام بتا

دوں۔۔۔۔تمہیں یاد ہوگا ایک بار میں نے بچپن میں مندر کے ایک پیڑ سے کچے آم توڑے تھے اور تم نے ایک ہی چانٹا مار کر مجھ سے سچی بات کہلوائی تھی۔۔۔آؤ مجھے مارو یہ چور جسے میں نے اپنے من میں پناہ دے رکھی ہے بغیر مار کے باہر نہیں نکلے گا۔''

نتھو خاموش رہا۔ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا پھر ایکا ایکی اس نے روپا کے پیلے گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ چھت کے چند سوکھے اور گرد سے اٹے ہوئے تنکے دھمک کے مارے نیچے گر پڑے نتھو کی سخت انگلیوں نے روپا کے گال پر کئی نہریں کھود دیں

نتھو نے گرج کر پوچھا ''بتا وہ کون ہے؟''

جھونپڑے کے باہر مادھو کے لنگڑے بھائی کی آدھی ٹانگ کانپی، چودھری جس تنکے سے زمین پر ایک اور طوطے کی شکل بنا رہا تھا ہاتھ کانپنے کے باعث دوہرا ہو گیا۔ مادھو کاکا نے کلنگ کی طرح اپنی گردن اونچی کر کے جھونپڑے کے اندر دیکھا۔

اندر سے نتھو کی خشم آلود آواز آ رہی تھی مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھو کاکا، چودھری اور لنگڑے کیشو نے آپس میں کئی باتیں کیں آخر میں مادھو کاکا، کا بھائی بیساکھی ٹیک کر اٹھا۔وہ جھونپڑے میں جانے ہی والا تھا کہ نتھو باہر نکلا کیشو ایک طرف ہٹ گیا نتھو نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور کہا ''آؤ روپا! پھر اس نے روپا کی ماں سے کہا''ماں تم بالکل چنتا نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔

کسی نے نتھو سے یہ نہ پوچھا کہ وہ روپا کو لے کر کدھر جا رہا ہے مادھو کا کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ نتھو اور روپا دونوں چبوترے سے اتر کر موری کے اس پار جا چکے تھے چنانچہ وہ اپنی مونچھ کے سفید بال نوچنے میں مصروف ہو گیا اور چودھری کبڑے تنکے کو سیدھا کرنے لگا۔

بھٹے کے مالک لالہ گنیش داس کا لڑکا ستیش جسے بھٹے کے مزدور چھوٹے لالہ جی کہا کرتے تھے اپنے کمرے میں اکیلا چائے پی رہا تھا پاس ہی تپائی پر ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی جسے غالباً وہ پڑھ رہا تھا کتاب کی جلد کی طرح اس کا چہرہ بھی جذبات سے خالی تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر غلاف چڑھا رکھا ہے وہ ہر روز اپنے اندر ایک نیا ستیش پاتا تھا وہ جاڑے اور گرمیوں کے درمیانی موسم کی طرح متغیر تھا۔ وہ گرم اور سرد لہروں کا ایک مجموعہ تھا دوسرے دماغ سے سوچتے تھے لیکن وہ ہاتھوں اور پیروں سے سوچتا تھا وہ اپنی عمر کی ان منزلوں کو طے کر رہا تھا جہاں ہر شے کھیل نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کو گیند کی مانند اچھال رہا تھا وہ سمجھتا تھا کہ اچھل کود ہی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کو مسلنے سے بہت زیادہ مزہ آتا ہے ہر شے کو وہ مسل کر دیکھتا تھا۔

عورتوں کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اس کو عورت جوان ملنی چاہیے عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری خیال کرتا تھا جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بنے ہوئے جال کے اندر تناؤ کو وہ اپنے دوستوں کو کہا کرتا تھا زندگی کے ساز کا ہر تار ہر وقت تنا ہوا ہونا چاہیے تاکہ ذرا سی جنبش پر بھی وہ لرزنا شروع کر دے

یہ لرزش، یہ کپکپاہٹ جس سے ستیش کو اس قدر پیار تھا دراصل اس کے گندے خون کے کھولاؤ کا نتیجہ تھی جنسی خواہشات اس کے اندر اس قدر زیادہ ہو گئی تھیں کہ جوان حیوانوں کو دیکھ کر بھی اسے لذت محسوس ہوتی تھی وہ جب اپنی گھوڑی کے جوان بچے کے کپکپاتے ہوئے بھورے بدن کو دیکھتا تو اسے نا قابل بیان مسرت حاصل ہوتی تھی اس کو دیکھ کر کئی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنا بدن اس کے تروتازہ بدن کے ساتھ گھسے۔

ستیش چائے پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چائے دانی کی تعریف کر رہا تھا جو بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی ستیش کو داغ پسند نہیں تھے وہ ہر شے میں ہمواری پسند کرتا تھا، صاف بدن عورتوں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتا تھا میری نگاہیں اس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں۔۔۔۔۔وہ کس قدر ہموار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل ہے۔

یہ کمرہ جس میں اس وقت ستیش بیٹھا تھا۔ خاص طور پر اس کے لیے بنوایا گیا تھا کمرے کے سامنے ٹینس کورٹ تھا یہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیلتا تھا آج اس نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹینس کھیلنے نہیں آئے گا کیونکہ اسے آج ایک دلچسپ کھیل کھیلنا تھا بھنگی کی جوان لڑکی جس کے متعلق اس نے ایک روز اپنے دوست سے یہ کہا تھا ''تم اسے دیکھو۔۔۔۔سچ کہتا ہوں تمہاری نگاہیں اس کے چہرے پر سے پھسل پھسل جائیں گی میری نگاہیں اس کو دیکھنے سے پہلے اس کے کھردرے بالوں کو تھام لیتی ہیں تاکہ پھسل نہ جائیں۔۔۔۔۔'' آج ایک مدت کے بعد ٹینس کورٹ میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے آ رہی تھی۔

وہ چائے پی رہا تھا اور اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں اس جوان لڑکی کے سانولے رنگ کا عکس پڑ رہا ہے۔

اس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا ہر سو کھے پتے کھڑکے تو ستیش نے پیالی میں سے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔۔۔۔

ایک لمبا سا سایہ ٹینس کورٹ کے جھاڑو دیتے ہوئے سینے پر متحرک ہوا اور لڑکی کے بجائے نتھو نمودار ہوا۔

ستیش نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ آنے والا ایک بھٹے کا مزدور ہے نتھو اپنے سر کے بالوں کا ایک گچھا انگلیوں سے مروڑ رہا تھا اور ٹینس کورٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ستیش کی کرسی برآمدے میں بچھی تھی۔ پاس پہنچ کر نتھو کھڑا ہو گیا اور ستیش کی طرف یوں دیکھنے لگا گویا چھوٹے لالہ جی کو اس کی آمد کی غرض و غایت اچھی طرح معلوم ہے۔

ستیش نے پوچھا ''کیا ہے؟''

نتھو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ''چھوٹے لالہ جی! میں اسے لے کر آیا ہوں اب آپ اسے اپنے پاس رکھ لیجئے، گاؤں والے اسے بہت تنگ کر رہے ہیں''

ستیش حیران ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نتھو کیا کہہ رہا ہے اس نے پوچھا'' کسے؟۔۔۔۔ کسے تنگ کر رہے ہیں''

نتھو نے جواب دیا'' آپ۔۔۔۔آپ ۔۔۔۔۔کی رو پا کو۔۔۔آپ کی چٹنی کو''

''میری پتنی!'' ستیش چکرا گیا ''میری پتنی۔۔۔۔تیرا دماغ تو نہیں بہک گیا۔۔۔یہ کیا بک رہا ہے۔۔۔۔'' یہ کہتے ہی اس کے اندر۔۔۔بہت اندر روپا کا خیال پیدا ہوا اور اسے یاد آیا کہ پہلے ساون میں وہ ایک موٹی موٹی آنکھوں اور گدرائے ہوئے جسم والی ایک لڑکی سے کچھ دنوں کھیلا تھا۔ وہ دودھ لے کر شہر میں جایا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے دودھ کی بوندیں اس کے ابھرتے ہوئے سینے پر ٹپکتی دیکھی تھیں اور۔۔۔۔۔۔ہاں ہاں یہ روپا وہی لڑکی تھی، جس کے بارے میں اس نے ایک بار یہ خیال کیا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ ملائم ہے اس کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ یہ اینٹیں بنانے والے ایسی نرم و نازک لڑکیاں کیسے پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بھنگی کی لڑکی کو بھول سکتا تھا سوشیلا کو فراموش کر سکتا تھا جو ہر روز اس کے ساتھ کھیلتی تھی وہ ہسپتال کی نرس کو بھول سکتا تھا۔ جس کے سفید کپڑوں کا وہ بہت معترف تھا وہ اس۔۔۔۔۔لیکن وہ روپا کو نہیں بھول سکتا تھا اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دوسری یا تیسری ملاقات پر جبکہ روپا نے آپنا آپ اس کے حوالے کر دیا تھا تو اس کی ایک بات پر اسے بہت ہنسی آتی تھی، روپا نے اس سے کہا تھا چھوٹے لالہ جی! کل سندری چمارن کہہ رہی تھی '' جلدی جلدی بیاہ کر لے ری بڑا مزہ آتا ہے۔۔۔۔۔اسے کیا پتہ کہ میں بیاہ کر بھی چکی ہوں'' مگر روپا تھی کہاں؟ ستیش کی حیوانی حس اس کا نام سنتے ہی بیدار ہو چکی تھی گو ستیش کا دماغ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا مگر اس کا جسم صرف اپنی دلچسپی کی طرف متوجہ تھا۔

ستیش نے پوچھا ''کہاں ہے روپا؟''

نتھو اٹھ کھڑا ہوا ''باہر کھڑی ہے۔۔۔۔۔میں ابھی اسے لاتا ہوں''

ستیش نے فوراً ہی رعب دار لہجے میں کہا ''خبردار جو اسے تو یہاں لایا۔۔۔۔جا بھاگ جا یہاں سے۔''

''پر۔۔۔۔پر۔۔۔۔۔۔چھوٹے لالہ جی وہ۔۔۔۔۔۔وہ آپ کی پتنی ہو چکی ہے۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔بچے کی ماں بننے والی ہے اور بچہ آپ ہی کا تو ہو گا۔۔۔۔آپ ہی کا تو ہوگا'' نتھو نے تتلاتے ہوئے کہا۔

تو روپا حاملہ ہو چکی تھی۔۔۔۔ستیش کو قدرت کی یہ ستم کاری سخت ناپسند تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ حمل کا سلسلہ کیوں جوڑ دیا گیا ہے مرد جب کسی عورت کی خاص خوبی کا معترف ہوتا ہے تو اس کی سزا بچے کی شکل میں کیوں طرفین کو بھگتنا پڑتی ہے۔۔۔۔۔۔روپا بچے کے بغیر کتنی اچھی تھی اور وہ اس بچے کے بغیر کتنے اچھے طریقے پر، روپا کے ساتھ تعلقات قائم رکھ سکتا تھا اس سلسلہ تولید کی وجہ سے کئی بار اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ عورت ایک بے کار شے ہے یعنی ہاتھ لگاؤ اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ بھی کوئی بات ہے اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس بچے کا کیا کرے جو پیدا ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر غور کر کے اس نے نتھو کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے آرام سے کہا۔

''تم روپا کے کیا لگتے ہو۔۔۔۔خیر چھوڑو اس قصے کو۔۔۔۔دیکھو، یہ بچے وچے کی بات مجھے یہ پسند نہیں مفت میں ہم دونوں بدنام ہو جائیں گے تم ایسا کرو، روپا کو یہاں چھوڑ جاؤ۔۔۔۔میں اسے آج ہی کسی ایسی جگہ بھجوا دوں گا۔ جہاں یہ بچہ ضائع کر دیا جائے۔۔۔۔اور روپا کو میں کچھ روپے دے دوں گا وہ خوش ہو جائے گی۔۔۔۔تمہارا انعام بھی تمہیں مل جائے گا۔۔۔۔ٹھہرو''

یہ کہہ کر ستیش نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا اور دس روپے کا نوٹ نتھو کے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ رہا تمہارا انعام۔۔۔۔جاؤ عیش کرو"

نتھو چپکے سے اٹھا دس روپے کا نوٹ اس نے اچھی طرح مٹھی میں دبا لیا اور وہاں سے چل دیا ستیش نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو چھٹی ہوئی اب وہ بھنگی کی لڑکی کی بابت سوچنے لگا کہ اگر اسے بھی۔۔۔۔مگر یہ کیا نتھو روپا کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

روپا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے اسے بہت تکلف ہو رہی تھی ستیش نے سوچا "یہ بچہ پیدا کرنا بھی ایک اچھی خاصی مصیبت معلوم ہوتی ہے"

نتھو اور روپا دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو گئے ستیش نے روپا کی طرف دیکھے بغیر کہا "دیکھو روپا! میں نے۔۔۔۔اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔سمجھیں۔۔۔۔کیوں بھئی تم نے اسے سب کچھ بتا دیا؟"

نتھو نے دس روپے کا نوٹ خاموشی سے ستیش کی طرف بڑھا دیا اور کہا "چھوٹے لالہ جی! کاغذ کے اس ٹکڑے سے آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں میں تو ایک بہت بڑا سودا کرنے آیا تھا"

ستیش نے سمجھا کہ نتھو شاید دس روپے سے زیادہ مانگتا ہے "کتنے روپے چاہئیں تجھے۔۔۔۔میرے پاس اس وقت پچاس ہیں، لینا ہوں تو لے جاؤ"

نتھو نے روپا کی طرف دیکھا روپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سیمنٹ سے لپی

ہوئی سیڑھیوں پر ٹپک رہے تھے اس کے دل پر یہ قطرے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گر رہے تھے۔ ستیش کی طرف اس نے مڑ کر کہا ''چھوٹے لالہ جی! یہ آپ کی پتنی ہے آپ اس کے بچے کے باپ ہیں۔۔۔ جیسے بڑے لالہ جی آپ کے پتا ہیں۔۔۔۔۔ روپا کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ہے، وہ آپ کے پاس رہے گی اور آپ اسے پتنی بنا کر رکھیں گے۔۔۔۔ سب گاؤں والے اسے دھتکار رہے ہیں، کس لیے۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ آپ کا بچہ اپنے پیٹ میں لیے لیے پھرتی ہے۔۔۔۔ آپ کو تھامنا پڑے گا اس لڑکی کا ہاتھ جس نے آپ کو اپنا سب کچھ دے دیا۔۔۔۔ آپ کا دل پتھر کا نہیں ہے چھوٹے لالہ جی! اور اس چھوکری کا دل بھی پتھر نہیں ہے۔۔۔۔۔ آپ نے اس کو سہارا نہ دیا تو اور کون دے گا یہ آتی نہیں تھی رو رو کے اپنی جان ہلکان کر رہی تھی میں نے اسے سمجھایا اور کہا پگلی تو کیوں روتی ہے تیرا پتی جیتا ہے چل میں تجھے اس کے پاس لے چلوں''

ستیش کو پتی پتنی کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آتا تھا ''دیکھو بھائی! زیادہ بکواس نہ کرو تم یوں ڈرا دھمکا کر مجھ سے زیادہ روپیہ وصول نہیں کر سکتے۔ میں ایک سو روپیہ دینے پر راضی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ بچہ ضائع کر دیا جائے اور تم جو مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں بسا لوں تو یہ ناممکن ہے۔۔۔ میں اس کا پتی خواب میں بھی نہیں بنا اور نہ یہ میری کبھی پتنی بنی ہے۔۔۔۔۔ سمجھے؟ سو روپیہ لینا ہو تو کل آ کے یہاں سے لے جانا اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔''

نتھو بھنا گیا

''اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔ یہ بچہ کیا آسمان سے آ گیا ہے؟۔۔۔۔۔ اس کی

آنکھوں میں آنسو بھوت پریتوں نے بھر دیئے ہیں۔۔۔۔ میرا دل۔۔۔۔ میرا دل کون مسل رہا ہے۔۔۔ یہ روپے۔۔۔۔ یہ سو روپے کیا آپ خیرات کے طور پر دے رہے ہیں۔۔۔۔ کچھ ہوا ہے تو سب کچھ ہو رہا ہے۔۔۔۔ کوئی بات ہے تو یہ ہلچل مچ رہی ہے۔۔۔ آپ اس کے بچے کے باپ ہیں تو کیا اس کے پتی نہیں؟۔۔۔۔۔ میری عقل کو کچھ ہو گیا ہے یا آپ کی سمجھ کو۔۔۔۔"

ستیش یہ تقریر برداشت نہ کر سکا "الو کے پٹھے! تو جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے، کھڑا اپنی منطق چھانٹ رہا ہے، جا جو کچھ کرنا ہے کر لے۔۔۔ دیکھوں تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔"

نتھو نے ہولے سے کہا "میں تو سنوارنے آیا تھا چھوٹے لالہ جی۔۔۔۔ آپ ناحق کیوں بگڑ رہے ہیں آپ کیوں نہیں اس کا ہاتھ تھام لیتے یہ آپ کی پتنی ہے۔"

"پتنی کے بچے، اب تو اپنی بکواس بند کرے گا یا نہیں۔۔۔۔۔۔ بچہ بچہ کیا بک رہا ہے۔۔۔ جا لے جا اپنی اس کچھ لگتی کو، ورنہ یاد رکھ، کھال ادھیڑ دوں گا۔"

نتھو کے سب پٹھے اکڑ گئے "بھگوان کی قسم، مجھ میں اتنی شکتی ہے کہ یوں ہاتھوں میں دبا کر تیرا سارا لہو نچوڑ دوں۔۔۔ میری کھال تیرے ان نازک ہاتھوں سے ادھڑے گی۔۔۔ میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔ پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔ میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا۔۔۔۔۔۔ تو روپا کے بچے کا باپ ہے، تو روپا کا پتی ہے اگر میں نے تجھ پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ روپا کے دل کو دھکا لگے گا۔۔۔۔ تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں

رکھتا۔"

ستیش آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے لگا" تیری اور تیری روپا کی ایسی تیسی۔۔۔۔۔نکل یہاں سے باہر"

نتھو بڑھ کر روپا کے آگے کھڑا ہو گیا اور ستیش کے پاس۔۔۔۔۔۔بالکل پاس جا کر کہنے لگا" چھوٹے لالہ جی مجھے معاف کر دیجیے میں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں۔۔۔۔۔مجھے معاف کر دیجیے مگر روپا کا ہاتھ تھام لیجیے۔۔۔۔۔آپ اس کے پتی ہیں، اس کے بھاگ میں آپ کے بنا اور کوئی مرد نہیں لکھا گیا یہ آپ کی ہے۔۔۔اب آپ اسے اپنا لیں۔۔۔یہ دیکھیے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں"

"کیسے واہیات آدمی سے واسطہ پڑا ہے" ستیش نے کمرے کے اندر جاتے ہوئے کہا" کہتا ہوں میں روپو وپا کو نہیں جانتا مگر یہ خواہ مخواہ سے میرے پلے باندھ رہا ہے۔۔۔۔جاؤ جا و ہوش کی دوا کرو"

کمرے کا صرف دروازہ کھلا تھا جس میں سے ستیش اندر داخل ہوا تھا اندر داخل ہو کر اس نے یہ دروازہ بند کر دیا نتھو نے دروازے کی لکڑی کی طرف دیکھا تو اسے ستیش کے چہرے اور اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

نتھو نے اپنے سر کے بال مروڑنے شروع کیے اور جب پلٹ کر اس نے روپا سے کچھ کہنا چاہا تو وہ جا چکی تھی۔۔۔۔وہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھاگا مگر وہ جا چکی تھی باہر نکل کر اس نے روپا کو بہت دور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا وہ اس کے پیچھے یہ کہتا ہوا بھاگا" روپا۔۔۔روپا ٹھہر جا۔۔۔۔میں ایک بار

پھر اسے سمجھاؤں گا۔۔۔وہی تیرا پتی ہے۔۔۔اس کا گھر ہی تیری اصل جگہ ہے۔''

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا مگر روپا بہت دور نکل گئی تھی۔۔۔اس روز سے آج تک نتھو، روپا کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر وہ اسے نہیں ملتی وہ لوگوں سے کہتا ہے

''میں روپا کے پتی کو جانتا ہوں۔۔۔۔تم اسے ڈھونڈ کر لا دو میں اسے اس کے پتی سے ملاؤں گا''

لوگ یہ سن کر ہنس دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔بچے جب بھی نتھو کو دیکھتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں ''اس کا پتی کون ہے نتھو بھیا!'' تو نتھو ان کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اللہ دتا

دو بھائی تھے اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے ان کے آباؤ اجداد البتہ لاہور کے تھے مگر جب ان دو بھائیوں کا دادا ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا تو وہیں کا ہو رہا۔

اللہ رکھا اور اللہ دتا دونوں سرکاری ملازم تھے ایک چیف سیکرٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا، دوسرا کنٹرولر آف سٹورز کے دفتر کا چپراسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تا کہ خرچ کم ہو بڑی اچھی گزر رہی تھی ایک طرف اللہ رکھا جو بڑا تھا، اور کبھی کبھی کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن وسکون درہم برہم نہ ہو۔

دونوں شادی شدہ تھے اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی دوسری جس کا نام صغریٰ تھا، تیرہ برس کی تھی اور پرائمری سکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی ۔۔۔۔۔۔ زینب ۔۔۔۔۔ اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں کوئی اتنی خوش نہیں تھی اس لیے کہ اس کا خاوند اوباش تھا پھر بھی وہ جوں توں نبھائے جا رہی تھی۔

زینب اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے

میں کام سیکھ رہا تھا لڑکا ذہین تھا چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار اسے مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنتی اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔۔۔۔۔انہوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ ایکا ایکی ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے دونوں بھائیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور عزت آبرو پر حملہ ہوگا اور انہیں نہایت افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں ریاست پٹیالہ چھوڑنا پڑے گی۔۔۔۔مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونیں طوفان میں کون سا درخت گرا۔کون سے درخت کی کون سی ٹہنی ٹوٹی۔۔۔۔جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقتیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔

اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔

اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا اس کی لڑکی زینب۔۔۔۔۔کا بدچلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونا دھونا بیکار تھا۔صبر شکر کر کے بیٹھ رہے۔۔۔پہلے تو کیمپوں میں گلتے سڑتے رہے پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کیے آخر خدا نے سن لی اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا شکستہ مکان سر چھپانے کو مل گیا طفیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔

اللہ رکھا لاہور ہی میں دیر تک دربدر پھرتا رہا جوان لڑکی ساتھ تھی گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا تھا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پٹیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر ے تک سنائی آدمی رحم دل تھا اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انہوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لیے دلوا دیا۔

اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا صغریٰ بڑی سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ادھر ادھر سے لکڑیاں چن کر لاتی چولہا سلگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے لیے پورا ہو جائے آٹا گوندھتی پاس ہی تنور تھا وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔

تنہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔طرح طرح کے خیالات آتے ہیں صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تا کہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس

کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔

زندگی افتاں وخیزاں گزر رہی تھی ادھر گوجرانوالہ میں اللہ دتا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیونکہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھی مل ملا کے کوئی ایک سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لیے بہت کافی تھے۔

مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، نچلی منزل میں زینب اور اس کا باپ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دتا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کر وہ صحن میں جھاڑو دے کر چولہا سلگا دیتا تھا کہ زینب کا کام کچھ ہلکا ہو جائے وقت ملتا تو وہ دو تین گھڑے بھر کر گھڑونجی پر رکھ دیتا تھا۔

زینب نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں وہ خوش تھی اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔۔۔ طفیل کے سامنے بھی اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغریٰ اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی۔۔۔۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی اس لیے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا نہیں۔۔۔ صرف احترام کے لیے۔۔۔ اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی ''یا پروردگار۔۔۔ میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے''

بعض اوقات کئی دعائیں الٹی ثابت ہوتی ہیں جو خدا کو منظور تھا، وہی ہونا تھا

غریب صغریٰ کے سر پر غم واندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹا تھا۔

جون کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تپتی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لو لگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا ہسپتال پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔

صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہوگئی اس نے قریب قریب اپنے آدھے بال نوچ ڈالے کہ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا۔ مگر یہ کارگر کیسے ہوتا۔۔۔ وہ ایسی کشتی کے مانند تھی جس کا بادبان ہو نہ کوئی چپوار اور بیچ منجھدار کے آن پھنسی ہو۔

پٹیالے کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی فرشتہ رحمت ثابت ہوئے ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے آئے سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال جا کر انہوں نے اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس کو دفنا آئیں۔

اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی بہر حال وہ لاہور آیا اور پوچھتا پاچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی اس نے اپنی بھتیجی کو بہت دم دلاسا دیا بہلایا سینے کے ساتھ لگایا پیار کیا، دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا، بہادر بننے کو کہا، مگر صغریٰ کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔

اللہ دتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں

میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دبی رہے گی مرحوم کی تجہیز و تکفین کا آپ نے بندوبست کیا پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی ۔۔۔۔خدا آپ کو اس کا اجر دے۔۔اب میں اسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے۔''

افسر صاحب نے کہا''ٹھیک ہے۔۔۔۔۔لیکن تم ابھی اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو۔۔۔۔۔طبیعت سنبھل جائے تو لے جانا''

اللہ دتا نے کہا''حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلدی!''

افسر صاحب بہت خوش ہوئے''بڑا نیک ارادہ ہے۔۔۔۔۔لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو اس کا اسی گھر میں رہنا مناسب نہیں تم شادی کا بندوبست کرو مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بات درست تھی اللہ دتا واپس گوجرانوالہ چلا گیا زینب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اداس ہو گئی تھی جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی

اللہ دتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا''ارے بابا، آنا جانا، کیا ہے۔۔۔۔۔قبر پر فاتحہ پڑھنی تھی صغریٰ سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا''

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی''صغریٰ کو یہاں لانا تھا'' ایک دم چونک کر''ہاں۔۔۔۔صغریٰ کو یہاں لانا تھا پر وہ کہاں ہے؟''

''وہیں ہے۔۔۔۔۔پٹیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں ان کے پاس ہے انہوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کر لوگے تو لے جانا'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔

زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ''اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو؟۔۔۔کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟''

اللہ دتا نے زور کا کش لیا ''ارے بھئی، اپنا طفیل۔۔۔۔۔۔۔۔میرے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے۔۔۔میں اسے کیا غیروں کے حوالے کر دوں گا''

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری ''تو صغریٰ کی شادی طفیل سے کرو گے؟''

اللہ دتا نے جواب دیا ''ہاں۔۔۔۔کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

زینب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا ''ہاں۔۔۔۔۔اور تم جانتے ہو کیوں ہے۔۔۔یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی؟''

اللہ دتا مسکرایا زینب کی ٹھوڑی پکڑ کا س نے اس کا منہ چوما ''پگلی۔۔۔۔۔۔ہر بات پر شک کرتی ہے۔۔۔اور باتوں کو چھوڑ، آخر میں تمہارا باپ ہوں''

زینب نے بڑے زور سے ''ہونہہ'' کی ''باپ!'' اور اندر کمرے میں جا کر رونے لگی

اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پچکارنے لگا

دن گزر گئے طفیل فرمانبردار لڑکا تھا جب اس کے باپ نے صغریٰ کی بات کی تو وہ فوراً مان گیا آخر تین چار مہینے کے بعد تاریخ مقرر ہو گئی۔۔۔۔افسر صاحب نے فوراً صغریٰ کے لیے ایک بہت اچھا جوڑا سلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا

ایک انگوٹھی بھی لے دی پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لیے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔

صغریٰ کو قریب قریب سبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انہوں نے مل ملا کر اس کے لیے بڑا اچھا جہیز تیار کر دیا۔

صغریٰ دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو پیٹ رہے ہیں بہر حال وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک کبھی نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔

صغریٰ کا اندیشہ درست تھا اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہیں پائی تھی کہ زینب نے اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کر دیئے، جھاڑو دیتی، برتن وہ مانجھتی، چولہا وہ جھونکتی، پانی وہ بھرتی یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی بات بات پر اس کو ڈانٹتی، ڈپٹتی، جھڑکتی رہتی۔

صغریٰ نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے گی کیونکہ اگر اسے یہاں سے دھکا مل گیا تو اس کے لیے اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے برا نہیں تھا زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھی وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں

جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا۔ اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہتا ''صغریٰ تم بڑی پیاری ہو!''

صغریٰ جھینپ جاتی دراصل وہ اتنے پر جوش پیار کی عادی نہیں تھی اس کا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تھا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا ''خدا میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے''

صغریٰ، طفیل سے بہت خوش تھی وہ بڑا اچھا خاوند تھا جو کماتا تھا اس کے حوالے کر دیتا تھا، مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی تھی اس لیے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔

طفیل سے صغریٰ نے زینب کی بدسلوکی اور اس کے ساتھ ایسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا وہ صلح کل تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا اور سب اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی اور اس کی تاب نہ لا سکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی، یا دوڑ کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔

طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی اللہ دتا کو اتوار کی اگر زینب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے، کیونکہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے لیے بھیج دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی اور وہ آٹا گوندھ رہی تھی اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ تڑپ کر اٹھی مگر اللہ دتا نے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

صغریٰ نے چیخنا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا اللہ دتا نے کہا ''شور مت مچاؤ۔۔۔۔ یہ سب بے فائدہ ہے۔۔۔۔ چلو آؤ''

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے وہ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر پہنچ گئی کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آ گئی اللہ دتا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا وہ آئی تو اس سے کہا ''ادھر آؤ میری ٹانگیں دباؤ۔۔۔ زینب اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگی تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔''

زینب نے اللہ دتا سے پوچھا ''کیا بات ہے۔۔۔۔ آج تم اپنے آپ

میں نہیں ہو"

اللہ دتا نے سوچا کہ زینب سے چھپانا فضول ہے، چنانچہ اس سارا ماجرا بیان کر دیا۔۔۔زینب آگ بگولا ہو گئی" کیا ایک کافی نہیں تھی۔۔۔۔۔تمہیں پہلے تو شرم نہ آئی پر اب تو آنی چاہیے تھی۔۔۔مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہو گا، اسی لیے میں شادی کے خلاف تھی۔۔۔اب ان تو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی!"

اللہ دتا نے بڑے مسکین لہجے میں پوچھا" کیوں؟"

زینب نے کھلے طور پر کہا" میں اس گھر میں اپنی موت دیکھنا نہیں چاہتی"

اللہ دتا کا حلق خشک ہو گیا اس کے منہ سے کوئی بات نکل نہ سکی

زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغریٰ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔

اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے۔۔۔۔۔۔صغریٰ نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کھچا کھچا رہتا تھا ذرا ذرا سی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے آخر ایک دن آیا کہ ان نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

☆☆☆☆☆☆

الو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا راستے میں، یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو الو کا پٹھا کہے بس صرف ایک بار غصے میں یا طنزیہ انداز میں کسی کو الو کا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی بڑی انوکھی خواہشیں پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی وہ بہت خوش تھا رات اس کو بڑی پیاری نیند آئی تھی وہ خود کو بہت تازہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ خواہش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑھے چھل گئے دراصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا ان میں کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی نوکروں پر بھی وہ ناراض نہیں تھا اس لیے کہ غلام محمد اور نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا فروری کے سہانے دن تھے جن میں کنوارپنے کی تازگی تھی ہوا خنک اور ہلکی دن چھوٹے نہ راتیں لمبی نیچر کا توازن بالکل ٹھیک تھا اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے الو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دل میں کیوں کر پیدا ہو گئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برسوں میں متعدد لوگوں کو الو کا پٹھا کہا ہوگا

اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کیے ہوں اور گندی گالیاں بھی دی ہوں مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر اب اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو الو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اس نے اگر کسی کو الو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا ہرج ہو جائے گا۔

دانت صاف کرنے کے بعد اس نے چھلے ہوئے مسوڑھوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا مگر دیر تک ان کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

"مان لیا کہ میرا کسی کو الو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔ مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی۔۔ میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں۔۔۔۔؟ میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں۔۔۔۔"

یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں، عجیب واہیات نوکر ہیں دروازے کے عین بیچ میں یہ حقہ لگا دیا ہے میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا ہوں، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پا انداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہے جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی۔۔۔۔۔

اس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے جب وہ بھاگا ہوا اس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقے کی طرف اشارہ کر کے اس سے صرف اتنا کہے "تم نرے الو کے پٹھے ہو" مگر اس نے تامل کیا اور سوچا "یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا اگر غلام محمد کو اب بلا کر الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہو گی اور پھر۔۔۔۔۔اور پھر اس بے چارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔"

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحے کے لیے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس نے الو کا پٹھا کہنے کے لیے ایک اچھا موقع تلاش کر لیا غائب ہو گئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی پورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازہ کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کیے بغیر حقے کا دھواں پیتا رہا اور دھوئیں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جونہی وہ حقے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔

قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہو گئی ہے۔۔۔۔۔الو کا پٹھا۔۔۔۔۔میں کسی کو الو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرض محال میں نے کسی کو الو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہو گا۔۔۔۔۔

قاسم دل ہی دل میں ہنسا وہ صحیح الدماغ آدمی تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خواہش جو اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے بالکل بیہودہ اور بے سروپا ہے لیکن اس

کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر وہ اور بھی زیادہ ابھر آتی تھی۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے الو کا پٹھا نہ کہے گا خواہ یہ خواہش صدیوں تک اس کے دل میں تلملاتی رہے شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آئی تھی اس قدر تڑپ رہی تھی۔

پتلون کے بٹن بند کرتے وقت جب اس نے دماغی پریشانی کے باعث اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلا اٹھا ''بھئی کون ہو گا۔۔۔۔۔۔۔یہ کیا بیہودگی ہے۔۔۔۔۔دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔۔۔الو کا پٹھا کہو۔۔۔۔۔۔۔الو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر سے بند کرنے پڑیں گے'' لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا اس کی بیوی نے چائے بنا کر پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی توس اتنے اچھے سنکے ہوئے تھے کہ بسکٹ کی طرح کرکرے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی خمیر میں سے خوشبو آ رہی تھی مکھن بھی صاف تھا چائے کی کیتلی بے داغ تھی اس کی مونھ کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا مگر آج وہ دھبہ بھی نہیں تھا۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا اس کی طبیعت خوش ہو گئی، خالص دارجلنگ کی چائے تھی جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا ''آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔''

بیوی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر اس نے منہ بنا کر ایک ادا سے کہا ''جی ہاں ۔۔۔بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کے پلائی جاتی ہے ۔۔۔۔مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے ۔۔۔سلیقے والیاں تو وہ موئی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گن گایا کرتے ہیں''

یہ تقریر سن کر قاسم کی طبیعت مکدر ہوگئی ایک لمحہ کے لیے اس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر الٹ دے اور وہ نیم جو اس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لیے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے بڑے طاقچے میں پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اس نے بردباری سے کام لیا ''یہ عورت میری بیوی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنیٰ قسم کی باتیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں ۔۔۔میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہہ دیتی ہے، اس کی نیت نیک ہوتی ہے بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں''

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں اس طاقچے سے ہٹالیں۔جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رخ بدل کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا'' دیکھو، آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا نیم زخموں کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔۔۔'' اور دیکھو،تم موسمیوں کا رس ضرور پیا کرو۔۔۔۔میں دفتر

سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤں گا یہ رس تمہاری صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

بیوی مسکرا دی" آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے۔۔۔۔۔اچھی بھلی تو ہوں، کھاتی ہوں، پیتی ہوں، دوڑتی ہوں، بھاگتی ہوں۔۔۔۔میں نے جو آپ کے لیے بادام منگوا کے رکھے ہیں۔۔۔۔۔بھئی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی۔۔۔۔۔لیکن دفتر میں کہیں بانٹ نہ دیجیے گا۔"

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی غصے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ان میں تھوڑا بہت رد و بدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اس نے جب سگریٹ نکال کر سلگایا اور اٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش نمودار ہو گئی اس مرتبہ اس نے سوچا، اگر میں کسی کو الو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔۔۔۔زیر لب بالکل ہولے سے کہہ دوں، الو۔۔۔۔کا۔۔۔۔پٹھا تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں۔۔۔۔دفتر میں۔۔۔۔

اس کو صحن میں بچے کا کموڈ پڑا نظر آیا یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور

خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار کرکری توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اس کے منہ میں تھا۔۔۔۔۔اس نے زور سے آواز دی ''غلام محمد''

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی ''غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے۔۔۔۔۔۔کوئی کام تھا آپ کو اس سے؟''

ایک سیکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں ''کہہ دوں، یہ غلام محمد الو کا پٹھا ہے۔۔۔اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔نہیں وہ خود تو موجود ہی نہیں پھر۔۔۔۔۔۔بالکل بیکار ہے۔۔۔۔لیکن سوال یہ ہے کہ بے چارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے اس کو تو میں ہر وقت الو کا پٹھا کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔''

قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا'' کچھ نہیں میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے۔۔۔۔۔۔تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتی ہے، یہ کہتے ہوئے اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جو فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچہ رینگتا رینگتا آئے گا اور اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائے گی۔ قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا'' یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمود کو الو کا پٹھا نہیں کہہ دیا۔۔۔۔اس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی

ابھی مجھ سے بھی ہوئی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی ۔۔۔۔

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور وفکر کرنے والا انسان ہے مگر اس احساس نے اس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اس نے بلاضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا وہ دراصل کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔

اس کی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی ''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

قاسم چونک پڑا ''کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟'' یہ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی الو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور ہنسے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو بیوی کا ساتھ دینا پڑے گا، چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں الو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اس نے غور کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے ۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے ۔۔۔ ہو سکتا ہے کیا، ضرور ہو جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار ناخوشگواری پیدا ہو، چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کچھ

نہ کہا اور ایک لمحہ تک اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا "آج صبح آپ کے برخوردار نے وہ ستایا ہے کہ اللہ کی پناہ۔۔۔۔ بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اسے کموڈ پر بٹھایا اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے۔۔۔۔۔ آخر لڑکا کس کا ہے۔۔۔؟"

قاسم کو اس قسم کی چخ پسند تھی ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاج کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اس نے بیوی سے کہا "لڑکا میرا ہی ہے مگر۔۔۔۔۔ میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا یہ عادت اس کی اپنی ہوگی۔"

بیوی نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھا قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا، اس لیے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست کرنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہوگئی۔

"اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں خدا حافظ!"

یہ لفظ جو ہر روز اس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چل دیا۔

کشمیری گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے ایک ڈاڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں پھر الو کا پٹھا کہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ "لو بھئی، یہ آدمی ہے جس کو الو کا پٹھا کہہ دینا چاہیے۔۔۔ یعنی جو صحیح معنوں میں الو کا پٹھا ہے۔۔۔ ذرا انداز ملاحظہ

کرو۔۔۔ کس انہماک سے ڈرائی کلین کیے جا رہا ہے۔۔۔۔۔ جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے۔۔۔۔ لعنت ہے۔"

لیکن قاسم صحیح الدماغ آدمی تھا اس نے تعجیل سے کام نہ لیا اور تھوڑی دیر غور کیا "میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اس کو الو کا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لیے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بری طرح مصروف ہے چاہیے تو یہ کہ اس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اٹھے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ الو کے پٹھے ہیں۔۔۔ لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔"

چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی اثناء میں اس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اس پر سوار تھی اس لیے کہ پیچھے بستہ بندھا تھا۔ آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا اس لیے کہ اس نے اس حادثہ کے ردعمل پر غور کرنا شروع کر دیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈ بہت بری طرح ان میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پچھلا پہیہ ذرا اونچا اٹھایا تاکہ اسے گھما کر ساڑھی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے اتفاق ایسا ہوا کہ پہیہ گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں

کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر پیچی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی قاسم بوکھلا گیا اس کی اس بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑا رہ گیا اور ساڑھی باہر نکل آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا تھا قاسم کی طرف اس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بھینچے ہوئے لہجہ میں کہا ''الو کا پٹھا''

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا ''نظروں سے غائب ہو گئی۔''

قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا خاص کر اس لیے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا مگر وہ بہت صحیح الدماغ آدمی تھا ٹھنڈے دل سے اس نے اس حادثہ پر غور کیا اور اس لڑکی کو معاف کر دیا۔''اس کو معاف ہی کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جراب میں اوپر ران کے پاس تین چار کاغذ کیوں اڑس رکھے تھے؟''

☆☆☆☆☆☆

انتظار

(گھڑی آٹھ بجاتی ہے)

منتظر: آدھا گھنٹہ۔۔۔۔۔۔صرف آدھا گھنٹہ اور پھر اس کے بعد۔۔۔یہ ٹن کی آخری ڈوبتی ہوئی گونج کتنی پیاری تھی اور۔۔۔اور۔۔۔

منتظر کا منطقی وجود: اگر وہ نہ آئی۔۔۔یعنی اگر۔۔۔۔۔

منتظر: کیوں نہ آئے گی۔۔۔۔ضرور آئے گی (پھیکی ہنسی)۔۔۔۔۔۔یہ اندیشے بالکل فضول ہیں (اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں) اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔

منطقی وجود: وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

منتظر: کتنا لغو خیال ہے۔۔۔۔۔کسی کے شعر کا ایک مصرعہ ہے شاید، لیکن کس قدر عامیانہ ہے۔۔۔ایسی شاعری ہی نے تو۔۔۔۔۔۔وہ ضرور آئے گی اور شاعری۔۔۔۔شاعری اچھی چیز ہے۔۔۔۔تپائی پر جو یہ گلدان پڑا ہے میں نے اس میں ابھی تک پھول کیوں نہ سجائے (پھولدان اٹھاتا ہے)۔۔۔۔۔۔۔یہ پھولدان اسے پسند ہے۔ آج وہ اسے اور بھی پسند کرے گی نرگس اور بنفشہ کے پھول اسے بہت بھاتے ہیں۔۔۔۔۔یہاں پر یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔۔کیوں (پھولدان پھر وہیں رکھ دیتا ہے سیٹی بجاتا ہے)

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(وقفہ)

منتظر: (ایک ایک لفظ کر کے) وہ

۔۔۔۔آئیں۔۔۔۔گھر۔۔۔۔میں۔۔۔۔

ہمارے۔۔۔۔خدا۔۔۔۔کی۔۔۔۔قدرت۔۔۔۔ہے۔۔۔۔خدا کی قدرت ہے (چونک کر) خدا کی قدرت خدا کی قدرت یعنی اس کا آنا بالکل اچانک تھا شاعر کو اس کی آمد کا یقین نہیں تھا۔۔۔۔بھئی ہو گا مگر ہمیں تو پورا یقین ہے کیوں؟

منطقی وجود: اگر۔۔۔۔۔اگر۔۔۔۔

منتظر: ہٹاؤ جی اس خیال کو۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔تو میں کیا سوچ رہا تھا۔۔۔سوچ کیا رہا تھا؟ سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟ وہ ضرور آئے گی۔۔۔۔۔چند منٹوں کی بات ہے۔

منطقی وجود: ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ساٹھ

منتظر: ستائیس منٹ اور رہ گئے ہیں۔۔صرف ستائیس۔۔۔۔(گھڑی کی ٹک ٹک بلند ہو کر پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے) ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے پھولدان بھی سج گیا سگریٹ سلگا لیتا ہوں ایک سگریٹ کم از کم دس منٹ جلتا رہے گا۔

منطقی وجود: ساڑھے سات منٹ

منتظر: تو کیا ہوا۔۔۔۔۔(سگریٹ سلگاتا ہے)

منطقی وجود: کش زور سے کیوں لے رہے ہو

منتظر: ساتھ ساتھ ٹہلتا بھی رہوں تو ٹھیک رہے گا (ٹہلتا ہے) ہاں۔۔۔تو یہ

بات ہے۔

منطقی وجود: کیا بات ہے تم کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟

منتظر: کوئی بات نہیں، بات کیا ہوگی ایک صرف اتنا ڈر ہے کہ۔۔۔۔۔

منطقی وجود: موسم خراب ہے

(کڑک سی بلند ہوتی ہے)

منتظر: (گھبرا کر) یہ بجلی کی کڑک تو نہیں ہے؟

منطقی وجود: سگریٹوں کا ڈبہ جو آپ نے ابھی ابھی کھولا تھا اس کا ڈھکنا آپ کے پیر کے نیچے آ گیا ہے۔

منتظر: (ہنستا ہے) آواز بالکل بجلی کی سی پیدا ہوئی۔۔۔کیا ڈھکنا ہی تھا؟۔۔۔ڈھکنا ہی تھا۔۔۔۔۔(کھڑکی کھولتا ہے) موسم زیادہ خراب تو نہیں ہے بادل؟ وہ اب تو گھر سے چل پڑی ہوگی یہ سگریٹ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ انگلیوں میں مسلا گیا ہے۔

منطقی وجود: دوسرا سلگاؤ اور یوں تھوڑا سا وقت بھی خرچ ہو جائے گا

منتظر: نہیں۔۔۔زیادہ سگریٹ میں نہیں پیوں گا، منہ سے بو آئے گی۔ بہت ممکن ہے اسے ناگوار معلوم ہو۔۔۔۔اس نے ایک بار کہا بھی تو تھا۔۔۔

وہ: (یعنی جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، اس کی آواز آتی ہے) تمہیں میری ہی جان کی قسم جواب سے سگریٹ پیو۔۔۔۔

منتظر: مجھے عدول حکمی نہیں کرنی چاہیے (وقفہ)

منطقی وجود: سگریٹ بجھا دیا اب یہ وقت کیسے کٹے گا

منتظر: یہ گراموفون باجا۔۔۔۔۔ریکارڈ نکال کر باہر رکھ دوں، بہت ممکن ہے وہ بجانا چاہے۔

منطقی وجود: ایک ریکارڈ پورے تین منٹ تک بجتا رہے گا

منتظر: تین منٹ۔۔۔۔۔(ریکارڈ لگاتا ہے)۔۔۔۔۔۔۔تین منٹ تک بجتا رہے گا۔کیا برا ہے۔۔۔موسیقی مجھے پسند ہے

(ریکارڈ بجتا ہے)

رات کٹی گن گن کے تارے

(ریکارڈ پر سے ایک دم سوئی ہٹا لیتا ہے)

منتظر: کیسا واہیات ریکارڈ ہے رات کٹی گن گن کے تارے۔۔۔۔۔

منطقی وجود: ابھی تو آٹھ بج کر کچھ منٹ ہوئے ہیں ساری رات پڑی ہے۔

منتظر: ابھی آٹھ بج کر کچھ منٹ ہی ہوئے ہیں۔۔۔تو اس کا کیا مطلب ہے۔۔میں۔۔۔میں اتنا بے تاب کیوں ہو رہا ہوں۔۔۔۔آ جائے گی۔۔۔ایسی باتوں ہی سے تو ان لوگوں کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔۔۔میں اس کا انتظار بالکل نہیں کروں گا۔۔کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں میز پر یہ سفید کاغذ رکھا ہی ہے۔ اس پر اس مہینے کا حساب لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔۔ہاں۔۔۔سگریٹ، پانچ روپے۔۔۔سگریٹ پانچ روپے۔۔۔(یہ آواز فیڈ ہوتی جاتی ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اس کی آواز ابھرتی آتی ہے)

وہ: تمہیں میری جان کی قسم جواب سے سگریٹ پیو۔۔۔دیکھو تو کتنے کمزور ہو رہے ہو۔۔۔۔بادام کھایا کرو

منتظر: اے میرا کتنا خیال ہے۔۔۔۔ابھی آ بھی جائے۔مگر۔۔۔۔۔

منطقی وجود: ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی کافی دیر ہے۔

منتظر: میں سمجھتا ہوں یہ گھڑی فاسٹ ہے۔۔۔۔۔کیا پتہ ہے کہ۔۔۔۔۔

منطقی وجود: گھڑی سلو ہو

منتظر: اجی نہیں، اس گھڑی کا وقت بالکل صحیح ہے۔۔۔۔۔۔۔ابھی پرسوں ہی تو ٹھیک کرائی ہے۔۔۔(وقفہ)۔۔۔۔۔کہیں اس کی گھڑی میں فرق نہ ہو۔

منطقی: ایسا ہو سکتا ہے

منتظر: تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔۔پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہو گا

منطقی: اس وقت سے لے کر اب تک دس منٹ مشکل سے گزرے ہیں۔۔۔۔۔نہیں ابھی دس منٹ نہیں گزرے۔

منتظر: تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔۔۔۔۔پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہو گا۔

منطقی: اس وقت سے لے کر اب تک دس منٹ مشکل سے گزرے ہیں۔۔۔۔۔نہیں ابھی دس منٹ نہیں گزرے۔

منتظر: گھڑی میں ضرور خرابی ہے۔۔۔۔۔کھول کر نہ دیکھ لوں

منطقی وجود: کھول کر آپ کو کیا نظر آ جائے گا

منتظر: کچھ نہیں میں نے تو یہ کہا تھا کہ چلو یوں تھوڑا سا وقت گزر جائے گا

منطقی وجود: تو چلیے پرزے کھول کر بیٹھ جائیے مگر یاد رہے اس دن کی طرح پھر جڑیں گے نہیں۔

منتظر: (ہنستا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں (ہنستا ہے پھر گاتا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں ــــــــ نہیں وزن ٹھیک نہیں ہے ــــ

منطقی وجود: یہ آپ کو شاعری کیا سوجھی

منتظر: (خوب ہنستا ہے) یہ شاعری بھی اچھی رہی ــــــ اب آ بھی جائے ــــ وقت کیا ہوا ہے ــــ ساڑھے ــــ

منطقی: ابھی ساڑھے کہاں ــــ سوا کہیے سوا

منتظر: مجھے کوئی کام بھی نہیں ہے آج

منطقی: اس مہینے کا حساب لکھنا تھا

منتظر: اجی لعنت بھیجو حساب کتاب پر یہ بھی کوئی وقت ہے حساب کتاب کا ــــ لیکن ایسے وقت میں کرنا کیا چاہیے۔

منطقی: اس کو ایک خط لکھنا شروع کردو

منتظر: بالکل ٹھیک ــــــــ (وقفہ) ــــ اس پیڈ کا کاغذ اچھا رہے گا

منطقی: ہاں ــــ خوشبودار ہے

منتظر: کیا لکھوں ــــ (وقفہ) ــــ مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔

منطقی: لکھو ــــ میں تمہارا بہت انتظار کرتا رہا

منتظر: اور جب وہ آئے تو یہ خط اس کو دے دیں ــــ خیال اچھا ہے ــ تو لکھتا ہوں ــــ (وقفہ) ــــ میرا خیال ہے کہ اب وہ گھر سے چل پڑی ہو گی ــــ یہ خط اس کے آنے تک ختم نہ ہوگا۔

منطقی: تم خط لکھنا شروع تو کرو

منتظر: میری پیاری۔۔۔تم نے آج وعدہ کیا تھا کہ ساڑھے آٹھ بجے آؤ گی میں تمہارا شدت سے انتظار کرتا رہا۔۔۔۔۔

منطقی: کتنی پھسپھسی عبارت ہے

منتظر: پھسپھسی۔۔۔۔۔۔نہیں تو۔۔۔(وقفہ)۔۔۔واقعی پھسپھسی ہے۔۔۔۔اب تو وہ آتی ہی ہوگی (کاغذ پھاڑ دیتا ہے) خط کی کوئی ضرورت نہیں میں اس کو زبانی بتادوں گا۔

منطقی: بشرطیکہ وہ آجائے

منتظر: یہ شرط کیسی۔۔۔۔۔وہ ضرور آئے گی

منطقی وجود: اگر۔۔اگر۔۔۔۔۔۔

منتظر: نہیں۔۔۔نہیں

منطقی: ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے

منتظر: کیسے بیہودہ خیال ہیں

منطقی: اگر وہ نہ آئی تو

منتظر: ضرور آئے گی

منطقی: دیکھ لیں گے

(دستک کی آواز)

منتظر: (خوش ہوکر) لو وہ آ گئی (گھبرا کر) سب چیزیں ٹھیک ہیں نا؟۔۔۔سگریٹوں کا ڈبہ؟۔۔۔اسے کہاں رکھوں؟۔۔۔۔کون ہے؟۔۔۔اس کا ڈھکنا کہاں ہے؟۔۔۔۔لعنت!۔۔خالی ہی کہیں چھپا دیتا

ہوں۔۔۔۔اور۔۔۔اور یہ۔۔آیا۔۔۔بس اب سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

منطقی: اپنا دم تو درست کر لو۔۔۔۔ہانپ رہے ہو

منتظر: دم وم سب ٹھیک ہے۔۔۔۔۔میرا خیال ہے اس کو تھوڑا سا ڈرانا چاہیے۔

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ڈرانے کی خاطر ''ہپ'' کرتا ہے)

اخبار والا: (ڈرے ہوئے انداز میں) اجی صاحب۔۔۔۔۔آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔۔۔۔۔اف

منتظر: تم۔۔۔ت۔۔و۔۔تم۔۔۔۔۔تم کون ہو۔۔۔تم اخبار والے کیوں ہو؟۔۔۔بھاگ جاؤ یہاں سے۔

اخبار والا: حضور یہ پوچھنے آیا تھا کہ دونوں اخبار اسٹیٹسمین اور ہندوستان ٹیمز لایا کروں یا اکیلا اسٹیٹسمین۔۔۔۔جیسا آپ حکم دیں۔

منتظر: جتنے بھی ہوں لے آیا کرو

اخبار والا: بہت اچھا سرکار

(اخبار والا جاتا ہے دروازہ بند کر دیا جاتا ہے)

منتظر: اس اخبار والے کو بھی اسی وقت آنا تھا۔۔۔کمبخت ڈر گیا تھا (ہنستا ہے)

(ہولے ہولے دستک دینے کی آواز)

منتظر: (ہنسی روک کر) آ گئی۔۔۔آ گئی۔۔۔۔

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ''ہپ'' کرتا ہے)

اخبار والا: (ڈرے ہوئے انداز میں) صاحب۔۔۔یہ ۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔آپ بار بار مجھے کیوں ڈراتے ہیں۔

منتظر: اوہ۔۔۔تم کیا چاہتے ہو؟۔۔۔۔اب پھر کیوں آئے ہو؟۔۔۔۔۔خدا کے لیے جاؤ۔

اخبار والا: صاحب یہ پوچھنے آیا تھا کہ اردو کے اخبار بھی لے آیا کروں؟

منتظر: فارسی، عربی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی، سب زبانوں کے لے آیا کرو مگر خدا کے لیے اس وقت جاؤ۔

(دروازہ بند کر دیتا ہے)

منتظر: حد ہوگئی ہے

منطقی وجود: بڑے شرم کی بات ہے وہ دل میں کیا کہتا ہوگا

منتظر: اجی ہٹاؤ۔ لیکن میں کہتا ہوں وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں کہیں ایسا تو نہیں ہوگیا۔۔۔۔۔

منطقی وجود: کہ وہ بھول گئی ہو

منتظر: ایسا بھلا ہو سکتا ہے بس اب وہ آتی ہی ہوگی یہاں سے اس کا گھر بھی تو کافی دور ہے اور بہت ممکن ہے پیدل آئے۔

منطقی: تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ بہت دیر کے بعد آئے گی

منتظر: میرا مطلب یہ تو نہیں تھا وہ گھر سے تو بہت پہلے کی چل پڑی ہو گی گھڑی۔۔۔گھڑی۔۔۔۔یہ گھڑی خراب ضرور ہوگئی ہے۔۔۔۔دیکھو نا اس کی سیکنڈ کی سوئی کتنی ہولے ہولے چلتی ہے۔

منطقی: سامنے کلاک موجود ہے

منتظر: دونوں کا وقت مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا ۔۔۔۔۔۔ خیر کل پتا لگ جائے گا ۔۔۔ ابھی تک دس منٹ باقی ہیں ۔۔۔۔ گزر کتنے چکے ہیں ۔

منطقی: سترہ ۔۔۔۔۔۔ تیرہ ابھی باقی ہیں

منتظر: میں دیوانہ ہو جاؤں گا

منطقی: کیا کہا

منتظر: کچھ بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔ تو یہ ناول پڑھنا شروع کر دیتا ہے

(لکڑی کے ساتھ کوئی چیز ٹکراتی ہے)

منتظر: (اچھل کر) ۔۔۔۔۔۔ لو وہ آ گئی ۔۔۔۔۔ آیا

منطقی: آپ کا پیر کرسی کے نچلے ڈنڈے کے ساتھ ٹکرایا ہے دستک نہیں ہوئی

منتظر: پھر ٹکرائے گا ۔۔۔۔۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ۔۔۔۔۔ ٹہلتا رہوں گا اور پڑھتا رہوں گا ۔ (بے قراری کے ساتھ ٹہلتا ہے ۔۔۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے مگر آواز بلند ہو جاتی ہے)

منتظر: کچھ سمجھ میں نہیں آتا عجب اوٹ پٹانگ عبارت ہے (کتاب بند کرنے اور میز پر رکھنے کی آواز) ۔۔۔ پھر پڑھوں گا

منطقی وجود: دل بیٹھتا کیوں جا رہا ہے

منتظر: کیا معلوم ۔۔۔ پانی پیتا ہوں (پانی پیتا ہے) تلخی ۔۔۔ کس قدر تلخی ہے حلق میں ۔۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیک وقت پر آئے گی پورے ساڑھے آٹھ بجے (چونک کر) ابھی ساڑھے آٹھ نہیں بجے ۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔ میں بیٹھ جاتا

ہوں (گھڑی بڑے بڑے وقفوں کے بعد ٹک ٹک کرتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیکنڈ لمبے ہو گئے ہیں) مجھے کچھ ہو گیا ہے

منطقی وجود: پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا

منتظر: پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا (میز پر انگلیوں سے ڈھول بجاتا ہے) یہ میں کیا کر رہا ہوں (گھڑی کی بھیانک آواز)

(اٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتا ہے)

منطقی وجود: پیر لڑکھڑا رہے ہیں

منتظر: تو اچھا بھلا بیٹھا تو تھا۔۔۔اٹھ کر چلنے کیوں لگا۔۔۔۔۔۔حلق سوکھ رہا ہے لیکن اب تو اس کے آنے میں کوئی دیر نہیں چند منٹوں کی۔۔۔۔

منطقی وجود: چند منٹوں کی جن میں۔۔۔۔۔۔(گھڑی لمبے لمبے سانس لیتی ہے)

(کاغذ کھڑکھڑاتا ہے)

منتظر: آج ہوا کتنی تیز ہے۔۔۔۔کیلنڈر کا کاغذ کھڑکھڑا رہا ہے

(برتن گرنے کی آواز)

منتظر: اس میری ہمسائی کے گھر میں ہر وقت برتن ہی گرتے رہتے ہیں

منطقی: آج تمہارے کان بڑے تیز ہیں

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

منتظر: ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے۔۔۔۔۔۔آواز پا۔۔۔۔دل

کی دھڑکن۔۔۔ (گھڑی زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے)۔۔۔۔۔یہ میرے دل کو کچھ ہو گیا ہے یا کلاک خراب ہو گیا ہے۔۔۔میرا حلق بھی سوکھ رہا ہے۔۔۔۔ابھی وقت نہیں ہوا (اضطراب کے ساتھ ٹہلتا ہے)

(دروازے پر دستک)

منتظر: (کمزور آواز میں)۔۔۔آ گئی۔۔۔آ گئی۔۔۔۔خوشی سے میری آواز ہی نہیں نکلتی۔۔۔دروازہ۔۔۔۔۔دروازہ۔۔۔۔

منطقی: دروازہ آپ کے سامنے ہے

منتظر: ارے ہاں۔۔۔۔آیا۔۔۔۔۔آیا

(دروازہ کھولنے کی آواز)

دوست: اسلام علیکم

منتظر: (تتلا کر) وو وو ۔۔۔۔۔۔وعلیکم السلام۔۔۔۔ک۔۔۔۔ک۔۔۔ک۔۔۔کیسے تشریف لائے

دوست: میں تم کو اس گھوڑی کی بابت کچھ بتانے آیا تھا

منتظر: گھو۔۔۔گھو۔۔۔گھوڑی

دوست: ہاں وہی جس کی بابت کالے خاں کہتا تھا کہ بڑی دولتیاں جھاڑتی ہے بھئی تھی بڑی منہ زور۔۔۔۔۔پٹری نہیں جمنے دیتی تھی۔ بگدھریاں کرتی تھی بگدھریاں۔

منتظر: بگ۔۔۔دھریاں۔۔۔۔۔جی

دوست: منہ کی بہت کڑی تھی۔۔۔۔الف ہو جاتی تھی الف

منتظر: جی۔۔۔کسی سلوتری کے حوالے کر دی ہوتی

دوست: ہم تو گھاس کھا گئے ہو۔۔۔کہاں کا سوار کہاں کا سلوتری قدم رکاب میں گیا اور بگٹٹ ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔اور مجھے تو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھی ایسی چمکتی تھی جیسے بجلی۔۔۔۔

منتظر: میں۔۔۔۔میں۔۔۔

دوست: کاٹھیاواڑ کھیت کی تھی نا۔۔۔۔چھوٹے تو سرپٹ جائے انجر پنجر ڈھیلے کر دے۔۔۔

منتظر: میں۔۔۔میں۔۔۔

دوست: یہ میں میں کیا کرتے ہو

منتظر: میں بیمار ہوں۔۔۔۔۔سخت بیمار ہوں۔۔۔آپ۔۔۔۔آپ۔۔۔اوہ۔۔۔ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں۔

دوست: (فکر مند لہجہ میں) تم بیمار ہو لیکن بھئی عجیب بیوقوف ہو مجھ سے تم نے پہلے کیوں نہ کہا۔۔۔۔اب اطمینان سے اپنا سارا حال سناؤ مجھے کوئی خدمت بتاؤ بھئی واللہ کمال کر دیا۔۔۔اور ہاں۔۔۔۔یہ ساڑھے آٹھ بجے تم نے کیا کہا تھا۔

منتظر: (مردہ آواز میں) ساڑھے آٹھ بجے۔۔۔۔۔۔ساڑھے آٹھ بجے مجھے دوا پینی ہے۔

دوست: لاؤ میں پلا دیتا ہوں۔۔۔کہاں ہے دوا۔۔۔۔۔ساڑھے آٹھ بجنے میں اب کون سی دیر ہے۔۔۔۔دوا کہاں ہے

منتظر: نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔میں خود پی لوں گا آپ تکلیف نہ

کریں۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔آپ جائیے

دوست: میں تمہیں یہاں بیمار چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں

منتظر: میں۔۔۔میں۔۔۔۔۔بیمار نہیں ہوں۔۔۔۔۔میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا آپ جائیے۔۔۔۔۔اوہ خدا کے لیے آپ جائیے مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا

دوست: دل کا دورہ۔۔۔۔۔۔۔بھئی اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔۔۔بتاؤ دوا کہاں ہے۔

منتظر: وہ میرے پاس نہیں ہے۔۔۔آپ جائیے۔۔۔۔خدا کے لیے جائیے

دوست: تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں ڈاکٹر کے پاس بھی تو نہیں جا سکتا

منتظر: کیا کہا؟۔۔۔۔(اضطراب بڑھتا جاتا ہے گھڑی کی آواز زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے)۔۔۔کیا کہا؟ آپ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جائیں گے۔۔۔۔میں۔۔۔۔میں۔۔۔مر جاؤں گا۔۔۔۔۔۔خدا کے لیے ڈاکٹر کے پاس دوڑے جائیے۔۔۔میری حالت بہت خراب ہے۔۔۔۔میری۔۔۔۔۔حالت۔۔۔۔۔بہت نازک۔۔۔۔ہے۔۔۔۔جائیے۔۔۔(آواز کمزور ہوتی جاتی ہے)

دوست: غش طاری ہو گیا۔۔۔۔کیا ہوا؟۔۔۔۔ڈاکٹر؟۔۔۔۔کہاں ملے گا۔ڈاکٹر۔۔۔(گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتا جاتا ہے) اب کوئی ڈاکٹر مل جائے اس وقت (چلا جاتا ہے)

(گھڑی اصلی حالت میں ٹک ٹک کرتی ہے۔۔۔یہ آواز ڈیڑھ سیکنڈ تک جاری رہتی ہے۔۔۔۔آخر میں کلاک میں خرخراہٹ پیدا ہوتی ہے اور ایک ٹن کی آواز آتی ہے اس ٹن کی گونج تھوڑی دیر قائم رہتی ہے پھر گھڑی کی ٹک ٹک بالکل بند ہو جاتی ہے اور ایک سیکنڈ تک مکمل خاموشی طاری رہتی ہے۔۔۔۔اس خاموشی کے بعد دروازہ کھلتا ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ آتی ہے)

وہ: دیکھو تو، کس مزے سے جناب سو رہے ہیں۔ گویا ان کو معلوم ہی نہیں میں آ رہی ہوں۔۔۔کافی گہری نیند سو رہے ہیں۔۔۔۔خدا جانے کہاں سے گھومتے گھامتے تھک کر آئے ہوں گے۔۔۔۔(خفگی کے ساتھ) تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ یہاں بن بلائے مہمانوں کی طرح کھڑی رہوں۔۔۔۔(دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے)

☆☆☆☆☆☆

اولاد

جب زبیدہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر پچیس برس کی تھی اس کے ماں باپ تو یہ چاہتے تھے کہ سترہ برس کی ہوتے ہی اس کا بیاہ ہو جائے مگر کوئی مناسب و موزوں رشتہ ملتا ہی نہیں تھا اگر کسی جگہ بات طے ہونے پاتی تو کوئی ایسی مشکل پیدا ہو جاتی کہ رشتہ عملی صورت اختیار نہ کر سکتا۔

آخر جب زبیدہ پچیس برس کی ہو گئی تو اس کے باپ نے ایک رنڈوے کا رشتہ قبول کر لیا۔۔۔۔اس کی عمر پینتیس برس کے قریب قریب تھی، یا شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ صاحب روزگار تھا مارکیٹ میں کپڑے کی تھوک فروشی کی دکان تھی ہر ماہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا۔

زبیدہ بڑی فرمانبردار لڑکی تھی اس نے اپنے والدین کا فیصلہ منظور کر لیا چنانچہ شادی ہو گئی، اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔

اس کا خاوند جس کا نام علم الدین تھا، بہت شریف اور محبت کرنے والا ثابت ہوا۔ زبیدہ کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا کپڑے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حالانکہ دوسرے لوگ اس کے لیے ترستے تھے۔ چالیس ہزار اور تھری بی کا لٹھا، شنتوں اور دو گھوڑے کی بوسکی کے تھانوں کے تھان زبیدہ کے پاس موجود تھے۔

وہ اپنے میکے ہر ہفتے جاتی۔۔۔۔ایک دن وہ گئی تو اس نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی بین کرنے کی آوازیں سنی اندر گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کے باعث مر گیا ہے۔

اب زبیدہ کی ماں اکیلی رہ گئی تھی گھر میں سوائے ایک نوکر کے اور کوئی بھی نہیں تھا اس نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ اسے اجازت دے کہ وہ اپنی بیوہ ماں کو اپنے پاس بلالے۔

علم الدین نے کہا" اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔۔ یہ تمہارا گھر ہے اور تمہاری ماں میری ماں۔۔۔ جاؤ انہیں لے آؤ۔۔۔۔۔۔ جو سامان وغیرہ ہو گا اس کو یہاں لانے کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں"

زبیدہ بہت خوش ہوئی گھر کافی بڑا تھا دو تین کمرے خالی پڑے تھے وہ تانگے میں گئی اور اپنی ماں کو ساتھ لے آئی علم الدین نے سامان اٹھوانے کا بندوبست کر دیا تھا، چنانچہ وہ بھی پہنچ گیا زبیدہ کی ماں کے لیے کچھ سوچ بچار کے بعد ایک کمرہ مختص کر دیا گیا۔

وہ بہت ممنون و متشکر تھی۔ اپنے داماد کے حسن سلوک سے بہت متاثر۔ اس کے جی میں کئی مرتبہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنا سارا زیور جو کئی ہزاروں کی مالیت کا تھا، اس کو دے دے کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائے اور زیادہ کمائے مگر وہ طبعاً کنجوس تھی۔

ایک دن اس نے اپنی بیٹی سے کہا" مجھے یہاں آئے دس مہینے ہو گئے ہیں۔۔۔۔ میں نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔۔۔ حالانکہ تمہارے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے دس ہزار روپے میرے پاس موجود ہیں۔۔۔ اور زیور الگ"

زبیدہ انگیٹھی کے کوئلوں پر پھلکا سینک رہی تھی" ماں، تم بھی کیسی باتیں کرتی

ہو“

”کیسی ویسی میں نہیں جانتی۔۔۔۔میں نے یہ سب روپے علم الدین کو دے دیئے ہوتے، مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے کوئی بچہ پیدا ہو۔۔۔۔تو یہ سارا روپیہ اس کو تحفے کے طور پر دوں۔“

زبیدہ کی ماں کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا۔۔۔۔شادی ہوئے قریب دو برس ہو چکے تھے، مگر بچے کی پیدائش کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔

وہ اسے کئی حکیموں کے پاس لے گئی۔ کئی معجونیں، کئی سفوف، کئی قرص اس کو کھلوائے، مگر خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔

آخر اس نے پیروں فقیروں سے رجوع کیا ٹونے ٹوٹکے استعمال کیے گئے۔ تعویذ دھاگے بھی۔۔۔۔مگر مراد بر نہ آئی زبیدہ۔۔۔اس دوران میں تنگ آ گئی ایک دن چنانچہ اس نے اکتا کر اپنی ماں سے کہہ دیا ”چھوڑو اس قصے کو۔۔۔۔بچہ نہیں ہوتا تو نہ ہو۔۔۔۔“

اس کی بوڑھی ماں نے منہ بسور کر کہا ”بیٹا۔۔۔۔۔یہ بہت بڑا قصہ ہے۔۔۔۔۔تمہاری عقل کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ اولاد کا ہونا کتنا ضروری ہے اسی سے تو انسان کی زندگی کا باغ سدا ہرا بھرا رہتا ہے۔“

زبیدہ نے چھالا چنگیر میں رکھا ”میں کیا کروں۔۔۔۔بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

بڑھیا نے کہا ''قصور کسی کا بھی نہیں بیٹی۔۔۔۔بس صرف ایک اللہ کی مہربانی چاہیے''

زبیدہ اللہ میاں کے حضور ہزاروں مرتبہ دعائیں مانگ چکی تھی کہ وہ اپنے فضل وکرم سے اس کی گود ہری کرے ،مگر اس کی ان دعاؤں سے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

جب اس کی ماں نے ہر روز اس سے بچے کی پیدائش کے متعلق باتیں کرنا شروع کیں ،تو اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ بنجر زمین ہے ،جس میں کوئی پودا اگ ہی نہیں سکتا۔

راتوں کو وہ عجیب عجیب سے خواب دیکھتی ۔بڑے اوٹ پٹانگ قسم کے ،کبھی یہ دیکھتی کہ وہ لق و دق صحرا میں کھڑی ہے اس کی گود میں ایک گل گوتھنا سا بچہ ہے ، جسے وہ ہوا میں اتنے زور سے اچھالتی ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔

کبھی یہ دیکھتی کہ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہے جو ننھے منے بچوں کے زندہ اور متحرک گوشت سے بنا ہے۔

ایسے خواب دیکھ دیکھ کر اس کا دل و دماغ غیر متوازن ہو گیا۔۔۔۔۔بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں بچوں کے رونے کی آواز آنے لگتی ،اور وہ اپنی ماں سے کہتی ''یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟''

اس کی ماں نے اپنے کانوں پر زور دے کر یہ آواز سننے کی کوشش کی ،جب کچھ سنائی نہ دیا تو اس نے کہا ''کوئی بچہ رو نہیں رہا۔۔۔۔''

''نہیں ماں۔۔۔۔رو رہا ہے۔۔۔بلکہ رو رو کے ہلکان ہوئے جا رہا

ہے"

اس کی ماں نے کہا "یا تو میں بہری ہو گئی ہوں، یا تمہارے کان بجنے لگے ہیں"

زبیدہ خاموش ہو گئی، لیکن اس کے کانوں میں دیر تک کسی نوزائیدہ بچے کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آتی رہیں، اور اس کو کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر رہا ہے اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے نہ کیا لیکن جب وہ اندر اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے گئی تو اس نے قمیص اٹھا کر دیکھا کہ اس کی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں اکثر ٹپکتی رہی۔۔۔لیکن وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یہ سب واہمہ ہے حقیقت صرف یہ ہے کہ اوس کے دل و دماغ پر مسلسل ہتھوڑے پڑتے رہے ہیں کہ اس کے بچہ کیوں نہیں ہوتا اور وہ خود بھی بڑی شدت سے وہ خلا محسوس کرتی ہے، جو کسی بیاہی عورت کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے۔

وہ اب بہت اداس رہنے لگی۔۔۔۔۔۔محلے میں بچے شور مچاتے تو اس کے کان پھٹنے لگتے اس کا جی چاہتا کہ باہر نکل کر ان سب کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کے شوہر علم الدین کو اولاد و لاد کی کوئی فکر نہیں تھی وہ اپنے بیوپار میں مگن تھا کپڑے کے بھاؤ روز بروز چڑھ رہے تھے۔ آدمی چونکہ ہشیار تھا، اس لیے اس نے کپڑے کا کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اب اس کی ماہانہ آمدن پہلے سے دوگنا ہو گئی تھی۔

مگر اس آمدن کی زیادتی سے زبیدہ کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی جب اس کا شوہر نوٹوں کی گڈی اس کو دیتا، تو اسے اپنی جھولی میں ڈال کر دیر تک انہیں لوری دیتی رہتی۔۔۔پھر وہ انہیں اٹھا کر کسی خیالی جھولنے میں بٹھا دیتی۔

ایک دن علم الدین نے دیکھا کہ وہ نوٹ جو اس نے اپنی بیوی کو لا کر دیئے تھے، دودھ کی پتیلی میں پڑے ہیں وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے یہاں پہنچ گئے چنانچہ اس نے زبیدہ سے پوچھا "یہ نوٹ دودھ کی پتیلی میں کس نے ڈالے ہیں؟"

زبیدہ نے جواب دیا "بچے بڑے شریر ہیں، یہ حرکت انہی کی ہو گی"

علم الدین بہت متحیر ہوا "لیکن یہاں بچے کہاں ہیں؟"

زبیدہ اپنے خاوند سے کہیں زیادہ متحیر ہوئی "کیا ہمارے ہاں بچے نہیں۔۔۔۔۔آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔ابھی سکول سے واپس آتے ہوں گے۔۔۔ان سے پوچھوں گی کہ یہ حرکت کس کی تھی۔"

علم الدین سمجھ گیا اس کی بیوی کے دماغ کا توازن قائم نہیں لیکن اس نے اپنی ساس سے اس کا ذکر نہ کیا کہ وہ بہت کمزور عورت تھی۔

وہ دل ہی دل میں زبیدہ کی دماغی حالت پر افسوس کرتا رہا مگر اس کا علاج اس کے بس میں نہیں تھا اس نے اپنے کئی دوستوں سے مشورہ لیا ان میں سے چند نے اس سے کہا کہ پاگل خانے میں داخل کرا دو۔ مگر اس کے خیال ہی سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا سارا وقت گھر رہتا اور زبیدہ کی دیکھ بھال کرتا، کہ مبادا وہ کسی روز کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔

اس کے گھر پر ہر وقت موجود رہنے سے زبیدہ کی حالت کسی قدر درست ہو گئی، لیکن اس کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ دکان کا کاروبار کون چلا رہا ہے۔ کہیں وہ آدمی جس کو یہ کام سپرد کیا گیا ہے، غبن تو نہیں کر رہا۔

اس نے چنانچہ کئی مرتبہ اپنے خاوند سے کہا ”دکان پر تم کیوں نہیں جاتے؟“

علم الدین نے اس سے بڑے پیار کے ساتھ کہا ”جانم۔۔۔میں کام کر کے تھک گیا ہوں، اب تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں“

”مگر دکان کس کے سپرد ہے؟“

میرا نوکر ہے۔۔۔وہ سب کام کرتا ہے

”کیا ایماندار ہے؟“

”ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔بہت ایماندار ہے۔۔۔۔دمڑی دمڑی کا حساب دیتا ہے۔۔۔۔تم کیوں فکر کرتی ہو“

زبیدہ نے بہت متفکر ہو کر کہا ”مجھے کیوں فکر نہ ہو گی بال بچے دار ہوں مجھے اپنا تو کچھ خیال نہیں لیکن ان کا تو ہے۔۔۔۔یہ آپ کا نوکر اگر آپ کا روپیہ مار گیا تو یہ سمجھئے کہ بچوں۔۔۔۔“

علم الدین کی آنکھوں میں آنسو آگئے ”زبیدہ۔۔۔۔۔۔ان کا اللہ مالک ہے ویسے میرا نوکر بہت وفادار ہے اور ایماندار ہے، تمہیں کوئی تردد نہیں کرنا چاہیے۔“

”مجھے تو کسی قسم کا تردد نہیں ہے، لیکن بعض اوقات ماں کو اپنی اولاد کے متعلق سوچنا ہی پڑتا ہے۔“

علم الدین بہت پریشان تھا کہ کیا کرے زبیدہ سارا دن اپنے خیالی بچوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ ان کی جرابیں دھوتی، ان کے لیے اونی سوئٹر بنتی کئی بار اس نے اپنے خاوند سے کہہ کر مختلف سائز کی چھوٹی چھوٹی سینڈلیں منگوائیں، جن کو وہ ہر صبح پالش کرتی تھی۔

علم الدین یہ سب کچھ دیکھتا اور اس کا دل رونے لگتا۔ اور وہ سوچتا کہ شاید اس کے گناہوں کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ یہ گناہ کیا تھے، اس کا علم، علم الدین کو نہیں تھا۔

ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملا جو بہت پریشان تھا علم الدین نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک لڑکی سے معاشقہ ہو گیا تھا اب وہ حاملہ ہو گئی ہے اسقاط کے تمام ذرائع استعمال کیے گئے ہیں، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ علم الدین نے اس سے کہا ''دیکھو اسقاط وسقاط کی کوشش نہ کرو۔ بچہ پیدا ہونے دو''

اس کے دوست نے جسے ہونے والے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کہا ''میں بچے کا کیا کروں گا؟''

''تم مجھے دے دینا''

بچہ پیدا ہونے میں کچھ دیر تھی اس دوران میں علم الدین نے اپنی بیوی زبیدہ کو یقین دلایا کہ وہ حاملہ ہے اور ایک ماہ کے بعد اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا

زبیدہ بار بار کہتی ''مجھے اب زیادہ اولاد نہیں چاہیے، پہلے ہی کیا کم ہے''

علم الدین خاموش رہتا

اس کے دوست کی داشتہ کے لڑکا پیدا ہوا، جو علم الدین نے زبیدہ کے پاس جو کہ سو رہی تھی، لٹا دیا۔۔۔ اور اسے جگا کر کہا ''زبیدہ، تم کب تک بے ہوش پڑی رہو گی یہ دیکھو، تمہارے پہلو میں کیا ہے۔''

زبیدہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ننھا منا بچہ ہاتھ پاؤں

مار رہا ہے۔ علم الدین نے اس سے کہا ''لڑکا ہے اب خدا کے فضل و کرم سے ہمارے پانچ بچے ہو گئے ہیں۔''

زبیدہ بہت خوش ہوئی ''یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟''

''صبح سات بجے''

''اور مجھے اس کا علم ہی نہیں ۔۔۔۔ میرا خیال ہے درد کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔''

علم الدین نے کہا ''ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو گیا۔''

دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ لہو لہان ہے اس کے ہاتھ میں اس کا کٹ تھروٹ استرا ہے وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔

علم الدین نے اس کے ہاتھ سے استرا چھین لیا ''یہ کیا کر رہی ہو تم؟''

زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا ''ساری رات بلکتا رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا ۔۔۔ لعنت ہے ایسی ۔۔۔''

اس سے آگے، وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگا دی، اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

☆☆☆☆☆☆

ایکٹریس کی آنکھ

"پاپوں کی گٹھڑی" کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی، رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لیے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹرسیں سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لیے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالیوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سن کر کسی نو وارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا، ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا آنکھیں کھلی تھیں اور منہ بھی نیم وا تھا مگر وہ سو رہا تھا اسی طرح اس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا ایکٹر اونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں، میک اپ ٹیبل پر رکھے، شاید وہ گیت بنانے میں مصروف تھے جو انہیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

"اوئی، اوئی، اوئی۔۔ہائے۔۔۔۔۔۔ہائے"

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی ولن صاحب جھٹ سے اٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے مونچھوں والے ایکٹر کے لمبے لمبے کان ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لیے تیار ہوئے۔ غنشی صاحب نے میک اپ ٹیبل پر سے ٹانگیں اٹھالیں اور ولن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا

''اوئی، اوئی، اوئی۔۔۔۔ہائے۔۔۔۔ہائے''

اس پر ولن، غنشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے، سب نے کاٹھ کے اس بکس نما کمرے سے اپنی گردنیں باہر نکالیں

''ارے، کیا ہے بھئی''

''خیر تو ہے''

''کیا ہوا؟''

''اماں، یہ تو۔۔۔۔دیوی ہیں''

''کیا بات ہے! دیوی؟''

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔۔کھڑکی میں سے نکلی ہوئی ہر گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور استفسار کے ملے جلے جذبات کا اظہار ہوا۔

''ہائے۔۔۔ہائے۔۔۔ہائے۔۔اوئی۔۔۔اوئی''

دیوی، کمپنی کی ہر دلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے منہ سے چیخیں نکلیں اور باہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اس نے اپنے چپل پہنے پاؤں کو

زور زور سے اسٹوڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی گندمی رنگت، خوب خوب کالی کالی تیکھی بھنویں، کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکا۔۔۔ بال کالے بھنورا سے جو سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کنگھی کیے ہوئے تھے، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے شہد کی بہت سی مکھیاں چھتے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چولی گجراتی تراش کی تھی، بغیر آستینوں کے، جن میں سے جوبن چھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا۔۔۔۔ گول گول کلائیاں جن میں کھلی کھلی جاپانی ریشمیں چوڑیاں کھنکھا رہی تھیں۔ ان ریشمیں چوڑیوں میں ملی ہوئی ادھر ادھر ولایتی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں جھم جھم کر رہی تھیں کان موزوں اور لویں بڑی خوبصورتی کے ساتھ نیچے جھکی ہوئیں، جن میں ہیرے کے آویزے، شبنم کی دو تھراتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیختی چلاتی، اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتی، دیوی نے داہنی آنکھ کو ننھے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

"ہائے میری آنکھ۔۔۔ ہائے میری آنکھ۔۔۔۔۔۔ ہائے"

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں، پھر سے ملنے لگیں۔

"آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟"

''یہاں کنکر بھی تو بے شمار ہیں۔۔۔۔۔۔ ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں''

''یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے''

''اندر آجاؤ، دیوی''

''ہاں، ہاں، آؤ۔۔۔ آنکھ کو اس طرح نہ ملو''

''ارے بابا۔۔۔ بولا نہ تکلیف ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔ تم اندر تو آؤ''

آنکھ ملتی ملتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی

ولن نے لپک کر تپائی سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جما دیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی صوفے پر سے منشی صاحب اور ولن اٹھ کھڑے ہوئے منشی صاحب نے بڑھ کر کہا ''آؤ، دیوی یہاں بیٹھو''

دروازے کے پاس بڑی بڑی سیاہ و سفید مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے، ان کی مونچھوں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے اور انہوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجہ میں کہا ''ادھر بیٹھو''

دیوی ان کی تھرتھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دیئے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی ایک نوجوان نے جو ہیرو سے معلوم ہو رہے تھے اور چھینٹی چھینٹی قمیص پہنے ہوئے تھے، جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سرکا کر آگے بڑھا

دی اور دیوی نے اس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب وغریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوت احساس چونکہ دوسرے مردوں سے زیادہ تھی، اس لیے چشمہ ہٹا کر انہوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی۔

جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی، اس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے متفکرانہ انداز میں کہا ''آنکھ کی سرخی بتا رہی ہے کہ تکلیف ضرور ہے''

ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اٹھا

یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

ولن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا ''جلن محسوس ہوتی ہے یا چبھن''

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے ''پپوٹوں کے نیچے رگڑ سی تو محسوس نہیں ہوتی''

دیوی کی آنکھ سرخ ہو رہی تھی پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث میلے میلے نظر آ رہے تھے چتونوں میں سے لال لال ڈوروں کی جھلک چک میں سے غروب آفتاب کا سرخ سرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ داہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں، جس سے ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔

باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا۔

"آں ۔۔۔بڑا تکلیف دہ ہوتی ہے ۔۔ہائے ۔۔۔اوئی" اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔

سیاہ وسفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا "اس طرح آنکھ نہ رگڑو خالی پیلی کوئی اور تکلیف ہو جائے گی۔"

"ہاں، ہاں ۔۔۔ارے، تم پھر وہی کر رہی ہو" پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا

ولن جو فوراً ہی دیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے "تم سب بیکار باتیں بنا رہے ہو ۔۔کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے ۔۔۔اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے ۔۔۔" یہ کہہ کر انہوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا۔" ارے ۔۔۔کوئی ہے ۔۔کوئی ہے؟ گلاب؟ ۔۔۔گلاب"

جب ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو انہوں نے گردن اندر کو کر لی اور بڑبڑانا شروع کر دیا "خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہو جاتا ہے ۔۔۔پڑا اونگھ رہا ہوگا اسٹوڈیو میں کسی تختے پر ۔۔۔مردود، نابکار" پھر فوراً ہی دور اسٹوڈیو کے اس طرف گلاب کو دیکھ کر چلائے، جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آ رہا تھا "ارے گلاب ۔۔۔گلاب!"

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ولن صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں اس سے کہا " دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاؤ ۔۔۔جلدی سے ۔۔۔بھاگو"

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، دیکھنے کے لیے کہ یہ گڑ بڑ کیا ہے۔۔۔اس پر ہیرو صاحب للکارے "ارے دیکھتا کیا ہے۔۔۔لا، نا گلاس میں تھوڑا سا پانی۔۔۔۔۔۔بھاگ کے جا، بھاگ کے"

گلاب سامنے، ٹین کی چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔دیوی کی آنکھ میں چبھن اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اس کی بناری لنگڑے کی کیری ایسی ننھی منی ٹھوڑی روتے بچے کی طرح کانپنے لگی اور وہ اٹھ کر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی دتی بٹوے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اس نے اپنی دکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا۔اتنے میں منشی صاحب بولے "گلاب سے کہہ دیا ہوتا۔۔۔۔پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈالتا لائے۔"

"ہاں، ہاں، سرد پانی اچھا رہے گا" یہ کہہ کر ولن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے "گلاب۔۔۔۔ارے گلاب۔۔پانی میں تھوڑی سی برف چھوڑ کے لانا"

اس دوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، کہنے لگے "میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھانپ سے گرم کرو اور اس سے آنکھ کو سینک دو۔۔۔۔۔کیوں دادا؟"

"ایک دم ٹھیک رہے گا" سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اثبات میں بڑے زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے۔اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو

کر کھڑے ہو گئے۔دیوی نے رومال لے لیا اور اسے منہ کے پاس لے جا کر گال پھلا پھلا کر سانس کی گرمی پہنچائی، آنکھ کو ٹکور دی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

"کچھ آرام آیا؟" سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا

دیوی نے رونی آواز میں جواب دیا "نہیں۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔ابھی نہیں نکلا۔۔۔۔۔میں مر گئی!۔۔۔۔۔"

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ہیرو اور ولن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چوایا جب گلاس کا پانی آنکھ کو غسل دینے میں ختم ہو گیا تو دیوی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور آنکھ جھپکانے لگی۔

"کچھ افاقہ ہوا"

"اب تکلیف تو نہیں ہے؟"

"کنکری نکل گئی ہو گی"

"بس تھوڑی دیر کے بعد آرام آجائے گا"

آنکھ دھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لیے دیوی کی آنکھ میں چبھن رفع کر دی ،مگر فوراً ہی پھر سے اس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نو وارد کہنہ سال ہونے کے باوجود چست و چالاک معلوم ہوتے تھے مونچھیں سفید تھیں جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں ان کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ فوج میں رہ چکے ہیں۔

سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرف ترچھی پہنے ہوئے تھے پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا کولہوں اور رانوں کے اوپر پتلون میں پڑے ہوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی نکٹائی کچھ اس طرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ ان سے روٹھی ہوئی ہے۔ پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر سے کھنچ کر آگے بڑھا ہوا تھا، جو یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس بے جان چیز سے بہت کڑا کام لیتے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پچکے ہوئے آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، جو بار بار شانوں کی عجیب جنبش کے ساتھ سکیڑ لی جاتی تھیں۔

آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا ''کنکر پڑ گیا ہے کیا؟'' اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے ہیرو اور ولن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرکے آپ نے کہا ''پانی سے آرام نہیں آیا۔۔۔۔خیر۔۔۔۔ رومال ہے کسی کے پاس؟''

نصف درجن رومال ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا، اور اس کا ایک کنارا پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ ہٹا لینے کا حکم دیا۔

جب دیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی تو انہوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بٹوا نکالا اور اس میں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھالیا۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دوری سے اکڑ کر معائنہ کیا پھر دفعتاً فوٹوگرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں

چھوڑی گئیں اور جب انہوں نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو وا کرنا چاہا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ فوٹو لیتے وقت کیمرے کا لینس بند کر رہے ہیں۔

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہونے کا رخ بدل کر انہوں نے دیوی کی آنکھ کا معائنہ کیا اور پھر پپوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ ان کے اندر داخل کر دیا۔۔۔ حاضرین خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی۔ آنکھ صاف کرنے کے بعد اسی ڈرامائی انداز میں فوٹو گرافر صاحب نے۔۔۔۔ چونکہ وہ بزرگ فوٹو گرافر ہی تھے۔ چشمہ اتار کر چرمی بٹوے میں رکھ کر دیوی سے کہا "اب کنکر نکل گیا ہے۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر میں آرام آ جائے گا۔"

دیوی نے انگلیوں سے آنکھ کے پپوٹوں کو چھوا اور ننھا سا آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی۔

"کنکری نکل گئی نا؟"

"اب درد محسوس تو نہیں ہوتا"

"سالا، اب نکل گیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ بہت دکھ دیا ہے اس نے"

"دیوی۔۔۔۔۔۔ اب طبیعت کیسی ہے؟"

یہ شور سن کر فوٹو گرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا "تم سارا دن کوشش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا۔۔۔۔۔ ہم فوج میں پچیس برس بھاڑ نہیں جھونکتا رہا۔۔۔ یہ سب کام جانتا ہے۔۔۔۔ کنکر نکل گیا ہے، اب صرف جلن باقی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں رونی صورت بنائے اپنا اطمینان کر رہی تھی ایکا ایکی مسکرائی اور پھر کھل کھلا کر ہنس دی۔۔۔۔چوبی کمرے میں مترنم تارے بکھر گئے۔

''اب آرام ہے۔۔۔۔۔۔اب آرام ہے'' یہ کہہ کر دیوی، سیٹھ کی جانب روانہ ہوگئی، جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا، اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔

ہیرو جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو منشی صاحب کی ران نیچے دب گئی آپ بھنا گئے

''اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے۔۔۔۔۔چلو بیٹھو، مجھے کل والے سین کے ڈائیلاگ سناؤ''

ہیرو کے دماغ میں اس وقت کوئی اور ہی سین تھا۔

☆☆☆☆☆☆

بانجھ

میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حد نظر پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا دور بہت دور، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے۔ بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے، جسے ادھر سے ادھر سمیٹا جا رہا ہے۔

ساحل کے سب قمقمے روشن تھے۔ جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر کپکپاتی ہوئی موٹی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھریلی دیوار کے نیچے کئی کشتیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے سمندر کی لہروں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر فضا میں گھلی ہوئی تھی کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے ''ہوں'' کی ہے۔

ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزہ آتا ہے میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی مگر ماچس نہ ملی جانے کہاں بھول آیا تھا سگریٹ کی ڈبیا

واپس جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ پاس سے کسی نے کہا

"ماچس لیجئے گا"

میں نے مڑ کر دیکھا بنچ کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا یوں تو بمبئی کے عام باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے لیکن اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا "آپ کی بڑی عنایت ہے"

یہ سن کر اس نے ماچس کی ڈبیا جو اس کے ہاتھ ہی میں تھی میری طرف بڑھا دی میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور کہا "تشریف رکھیے"

اس نے جواب دیا "آپ سگریٹ سلگا لیجئے، مجھے جانا ہے"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے کیونکہ اس کے لہجے سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اسے کہیں جانا ہے آپ کہیں گے کہ لہجے سے ایسی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا " ایسی جلدی کیا ہے۔۔۔ تشریف رکھیے" اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی "شوق فرمائیے"

اس نے سگریٹ کے چھاپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا "شکریہ میں صرف اپنا برانڈ پیا کرتا ہوں"

آپ مانیں نہ مانیں مگر میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس بار اس نے پھر جھوٹ بولا اس مرتبہ پھر اس کے لہجے نے چغلی کھائی اور مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی اس لیے کہ میں نے اپنے دل میں قصد کر لیا تھا کہ اسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤں گا اور اپنا

سگریٹ پلواؤں گا میرے خیال کے مطابق اس میں مشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی کیونکہ اس کے دو جملوں ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھے اور سگریٹ پئے لیکن بیک وقت اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس نہ بیٹھے اور میرا سگریٹ نہ پئے چنانچہ ہاں اور نہ کا یہ تصادم اس کے لہجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا آپ یقین جانئے کہ اس کا وجود بھی ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں لٹکا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں بے حد پتلا تھا اس پر اس کی ناک آنکھوں اور منہ کے خطوط اس قدر مدھم تھے جیسے کسی نے تصویر بنائی ہے اور اس کو پانی سے دھو ڈالا ہے کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ ابھر سے آتے لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاری کی مانند سو جاتے۔ اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا آنکھیں گدلے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں جن پر اس کی چھدری پلکیں جھکی ہوئی تھیں بال کالے تھے مگر ان کی سیاہی جلے ہوئے کاغذ کی مانند تھی جن میں بھوسلا پن بھی ہوتا ہے قریب سے دیکھنے پر اس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہو سکتا تھا مگر دور سے دیکھنے پر وہ بالکل چپٹی معلوم ہوتی تھی کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کر چکا ہوں اس کے چہرے کے خطوط بالکل ہی مدھم تھے۔

اس کا قد عام لوگوں جتنا تھا یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمر کی ہڈی کو ڈھیلا چھوڑ کے کھڑا ہوتا تو اس کے قد میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا اس طرح جب وہ ایک دم کھڑا ہوتا تو اس کا قد جسم کے مقابلے میں

بہت بڑا دکھائی دیتا۔

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرت استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دھلائی کی مار تھی مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا میں نے سعی کر رہا تھا اس لیے کہا کیونکہ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے سارے وجود میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ سلگا کر اس کی طرف پھر ڈبیا بڑھا دی ”شوق فرمائیے“

یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا اور فوراً ہی ماچس سلگا کر اس انداز سے پیش کی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبا لیا اور اسے سلگا کر پینا بھی شروع کر دیا لیکن ایکا ایکی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور منہ میں سے سگریٹ نکال کر مصنوعی کھانسی کے آثار حلق میں پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا ” کیونڈر مجھے راس نہیں آتے ان کا تمباکو بہت تیز ہے میرے گلے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں“

میں نے اس سے پوچھا ”آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں؟“

اس نے تتلا کر جواب دیا ”میں۔۔۔میں۔۔۔میں دراصل سگریٹ بہت کم پیتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر اروِلکر نے منع کر رکھا ہے ویسے میں تھری فائیو پیتا ہوں جن کا

تمباکو تیز نہیں ہوتا۔"

اس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے اس کی فیس دس روپے ہے جن سگرٹوں کا اس نے حوالہ دیا ان کے متعلق آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں اس نے ایک ہی سانس میں دو جھوٹ بولے جو مجھے ہضم نہ ہوئے مگر میں خاموش رہا حالانکہ سچ عرض کرتا ہوں اس وقت میرے دل میں یہی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ اس کا غلاف اتار دوں اور اس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں اور اسے کچھ اس طرح شرمندہ کروں کہ وہ مجھ سے معافی مانگے مگر میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا جز بن کر رہ گیا ہے جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سرخی سی دوڑ جایا کرتی ہے مجھے نظر نہ آئی بلکہ میں نے دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے اس کو حقیقت سمجھتا ہے اس کے جھوٹ میں اس قدر اخلاص تھا یعنی اس نے اتنے پر خلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا کہ اس کی میزان احساس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی خیر اس قصے کو چھوڑیئے ایسی باریکیاں میں آپ کو بتانے لگوں تو صفحوں کے صفحے کالے ہو جائیں گے اور افسانہ بہت خشک ہو جائے گا۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے اس کا راہ پر لگا لیا اور ایک اور سگریٹ پیش کر کے سمندر کے دلفریب منظر کی بات چھیڑ دی چونکہ افسانہ نگار ہوں اس لیے کچھ اس دلچسپ طریقے پر اسے سمندر، اپولو بندر اور وہاں آنے جانے والے تماشائیوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں کہ چھ سگریٹ پینے پر بھی اس کے حلق میں خرخراہٹ پیدا نہ ہوئی اس نے میرا نام پوچھا میں نے بتایا تو وہ اٹھ کھڑا

ہوا اور کہنے لگا ’’آپ۔۔۔۔آپ مسٹر۔۔۔ہیں۔۔۔میں آپ کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں مجھے۔۔۔۔مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی۔۔۔۔ہیں۔۔۔۔مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی واللہ بہت خوشی ہوئی ہے۔‘‘

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس نے اپنی بات شروع کر دی ’’ہاں خوب یاد آیا ابھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے۔۔۔۔عنوان بھول گیا ہوں۔۔۔۔اس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی مگر وہ اسے دھوکا دے گیا اسی لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا جو افسانہ سناتا ہے جب اس کو لڑکی کی افتاد کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس سے ملتا ہے اور اس سے کہتا ہے زندہ رہو۔۔۔ان چند گھڑیوں کی یاد میں اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کرو جو تم نے اس کی محبت میں گزاری ہیں اس مسرت کی یاد میں جو تم نے چند لمحات کے لیے حاصل کی تھی‘‘ مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی لیکن مجھے بتائیے کیا ایسا ممکن ہے۔۔۔۔ممکن کو چھوڑیئے آپ یہ بتائیے کہ وہ آدمی کیا آپ تو نہیں تھے؟۔۔۔۔معاف کیجئے گا میں ایسے سوال کر رہا ہوں جو مجھے نہیں کرنے چاہئیں۔۔۔۔۔مگر کیا آپ ہی نے اس سے کوٹھے پر ملاقات کی تھی اور اس کی تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے آئے تھے۔۔۔۔یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا ’’مگر مجھے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔۔۔۔اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے۔‘‘

اس پر میں نے کہا ’’میں آپ کو بتاؤں گا۔۔۔۔لیکن پہلی ملاقات میں سب

کچھ پوچھ لینا اور سب کچھ بتانا اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ کا کیا خیال ہے؟'' وہ جوش جو گفتگو کرتے وقت اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا اس نے دھیمے لہجے میں کہا ''آپ کا فرمانا بالکل درست ہے مگر کیا پتہ ہے کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو''

اس پر میں نے کہا ''اس میں شک نہیں بمبئی بہت بڑا شہر ہے لیکن ہماری ایک نہیں، بہت سی ملاقاتیں ہو سکتی ہیں بیکار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار۔۔۔ شام کو ہر روز اسی وقت بشرطیکہ بیمار نہ ہو جاؤں آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے۔۔۔ یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں اور میں اس لیے آتا ہوں کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں۔۔۔ محبت بری چیز نہیں ہے۔''

''محبت۔۔۔ محبت۔۔۔!'' اس نے اس سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا اور جلتی ہوئی رسی کی طرح آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ازراہ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا دراصل اس وقت فضا ایسی دلفریب تھی کہ اگر میں کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار کے اندر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کے قربت کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحت شعور ہی میں چھپا رہتا ہے۔

خدا معلوم اس نے کس افسانے کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں میں اپنی زندگی میں

بہت کم عورتوں سے ملا ہوں وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لیے میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے اس لیے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق ہیں میں نے چند افسانے لکھے ہیں مگر وہ رومان نہیں ہیں اس نے جس افسانے کا ذکر کیا تھا وہ یقیناً کوئی ادنیٰ درجے کا رومان تھا جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لیے لکھا ہو گا۔۔۔۔لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

ہاں، تو جب وہ محبت کہہ کر خاموش ہو گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا، ''محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں، سردیوں میں پیدا ہو، یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں۔۔۔۔محبت خوب صورت کریں یا بدصورت، بدکردار کرے یا نیکوکار۔۔۔۔محبت محبت ہی رہتی ہے اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی چلی آ رہی ہے اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے یہ جدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راجکماری جنگل میں غلام محمد کے دل میں بھنگن محبت پیدا کر دے اور نتھو رلال کے دل میں کوئی رانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں اسی طرح محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں

بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے جس طرح عورت کا حمل گر جاتا ہے اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے، ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں۔۔۔۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹ جاتی ہے یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا نہیں، یہ خواہش ان کے دل میں موجود ہوتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔۔۔محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔''

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی چنانچہ میں اس کی طرف دیکھے بغیر لکچر دیئے چلا جا رہا تھا لیکن جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دور سمندر کے اس پار خلا میں دیکھ رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم تھا میں خاموش ہو گیا۔

جب زور سے کسی موٹر کا ہارن بجا تو وہ چونکا اور خالی الذہن ہو کر کہنے لگا'' جی۔۔۔۔۔آپ نے بالکل درست فرمایا ہے!''

میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں۔۔۔۔'' درست فرمایا ہے؟۔۔۔۔اس کو چھوڑیئے آپ یہ بتایئے کہ میں نے کہا کیا ہے؟'' لیکن میں خاموش رہا اور اس کو موقع دیا کہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اس کے بعد اس نے پھر کہا'' آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے لیکن۔۔۔۔خیر چھوڑیئے اس قصے کو''

مجھے اپنی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوئی تھی میں چاہتا تھا کہ کوئی میری باتیں سنتا چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا ''تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض آدمی بھی محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں یعنی ان کے دل میں محبت کرنے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے لیکن ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی میں سمجھتا ہوں کہ اس بانجھ پن کا باعث روحانی نقائص ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟''

اس کا رنگ اور بھی زرد پڑ گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو یہ تبدیلی اس کے اندر اتنی جلدی پیدا ہوئی کہ میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا ''خیریت تو ہے۔۔۔آپ بیمار ہیں''

''نہیں تو۔۔۔نہیں تو۔۔۔'' اس کی پریشانی اور بھی زیادہ ہو گئی۔۔۔'' مجھے کوئی بیماری ویماری نہیں ہے۔۔۔لیکن آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں بیمار ہوں''

میں نے جواب دیا'' اس وقت آپ کو جو کوئی بھی دیکھے گا یہی کہے گا کہ آپ بہت بیمار ہیں آپ کا رنگ خوفناک طور پر زرد ہو رہا ہے۔۔۔میرا خیال ہے کہ آپ کو گھر چلے جانا چاہیے آیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔''

''نہیں میں خود چلا جاؤں گا مگر میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔۔۔کبھی کبھی میرے دل میں معمولی سا درد پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ شاید وہی ہو۔۔۔۔میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھیے۔''

میں تھوڑی دیر خاموش رہا کیونکہ وہ ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میری بات غور سے سن سکتا۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہنا شروع کیا میں آپ سے

یہ پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔۔۔میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور ان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا لیکن جب میں اس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں جو صرف ایک بیٹی یا بیٹا حاصل کرنے کے لیے دعائیں مانگتی ہے خدا کے حضور میں گڑگڑاتی ہے۔اور جب وہاں سے کچھ نہیں ملتا تو ٹونے ٹوٹکوں میں اپنا گوہر مقصود ڈھونڈتی ہے۔شمشانوں سے راکھ لاتی ہے کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتائے ہوئے منتر پڑھتی ہے منتیں مانتی ہے۔چڑھاوے چڑھاتی ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہو گی جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو۔۔۔۔ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں مجھے اندھوں پر اتنا رحم نہیں آتا۔جتنا ان لوگوں پر آتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ تھوک نگل کر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا اور پرلی طرف منہ کر کے کہنے لگا" اوہ، بہت دیر ہو گئی مجھے ضروری کام کے لیے جانا تھا یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گزر گیا۔"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا وہ پلٹا اور میرا ہاتھ دبا کر لیکن میری طرف دیکھے بغیر اس نے" اب رخصت چاہتا ہوں" کہا اور چل دیا۔

دوسری مرتبہ اس سے میری ملاقات پھر اپولو بندر ہی پر ہوئی۔میں سیر کا عادی نہیں ہوں مگر اس زمانے میں ہر شام اپولو بندر جانا میرا دستور ہو گیا تھا ایک مہینے کے بعد جب مجھے آگرہ کے ایک شاعر نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اس نے نہایت ہی حریصانہ طور پر اپولو بندر اور وہاں جمع ہونے والی پریوں کا ذکر کیا اور

مجھے اس لحاظ سے بہت خوش قسمت کہا کہ میں بمبئی میں ہوں تو اپولو بندر سے میری دلچسپی ہمیشہ کے لیے فنا ہوگئی اب جب کبھی کوئی مجھے اپولو بندر جانے کو کہتا ہے تو مجھے آگرے کے شاعر کا خط یاد آجاتا ہے اور میری طبیعت متلا جاتی ہے لیکن میں اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب یہ خط مجھے نہیں ملا تھا اور میں ہر روز جا کر شام کو اپولو بندر کے اس بنچ پر بیٹھا کرتا تھا جس کے اس طرف کئی آدمی چمپی والوں سے اپنی کھوپڑیوں کی مرمت کراتے رہتے ہیں۔

دن پوری طرح ڈھل چکا تھا اور اجالے کا کوئی نشان باقی رہا تھا اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔۔۔تھکے ہوئے مسافر کی طرح، سیر کرنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا میرے پیچھے موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔بنچ بھی سب کے سب پر تھے جہاں بیٹھتا تھا۔وہاں دو باتونی، ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب کے جمے ہوئے تھے دونوں گجراتی بولتے تھے مگر مختلف لب ولہجہ سے پارسی کی آواز میں دو سر تھے وہ کبھی باریک سر میں بات کرتا تھا کبھی موٹے سر میں جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔

میں ان کی لا متناہی گفتگو سے تنگ آ کر اٹھا اور ٹہلنے کی خاطر تاج محل ہوٹل کا رخ کرنے ہی لگا تھا کہ سامنے سے مجھے وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا اس لیے میں اسے پکار نہ سکا لیکن جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی نگاہیں ساکن ہوگئیں، جیسے اسے وہ چیز مل گئی ہو جس کی اسے تلاش تھی۔

کوئی بنچ خالی نہیں تھا اس لیے میں نے اس سے کہا'' آپ سے بہت دیر کے

بعد ملاقات ہوئی۔۔۔۔۔چلیے سامنے ریستوران میں بیٹھتے ہیں یہاں کوئی بنچ خالی نہیں۔"

اس نے رسمی طور پر چند باتیں کیں اور ساتھ ہولیا چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر ہم دونوں ریستوران میں بید کی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے چائے کا آرڈر دے کر میں نے اس کی طرف سگرٹوں کا ٹین بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے میں نے اسی روز دس روپے دے کر ڈاکٹر ارولکر سے مشورہ لیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اول تو سگریٹ پینا ہی موقوف کردو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اچھے سگریٹ پیا کرو مثال کے طور پر پانچ سو پچپن۔۔۔۔چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ ٹین اسی شام خریدا تھا، اس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہوگیا۔

میں ہنس پڑا" آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگریٹ پینا شروع کیے ہیں۔۔۔۔۔اتفاق کی بات ہے کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر ارولکر کے پاس جانا پڑا کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے چنانچہ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ سگریٹ پیا کرو لیکن بہت کم۔۔۔۔"

میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہوئی ہیں چنانچہ میں نے فوراً اپنی جیب سے وہ نسخہ نکالا جو ڈاکٹر ارولکر نے مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اس کے سامنے رکھ دیا" یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وٹامن کا سارا خاندان اس نسخے میں جمع کر دیا ہے۔"

اس کاغذ کو جس پر ابھرے ہوئے کالے حروف میں ڈاکٹر اروکلر کا نام اور پتہ مندرج تھا اور تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ اس نے چور نگاہوں سے دیکھا اور وہ اضطراب جو اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا فوراً دور ہو گیا چنانچہ اس نے مسکرا کر کہا

''کیا وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں کے اندر رونا منز ختم ہو جاتی ہیں؟''

میں نے جواب دیا ''اس لیے کہ انہیں کھانے کو کافی نہیں ملتا کام زیادہ کرتے ہیں لیکن اجرت بہت ہی کم ملتی ہے''

اس کے بعد چائے آ گئی اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں

پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ پیلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو رہے تھے اسے غالباً کوئی روحانی تکلیف تھی جس کا احساس اسے ہر وقت رہتا تھا۔ کیونکہ باتیں کرتے کرتے وہ بعض اوقات ٹھہر جاتا اور اس کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اس سے اچانک طور پر پوچھا ''آپ اداس کیوں ہیں؟''

''اداس۔۔۔۔۔اداس!'' ایک پھیکی سی مسکراہٹ جوان مرنے والوں کے لبوں پر پیدا ہوا کرتی ہے جو ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وہ موت سے خائف نہیں اس کے ہونٹوں پر پھیل ''میں اداس نہیں ہوں آپ کی طبیعت اداس ہو گی''

یہ کہہ کر اس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا

"اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ایک ضروری کام سے جانا ہے"

مجھے یقین تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے مگر میں نے اسے نہ روکا اور جانے دیا اس دفعہ پھر اس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بے حد پریشان تھا وہ اداس تھا بلکہ یوں کہیے کہ اداسی اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اداسی کا دوسروں کو علم ہو۔ وہ دو زندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا ایک وہ جو حقیقت تھی اور ایک وہ جس کی تخلیق میں وہ ہر گھڑی، ہر لمحہ مصروف رہتا تھا لیکن اس کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ناکام تھے۔ کیوں؟۔۔۔۔۔یہ مجھے معلوم نہیں۔

اس سے تیسری مرتبہ میری ملاقات پھر اپولو بندر پر ہوئی۔ اس دفعہ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہیں ہوئی لیکن گھر پر اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر چند لمحات کے لیے اداسی چھا گئی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے اپنی عادت کے خلاف اپنے آپ کو بہت تروتازہ اور باتونی ظاہر کرنے کی کوشش کی اس کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اس پر اور بھی ترس آیا وہ ایک موت جیسی یقینی حقیقت کو جھٹلا رہا تھا اور مزہ یہ ہے کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن بھی نظر آتا تھا۔

باتوں کے دوران میں اس کی نظر میرے میز پر پڑی۔ شیشے کے فریم میں اس کو ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی اٹھ کر اس نے تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا "کیا میں آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں"

میں نے کہا "بصد شوق!"

اس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا "اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔۔۔میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی۔۔۔۔"

"جی نہیں۔۔۔۔ایک زمانہ ہا اس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا بلکہ یوں کہیے کہ تھوڑی سی محبت میرے دل میں پیدا ہو بھی گئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کو اس کی خبر تک نہ ہوئی اور میں۔۔۔۔میں۔۔۔۔نہیں بلکہ وہ بیاہ دی گئی۔۔۔یہ تصویر میری پہلی محبت کی یادگار ہے جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی۔"

"یہ آپ کی محبت کی یادگار ہے۔۔۔اس کے بعد تو آپ نے اور بہت سے رومان بھی لڑائے ہوں گے" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "یعنی۔۔۔یعنی آپ کی زندگی میں تو کوئی ایسی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی۔"

میں کہنے ہی والا تھا کہ جی نہیں خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا ہی بنجر ہے مگر جانے کیوں، یہ کہتا کہتا رک گیا اور خواہ مخواہ جھوٹ بول دیا "جی ہاں۔۔۔ایسے سلسلے ہوتے ہی رہتے ہیں۔۔۔آپ کی کتاب زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھرپور ہوگی۔"

وہ کچھ نہ بولا اور بالکل خاموش ہوگیا جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔ دیر تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا اور میں اس کی خاموشی سے اداس ہونے لگا تو میں نے کہا "اجی حضرت! آپ کن خیالات میں کھو گئے؟"

وہ چونک پڑا "میں۔۔۔میں۔۔۔کچھ نہیں، میں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا"

میں نے پوچھا ''کوئی بیتی ہوئی کہانی یاد آ گئی۔۔۔۔کوئی بچھڑا ہوا سپنا مل گیا۔۔۔پرانے زخم ہرے ہو گئے''

''زخم۔۔۔پرانے۔۔۔زخم۔۔۔کئی زخم تو نہیں۔۔۔صرف ایک ہی ہے بہت گہرا، بہت کاری۔۔۔اور زخم میں چاہتا بھی نہیں ایک ہی زخم کافی ہے'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اس چھوٹی سی جگہ میں جہاں کرسیاں، میز اور چارپائی سب کچھ پڑا تھا ٹہلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میز کے پاس اسے رکنا پڑا۔ تصویر کو اب کی دفعہ گہری نظروں سے دیکھا اور کہا ''اس میں اور اس میں کتنی مشابہت ہے۔۔۔مگر اس کے چہرے پر ایسی شوخی نہیں تھی اس کی آنکھیں بڑی تھیں مگر ان آنکھوں کی طرح ان میں شرارت نہیں تھی وہ فکر مند آنکھیں تھیں ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا ''موت بالکل نا قابل فہم چیز ہے خاص طور پر اس وقت جبکہ یہ جوانی میں آئے۔۔۔۔۔میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔۔۔۔مگر چھوڑیئے اس قصے کو۔''

میں نے اس سے کہا ''نہیں۔۔۔نہیں۔۔آپ سناتے جایئے۔۔۔لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں۔۔۔۔سچ پوچھئے تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کبھی محبت کی ہی نہ ہوگی۔''

''یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری کتاب زندگی ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہوگی'' یہ کہہ

کر اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ''میں نے اگر محبت نہیں کی تو یہ دکھ میرے دل میں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ میں نے اگر محبت نہیں کی تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چمٹ گیا ہے؟ میں اداس کیوں رہتا ہوں۔۔۔۔ مجھے اپنے آپ کا ہوش کیوں نہیں ہے؟ میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھلا جا رہا ہوں؟''

بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا مگر دراصل وہ سب کچھ اپنے آپ ہی سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا ''میں نے جھوٹ بولا تھا کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوں گے مگر آپ نے بھی تو جھوٹ بولا تھا کہ میں اداس نہیں ہوں اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے۔۔۔ کسی کے دل کا حال جاننا آسان بات نہیں ہے۔ آپ کی اداسی کی اور بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے اور ۔۔۔اور۔۔۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔''

''ہمدردی۔۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ''مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ہمدردی اسے واپس نہیں لا سکتی۔۔۔۔ اس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کر سکتی جس سے مجھے پیار تھا۔۔۔ آپ نے محبت نہیں کی۔۔۔ مجھے یقین ہے آپ نے محبت نہیں کی اس لیے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا۔۔۔ میری طرف دیکھیے''

یہ کہہ کر اس نے خود اپنے آپ کو دیکھا" کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں۔۔۔ میرا وجود خود اس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے۔۔۔ میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں اور کیوں سناؤں جبکہ آپ اسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔۔۔ کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مر گئی ہے آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو موت نے بیٹے پر کیا تھا۔۔۔ میری داستان محبت آپ کو ۔۔۔ کسی کو بھی بلکل معمولی معلوم ہوگی مگر مجھ پر جو اثر ہوا ہے اس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ محبت میں نے کی ہے اور سب کچھ صرف مجھی پر گزرا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اس کے حلق میں تلخی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا وہ آپ کو دھوکا دے گئی" میں نے اس سے پوچھا "یا کچھ اور حالات تھے؟"

"دھوکا۔۔۔ وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔ خدا کے لیے دھوکا نہ کہیے وہ عورت نہیں فرشتہ تھی مگر برا ہو اس موت کو جو ہمیں خوش نہ دیکھ سکی اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پروں میں سمیٹ کر لے گئی۔۔۔۔ آہ!۔۔۔ آپ نے میرے دل پر خراشیں پیدا کر دی ہیں۔ سنیے۔۔۔۔ سنیے۔۔۔ میں آپ کو اس دردناک داستان کا کچھ حصہ سناتا ہوں۔۔۔ وہ ایک بڑے اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی جس زمانے میں اس کی اور میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں اپنے باپ دادا کی ساری جائیداد عیاشیوں میں برباد کر چکا تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ اپنا

وطن چھوڑ کر میں لکھنو چلا آیا۔ اپنی موٹر چونکہ میرے پاس ہوا کرتی تھی اس لیے میں صرف موٹر چلانے کا کام جانتا تھا چنانچہ میں نے اسی کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا پہلی ملازمت مجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی۔ جن کی وہ اکلوتی لڑکی تھی۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھو گیا اور دفعتاً چپ ہو گیا۔ میں بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چونکا اور کہنے لگا "میں کیا کہہ رہا تھا؟"

آپ ڈپٹی صاحب کے یہاں ملازم ہو گئے

"ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ انہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ہر روز صبح نو بجے میں زہرہ کو موٹر میں سکول لے جایا کرتا تھا وہ پردہ کرتی تھی مگر موٹر ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا۔۔۔۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی بلکہ اس میں ایک خاص بات بھی تھی۔۔۔۔۔۔ بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی اس کی سیدھی مانگ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ میں کیا عرض کروں وہ کیا تھی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اس کی صورت اور سیرت بیان کر سکوں۔"

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا اس دوران میں نے کئی مرتبہ اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا لیکن پھر اداسی چھا جاتی اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کر دیتا۔ وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سنا رہا تھا جیسے خود بھی مزہ لے رہا ہو۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اس نے اپنی ساری کہانی پوری کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا۔

زہرہ سے اسے بے پناہ محبت ہوگئی کچھ دن تو موقع پا کر اس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصوبے باندھنے میں گزر گئے۔ مگر جب اس نے سنجیدگی سے اس محبت پر غور کیا تو خود کو زہرہ سے بہت دور پایا ایک موٹر ڈرائیور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ جب اس تلخ حقیقت کا احساس اس کے دل میں پیدا ہوا تو وہ مغموم رہنے لگا لیکن ایک روز اس نے بڑی جرأت سے کام لیا کاغذ کے ایک پرزے پر اس نے زہرہ کو چند سطریں لکھیں۔۔۔ یہ سطریں مجھے یاد ہیں۔

> ''زہرہ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تمہارا نوکر ہوں تمہارے والد صاحب مجھے تیس روپے ماہوار دیتے ہیں مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں کیا کروں، کیا نہ کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔''

یہ سطریں کاغذ پر لکھ کر اس نے کاغذ اس کی ایک کتاب میں رکھ دیا دوسرے روز جب وہ اسے موٹر میں سکول لے گیا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ہینڈل کئی بار اس کی گرفت سے نکل نکل گیا مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہوا۔ اس روز اس کی کیفیت عجیب رہی شام کو جب وہ زہرہ کو سکول سے واپس لا رہا تھا تو راستے میں اس لڑکی نے موٹر روکنے کے لیے کہا اس نے جب موٹر روک لی تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا ''دیکھو نعیم آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا میں نے ابھی تک ابا جی سے تمہارے اس خط کا ذکر نہیں کیا جو تم نے میری کتاب میں رکھ دیا تھا لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو مجبوراً ان سے شکایت کرنا پڑے گی۔

مجھے۔۔۔۔۔چلو اب موٹر چلاؤ۔“

اس گفتگو کے بعد اس نے بہت کوشش کی کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لیے مٹا دے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا ایک مہینہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ایک روز اس نے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا اور زہرہ کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا اسے یقین تھا کہ دوسرے روز صبح کو اسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا شام کو سکول سے واپس آتے ہوئے زہرہ اس سے ہم کلام ہوئی اور ایک بار پھر اس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لیے کہا ”اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو کچھ خیال تمہیں ہونا چاہیے۔“ یہ اس نے ایک بار پھر اسے کچھ اس سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ نعیم کی ساری امیدیں فنا ہو گئیں اور اس نے قصد کر لیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا مہینے کے اخیر میں نوکری چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا اس میں اس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اس سے کہا ”زہرہ! میں نے بہت کوشش کی کہ میں تمہارے کہے پر عمل کر سکوں مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے یہ میرا آخری خط ہے، کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دوں گا اس لیے تمہیں اپنے والد سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی مگر یہ خیال نہ کرنا کہ تم سے دور رہ کر تم سے محبت نہیں کروں گا میں جہاں کہیں بھی رہوں گا میرا دل تمہارے قدموں میں رہے گا میں ہمیشہ ان دنوں کو یاد کرتا رہوں گا جب میں موٹر اس لیے آہستہ آہستہ چلاتا تھا کہ تمہیں دھکا نہ

لگے۔۔۔میں اس کے سوا اور تمہارے لیے کر ہی کیا سکتا تھا۔۔‘‘

یہ خط بھی اس نے موقع پا کر اس کی کتاب میں رکھ دیا صبح کو زہرہ نے سکول جاتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی اور شام کو بھی راستے میں اس نے کچھ نہ کہا چنانچہ وہ بالکل نا امید ہو کر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا جو تھوڑا بہت اسباب اس کے پاس تھا باندھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور لالٹین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ زہرہ اور اس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا ملازم ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اگر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ آدھی رات کے قریب اس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہوئی اس کا دل دھک سے رہ گیا لیکن پھر اس نے خیال کیا کہ مالی ہو گا ممکن ہے اس کے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو اور وہ اس سے مدد لینے کے لیے آیا ہو لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔۔جی ہاں زہرہ۔۔۔۔دسمبر کی سردی میں شال کے بغیر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔اس کی زبان گنگ ہو گئی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کہے چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گزر گئے آخر زہرہ کے ہونٹ وا ہوئے اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا’’ نعیم میں تمہارے پاس آ گئی ہوں بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو۔۔۔۔لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

نعیم خاموش رہا لیکن زہرہ اس سے پوچھنے لگی ''کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

نعیم کو جیسے ٹھیس سی لگی اس کا چہرہ تمتما اٹھا ''زہرہ تم نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب اگر میں دوں تو میری محبت کی توہین ہو گی۔۔۔ میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا میں محبت نہیں کرتا؟''

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال کیا

''میرے باپ کے پاس کافی دولت ہے مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں جو کچھ میرا کہا جاتا ہے میرا نہیں، ان کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے؟''

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا چنانچہ اس سوال نے بھی اس کے وقار کو زخمی کیا بڑے دکھ بھرے لہجے میں اس نے زہرہ سے کہا ''زہرہ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا جواب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے''

زہرہ اس کی کوٹھری میں داخل ہو گئی اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی ''میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی''

زہرہ نے اپنا قول پورا کیا جب دونوں لکھنو چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور شادی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے نعیم کو نوکری مل گئی تھی اس لیے وہ گھر میں نہیں تھا ڈپٹی صاحب نے

زہرہ کو بہت برا بھلا کہا ان کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی وہ چاہتے تھے کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے اور جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جائے وہ نعیم کو دو تین ہزار روپیہ دینے کے لیے بھی تیار تھے مگر انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لیے کہ زہرہ نعیم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی اس نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جی! میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہوں آپ اس سے اچھا شوہر میرے لیے کبھی تلاش نہ کر سکتے ہیں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے اگر آپ ہمیں دعائیں دے سکیں تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔''

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سنی تو بہت خشم آلود ہوئے انہوں نے نعیم کو قید کرا دینے کی دھمکی بھی دی مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا ''ابا جی! اس میں نعیم کا کیا قصور ہے سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں البتہ ہم ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔۔۔۔ یہ کوئی قصور نہیں ہے میں نابالغ نہیں ہوں''

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے فوراً سمجھ گئے کہ جب ان کی بیٹی ہی رضامند ہے تو نعیم پر کیسے جرم عائد ہو سکتا ہے چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اس کو روپے پیسے سے لالچ دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی گو نعیم کی آمدن بہت ہی کم تھی اور زہرہ کو جو ناز و نعمت میں پلی تھی بدن پر کھردرے کپڑے پہننے پڑتے تھے اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے مگر وہ خوش تھی اور خود کو ایک نئی دنیا میں

پاتی تھی جہاں قدم قدم پر نعیم کی محبت کے نئے نئے پہلو اس پر منکشف ہوتے تھے وہ بہت سکھی تھی۔۔۔۔بہت سکھی، نعیم بھی بہت خوش تھا لیکن ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ زہرہ کے سینے میں ایک موذی درد اٹھا اور پیشتر اس کے کہ نعیم اس کے لیے کچھ کر سکے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور نعیم کی دنیا ہمیشہ کے لیے تاریک کر گئی۔

یہ داستان اس نے رک رک کر اور خوب مزے لے لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حال دل سنا چکا تو اس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے تمتما اٹھا جیسے اس کے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خون داخل کر دیا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہو گئی تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا، جیسے اسے بہت جلدی ہے اور کہنے لگا "میں نے بہت غلطی کی۔۔۔جو آپ کی اپنی داستان محبت سنا دی۔۔۔۔میں نے بہت غلطی کی۔۔۔۔زہرہ کا ذکر صرف مجھی تک محدود رہنا چاہیئے تھا۔۔۔۔لیکن ۔۔۔۔لیکن۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔۔۔ "میں زندہ ہوں اور وہ۔۔۔وہ۔۔۔۔" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

نعیم سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی اپولو بندر پر کئی مرتبہ اس کی تلاش میں گیا مگر وہ نہ ملا چھ یا سات مہینے کے بعد اس کا ایک خط مجھے ملا جو میں یہاں پر نقل کر رہا ہوں۔

"۔۔۔صاحب!"

آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستان عشق سنائی تھی۔۔۔۔۔۔وہ محض افسانہ تھا ایک جھوٹا افسانہ کوئی زہرہ ہے نہ نعیم۔۔۔۔میں ویسے موجود تو ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں میں بھی ان بد قسمت آدمیوں میں سے ایک ہوں جن کی ساری جوانی اپنا دل پرچانے میں گزر گئی زہرہ سے نعیم کی محبت ایک دل بہلاوا تھا اور زہرہ کی موت۔۔۔۔میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نے اسے کیوں مار دیا بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔

مجھے معلوم نہیں آپ نے میرے افسانے کو جھوٹا سمجھا یا سچا لیکن میں آپ کو ایک عجیب وغریب بات بتاتا ہوں کہ میں نے۔۔۔۔یعنی اس جھوٹے فسانے کے خالق نے اس کو بالکل سچا سمجھا سو فیصدی حقیقت پر مبنی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے واقعی زہرہ سے محبت کی ہے اور وہ سچ مچ مر چکی ہے آپ کو یہ سن کر اور بھی تعجب ہوگا کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس افسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا اور زہرہ کی آواز اس کی ہنسی بھی میرے کانوں میں گونجنے لگی میں اس کے سانس کی گرمی تک محسوس کرنے لگا افسانے کا ہر ذرہ جاندار ہو گیا اور میں نے۔۔۔۔۔اور میں نے یوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی۔

زہرہ فسانہ نہ سہی مگر میں تو فسانہ ہوں وہ مر چکی ہے، اس لیے مجھے بھی مر جانا چاہیے یہ خط آپ کو میری موت کے بعد ملے گا۔۔۔۔الوداع۔۔۔۔زہرہ مجھے ضرور ملے گی۔۔۔۔کہاں؟۔۔۔۔یہ مجھے معلوم نہیں

میں نے یہ چند سطور صرف اس لیے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں اگر اس سے آپ افسانہ تیار کرلیں تو آپ کو سات آٹھ روپے مل جائیں گے کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ افسانے کا معاوضہ آپ وک سات سے دس روپے تک مل جایا کرتا ہے یہ میرا تحفہ ہوگا اچھا الوداع۔

آپ کا ''ملاقاتی نعیم''

نعیم نے اپنے لیے زہرہ بنائی اور مر گیا۔۔۔ میں نے اپنے لیے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے اور زندہ ہوں۔۔۔ یہ میری زیادتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

باسط

باسط بالکل رضامند نہیں تھا لیکن ماں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اول اول تو اس کو اتنی جلدی شادی کرنے کی خواہش نہیں تھی اس کے علاوہ وہ لڑکی بھی اسے پسند نہیں تھی جس سے اس کی ماں اس کی شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی وہ بہت دیر تک ٹالتا رہا۔ جتنے بہانے بنا سکتا تھا اس نے بنائے، لیکن آخر ایک روز اس کو ماں کی اٹل خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا اور اصل انکار کرتے کرتے وہ بھی تنگ آ گیا تھا چنانچہ اس نے دل میں سوچا "یہ بک بک ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے، ہونے دو شادی، کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑے گی ۔۔۔۔ میں نبھا لوں گا"

اس کی ماں بہت خوش ہوئی لڑکی والے اس کے عزیز تھے اور وہ عرصہ ہوا ان کو زبان دے چکی تھی جب باسط نے ہاں کی تو وہ تاریخ پکی کرنے کے لیے لڑکی والوں کے ہاں گئی انہوں نے ٹال مٹول کی تو باسط کی ماں کو بہت غصہ آیا "سعیدہ کی ماں! میں نے اتنی مشکلوں سے باسط کو رضامند کیا ہے، اب تم تاریخ پکی نہیں کر رہی ہو شادی ہو گی تو اسی مہینے کی بیس کو ہو گی نہیں تو نہیں ہو گی اور یہ بات سولہ آنے پکی ہے سمجھ لیا"

دھمکی نے کام کیا لڑکی کی ماں بالآخر راضی ہو گئی سب تیاریاں مکمل ہوئیں بیس کو دلہن گھر میں تھی باسط کو گو وہ پسند نہیں تھی، لیکن وہ اس کے ساتھ نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا، چنانچہ وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیا

کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ کہ وہ زبردستی اس کے سر منڈھ دی گئی ہے۔

نئی دلہنیں عام طور پر بہت شرمیلی ہوتی ہیں لیکن باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اس کے اس شرمیلے پن میں کچھ خوف بھی تھا جیسے وہ باسط سے ڈرتی ہے شروع شروع میں باسط نے سوچا کہ یہ چیز دور ہو جائے گی مگر وہ بڑھتی ہی گئی۔ باسط نے اس کو چند روز کے لیے میکے بھیج دیا واپس آئی تو اس کا خوف آلود شرمیلا پن ایک حد تک دور ہو چکا تھا باسط نے سوچا ایک دو مرتبہ اور میکے جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی مگر اس کا یہ قیاس غلط نکلا سعیدہ پھر خوف زدہ رہنے لگی۔

باسط نے ایک روز اس سے پوچھا ''سعیدہ تم ڈری ڈری کیوں رہتی ہو''

سعیدہ یہ سن کر چونکی ''نہیں تو۔۔۔۔۔نہیں تو''

باسط نے اس سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا'' آخر بات کیا ہے۔۔۔۔۔خدا کی قسم مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔۔۔۔کس بات کا ڈر ہے تمہیں۔۔۔۔میری ماں اتنی اچھی ہے وہ تم سے ساسوں کا سا سلوک نہیں کرتی میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔۔۔پھر تم ایسی صورت کیوں بنائے رکھتی ہو کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں یہ خوف ہے کہ کوئی تمہیں پیٹے گا'' یہ کہہ کر اس نے سعیدہ کا منہ چوما۔

سعیدہ خاموش رہی اس کی آنکھیں البتہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئیں باسط نے اس کو اور پیار کیا اور کہا ''تمہیں ہر وقت ہنستی رہنا چاہیے۔۔۔۔لو اب ذرا ہنسو۔۔۔ہنسو میری جان!''

سعیدہ نے ہنسنے کی کوشش کی باسط نے پیار سے اس کو تھپکی دی ''شاباش۔۔۔۔اسی طرح مسکراتا چہرہ ہونا چاہیے ہر وقت!''

باسط کی یہ محبت ظاہر ہے کہ بالکل مصنوعی تھی، کیونکہ سعیدہ کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی لیکن وہ صرف اپنی ماں کی خاطر چاہتا تھا کہ سعیدہ سے اس کا رشتہ ناکام ثابت نہ ہو اس کی ماں اپنی شکست کبھی برداشت نہ کرسکتی اس نے اپنی زندگی میں شکست کا منہ دیکھا ہی نہیں تھا اس لیے باسط کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ سعیدہ سے اس کی نبھ جائے، چنانچہ اپنے دل میں سعیدہ کے لیے اس نے بڑے خلوص کے ساتھ مصنوعی محبت پیدا کرلی تھی۔

اس کی ہر آسائش کا خیال رکھتا تھا اپنی ماں سے سعیدہ کی چھوٹی سی بات کی بھی تعریف کرتا تھا جب وہ یہ محسوس کرتا کہ اس کی ماں بہت مطمئن ہے، اس بات سے مطمئن ہے کہ اس نے باسط کا رشتہ ٹھیک جگہ کیا ہے تو اس کو دلی خوشی ہوتی۔

شادی کو ایک مہینہ ہوگیا اس دوران میں سعیدہ کئی مرتبہ میکے گئی باسط کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا وہ سمجھتا تھا کہ یوں اس کا خوف آلود شرمیلا پن دور ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوا یہ دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا اب تو سعیدہ وحشت زدہ دکھائی دیتی تھی باسط حیران تھا کہ بات کیا ہے اس کے بارے میں اس نے ماں سے کوئی بات نہ کی اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کو ڈانٹ پلاتیں ''بکواس نہ کرو مجھے معلوم تھا تم ضرور ایک روز اس میں کیڑے ڈالو گے۔''

باسط نے سعیدہ ہی سے کہا ''میری جان! تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو''

سعیدہ چونک اٹھی ''جی؟''

اس کے چونکنے پر باسط نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے سعیدہ کی کسی دکھتی رگ پر زور سے ہاتھ رکھ دیا تھا لہجے میں اور زیادہ پیار بھر کے اس نے کہا۔۔۔۔۔"

میں نے پوچھا تھا کہ اب تم اور زیادہ خوف زدہ رہنے لگی ہو آخر بات کیا ہے۔"

سعیدہ نے تھوڑے توقف کے بعد جواب دیا" بات تو کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔میں ذرا بیمار ہوں"

"کیا بیماری ہے۔۔۔۔۔۔تم نے مجھ سے کبھی ذکر ہی نہیں کیا"

سعیدہ نے دوپٹے کے کنارے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے جواب دیا" امی جان! علاج کرا رہی ہیں میرا جلدی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

باسط نے سعیدہ سے اور زیادہ دلچسپی لینا شروع کی تو اس نے دیکھا کہ وہ ہر روز چھپ کر کوئی دوا کھاتی ہے۔ایک دن جب کہ وہ اپنے قفل لگے ٹرنک سے دوا نکال کر کھانے والی تھی وہ اس کے پاس پہنچ گیا وہ زور سے چونکی سفوف کی کھلی ہوئی پڑیا اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔باسط نے اس سے پوچھا" یہ دوا کھاتی ہو"

سعیدہ نے تھوک نگل کر جواب دیا" جی ہاں۔۔۔۔۔۔۔امی جان نے حکیم صاحب سے منگوائی تھی۔"

"کچھ افاقہ ہے اس سے"

"جی ہاں"

"تو کھاؤ۔۔۔۔اگر آرام نہ آئے تو مجھ سے کہنا میں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا"

سعیدہ نے پڑیا فرش پر سے اٹھائی اور سر ہلا کر کہا" جی اچھا"

باسط چلا گیا اس نے سوچا ''اچھا ہے کوئی علاج تو ہو رہا ہے خدا کرے اچھی ہو جائے میرا خیال ہے یہ ڈرو کچھ نہیں بیماری ہے۔۔۔۔۔ دور ہو جائے گی انشاءاللہ!''

اس نے سعیدہ کی اس بیماری کا اپنی ماں سے پہلی بار ذکر کیا تو کہنے لگی۔۔۔۔۔ ''بکواس ہے خدا کے فضل و کرم سے اچھی بھلی ہے، کیا بیماری ہے اسے؟''

باسط نے کہا ''مجھے کیا معلوم امی جان! یہ تو سعیدہ ہی بتا سکتی ہے آپ کو''

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا ''میں پوچھوں گی اس سے'' جب سعیدہ سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا ''کچھ نہیں خالہ جان! سر میں درد رہتا تھا امی جان نے حکیم صاحب سے دوا منگا دی تھی۔ اصل میں باسط صاحب بڑے وہمی ہیں۔۔۔۔ ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ تم ڈری ڈری سی دکھائی دیتی ہو مجھے ڈر کس بات کا ہوگا بھلا''

باسط کی ماں نے کہا ''بکواس کرتا ہے تم اس کی فضول باتوں کا خیال نہ کیا کرو''

چند روز کے بعد باسط نے محسوس کیا کہ سعیدہ بہت ہی زیادہ گھبرائی ہوئی ہے اس کا اضطراب اس کے رویئے رویئے سے ظاہر ہوتا تھا شام کے قریب اس نے باسط سے کہا ''امی جان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔ مجھے وہاں چھوڑ آیئے''

باسط نے جواب دیا ''نہیں سعیدہ! آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے''

سعیدہ نے اصرار کیا ''آپ مجھے وہاں چھوڑ آیئے ٹھیک ہو جاؤں گی''

باسط نے انکار کر دیا ''وہاں طبیعت ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہاں بھی ٹھیک ہو سکتی ہے، جاؤ آرام سے لیٹ جاؤ''

باسط کی ماں آ گئی باسط نے اس سے کہا ''امی جان! دیکھئے سعیدہ ضد کر رہی ہے طبیعت اس کی ٹھیک نہیں، کہتی ہے مجھے امی جان کے پاس لے چلو۔''

باسط کی ماں نے بڑی بے پروائی سے کہا ''کل چلی جانا سعیدہ!''

سعیدہ نے اور کچھ نہ کہا خاموش ہو کر باہر صحن میں چلی گئی تھوڑی دیر کے بعد باسط باہر نکلا۔ سعیدہ صحن میں نہیں تھی اس نے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملی باسط نے سوچا اوپر کوٹھے پر ہو گی اوپر گیا تو غسل خانے کا دروازہ بند تھا کھٹکھٹا کر اس نے آواز دی ''سعیدہ!''

کوئی جواب نہ ملا تو پھر پکارا ''سعیدہ!''

اندر سے بڑی نحیف آواز آئی ''جی!''

باسط نے پوچھا ''کیا کر رہی ہو''

اور زیادہ نحیف آواز آئی ''نہا رہی ہوں''

باسط نیچے آ گیا سعیدہ کے بارے میں سوچتا سوچتا باہر گلی میں نکلا موری کی طرف نظر پڑی تو اس میں خون ہی خون تھا اور یہ خون اس غسل خانے سے آ رہا تھا جس میں سعیدہ نہا رہی تھی باسط کے ذہن میں تلے اوپر کئی خیالات اوندھے سیدھے گرے پھر یہ گردان شروع ہو گئی ''دوا۔۔۔خون۔۔۔۔خون۔۔۔۔ دوا۔۔۔ڈر۔۔۔دوا۔۔۔۔خون۔۔۔ڈر۔۔۔''

پھر اس نے آہستہ آہستہ سوچنا شروع کیا۔ سعیدہ کی ماں شادی کی تاریخ پکی نہیں کرتی تھی اس نے کہا تھا ایک دو مہینے ٹھہر جاؤ۔۔۔ سعیدہ کا بار بار اپنی ماں سے ملنے جانا۔۔۔۔ اس کا ہر وقت خوفزدہ رہنا دوا کھانا اور خاص طور پر آج بہت

ہی زیادہ وحشت زدہ رہنا۔

باسط سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سعیدہ پیٹ سے تھی جب وہ دلہن بن کر اس کے پاس آئی تھی اس کی ماں کی یہ کوشش تھی کہ حمل گر جائے چنانچہ آج وہ چیز ہوگئی باسط نے سوچا ''کیا میں اوپر جاؤں جا کر سعیدہ کو دیکھوں۔۔۔۔۔ اپنی ماں سے بات کروں''

ماں کا سوچا تو اس کو خیال آیا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ذلیل ہونا کبھی گوارا نہیں کرے گی ضرور کچھ کھا کر مر جائے گی وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اپنے کمرے میں گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کئی بار اس کو سعیدہ کا خیال آیا کہ وہ خدا معلوم کس حالت میں ہوگی اس کے جسم پر اس کے دل و دماغ پر کیا کچھ بیتا ہوگا اور کیا بیت رہا ہوگا کیسے اتنا بڑا راز چھپائے گی کیا لوگ پہچان نہیں جائیں گے جوں جوں وہ سعیدہ کے بارے میں سوچتا اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جاتا اس کو سعیدہ پر ترس آنے لگا'' بے چاری معلوم نہیں بے ہوش پڑی ہے یا ہوش میں ہے ہوش میں بھی اس پر جانے کیا گزری ہوگی کیا وہ نیچے آسکے گی؟''

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر صحن میں گیا تو سعیدہ نیچے آئی اس کا رنگ بے حد زرد تھا اتنا زرد کہ وہ بالکل مردہ معلوم ہوتی تھی اس سے بمشکل چلا جاتا تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں کمر میں جیسے جان ہی نہیں تھی باسط نے اس کو دیکھا تو اس پر بہت ترس آیا اندر سے برقع اٹھایا اور اس سے کہا ''چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

سعیدہ نے بہت ہمت سے کام لیا باسط کے ساتھ چل کر باہر سڑک تک گئی باسط نے تانگہ لیا اور اس کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آیا ماں نے اس سے پوچھا''

سعیدہ کہاں ہے؟"

باسط نے جواب دیا "ضد کرتی تھی میں اسے چھوڑ آیا ہوں"

باسط کی ماں نے اس کو ڈانٹا "بکواس کرتے ہو ضد کرنے دی ہوتی تم اسی طرح اس کی عادتیں خراب کرو گے اور پھر مجھ سے کہو گے کہ میں نے غلط جگہ تمہارا رشتہ کیا تھا۔"

باسط نے کہا "نہیں امی جان! سعیدہ بڑی اچھی لڑکی ہے"

اس کی ماں مسکرائی "میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ وہ بہت نیک لڑکی ہے تم اسے ضرور پسند کرو گے" پھر تھوڑی دیر چھالیا کاٹنے کے بعد ایک دم باسط سے مخاطب ہوئی "اور ہاں باسط یہ اوپر غسل خانے میں خون کیسا تھا"

باسط سٹپٹا گیا "وہ ۔۔۔۔ کچھ نہیں امی جان! میری نکسیر پھوٹی تھی"

ماں نے بڑے غصے کے ساتھ کہا "کم بخت گرم چیزیں نہ کھایا کرو ۔۔۔۔ جب دیکھو جیبیں مونگ پھلی سے بھری ہیں۔"

باسط کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ باتیں کرتا رہا وہ اٹھ کر کہیں گئی تو باسط اوپر غسل خانے میں گیا پانی ڈال کر اس کو اچھی طرح صاف کیا اس کے دل کو اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ اس نے اپنی ماں سے سعیدہ کے متعلق کوئی بات نہیں کی اور نہ اس نے سعیدہ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا راز جانتا ہے۔

وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ سعیدہ کا راز ہمیشہ اس کے سینے میں دفن رہے گا وہ کافی تکلیف اٹھا چکی تھی باسط کے خیال کے مطابق اس کو اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی مزید سزا دینے کا کوئی فائدہ نہیں "خدا کرے وہ جلد تندرست ہو جائے اب

اس کے چہرے پر وہ الجھن پیدا کرنے والا خوف نہیں رہے گا‘‘ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے اس کی ماں کی چیخ کی آواز آئی باسط لوٹا رکھ کر دوڑا نیچے گیا سب کمرے دیکھے ڈیوڑھی میں گیا تو اس کی ماں فرش پر اوندھی پڑی تھی، مردہ اس کے سامنے کوڑے والے لکڑی کے بکس میں ایک چھوٹا بہت ہی چھوٹا سا نامکمل بچہ کپڑے میں لپٹا پڑا تھا۔

باسط کو بے حد صدمہ ہوا اس نے پہلے اس بچے کو اٹھایا کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا اور اندر جا کر بوٹ کے خالی ڈبے میں بند کر دیا پھر ماں کو اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر دیر تک روتا رہا۔

سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو اپنی ماں کے ساتھ آنا پڑا وہ اسی طرح زرد تھی پہلے سے زیادہ نڈھال باسط کو بہت ترس آیا اس سے کہا ’’سعیدہ جو اللہ کو منظور تھا ہو گیا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رونا بند کرو اور جاؤ اندر لیٹ جاؤ‘‘

اندر جانے کے بجائے سعیدہ ڈیوڑھی میں گئی جب واپس آئی تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا باسط خاموش رہا سعیدہ نے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے یہ آنسو صاف بتا رہے تھے کہ وہ باسط کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔۔۔ باسط نے اس سے بڑے پیار سے کہا ’’زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ! جو خدا کو منظور تھا ہو گیا‘‘

دوسرے روز اس نے بچے کو نہر کے کنارے گڑھا کھود کر دفنا دیا۔

29 جولائی 1950ء

☆☆☆☆☆☆

پچھنی

بھنگنوں کی باتیں ہو رہی تھیں خاص طور پر ان کی جو بٹوارے سے پہلے امرتسر میں رہتی تھیں مجید کا یہ ایمان تھا کہ امرتسر کی بھنگنوں جیسی کراری چھوکریاں اور کہیں نہیں پائی جاتیں خدا معلوم تقسیم کے بعد وہ کہاں تتر بتر ہو گئی تھیں۔

رشید ان کے مقابلے میں گجریوں کی تعریف کرتا تھا اس نے مجید سے کہا ''تم ٹھیک کہتے ہو کہ امرتسری بھنگنیں اپنی جوانی کے زمانے میں بڑی پرکشش ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ جوانی کھترانیوں کی طرح زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔۔۔بس ایک دم جوان ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ادھیڑ ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ان کی جوانی معلوم نہیں کون سا چور چرا کے لے جاتا ہے خدا کی قسم۔۔۔ہمارے ہاں ایک بھنگن کوٹھا کمانے آتی تھی۔۔۔۔اتنی کڑیل جوان تھی کہ میں اپنی کمزور جوانی کو محسوس کر کے اس سے کبھی بات نہ کر سکا۔۔۔عیسائی مشنریوں نے اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا نام اس کا فاطمہ تھا، پہلے گھر والے اسے پھاتو کہتے تھے۔۔۔مگر جب وہ عیسائی ہوئی تو اسے مس پھاتو کے نام سے پکارا جانے لگا۔۔۔۔صبح کو وہ برک فاسٹ کرتی تھی، دوپہر کو لنچ اور شام کو ڈنر۔۔۔۔۔۔لیکن چند مہینوں کے بعد میں نے اسے دیکھا کہ اس کی ساری کڑیل جوانی جیسے پگھل گئی ہے۔۔۔اس کی چھاتیاں جو بڑی تند خو تھیں اور اس طرح اوپر اٹھی رہتی تھیں جیسے ابھی اپنا سارا جوبن آپ پر داغ دیں گی، اس قدر نیچے ڈھلک گئی تھیں کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔۔۔لیکن اس کے مقابلے

میں ہمارے گھر میں وہ گجری جو اوپلے لے کر آتی تھی، تیر کی طرح سیدھی تھی اس کی عمر بھی اتنی ہی ہو گی جتنی اس بھنگن کی تھی۔۔۔۔ مگر وہ تین برس کے بعد بھی ویسی ہی جوان تھی۔۔۔۔۔ سرو قد۔۔۔۔۔ اوپلوں کا ٹوکرا اس کے سر پر ہوتا تھا۔۔۔۔ ایک پہاڑ سا بنا ہوا مگر مجال ہے کہ اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش آ جائے یا اس کی کمر میں خفیف سا خم آ جائے۔۔۔۔۔ تین برس وہ ہمارے یہاں آتی رہی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔۔۔۔ اس کے یکے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ اور مجید، میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس کی کمر ویسی کی ویسی مضبوط تھی۔۔۔۔ تم میری مان لو کہ بھنگنیں گوجریوں کا مقابلہ کسی صورت بھی نہیں کر سکتیں"

مجید تلملا رہا تھا اس نے پان کی گلوری پندنیا سے نکال کر اپنے کلے میں دبائی چھوٹی ڈبیا سے ماچس کی تیلی کی مدد سے تھوڑا سا قوام نکالا اور منہ میں ڈال کر بڑے تحمل سے کہا "رشید بھائی۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔ لیکن جس بھنگن کا تصور میرے دماغ میں ہے اور جس کی دراصل میں بات کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اس کی گرد کو امرتسر کی کوئی گجری نہیں پہنچ سکتی۔۔۔۔ وہ ایک قیامت تھی۔۔۔ ایک فتنا تھی۔۔۔ اب تم ایسا کرو کہ میری ساری داستان سن لو تا کہ تمہیں اس فتنہ و قیامت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔۔۔ جوبن ڈھلنے کی تم جو بات کرتے ہو اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں گجریوں کا قد لمبا ہوتا ہے قدرتی طور پر انہیں جلدی ڈھلنا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ ننگے پاؤں رہتی ہیں اور اپنے سر پر بقول تمہارے پہاڑ سا اوپلوں کا ٹوکرا اٹھائے پھرتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن لعنت

بجھو فی الحال گجریوں پر، کیونکہ مجھے پچنی کی بات کرنا ہے جو ہمارے محلے کی بڑی کراری بھنگن تھی۔۔۔۔اس کا قد تو انگشتانہ بھر کا تھا مگر زبان اسکندری گز تھی شادی شدہ تھی، مگر خاوند سے ہر روز لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ ہمارے کمپاؤنڈ میں یہ دونوں میاں بیوی ہر روز صبح سویرے آتے اور ایک بڑ کے درخت کے ساتھ جھولا لٹکا دیتے اس میں وہ اپنا لڑکا ڈال دیتے تھے مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کو جھلانے والا اور کوئی نہیں تھا، چنانچہ دونوں میاں بیوی جھاڑو چھوڑ کر اسے جھولا جھلاتے یا گود میں اٹھائے پھرتے تھے"

رشید نے مجید سے کہا "یہ جھولے کی بات کہاں سے آ گئی۔۔۔۔۔۔تم تو ایک کراری بھنگن کی بات کر رہے تھے۔۔۔۔جو بقول تمہارے بہت خوبصورت تھی۔"

مجید نے فوراً کہا "یار تم جھولے کے ساتھ کیوں اٹک گئے۔۔۔۔۔۔میری پوری کہانی تو سن لو۔۔۔۔۔۔یہ جھولے کی نہیں پچنی کی ہے۔۔۔اس پچنی کی جسے میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا۔۔۔وہ ایک آفت تھی۔۔۔۔صبح اپنے خاوند کے ساتھ آتی تھی۔۔۔۔ہاتھ میں لمبی سی جھاڑو لیے۔۔۔۔۔ماتھے پر سینکڑوں تیوریاں۔۔۔۔ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی جھاڑو آپ کے سر پر دے مارے گی۔۔۔۔۔مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔۔۔۔۔میں نے ہزاروں بار اس کو گھورا، لیکن اس نے میرے سر پر جھاڑو نہیں ماری۔۔۔۔اس کی تیوریاں اس کے ماتھے پر بدستور قائم رہیں اور وہ حسب سابق اپنا کام کرتی رہی۔ اس کا خاوند جس کا نام معلوم نہیں کیا تھا، اول درجے کا زن مرید تھا۔ اس کا قد اپنی بیوی سے بھی چھوٹا

تھا۔وہ اس کو کام کے دوران میں ہمیشہ گالیاں دیا کرتی تھی۔۔۔محلے کے سب لوگ ہنستے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کرتے تھے۔"

رشید اتنی لمبی داستان سنا کر بھنا گیا "تم اصل بات کی طرف آؤ۔۔۔یہ کیا تم مے گوئیاں بک رہے ہو۔۔۔۔۔بچنی نام بڑا اچھا ہے، ورنہ خدا کی قسم، میں تمہاری یہ خرافات کبھی نہ سنتا۔۔۔معلوم نہیں، یہ تمہاری جوڑی ہوئی کہانی ہے۔۔۔۔۔بہر حال تمہیں چند منٹ دیتا ہوں۔۔۔۔۔سنالو"

مجید تاؤ میں آ گیا "الو کے پٹھے۔۔۔تم نے صرف بچنی کا نام سنا ہے، کبھی تم نے اسے دیکھا ہوتا تو دل نکال کر اس کے ٹوکرے میں ڈال دیا ہوتا۔۔۔میں تم سے اگر ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں تو اس میں نمک مرچ لگانے کی مجھے اجازت ہونی چاہیے۔۔۔۔۔تم اگر اکتا گئے ہو تو جہنم میں جاؤ!"

رشید کو اور کوئی کام نہیں تھا۔۔۔۔۔اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ کسی سینما میں چلا جاتا اس لیے مناسب سمجھا کہ مجید کی داستان سن لے "جہنم میں جانے کا سوال نہیں۔۔۔۔تم ذرا اختصار سے کام لو۔۔۔۔۔اصل میں مجھے بچنی سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔"

مجید غصے میں آ گیا "تمہاری دلچسپی کی ایسی کی تیسی۔۔۔۔۔۔سالے، تم کون ہوتے ہو، اس میں دلچسپی لینے والے۔۔۔اس میں دلچسپی لینے والے تم ایسے ہزاروں تھے، مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔۔۔۔۔۔میں تم سے کروڑ مرتبہ زیادہ خوبصورت ہوں، لیکن میں اس کی نگہ التفات کا ہر وقت منتظر رہتا تھا۔۔۔وہ بڑی ہٹیلی تھی۔۔۔۔میرے دوست رشید! خدا کی قسم، اس جیسی لڑکی،

میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی نام اس کا پچنی تھا۔۔۔۔یعنی بچپن سے تعلق رکھتا تھا۔۔مگر وہ تو چھپا چھپاکلنی تھی۔۔۔۔میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو اپنے قبضے میں لے آؤں، پر نا کام رہا وہ پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی تھی۔''

یہ سن کر رشید بولا''تم یار ہمیشہ ایسے معاملوں میں کورے رہے ہو''

مجید کے گہری چوٹ لگی'' بکواس کرتے ہو۔۔۔۔۔۔میں نے ایک روز اسے پکڑ لیا۔۔۔۔میرے گھر کے باہر وہ جھاڑو دے رہی تھی کہ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ چمٹا لیا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' رشید نے ازراہ مذاق سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی بجھا کر اس کے کئی ٹکڑے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیئے۔

مجید کو ایسا معلوم ہوا، کہ رشید نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، بہت جز بز ہوا لیکن آدمی سچا تھا اس لیے جھوٹ نہ بول سکا''یار رشید! تم مذاق اڑاتے ہو۔۔۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ اس روز ہوا، اس کا مذاق اڑانا ہی چاہیے۔۔۔۔میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔۔۔۔۔لیکن اس حرامزادی نے کھینچ کے اپنی جھاڑو میرے منہ پر دے ماری۔میں شرم کے مارے اندر بھاگ گیا۔۔۔۔لیکن فوراً باہر نکلا۔۔۔۔دیکھا کہ وہ میرے مکان کے باہر جھاڑو دے رہی ہے۔۔۔میں نے اسے پھر پکڑا۔۔۔اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔۔۔میں نے سوچا۔۔۔''

رشید نے مجید کا فقرہ مکمل کر دیا'' کہ معاملہ درست ہو گیا ہے''

مجید بوکھلا گیا'' خاک درست ہوا۔۔۔۔۔وہ میری گرفت سے نکل کر سیدھی

میری بیوی کے پاس چلی گئی۔۔۔لیکن اس سے کوئی شکایت نہ کی۔۔۔میں ڈر کے مارے دبکا ہوا تھا۔۔۔میں نے صرف یہ سنا، اور میری جان کا بوجھ ہلکا ہوا۔۔۔''بی بی جی، آج بھی پانی نہیں آیا۔۔۔یہ ان لوگوں کو جو آپ سے ہر مہینے دس روپے وصول کرتے ہیں، کیا ہو گیا ہے۔۔۔کیوں وہ اتنا خیال نہیں کرتے کہ آپ کو ہر روز ماشکی کو دس مشکوں کے چار آنے فی مشک کے حساب سے دو روپے آٹھ آنے دینا پڑیں۔۔۔۔میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے میری عزت و آبرو رکھ لی۔۔۔لیکن میں نے بعد میں سوچا کہ میری عزت آبرو رکھنے والی اصل میں پچنی ہے۔۔۔لیکن جب زیادہ سوچا تو احساس ہوا کہ ایسا سوچنا کفر ہے۔

رشید قریب قریب تنگ آ چکا تھا اس نے اپنے دوست کی خاطر آواز دبا کر کہا'' کافر کے بچے۔۔۔بات تو کر یہ کہ تیرا اس پچنی کی بچی سے کیا ہوا؟۔۔۔کیا تم نے اسے پٹا لیا؟''

مجید نے رشید کی پندنیا سے ایک گلوری لی اور کہا'' دیکھو رشید۔۔۔۔۔تم پچنی کو جانتے نہیں۔۔۔افسوس ہے کہ میں افسانہ نگار نہیں ورنہ میں اس کا کردار بہت اچھی طرح۔۔۔جیتا جاگتا پیش کر سکتا۔۔۔۔۔وہ معلوم نہیں ہے، کیا تھی۔۔۔۔۔عمر اس کی زیادہ سے زیادہ۔۔۔یہ سمجھو کہ سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہوگی۔۔۔قد اس کا ساڑھے چار فٹ ہوگا۔۔۔چھاتی ایسی تھی جیسے لوہے کی بنی ہے حالانکہ ایک بچے کی ماں تھی''

رشید بہت تنگ آ گیا'' ایک بچے کی ماں کے بچے۔۔۔تو اپنی داستان کے

انجام کو پہنچ۔۔مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔۔۔ساڑھے سات بج چکے ہیں، لیکن تمہاری داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی‘‘

مجید سنجیدہ رہا ’’رشید لالے!۔۔۔۔معاملہ بڑا نازک ہے‘‘

’’کس کا؟۔۔۔تمہارا یا میرا؟‘‘

’’میں نہیں کہہ سکتا، لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت معاملہ میرا تو بہت نازک تھا۔۔۔۔سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کروں، کیا نہ کروں۔۔۔۔اب تم یہ خیال کرو کہ میں ہزاروں کا مالک تھا۔۔۔۔تم جانتے ہی ہو کہ ماں باپ مرکھپ چکے تھے۔۔۔۔ساری جائیداد کا میں وارث تھا جہاں چاہتا لٹا دیتا۔۔۔۔اس روز جب میں نے بچی کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچا اور وہ میری گرفت سے یوں الگ ہٹی، جیسے میرا کام تمام کر دے گی لیکن میری بیوی سے اس نے اس سلسلے کا ذکر تک نہ کیا تو مجھے امید ہو گئی کہ چند ایسے معاملوں کے بعد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔‘‘

رشید نے اس سے پوچھا ’’تجھے کامیابی ہوئی‘‘

’’خاک۔۔۔تم اسے جانتے ہی نہیں ہو۔۔۔۔۔بڑی تیز خو لڑکی ہے۔۔۔اپنے خاوند کو کچھ نہیں سمجھتی۔۔۔۔لیکن ایک عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے اتنی چھیڑ چھاڑ کی، لیکن اس نے کسی سے بات تک نہ کی، ورنہ اگر وہ چاہتی تو میرا گھر نکالا کر سکتی تھی‘‘

رشید مسکرایا ’’میں تمہاری بچی کو جانتا ہوں‘‘

مجید نے بڑی حیرت سے پوچھا ’’تم کیسے جانتے ہو اس کو؟‘‘

''جس طرح تم جانتے ہو۔۔۔۔۔۔کیا تم نے ٹھیکا لے رکھا ہے کہ وہ تمہارے ہی محلے میں کام کیا کرے۔۔میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں''

مجید کو یقین نہ آیا'' بکواس کرتے ہو۔۔۔اس کی عمر ہی کتنی ہے کہ تم اسے جانو۔۔۔۔۔دو برس سے کچھ مہینے اوپر ہو گئے ہیں کہ وہ ہمارے محلے میں روزانہ آتی ہے اس کے لڑکے کی عمر بھی دو سال کے قریب ہو گی۔۔۔یعنی جب وہ ہمارے ہاں ملازم ہوئی تو اس کے کوئی بچہ نہیں تھا۔۔۔لیکن دو تین مہینے کے بعد اس کی گود میں ایک لڑکا تھا۔''

رشید پھر مسکرایا''تمہارا؟''

''میرا؟''مجید گھبرا گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا''میرا ہوتا تو کیا کہنے تھے۔۔۔کم از کم میں یہ تو کہنے کے قابل ہو جاتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔''

رشید کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب رنگ اختیار کر گئی''تمہیں اپنی بچنی کے شوہر کا نام معلوم نہیں''

''نہیں!''

''میں بتاتا ہوں تمہیں۔۔۔۔اس کے شوہر کا نام رشید ہے!''

مجید بوکھلا گیا''رشید؟۔۔۔۔کیا اس کا نام رشید ہے؟''

رشید نے بڑے وثوق اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا''ہاں اس کا نام رشید ہے۔۔۔اصل میں وہی اس کا شوہر ہے''

''وہ جو اس کے ساتھ ہمارے محلے میں جھاڑو دیتا ہے اور اپنے بچے کو جھولا

جھلاتا ہے" مجید کی بوکھلاہٹ اسی طرح قائم تھی

رشید کی سنجیدگی میں کچھ اضافہ ہو گیا " وہ الو کا پٹھا اپنے بچے کو جھولا نہیں جھلاتا"

" تو کسے جھلاتا ہے۔۔۔کیا وہ اس رشید کا بچہ نہیں؟"

" نہیں!"

" تو کس کا بچہ ہے؟"

" ایک بہت غریب اور نادار آدمی کا۔۔۔جو خوبصورت بھی نہیں۔۔۔تم سے ہزاروں درجے نیچے ہے"

" کون ہے وہ؟"

" پوچھ کے کیا کرو گے؟"

" کروں گا کیا۔۔۔بس ایسے ہی جاننا چاہتا ہوں"

رشید نے ایک سگریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے کہا " جاننا چاہتے ہو تو جان لو۔۔وہ رشید میں ہوں۔۔۔تمہاری بچی سے میری آشنائی بچپن کی ہے۔۔۔وہ گیارہ برس کی تھی۔۔۔میں تیرہ برس کا۔۔۔جب سے میرا اس کا معاملہ چلا آ رہا ہے۔۔۔وہ لڑکا جو تم اس کی گود میں دیکھتے ہو اور جسے اس کا الو کا پٹھا شوہر ہر روز جھولا جھلاتا ہے، اس خاکسار کی اولاد ہے۔۔۔شکر ہے خداوند کریم کا کہ لڑکی نہ ہوئی، ورنہ میں تو اسے دوسرے ہی روز مار ڈالتا۔۔۔۔"

یہ کہہ کر رشید فوراً اٹھا اور چلا گیا۔۔۔مجید سوچتا رہ گیا کہ خداوند کریم نے اس پر کون سا کرم کیا تھا جو وہ اس کا شکر گزار تھا۔۔۔۔۔!

☆☆☆☆☆

بسم اللہ

فلم بنانے کے سلسلے میں ظہیر سے سعید کی ملاقات ہوئی سعید بہت متاثر ہوا بمبئی میں اس نے ظہیر کو سنٹرل اسٹوڈیوز میں ایک دو مرتبہ دیکھا تھا اور شاید چند باتیں بھی کی تھیں مگر مفصل ملاقات پہلی مرتبہ لاہور ہی میں ہوئی۔

لاہور میں یوں تو بے شمار فلم کمپنیاں تھیں مگر سعید کو اس تلخ حقیقت کا علم تھا کہ ان میں سے اکثر کا وجود صرف ان کے نام کے بورڈوں تک ہی محدود ہے۔ ظہیر نے جب اس کو اکرم کی معرفت بلایا تو اس کو سو فیصدی یقین تھا کہ ظہیر بھی دوسرے فلم پروڈیوسروں کی طرح کھوکھلا ہے جو لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں آفس قائم کرتے ہیں کرائے پر فرنیچر لاتے ہیں اور آخر میں آس پاس کے ہوٹلوں کے بل مار کر بھاگ جاتے ہیں۔

ظہیر نے بڑی سادگی سے سعید کو بتایا کہ وہ کم سے کم سرمائے سے فلم بنانا چاہتا ہے۔ بمبئی میں وہ اسٹنٹ فلم بنانے والے ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ پانچ برس تک وہ اس کے ماتحت کام کرتا رہا اس کو خود فلم بنانے کا موقع ملنے ہی والا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا اور اسے پاکستان آنا پڑا۔ یہاں وہ تقریباً ڈھائی سال بیکار رہا مگر اس دوران میں اس نے چند آدمی ایسے تیار کر لیے جو روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے سعید سے کہا ”دیکھئے جناب! میں کوئی فرسٹ کلاس فلم بنانا نہیں چاہتا۔ کم علم آدمی ہوں اسٹنٹ فلم بنا سکتا ہوں اور انشاءاللہ اچھا اسٹنٹ فلم بناؤں گا پچاس ہزار روپوں کے اندر اندر سو فیصدی نفع تو یقینی ہے۔۔۔۔۔ آپ کا کیا خیال

ہے؟''

سعید نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا ''ہاں اتنا نفع تو ہونا چاہیے''

ظہیر نے کہا ''جو آدمی روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ حساب کتاب سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہوگا یہ آپ کا کام ہے۔۔۔باقی سب چیزیں میں سنبھال لوں گا۔''

سعید نے پوچھا ''مجھ سے آپ کیا خدمت چاہتے ہیں''

ظہیر نے بڑی سادگی سے کہا ''پاکستان کے تقریباً تمام ڈسٹری بیوٹر آپ کو جانتے ہیں میری یہاں ان لوگوں سے واقفیت نہیں بڑی نوازش ہوگی اگر آپ میرے فلم کی ڈسٹری بیوشن کا بندوبست کردیں۔''

سعید نے کہا ''آپ فلم تیار کرلیں انشاءاللہ ہو جائے گا''

''آپ کی بڑی مہربانی ہے'' یہ کہہ کر ظہیر نے میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ایک پھول سا بنایا ''سعید صاحب! مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ میں کامیاب رہوں گا۔۔۔۔ہیروئن میری بیوی ہوگی۔''

سعید نے پوچھا ''آپ کی بیوی؟''

''جی ہاں''

''پہلے کسی فلم میں کام کرچکی ہیں''

''جی نہیں'' ظہیر نے پیڈ پر پھول کے ساتھ شاخ بناتے ہوئے کہا ''میں نے شادی یہاں لاہور میں آکر کی ہے۔۔۔۔میرا ارادہ تو نہیں تھا کہ اسے فلم لائن میں لاؤں مگر اس کو شوق ہے۔۔۔۔بہت شوق ہے ہر روز ایک فلم دیکھتی

ہے۔۔۔۔۔میں آپ کو اس کا فوٹو دکھاتا ہوں۔''

ظہیر نے میز کا دراز کھول کر ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے اپنی بیوی کا فوٹو سرکا کر سعید کی طرف بڑھا دیا۔

سعید نے فوٹو دیکھا معمولی خدو خال کی جوان عورت تھی تنگ ماتھا، باریک ناک موٹے موٹے ہونٹ آنکھیں بڑی بڑی اور اداس۔

یہ آنکھیں ہی تھیں جو اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کے مقابلے میں سب سے نمایاں تھیں سعید نے غور سے ان کو دیکھنا چاہا مگر معیوب سمجھا اور فوٹو میز پر رکھ دیا

ظہیر نے پوچھا ''کیا خیال ہے آپ کا؟''

سعید کے پاس اس سوال کا جواب تیار نہیں تھا اس کے دل و دماغ پر دراصل وہ آنکھیں چھائی ہوئی تھیں بڑی بڑی اداس آنکھیں، غیر ارادی طور پر اس نے میز پر سے فوٹو اٹھایا اور ایک نظر دیکھ کر پھر وہیں رکھ دیا اور کہا ''آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں''

ظہیر نے پیڈ پر ایک اور پھول بنانا شروع کیا ''یہ فوٹو اچھی نہیں۔۔۔۔۔ذرا سی ہلی ہوئی ہے۔''

اتنے میں پچھلے دروازے کا پردہ ہلا اور ظہیر کی بیوی داخل ہوئی۔۔۔۔۔وہی بڑی بڑی اداس آنکھیں ظہیر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ''عجیب و غریب نام ہے اس کا۔۔۔۔۔'' بسم اللہ! پھر سعید کی طرف اشارہ کیا ''یہ میرے دوست سعید صاحب ہیں''

بسم اللہ نے کہا ''آداب عرض''

سعید نے اس کا جواب اٹھ کر دیا ''تشریف رکھیے''

بسم اللہ دوپٹہ ٹھیک کرتی سعید کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار چغلیاں کھا رہا تھا۔سعید نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

ظہیر نے فوٹو واپس لفافے میں رکھا اور سعید سے کہا ''مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ بسم اللہ پہلے ہی فلم میں کامیاب ثابت ہوگی لیکن سمجھ میں نہیں آتا، اس کا فلمی نام کیا رکھوں۔بسم اللہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کیا خیال آپ کا۔''

سعید نے بسم اللہ کی طرف دیکھا اس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ ایک لمحے کے لیے جیسے ڈوب سا گیا۔فوراً ہی نگاہ اس طرف سے ہٹا کر اس نے ظہیر سے کہا ''جی ہاں۔۔۔۔۔بسم اللہ ٹھیک نہیں ہے کوئی اور نام ہونا چاہیے۔''

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔بسم اللہ خاموش تھی اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں بھی خاموش تھیں۔سعید نے اس دوران میں ان آنکھوں کے اندر کئی بار ڈبکیاں لگائیں ظہیر اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے بسم اللہ خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں پر چھائی ہوئی سیاہ پلکیں جھپکا کی اس کے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار برابر چغلیاں کھاتا رہا۔سعید ادھر دیکھتا ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں دوسری طرف پلٹ جاتیں۔

بسم اللہ کا رنگ گہرا سانولا تھا فوٹو میں اس رنگت کا پتا نہیں چلتا تھا اس گہرے

سانولے رنگ پر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور بھی زیادہ اداس ہو گئی تھیں سعید نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس اداسی کا باعث کیا ہے۔۔۔۔ان کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اداس دکھائی دیتی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے کوئی معقول بات سعید کے ذہن میں نہ آئی۔

ظہیر بمبئی کی باتیں شروع کرنے والا تھا کہ بسم اللہ اٹھی اور چلی گئی اس کی چال میں بے ڈھنگا پن تھا جیسے اس نے اونچی ایڑھی کے چپل نئے نئے استعمال کرنے شروع کیے ہیں۔غرارے کی نشست بھی ٹھیک نہیں تھی سلوٹوں کا گراؤ بھدا تھا اس کے علاوہ سعید نے یہ بھی محسوس کیا کہ ادب آداب سے بسم اللہ محض کوری ہے۔۔۔۔لیکن اس کے گہرے سانولے چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اداس ہونے کے باوجود کس قدر جذبات انگیز تھیں۔

چند ہی ملاقاتوں میں ظہیر سے سعید کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے ظہیر بے حد سادہ دل تھا اس خاص چیز سے سعید بہت متاثر ہوا تھا اس کی کسی بھی بات میں بناوٹ نہیں ہوتی تھی خیال جس شکل میں پیدا ہوتا تھا سادہ الفاظ میں تبدیل ہو کر اس کی زبان پر آجاتا تھا کھانے پینے اور رہنے سہنے کے معاملے میں بھی وہ سادگی پسند تھا۔

جب بھی سعید اس کے یہاں جاتا ظہیر اس کی خاطر تواضع کرتا سعید نے اس سے کئی بار کہا کہ تم یہ تکلف نہ کیا کرو مگر وہ نہ مانا وہ اکثر کہا کرتا "اس میں کیا تکلف ہے آپ کا اپنا گھر ہے۔"

سعید نے جب تقریباً ہر روز ظہیر کے ہاں جانا شروع کیا تو اس نے سوچا کہ یہ

بہت بری بات ہے وہ میری اتنی عزت کرتا ہے مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے اور میں اس سے صرف اس لیے ملتا ہوں کہ مجھے اس کی بیوی سے دلچسپی ہو گئی ہے یہ بہت بری بات ہے۔

اس کے ضمیر نے کئی دفعہ اسے ٹوکا مگر وہ برابر ظہیر کے ہاں جاتا رہا۔

بسم اللہ اکثر آ جاتی تھی شروع شروع میں خاموش بیٹھی رہتی پھر آہستہ آہستہ اس نے باتوں میں حصہ لینا شروع کر دیا لیکن گفتگو کے لحاظ سے وہ خام تھی سعید کو دکھ ہوتا تھا کہ وہ اچھی باتیں کرنا کیوں نہیں جانتی۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ظہیر گھر سے باہر تھا سعید نے آواز دی تو بسم اللہ بولی ''باہر گئے ہوئے ہیں'' یہ سن کر کچھ دیر کھڑا رہا کہ شاید وہ اس سے کہے، اندر آ جائیے ابھی آتے ہیں مگر ایسا نہ ہوا۔

ظہیر کے فلم کا چکر چل رہا تھا اس کا ذکر قریب قریب ہر روز ہوتا ظہیر کہتا مجھے اتنی جلدی نہیں ہے ہر ایک چیز آرام سے ہو گی اور اپنے وقت پر ہو گی۔

سعید کو ظہیر کے فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کو اگر دلچسپی تھی تو بسم اللہ سے جس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ کئی بار غوطے لگا چکا تھا اور اس کی یہ دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی جس کا احساس اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ وہ اپنے دوست ظہیر کی بیوی سے جسمانی رشتہ پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

دن گزرتے گئے ظہیر کے فلم کا کام وہیں کا وہیں تھا۔ سعید ایک دن اس سے ملنے گیا تو وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا چلنے ہی والا تھا کہ بسم اللہ نے کہا ''اندر آ جائیے وہ

کہیں دور نہیں گئے''

سعید کا دل دھڑکنے لگا کچھ توقف کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا بسم اللہ میز کے پاس کھڑی تھی سعید نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا'' بیٹھئے''

بسم اللہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھوڑی دیر خاموش رہی اس کے بعد سعید نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا'' ظہیر آئے نہیں ابھی تک؟''

بسم اللہ نے مختصر جواب دیا'' آ جائیں گے''

تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی اسی دوران میں کئی مرتبہ سعید نے بسم اللہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اٹھ کر ان کو چومنا شروع کر دے اس قدر چومے کہ ان کی ساری اداسی دھل جائے مگر سعید نے اس خواہش پر قابو پا کر اس سے کہا'' آپ کو فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے؟''

بسم اللہ نے ایک جمائی لی اور جواب دیا'' ہے تو سہی''

سعید ناصح بن گیا'' یہ لائن اچھی نہیں میرا مطلب ہے بڑی بدنام ہے'' اس کے بعد اس نے فلم لائن کی تمام برائیاں بیان کرنا شروع کر دیں ظہیر کا خیال آیا تو اس نے رخ بدل لیا'' آپ کو شوق ہے تو خیر دوسری بات ہے کیریکٹر مضبوط ہو تو آدمی کسی بھی لائن میں ثابت قدم رہ سکتا ہے پھر ظہیر خود اپنا فلم بنا رہا ہے لیکن آپ کسی دوسرے کے فلم میں کام ہر گز نہ کیجئے گا''

بسم اللہ خاموش رہی سعید کو اس کی یہ خاموشی بہت بری معلوم ہوئی پہلی مرتبہ اس کو تنہائی میں اس سے ملنے کا موقع ملا تھا مگر وہ بولتی ہی نہیں تھی سعید نے

ایک دو مرتبہ ڈرتے ڈرتے ٹوہ لینے والی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر کوئی ردعمل پیدا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا" اچھا تو پان ہی کھلائیے"

بسم اللہ اٹھی ریشمی قمیص کے پیچھے اس کے سینے کا نمایاں ابھار ہلا سعید کی نگاہوں کو دھکا سا لگا بسم اللہ دوسرے کمرے میں گئی تو وہ ڈرڈر کے تیکھی تیکھی باتیں سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پان لے کر آئی اور سعید کے پاس کھڑی ہوگئی " لیجئے"

سعید نے شکریہ کہہ کر پان لیا تو اس کی انگلیاں بسم اللہ کی انگلیوں سے چھوئیں اس کے سارے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی اس کے ساتھ ہی ضمیر کا کانٹا اس کے دل میں چبھا۔

بسم اللہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اس کے گہرے سانولے چہرے سے سعید کو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا سعید نے سوچا کوئی اور عورت ہوتی تو فوراً سمجھ جاتی کہ میں اسے کن آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، لیکن شاید سمجھ گئی ہو شاید یہ بھی سمجھی ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

سعید کا دماغ بے حد مضطرب تھا ایک طرف بسم اللہ کا ستانے والا وجود تھا اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں اس کے سینے کا نمایاں ابھار، دوسری طرف ظہیر کا خیال، اس کے ضمیر کا کانٹا، سب عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا۔ بسم اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا اس کا مطلب صاف تھا کہ جو چیز سعید سوچ رہا ہے ناممکن ہے مگر وہ پھر بھی اس کو انہی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا ''ظہیر نہیں آئے میرا خیال ہے میں چلتا ہوں''

بسم اللہ نے خلاف توقع کہا ''نہیں نہیں بیٹھئے''

''آپ تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں'' یہ کہہ کر سعید اٹھا

بسم اللہ نے پوچھا ''چلے؟''

سعید نے اس کی طرف ٹوہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا ''جی نہیں بیٹھتا ہوں آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو''

بسم اللہ نے ایک جمائی لی ''مجھے کیا اعتراض ہوگا''

بسم اللہ کی آنکھوں میں خمار سا پیدا ہو گیا سعید نے کہا ''آپ کو شاید نیند آ رہی ہے۔''

''جی ہاں رات جاگتی رہی''

سعید نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا ''کیوں؟''

بسم اللہ نے ایک اور جمائی لی ''کہیں باہر گئے ہوئے تھے''

سعید بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد بسم اللہ سو گئی اس کے سینے کا نمایاں ابھار ریشمی قمیض کے پیچھے سانس کے زیر و بم سے ہولے ہولے ہل رہا تھا بڑی بڑی اداس آنکھیں اب بند تھیں دایاں بازو ایک طرف ڈھلک گیا تھا آستین اوپر کو اٹھ گئی تھی سعید نے کہا گہرے سانولے رنگ کی کلائی پر ہندی کے حروف کھدے ہوئے تھے اتنے میں ظہیر آ گیا۔

سعید اس کی آمد پر سٹپٹا سا گیا ظہیر نے اس سے ہاتھ ملایا اپنی بیوی بسم اللہ کی

طرف دیکھا ''ارے سو رہی ہے''

سعید نے کہا ''میں جا رہا تھا کہنے لگیں ظہیر صاحب ابھی آ جائیں گے آپ بیٹھیے میں بیٹھا تو آپ سو گئیں''

ظہیر ہنسا، سعید بھی ہنسنے لگا

''بھئی واہ۔۔۔۔اٹھو اٹھو'' ظہیر نے بسم اللہ کے سر پر ہاتھ پھیرا

بسم اللہ نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی بڑی بڑی اداس آنکھیں کھول دیں اداسی کے ساتھ ساتھ اب ان میں ویرانی سی بھی تھی۔

''چلو چلو۔۔۔۔۔اٹھو ایک ضروری کام پر جانا ہے'' بسم اللہ سے یہ کہہ کر ظہیر سعید سے مخاطب ہوا ''معاف کیجئے گا سعید صاحب میں ایک کام سے جا رہا ہوں انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔''

سعید چلا گیا دوسرے روز اس نے ظہیر کے ہاں جانے سے پہلے یہ دعا مانگی کہ وہ گھر پر نہ ہو وہاں پہنچا تو باہر کئی آدمی جمع تھے سعید کو ان سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ ظہیر کی بیوی نہیں تھی وہ ایک ہندو لڑکی تھی جو فسادوں میں یہاں رہ گئی تھی ظہیر اس سے پیشہ کراتا تھا پولیس ابھی ابھی اسے برآمد کر کے لے گئی ہے۔

وہ بڑی بڑی سیاہ اور اداس آنکھیں اب بھی سعید کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

بغیر اجازت

نعیم ٹہلتا ٹہلتا ایک باغ کے اندر چلا گیا۔۔۔اس کو وہاں کی فضا بہت پسند آئی۔۔۔گھاس کے ایک تختے پر لیٹ کر اس نے خود کلامی شروع کر دی۔

''کیسی پر فضا جگہ ہے۔۔۔۔حیرت ہے کہ آج تک میری نظروں سے اوجھل رہی۔۔۔نظریں۔۔۔اوجھل''

اتنا کہہ کر وہ مسکرایا

''نظر ہو تو چیزیں نظر بھی نہیں آتیں۔۔۔آہ کہ نظر کی بے نظری!''

دیر تک وہ گھاس کے اس تختے پر لیٹا اور ٹھنڈک محسوس کرتا رہا لیکن اس کی خود کلامی جاری تھی۔

''یہ نرم نرم گھاس کتنی فرحت ناک ہے''

آنکھیں پاؤں کے تلوؤں میں چلی آئیں۔۔۔اور یہ پھول۔۔۔یہ پھول اتنے خوبصورت نہیں جتنی ان کی ہرجائی خوشبو ہے۔۔۔ہر شے جو ہرجائی ہو۔۔۔خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔ ہرجائی عورت۔۔۔۔ہرجائی مرد۔۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔یہ خوبصورت چیزیں پہلے پیدا ہوئی تھیں۔۔یا خوبصورت خیال۔۔۔۔ہر خیال خوبصورت ہوتا ہے۔۔۔۔مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر پھول خوبصورت نہیں ہوتا۔۔۔مثال کے طور پر یہ پھول، اس نے اٹھ کر ایک پھول کی طرف دیکھا اور اپنی خود کلامی جاری رکھی۔

یہ اس ٹہنی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔۔۔کتنا سفلہ دکھائی دیتا ہے بہر حال یہ جگہ

خوب ہے۔۔۔۔ایک بہت بڑا دماغ معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔روشنی بھی ہے۔۔۔۔سائے بھی ہیں۔۔۔۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں نہیں بلکہ یہ جگہ سوچ رہی ہے۔

یہ پرفضا جگہ جو اتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہی۔

اس کے بعد نعیم فرط مسرت میں کوئی غزل گانا شروع کر دیتا ہے۔۔۔۔۔کہ اچانک موٹر کے ہارن کی کرخت آواز اس کے ساز دل کے سارے تار جھنجھوڑ دیتی ہے۔

وہ چونک کر اٹھتا ہے۔۔۔۔۔دیکھتا ہے کہ ایک موٹر پاس کی روش پر کھڑی ہے اور ایک لمبی لمبی مونچھوں والا آدمی اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔اس مونچھوں والے آدمی نے گرج کر کہا۔

''اے تم کون ہو۔۔۔۔''

نعیم جو اپنے ہی نشہ میں سرشار تھا چونکا۔۔۔۔

''یہ موٹر اس باغ میں کہاں سے آ گئی''

مونچھوں والا جو اس باغ کا مالک تھا بڑبڑایا

وضع قطع سے تو آدمی شریف معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کیسے گھس آیا۔۔۔۔کس اطمینان سے لیٹا تھا جیسے اس کے باوا کا باغ ہے۔۔۔۔پھر اس نے بلند آواز میں للکار کے نعیم سے کہا

''اماں۔۔۔۔۔کچھ سنتے ہو۔۔۔''

نعیم نے جواب دیا

''حضور سن رہا ہوں۔۔۔تشریف لے آیئے۔۔۔یہاں بہت پرفضا جگہ ہے۔''

باغ کا مالک بھنا گیا

''تشریف کا بچہ۔۔۔ادھر آؤ''

نعیم لیٹ گیا

''بھئی مجھ سے نہ آیا جائے گا تم خود ہی چلے آؤ۔۔۔۔۔واللہ بڑی دلفریب جگہ ہے تمہاری سب کوفت دور ہو جائے گی''

باغ کا مالک موٹر سے نکلا۔۔۔۔۔اور غصے میں بھرا ہوا نعیم کے پاس آیا

''اٹھو یہاں سے''

نعیم کے کانوں کو اس کی تیکھی آواز بہت ناگوار گزری'' اتنے اونچے نہ بولو۔۔۔آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔۔۔بالکل خاموش جس طرح کہ میں لیٹا ہوا ہوں۔۔۔آنکھیں بند کر لو۔۔۔اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دو۔۔۔دماغ کی ساری بتیاں گل کر دو۔۔۔پھر جب تم اس اندھیرے میں چلو گے تو ٹٹولتی ہوئی تمہاری انگلیاں غیر ارادی طور پر ایسے قمقمے روشن کریں گی جن کے وجود سے تم بالکل غافل تھے۔''

آؤ میرے ساتھ لیٹ جاؤ

باغ کے مالک نے ایک لحظہ سوچا۔۔۔نعیم سے کہا

''دیوانے معلوم ہوتے ہو۔۔۔''

نعیم مسکرایا''نہیں۔۔۔تم نے کبھی دیوانے دیکھے ہی نہیں۔۔۔۔میری

جگہ یہاں اگر کوئی دیوانہ ہوتا تو وہ ان بکھری ہوئی جھاڑیوں اور ٹہنیوں پر بچوں کے گالوں کے مانند لٹکے ہوئے پھولوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا۔۔۔۔۔۔ دیوانگی اطمینان کا نام نہیں میرے دوست۔۔۔۔۔لیکن آؤ ہم دیوانگی کی باتیں کریں۔"

"بکواس بند کرو۔۔۔۔۔نکل جاؤ یہاں سے"

باغ کے مالک کو طیش آ گیا۔۔۔۔اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا کہ آ کر نعیم کو دھکے مار کر باہر نکال دے۔

"ارے تم کون ہو۔۔۔۔۔بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو"

جب نعیم باہر جا رہا تھا تو اس نے گیٹ پر ایک بورڈ دیکھا جس پر یہ لکھا تھا" بغیر اجازت اندر آنا منع ہے"

وہ مسکرایا

"حیرت ہے کہ یہ میری نظروں سے اوجھل رہا۔۔۔۔۔نظر ہو تو بعض چیزیں نظر نہیں بھی آتیں۔۔۔۔۔۔آہ نظر کی یہ بے نظیری"

یہاں سے نکل کر وہ ایک آرٹ کی نمائش میں چلا گیا تا کہ اپنی ذہنی تکدر دور کر سکے

ہال میں داخل ہوتے ہی اس کو عورتوں اور مردوں کا جھرمٹ نظر آیا جو دیواروں پر لگی پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔

ایک مرد کسی پارسی عورت سے کہہ رہا تھا

"مسز فوجدار۔۔۔۔یہ پینٹنگ دیکھی آپ نے"

مسز فوجدار نے تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک عورت شیریں کی طرف

بڑے غور سے دیکھا اور اس مرد سے جو غالباً اس کا ہونے والا شوہر تھا کہا

''تم نے دیکھا شیریں کتنی سج بن کے آئی ہے۔''

ایک نوجوان عورت ایک نوعمر لڑکی سے کہہ رہی تھی ''ثریا ادھر آ کے تصویریں دیکھ۔۔۔۔۔تو وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے''

ثریا کو تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اصل میں اس کو ایک بوائے فرینڈ سے ملنا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر کا مرد جسے پینٹنگز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اپنے ادھیڑ عمر کے دوست سے کہہ رہا تھا۔

''للی زکام کی وجہ سے نڈھال ہے، ورنہ ضرور آتی۔۔۔۔۔۔آپ جانتے ہی ہیں پینٹنگز سے اسے کتنی دلچسپی ہے اب تو وہ بہت اچھی تصویریں بنا لیتی ہے پرسوں اس نے پنسل کاغذ لے کر اپنے چھوٹے بھائی کی سائیکل کی تصویر اتاری۔۔۔۔۔میں تو دنگ رہ گیا''

نعیم پاس کھڑا تھا۔۔۔۔۔اس نے ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا

''ہو بہو سائیکل معلوم ہوتی ہوگی''

دونوں دوست بھونچکے ہو کر رہ گئے کہ یہ کون بدتمیز ہے چنانچہ ان میں سے ایک نے نعیم سے پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟''

نعیم بوکھلا گیا

''میں۔۔۔۔۔میں''

''میں میں کیا کرتے ہو۔۔۔بتاؤ تم کون ہو''

نعیم نے سنبھل کر کہا

''آپ ذرا آرام سے پوچھئے۔۔۔۔۔۔میں آپ کو بتا سکتا ہوں''

''تم یہاں آئے کیسے؟''

نعیم کا جواب بڑا مختصر تھا

''جی پیدل۔۔۔''

عورتیں اور مرد جو آس پاس کھڑے تصویریں دیکھنے کی بجائے خدا معلوم کن کن چیزوں پر تبصرہ کر رہے تھے ہنسنا شروع کر دیا۔۔۔اتنے میں اس نمائش کا ناظم آیا اس کو جب نعیم کی گستاخی کے متعلق بتایا گیا تو اس نے بڑے کڑے انداز میں اس سے پوچھا

''تمہارے پاس کارڈ ہے''

نعیم نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا

''کارڈ۔۔۔۔۔۔کیسا کارڈ۔۔۔۔پوسٹ کارڈ؟''

ناظم نے اپنا لہجہ اور کڑا کر کے نعیم سے کہا

''بغیر اجازت تم اندر چلے آئے جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے''

نعیم ایک تصویر کو دیکھ کر دیر تک دیکھنا چاہتا تھا مگر اسے بادل نخواستہ وہاں سے نکلنا پڑا۔۔۔سیدھا اپنے گھر گیا دروازے پر دستک دی اس کا نوکر فضول باہر نکلا نعیم نے اس سے درخواست کی۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں''

فضلو بوکھلا گیا۔۔۔۔ ''حضور۔۔۔۔حضور۔۔۔یہ آپ کا اپنا گھر ہے اجازت کیسی؟''

نعیم نے اس سے کہا

''نہیں فضلو۔۔۔۔۔یہ میرا گھر نہیں ۔۔۔۔۔یہ گھر جو مجھے راحت بخشتا ہے کیسے میرا ہو سکتا ہے۔۔۔مجھے اب ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے''

فضلو نے بڑے ادب سے پوچھا

''کیا سرکار؟''

نعیم نے کہا

''یہی کہ یہ میرا گھر میرا نہیں ۔۔۔۔البتہ اس کا گرد و غبار۔۔۔۔اس کی تمام غلاظتیں میری ہیں۔۔۔۔۔۔۔وہ تمام چیزیں جن سے مجھے کوفت ہوتی ہے میری ہیں لیکن وہ تمام چیزیں جن سے مجھے راحت پہنچتی ہے کسی اور کی۔۔۔۔۔خدا جانے کس کی۔۔۔۔۔۔میں اب ڈرتا ہوں۔۔۔۔کسی اچھی چیز کو اپنانے سے خوف لگتا ہے یہ پانی میرا نہیں۔۔۔۔۔یہ ہوا میری نہیں۔۔۔۔۔یہ آسمان میرا نہیں۔۔۔۔۔۔۔وہ لحاف جو میں سردیوں میں اوڑھتا ہوں میرا نہیں۔۔۔۔اس لیے کہ میں اس سے راحت طلب کرتا تھا۔''

فضلو جاؤ۔۔۔۔۔۔تم بھی میرے نہیں

نعیم نے فضلو کو کوئی بات کرنے نہ دی

وہ چلا گیا

رات کے دس بج چکے تھے

ہیرامنڈی کے ایک کوٹھے سے پیا بن ناہیں آوت چین کے بول باہراڑ اڑ کے آرہے تھے

نعیم اس کوٹھے پر چلا گیا

اندر مجرا سننے والے تین چار مردوں کی طرف دیکھا۔۔۔اور طوائف سے کہا

''ان اصحاب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا''

طوائف مسکرائی

''نہیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔۔۔۔ادھر مسند پر بیٹھیے۔۔۔گاؤ تکیہ لے لیجیے''

نعیم بیٹھ گیا۔۔۔اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس طوائف سے کہا

''یہ کتنی اچھی جگہ ہے''

طوائف سنجیدہ ہوگئی

''آپ کیا مذاق اڑانے آئے ہیں۔۔۔یہ اچھی جگہ ہے۔۔۔۔۔۔جسے تم شرفا حد سے زیادہ گندی جگہ کہتے ہیں''

نعیم نے اس سے کہا

''یہ اچھی جگہ اس لیے ہے کہ یہاں بغیر اجازت کے آنا منع ہے کا بورڈ آویزاں نہیں ہے۔''

یہ سن کو طوائف اور اس کا مجرا سننے والے تماشبین ہنسنے لگے

نعیم نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا ایک اس قسم کی طوائف ہے جسے مجرا سننے کے لیے اس قسم کے چغد آتے ہیں۔

بلاؤز

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتی کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا۔

بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دھندلے دھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں۔ مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے۔ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی تھیں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضاء میں پیدا ہو گیا تھا جس کے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے سے ہاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے۔

''مجھے کوٹنا شروع کر دیں۔''

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کو کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکیوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اس کی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی، جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیئے کی لو کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولھواں بھی لگا ہو۔ اسے اپنی عمر کے متعلق

صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا۔ جس کا لڑکپن تیزی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے پتلی تھی۔ اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہ موٹی ہو گئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سے پڑ گئی تھیں۔ جگہ ابھر آئی تھی جیسے کسی نے ایک ایک بنٹا اندر داخل کر دیا ہے۔ ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیض کے موٹے اور کھردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانہ میں جب کوئی اور موجود نہ ہو۔ مومن اپنے قمیض کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا۔ ہاتھوں سے مسلتا۔ درد ہوتا۔ ٹیسیں اٹھتیں۔ جیسے جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح زور سے ہلایا گیا ہو۔ کانپ کانپ جاتا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے ایک لیسدار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لووں تک سرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے نہ کر سکتا ہو۔ اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیض کے بٹن بند کر لیتا اور دل میں عہد کرتا کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی نہیں کرے گا لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے یا تیسرے روز تخلیے میں وہ پھر اس کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے سب گھر والے خوش تھے۔ بڑا محنتی لڑکا تھا۔ جب ہر کام وقت پر کر دیتا تو کسی کو شکایت کا موقع کیسے ملتا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر نوکر ہوا تھا۔ مگر دوسرے مہینے ہی اس کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیئے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی مگر اب کچھ دنوں سے وہ بے قرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجہ بجانے، نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہ کی تھی۔

شکیلہ البتہ مومن سے ادھر ادھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اسے ڈانٹتی بھی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ بھی چند بلاؤزوں کے نمونے اتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلاؤز اس کی ایک سہیلی کے تھے جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بے حد شوق تھا۔ شکیلہ اس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے۔ یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی جو زیادہ تر باورچی خانے کا کام کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ انقلاب جس میں مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا۔ اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی اور پھر مومن نوکر تھا......... نوکروں کے متعلق کون غور وفکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا زندگی کے ایک ایسے راستے پر آ نکلا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پر خطر تھا۔ اس راستے پر اس کے قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے۔ کبھی ہولے ہولے وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیے۔ انہیں جلدی طے کرنا چاہیے یا کچھ وقت لے کر

آہستہ آہستہ ادھر ادھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہیے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی بٹیاں پھسل رہی تھیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی لیے بے حد مضطرب تھا۔ اس اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اسے کوئی اتنا کھینچے، اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوئی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعور طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو.......... کیا ہو؟.......... بس کچھ ہو۔ میز پر قرینے سے چنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کو اڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ پھوٹ نکلے۔ اسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور اس میں ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔

کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی طرز سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلہ کاغذوں پر بلاؤزوں کے نمونے اتار رہی تھی۔ جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جو ان سب میں اچھا تھا۔ سامنے رکھ کر اپنے لیے اودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کر دیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور

فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی پر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیائش بھی اس کی بہت صحیح تھی۔ اس لیے کہ پہلے کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی تھی۔

شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی ہاتھ بہت گدگدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ایک ننھا گڑھا تھا۔ جب مشین چلاتی تھی تو یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتے تھے۔

شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی دو یا تین انگلیاں بڑی نرمی کے ساتھ مشین کی ہتھی گھماتی تھیں۔ کلائی میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لیے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی۔ نیچے پھسل آتی تھی۔ شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رہتی کہ اسے ہٹانے یا جمانے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔

جب شکیلہ اودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ماپ کا بلاؤز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیائش کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو

گئی تھی۔ اس لیے ساری پیائش دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیض اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا ”جاؤ مومن دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہے۔“

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا۔ مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا ”کیسا گز بی بی جی۔“

شکیلہ نے جواب دیا۔ ”کپڑے کا گز......... ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ یہ لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے، کپڑے کا۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔“

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آ گیا۔ شکیلہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا۔ ”یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا۔“ پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی۔ ”ان لوگوں کی کوئی چیز اپنے پاس رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے......... ادھر آؤ یہ گز لو اور یہاں سے میرا ماپ لو۔“

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ماپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئیں۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

”رضیہ تم گز کو کھینچ کر ماپ کیوں نہیں لیتیں......... پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا۔ تم نے ماپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اوپر کے حصہ پر اگر کپڑا فٹ نہ

آ ئے تو ادھر ادھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔"

"کہاں کا لوں۔ کہاں کا نہ لوں۔ تم تو عجیب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ماپ لینا شروع کیا تھا تو تم نے کہا ذرا اور نیچے کا لو............ ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کون سی آفت آ جائے گی۔"

"بھئی واہ............ چیز کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں شکن پڑے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے............ لو اب ماپ لو............"

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "لو اب جلدی کرو۔"

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا۔ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "گز لا دیجئے بی بی جی............ دے آؤں۔"

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اگ رہے تھے مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس

کی مونچھیں بن جائیں۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو سرسراہٹ اسے محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کر دی۔

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا اور بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا اور بغل میں اس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا۔ ''جاؤ......... واپس دے آؤ۔ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔''

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا جس میں اس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے......... اس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کرے گی اور اس کی رومی ٹوپی.........

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھندنا آ گیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی

بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم و ار چکیلے پھندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی۔ ''مومن!''

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی۔ ''جی بی بی جی!''

''تو کیا کر رہے تھے؟''

''کچھ.........کچھ بھی نہیں؟''

''کچھ تو ضرور کرتے ہوگے۔'' شکیلہ یہ سوال کیے جا رہی تھی مگر اس کا دھیان اصل میں بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ ''ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔''

شکیلہ کھلکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

شکیلہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور اس تسکین نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں شرماہٹ پیدا کر کے اس نے کہا۔ ''بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔''

شکیلہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا کرو گے اس رومال کو؟''

مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔ ''گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی......... بڑا اچھا معلوم ہوگا۔''

یہ سن کر شکیلہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

''گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا اسی سے پھانسی دے دوں گی۔'' یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ نے کہا ''کمبخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا رضیہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟''

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کر دی جو وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکیلہ کو خود ہی یاد آ گیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ ''دیکھو مومن! میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں۔ دوائیوں کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جہاں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے۔ وہاں جاؤ اور پوچھ کے آؤ کہ ایسی چھ بنیانوں کا وہ کیا لے گا............ کہنا ہم چھ لیں گے۔ اس لیے کچھ رعایت ضرور کرے............ سمجھ لیا نا؟''

مومن نے جواب دیا۔ ''جی ہاں!''

''اب تم پرے ہٹ جاؤ۔''

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آ گرا اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی۔ ''ہم اسی قسم کی اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیے۔''

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھا لیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔ بدن کی بو بھی اس میں بسی ہوئی تھی میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلی کے بچے کی طرح ملائم تھا۔ اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا

گیا۔ جب بھاؤ واؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی اس اودی اودھی ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی رومی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچکدار تھی۔

یہ بلاؤز شاید عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی۔

مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لیے، استری نکالنے کے لیے، سوئی ٹوٹ گئی تو نئی سوئی لانے کے لیے شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر باقی کام اٹھا دیا تو وہ دھاگے کے ٹکڑے اور اودی ساٹن کی بیکار کترین اٹھانے کے لیے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ مگر ساٹن کی چمکیلی کترین اپنی جیب میں رکھ لیں .... بالکل بے مطلب کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کا کیا کرے گا؟

دوسرے روز اس نے جیب سے کترین نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا۔ مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی اسے شکیلہ نے کئی بار بلایا .... اودی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا تو اس پر

سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلہ نے اسے پہنا۔ رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس آئینے میں خود کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پورا اطمینان ہو گیا تو اسے اتارا۔ جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے۔ اس کی ساری خامیاں دور کیں۔ ایک بار پھر پہن کر دیکھا جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلائی شروع کی۔

ادھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا۔ ادھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانکے سے ادھڑ رہے تھے .... جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے صرف چھو کر ہی نہیں .... بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے۔ اپنے کھردرے ہاتھ۔

اس نے ان ساٹن کے ٹکڑوں سے ان کی ملائمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا گچھا بنایا تو دباتے وقت اسے معلوم ہوا تھا کہ ان میں ربڑ کی سی لچک بھی ہے .... وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا۔ ان کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہوں گے؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا .... مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا۔ کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیض اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اس کے نیچے اسی قسم کا سفید

بنیان تھا۔ جس کا نمونہ لے کے مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا............ اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سیا ہوا بلاؤز پہنا۔ سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے ہوئے آئینہ کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہوگیا ہے............ شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی۔ مومن سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ''بی بی جی! آپ نے درزیوں کو بھی مات کر دیا ہے۔''

شکیلہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس لیے وہ صرف ''اچھا ہے نا'' کہہ کر باہر دوڑ گئی............ مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لیے آیا تو اس نے کھونٹی پر لکڑی کے ہینگر میں اس بلاؤز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے غور سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے یوں لگا کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے............ ڈپٹی

صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا .... یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولا بنا ہوا تھا پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے .... بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے .... پھر آندھی آ گئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا .... پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا .... دیکھی ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا .... نئے لٹھے کی بو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی پھر نہ جانے کیا ہوا .... ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا .... کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھوڑی دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے اس کے بعد اسے خوف اور تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا، اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی، پہلے اسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوئی تھی، مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم پر رینگنے لگی۔

بلونت سنگھ مجیٹھیا

شاہ صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو ہم فوراً بے تکلف ہو گئے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سید ہیں اور میرے دور دراز کے رشتے دار بھی ہیں۔ وہ میرے دور یا قریب کے رشتہ دار کیسے ہو سکتے تھے، اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ سید تھے اور میں ایک محض کشمیری۔

بہر حال ان سے میری بے تکلفی بہت بڑھ گئی۔ ان کو ادب سے کوئی شغف نہیں تھا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں افسانہ نگار ہوں تو انہوں نے مجھ سے میری چند کتابیں مستعار لیں اور پڑھیں۔

یہ کتابیں جو کہ افسانوں کے مجموعے تھیں، انہوں نے پڑھیں اور مجھے بہت تعجب ہوا کہ انہوں نے چند افسانوں کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے یہ افسانے ایسے تھے جو ادبی دنیا میں شاہکار تسلیم کیے جا چکے تھے۔

شاہ صاحب میرے پڑوسی تھے۔ انہوں نے ایک مکان الاٹ کرا رکھا تھا۔ لیکن خاندان کے افراد چونکہ زیادہ تھے اس لیے انہوں نے اپنے فلیٹ کے نیچے موٹر گیراج پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنی بیٹھک کا انتظام کیا تھا۔ اوپر زنانہ تھا، شاہ صاحب کے دوست یار بے شمار تھے اس لیے اس گیراج میں وہ ان کی خاطر مدارات کرتے تھے۔

ایک دن ان سے افسانوں کے بارے میں باتیں ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”میری زندگی میں ایسی کئی حقیقتیں ہیں جن کو تم افسانے بنا کر پیش کر سکتے

ہو۔''

میں ہر وقت فسانوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ چنانچہ میں فوراً متوجہ ہوا اور شاہ صاحب سے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ آپ اچھا مواد دیں گے!''

شاہ صاحب نے جواباً کہا۔ ''میں افسانہ نگار نہیں .... لیکن میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ ہوا ہے جو قابلِ ذکر ہے .... میں نے قابلِ ذکر اس لیے کہا ہے کہ آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ورنہ یہ واقعہ جو میں اب بیان کرنے والا ہوں میرے نزدیک بے حد حیرت انگیز ہے۔''

شاہ صاحب نے کہا ''جی! میں نہیں کہہ سکتا کہ جو واقعہ میں آپ کو سنانے والا ہوں، ہر شخص کے لیے حیرت کا باعث ہو گا .... میں صرف اپنی ذات کے متعلق آپ سے عرض کر رہا ہوں ...... اور یہ حقیقت ہے کہ میں جو داستان آپ کو سناؤں گا، اس وقت تک میری زندگی میں محیر العقول حیثیت رکھتی ہے۔''

شاہ صاحب نے ''نیل کٹر'' سے اپنے ناخن کاٹنے شروع کیے میں ان کی داستان سننے کے لیے بے تاب تھا، مگر شاید وہ آغاز کے متعلق سوچ رہے تھے کہ اپنی داستان کو کہاں سے شروع کریں۔ میرا خیال درست تھا کہ جو کچھ ان پر بیتا تھا اس کو کئی برس ہو چکے تھے وہ تمام واقعات کی یاد اپنے ذہن میں تازہ کر رہے تھے۔

میں نے سگریٹ سلگایا۔ انہوں نے اپنی دس انگلیوں کے ناخن کاٹ کر ''نیل کٹر'' تپائی پر رکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''میں ان دنوں کابل میں تھا۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحات خاموش رہے، اس کے بعد بولے۔ ''میری وہاں بہت بڑی دکان تھی جس میں بڑھیا سے بڑھیا سامان موجود رہتا تھا۔''

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ ''آپ جنرل مرچنٹ تھے؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''جی ہاں .... کابل کا سب سے بڑا جنرل مرچنٹ ...... میری دکان میں کابل کی قریب قریب ہر عورت سودا لینے آتی تھی ...... آپ سے میں ایک بات عرض کروں .... ساتھ کے دکاندار جب یہ دیکھتے تھے کہ کسی روز عورتوں کی بجائے میری دکان میں مرد گاہک آئے ہیں تو وہ مجھ سے فارسی زبان میں افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ آغا آج یہ کیا ہوا .... کابل کی عورتیں اور لڑکیاں مر گئیں یا تمہارے نصیب سو گئے۔''

شاہ صاحب مسکرا دیتے تھے .... اس کے علاوہ اور وہ کیا جواب دے سکتے تھے لیکن ان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ ان کی دکان میں گاہکوں کی اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب ان کی چرب زبانی کا معجزہ ہے۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''منٹو صاحب میں بہترین سیلز مین ہوں خاص طور پر عورتوں کے ساتھ تو میں اس طرح سودا کر سکتا ہوں کہ یہاں لاہور میں کوئی بھی نہیں کر سکتا .... بی، اے ہوں .... تھوڑی بہت سائیکالوجی بھی میں نے پڑھی ہے، اس لیے مجھے معلوم ہے کہ عورتوں سے کس طرح ''ڈیل'' کیا جا سکتا ہے .... یہی وجہ تھی کہ سارے کابل میں میری دکان ہی ایسی تھی جس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی گاہک موجود ہوتا تھا۔''

میں نے شاہ صاحب کی یہ خود تعریفی سنی اور ان سے کہا۔ ''یقیناً آپ بہترین سیلز مین ہیں کہ آپ کی گفتگو کا انداز ہی اس کا ثبوت ہے۔''

شاہ صاحب مسکرائے۔ ''مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی داستان بہترین سیلز مین کے انداز بیان میں بیان نہیں کرسکوں گا۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''آپ شروع تو کیجیے۔''

شاہ صاحب نے چند لمحات اپنے حافظے کو پھر ٹٹولا اور اپنی داستان شروع کی۔

''منٹو صاحب! جیسا کہ میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں، میں کابل میں تھا۔ یہ کوئی دس برس پہلے کی بات ہے جب میری صحت بہت اچھی تھی۔ یوں تو میں اب بھی تنومند کہلاتا ہوں، مگر اس زمانے میں میرا جسم آج کے مقابلے میں دگنا تھا۔ ہر روز ورزش کرتا تھا سینکڑوں ڈنٹر پیلتا تھا، مگدر گھماتا تھا۔ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب، بس ایک اچھا کھانے کی عادت تھی۔ افغانی نہیں، ہندوستانی، چنانچہ میں امرتسر سے اپنے ساتھ ایک بہت اچھا کشمیری باورچی لے گیا تھا جو ہر روز میرے لیے لذیذ سے لذیذ کھانے تیار کر کے میز پر رکھتا تھا میری زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی۔ آمدن بہت معقول تھی۔ بینک میں لاکھوں افغانی روپے جمع تھے ...... لیکن ......''

شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

''لیکن کہہ کر آپ چپ ہو گئے ...... اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ آپ پھر بھی ناخوش تھے۔''

شاہ صاحب نے اعتراف کیا ''جی ہاں! میں ان تمام آسائشوں کے باوجود ناخوش تھا ...... اس لیے کہ میں اکیلا تھا ...... مجرد تھا ...... اگر میری دکان میں عورتیں اور لڑکیاں زیادہ نہ آتیں تو بہت ممکن ہے کہ مجھے اپنے تجرد کا احساس نہ ہوتا ......

لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا کابل کی ہر صاحب ثروت عورت میری دکان میں آتی تھی...... دکان میں داخل ہوتے ہی یہ عورتیں اور لڑکیاں اپنا برقع اتار کر ایک طرف رکھتیں اور سودا خریدنے میں مصروف ہو جاتیں......... منٹو صاحب! آپ کا شاید یہ خیال ہو کہ وہ بڑا شرعی قسم کا لباس پہنتی ہوں گی، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یوں تو وہاں کی عورتیں اور لڑکیاں پردہ کرتی ہیں مگر لباس ٹھیٹ یورپین پہنتی ہیں۔ سکرٹ، کٹے ہوئے بال، رنگے ہوئے ناخن، پنڈلیاں ننگی.......... جب وہ میری دکان میں آتی تھیں تو اپنے برقعے اتار کر ایک طرف رکھ دیتی تھیں اور مال دیکھنے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔''

شاہ صاحب نے بولنا بند کیا تو میں نے ان سے پوچھا ''آپ کو ان میں سے کسی سے محبت تو یقیناً ہو گئی ہو گی۔''

شاہ صاحب بہت سنجیدہ ہو گئے۔ ''جی ہاں! ایک لڑکی سے ہوئی تھی، جو اپنا برقع نہیں اتارتی تھی، حتیٰ کہ نقاب بھی نہیں اٹھاتی تھی۔''

میں نے ان سے پوچھا۔ ''کون تھی وہ؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ایک بہت بڑے گھرانے سے متعلق تھی۔ اس کا باپ فوج کا اعلیٰ افسر تھا۔ بڑا سخت گیر.......... مجھے اس سے صرف اس لیے محبت ہوئی کہ وہ ہاتھوں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دکھاتی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کی وجہ؟''

شاہ صاحب نے کہا ''مجھے معلوم نہیں اور نہ میں نے اس سے کبھی اس بارے میں استفسار ہی کیا.......... لیکن میرے تصور میں وہ انتہا درجے کی حسین تھی۔

گوری چٹی.......... جسم خواہ برقعے میں لپٹا ہو، لیکن اس کے تناسب کے متعلق اندازہ لگانا کوئی اتنا زیادہ مشکل نہیں تھا.......... میں نے چور آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ جوانی کا آدرش مجسمہ ہے.......... لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ چند منٹوں کے لیے میری دکان میں آتی تھی۔ چیزیں خریدنے اور ان کی قیمتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں چند منٹ صرف کرتی تھی اور چلی جاتی تھی۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ "یہ سلسلہ کب تک جاری رہا......؟"

"قریب قریب چھ مہینے تک.......... مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں۔ میں اس سے بہت مرعوب تھا، اس لیے کہ وہ دوسروں سے مختلف تھی۔ اس میں ایک عجیب قسم کی رعونت تھی...... میں اس کو بے طرح گھورتا تھا، حالانکہ یہ شائستگی نہیں تھی۔ لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا...... منٹو صاحب! ایک دن میں دکان میں بیٹھا اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے ریسیور اٹھایا اور مجھ سے کہا کہ کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں...... میں نے سوچا کہ کوئی گاہک ہوگی اور نئے مال کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوگی۔ اٹھ کر میں نے ریسیور ہاتھ میں لیا اور پوچھا، مادام آپ کیا چاہتی ہیں؟ ادھر سے آواز آئی، کیا آپ سید مظفر علی ہیں؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں...... ارشاد!...... اب میں نے آواز پہچان لی تھی...... یہ اسی کی تھی...... اس کی جو میری دکان میں برقع نہیں اتارتی تھی...... میں گھبرا گیا...... منٹو صاحب! یہ عاشق ہونا بھی ایک عجیب لعنت ہے۔"

یہ سن کر میں مسکرایا۔ "آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب.......... لیکن

افسوس ہے کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔"

شاہ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ "حد ہو گئی ہے...... انسان اپنی جوانی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور عشق میں گرفتار ہوتا ہے...... خیر، آپ کو ابھی تک عشق نہیں ہوا تو خدا کرے کہ بہت جلد ہو جائے، کیونکہ یہ مرض بہت دلچسپ ہے۔"

میں نے مسکرا کر شاہ صاحب سے کہا۔ "آپ اپنی داستان بیان کیجیے...... مجھے عشق ہو گا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس کی پوری روئیداد سنا دوں گا۔"

شاہ صاحب کرسی پر سے اٹھ کر پلنگڑی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

"منٹو صاحب...... میں اس لڑکی کے عشق میں اس بری طرح گرفتار ہوا کہ ورزش بھول گیا...... وہ میری دکان پر اکثر آتی تھی...... میں اس کو گھورتا تھا...... لیکن دیکھیے میرا دماغ کتنا خراب ہو گیا ہے یہ اسی عشق خانہ خراب کا باعث ہے...... میں آپ سے اس کے ٹیلیفون کی بات کر رہا تھا...... جب میں نے ریسیور اٹھایا اور اس کی آواز پہچان لی تو اس نے مجھ سے کہا دیکھو میں جب بھی تمہاری دکان میں آتی ہوں، تم مجھے گھورتے ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو، تو ٹھیک ہو جاؤ ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا...... منٹو صاحب میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا...... میں دیر تک گونگے ریسیور کو کان کے ساتھ لگائے کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اس دھمکی کا مطلب کیا ہے۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "کیا وہ دھمکی اصلی تھی؟"

"جی ہاں...... چوتھے روز وہ میری دکان میں آئی تو میں نے اس کی نقاب کی

طرف پھر انہی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے جھنجھلا کر میرے ملازموں کے سامنے مجھ سے کہا...... تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم مجھے اس طرح دیکھتے ہو...... میں سن ہو گیا...... لیکن اس نے چند چیزیں خریدیں...... دام دیئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلی گئی۔"

میں شاہ صاحب کی داستان میں کافی دلچسپی لے رہا تھا۔ "عجیب لڑکی تھی...... آپ سے اسے نفرت بھی تھی، مگر اس کے باوجود آپ کی دکان میں آتی تھی۔"

شاہ صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ "منٹو صاحب! یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی نفرت و حقارت مصنوعی ہے وہ دراصل وہ میری محبت سے متاثر ہو چکی ہے اور محض بناوٹ کے طور پر غصے کا اظہار کرتی ہے...... لیکن جب ایک روز اس نے مجھے بہت زور سے لعن طعن کی تو میں سرد ہو گیا...... پر اس کی محبت تھی جو میرے دل سے جاتی ہی نہیں تھی...... میں نے بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں...... میں نے خود کو سمجھایا کہ تم عجیب بے وقوف ہو۔ ایک لڑکی جس کی تم نے شکل نہیں دیکھی...... جو تم سے نفرت کرتی ہے، تم اس سے عشق فرما رہے ہو۔ باز آؤ، تمہارا کاروبار ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔ سارے افغانستان میں تمہاری ساکھ ہے۔ یہ کیا جھک مار رہے ہو...... لیکن منٹو صاحب عشق بہت بری بلا ہے میں اس سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا......"

میں نے ان سے کہا "آپ خواہ مخواہ داستان طویل بناتے جا رہے ہیں۔ انجام پر پہنچیے"

شاہ صاحب پلنگڑی پر سے اٹھے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ "حضرت ایسی

داستانیں اکثر طویل ہوا کرتی ہیں۔ عشق ایک مرض ہے اور جب تک طول نہ پکڑے، مرض نہیں ہوتا۔ محض ایک مذاق ہوتا ہے ...... خیر، اب جبکہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی داستان طویل نہ بناؤں تو مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرا عشق جب بہت شدت اختیار کر گیا تو ایک روز میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے شہر امرتسر کا ایک باشندہ سردار بلونت سنگھ تھا جو مجیٹھے کے ایک اچھے خاندان کا فرد تھا۔ وہ کابل میں ایک انجینئرنگ فرم میں ملازم تھا۔ کھانے پینے والا آدمی تھا، اس لیے وہ ہر مہینے مجھ سے پچاس ساٹھ روپے قرض لے جاتا تھا۔ مزید قرض لینے کی غرض ہی سے وہ اس وقت میری دکان میں آیا جب کہ میری آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے معلوم نہیں مجھ سے کیا پوچھا اور میں نے جانے کیا جواب دیا لیکن جب اس نے مجھ سے یہ کہا۔ ''دوست تم کو کوئی روگ لگ گیا ہے۔'' تو میں چونک پڑا۔ ''نہیں نہیں ...... ایسی کوئی بات نہیں ...... سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا اپنی گھنی مونچھوں کے اندر مسکرایا ...... تم جھوٹ بولتے ہو، صاف صاف بتاؤ، تمہیں یہاں کسی سے عشق ہوا ہے ...... میں خاموش رہا تو وہ پھر بولا، دیکھو اگر کوئی مشکل درپیش ہے تو ہم سب ٹھیک کر دیں گے ...... جب اس نے اسی قسم کی چند اور باتیں کیں تو میں نے سارا معاملہ اس کو بتا دیا۔''

میں نے پوچھا ''تو اس نے مشکل آسان کرنے کا کیا گر بتایا؟''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''اس نے مجھے ایک منتر بتایا''

''منتر؟''

''جی ہاں!''

''آپ سید ہیں...... کیا آپ منتر جنتر پر ایمان لا سکتے ہیں؟''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''لانا تو نہیں چاہیے تھا کہ یہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں...... لیکن اس وقت سردار بلونت سنگھ کا مشورہ ماننا ہی پڑا، اس لیے کہ عشق بری بلا ہے...... اس نے مجھے ایک منتر بتایا اور کہا کہ سات رنگوں کے پھول لو۔ ان میں سے ہر ایک پر یہ منتر پڑھ کر پھونکو اور منگل کے روز اس لڑکی کو کسی نہ کسی طریقے سے سنگھا دو...... یہ منتر مجھے ابھی تک یاد ہے۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''ذرا سنائیے تو''

شاہ صاحب نے ایک لمحے کے لیے اپنے حافظے کو ٹٹولا اور کہا:۔

کورو دس ملکھیا دیوی
پھل کھڑے پھل سے
پھل چکے ناہر سنگھ پیارے
جو کوہی لے پھلاوں کی باس
کبھی نہ چھوڑے ہمارا ساتھ
ہمیں چھوڑ کسی اور کو کرے
پیٹ پھول بھسم ہو مرے
دہائی سلیمان پیر پیغمبر کی!

میں نے یہ منتر سنا تو مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا جب میں نے منتروں کی ایک کتاب خریدی تھی اور اس میں سے ایک منتر ازبر اس غرض سے کیا تھا کہ میں سکول کے تمام امتحانوں میں پاس ہوتا چلا جاؤں...... یہ منتر مجھے اب تک یاد ہے

......اونگ نما کا مشیری اتماد ے بھرینگ پر اسواہ......لیکن اس کے پڑھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔

میں نے اس منتر کا ذکر شاہ صاحب سے نہ کیا اور ان سے پوچھا۔ ''تو آپ نے سات رنگ کے پھولوں پر یہ منتر پڑھا؟''

''جی ہاں......وہ آئی......اس نے مجھے ٹیلیفون پر کہہ دیا تھا کہ وہ آئے گی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ پر آئی اور اس نے چیکوسلواکیا کے مال کے متعلق استفسار کیا۔ عرض یہ ہے کہ مال وال کا قصہ بالکل فراڈ تھا......میں نے اس سے کہا کہ ملازموں نے ابھی تک پیٹیاں نہیں کھولیں، آپ کل تشریف لایئے گا۔ وہ بہت جزبز ہوئی، میں منتر پڑھے پھولوں کی طرف دیکھ رہا تھا......اتفاق کی بات کہ اس نے بھی ان پھولوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا، یہ پھول تمہاری میز پر کہاں سے آ گئے؟......میں نے جواب دیا، یہ میں نے آپ کے لیے خریدے تھے۔ اگر آپ کو پسند ہوں......میرا مطلب ہے اگر آپ کو ان کی خوشبو پسند ہو۔ تو آپ انہیں قبول فرمائیں......اس نے وہ سات پھول اٹھائے اور انہیں سونگھا۔''

میں نے ان سے پوچھا ''اس لڑکی کا ردِ عمل کیا تھا؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا......یہ پھول ہیں؟......ان میں تو خوشبو ہے نہ بدبو......بہر حال اس نے وہ پھول سونگھے......چند چیزیں خریدیں اور چلی گئی......شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا میری دکان پر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا......کہ وہ پھول سنگھا دیئے؟ میں نے اس سے کہا۔ سنگھا تو

دیئے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ سردار بلونت سنگھ ہنسا۔ اس نے بڑے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا دوست! اب تمہارا کام سمجھو کہ پندرہ آنے ہو گیا ہے۔"

مجھے بڑی حیرت تھی کہ منتر کے ذریعے سے ایسا کام پندرہ آنے کیونکر ہو سکتا ہے، مگر سید صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "منٹو صاحب! آپ یقین مانیے کہ میرا کام پندرہ آنے مکمل ہو گیا...... دوسرے دن کوکو جان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ کچھ چیزیں خریدنے کے لیے آ رہی ہے، میں نے اس کا استقبال کیا...... وہ کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت دیر تک وہ میری دکان میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تم سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے گھورا نہ کرو...... اور وہ جو تم نے پھول سنگھائے تھے، اس کا کیا مطلب تھا......"

میں نے کوکو جان سے لکنت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں...... میں...... وہ پھول جو تھے...... پھول تھے...... میں نے...... میں نے...... مال جو چیکوسلوواکیہ سے آیا تھا، کھلا ہوا نہیں تھا اس لیے میں نے وہ پھول آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے...... کوکو جان برقعے میں سخت مضطرب تھی...... اس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔ تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے؟"...... میں نے اس سے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا "کیا آپ کو اس سے کوئی تکلیف ہوئی......؟" وہ بڑے گرم انداز میں بولی "تکلیف......؟ میں ساری رات وہ سات پھول دیکھتی رہی ہوں...... پھول آتے تھے اور جب میں انہیں حاصل کرنا چاہتی تھی تو وہ مجھ سے پرے ہٹ جاتے تھے...... یہ کیسے پھول تھے؟ میں نے جواب دیا "میرے وطن کے تھے"

......چونکہ میرے وطن کے تھے اس لیے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے ......لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ رات بھر آپ کو کیوں نظر آتے اور ستاتے رہے۔''

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا ''یہ پھول آپ نے کہاں سے منگوائے تھے؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا ''جی! منگوائے کہاں سے تھے وہیں افغانستان کے تھے ...... نہایت واہیات قسم کے پھول، جن میں خوشبو نام کو بھی نہیں تھی ......

شام کو سردار بلونت سنگھ آیا، مزید قرض لینے کے لیے۔ اس نے مجھ سے قرض لینے سے پہلے دریافت کیا، کہیے شاہ صاحب، اس معاملے کا کیا ہوا؟ میں نے اس کو ساری بات بتادی ...... وہ قرض لینا بھول گیا۔ اپنا بالوں بھرا ہاتھ میرے کندھے پر زور سے مار کر چلایا۔ شاہ جی، آپ کا کام سولہ آنے ہو گیا ہے ...... وسکی کی ایک بوتل منگائیے۔''

شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے وسکی کی بوتل کے علاوہ ایک ڈبہ سگریٹوں کا بھی منگوایا جس میں سے سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا تمباکو نوشی کے ٹھیٹ انداز میں پے در پے کئی سگریٹ پھونکتے رہے۔ جب جانے لگے تو انہوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ دیکھو ابھی تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ اگلے منگل تم اور ساتھ پھول اور ان پر وہی منتر پڑھ کر اس لڑکی کو سنگھا دو ...... بیڑا پار ہو جائے گا ......

شاہ صاحب بہت پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اب کی کوکو جان کو پھول کیسے سنگھا سکیں گے جبکہ وہ اس معاملے کے متعلق شاکی تھی لیکن معاملہ عشق کا تھا، اس لیے شاہ صاحب موت کے منہ میں جانے کے لیے بھی تیار تھے۔

شاہ صاحب نے پشاور سے پھول منگوائے.........ان میں سے سات منتخب کیے اور ہر ایک پر منتر پڑھا اور اپنے میز کے گلدان میں رکھ دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی دکان میں جابجا گلدان رکھوائے اور ان میں پھول سجا دیئے۔

پیر کو شاہ صاحب نے کوکو جان کو ٹیلیفون کیا اور اس سے پھر جھوٹ بولا کہ چیکو سلوواکیا کا مال کھل گیا ہے، آپ آیئے اور دیکھ لیجیے۔ کوکو جان آئی، مگر مال وال موجود نہیں تھا.........شاہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے بوکھلائے، پھر ذرا ہوش سنبھال کر اپنے نوکروں کو لعن طعن کی کہ تم نے ابھی تک مال کیوں نہیں کھولا۔

کوکو جان کے ساتھ اس کی والدہ بوبو جان تھی۔ وہ ایک طرف ٹائلٹ کا سامان دیکھنے میں مصروف تھی۔ کوکو جان نے جب دکان میں جابجا پھول دیکھے تو وہ متعجب ہونے کے علاوہ مضطرب بھی ہوئی۔

میرے میز پر وہ خاص پھول پڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آئی گلدان میں سے اٹھا کر اس نے انہیں سونگھا اور مجھ سے کہا "یہ افغانستان کے پھول نہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں.........یہ میرے وطن کے ہیں.........اور میں نے خاص آپ کے لیے منگوائے ہیں۔ بوبو جان خرید و فروخت میں مشغول تھی۔ اس دوران میں کوکو جان سے میں نے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ وہ سخت ناراض ہوئی اور اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی.........شام کو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا آیا.........اس سے بات چیت ہوئی۔ میں نے اس کو دس روپے قرض دیئے۔ جب اس نے روپے اپنی جیب میں ڈالے تو مجھ سے پوچھا۔ آج منگل ہے.........وہ پھول سنگھا دیئے تھے آپ نے؟.........میں نے سارا واقعہ بیان کر دیا.........سردار بلونت

سنگھ نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ زور سے میرے ہاتھ پر مارا اور کہا، شاہ جی، اب کام سترہ آنے پورا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔ وسکی کی ایک بوتل منگاؤ۔"

شاہ صاحب نے وسکی کی بوتل منگائی۔ سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا نے آدھی، دکان میں پی اور آدھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا۔ "دوسری دفعہ پھول سنگھانے سے کیا نتیجہ برآمد ہوا۔"

شاہ صاحب نے جواب دیا "وہ بہت بے چین ہو گئی۔ اسے دن رات اتنے پھول نظر آنے لگے کہ ایک دن وہ سخت اضطراب کی حالت میں آئی۔ برقع جو اس نے کبھی اتارا نہیں تھا، کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور مجھ سے مخاطب ہوئی "دیکھو شاہ! تم نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا" جو مجھے پہلی بار نظر آیا تھا منٹو صاحب! میں نے اپنی زندگی میں اس جیسی حسین لڑکی اب تک نہیں دیکھی۔۔۔۔۔۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔۔۔۔۔۔ اس نے بڑے تیز و تند لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے پھول کیوں سنگھائے تھے۔۔۔۔۔۔ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ دن ہو یا رات، ہر وقت مجھے وہ تمہارے پھول دکھائی دیتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میرے والدین عنقریب میری شادی کر رہے ہیں۔ تم نے مجھ پر یہ کیا جادو پھونکا ہے۔۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے میرے میز پر سے گلدان میں سے پھول نکالے اور فرش پر پھینک کر اپنی سینڈل سے مسل دیئے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ناراض ہونے کے باوجود ناراض نہیں تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس سے باتیں کروں، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا اس لیے

میں خاموش رہا...... وہ کچھ دیر غصے کی حالت میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے برقع پہنا اور چلی گئی۔"

میں نے شاہ صاحب سے پوچھا "تو سردار بلونت سنگھ مجیٹھیا کا منتر کام کر گیا!"

"جی ہاں کام کر گیا...... اس کو پھول ہی پھول نظر آتے تھے میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ یہ سب بکواس ہے، مگر کلو جان کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ منتر اپنا اثر کر گیا ہے، حالانکہ جو منتر آپ سن چکے ہیں، اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ اثر کرے گا...... لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ جب پھر میری دکان میں آئی تو برقع اتار کر مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور رونا شروع کر دیا۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ چوما۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری میز پر گلدان میں جو پھول پڑے تھے اس نے نکالے اور انہیں نوچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ برقع پہن کر تیزی سے باہر نکل گئی۔"

داستان کافی طوالت پکڑ رہی تھی۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا "آپ مختصراً فرمائیے کہ انجام کیا ہوا؟...... کیا وہ لڑکی آپ کو مل گئی؟"

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری۔ "جی نہیں...... اس کی شادی ہو گئی۔ مگر حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہی معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ گری اور گرتے ہی مر گئی...... اس کے ہاتھ میں سات پھول تھے مختلف رنگوں کے۔"

میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کی پلنگڑی کے ساتھ تپائی پر پیتل کے پھولدان میں سات مختلف رنگوں کے پھول اڑسے ہوئے تھے۔

بھنگن

''پرے ہٹیے......''

''کیوں؟''

''مجھے آپ سے بو آتی ہے۔''

''ہر انسان کے جسم کی ایک خاص بو ہوتی ہے...... آج بیس برسوں کے بعد تمہیں اس سے تنفر کیوں محسوس ہونے لگا؟''

''بیس برس...... اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے اتنا طویل عرصہ کیسے بسر کیا ہے۔''

''میں نے کبھی آپ کو اس عرصہ میں تکلیف پہنچائی؟''

''جی کبھی نہیں۔''

''تو پھر آج اچانک آپ کو مجھ سے ایسی بو کیوں آنے لگی جس سے آپ کی ناک جو ماشاءاللہ کافی بڑی ہے اتنی غضب ناک ہو رہی ہے۔''

''آپ اپنی ناک تو دیکھیے...... پکوڑا سی ہے۔''

''میں اس سے انکار نہیں کرتا...... پکوڑے، تم جانتی ہو مجھے بہت پسند ہیں۔''

''آپ کو تو ہر واہیات چیز پسند ہوتی ہے...... کوڑے کرکٹ سے بھی آپ دلچسپی لیتے ہیں۔''

''کوڑا کرکٹ ہمارا ہی تو پھیلایا ہوتا ہے...... اس سے آدمی دلچسپی کیوں نہ لے...... اور تم جانتی ہو آج سے دس سال پہلے جب تمہاری ہیرے کی انگوٹھی گم ہو

گئی تھی تو اسی کوڑے کے ڈھیر سے میں نے تمہیں تلاش کر کے دی تھی۔''

''بڑا کرم کیا تھا آپ نے مجھ پر۔''

''بھئی کرم کا سوال نہیں...... فارسی کا ایک شعر ہے''

خاکساراں را بہ حقارت منگر

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

''میں خاک بھی نہیں سمجھی۔''

''یہی وجہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا...... ورنہ بیس برس ایک آدمی کو پہچاننے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔''

''ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟''

''تم دکھ کی بات کرو...... بتاؤ میں نے کون سا دکھ تمہیں اس عرصے میں پہنچایا؟''

''ایک بھی نہیں۔''

''تو پھر یہ کہنے کا کیا مطلب تھا...... ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟''

''آپ میرے قریب نہ آئیے...... میں سونا چاہتی ہوں۔''

''اس غصے میں نیند آ جائے گی تمہیں؟''

''خاک آئے گی...... بہر حال...... آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں گی اور......''

''اور کیا کریں گی؟''

''لیٹی اس روز پر آنسو بہاؤں گی جب میں آپ کے پلے باندھی گئی۔''

’’تمہیں یاد ہے وہ دن کیا تھا......سن کیا تھا......وقت کیا تھا؟‘‘

’’میں کبھی وہ دن بھول سکتی ہوں......خدا کرے وہ کسی لڑکی پر نہ آئے۔‘‘

’’تم بتا تو دو......میں تمہاری یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اب آپ میرا امتحان کیا لیں گے......پرے ہٹیے......مجھے آپ سے بو آ رہی ہے۔‘‘

’’بھئی حد ہو گئی ہے......تمہاری اتنی لمبی ناک جو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی اس کو آخر کیا ہو گیا ہے......مجھ سے تو اس کو بڑی بھینی بھینی خوشبو آنا چاہیے......تم نے مجھ سے ان بیس برسوں میں ہزاروں مرتبہ کہا کہ آپ جب کسی کمرے میں داخل ہوں اور وہاں سے نکل جائیں تو میں پہچان جایا کرتی ہوں کہ آپ وہاں آئے تھے۔‘‘

’’آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔‘‘

’’دیکھو......میں نے اپنی زندگی میں آج تک جھوٹ نہیں بولا......تم مجھ پر یہ الزام نہ دھرو۔‘‘

’’واہ جی واہ، بڑے آئے ہیں آپ کہیں کے سچے......میرا سو روپے کا نوٹ آپ نے چرایا اور صاف مکر گئے۔‘‘

’’یہ کب کی بات ہے؟‘‘

’’دو جون سن انیس سو بیالیس کو......جب سلمیٰ میرے پیٹ میں تھی۔‘‘

’’یہ تاریخ تمہیں خوب یاد رہی۔‘‘

’’کیوں یاد نہ رہتی۔ جب آپ سے میری اتنی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ میں

اندر کمرے میں پڑی تھی۔ آپ نے چابی بڑی صفائی سے میرے تکیے کے نیچے سے نکالی۔ دوسرے کمرے میں جا کر الماری کھولی اور اس میں جو سات سو روپے تھے ان میں سے ایک نوٹ اڑا کر لے گئے۔ میں نے جب دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد اٹھ کر دیکھا تو آپ سے چخ ہوئی۔ مگر آپ تھے کہ پروں پر پانی ہی نہیں لیتے تھے۔ آخر میں خاموش ہوگئی۔"

"یہ دو جون سن انیس سو بیالیس کی بات ہے..... آج کل سن چون چل رہا ہے۔ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟"

"فائدہ تو ہر حالت میں آپ ہی کا رہنا ہے..... میری ایک نیلم کی انگوٹھی بھی آپ نے غائب کر دی تھی، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"دیکھو میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اس نیلم کی انگوٹھی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"اور اس سو روپے کے نوٹ کے متعلق"

"اب تمہاری جان کی قسم کھائی ہے تو سچ مچ بتانا ہی پڑے گا..... میں نے میں نے چرایا ضرور تھا، مگر صرف اس لیے کہ اس مہینے مجھے تنخواہ دیر سے ملنے والی تھی اور تمہاری سالگرہ تھی۔ تمہیں کوئی تحفہ دینا تھا۔ ان بیس برسوں میں تمہاری ہر سالگرہ پر میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا رہا ہوں۔"

"بڑے تحفے تحائف دیئے ہیں آپ نے مجھے۔"

"ناشکری تو نہ بنو۔"

"میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں، آپ پرے ہٹ جایئے..... مجھے آپ سے بو آتی ہے۔"

”کس کی؟“

”یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”میں نے خود کوئی مرتبہ سونگھا ہے، مگر میری پکوڑا ایسی ناک میں ایسی کوئی بو نہیں گھسی۔ جس پر کسی بیوی کو اعتراض ہو سکے۔“

”آپ باتیں بنانا خوب جانتے ہیں۔“

”اور باتیں بگاڑنا تم..... میری سمجھ میں نہیں آتا آج تم اس قدر ناراض کیوں ہو۔“

”اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے۔“

”میں اس وقت قمیض پہنے نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“

”سخت گرمی ہے۔“

”سخت گرمی ہو یا نرم..... آپ کو قمیض تو نہیں اتارنا چاہیے تھی۔ یہ کوئی شرافت نہیں۔“

”محترمہ! آپ نے بھی تو قمیض اتار رکھی ہے..... اپنے ننگے بدن کو ملاحظہ فرمائیے۔“

”اوہ..... یہ میں نے کیا واہیات پن کیا ہے۔“

”یہ واہیات پن تو آپ گرمیوں میں بیس برس سے کر رہی ہیں۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں۔“

”خیر جھوٹ بولنا تو ہر مرد کی عادت ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ سے دور ہی رہیں۔“

''کیوں؟''

''توبہ......لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے بہت گندی بو آرہی ہے۔''

''پہلے صرف بو تھی......اب گندی ہوگئی۔''

''خبردار، جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا۔''

''اس قدر بیزاری آخر کیوں؟''

''میں اب آپ سے قطعاً بیزار ہو چکی ہوں۔''

''ان بیس برسوں میں تم نے کبھی ایسی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔''

''اب تو کر دیا ہے۔''

''لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے۔''

''میں کہتی ہوں، مجھے مت چھوئیے۔''

''تمہیں مجھ سے اتنی کراہت کیوں ہو رہی ہے۔''

''آپ ناپاک ہیں......بے حد ذلیل ہیں۔''

''دیکھو، تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔''

''آپ نے کم کی ہے۔کوئی شریف آدمی آپ کی طرح ایسی ذلیل حرکت نہیں کرسکتا تھا۔''

''کون سی؟''

''آج صبح کیا ہوا تھا؟''

''آج صبح؟......بارش ہوئی تھی۔''

''بارش ہوئی تھی............لیکن اس بارش میں آپ نے کس کو اپنی آغوش میں

دبایا ہوا تھا؟''

''اوہ!''

''بس اس کا جواب اب ''اوہ'' ہی ہو گا...... میں نے پکڑ جو لیا آپ کو۔''

''دیکھو میری جان............''

''مجھے اپنی جان وان مت کہیے...... آپ کو شرم آنی چاہیے۔''

''کس بات پر...... کس گناہ پر؟''

''میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے...... لیکن ایسی گندگی میں نہ گرے۔''

''میں کس گندگی میں گرا ہوں؟''

''آج صبح آپ نے اس...... اس......''

''کیا؟''

''اس بھنگن کو...... جوان بھنگن کو جو مٹھائی والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔''

''لاحول والا...... تم بھی عجیب عورت ہو...... وہ غریب حاملہ ہے بارش میں جھاڑو دیتے ہوئے اس کو غش آیا اور گر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا اور اس کے کوارٹر میں لے گیا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گئی؟''

''ہائے...... بے چاری...... میں تو ٹھنڈی برف ہو گئی ہوں۔''

''میرے قریب آجاؤ...... میں قمیض پہن لوں؟''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری قمیض میں ہوں۔''

بیگو

تسلیاں اور دلاسے بے کار ہیں۔ لوہے اور سونے کے یہ مرکب میں پھانکوں پھانک چکا ہوں۔ کون سی دوا ہے جو میرے حلق میں نہیں اتاری گئی۔ میں آپ کے اخلاق کا ممنون ہوں مگر ڈاکٹر صاحب میری موت یقینی ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں دق کا مریض نہیں۔ کیا میں ہر روز خون نہیں تھوکتا؟ آپ یہی کہیں گے کہ یہ میرے گلے اور دانتوں کی خرابی کا نتیجہ ہے مگر میں سب جانتا ہوں۔ میرے دونوں پھیپھڑے خانہ زنبور کی طرح مشبک ہو چکے ہیں☆ آپ کے انجکشن مجھے دوبارہ زندگی نہیں بخش سکتے۔ دیکھئے، میں اس وقت آپ سے باتیں کر رہا ہوں مگر سینے پر ایک وزنی انجن دوڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک تاریک گڑھے میں اتر رہا ہوں...... قبر بھی تو ایک تاریک گڑھا ہے۔ آپ میری طرف اس طرح نہ دیکھئے ڈاکٹر صاحب، مجھے اس چیز کا کامل احساس ہے کہ آپ اپنے ہسپتال میں کسی مریض کا مرنا پسند نہیں کرتے مگر جو چیز اٹل ہے وہ ہو کے رہے گی۔ آپ ایسا کیجیے کہ مجھے یہاں سے رخصت کر دیجیے۔ میری ٹانگوں میں تین چار میل چلنے کی قوت ابھی باقی ہے۔ کسی قریب کے گاؤں میں چلا جاؤں گا اور...... مگر میں تو رو رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجیے میں موت سے خائف نہیں۔ یہ میرے جذبات ہیں، جو آنسوؤں کی شکل میں باہر نکل رہے ہیں۔ آہ! آپ کیا جانیں۔ اس مدقوق سینے سے کیا کچھ باہر نکلنے کو مچل رہا ہے میں اپنے انجام سے باخبر ہوں۔ آج سے پانچ برس پہلے بھی میں اس وحشت ناک

انجام سے باخبر تھا، جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ کچھ عرصے بعد میری زندگی کی ڈوری ختم ہو جائے گی۔ میں نے اس گیند کو جسے آپ زندگی کے نام سے پکارتے ہیں، خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر کاٹا ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کھیل میں لذت محسوس کر رہا ہوں۔ لذت...... ہاں لذت ...... میں نے اپنی زن دگی کی کئی راتیں حسن فروش عورتوں کے تاریک اڈوں پر گزاری ہیں۔ شراب کے نشے میں چور میں نے کس بیدردی سے خود کو اس حالت پر پہنچایا۔ مجھے یاد ہے انہی اڈوں کی سیاہ پیشہ عورت ...... کیا نام تھا اس کا؟...... ہاں گلزار مجھے اس بری طرح اپنی جوانی کو کیچڑ میں لت پت کرتے دیکھ کر مجھ سے ہمدردی کرنے لگ گئی تھی۔ بے وقوف عورت، اس کو کیا بتاتا کہ میں اس کیچڑ میں کس کا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے گلزار اور دیگر ہم پیشہ عورتوں سے نفرت تھی اور اب بھی ہے، لیکن کیا آپ مریضوں کو زہر نہیں کھلاتے اگر اس سے اچھے نتائج کی امید ہو۔ میرے درد کی دوا ہی تاریک زندگی تھی۔ میں نے بڑی کوششوں اور مصیبتوں کے بعد اس انجام کو بلایا ہے۔ جس کی کچھ روداد آپ نے میرے سرہانے ایک تختی پر لکھ کر لٹکا رکھی ہے۔ میں نے اس کے انتظار میں ایک ایک گھڑی کس بیتابی سے کاٹی ہے، آہ! کچھ نہ پوچھئے لیکن اب مجھے دلی تسکین حاصل ہو چکی ہے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ میں دق اور سل کا مریض ہوں۔ اس مرض نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے...... آپ حقیقت کا اظہار کیوں نہیں کر دیتے بخدا اس سے مجھے اور تسکین حاصل ہو گی۔ میرا آخری سانس آرام سے نکلے گا ...... ہاں ڈاکٹر صاحب تو یہ بتائیے، کیا آخری لمحات واقعی تکلیف دہ ہوتے

ہیں؟ میں چاہتا ہوں میری جان آرام سے نکلے۔ آج میں واقعی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ آپ اپنے دل میں یقیناً مسکراتے ہوں گے کہ میں آج معمول سے بہت زیادہ باتونی ہو گیا ہوں ...... دیا جب بجھنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی روشنی تیز ہو جایا کرتی ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ .... آپ تو بولتے ہی نہیں اور میں ہوں کہ بولے جا رہا ہوں۔ ہاں ...... ہاں ...... بیٹھیے ...... میرا جی چاہتا ہے کہ آج کسی سے باتیں کیے جاؤں۔ آپ نہ آتے تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی ...... آپ کا سفید سوٹ آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ کفن بھی اسی طرح صاف ستھرا ہوتا ہے۔ پھر آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں مرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ اگر مرنے والوں کو کفن خود پہننا ہو تو آپ دیکھتے میں اس کو کتنی جلدی اپنے گرد لپیٹ لیتا۔ میں کچھ عرصہ اور زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ کہ وہ مر چکی ہے، میرا زندہ رہنا فضول ہے۔ میں نے اس موت کو بہت مشکلوں کے بعد اپنی طرف آمادہ کیا ہے اور اب میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔ وہ مر چکی ہے اور اب میں بھی مر رہا ہوں۔ میں نے اپنی سنگ دلی .... وہ مجھے سنگ دل کے نام سے پکارا کرتی تھی، کی قیمت ادا کر دی ہے اور خدا گواہ ہے کہ اس کا کوئی سکہ بھی کھوٹا نہیں۔ میں پانچ سال تک ان کو پرکھتا رہا ہوں۔ میری عمر اس وقت پچیس برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہ، ان سات برسوں کی روداد کتنی حیرت افزا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی تفصیل کاغذوں پر پھیلا دے تو انسانی دلوں کی داستانوں میں کیسا دلچسپ اضافہ ہو۔ دنیا ایک ایسے دل کی دھڑکن

سے آشنا ہو گی۔ جس نے اپنی غلطی کی قیمت خون کی ان تھوکوں میں ادا کی ہے۔ جنہیں آپ ہر روز جلاتے رہتے ہیں۔ کہ ان کے جراثیم دوسروں تک نہ پہنچیں .... آپ میری بکواس سنتے سنتے کیا تنگ تو نہیں آ گئے خدا معلوم کیا کیا کچھ بکتا رہا ہوں۔ تکلف سے کام نہ لیجیے۔ آپ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ میں خود کچھ نہیں سمجھ سکا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بٹوت سے واپس آ کر میرے دل و دماغ کا ہر جوڑ ہل گیا تھا۔ اب یعنی آج جب کہ میرے جنون کا دورہ ختم ہو چکا ہے اور موت کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وزن جو میری چھاتی کو دابے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں موت وزن جو میری چھاتی کو دابے ہوئے تھا ہلکا ہو گیا ہے اور میں پھر زندہ ہو رہا ہوں موت میں زندگی .... کیسی دلچسپ چیز ہے آج میرے ذہن سے دھند کے تمام بادل اٹھ گئے ہیں۔ میں ہر چیز کو روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ سات برس پہلے کے تمام واقعات اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں۔ دیکھیے ...... میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ سوٹ سلوائے جا رہے ہیں۔ ہولڈال اور ٹرنک کپڑوں سے پر کیے جا رہے ہیں۔ میں رات کی گاڑی سے جموں روانہ ہوتا ہوں۔ شمیم میرے ساتھ ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر ہم عرصہ تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی ہے۔ شمیم چلا جاتا ہے۔ میں سو جاتا ہوں۔ دماغ ہر قسم کی فکر سے آزاد ہے۔ صبح جموں کے اسٹیشن پر جاگتا ہوں کشمیر کی حسین وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں مگن لاری پر سوار ہوتا ہوں۔ بٹوت سے ایک میل کے فاصلے پر لاری کا پہیہ پنکچر ہو جاتا ہے شام کا وقت ہے۔ اس لیے

رات بٹوت کے ایک ہوٹل میں کاٹنا پڑتی ہے۔ اس ہوٹل کا کمرہ مجھے بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے مگر کیا معلوم تھا کہ وہاں پر مجھے پورے دو مہینے رہنا پڑے گا۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ لاری کے انجن کا ایک پرزہ بھی خراب ہو گیا ہے اس لیے مجبوراً ایک دن اور بٹوت میں ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ سن کر میری طبیعت کس قدر افسردہ ہو گئی تھی اس افسردگی کو دور کرنے .... میں اس روز شام کو سیر کے لیے نکلتا ہوں۔ چیڑ کے درختوں کا تنفس، جنگلی پرندوں کی نغمہ سرائیاں سیب کے درختوں کا حسن اور غروب ہوتے سورج کا دل کش سماں۔ لاری والے کی بے احتیاطی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والی تقدیر کی گستاخی کا رنج افزا خیال محو کر دیتا ہے۔ میں نیچر کے مسرت افزا مناظر سے لطف اندوز ہوتا سڑک کے ایک موڑ پر پہنچتا ہوں۔ دفعتاً میری نگاہیں اس سے دوچار ہوتی ہیں۔ بیگو مجھ سے بیس قدم کے فاصلے پر اپنی بھینس کے ساتھ کھڑی ہے .... جس داستان کا انجام اس وقت آپ کے پیش نظر ہے اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

وہ جوان تھی۔ اس کی جوانی پر بٹوت کی فضا پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر تھی سبز لباس میں ملبوس وہ سڑک کے درمیان مکئی کا ایک دراز قد بوٹا معلوم ہو رہی تھی چہرے کے تانبے ایسے تابیاں رنگ پر اس کی آنکھوں کی چمک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی جو چشمے کے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھیں ....

میں اس کو کتنا عرصہ دیکھتا رہا۔ یہ مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے دفعتاً اپنا سینہ موسیقی سے لبریز پایا اور پھر میں مسکرا دیا۔ اس کی بھٹکی ہوئی نگاہوں کی توجہ بھینس سے ہٹ کر میرے تبسم سے ٹکرائی۔ میں گھبرا گیا۔ اس نے ایک تیز تجسس سے میری

طرف دیکھا۔ جیسے وہ کسی بھولے ہوئے خواب کو یاد کر رہی ہے پھر اس نے اپنی چھڑی کو دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور مسکرا دی۔ اس کا سینہ چشمے کے پانی کی طرح دھڑک رہا تھا۔ میرا دل بھی میرے پہلو میں انگڑائیاں لے رہا تھا.......... آہ یہ پہلی ملاقات کس قدر لذیذ تھی۔ اس کا ذائقہ ابھی تک میرے جسم کی ہر رگ میں موجود ہے...... وہ چلی گئی...... میں اس کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ اس انداز سے چل رہی تھی جیسے کچھ یاد کر رہی ہے۔ کچھ یاد کرتی ہے مگر پھر بھول جاتی ہے اس نے جاتے ہوئے پانچ چھ مرتبہ میری طرف مڑ کر دیکھا لیکن فوراً ہی سر پھیر لیا جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی جو سڑک کے نیچے مکئی کے چھوٹے سے کھیت کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس احساس نے مجھے سخت متحیر کیا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی۔ کالج میں اپنے ہم جماعت طلبہ کی زبانی میں محبت کے متعلق سن چکا تھا۔ عشقیہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے متعلق سن چکا تھا۔ عشقیہ داستانیں بھی اکثر میرے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ مگر محبت کے حقیقی معنی میرے نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے ایک ناقابل بیان تلخی اپنے دل کی دھڑکنوں میں حل ہوتی ہوئی محسوس کی تو میں نے خیال کیا شاید اسی کا نام محبت ہے.......... یہ محبت ہی تھی.......... عورت سے محبت کرنے کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد کی ہو جائے، یعنی وہ اس سے شادی کر لے۔ وہ آرام سے اپنی بقایا زندگی گزار دے۔ شادی کے بعد یہ محبت کروٹ بدلتی ہے۔ پھر مرد اپنی محبوبہ کے کاندھوں پر ایک گھر تعمیر کرتا ہے۔ میں نے جب بیگو کو

اپنے دل سے وابستہ ہوتے محسوس کیا تو فطری طور پر میرے دل میں اس رفیقۂ حیات کا خیال پیدا ہوا جس کے متعلق میں اپنے کمرے کی چار دیواری میں کئی خواب دیکھ چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل سے یہ صدا اٹھی۔ ''دیکھو سعید یہ لڑکی ہی تمہارے خوابوں کی پری ہے۔'' چنانچہ میں تمام واقعے پر غور کرتا ہوا ہوٹل واپس آیا اور ایک ماہ کے لیے ہوٹل کا وہ کمرہ کرائے پر اٹھا لیا جو مجھے بے حد غلیظ محسوس ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوٹل کا مالک میرے اس ارادے کو سن کر بہت متحیر ہوا تھا۔ اس لیے کہ میں صبح اس کی غلاظت پسندی پر ایک طویل لیکچر اسے دے چکا تھا۔ داستان کتنی طویل ہوتی جا رہی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ اسے غور سے سن رہے ہیں ...... ہاں ہاں آپ سگریٹ سلگا سکتے ہیں۔ میرے گلے میں آج کھانسی کے آثار محسوس نہیں ہوتے۔ آپ کی ڈبیہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ بیگو بھی سگریٹ پیا کرتی تھی۔ میں نے کئی بار اسے گولڈ فلیک کی یہ ڈبیاں لا کر دی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے ان کو منہ میں دبا کر دھوئیں کے بادل اڑایا کرتی تھی۔ دھواں .... میں اس نیلے نیلے دھوئیں کو اب بھی دیکھ رہا ہوں جو اس کے گیلے ہونٹوں پر رقص کیا کرتا تھا ...... ہاں تو دوسرے روز میں شام کو اسی وقت ادھر سیر کو گیا۔ جہاں مجھے وہ سڑک پر ملی تھی۔ دیر تک سڑک کے ایک کنارے پتھروں کی ایک دیوار پر بیٹھا رہا۔ مگر وہ نظر نہ آئی .... اٹھا اور ٹہلتا آگے نکل گیا۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی جس پر چیڑ کے درخت اگے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ بڑے بڑے پتھروں کے کٹے پھٹے سر ابھر رہے تھے۔ ان پر جمی ہوئی مٹی کے ڈھیلوں میں گھاس

اگی ہوئی تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ چیڑ کے تاگا نما پتوں کی سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جب موڑ مڑا تو دفعتاً میری نگاہیں سامنے اٹھیں مجھ سے سو گز کے فاصلے پر وہ اپنی بھینس کو ایک سنگین حوض میں پانی پلا رہی تھی۔ میں قریب پہنچا۔ مگر اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا اور آگے نکل گیا اور جب واپس مڑا تو وہ گھر جا چکی تھی۔ اب ہر روز اس طرف سیر کو جانا میرا معمول ہو گیا۔ مگر بیس روز تک میں اس سے ملاقات نہ کر سکا۔ میں نے کئی بار باؤلی پر پانی پیتے وقت اس سے ہم کلام ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر زبان گنگ ہو گئی۔ کچھ بول نہ سکا قریباً ہر روز میں اس کو دیکھتا۔ مگر رات کو جب میں تصور میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تو ایک دھند سی چھا جاتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں اس کی شکل کو اس کے باوجود کہ اسے ہر روز دیکھتا تھا۔ بھول جاتا تھا۔ بیس دنوں کے بعد ایک روز چار بجے کے قریب جب کہ میں ایک باؤلی کے اوپر چیڑ کے سائے میں لیٹا تھا۔ وہ ایک خورد سال لڑکے کو لے کر اوپر چڑھی۔ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں سخت گھبرا گیا۔ دل میں یہی آئی کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن اس کی سکت بھی نہ رہی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ چونکہ اس کے قدم تیز تھے۔ اس لیے لڑکا پیچھے رہ گیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ دفعتاً لڑکے نے ایک چیخ ماری اور چشم زدن میں چیڑ کے خشک پتوں پر سے پھسل کر نیچے آ رہا۔ میں فوراً اٹھا اور بھاگ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ چیخ سن کر وہ مڑی اور دوڑنے کے بڑھے ہوئے قدم روک کر آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اپنی جوان آنکھوں سے مجھے دیکھا اور لڑکے سے یہ کہا۔ ”خدا جانے تم کیوں گر گر پڑتے ہو؟“

میں نے گفتگو شروع کرنے کا ایک موقع پا کر اس سے کہا۔ ''بچہ ہے، اس کی انگلی پکڑ لیجیے۔ ان پتھوں نے خود مجھے کئی بار اوندھے منہ گرا دیا ہے۔''

یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''آپ کے ہیٹ نے تو خوب لڑھکنیاں کھائی ہوں گی۔''

''آپ ہنستی کیوں ہیں؟ کسی کو گرتے دیکھ کر آپ کی طبیعت اتنی شاد کیوں ہوتی ہے اور جو کسی روز آپ گر پڑیں تو .... وہ گھڑا جو ہر روز بھر کر شام کے وقت آپ گھر لے جاتی ہیں۔ کس بری طرح زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔''

''میں نہیں گر سکتی .... '' یہ کہتے ہوئے اس نے دفعتاً نیچے باؤلی کی طرف دیکھا اس کی بھینس نالی پر بندھے ہوئے پل کی طرف خراماں جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب قسم کی آواز نکالی۔ اس کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ کس قدر جوان تھی یہ آواز، اس نے بڑھ کر لڑکے کو کاندھے پر اٹھا لیا اور بھینس کو، اے چھلاں، اے چھلا کے نام سے پکارتی ہوئی چشم زدن میں نیچے اتر گئی۔ بھینس کو واپس موڑ کر اس نے میری طرف دیکھا اور گھر کو چل دی ...... اس ملاقات کے بعد اس سے ہم کلام ہونے کی جھجک دور ہو گئی۔ ہر روز شام کے وقت باؤلی پر یا چیڑ کے درختوں تلے میں اس سے کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتا۔ شروع شروع میں ہماری گفتگو کا موضوع بھینس تھا۔ پھر میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا اور اس نے میرا اس کے بعد گفتگو کا رخ اصل مطلب کی طرف آ گیا۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ نالے میں ایک بڑے

سے پتھر پر بیٹھی اپنے کپڑے دھو رہی تھی میں.........اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کسی خاص بات کا اظہار کرنے پر تیار دیکھ کر اس نے جنگلی بلی کی طرح میری طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے اپنی شلوار کو پتھر پر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"آپ کشمیر کب جا رہے ہیں۔ جہاں بٹوت میں کیا دھرا ہے جو آپ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

یہ سن کر میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا میں اس کے سوال کا جواب خود اس کی زبان سے چاہتا ہوں۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ سیر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کشمیر میں بہت سے باغ ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟"

موقع اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے دل کے تمام دروازے کھول دیئے۔ وہ میرے جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا شور خاموشی سے سنتی رہی۔ میری آواز نالے کے پانی کی گنگناہٹ میں جو ننھے ننھے سنگریزوں سے کھیلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر اخروٹ کے گھنے درخت میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں ہوا اس قدر تازہ لطیف تھی کہ اس کا ہر جھونکا بدن پر ایک خوشگوار کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ میں اس سے پورا ایک گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور شادی کا خواہشمند ہوں۔ یہ سن کر وہ بالکل متحیر نہ ہوئی لیکن اس کی نگاہیں جو دور پہاڑیوں کی سیاہی اور آسمان کی نیلاہٹ کو آپس میں ملتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد اس نے

میرے اصرار پر صرف اتنا جواب دیا۔

''اچھا آپ کشمیر نہ جائیں۔''

یہ جواب اختصار کے باوجود حوصلہ افزا تھا...... اس ملاقات کے بعد ہم دونوں بے تکلف ہو گئے۔ اب پہلا سا حجاب نہ رہا۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز میں نے اس سے نشانی کے طور پر کچھ مانگا تو اس نے بڑے بھولے انداز سے اپنے سر کے دو کلپ اتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور مسکرا کر کہا۔ ''میرے پاس یہی کچھ ہے۔'' یہ کلپ میرے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ خیر، کچھ دنوں کی طول طویل گفتگوؤں کے بعد میں نے اس کی زبان سے کہلوا لیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس روز شام کو اس نے اپنے گھڑے کو سر پر سنبھالتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ ''ہاں میں چاہتی ہوں۔'' تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہوٹل کو واپس آتے ہوئے کچھ گایا تھا۔ اس پر مسرت شام کے چوتھے روز جب کہ میں آنے والی ساعت سعید کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس مکان کی تمام دیواریں گر پڑیں جن کو میں نے بڑے پیار سے استوار کیا تھا۔ بستر میں پڑا تھا کہ صبح سیالکوٹ کے ایک صاحب جو بغرض تبدیلی آب و ہوا بٹوت میں قیام پذیر تھے اور ایک حد تک بیگو سے میری محبت کو جانتے تھے۔ میری چارپائی پر بیٹھ گئے اور نہایت ہی متفکرانہ لہجہ میں کہنے لگے:

''وزیر بیگم سے ملاقاتوں کا ذکر آج بٹوت میں ہر بچے کی زبان پر ہے میں وزیر بیگم کے کیریکٹر سے ایک حد تک واقف تھا۔ اس لیے کہ سیالکوٹ میں اس لڑکی

کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں مگر یہاں بٹوت میں اس کی تصدیق ہوگئی ہے، ایک ہفتہ پہلے یہاں کا قصائی اس کے متعلق ایک طویل حکایت سنا رہا تھا۔ پرسوں پان والا آپ سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا کہ آپ عصمت باختہ لڑکی کے دام میں پھنس گئے ہیں۔ کل شام کو ایک اور صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ ایک ٹوٹی ہوئی ہنڈیا خرید رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض لوگ اس سے آپ کی گفتگو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ آپ جب سے بٹوت میں آئے ہیں وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ میں نے آپ سے حقیقت کا اظہار کر دیا ہے۔ اب آپ بہتر سوچ سکتے ہیں۔''

عصمت باختہ لڑکی، ٹوٹی ہوئی ہنڈیا، لوگ اس سے میری گفتگو پسند نہیں کرتے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آتا تھا۔ بیگو اور............ اس کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر جب دوسرے روز مجھے ہوٹل والے نے نہایت ہی رازدرانہ لہجے میں چند باتیں کہیں تو میری آنکھوں کے سامنے تاریک سی دھند چھا گئی۔ ''بابو جی! آپ بٹوت میں سیر کے لیے آئے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ یہاں کی حسن فروش لڑکی کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔ میرا اس لڑکی کے گھر آنا جانا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس کو کچھ کپڑے بھی خرید دیئے ہیں آپ نے یقیناً اور بھی روپے خرچ کیے ہوں گے۔ معاف کیجیے مگر یہ سراسر حماقت ہے۔ میں آپ سے یہ باتیں ہرگز نہ کرتا۔ کیونکہ یہاں بیسیوں عیش پسند مسافر آتے ہیں۔ مگر آپ کا دل ان سیاہیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ آپ بٹوت سے چلے جائیں اس قماش کی لڑکی سے گفتگو کرنا اپنی عزت کو خطرے میں

ڈالنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں نے مجھے بے حد افسردہ بنا دیا ہے۔ وہ مجھ سے سگریٹ، مٹھائی اور اسی قسم کی دوسری معمولی چیزیں طلب کیا کرتی تھی اور میں بڑے شوق محبت سے اس کی یہ خواہش پوری کیا کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص لطف تھا مگر اب ہوٹل والے کی بات نے میرے ذہن میں مہیب خیالات کا تلاطم برپا کر دیا۔ گزشتہ ملاقاتوں کے جتنے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ تھے اور جنہیں میں ہر روز بڑے پیار سے اپنے تصور میں لا کر ایک خاص قسم کی مٹھاس محسوس کیا کرتا تھا۔ دفعتاً تاریک شکل اختیار کر گئے۔ مجھے اس کے نام ہی سے عفونت آنے لگی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی بہت ہی کوشش کی مگر بے سود۔ میرا دل جو ایک کالج کے طالب علم کے سینے میں دھڑکتا تھا اپنے خوابوں کی یہ بری اور بھیانک تعبیر دیکھ کر چلا اٹھا۔ اس کی باتیں جو کچھ عرصہ پہلے مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ریاکاری میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگیں .... میں نے گزشتہ واقعات، بیگو کی نقل و حرکت، اس کی ہر جنبش اور اپنے گردوپیش کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر عمیق مطالعہ کیا۔ تو تمام چیزیں روشن ہو گئیں۔ اس کا ہر شام کو ایک مریض کے ہاں دودھ لے کر جانا اور وہاں ایک عرصہ تک بیٹھی رہنا۔ باؤلی پر ہر کس و ناکس سے بیباکانہ گفتگو، دوپٹے کے بغیر ایک پتھر سے دوسرے پتھر پر اچھل کود، اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کہیں زیادہ شوخی اور آزادی'' .... ''وہ یقیناً عصمت باختہ لڑکی ہے۔'' میں نے یہ رائے مرتب تو کر لی۔ مگر آنسوؤں سے میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ خوب رویا مگر دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار اور آخری بار اس سے ملوں اور اس کے منہ پر تمام غصے کو تھوک دوں۔ یہی صورت تھی جس سے

مجھے کچھ سکون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں شام کو باؤلی کی طرف گیا۔ وہ پگڈنڈی پر انار کی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرا دل کس قدر کڑھا۔ میرا حلق اس روز کی تلخی کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے قریب پہنچا اور پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چھلاں اس کی بھینس اس کا بچھڑا چند گزوں پر بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ غصے اور افسردگی نے میری زبان پر قفل لگا دیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، جیسے چشمے کے پانی میں کسی نے اپنے مٹی بھرے ہاتھ دھو دیئے ہیں۔ پھر وہ مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ مجھے کسی قدر مصنوعی اور پھیکی معلوم ہوئی۔ میں نے سر جھکا لیا اور سنگریزوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ شاید میرا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا ''آپ بیمار ہیں؟''

اس کا یہ کہنا تھا کہ میں برس پڑا۔ ''ہاں بیمار ہوں، یہ بیماری تمہاری دی ہوئی ہے۔ تمہیں نے یہ روگ لگایا ہے۔ بیگو! میں تمہارے چال چلن کی سب کہانی سن چکا ہوں اور تمہارے سارے حالات سے باخبر ہوں۔''

میری چبھتی ہوئی یہ باتیں سن کر اور بدلے ہوئے تیور دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی اور کہنے لگی۔ ''اچھا تو میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ کو میرے چال چلن کے متعلق سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔''

میں چلایا۔ ''گویا تم کو معلوم نہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تو اپنی سیہ کاریوں کا سارا نقشہ تمہاری آنکھوں تلے گھوم جائے گا۔'' میں طیش میں آ

گیا۔ ''کتنی بھولی بنتی ہو، جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں، بھلا تم کیا سمجھو جاؤ جاؤ بیگو تم نے مجھے سخت دکھ پہنچایا ہے۔'' یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

وہ بھی سخت مضطرب ہوگئی اور جل کر بول اٹھی۔ ''آخر میں بھی تو سنوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا کیا سنا ہے۔ پر آپ تو رو رہے ہیں۔''

''ہاں رو رہا ہوں، اس لیے کہ تمہارے افعال ہی اتنے سیاہ ہیں کہ ان پر ماتم کیا جائے۔ تم پاکبازوں کی قدر کیا جانوں۔ اپنا جسم بیچنے والی لڑکی محبت کیا جانے۔ تم...... تم صرف اتنا جانتی ہو کہ کوئی مرد آئے اور تمہیں اپنی چھاتی سے بھینچ کر چومنا چاٹنا شروع کر دے اور جب سیر ہو جائے تو اپنی راہ لے۔ کیا یہی تمہاری زندگی ہے۔''

میں غصے کی شدت میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ جب اس نے میری زبان سے اس قسم کے سخت کلمات سنے تو اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی نظر میں یہ سب گفتگو ایک معمہ ہے۔ اس وقت طیش کی حالت میں میں نے اس کی حیرت کو نمائشی خیال کیا اور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ، تم ناپاک ہو۔''

یہ سن کر اس نے ڈری ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔ ''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

''مجھے کیا ہو گیا ہے...... کیا ہو گیا ہے۔'' میں پھر برس پڑا۔ ''اپنی زندگی کی سیہ کاریوں پر نظر دوڑاؤ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تم میری بات اس لیے نہیں سمجھتی ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس لیے کہ میرے سینے

میں شہوانی خیالات موجود نہیں، اس لیے کہ میں صرف محبت کرتا ہوں۔ جاؤ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔"

جب میں بول چکا تو اس نے تھوک نگل کر اپنے گلے کو صاف کیا اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "شاید آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہوں مگر سچ جانئے مجھے کچھ معلوم نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام آپ سڑک پر سے گزر رہے تھے آپ نے میری طرف دیکھا تھا اور مسکرا دیئے تھے۔ یہاں بیسیوں لوگ ہم لڑکیوں کو دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چلے جاتے ہیں۔ پھر آپ متواتر باؤلی کی طرف آتے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ میرے لیے آتے ہیں مگر اسی قسم کے کئی واقعے میرے ساتھ گزر چکے ہیں۔ ایک روز آپ نے میرے ساتھ باتیں کیں اور اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ آپ نے شادی کے لیے کہا اور میں مان گئی۔ مگر اس سے پہلے اسی قسم کی کئی درخواستیں سن چکی ہوں جو مرد بھی مجھ سے ملتا ہے۔ دوسرے تیسرے روز میرے کان میں کہتا ہے۔ بیگو! دیکھ میں تیری محبت میں گرفتار ہوں، رات دن تو ہی میرے دل و دماغ میں بسی رہتی ہے۔ آپ نے مجھ سے یہی کہا۔ آپ بتائیے محبت کیا چیز ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ آپ نے دل میں چھپا رکھا ہے یہاں آپ جیسے کئی لوگ ہیں جو مجھ سے یہی کہتے رہتے ہیں۔ بیگو تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ صدقے ہو جاؤں۔ تمہارے ہونٹ کس قدر پیارے ہیں۔ جی چاہتا ہے ان کو چومے جاؤں...... وہ مجھے چومتے رہتے ہیں۔ کیا یہ محبت نہیں؟ کئی بار میرے دل میں خیال آیا ہے کہ محبت کچھ اور ہی چیز ہے مگر

میں پڑھی لکھی نہیں اس لیے مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا مگر چھوڑ دیا۔ اگر میں پڑھوں تو پھر چھلاں اور اس کے بچھڑے کا پیٹ کون بھرے۔ آپ اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ اس لیے آپ کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتی۔ چھوڑیئے اس قصے کو۔ آیئے کچھ اور باتیں کریں۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میری ماں کہہ رہی تھیں کہ بیگو تو ہیٹ والے بابو کے پیچھے دیوانی ہوگئی ہے۔"

میری نظروں کے سامنے سے وہ تاریک پردہ اٹھنے لگا تھا۔ جو اس انجام کا باعث تھا۔ مگر دفعتاً میرے جوش اور غصے نے پھر اسے گرا دیا۔ بیگو کی گفتگو بے حد سادہ اور معصومیت سے پر تھی۔ مگر مجھے اس کا ہر لفظ بناوٹ میں لپٹا نظر آیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی اس کی اہمیت پر غور نہ کیا۔

"بیگو میں بچہ نہیں ہوں کہ تم مجھے چکنی چپڑی باتوں سے بے وقوف بنا لوگی۔" میں نے غصہ میں اس سے کہا۔ "یہ فریب کسی اور کو دینا۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تم نے ابھی اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ اب میں کیا کہوں............"

"نہیں............نہیں............کہیے۔" اس نے کہا۔

"کئی لوگ تمہارے منہ کو چومتے رہے ہیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"ہائے آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔ اب میں کیا جھوٹ بولتی ہوں۔ میں خود تھوڑا ہی ان کے پاس جاتی ہوں اور منہ بڑھا کر چومنے کو کہتی ہوں۔ اگر آپ اس روز میرے بالوں کو چومنا چاہتے۔ جب کہ آپ ان کی تعریف کر رہے تھے تو کیا میں

انکار کر دیتی؟ میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں۔ مجھے چلاں بہت پیاری لگتی ہے اور میں اس کو ہر روز چومتی ہوں۔ اس میں کیا ہرج ہے میں چاہتی ہوں کہ لوگ میرے بالوں، میرے ہونٹوں اور میرے گالوں کی تعریف کریں اس سے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خبر نہیں کیوں؟ میں صبح سویرے اٹھتی ہوں اور چلاں کو لے کر گھاس چرانے کے لیے باہر چلی جاتی ہوں۔ بارہ بجے روٹی کھا کر پھر گھر سے نکل آتی ہوں۔ شام کو پانی بھرتی ہوں۔ ہر روز میرا یہی کام ہے۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ میں پانی بھرنے نہ آیا کروں، بھینس نہ چرایا کروں۔ شاید آپ اسی وجہ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ میں گھر پر رہوں تو پھر آپ مجھ سے ملاقات کیونکر کر سکیں گے؟ میں نے سنا ہے کہ پنجاب میں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلتیں مگر ہم پہاڑی لوگ ہیں، ہمارا یہی کام ہے۔"

"تمہارا یہی کام ہے کہ ہر راہ گزر سے لپٹنا شروع کر دو۔ تم پہاڑی لوگوں کے چلن مجھ سے چھپے ہوئے نہیں، یہ تقریر کسی اور کو سنانا۔ گھر پر رہو یا باہر پھرو۔ اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان پہاڑیوں میں رہ کر جو سبق تم نے سیکھا ہے وہ مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔"

"آپ بہت تیز ہوتے جا رہے ہیں، بہت چل نکلے ہیں۔" اس نے قدرے بگڑ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے لوگوں نے آپ کے بہت کان بھرے ہیں۔ مجھے بھی تو پتہ لگے کہ وہ کون مرن جوگے ہیں جو میرے متعلق آپ کو ایسی باتیں سنا رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اتنے گرم ہوتے جا رہے ہیں یہ سچ ہے کہ مردوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوں اور ان سے ملتی ہوں مگر........" یہ کہتے ہوئے اس کے گال

سرخ ہو گئے مگر میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ ''آپ کہتے ہیں کہ میں بری لڑکی ہوں۔ یہ غلط ہے۔ میں پگلی ہوں .... سچ مچ پگلی ہوں، کل آپ کے جانے کے بعد میں پتھر پر بیٹھ کر دیر تک روتی رہی۔ جانے کیوں۔ ایسا کئی دفعہ ہوا ہے کہ میں گھنٹوں رویا کرتی ہوں، آپ ہنسیں گے۔ مگر اس وقت بھی میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں سے اٹھ بھاگوں اور اس پہاڑی کی چوٹی پر بھاگتی ہوئی چڑھ جاؤں اور پھر کودتی پھاندتی نیچے اتر آؤں۔ میرے دل میں ہر وقت ایک بے چینی رہتی ہے۔ بھینس چراتی ہوں، پانی بھرتی ہوں لکڑیاں کاٹتی ہوں لیکن یہ سب کام میں اوپرے دل سے کرتی ہوں۔ میرا جی کسی کو ڈھونڈتا ہے معلوم نہیں کس کو .... میں دیوانی ہوں۔''

بیگو کی یہ عجیب غریب باتیں جو در حقیقت اس کی زندگی کا ایک نہایت الجھا ہوا باب تھیں اور جسے بغور مطالعہ کرنے کے بعد سب راز حل ہو سکتے تھے۔ اس وقت مجھے کسی مجرم کا غیر مربوط بیان معلوم ہوئیں۔ بیگو اور میرے درمیان اس قدر تاریک اور موٹا پردہ حائل تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی بہت مشکل تھی۔

''تم دیوانی ہو'' میں نے اس سے کہا۔ ''کیا مردوں کے ساتھ بیٹھ کر جھاڑیوں کے پیچھے پہروں باتیں کرتے رہنا بھی اس دیوانگی ہی کی ایک شاخ ہے؟ .... بیگم تم دیوانی ہو مگر اپنے کام میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار!''

''میں باتیں کرتی ہوں، ان سے ملتی ہوں۔ میں نے کب اس سے انکار کیا ہے۔ ابھی ابھی میں نے آپ سے اپنے دل کی سچی بات کہی تو آپ نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اب اگر میں کچھ اور کہوں تو اس سے کیا فائدہ ہو گا، آپ کبھی

مانیں گے ہی نہیں۔"

"نہیں نہیں، کہو، کیا کہتی ہو۔ تمہارا نیا فلسفہ بھی سن لوں۔"

"سنیئے پھر! یہ کہہ کر اس نے تھکی ہوئی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھا" اور آہ بھر کر بولی۔ "یہ باتیں جو میں آج آپ کو سنانے لگی ہوں، میری زبان سے پہلے کبھی نہیں نکلیں۔ میں یہ آپ کو بھی نہ سناتی مگر مجبوری ہے۔ آپ عجیب وغریب آدمی ہیں۔ میں بہت سے لوگوں سے ملتی رہی ہوں مگر آپ بالکل نرالے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ سے ...." وہ ہچکچائی۔ "ہاں آپ سے پیار ہو گیا ہے۔ آپ نے کبھی مجھ سے غیر بات نہیں کی حالانکہ میں جس سے ملتی رہی ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ اور ہی کہتا تھا۔ میری اماں جانتی ہے کہ میں گھر میں ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی ہوں۔ میرا منہ تھکتا ہی نہیں۔ آپ کے آنے پر میں نے گاہکوں کے پاس دودھ لے جانا چھوڑ دیا ہے۔ لوگوں سے باتیں کرنا بند کر دیں۔ پانی بھرنے کے لیے بھی زیادہ تر چھوٹی بہن کو بھیجتی رہی ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میں لوگوں سے ملتی رہی ہوں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں ان سے کیوں ملتی تھی .... مجھے کوئی مرد بھی بلاتا تو میں اس سے باتیں کرنے لگتی اس لیے نہیں، میں نہیں بتاؤں گی .... میرا دل جو چاہتا تھا۔ وہ ان لوگوں کے پاس نہیں تھا، میں بری نہیں، اللہ کی قسم، بے گناہ ہوں، خدا معلوم لوگ مجھے برا کیوں کہتے ہیں آپ بھی مجھے برا کہتے ہیں۔ جس طرح آپ نے آج میرے منہ پر اتنی گالیاں دی ہیں۔ اگر آپ کی بجائے کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی مگر آپ .... اب میں کیا کہوں، میں بہت بدل گئی ہوں۔ آپ اچھے آدمی ہیں۔

میں خیال کرتی تھی کہ آپ مجھے کچھ سکھائیں گے۔ مجھے اچھی باتیں سنائیں گے لیکن آپ مجھ سے خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں.......... آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ کی کتنی قدر کرتی ہوں میں نے آپ کے سامنے کبھی گالیاں نہیں دیں، حالانکہ ہمارے گھر سارا دن گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اس پیاری لڑکی کی گفتگو کس قدر سادہ تھی مگر افسوس ہے کہ اس وقت میرے کانوں میں روئی ٹھنسی ہوئی تھی۔ اس کے ہر لفظ سے مجھے عصمت فروشی کی بو آ رہی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔''

''بیگم تم ہزار قسمیں کھاؤ مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو میں کل بٹوت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تم نے میرے دل کو بہت دکھ دیا ہے.......... خیر اب جاتا ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔''

مجھے جاتا دیکھ کر وہ سخت مضطرب ہو گئی اور میرا بازو پکڑ کر اور پھر اسے فوراً ہی ڈرتے ہوئے چھوڑ کر تھرائی ہوئی آواز میں صرف اس قدر کہا۔ ''آپ جا رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں جا رہا ہوں تاکہ تمہارے چاہنے والوں کے لیے میدان صاف ہو جائے۔''

''آپ نہ جائیے۔ اللہ کی قسم میرا کوئی چاہنے والا نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ''نہ جائیے، نہ جائیے نہ..........'' آخری الفاظ اس کی

گلوگیر آواز میں دب گئے اس کا رونا میرے دل پر کچھ اثر نہ کر سکا۔ میں چل پڑا۔ مگر اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ خفا کیوں ہو گئے ہیں۔ میں آئندہ کسی آدمی سے بات نہ کروں گی۔ اگر آپ نے مجھے کسی مرد کے ساتھ دیکھا تو آپ اس چھڑی سے جتنا چاہیے۔ پیٹ لیجیے۔ آیئے گھر چلیں، میں آپ کے لیے حقہ تازہ کر کے لاؤں گی۔''

میں خاموش رہا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھر چل پڑا۔ اس وقت بیگو سے ایک منٹ کی گفتگو کرنا بھی مجھے گراں گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لڑکی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے۔ میں نے بمشکل دو گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ آنکھوں کے ڈورے سرخ اور ابھرے ہوئے تھے۔ سینہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ واقعی جا رہے ہیں؟''

میں نے تیزی سے جواب دیا۔ ''تو اور کیا جھوٹ بک رہا ہوں۔''

''جائیے!''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور گال آنسوؤں کی وجہ سے میلے ہو رہے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک ناچ رہی تھی۔

''جائیے!'' یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں مڑی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا۔

میں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے رونے کی آواز سنی۔ وہ رو رہی تھی .... وہ تھرائی ہوئی آواز ابھی تک

میرے کانوں میں آ رہی ہے۔

"یہ ہے میری داستان ڈاکٹر صاحب، میں نے اس پہاڑی لڑکی کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اس غلطی کا احساس مجھے پورے دو سال بعد ہوا۔ جب میرے ایک دوست نے مجھے یہ بتایا کہ بیگو نے میرے جانے کے بعد اپنے شباب کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور دق کے مریضوں سے ملنے کی وجہ سے وہ خود اس کا شکار ہو گئی۔ پھر بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس مرض نے بالآخر اسے قبر کی گود میں سلا دیا ...... اس کی موت کا باعث میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر اپنا راستہ تلاش کرتی تھی مگر میں اس کو بھول بھلیوں میں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھٹک گئی۔ میں مجرم تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے وہی موت تجویز کی جس سے وہ دوچار ہوئی۔ وہ وزن جو میں پانچ سال اپنی چھاتی پر اٹھائے پھرتا رہا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ اب ہلکا ہو گیا ہے۔"

میں مریض کی داستان خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بول چکا تو پھر بھی خاموش رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبات پر رائے زنی کروں۔ چنانچہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا مجھے کئی مریضوں کی داستانیں سننے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ نہایت عجیب و غریب اور پر اثر داستان تھی۔ گو مریض بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس نے اپنے طویل بیان کو کس طرح جاری رکھا۔

صبح کے وقت میں اس کا ٹمپریچر دیکھنے کے لیے آیا مگر وہ مر چکا تھا۔ سفید چادر اوڑھے وہ بڑے سکون سے سو رہا تھا۔

جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا۔

''ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔ میں نے اس کی بند مٹھی کو آدھا کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار۔''

''ان کو نکالنا نہیں یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔'' میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔

پریشانی کا سبب

نعیم میرے کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور اخبار کی آخری کاپی کے لیے جو مضمون لکھ رہا تھا اس کو جاری رکھنے ہی والا تھا کہ معاً مجھے نعیم کے چہرے پر ایک غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے چشمہ اتار کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کیا بات ہے نعیم! معلوم ہوتا ہے تمہاری طبیعت ناساز ہے۔''

نعیم نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور جواب دیا۔ ''کیا بتاؤں، عجب مشکل میں جان پھنس گئی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک ایسی بات ہوئی ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔''

میں نے کاغذ کی جتنی پرچیاں لکھی تھیں جمع کر کے ایک طرف رکھ دیں اور زیادہ دلچسپی لے کر اس سے پوچھا ''کوئی حادثہ پیش آ گیا............ فلم کمپنی میں کسی ایکٹرس سے..........''

نعیم نے فوراً ہی کہا۔ ''نہیں بھائی! ایکٹرس ویکٹرس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک اور ہی مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ تمہیں فرصت ہو تو میں ساری داستان سناؤں۔''

نعیم میرا دوست ہے۔ جب سے وہ بمبئی آیا ہے اس سے میری دوستی چلی آ رہی ہے۔ وہ یوں کہ بمبئی آتے ہی اس نے میرے اخبار میں کام کیا اور خود کو بہت سی اہلیتوں کا مالک ثابت کیا۔ پھر آہستہ آہستہ جب مجھے اس کے اعلیٰ خاندان کا پتا

چلا اور اسی قسم کی دوسری واقفیتیں نکلتی آئیں تو میرے دل میں اس کی عزت اور بھی زیادہ ہو گئی، چنانچہ چھ مہینے کے مختصر عرصے ہی میں وہ میرا بے تکلف دوست بن گیا۔

نعیم نے میرے اخبار کو دلچسپ بنانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوششیں کیں۔ ہر ہفتے جب اس نے ایک نئی کہانی لکھنا شروع کی اور میں نے اس کی تین چار کہانیاں پڑھیں تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اخبار میں اگر نعیم پڑا رہا تو اس کی تمام ذکاوتیں تباہ ہو جائیں گی، چنانچہ میں نے موقع ملتے ہی ایک فلم کمپنی میں اس کی سفارش کی اور وہ مکالمہ نگار کی حیثیت سے فوراً ہی وہاں ملازم ہو گیا۔

فلم کمپنی کی ملازمت کے دوران میں نعیم نے وہاں کے سیٹھوں اور ڈائریکٹروں پر کیسا اثر ڈالا، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ میں بے حد مصروف آدمی ہوں لیکن نعیم سے ایک دو بار مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہاں اس کا کام پسند کیا گیا ہے۔ اب ایکا ایکی نہ جانے کیا حادثہ پیش آیا تھا جو اس کا رنگ یوں ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔

نعیم بے حد شریف آدمی ہے۔ اس سے کسی نامعقول حرکت کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی، میں سخت متحیر ہوا کہ ایسی کون سی افتاد پڑی جو نعیم کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اس سے اجازت لے کر جلدی جلدی آخری کاپی کے لیے مضمون کا بقایا حصہ مکمل کیا اور تمام پرچیاں کاتب کر دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"بھئی معاف کرنا میں فوراً ہی تمہاری داستان نہ سن سکا...... لیکن میں پوچھتا ہوں یہ داستان آخر بنی کیسے؟...... تم...... تم...... خیر چھوڑو اس قصے کو، تم مجھے سارا

واقعہ سناؤ۔‘‘

نعیم نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔ ’’اب میں تمہیں کیا بتاؤں، جو کچھ ہوا، میری اپنی بیوقوفی کی بدولت ہوا۔ ہماری فلم کمپنی میں ایک ایکٹر ہے۔ عاشق حسین، اول درجے کا چغد ہے۔ چونکہ دوسروں کی طرح اسے ستاتا نہیں ہوں اس لیے وہ مجھ پر بری طرح فریفتہ ہے، یہ فریفتہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ مجھ سے اسی طرح باتیں کرتا ہے جس طرح خوبصورت عورتوں سے کی جاتی ہیں۔‘‘

میں ہنس پڑا۔ ’’پر تم اتنے خوبصورت تو نہیں ہو۔‘‘

نعیم کے پیلے چہرے پر بھی ہنسی کی لال لال دھاریاں پھیل گئیں۔ ’’کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے۔ دراصل وہ اپنے اخلاص اور اپنی بے لوث محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور چونکہ اسے ایسا کرنے کا طریقہ نہیں آتا اس لیے اس کا پیار وہی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس کو غالباً اپنی بیوی سے ہوگا...... ہاں تو یہ عاشق حسین صاحب جو اول درجے کے رقاص ہیں اور رقص کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے پرسوں شوٹنگ کے بعد مجھے ملے۔ سیٹ پر میں نے ان کے مکالمے درست کرنے میں کافی محنت کی تھی۔ اس کا حق ادا کرنے کے لیے انہوں نے فوراً ہی کچھ سوچا اور کہا۔ نعیم صاحب! میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’فرمائیے۔‘‘ انہوں نے پھر کچھ سوچا اور کہا۔ ’’دن بھر کام کرنے کے بعد میں بہت تھک گیا ہوں۔ آپ بھی ضرور تھک گئے ہوں گے۔ چلیے کہیں گھوم آئیں۔‘‘ اب میں یہاں اپنی ایک کمزوری بتا دوں۔ موسم اگر خوشگوار ہو تو میں عموماً بہک جاتا

ہوں۔ شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ جوان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو پھیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہوگئی جب میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ "چلیے...... مگر کہاں جائیے گا۔" اب عاشق حسین نے پھر سوچا اور کہا۔ "کہیں بھی چلے چلیں گے...... یہاں سے باہر تو نکلیں۔" ہم دونوں گیٹ سے باہر نکلے اور موٹر بس کا انتظار کرنے لگے۔

یہاں تک کہہ کر نعیم رک گیا۔ اس کے چہرے کی زردی اب دور ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔ "تم دونوں گیٹ سے باہر نکل کر بس کا انتظار کرنے لگے۔"

نعیم نے سر ہلایا۔ "اور شامتِ اعمال ادھر سے عاشق حسین کے ایک مارواڑی دوست کا گزر ہوا۔ وہ موٹر میں جا رہا تھا کہ اچانک عاشق حسین کی نظر اس پر پڑی۔ فوراً ہی اس نے مارواڑی زبان میں اپنے دوست کو ٹھہرنے کے لیے کہا۔ موٹر رکی، عاشق حسین نے اس سے مارواڑی زبان میں چند باتیں کیں پھر دوڑ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ چلیے...... کام بن گیا۔ موٹر مل گئی۔ اسی میں چلتے ہیں۔" میں چل پڑا موٹر میں داخل ہونے سے پہلے عاشق نے اپنے مارواڑی دوست سے جو شکل و صورت کے اعتبار سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا تعارف کرایا اور حسبِ معمول مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یہ مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ یہاں ایک

کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں۔ میرے بہت مہربان دوست ہیں۔'' اور میرے متعلق اپنے دوست سے کہا۔ ''ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائٹر ہیں۔''
ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائٹر اور مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ نے ہاتھ ملائے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ رسمی طور پر خوش ہوئے اور موٹر چلی۔ یہ سن کر میں مسکرایا۔ ''نعیم! اس مارواڑی سیٹھ کے متعلق تمہاری رائے بہت خراب معلوم ہوتی ہے، کیا آگے چل کر یہ ولن کا پارٹ ادا تو نہیں کرے گا۔''

''تم پہلے پوری داستان سن لو، پھر سوچنا کہ ولن کون ہے اور ہیرو کون لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کہانی کی ہیروئن زہرہ ہے .... زہرہ جس کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کل دادر کی ایک فوجداری عدالت میں دیکھا ہے .... ایک مجرم کی حیثیت میں۔''

یہ کہتے ہوئے نعیم کے کان کی لویں شرم کے باعث سرخ ہو گئیں۔ داستان سننے کے دوران میں پہلی مرتبہ زہرہ کے اچانک ذکر سے مجھے سخت تعجب ہوا میں نے کہا۔ ''نعیم! یہ تو بالکل الگونڈ پو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ زہرہ بالکل پو کے افسانوں کے غیر متوقع انجام کی طرح اس داستان میں آئی ہے۔ یہ عورت کون ہے؟''

''میں قطعاً نہیں جانتا۔ یعنی اگر مجھے اس عورت کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھ پر لعنت۔ خدا معلوم کون ہے، پر اب میں اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ہم لوگوں پر فوجداری مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ جرم ڈاکہ اور چوری ہے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''ڈاکہ اور چوری۔''

نعیم کے لہجہ نے ایسی متانت اختیار کرلی جس میں روحانی اذیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگا۔ ''ہاں...... ڈاکہ اور چوری مجھے دفعات اچھی طرح یاد نہیں مگر ان کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے مداخلت بے جا کی، زہرہ کے گھر پر ڈاکہ ڈالا اور اس کی چند قیمتی اشیاء چرا کر لے گئے، لیکن یہ تو داستان کا انجام ہے۔ پہلے کے واقعات تمہیں سنا لوں پھر اس طرف آتا ہوں...... میں کیا کہہ رہا تھا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یہ کہ تم اس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گئے۔''

''ہاں میں عاشق حسین کے کہنے پر اس منحوس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر وہ خود چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر ایک اور آدمی بیٹھا تھا جو اس سے کم منحوس نہیں تھا۔ عاشق حسین نے شاید اس کے متعلق کہا تھا کہ وہ موٹریں بنانے کا کام کرتا ہے۔ خیر موٹر مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی دادر کی طرف جا نکلی ظاہر تھا کہ ہم جوہو جائیں گے، چنانچہ میں بہت خوش تھا جوہو کی گیلی گیلی ریت سے مجھے بے حد پیار ہے۔ کبھی کبھی ادھر جا کر میں گیلی ریت پر ضرور لیٹا کرتا ہوں اور دیر تک کھلے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہوں جو اتنا ہی پر اسرار اور ناقابل رسا دکھائی دیتا ہے جتنا ایک اجنبی عورت کا تصور...... سامنے رات کی سرمئی روشنی میں سمندر کروٹیں لیتا ہے، اوپر گدلے آسمان پر تارے یوں چمکتے ہیں جیسے انہونی باتیں کسی جوان آدمی کے دل میں ٹمٹما رہی ہوں۔ ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ دو اس پار جہاں آسمان اور سمندر کوئی واضح خط بنائے بغیر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ ایک ایسی دھندلی روشنی نظر آیا کرتی ہے جو خوبصورت شعروں کی طرح

مصنوعی ہوتی ہے...... میں جوہو کی سیر کے خیال میں مگن تھا کہ عاشق حسین نے موٹر کو دادر ہی میں ایک جگہ ٹھہرالیا اور مجھ سے کہا چلیے............ کچھ پی لیں۔'' جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، بیئر مجھے پیاری ہے۔ عاشق حسین کو خدا معلوم کہاں سے اس بات کا پتا چلا تھا کہ میں پیا کرتا ہوں۔ خیر.......... ہم چاروں داخل ہوئے۔ ایک بوتل بیئر کی میں نے پی اور ایک عاشق حسین نے۔ مارواڑی سیٹھ اور موٹریں بنانے والے نے کچھ نہ پیا۔ ہم جلدی ہی فارغ ہو گئے۔ پھر موٹر میں بیٹھے اور جوہو کا رخ کیا مگر فوراً ہی عاشق حسین کو ایک کام یاد آ گیا۔ ''اوہ مجھے تو اپنی شاگرد زہرہ کے ہاں جانا ہے۔ آج اس سے ملنے کا میں نے وعدہ کیا تھا...... نعیم صاحب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو پانچ منٹ لگیں گے۔ اس کا مکان بالکل قریب ہے۔'' مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے موٹر ایک گلی میں ٹھہرالی اور اکیلا سامنے والے مکان کی طرف بڑھا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ گلی کس طرف ہے۔''

نعیم نے جواب دیا۔ ''دادر ہی میں ہے...... ادھر جہاں پارسیوں کے بے شمار مکان ہیں، غالباً اس کو پارسی کالونی کہتے ہیں۔''

...... ہاں تو عاشق حسین موٹر سے نکل کر سامنے مکان کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ بغیچہ طے کر کے عاشق نے دروازہ پر دستک دی۔ جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو عاشق نے دوسری بار زور سے دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی ''کون ہے۔'' عاشق حسین نے بلند آواز مین جواب دیا۔ ''عاشق!'' اندر سے خشم آلود آواز آئی۔ ''عاشق کی......... '' عاشق حسین نے یہ

گالی سن کر ہماری طرف دیکھا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا اور یہ کہنا شروع کیا۔

"دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو۔"

یہ سن کر میں نے کہا۔" اس عورت نے شاید عاشق کا غلط مطلب سمجھا ورنہ جیسا کہ تم ابھی کہہ چکے ہو وہ عاشق کی شاگرد تھی۔"

"جانے بلا...... کیا تھی اور کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عاشق حسین نے جھوٹ ہی بولا ہو اور بیئر کی ایک بوتل پینے کے بعد زہرہ کا خیال اس کے دماغ میں آ گیا ہو۔ کسی نے اس سے کبھی کہا ہوگا کہ فلاں نمبر کے فلیٹ میں ایک عورت زہرہ رہتی ہے ...... لیکن اس سے کیا بحث ہے ...... عاشق حسین نے اودھم مچانا شروع کردی۔ اندر سے گالیاں آتی رہیں اور پیشتر اس کے کہ میں اسے منع کرسکتا۔ تین چار دھکے مار کر اس نے دروازہ توڑا اور زبردستی اندر داخل ہوگیا۔ جب یہ شور ہوا تو آس پاس کے رہنے والے پارسی اکٹھے ہوگئے۔ میں بے حد پریشان ہوا، چنانچہ اسی پریشانی میں موٹر سے باہر نکلا اور عاشق کو باہر لانے کی خاطر اس مکان میں داخل ہوگیا۔ میرے پیچھے پیچھے عاشق کے دونوں ساتھی بھی چلے آئے۔ میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمرے دیکھے مگر نہ عاشق نظر آیا نہ اس کی شاگرد زہرہ۔ خدا معلوم کہاں غائب ہوگئے تھے۔ گھر کے پرلی طرف دوسرا راستہ تھا، ممکن ہے وہ ادھر سے باہر نکل گئے ہوں۔ میں چند منٹ ان تین کمروں میں رہا، جب کوئی سراغ نہ ملا تو باہر نکل کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ وہ پارسی جو گلی میں جمع ہوگئے تھے گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اور زیادہ پریشان ہوگیا۔ بیئر کا سارا نشہ جو دماغ میں تھا اتر کر میری ٹانگوں میں چلا آیا۔ میرے جی میں آئی کہ عاشق، اس کے ساتھیوں اور ان کی موٹر کو وہیں چھوڑ

کر بھاگ جاؤں مگر...... عجیب مشکل میں میری جان پھنس گئی تھی۔ اگر بھاگنے کی کوششیں کرتا تو یقیناً وہ پارسی جو مجھے چڑیا گھر کا بندر سمجھ کر گھور رہے تھے پکڑ لیتے...... دس بارہ منٹ اسی شش و پنج میں گزر رہے۔ اس کے بعد عاشق اور اس کے دونوں دوست مکان میں سے باہر نکلے اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ میں نے عاشق سے کوئی بات نہ پوچھی۔ موٹر چلی اور جب دادر کا حلقہ آیا تو میں نے اس سے کہا مجھے یہیں اتار دو، میں بس میں گھر چلا جاؤں گا۔'' عاشق کے دماغ سے جوہو کی سیر کا خیال نکل گیا تھا، اس نے اپنے مارواڑی دوست سے موٹر روکنے کے لیے کہا، چنانچہ میں ان سے رخصت لے کر گھر چلا آیا اور اس واقعے کو بھول گیا۔

نعیم نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟'' ''مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ نعیم نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا۔ ''اس بیوقوف کے بچے عاشق حسین سے جب پولیس والوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا تو اس نے اپنے مارواڑی دوست، اس موٹر بنانے والے کا اور میرا نام لے دیا۔ ہم تینوں ایک گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کر لیے گئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔''

نعیم نے جواب دیا۔ کل دو ڈھائی بجے کے قریب ہماری گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ میں نے تمہیں ٹیلی فون پر ضرور مطلع کیا ہوتا اگر میرے حواس بجا ہوتے۔ بخدا میں سخت پریشان تھا۔ پولیس انسپکٹر ٹیکسی میں ہم سب کو تھانے لے گیا۔ وہاں بیانات قلمبند ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ عاشق حسین کے وہ مارواڑی دوست جو کسی کاروبار کے سلسلے میں یہاں آئے تھے زہرہ کا پنکھا اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے

تھے۔ بجلی کا یہ پنکھا پولیس نے ان سے حاصل کر لیا تھا۔

یہ سن کر میں نے تشویشناک لہجہ میں کہا۔ ''اس سے تو چوری صاف ثابت ہوتی ہے۔''

''چوری ثابت ہوتی ہے جبھی تو میں اس قدر پریشان ہوں اور سچ پوچھو تو اگر یہ ثابت نہ بھی ہوتی تو میری پریشانی اسی قدر رہتی۔ تھانے اور عدالت میں جانا بے حد شرمناک ہے، پر اب کیا کیا جائے۔ جو ہونا ہے ہو چکا ہے۔ اس خفت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا جو مجھے اٹھانا پڑے گی اور اٹھانا پڑ رہی ہے...... میں بالکل بے گناہ ہوں لیکن ظاہر ہے کہ زہرہ کو میں بالکل نہیں جانتا، اس کے مکان پر میں اگر گیا تو محض عاشق حسین کی وجہ سے اس چغد کے کہنے پر جو ایک بوتل بیئر بھی ہضم نہیں کر سکتا۔''

نعیم کے چہرے پر نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ''بھئی...... بہت برے پھنسے۔''

نعیم نے اسی انداز میں کہا۔ ''ہنسی میں پھنسی اسی کو کہتے ہیں...... کل...... اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے عدالت کا منہ دیکھا اور وہ زہرہ بھی پہلی مرتبہ مجھے نظر آئی۔''

میں نے فوراً ہی پوچھا۔ ''کیسی ہے؟''

نعیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''بری نہیں...... یعنی شکل صورت کے اعتبار سے اچھی خاصی ہے...... بیضوی چہرہ ہے جس پر کیلوں اور مہاسوں کے داغ نظر آتے ہیں۔ لمبے لمبے کالے بال ہیں۔ پیشانی تنگ ہے۔ جوان ہے۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی میں اس نے یہ دھندا شروع کیا ہے۔''

میں نے بغیر کسی مطلب کے یوں ہی پوچھا۔''کیسا دھندا؟''

نعیم نے شرما سا گیا۔''ارے بھئی......وہی جو عورتیں کرتی ہیں۔زہرہ کے چہرے پر اس کی چھاپ دور سے نظر آ سکتی ہے......مجھے اس عورت پر اتنا غصہ کبھی نہ آتا مگر جب مجسٹریٹ نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔تم اس کو پہچانتی ہو۔''تو زہرہ نے میری طرف اپنی بڑی بڑی ڈھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔''ہاں صاحب! پہچانتی ہوں۔اسی نے میرا چاندی کا ٹی سیٹ اٹھایا تھا۔جب اس نے یہ جھوٹ بولا تو خدا کی قسم جی میں آئی ملعونہ کے حلق میں کٹہرے کا ایک ڈنڈا نکال کر ٹھونس دوں۔اتنا بڑا جھوٹ!''

اس پر میں نے کہا۔''بھئی جھوٹ تو بولے گی۔اس کے بغیر کام کیسے چلے گا۔اسے اپنا کیس مضبوط بھی تو بنانا ہے......اب تو تمہیں قہر درویش بر جان درویش سب کچھ سننا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔''نعیم نے بڑی پریشانی کے ساتھ کہا۔''جو کچھ ہوگا اسے ہر حالت میں سہنا ہی پڑے گا مگر......مگر......میں کیا بتاؤں میں کس قدر پریشان ہو گیا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا......اگر کسی مرد نے مجھ پر ایسا مقدمہ دائر کیا ہوتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی مگر ذرا غور تو کرو، وہ عورت ہے......اور میں عورتوں کی تعظیم کرتا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔''کیوں؟''

نعیم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔''اس لیے کہ میں عورتوں کو جانتا ہی

نہیں۔ کسی عورت سے ملنے اور اس سے کھل کر بات چیت کرنے کا مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ عورت آئی ہے تو مدعی بن کر۔"

میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نعیم نے اس پر بگڑ کر کہا۔ "تم ہنستے ہو مگر یہاں میری جان پر بنی ہے...... دو دن سے میں کمپنی نہیں جا رہا...... وہاں یہ بات ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ سیٹھ صاحب کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ انہوں نے اگر کچھ پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "جو اصل بات ہے ان کو بتا دینا۔"

"وہ تو میں بتا ہی دوں گا مگر خدا کے لیے سوچو تو سہی کہ میری پوزیشن کیا ہے...... میں سیٹھ صاحب کی بے حد عزت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ میرے آقا ہیں اگر انہوں نے مجھے بدکردار سمجھ کر برطرف کر دیا تو عمر بھر کے لیے میں داغدار ہو جاؤں گا۔ ملازمت کھونے کا مجھے اتنا افسوس نہیں ہوگا مگر یہاں سوال عزت و ناموس کا ہے...... وہ ضرور بدگمان ہو جائیں گے۔ میں ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں میری سچی باتوں کو بھی وہ جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ فلم کمپنی میں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ وہ خود بھی ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں...... اب میں کیا کروں...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

میں نے ہر ممکن طریقے سے نعیم کی اخلاقی جرأت بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ بے حد ڈرپوک ہے۔ خاص کر عورتوں کے معاملے میں تو اس کی بزدلی بہت ہی زیادہ ہے۔ دراصل معاملہ بھی سنگین تھا اگر برقی پنکھا برآمد نہ ہوتا تو کیس بالکل معمولی رہ جاتا۔ مگر پولیس اس مارواڑی سے پنکھا حاصل کر چکی تھی

اس لیے ظاہر ہے کہ زہرہ ایک حد تک بچی تھی۔

نعیم زیادہ دیر تک میرے پاس نہ ٹھہرا اور چلا گیا۔ دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ اس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگا۔ ''بھائی! ایک مصیبت میں تو جان پھنسی تھی، اب ایک اور آفت گلے پڑ گئی ہے۔''

میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ ''کیا ہوا...... کیا کوئی اور کیس کھڑا ہو گیا۔''

''نہیں...... کیس وہی ہے، مگر ایک ایسی بات ہوئی ہے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔'' نعیم نے کرسی پر بیٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹانگ ہلانا شروع کی۔ ''آج صبح سیٹھ صاحب نے مجھے بلانے کے لیے موٹر بھیجی۔ مجھے جانا ہی پڑا حالانکہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہیں جاؤں گا۔ بخدا فلم کمپنی میں داخل ہوتے وقت میری حالت وہی تھی جو حساس ملزموں کی ہوتی ہے۔ شرم کے مارے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ سر بھاری ہو گیا تھا۔ نیچی نظریں کیے جب میں سیٹھ صاحب کے کمرے مین داخل ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے تپاک کے ساتھ انہوں نے پہلی مرتبہ میرے ساتھ ہینڈ شیک کیا اور ہنس کر کہنے لگے۔ منشی صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ بیٹھیے تشریف رکھیے۔'' میں ندامت میں غرق کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ایسی باتیں شروع کیں کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ''آپ گھبراتے کیوں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بتائیے کہ یہ زہرہ ہے کیسی؟ کچھ اچھی ہے؟ بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ میں سنتا ہوں کہ آپ نے پی کر وہ دھمال مچائی کہ پارسی کالونی کے سب آدمی اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ زہرہ کی ساڑھی اتار کر لے گئے......

پہلے بھی تو آپ اس کے ہاں آتے جاتے ہوں گے پھر حرامزادی نے پولیس میں رپورٹ کیوں لکھوائی، پر کیا پتا ہے آپ نے بہت زیادہ شرارتیں کی ہوں۔'' ایسی ہی بے شمار باتیں انہوں نے مجھ سے کیں۔ میں خاموش رہا۔ اس کے بعد انہوں نے چائے منگوائی۔ ایک پیالہ میرے لیے بنایا اور پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔

''چاندی کا ٹی سیٹ جو آپ اٹھا کر لے گئے تھے، مجھے اگر آپ پریزنٹ کر دیں تو میں ابھی آپ کو اپنے وکیل کے پاس لے چلتا ہوں...... ایسی اچھی وکالت کرے گا کہ زہرہ کی طبیعت صاف ہو جائے گی...... میں سنتا ہوں زہرہ شکل صورت کی اچھی ہے، تو بھئی اس مقدمہ کے بعد اسے یہاں لے آؤنا۔ اپنے فلم میں اسے کوئی چھوٹا سا رول دے دیں گے...... اور ہاں، یہ آپ نے اچھا کیا کہ اسی کی شراب پی اور اسی کی چیزیں اڑا کر لے گئے...... پر آپ ایک درجن آدمی اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟ بے چاری اتنے آدمی دیکھ کر گھبرا گئی ہو گی۔'' بات بات پر وہ ہنستے تھے جیسے گفتگو کے لیے انہیں ایک نہایت ہی دلچسپ موضوع مل گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تو کیا ہوا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ تم پر ناراض نہ ہوئے۔''

نعیم نے بگڑ کر کہنے لگا۔ ''یہ بھی تم نے خوب کہا۔ کہ مجھے خوش ہونا چاہیے۔ وہ مجھے مجرم سمجھ رہے تھے جو کہ میں نہیں ہوں...... میں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے خزانچی کو بلایا اور مجھے سو روپے ایڈوانس دلوائے حالانکہ دو مہینے سے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں مل رہی۔''

میں نے کہا۔ ''تو کیا برا ہوا؟''

''ارے بھئی! تم ساری بات تو سن لو۔'' نعیم کھج گیا۔ سو روپے دلوا کر انہوں نے کہا۔ ''یہ آپ اپنے پاس رکھیے۔ آپ کو مقدمہ کے لیے ضرورت ہوگی۔ وکیل کا بندوبست میں ابھی کیے دیتا ہوں۔'' ٹیلی فون پر انہوں نے فوراً ہی وکیل سے بات کی، پھر مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر اس کے پاس لے گئے۔ ساری باتیں اس کو سمجھائیں اور کہا۔ ''دیکھیے، اس مقدمے میں جان لڑا دیجیے گا...... بات بالکل معمولی ہے، اس لیے کہ منشی صاحب سے زہرہ کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔''

میں کیا کہتا۔ وہاں بھی خاموش رہا۔

میں نے ہنس کر نعیم سے کہا۔ ''اب بھی خاموش رہو۔ تمہارا کیا بگڑ گیا ہے؟''

نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور اضطراب کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ ''ابھی کچھ بگڑا ہی نہیں۔ عدالت میں مجھے بیان دینا پڑے گا کہ زہرہ میری داشتہ ہے اور میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں...... اور...... اور...... سیٹھ صاحب نے آج شام مجھے مدعو کیا ہے۔ کہتے تھے کہ گرین چلیں گے۔ وہاں کچھ شغل رہے گا...... میری جان عجب مصیبت میں پھنس گئی ہے...... سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے۔''

پہچان

ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے۔ اور ایک ایسی عورت تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔ کوئی ایسی عورت ڈھونڈی جائے جو ہوٹل کی کثافت کے مقابلے میں نفاست پسند اور بد ذائقہ وسکی کے مقابلے میں لذیذ ہو۔

فخر نے ہوٹل کی غلیظ فضا سے باہر نکلتے ہی مجھ سے اور مسعود سے کہا۔ ''کوئی دانے دار عورت ہو...... اچھے گویے کے گلے کی طرح اس میں بڑے بڑے دانے ہوں...... خدا کی قسم طبیعت صاف ہو جائے۔''

وسکی دانوں سے بالکل خالی تھی۔ سوڈا بھی بالکل بے جان تھا۔ غالباً اسی وجہ سے فخر ''دانے دار عورت'' کا قائل ہو رہا تھا۔ ہم تینوں عورت چاہتے تھے۔ فخر دانے دار عورت چاہتا تھا۔ مجھے ایسی عورت مطلوب تھی جس میں بنیا پن نہ ہو اپنی فیس کے روپے لے کر ٹرنک میں یا جہاں اس کا جی چاہے رکھے اور کچھ عرصہ کے لیے بھول جائے کہ سودا کر رہی ہے۔

اس بازار کا راستہ جو ہم جانتے تھے جہاں عورتیں مل سکتی ہیں کالی، نیلی، پیلی، لال اور جامنی رنگ کی عورتیں۔ پیڑوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں دور تک دوڑتے چلے گئے ہیں۔ یہ رنگ برنگی عورتیں ان میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ عورتیں مطلوب نہیں تھیں۔ دراصل ہم اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتے

تھے ہم ایسی عورت یا عورتیں چاہتے تھے جو حرف عام میں ''پرائیویٹ ہوں'' یعنی جو منڈی کے ہجوم میں سے نکل کر علیحدہ شریف محلوں میں اپنا کاروبار چلا رہی ہوں۔

ہم تینوں میں فخر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ قوت ارادی بھی اس میں ہم سب سے زیادہ تھی۔ ایک تانگے والا جب ہمارے پاس سے گزرا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور بغیر کسی جھجک کے معنی خیز لہجے میں اس سے کہا۔

''ہم سیر کرنا چاہتے ہیں۔ چلو گے؟''

تانگے والا سنجیدہ اور متین آدمی معلوم ہوتا تھا ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ میں جھینپ سا گیا خاموشی ہی خاموشی میں وہ ہم سے کہہ گیا تھا، تم نوجوانوں کو شراب پی کر یہ کیا ہو جاتا ہے؟

فخر نے دوبارہ اس سے کہا۔ ''ہم سیر کرنا چاہتے ہیں...... چلو گے؟'' پھر فوراً ہی اسے کچھ خیال آیا اور اپنا مطلب اور زیادہ واضح کر دیا۔ ''کوئی مال وال ہے تمہاری نگاہ میں؟''

مسعود اور میں دونوں ایک طرف کھسک گئے۔ مسعود نے گھبرا کر مجھ سے کہا۔

''یہ فخر کیا آدمی ہے اسے کچھ سمجھاؤ۔''

مسعود سے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فخر نے آواز دی۔ ''وسکی پینے کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ اگلی نشست پر تھا اور تینوں میں سب سے زیادہ کمزور تھا۔ اس لیے میرے کان سن ہو رہے تھے۔ جب تانگہ ڈفرن برج کے نیچے اترا تو میں نے مفلر نکال کر کانوں اور سر پر لپیٹ لیا اور اوورکوٹ کا کالر بھی اونچا کر لیا۔''

سانس گھوڑے کے نتھنوں سے بھاپ بن کر باہر نکل رہا تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ تانگے والا موٹے اور کھردرے کمبل میں لپٹا خاموشی سے اپنا تانگہ چلا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سنجیدگی اس کے چہرے پر ٹھٹھری سی رہی تھی۔ جو مجھے بہت بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں نے فخر سے کہا۔ ''فخر یہ آدمی کیسا ہے...... کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاسٹر آئل پی کر بیٹھا ہے۔''

تانگے والا میرے اس ریمارک پر بھی خاموش رہا۔ فخر نے کہا۔ ''زیادہ باتیں کرنے والے آدمی ٹھیک نہیں ہوتے۔ ہمارا مطلب سمجھ گیا ہے۔ لے چلے گا۔ جہاں بھی چیز اچھی ہوئی۔''

مسعود جو سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ایک دم بولا۔ ایک دم بولا۔ ''واللہ عورت کتنی اچھی چیز ہے۔ عورت، عورت کم ہے چیز زیادہ ہے۔'' میں نے اس کو ذرا اور خوبصورت بنا کر کہا۔ ''مسعود! چیز نہیں...... چیزی۔''

شاعر آدمی تھا۔ پھڑک اٹھا۔ ''واللہ کیا بات پیدا کی ہے، چیز نہیں، چیزی...... سو میاں تانگے والے چیز اور چیزی میں فرق ہے۔ اس کا دھیان رکھنا۔'' تانگے والا خاموش رہا۔

اب میں نے اس کی طرف اور زیادہ غور سے دیکھا۔ مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ پتلی پتلی مونچھیں تھیں۔ جن کے بال نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ سردی کے باعث چونکہ اس نے کمبل کا ڈھاٹا سا بنا رکھا تھا۔ اس لیے اس کا پورا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھ کر فخر سے پوچھا۔ ''کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟''

فخر نے جو زیادہ سوچ بچار کا عادی نہیں تھا۔ جواب دیا ''اتنے بیتاب کیوں ہوتے ہو؟ ابھی تھوڑی دیر کے بعد چیز تمہارے سامنے آجائے گی۔''

مسعود نے اس پر فخر سے کہا۔ ''تم سے کیا بات ہوئی ہے اس کی؟''

فخر نے جواب دیا۔ ''روشن آرا روڈ پر...... کچھ میمیں رہتی ہیں۔ کہتا ہے ہمارے کام کی ہیں۔''

میموں کا نام سن کر مسعود اپنے دوست کی ایک نظم یاد آ گئی۔ اس کا حوالہ دے کر اس نے کہا۔

''تو چلو آج لگے ہاتھوں ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام بھی لے لیا جائے گا۔ واللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانگے والا صاحب ذوق ہے۔ وہ نظم ضرور پڑھی ہوگی اس نے۔''

اس کے بعد دیر تک میموں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں اور مسعود میموں کے بالکل قائل نہیں تھے۔ لیکن فخر کو عورتوں کی یہ قسم پسند تھی۔ ''ان کا علم سائنٹیفک ہوتا ہے۔ یعنی یہ عورتیں سائنٹیفک طریقے پر اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مشرقی عورتوں کو دیکھئے تو وہی فرق نظر آئے گا۔ جو ہمارے یہاں کی ریوڑھی اور وہاں کی ٹافی میں ہے۔ بھئی دراصل بات یہ ہے کہ ان میموں کا پیکنگ بڑا اچھا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فخر! ممکن ہے تمہارا نظریہ درست ہو مگر بھائی! میں ایسے موقعوں پر زبان کی مشکلات برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دفتر میں بڑے صاحب کے ساتھ انگریزی بول سکتا ہوں۔ میں یہاں دہلی میں رہ کر اس تانگے والے سے اردو میں بات چیت کرنا گوارا کر سکتا ہوں۔ مگر اس موقع پر انگریزی میں گفتگو نہیں کر

سکتا۔ میری پتلون انگریزی، میری ٹائی انگریزی، میرا شو انگریزی...... یہ سب چیزیں انگریزی ہو سکتی ہیں۔ مگر خدا کے لیے وہ چیز مجھ سے انگریزی میں کیسے ہو سکتی ہے۔''

فخر اپنا نظریہ بھول کر ہنسنے لگا۔ مسعود شاید ابھی تک اپنے دوست کی لکھی ہوئی نظم پر غور کر رہا تھا۔ جس میں شاعر نے ایک فرنگی عورت کے ہونٹ چوس کر ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لیا تھا۔ دفعتاً چونک کر اس نے کہا۔ ''کیوں بھئی! یہ تانگہ کب تک چلتا رہے گا؟''

تانگے والے نے ایک دم باگیں کھینچ کر تانگہ ٹھہرا دیا اور فخر سے کہا۔ ''وہ جگہ آ گئی صاحب! آپ اکیلے چلیے گا یا......''

ہم تینوں تانگے والے کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

ایک نیم روشن گلی میں وہ ہمیں لے گیا۔ دلی کی دوسری گلیوں سے یہ گلی کچھ مختلف تھی۔ اس لیے بہت چوڑی تھی۔ دائیں ہاتھ کو ایک منزلہ مکان تھا۔ جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر چقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک دروازے کی چق اٹھا کر تانگے والا اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جب کہا۔ ''بھائی ہم کہیں اوندھے منہ نہ گر پڑیں۔'' تو دوسرے کمرے سے کسی عورت کی بھدی آواز سنائی دی۔ ''لالٹین تو لے گیا ہوتا تو'' اور تھوڑی دیر کے بعد تانگے والا ایک اندھی سی لالٹین لے کر نمودار ہوا۔ ''چلیے اندر تشریف لے چلیے۔'' ہم تینوں اندر تشریف لے گئے دو کالی بھجنگی، انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں جنہوں نے ڈھیلے ڈھیلے فراک پہن

رکھے تھے۔ یہ میمیں تھیں۔ میں نے اپنی ہنسی روک کر فخر سے کہا۔ ''کیا لذیذ نانفیاں اور بسکٹ ہیں۔''

میری یہ بات سن کر ان میموں میں سے ایک جس کا چہرہ سرخی لگانے کے باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ہنسی..... میں بھی ہنس دیا اور بڑے پیار سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے آپ کا؟''

بولی۔ ''لوسی۔''

شاعر مسعود نے آگے بڑھ کر دوسری سے پوچھا۔ ''آپ کا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میری۔''

فخر بھی آگے بڑھ آیا۔ ''کیوں صاحب آپ کام کیا کرتی ہیں؟''

دونوں لجا گئیں۔ ایک نے ادا سے کہا۔ ''کیسا بات کرتا ہے تم؟''

دوسری نے کہا۔ ''جلدی کرو۔ رہنا مانگتا ہے یا نہیں۔ ہمیں روٹی پکانا ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو گیلے آٹے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی۔ تانگے والا قطعی طور پر ہمیں غلط جگہ لے آیا تھا۔ مروڑیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔

ہم تینوں کے اس مکان میں آ کر سخت پریشان ہو گئے۔ مگر ہم اپنی پریشانی ان دو عورتوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں سخت ناامیدی ہوئی تھی اگر ہم ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ تم ہمارے مطلب کی نہیں ہو تو ضرور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ عورت جس کے ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوں ایسے جذبات

سے عاری نہیں ہو سکتی۔

میں نے ان دونوں کی تعریف کی۔ فخر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پھر ہم تینوں جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے نکل گئے۔ تانگے والا ہمارا مطلب سمجھ گیا تھا چنانچہ اسے چند لمحات کے لیے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ باہر نکلا تو فخر نے اس سے کہا۔ ''تم انہیں میمیں کہتے ہو؟''

تانگے والے نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ''لوگ یہی کہتے ہیں صاحب!'' وہ لوگ جھک مارتے ہیں...... میں نے خیال کیا تھا کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے...... اب خدا کے لیے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں ہم چند گھڑیاں اپنا دل بہلا سکیں۔

مسعود نے تینوں کا اجتماعی مقصد اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ ''دیکھو ہم ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں کچھ عرصے کے لیے بیٹھ سکیں...... ہمیں ایسی عورت کے پاس لے چلو جو باتیں کرنے کا سلیقہ رکھتی ہو...... بھائی ہم گورے نہیں ہیں۔ کسی فوج کے سپاہی نہیں ہیں۔ تین شریف آدمی ہیں جنہیں عورت سے بات چیت کیے برسوں گزر چکے ہیں...... سمجھے؟''

تانگے والے نے اس بات میں سر ہلا دیا۔ ''تو چلیے...... بیٹھیے...... آپ کو صدر بازار لے چلتا ہوں۔''

فخر نے پوچھا۔ ''کون ہے وہاں؟''

تانگے والے نے گھوڑے کی باگیں تھام کر جواب دیا۔ ''ایک پنجابن ہے بہت لوگ آتے ہیں اس کے پاس۔''

تانگے والے نے پنجابن کے گھر کا رخ کیا۔

راستے میں ان دو میموں کا ذکر چھڑ گیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو وہاں جانے کا افسوس تھا۔ اس لیے کہ ہم سب سے زیادہ وہ نا امید ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو کچھ روپے دے دیئے ہوتے۔ مگر یہ بھیک ہو جاتی ...... فخر نے ہماری اس گفتگو میں زیادہ حصہ نہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے لیکن جب تک تانگہ پنجابن کے گھر تک نہ پہنچا۔ ان کا ذکر ہوتا رہا۔

تانگہ ایک فراخ بازار میں فٹ پاتھ کے پاس رکا۔ طویلے کے ساتھ والا مکان تھا۔ جدھر کا ہم چاروں نے رخ کیا۔ زینہ طے کر کے ہم اوپر پہنچے۔ سامنے پاخانہ تھا دروازے سے بے نیاز ...... اس کے ساتھ ہی پرانی وضع کا مغلئی کمرہ تھا۔ جس میں ہم چاروں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے آخری سرے پر چار آدمی بیٹھے فلاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جو ہماری آمد سے غافل رہے۔ البتہ وہ عورت جوان کے پاس کھڑی تھی اور ایک آدمی کے پتوں میں دلچسپی لے رہی تھی آہٹ پا کر ہماری طرف آئی۔

یہاں بھی لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ جس کو فلاش کھیلنے والے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ جب وہ فخر کے پاس آئی اور کولہے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی تو میں نے غور سے اسے دیکھا ...... اس کی عمر کم از کم 35 برس کے قریب تھی چھاتیاں بڑی بڑی تھیں۔ جو اس نے بڑے ہی بیہودہ اور فحش انداز سے اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ تنگ ماتھے پر نیلے رنگ کا چاند کھدا ہوا تھا۔ جب وہ مسعود کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو مجھے اس کے سامنے کے دو دانتوں میں سونے کی کیلیں نظر آئیں ......

بڑی خوفناک عورت تھی اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے

والی مشین کا کھلتا ہے۔

اس نے فخر کو آنکھ ماری اور پوچھا۔ ''کہو کیا بات ہے؟''

فخر نے بچے کی طرح کہا۔ ''آپ کا نام؟''

اس نے کولہے پر ہاتھ رکھے۔ ہم تینوں کو باری باری سے دیکھا۔ ''گلزار۔''

فخر نے فوراً ہی معذرت کی۔ ''ہم گلاب کے یہاں آئے تھے۔ غلطی سے ادھر چلے آئے معاف کر دیجیے گا۔''

یہ سن کر وہ فخر کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر کش لگاتی فلاش کھیلنے والوں کے پاس چلی گئی۔ جو ابھی تک ہماری آمد سے غافل تھے۔ نیچے اتر کر ہم تینوں نے تانگے والے کو پھر اپنا مطلب سمجھایا اور اس کو بتایا کہ ہم کس قسم کی عورت چاہتے ہیں اس نے ہم تینوں کا لیکچر سنا اور کہا۔ ''آپ تھوڑے لفظوں میں مجھے بتائیے۔ کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟''

فخر نے اسے سمجھایا۔ ''دیکھو ہمیں کسی لڑکی کے پاس لے چلو...... ایسی عورت کے پاس جو سولہ سترہ برس کی ہو۔ اس سے زیادہ کی ہرگز نہ ہو سمجھے؟''

تانگے والے نے کمبل کی بکل مار کے باگیں تھامیں۔ ''آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا چلیے...... اب آپ کو ٹھیک جگہ پر لے چلوں گا۔''

آدھ گھنٹے کے بعد ٹھیک جگہ بھی آ گئی...... خدا معلوم کون سا بازار تھا۔ دوسری منزل پر ایک بیٹھک سی تھی جس کے دروازے پر موٹا اور میلا ٹاٹ لٹک رہا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو سامنے آنگن میں ایک دیہاتی بڑھیا چولہا جھونک رہی تھی...... مٹی کے کونڈے میں گندھا ہوا آٹا پاس ہی پڑا تھا۔ دھواں اس قدر تھا کہ

اندر داخل ہوتے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بڑھیا نے چولہے میں لکڑیاں جھاڑ کر ہماری طرف دیکھا اور تانگے والے سے دیہاتی لہجے میں کہا۔ ''انہیں اندر لے جاؤ۔''

تانگے والے نے اندھیرے کمرے میں دیا سلائی جلا کر ہمیں داخل کیا اور کیل سے لٹکی ہوئی لالٹین کو روشن کر کے باہر چلا گیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا۔ جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ بھی پڑا تھا۔ جس پر سرخ رنگ کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کانس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ٹرنک تھا۔ جس پر ایک کالی گرکابی رکھی ہوئی تھی۔

مسعود اور فخر دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پست قد لڑکی اپنے سے دوگنا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کرتی اندر داخل ہوئی۔ فخر اور مسعود دونوں اٹھ کھڑے ہوئے جب وہ لالٹین کی روشنی میں آئی تو میں نے اسے دیکھا اس کی عمر بمشکل 12 برس کے قریب ہوگی۔ چھاتیاں آڑو کے برابر تھیں۔ مگر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکی ہے۔ بہت آگے جہاں شاید اس کی ماں بھی نہیں پہنچ سکی۔ جو باہر آنگن میں چولہا پھونک رہی تھی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور اس انداز سے اپنا ایک ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پورا تول نہیں تولے گی۔

ہم تینوں اس کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ فخر شرم بھی محسوس کر رہا

تھا۔ مسعود کی ساری شاعری سمٹ کر شاید اس کے ناخنوں میں چلی گئی۔ کیونکہ وہ بری طرح انہیں دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا جیسے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ٹھنگنی سی لڑکی تھی۔ جو ایک بہت بڑا میلا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رنگ گہرا سانولا، بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو ایک دم رک گئی ہے۔ اس کے پہیوں میں بریک لگ گئے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اس کا رنگ و روغن دھوپ اور بارش میں اڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدی سی بھدی لڑکی کے جسم میں ایک قسم کی شوخ جاذبیت ہوتی ہے۔ اس میں بالکل نہیں تھی۔ کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی دیتی تھی۔ بہت ہی بیہودہ اور ناواجب طریقے پر ننگی.......... اس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر سے غیر نسوانی تھا۔

میں اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے عقب سے ایک بڈھا نمودار ہوا۔ بالکل سفید ڈاڑھی سر ضعف کے باعث ہل رہا تھا۔ لڑکی نے دیہاتی زبان میں ان سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب میں صرف اس قدر سمجھا کہ وہ بڈھا اس کا نانا ہے۔

ہم تینوں صحیح معنوں میں اٹھ بھاگے۔ نیچے بازار میں پہنچے تو ہمارا تکدر کچھ دور ہوا۔

بڈھے اور لڑکی کو دیکھ کر ہمارے جمالیاتی ذوق کو بہت ہی شدید صدمہ پہنچا تھا۔ دیر تک ہم چپ چاپ رہے۔

فخر ٹہلتا رہا۔ مسعود ایک کونے میں پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میں او ور

کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اوپر آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں نامکمل چاند بالکل اس زرد بیسوا لونڈیا کی طرح جس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا۔ بادل کے ایک بڑے ٹکڑے کا دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہا تھا...... اس سے کچھ دور ایک چھوٹا سفید ٹکڑا اس کے نانا کے ضعیف سر کی طرح لرز رہا تھا

....

میرے بدن پر جھرجھری طاری ہوگئی۔

ہم غالباً دس بارہ منٹ تک بازار میں کھڑے رہے اس کے بعد تانگے والا نیچے اتر انفجر کے پاس جا کر اس نے کہا۔ ''آپ نے آٹھ بجے تانگہ لیا تھا...... اب گیارہ بج چکے ہیں تین گھنٹوں کے پیسے دے دیجیے۔''

نفجر نے کچھ کہے بغیر دو روپے اس کو دے دیئے۔ روپے لے کر وہ مسکرایا۔

''بابو! آپ کو کچھ پہچان نہیں...... ایسی کراری لونڈیا تو شہر بھر میں نہیں ملے گی آپ کو...... خیر آپ کو اختیار...... تانگے میں بیٹھے میں ابھی آیا۔''

اس کو اوپر جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ کیونکہ سفید ریش بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور موری کے پاس کھڑا اپنا ضعیف سر ہلا رہا تھا۔ اس کو دو روپے دے کر جب تانگے والے نے باگیں تھامیں تو اس کی سنجیدگی غائب تھی۔ ''چل بیٹا'' کہہ کر اس نے اپنی بھدی مگر مسرت بھری آواز میں گانا شروع کر دیا۔

''ساون کے نظارے ہیں...... اللا......''

اختتام ـــــــــــــــــــــ حصہ اول

منٹو کے سو بہترین افسانے

(افسانے)

حصہ دوم

Presented by: S A M I

فہرست

پھاہا

پھسپھسی کہانی

پیرن

ترقی پسند

تلون

تانگے والے کا بھائی

ٹوٹو

ٹھنڈا گوشت

ٹیڑھی لکیر

ٹیٹوال کا کتا

جسم اور روح

جنٹل مینوں کا برش

جھوٹی کہانی

جیب کفن

چوری

چوہے دان

چور

حامد کا بچہ

حجامت

حج اکبر

پھاہا

گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ آم خوب ہوئے تھے۔ بازاروں میں، گلیوں میں، دکانداروں کے پاس، پھیری والوں کے پاس، جدھر دیکھو، آم ہی آم نظر آتے۔ لال، پیلے سبز رنگا رنگ کے...... سبزی منڈی میں لاکھوں کے حساب سے ہر قسم کے آم آتے تھے اور نہایت سستے داموں فروخت ہو رہے تھے۔ یوں سمجھئے کہ پچھلے برس کی کسر پوری ہو رہی تھی۔

سکول کے باہر چھوٹو رام پھل فروش سے گوپال نے ایک روز خوب جی بھر کے آم کھائے اور جیب میں سے ایک مہینے کے بچائے ہوئے جو پیسے جمع تھے سب کے سب ان آموں پر خرچ کر دیئے۔ جن کے گودے اور رس میں شہید گھلا ہوا تھا۔

اس روز چھٹی کے وقت آم کھانے کے بعد انگلیاں چاٹتے ہوئے گوپال کو سکول کے حلوائی سے دودھ کی لسی پینے کا خیال آیا تھا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اس نے گنڈا رام حلوائی سے پاؤ دودھ کی لسی بنانے کو کہا بھی تھا۔ مگر حلوائی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا۔ "بابو گوپال! پہلا حساب چکا دو تو اور ادھار دوں گا ورنہ نہیں۔"

گوپال نے اگر آم نہ کھائے ہوتے یا اگر اس کی جیب میں تھوڑے بہت پیسے ہوتے۔ تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گنڈا رام کا حساب چکا دیتا اور کچھ نہیں تو نقد دام دے کر لسی کا وہ گلاس لے لیتا۔ جس میں برف کا ٹکڑا ڈبکیاں لگا رہا تھا اور جسے

حلوائی نے برا سا منہ بنا کر اپنے پیچھے لوہے کے تھال پر رکھ دیا تھا۔ مگر گوپال کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھے روز اس کی ران پر یہ بڑا پھوڑا نکل آیا اور تین چار روز تک ابھرتا رہا۔

گوپال کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟ وہ پھوڑے سے اتنا پریشان نہیں تھا جتنا اس کے درد سے...... اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پھوڑا دن بدن لال ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کے منہ پر بدن کی جھلی پھٹنا شروع ہو گئی تھی۔ بعض اوقات گوپال کو یہ معلوم ہوتا کہ پھوڑے کے اندر کوئی ہنڈیا ابل رہی ہے اور اس کے اندر سب کچھ ایک ہی ابال میں نکلنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اسے بہت پریشان کر رہی تھی اور پھوڑے کی جسامت دیکھ کر ایک مرتبہ تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کی جیب میں سے کانچ کی گولی نکل کر اس کی ران میں گھس گئی ہے۔

گوپال نے گھر میں پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پتا جی کو اس کا پتہ چل گیا تو وہ اپنے تھانے کی مکھیوں کا سارا غصہ اسی پر نکالیں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اسے اس چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیں۔ جو تھوڑے روز ہوئے گردھاری وکیل کے منشی نے وزیر آباد سے انہیں تحفے کے طور پر لا کر دی تھی۔ ماں کا مزاج بھی کم گرم نہ تھا۔ وہ اگر اسے آم کھانے کے جرم کی سزا نہ دیتی تو اس غلطی پر اس کے کان کھینچ کھینچ کر ضرور لال کر دیتی۔ کہ اس نے گھر کے باہر اکیلے اکیلے آم کیوں اڑائے۔ اس کی ماں کا اصول تھا کہ گوپال اگر تجھے زہر بھی کھانا ہو تو گھر میں کھانا۔ گوپال اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اصول کے پیچھے اس کی

ماں کی صرف یہ خواہش تھی کہ گوپال کے منہ کے ساتھ اس کا منہ بھی چلتا رہے۔

کچھ بھی ہو گوپال کی ران پر پھوڑا نکلنا تھا۔ نکل آیا۔ اس کا باعث جہاں تک گوپال سمجھ سکا تھا۔ وہی آم تھے۔ اس نے پھوڑے کی بابت گھر میں کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ اس کو اپنے پتا جی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی۔ جو غسل خانے کے اندر بتائی گئی تھی۔ اس کے پتا جی لالہ پرشوم داس تھانیدار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے۔ جو انہوں نے صبح سویرے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کیے تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم اڑانا چاہا تھا۔ تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ”بے شرم...... تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا جانے کب آئے گا؟“

اور جب گوپال نے رونی صورت بنا کر کہا تھا۔ ”پتا جی............ آم کھانے کو میرا بھی تو جی چاہتا ہے۔“ تو تھانیدار صاحب نے آم کی گٹھلی چوس کر موری میں پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ ”گوپو تیرے لیے یہ آم بہت گرم تھا۔ پھوڑے پھنسیاں چاہتا ہے۔ تو بیشک کھا لے...... دو تین بارشیں اور ہو لینے دے، پھر خوب ٹھاٹ سے کھائیو تیری ماں سے کہوں گا وہ لسی بنا دے گی...... چل اب پیٹھ مل۔“ اور گوپال نے یہ رکاوٹ کی بات سن کر خاموشی سے اپنے پتا جی کی پیٹھ ملنا شروع کر دی۔ اور

آم کی مٹھاس نے جو پانی اس کے منہ میں بھر دیا تھا۔ اسے دیر تک نگلتا رہا تھا۔

اس کے دوسرے روز اس نے آم کھائے اور چوتھے روز اس کی ران پر پھوڑا نکل آیا۔ اس کے پتا کی بات سچی ثابت ہوئی۔

اب اگر گوپال گھر میں کسی سے اس پھوڑے کی بات کرتا تو ظاہر ہے کہ خوب پیٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاموش رہا اور پھوڑے کا بڑھاؤ بند کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔

ایک روز اس کے پتا جی تھانے سے واپسی پر جب گھر آئے۔ تو ان کے ہاتھ میں ایک لمبی سی بتی تھی۔ گوپال کی ماں کو آواز دے کر انہوں نے یہ بتی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ''پھوڑے پھنسی کی بہار ہے۔ ذرا سا پھاہا پھوڑے پر لگا دو گی۔ یوں آرام آ جائے گا...... یوں...... بمبئی کا نخالص مرہم ہے۔ سنبھال کے رکھو۔''

گوپال اپنی بہن نرملا کے ساتھ صحن میں گیند بلا کھیل رہا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب تھانیدار جی مرہم دے کر اپنی پتنی کو کچھ سمجھا رہے تھے۔ تو نرملا نے زور سے گیند پھینکی۔ گوپال کا دھیان باپ کی طرف تھا۔ گیند زور سے پھوڑے پر لگی۔ گوپال بلبلا اٹھا لیکن درد کو اندر ہی اندر پی گیا۔ وہ سکول میں ماسٹر ہری رام کے مشہور بید کی مار کھا کر درد سہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

ادھر گوپال کے پھوڑے پر گیند لگی۔ ادھر اس کے باپ کی آواز بلند ہوئی۔ ذرا سا پھاہے پر لیپ کر کے لگا دو گی...... یوں آرام آ جائے گا...... یوں...... اور یوں کے ساتھ اس کے باپ کی چٹکی نے گویا گوپال کے سوئے ہوئے دماغ کی چٹکی بھر

لی۔اس کو اپنے درد کا علاج معلوم ہو گیا۔

اس کی ماں نے مرہم بتی سامنے والان میں سلائی کی پٹاری میں رکھ دی۔ گوپال کو اچھی طرح معلوم تھا۔کہ اس کی ماں عام طور پر سلائی کی پٹاری ہی میں سب سنبھالنے والی چیزیں رکھا کرتی ہے۔سب سے زیادہ سنبھالنے والی چیز وہ موچنا تھا۔جس سے اس کی ماں ہر دسویں پندرہویں روز اپنے تنگ ماتھے کے بال صاف کیا کرتی تھی۔ یہ بلا شک وشبہ سلائی کی پٹاری میں اس پڑیا سمیت موجود تھا۔جس میں کوئلوں کی سفید راکھ جمع رہتی تھی۔ جو اس کی ماں بال نوچ کر ماتھے پر لگایا کرتی تھی۔

تاہم گوپال نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے گیند والان میں پھینک دی اور اس کو پلنگ کے نیچے سے نکالتے ہوئے اپنی ماں کو سلائی کی پٹاری میں مرہم رکھتے دیکھ لیا۔

دوپہر کو اس نے اپنی بہن نرملا کو ساتھ ملا کر چھوٹی قینچی جس سے اس کا باپ انگلیوں کے ناخن کاٹتا تھا۔مرہم کی بتی اور اپنے باپ کے پائجامے سے بچا ہوا لٹھے کا وہ ٹکڑا حاصل کر لیا۔جس سے اس کی ماں ایک اور ٹکڑے کو ساتھ ملا کر شلوار کی میانی بنانا چاہتی تھی۔

دونوں یہ چیزیں لے کر اوپر کوٹھے پر چلے گئے وار برساتی کے نیچے کوئلوں کی بوریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

نرملا نے اپنی جیب سے لٹھے کا ٹکڑا نکال کر اپنی ران پر شلوار کے پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے پر پھیلا کر جب گوپال کی طرف اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

تو اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ گیارہ برس کی یہ کم سن لڑکی جو دریائی سرکنڈے کی طرح نرم اور لچکیلی تھی۔ ایک بہت بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہے۔

اس کا ننھا سا دل جو اس وقت تک صرف ماں باپ کی جھڑکیوں اور اپنی گڑیوں کے میلے ہوتے ہوئے چہروں کی فکر سے دھڑکا کرتا تھا۔ اب اپنے بھائی کی ران پر پھوڑا دیکھنے کے خیال سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے کان کی لویں لال اور نرم ہو گئی تھیں۔

گوپال نے گھر میں اپنے پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا تھا لیکن اب اسے نرملا کو ساری بات سنانی پڑی۔ کہ کس طرح اس نے چوری چوری آم کھائے اور لسی پینا بھول گیا اور اس کی ران پر پیسے کے برابر پھوڑا نکل آیا۔ جب اس نے اپنی رام کہانی سنا کر نرملا سے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔ ”دیکھ نرملا! گھر میں یہ بات کسی سے نہ کہیو۔“ تو نرملا نے بڑی متین صورت بنا کر جواب دیا تھا۔ ”میں پاگل تھوڑی ہوں۔“

ربڑ کا غبارہ پھٹ گیا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اور اس کے اندر جو کچھ ہے پھوٹ بہے گا۔ گوپال نے مرہم کو انگلی پر اٹھاتے ہوئے کہا۔

نرملا کا گلابی رنگ اب بمبئی کے مرہم کی طرح پیلا ہو گیا تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ ”مگر یہ پھوڑے کیوں نکلتے ہیں بھیا؟“

”گرم چیزیں کھانے سے۔“ گوپال نے ایک ماہر طبیب کے سے انداز میں

جواب دیا۔

نرملا کو وہ دو انڈے یاد آ گئے۔ جو اس نے دو ماہ پہلے کھائے تھے۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔

گوپال اور نرملا کے درمیان چند باتیں اور ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اصل کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نرملا نے لٹھے کا ایک گول پھاہا کاٹا۔ بڑی نفاست سے، یہ روپے کے برابر تھا اور اس کی گولائی میں مجال ہے جو ذرا سا نقص بھی ہو اسی طرح گول تھا۔ جس طرح نرملا کی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی روٹی گول ہوتی تھی۔

گوپال نے اس پھاہے پر تھوڑا سا مرہم لگا دیا اور اسے اچھی طرح پھیلانے کے بعد پھوڑے کی طرف غور سے دیکھا۔ نرملا گوپال کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور گوپال کی ہر حرکت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ گوپال نے جب پھاہا اپنے پھوڑے کے اوپر جما دیا تو گوپال کو یقین تھا کہ نرملا یہ بات اپنے تک ہی رکھے گی۔ چنانچہ اس نے پاجامے کو اوپر اڑس لیا۔ نرملا کا دل دھک دھک کرنے لگا جب گوپال نے بیٹھ کر اپنا پھوڑا دکھایا اور نرملا نے دور ہی سے اپنی انگلی سے اسے چھوا۔ تو اس کے بدن پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ سی سی کرتے ہوئے اس نے ابھرتے ہوئے لال پھوڑے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کتنا لال ہے۔''

''ابھی تو اور ہو گا۔'' گوپال نے اپنے مردانہ حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ نرملا نے حیرت سے کہا۔ ''سچ؟''

''ابھی تو کچھ لال نہیں ہے ''جو پھوڑا'' میں نے چرنجی کے منہ پر دیکھا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور لال تھا۔'' گوپال نے پھوڑے پر دو انگلیاں پھیریں۔

تو ابھی اور بڑے گا؟ نرملا آگے سرک آئی۔

''کیا پتا ہے...... ابھی تو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔'' گوپال نے جیب میں سے مرہم کی بتی نکال کر کہا۔

نرملا سہم سی گئی۔ ''اس مرہم سے تو آرام آجائے گا نا؟''

گوپال نے بتی کے ایک سرے پر سے کاغذ کی تہہ جدا کی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اس کا ایک پھاہا لگانے ہی سے پھٹ جائے گا۔''

''پھٹ جائے گا۔'' نرملا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے کان کے پاس بم پھٹا ہو۔ وہ کانپ گئی۔ جیسے اس کے بدن پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہے۔

''اب آرام آجائے گا نا؟'' نرملا نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

گوپال جواب دینے بھی نہ پایا تھا۔ کہ برساتی کے برابر والی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ یہ ان کی ماں تھی جو غالباً کوئلے لینے کے لیے آرہی تھی۔

گوپال اور نرملا نے بیک وقت ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سنے بغیر سب چیزیں اکٹھی کر کے اس پرانے صندوق کے پیچھے چھپا دیں۔ جہاں ان کی بلی سندری بچے دیا کرتی تھی اور چپکے سے بھاگ گئے۔

یہاں سے بھاگ کر گوپال جب نیچے گیا تو اس کے باپ نے اسے باہر فالودہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب واپس آیا تو اسے گلی میں نرملا ملی۔ فالودے کا گلاس اس کے حوالے کر کے وہ دوڑ چرنجی کے گھر چلا گیا اور اس طرح ان چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا بھول گیا۔ جو ماں کے اچانک آجانے سے اس نے اور نرملا نے صندوق کے پیچھے چھپا دی تھیں۔

چرنجی کے یہاں وہ دیر تک تاش کھیلتا رہا۔ کھیل سے فارغ ہو کر جب وہ چرنجی کی بغل میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ تو کسی بات پر اس کا دوست ہنسا اور اس کے داہنے گال پر پھوڑے کا نشان لمبی سی لکیر بن گیا۔ اس کو دیکھ کر فوراً ہی اپنے پھوڑے کا گوپال کو خیال آیا اور اس خیال کے ساتھ ہی اسے وہ چیزیں یاد آ گئیں جو صندوق کے پیچھے پڑی تھیں۔ چرنجی کی بغل سے ہاتھ نکال کر وہ بھاگا۔

گھر پہنچ کر اس نے وہاں کی فضا دیکھی۔ اس کی ماں صحن میں بیٹھی اس کے باپ سے ''ملاپ'' اخبار کی خبریں سن رہی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ گوپال ان کے پاس سے گزرا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر اس سے کوئی بات نہ کی۔ گوپال کو اطمینان ہو گیا کہ ابھی تک اس کی ماں نے اپنی سلائی کی پٹاری نہیں دیکھی۔ چنانچہ وہ چپکے سے کوٹھے پر چلا گیا۔

بڑے کوٹھے کو طے کر کے دروازے کے اندر داخل ہونے والا ہی تھا کہ اس کے قدم رک گئے۔

صندوق کے پاس بیٹھی نرملا کچھ کر رہی تھی۔ گوپال پیچھے ہٹ گیا اور چھپ کر دیکھنے لگا۔

نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹنے کھولے سینے کے طرف داہنی چھوٹا سا ابھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نکی پر صابن کا چھوٹا سا مکمل بلبلا اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے اس ننھے سے ابھار پر جما دیا۔

پھسپھسی کہانی

سخت سردی تھی۔

رات کے دس بجے تھے۔ شالامار باغ سے وہ سڑک جو ادھر لاہور کو آتی ہے، سنسان اور تاریک تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔

گردوپیش کی ہر چیز ٹھٹھری ہوئی تھی۔ سڑک کے دورویہ پست قد مکان اور درخت دھندلی روشنی میں سکڑے سکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے ایک دوسرے سے دور دور ہٹے، روٹھے اور اکتائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ساری فضا میں بدمزگی کی کیفیت تھی۔ ایک صرف تیز ہوا تھی جو اپنی موجودگی منوانے کی بیکار کوشش میں مصروف تھی۔

جب دو سائیکل سوار نمودار ہوئے اور ہوا کے تیز و تند جھونکے ان کے کانوں سے ٹکرائے تو انہوں نے اپنے اوورکوٹ کا کالر اونچا کر لیا۔ دونوں خاموش تھے۔ مخالف ہوا کے باعث انہیں پیڈل چلانے میں کافی زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ اس کے احساس سے غافل ایک دوسرے کا سایہ بنے شالامار باغ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگر کوئی انہیں دور سے دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ سڑک جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، ان کی سائیکلوں کے ساکت پہیوں کے نیچے ہولے ہولے کھسک رہی ہے۔

بہت دیر تک وہ دونوں سنسان فاصلہ خاموشی میں طے کرتے رہے۔ آخر ان سے ایک سائیکل سے اتر کر اپنے سرد ہاتھ کو منہ کو بھاپ سے گرم کرنے لگا۔ ''سخت

سردی ہے۔''

اس کے ساتھی نے بریک لگائی اور ہنسنے لگا۔ ''بھائی جان، وہ.........وہ وسکی کہاں گئی؟''

''جہنم میں.......جہاں ساری شام غارت ہوئی وہاں وہ بھی ہوئی۔''

دونوں بھائی تھے، مگر ایسے بھائی جو چاروں عیب شرعی اکٹھے مل جل کے کرتے تھے۔ دونوں نے صبح یہ پروگرام بنایا تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر رشوت کے اس روپے کا جو انہیں دو بجے کے قریب ملنا تھا، جائز استعمال سوچیں گے۔

روپیہ انہیں دو بجے سے پہلے ہی مل گیا، اس لیے کہ رشوت دینے والا بہت بے قرار تھا۔ بڑے بھائی نے روپیہ جیب میں رکھنے سے پہلے تمام نوٹ اچھی طرح دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا کہ وہ نشان زدہ نہیں تھے۔ رقم زیادہ نہیں تھی۔ دو سو ایک روپے تھے۔ انہوں نے دو سو طلب کیے تھے مگر ایک کا اضافہ رشوت دینے والے نے شگن کے لیے کیا تھا جو بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے مشورہ کر کے ایک اندھے بھکاری کو دے دیا تھا، جب وہ دونوں ہیرا منڈی کی طرف جا رہے تھے۔

چھوٹے بھائی کی جیب میں اسکاچ کی بوتل تھی۔ بڑے کی جیب میں تھری فائیو کے دو ڈبے۔ عام طور پر دونوں گولڈ فلیک پیتے تھے، مگر جب رشوت ملتی تو ایسا برانڈ پیتے تھے جس کے دام زیادہ ہوں۔

ہیرا منڈی میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ بادشاہی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ بڑے نے چھوٹے سے کہا۔ ''چلو یار نماز پڑھ لیں۔''

چھوٹے نے اپنی پھولی ہوئی جیب کی طرف دیکھا۔ ''اس کا کیا کریں بھائی جان؟''

بڑے نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا۔ ''اس کا انتظام کر لیتے ہیں...... اپنا یار بٹ جو ہے۔''

بٹ پان فروش کی دکان قریب ہی تھی۔ چھوٹے نے مہین کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل اس کے حوالے کی۔ بڑے نے اپنی اور اپنے بھائی کی سائیکل دکان کے تھڑے کے ساتھ ٹکائی اور بٹ سے کہا۔ ''ہم ابھی آئے نماز پڑھ کے۔''

بٹ نے قہقہہ لگایا۔ ''دو نفل شکرانے کے بھی۔''

دونوں بھائیوں نے بادشاہی مسجد میں نماز ادا کی اور دو نفل شکرانے کے بھی پڑھے۔ واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بٹ کی دکان بند ہے۔ ساتھ والے دکاندار سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ''نماز پڑھنے گیا ہے۔''

دونوں بھائیوں کو سخت تعجب ہوا۔ ''نماز؟''

دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سال چھ ماہی میں کبھی کبھی پڑھ لیا کرتا ہے۔''

دونوں بہت دیر تک بٹ کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ نہ آیا تو بڑے نے چھوٹے سے کہا۔ ''جاؤ یار...... ایک بوتل اور لے آؤ...... میں نے خواہ مخواہ اس حرامزادے بٹ پر اعتبار کیا۔''

چھوٹے نے روپے لیے اور بڑے سے کہا۔ ''جیب ہی میں پڑی رہتی تو کیا حرج تھا؟''

''چھوڑو یار...... ہٹاؤ اس قصے کو مجھے بوتل جانے کا اتنا افسوس نہیں...... کہیں گر کر بھی ٹوٹ سکتی تھی...... افسوس تو اس بات کا ہے کہ بڑی بے دردی سے پی رہا ہو گا کم بخت۔''

چھوٹے نے پیڈل پر پاؤں رکھا اور پوچھا۔ ''آپ یہیں ہوں گے؟''

بڑے نے بڑے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں بھئی، یہیں کھڑا رہوں گا...... شاید بہک کر ادھر آ نکلے...... لیکن تم جلدی آ جانا۔''

چھوٹا جلدی واپس آ گیا، مگر اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو کیریر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا تاڑ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن اسے زیادہ دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا نہ رہنا پڑا کیونکہ چھوٹے نے سائیکل سے اترتے ہی اس کو سارا واقعہ سنا دیا۔

شراب کی دکان سے دوسری بوتل لے کر جونہی وہ باہر نکلا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ اسے جلد واپس پہنچنا تھا۔ افراتفری میں اس نے سائیکل پر سوار ہونے کی کوشش کی مگر وہ ایسی پھسلی کہ سنبھالے نہ سنبھلی۔ سڑک پر اوندھے منہ گرا اور دوسری بوتل بھی جہنم میں چلی گئی۔

چھوٹے نے ساری داستان تفصیل کے ساتھ سنا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ''میں بچ گیا بھائی جان...... بوتل کا کوئی ٹکڑا اگر کپڑے چیر کر گوشت تک پہنچ جاتا تو اس وقت کسی ہسپتال میں پڑا ہوتا۔''

بڑے نے اللہ کا شکر ادا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ شراب کی دکان سے جو آدمی اس کے بھائی کے ساتھ آیا تھا اس کو تیسری بوتل کے پیسے دے کر اس نے بٹ پان

فروش کی بند دکان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں ایک بہت ہولناک قسم کی گالی دے کر اس کی دکان کو بھسم کر ڈالا۔

دونوں کو معلوم تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ چوک کے اس طرف نان کباب والے کے اوپر جو بالا خانہ تھا، اسی میں ان دونوں بھائیوں کی بالائی آمدنی کا جائز نکاس ہوتا تھا۔ لونڈیا کم گو تھی۔ کھانے پینے والی تھی۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے طوائف کم اور کلرک زیادہ تھی۔ اسی لیے ان کو پسند تھی کہ وہ خود بھی کلرک تھے۔ جب دونوں خوب پی جاتے تو دفتری گفتگو شروع کر دیتے۔ ہیڈ کلرک کیسا ہے، صاحب کیسا ہے، اس کے گھر والی کی طبیعت کیسی ہے۔ گھنٹوں اپنے ماتحتوں اور اپنے افسروں کے ماضی اور حال پر تبصرہ کرتے رہتے اور وہ بڑے انہماک سے سنتی رہتی۔

بہت کن سری تھی، مگر دونوں بھائی اس کا گانا سن کر یوں جھومتے تھے جیسے وہ ان کے کانوں میں شہد ٹپکا رہی ہے...... لیکن آج جب وہ گانے لگی تو ان کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ سُر میں ہے نہ تال میں۔ چنانچہ اس کا گانا بند کرا کے انہوں نے باقی بچی ہوئی شراب پینا شروع کر دی۔

طوائف جس کا نام شیداں تھا، بہت کم پینے والی تھی، مگر جانے اسے کیا ہوا کہ جب ان دونوں بھائیوں نے اس کا گانا بند کرا کے پینا شروع کی تو وہ ایسی بہکی کہ بوتل اٹھا کر ساری کی ساری سوکھی پی گئی۔

بڑے کو بہت غصہ آیا۔ مگر وہ اسے پی گیا۔ کیونکہ چھوٹا بڑے مزے میں تھا لیکن زیادہ دیر تک اس پر یہ کیف طاری نہ رہا۔ کیونکہ جب اس نے اور پینے کے

لیے بوتل اٹھائی تو وہ خالی تھی۔ اب دونوں یکساں طور پر بے مزہ تھے۔

بڑے نے چھوٹے سے مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ شیداں کے استاد مانڈو کو روپے دے کر اس نے کہا۔ ''جاؤ، بھاگ کر جاؤ اور ایک بوتل جمخانہ وسکی لے آؤ۔''

استاد نے روپے گن کر جیب میں رکھے اور کہا۔ ''سرکار! بلیک میں ملے گی۔''

بڑا جو پہلے ہی بھنایا ہوا تھا چلا کر بولا۔ ''ہاں، ہاں...... جانتا ہوں۔ اسی لیے تو میں نے پانچ زیادہ دیئے ہیں۔''

جمخانہ آئی۔ دو دور چلے تو بڑے نے محسوس کیا کہ پانی ملی ہے۔ امتحان لینے کی خاطر اس نے تھوڑی سی رکابی میں ڈالی اور اس کو دیا سلائی دکھائی۔ ایک لمحے کے لیے نیم جان نیلگوں سا دھواں اٹھا اور دیا سلائی شوں کر کے رکابی میں بجھ گئی۔

دونوں بھائیوں کو اس قدر کوفت ہوئی کہ غصے میں بھرے ہوئے اٹھے۔ بڑے نے پانی ملی بوتل ہاتھ میں لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ وہ اس شراب فروش کے سر پر دے مارے گا جس نے بے ایمانی کی تھی، مگر فوراً اسے خیال آیا کہ ان کے پاس پرمٹ نہیں تھا۔ اس لیے مجبوراً گالیاں دے کر خاموش ہو گئے۔

چھوٹے کی کوششوں سے بدمزگی کسی حد تک دور ہوئی تھی کہ شیداں نے جو اس کی مدد کر رہی تھی سب کھایا پیا اگلنا شروع کر دیا۔ اب دونوں بھائیوں نے مناسب خیال کیا کہ چلا جائے۔ چنانچہ استاد کی تحویل سے سائیکلیں لے کر وہ ہیرا منڈی کی گلیوں میں دیر تک بے مقصد گھومتے رہے، مگر اس آوارہ گردی کے باوجود ان کی کوفت دور نہ ہوئی۔ واپس گھر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ انہیں بٹ دکھائی دیا۔ نشے میں دھت تھا اور کوٹھوں کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر واہی تباہی بک رہا

تھا۔ دونوں بھائیوں کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیں۔ مگر ان سے پہلے ایک سپاہی نے اس کو پکڑ لیا اور تھانے لے گیا۔

چھوٹے نے بڑے سے کہا۔ "چلیے بھائی جان...... ذرا تماشہ دیکھیں۔"

بڑے نے پوچھا۔ "کس کا؟"

"بٹ کا اور کس کا؟"

بڑے کے ہونٹوں پر معنی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "پاگل ہوئے ہو...... تھانے میں اگر اس نے ہمیں پہچان لیا یا کسی نے ہمارے منہ کی بو سونگھ لی تو ہمیں اپنا تماشہ بھی ساتھ ساتھ دیکھنا پڑے گا۔"

چھوٹے نے دل ہی دل میں بڑے کی دور اندیشی کی داد دی اور کہا "تو چلیے...... گھر چلیں!"

دونوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے۔ بارش ختم ہو چکی تھی لیکن سرد ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ ابھی وہ ہیرا منڈی سے باہر نہیں نکلے تھے کہ انہیں اس تانگے میں جو ان کے آگے آگے چل رہا تھا، اپنے دفتر کا بڑا افسر نظر آیا۔ دونوں نے ایک دم اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ کیونکہ وہ انہیں دیکھ چکا تھا۔

"ہلو!"

انہوں نے اس ہلو کا جواب نہ دیا۔

"ہلو!"

اس ہلو کے جواب میں انہوں نے اپنی اپنی سائیکل روک لی...... افسر نے تانگہ ٹھہرا لیا اور ان سے بڑے مربیانہ انداز میں کہا۔ "کہو مسٹر! عیش ہو رہے

ہیں؟"

چھوٹے نے "جی ہاں!" اور بڑے نے "جی نہیں!" میں جواب دیا۔ اس پر افسر نے قہقہہ لگایا۔ "میرا عیش تو ادھورا رہا۔" پھر اس نے افسرانہ انداز میں پوچھا۔ "تمہارے پاس کچھ روپے ہیں؟"

اس مرتبہ بڑے نے "جی ہاں!" اور چھوٹے نے "جی نہیں" میں جواب دیا، جس پر افسر نے دوسرا قہقہہ بلند کیا جو ٹھیٹ افسرانہ تھا۔ "ایک سو روپے کافی ہوں گے اس وقت!"

بڑے نے بڑے میکانک انداز میں اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور اپنے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ چھوٹے نے پکڑ کر افسر کے حوالے کر دیا، جس نے "تھینک یو!" کہا اور تانگے سے اتر کر لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

دونوں بھائی تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ بڑے نے تمام حالات پیش نظر رکھ کے اپنے سر کو زور سے جنبش دی۔ "معلوم نہیں، آج صبح صبح کس کا منہ دیکھا تھا۔"

چھوٹے کے منہ سے یہ بڑی گالی نکلی۔ "اسی...... کا، جس نے دو سو ایک روپے دیئے۔"

بڑے نے بھی اس کو مناسب و موزوں گالی سے یاد کیا۔ "ٹھیک کہتے ہو...... لیکن میں سمجھتا ہوں، سارا قصور اس فالتو روپے کا ہے جو اس نے اپنی ماں کی روال سے شگن کے طور پر دیا تھا۔"

"اس نماز کا بھی جو ہم نے پڑھی!"

”اور اس کا حرامی بٹ کا بھی!“

”میں تو شکر کرتا ہوں کہ پولیس نے اس کو پکڑ لیا، ورنہ میں نے آج ضرور اس کا خون کر دیا ہوتا۔“

”اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔“

”لینے کے دینے تو پڑ ہی گئے...... خدا معلوم یہ ہمارا افسر کہاں سے آن ٹپکا۔“

”لیکن سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا...... سو روپے میں سالا کانا تو ہو گیا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے...... لیکن آج کی شام بہت بری طرح غارت ہوئی۔“

”چلو چلیں...... ایسا نہ ہو کوئی اور آفت آ جائے۔“

دونوں پھر اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوئے اور ہیرا منڈی سے نکل آئے۔

بڑے نے دفتر سے نکلتے ہی یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اسکاچ کے دو تین دور ہونے کے بعد وہ شیداں سے کہے گا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو بلائے۔ اس کی وہ بہت تعریفیں کیا کرتی تھی۔ کم عمر اور الہڑ تھی۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے گاؤں کی صحت مند فضا میں گزارا تھا اور دھندا شروع کیے اسے بمشکل چند مہینے ہوئے تھے۔

اسکاچ وسکی اور شیداں کی چھوٹی بہن...... اس سے بڑھ کر اور عیاشی کیا ہو سکتی تھی...... مگر اس کا یہ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا اور صرف کوفت باقی رہ گئی۔

چھوٹے نے بھی کھل کھیلنے کی سوچی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وسکی اور شیداں یقینی طور پر اسے اور بھی خوشگوار بنا دیتے اور وہ اس قدر محظوظ ہوتا کہ پندرہ بیس روز تک اسے اور کسی عیش کی ضرورت محسوس نہ ہوتی...... مگر سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔

دونوں کے سر بھاری اور دل کڑوے کسیلے تھے۔ دونوں کی ہر بات الٹی ثابت

ہوئی تھی۔ اسکاچ کی پہلی بوتل بٹ پان فروش لے اڑا، دوسری سڑک کے پتھروں پر لوٹ کر بہہ گئی۔ تیسری عین اس وقت داغ مفارقت دے گئی جب کہ سرور گھ رہے تھے۔ چوتھی کنایت کی خاطر ویسی منگوائی تو اس میں آدھا پانی نکلا اور سو کا آخری نوٹ افسر نے ہتھیالیا۔

بڑے کی کوفت زیادہ شدید تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دماغ میں عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اور بھی کچھ ہو...... کوئی ایسی بات ہو کہ وہ کتوں کی طرح زور زور سے بھونکنا شروع کر دے...... یا ایسا زچ بچ ہو کہ اپنی سائیکل کے پرزے اڑا دے، اپنے تمام کپڑے اتار کر پھینک دے اور ننگ دھڑنگ کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ جس طرح حالات نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا، اسی طرح وہ ان کا مضحکہ اڑانا چاہتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ حالات پیدا ہو کر وہیں ہیرا منڈی میں وفات پا گئے تھے۔ اب نئے حالات اور وہ بھی ایسے حالات کیسے پیدا ہوں جن کا وہ حسب منشا مضحکہ اڑا سکے، اس کے متعلق سوچنے سے وہ خود کو عاری پاتا تھا۔

ایک صرف گھر تھا، جہاں وہ لحاف اوڑھ کر سو سکتے تھے...... مگر خالی خولی لحاف اوڑھ کر سو جانے میں کیا رکھا تھا۔ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ وہ سو سو کے دو نوٹوں میں چرس ملا تمبا کو بھرتے اور پی کر انٹا غفیل ہو جاتے۔ اور صبح اٹھ کر شگن کے ایک روپے کا کسی پیر فقیر کے مزار پر چڑھاوا چڑھا دیتے۔

سوچتے سوچتے بڑے نے زور کا نعرہ بلند کیا۔ ”ہت تیری ایسی کی تیسی۔“

چھوٹے نے گھبرا کر پوچھا۔ ”پنکچر ہو گیا؟“

بڑے نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "نہیں یار.......... میں نے اپنا دماغ پنکچر کرنے کی کوشش کی تھی۔"

چھوٹا سمجھ گیا۔ "اب جلدی گھر پہنچ جائیں۔"

بڑے کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ "وہاں کیا کریں گے.......... بطخوں کے بال مونڈیں گے؟"

چھوٹا بے اختیار ہنسنے لگا۔ بڑے کو یہ ہنسی بہت ناگوار گزری۔ "خاموش رہو جی!"

دیر تک دونوں خاموشی میں گھر کا فاصلہ طے کرتے رہے۔ اب وہ اس سڑک پر تھے جو لوہے کی زنگ آلود چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی، اور ایسا لگتا تھا۔ کہ ان کی سائیکلوں کے پہیوں کے نیچے ہولے ہولے کھسک رہی ہے۔

بڑے نے جب اپنے سرد ہاتھ منہ کی بھاپ سے گرم کیے اور کہا۔ "سخت سردی ہے۔" تو چھوٹے نے ازراہ مذاق پوچھا۔ "بھائی جان! وہ.......... وہ وسکی کہاں گئی؟"

بڑے کے جی میں آئی کہ چھوٹے کو سائیکل سمیت اٹھا کر سڑک پر پٹک دے مگر اس قدر کہہ سکا۔ "جہنم میں...... جہاں ساری شام غارت ہوئی وہاں وہ بھی ہوئی۔"

یہ کہہ کر وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ اتنے میں چھوٹے نے آواز دی۔ "بھائی جان! وہ دیکھئے کون آ رہا ہے۔"

بڑے نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی تھی جو سردی میں ٹھٹھرتی، کانپتی، قدموں سے راستہ ٹٹولتی، ان کی جانب آ رہی تھی۔ جب پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اندھی ہے آنکھیں کھلی تھیں مگر اس کو سجھائی نہیں دیتا تھا، کیونکہ کھمبے کے ساتھ وہ ٹکراتے

ٹکراتے بچی تھی۔

بڑے نے غور سے اس کی طرف دیکھا...... جوان تھی۔ عمر یہی سولہ سترہ برس کے قریب ہوگی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی اس کا سڈول بدن جاذب توجہ تھا۔ چھوٹے نے اس سے پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہے تو؟''

اندھی نے ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''راستہ بھول گئی ہوں...... گھر سے آگ لینے کے لیے نکلی تھی۔''

بڑے نے پوچھا۔ ''تیرا گھر کہاں ہے؟''

اندھی بولی۔ ''پتا نہیں...... کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔''

بڑے نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''چل میرے ساتھ۔''

اور وہ اسے سڑک کے اس پار لے گیا جہاں اینٹوں کا پرانا بھٹہ تھا جو ویرانے کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔ اندھی سمجھ گئی کہ اس کو راستہ بتانے والا اسے کس راستے پر لے جارہا ہے۔ مگر اس نے کوئی مزاحمت نہ کی...... شاید وہ ایسے راستوں پر کئی مرتبہ چل چکی تھی۔

بڑا خوش تھا کہ چلو وقت دور کرنے کا سامان مل گیا۔ کسی کی مداخلت کا کھٹکا بھی نہیں تھا۔ اوور کوٹ اتار کر اس نے زمین پر بچھایا اور وہ اور اندھی دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اندھی جنم کی اندھی نہیں تھی۔ فسادات سے پہلے وہ اچھی بھلی تھی لیکن جب سکھوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تو بھگدڑ میں اس کے سر پر گہری چوٹ لگی جس کے باعث اس کی بصارت چلی گئی۔

بڑے نے اوپرے دل سے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کو اس کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دو روپے جیب سے نکال کر اس نے اس کی ہتھیلی پر رکھے اور کہا۔ ''کبھی کبھی ملتی رہا کرنا...... میں تمہیں کپڑے بھی بنوا دوں گا۔''

اندھی بہت خوش ہوئی۔ بڑے نے جب اس کو اپنی روشن آنکھوں اور پھرتیلے ہاتھوں سے اچھی طرح ٹٹولا تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس کی کوفت کافی حد تک دور ہو گئی لیکن ایک دم اسے اپنے چھوٹے بھائی کی بھنچی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''بھائی جان...... بھائی جان!''

بڑے نے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

چھوٹا سامنے آیا۔ بڑے خوف زدہ لہجے میں اس نے کہا۔ ''دو سپاہی آ رہے ہیں۔''

بڑے نے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اپنا اوورکوٹ کھینچا جس پر اندھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جھٹکے سے وہ اس خندق میں گر پڑی جس میں سے پکی ہوئی اینٹیں نکالی گئی تھیں۔ گرتے وقت اس کے منہ سے بلند چیخ نکلی۔ مگر دونوں بھائی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

چیخ سن کر سپاہی آئے تو انہوں نے بے ہوش اندھی کو خندق میں سے باہر نکالا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا...... تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے سپاہیوں کو دیکھنا شروع کیا جیسے وہ بھوت ہیں...... پھر ایک دم دیوانہ وار چلانے لگی۔

''میں دیکھ سکتی ہوں...... میں دیکھ سکتی ہوں...... میری نظر واپس آ گئی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔ اس کے ہاتھ سے جو دو روپے گرے وہ سپاہیوں نے اٹھا لیے۔

پیرن

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بے حد مفلس تھا۔ بمبئی میں نو روپے ماہوار کی ایک کھولی میں رہتا تھا جس میں پانی کا نل تھا نہ بجلی۔ ایک نہایت ہی غلیظ کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر سے ہزار ہا کھٹمل میرے اوپر گرا کرتے تھے۔ چوہوں کی بھی کافی بہتات تھی...... اتنے بڑے چوہے میں نے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ بلیاں ان سے ڈرتی تھیں۔

چالی یعنی بلڈنگ میں صرف ایک غسل خانہ تھا۔ جس کے دروازے کی کنڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ صبح سویرے چالی کی عورتیں پانی بھرنے کے لیے اس غسل خانے میں جمع ہو جاتی تھیں۔ یہودی، مرہٹی، گجراتی، کرچین...... بھانت بھانت کی عورتیں۔

میرا یہ معمول تھا کہ ان عورتوں کے اجتماع سے بہت پہلے غسل خانے میں جاتا دروازہ بھیڑتا اور نہانا شروع کر دیتا۔ ایک روز میں دیر سے اٹھا۔ غسل خانے میں پہنچ کر نہانا شروع کیا تو تھوڑی دیر کے بعد کھٹ سے دروازہ کھلا۔ میری پڑوسن تھی۔ بغل میں گاگر دبائے۔ اس نے معلوم نہیں کیوں ایک لحظے کے لیے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر ایک دم پلٹی۔ گاگر اس کی بغل سے پھسلی اور فرش پر لڑھکنے لگی .... ایسی بھاگی جیسے کوئی شیر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ میں بہت ہنسا اٹھ کر دروازہ بند کیا اور نہانا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازہ کھلا۔ برج موہن تھا۔ میں نہا کے فارغ ہو چکا

تھا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ''بھئی منگو آج اتوار ہے۔''

مجھے یاد آ گیا کہ برج موہن کو باندرہ جانا تھا، اپنی دوست پیرن سے ملنے کے لیے وہ ہر اتوار کو اس سے ملنے جاتا تھا۔ وہ ایک معمولی شکل و صورت کی پارسی لڑکی تھی جس سے برج موہن کا معاشقہ قریباً تین برس سے چل رہا تھا۔

ہر اتوار کو برج موہن مجھ سے آٹھ آنے ٹرین کے کرائے کے لیے لیتا۔ پیرن کے گھر پہنچتا۔ دونوں آدھے گھنٹے تک آپس میں باتیں کرتے۔ برج موہن السٹریٹڈ ویکلی کے کراس ورڈ پزل کے حل اس کو دیتا اور چلا آتا۔ وہ بیکار تھا۔ سارا دن سر نیوڑھائے یہ پزل اپنی دوست پیرن کے لیے حل کرتا رہتا تھا۔ اس کو چھوٹے چھوٹے کئی انعام مل چکے تھے مگر وہ سب پیرن نے وصول کیے تھے۔ برج موہن نے ان میں سے ایک دمڑی بھی اس سے نہ مانگی تھی۔

برج موہن کے پاس پیرن کی بے شمار تصویریں تھیں۔ سلوار قمیض میں، چست پاجامے میں، ساڑھی میں، فراک میں، بیدنگ کسٹیوم میں، فینسی ڈریس میں...... غالباً سو سے اوپر ہونگی۔ پیرن قطعاً خوبصورت نہیں تھی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بہت ہی ادنیٰ شکل و صورت کی تھی لیکن میں نے اپنی اس رائے کا اظہار برج موہن سے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پیرن کے متعلق کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیا کرتی ہے، برج موہن سے اس کی ملاقات کیسے ہوئی، عشق کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ کیا وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ برج موہن نے بھی اس کے بارے میں مجھ سے کچھ بات چیت نہ کی تھی۔ بس ہر اتوار کو وہ ناشتے کے بعد مجھ سے آٹھ آنے کرائے کے لیتا اور اس سے ملنے کے لیے باندرہ روانہ ہو

جاتا اور دوپہر تک لوٹ آتا۔

میں نے کھولی میں جا کر اس کو آٹھ آنے دیئے، وہ چلا گیا۔ دوپہر کو لوٹا تو اس نے خلاف معمول مجھ سے کہا۔ "آج معاملہ ختم ہو گیا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "کون سا معاملہ؟ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس معاملے کی بات کر رہا ہے۔"

برج موہن نے، جیسے اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو، مجھ سے کہا۔ "پیرن سے آج دو ٹوک فیصلہ ہو گیا ہے...... میں نے اس سے کہا۔ جب بھی تم سے ملنا شروع کرتا ہوں مجھے کوئی کام نہیں ملتا۔ تم بہت منحوس ہو۔ اس نے کیا بہتر ہے، ملنا چھوڑ دو دیکھوں گی تمہیں کیسے کام ملتا ہے۔ میں منحوس ہوں مگر تم اول درجے کے نکھٹو اور کام چور ہو...... سو اب یہ قصہ ختم ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے انشاء اللہ کل ہی مجھے کام مل جائے گا صبح تم مجھے چار آنے دینا۔ میں سیٹھ نانو بھائی سے ملوں گا، وہ مجھے ضرور اپنا اسسٹنٹ رکھ لے گا۔"

یہ سیٹھ نانو بھائی جو فلم ڈائریکٹر تھا متعدد مرتبہ برج موہن کو ملازمت دینے سے انکار کر چکا تھا۔ کیونکہ اس کا بھی پیرن کی طرح یہی خیال تھا کہ وہ کام چور اور نکما ہے لیکن دوسرے روز جب برج موہن مجھ سے چار آنے لے کر گیا تو دوپہر کو اس نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ سیٹھ نانو بھائی نے بہت خوش ہو کر اسے ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا ہے۔ کنٹریکٹ ایک برس کا ہے جس پر دستخط ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے نکالے اور مجھے دکھائے۔ "یہ ایڈوانس ہے...... جی تو میرا چاہتا ہے کہ کنٹریکٹ اور سو روپے لے کر باندرہ جاؤں

اور پیرن سے کہوں کہ لو دیکھو، مجھے کام مل گیا ہے، لیکن ڈر ہے کہ نانو بھائی مجھے فوراً جواب دے دے گا...... میرے ساتھ ایک نہیں کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ ادھر ملازمت ملی، ادھر پیرن سے ملاقات ہوئی...... معاملہ صاف۔ کسی نہ کسی بہانے مجھے نکال باہر کیا گیا۔ خدا معلوم اس لڑکی میں یہ نحوست کہاں سے آ گئی۔ اب میں کم از کم ایک برس تک اس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔ میرے پاس کپڑے بہت کم رہ گئے ہیں۔ ایک برس لگا کر کچھ بنوا لوں تو پھر دیکھا جائے گا۔‘‘

چھ مہینے گزر گئے۔ برج موہن برابر کام پر جا رہا تھا۔ اس نے کئی نئے کپڑے بنوا لیے تھے۔ ایک درجن رومال بھی خرید لیے تھے۔ اب وہ تمام چیزیں اس کے پاس تھیں جو ایک کنوارے آدمی کے آرام و آسائش کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

ایک روز اسٹوڈیو گیا ہوا تھا کہ اس کے نام ایک خط آیا۔ شام کو جب وہ لوٹا تو میں اسے یہ خط دینا بھول گیا۔ صبح ناشتے پر مجھے یاد آیا تو میں نے یہ خط اس کے حوالے کر دیا۔ لفافہ پکڑتے ہی وہ زور سے چیخا۔ ’’لعنت!‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’کیا ہوا؟‘‘

’’وہی پیرن...... اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے چمچ سے لفافہ کھولا خط کا کاغذ نکالا اور مجھ سے کہا۔ ’’وہی کم بخت ہے...... میں کبھی اس کا ہینڈ رائٹنگ بھول سکتا ہوں۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’کیا لکھتی ہے؟‘‘

’’میرا سر...... کہتی ہے مجھ سے اس اتوار کو ضرور ملو۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر برج موہن نے خط لفافے میں ڈالا اور جیب میں رکھ لیا۔ ’’لو بھئی منٹو، نوکری

سے انشاء اللہ کل ہی جواب مل جائے گا۔‘‘

’’کیا بکواس کرتے ہو؟‘‘

موہن نے بڑے وثوق سے کہا۔ ’’نہیں منٹو تم دیکھ لینا۔ کل اتوار ہے۔ پرسوں نانو بھائی کو ضرور مجھ سے کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہو گی اور وہ مجھے فوراً نکال باہر کرے گا۔‘‘

میں نے اس سے کہا۔ ’’اگر تمہیں اتنا وثوق ہے تو مت جاؤ اس سے ملنے۔‘‘

’’یہ نہیں ہو سکتا...... وہ بلائے تو مجھے جانا ہی پڑتا ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’ملازمت کرتے کرتے کچھ میں بھی اکتا چکا ہوں...... چھ مہینے سے اوپر ہو گئے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور چلا گیا۔

دوسرے روز ناشتہ کر کے وہ باندرہ چلا گیا۔ پیرن سے ملاقات کر کے لوٹا۔ تو اس نے اس ملاقات کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

’’مل آئے اپنے منحوس ستارے سے؟‘‘

’’ہاں بھئی...... اس سے کہہ دیا کہ ملازمت سے بہت جلد جواب مل جائے گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ کھاٹ پر سے اٹھا۔ ’’چلو آؤ کھانا کھا آئیں۔‘‘

ہم دونوں نے حاجی کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس دوران میں پیرن کی کوئی بات نہ ہوئی۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے صرف اتنا کہا۔ ’’اب دیکھئے کل کیا گل کھلتا ہے۔‘‘

میرا خیال تھا کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ مگر دوسرے روز برج موہن خلاف معمول

اسٹوڈیو سے جلد لوٹ آیا مجھ سے ملا تو خوب زور سے ہنسا ''چھٹی منٹو بھائی۔''

میں نے سمجھا مذاق کر رہا ہے: ''ہٹاؤ جی۔''

''جو ہٹنا تھا وہ تو ہٹ گیا...... اب میں کیسے ہٹاؤں...... سیٹھ نانو بھائی پر آنچ آ گئی ہے...... اسٹوڈیو سیل ہو گیا ہے۔ میری وجہ سے خوامخواہ بچارے نانو بھائی پر بھی آفت آئی۔'' یہ کہہ کر برج موہن پھر ہنسنے لگا۔

میں نے صرف اتنا کہا۔ ''یہ عجیب سلسلہ ہے۔''

''دیکھ لو...... اسے کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔'' برج موہن نے سگریٹ سلگایا اور کیمرہ اٹھا کر باہر گھومنے چلا گیا۔

برج موہن اب بیکار تھا۔ جب اس کی جمع پونجی ختم ہو گئی تو اس نے ہر اتوار کو پھر مجھ سے باندرہ جانے کے لیے آٹھ آنے مانگنے شروع کر دیئے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں آدھ پون گھنٹے میں وہ پیرن سے کیا باتیں کرتا تھا۔ ویسے وہ بہت گفتگو کرنے والا تھا۔ مگر اس لڑکی سے جس کی نحوست کا اس کو مکمل طور پر یقین تھا وہ کس قسم کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔ ''برج کیا پیرن کو بھی تم سے محبت ہے؟''

''نہیں، وہ کسی اور محبت کرتی ہے۔''

''تم سے کیوں ملتی ہے؟''

''اس لیے کہ میں ذہین ہوں، اس کے بھدے چہرے کو خوبصورت بنا کر پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے کراس ورڈ پزل حل کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اس کو انعام بھی دلوا دیتا ہوں...... منٹو تم نہیں جانتے ان لڑکیوں کو۔ میں خوب پہچانتا ہوں انہیں

......جس سے وہ محبت کرتی ہے، اس میں جو کمی ہے، مجھ سے مل کر پوری کر لیتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ "بڑی چار سو بیس ہے۔"

میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ "مگر تم کیوں اس سے ملتے ہو؟"

برج موہن ہنسا، چشمے کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اس نے کہا۔ "مجھے مزہ آتا ہے۔"

"کس بات کا۔"

"اس کی نحوست کا...... میں اس کا امتحان لے رہا ہوں۔ اس کی نحوست کا امتحان...... یہ نحوست اپنے امتحان میں پوری اتری ہے۔ میں نے جب بھی اس سے ملنا شروع کیا، مجھے اپنے کام سے جواب ملا...... اب میری ایک خواہش ہے کہ اس کے منحوس اثر کو چکمہ دے جاؤں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

برج موہن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "میرا یہ جی چاہتا ہے کہ ملازمت سے جواب ملنے سے پہلے ملازمت سے علیحدہ ہو جاؤں، یعنی خود اپنے آقا کو جواب دے دوں۔ ان سے بعد میں کہوں، جناب مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے برطرف کرنے والے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کو زحمت نہ دی اور خود علیحدہ ہو گیا اور آپ مجھے برطرف نہیں کر رہے تھے۔ یہ میری دوست چیرن تھی جس کی ناک کیمرے میں اس طرح گھستی ہے جیسے تیر!"

برج موہن مسکرایا۔ "یہ میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے، دیکھو پوری ہوتی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا۔ ''عجیب و غریب خواہش ہے۔''

''میری ہر چیز عجیب و غریب ہوتی ہے...... پچھلے اتوار میں نے پیرن کے اس دوست کے لیے جس سے وہ محبت کرتی ہے، ایک فوٹو تیار کر کے دیا۔ الو کی دم اسے کمپی ٹیشن میں بھیجے گا...... یقینی طور پر انعام ملے گا اسے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

برج موہن واقعی عجیب و غریب آدمی تھا۔ وہ پیرن کے دوست کو کئی بار فوٹو تیار کر کے دے چکا ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی میں یہ فوٹو اس کے نام سے چھپتے تھے اور پیرن بہت خوش ہوتی تھی۔ برج موہن ان کو دیکھتا تھا تو مسکرا دیتا تھا۔ وہ پیرن کے دوست کے شکل صورت سے ناآشنا تھا۔ پیرن نے برج موہن سے اس کی ملاقات تک نہ کرائی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کسی مل میں کام کرتا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔

ایک اتوار کو برج باندرہ سے واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''لو بھئی منٹو! آج معاملہ ختم ہو گیا۔''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''پیرن والا؟''

''ہاں بھئی...... کپڑے ختم ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ یہ سلسلہ ختم کرو...... اب انشاء اللہ دنوں ہی میں کوئی نہ کوئی ملازمت مل جائے گی...... میرا خیال ہے۔ سیٹھ نیاز علی سے ملوں اس نے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا ہے...... کل ہی جاؤں گا۔ تم یار ذرا اس کے دفتر کا پتا لگا لینا۔''

میں نے اس کے دفتر کا نیا فون ایک دوست سے پوچھ کر برج موہن کو بتا دیا۔ وہ دوسرے روز وہاں گیا۔ شام کو لوٹا۔ اس کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''لو

بھئی منٹو!" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔ "ایک پکچر کا کنٹریکٹ تنخواہ دو سو روپے ماہوار۔ کم ہے، لیکن سیٹھ ناز نے کہا ہے، بڑھا دوں گا...... ٹھیک ہے۔"

میں ہنسا۔ "اب پیرن سے کب ملو گے؟"

برج موہن مسکرایا۔ "کب ملوں گا؟ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اس سے کب ملنا چاہیے...... منٹو یار! میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک میری چھوٹی سی خواہش ہے، بس وہ پوری ہو جائے...... میرا خیال ہے مجھے اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ذرا میرے تین چار جوڑے بن جائیں۔ پچاس روپے ایڈوانس لے آیا ہوں پچیس تم رکھ لو۔"

پچیس میں نے لیے۔ ہوٹل والے کا قرض تھا جو فوراً چکا دیا گیا۔ ہمارے دن بڑی خوشحالی میں گزرنے لگے۔ سو روپیہ ماہوار میں کما لیتا تھا۔ دو سو روپے ماہانہ برج موہن لے آتا تھا۔ بڑے عیش تھے۔ پانچ مہینے گزر گئے کہ اچانک ایک روز پیرن کا خط برج موہن کو وصول ہوا۔ "لو بھئی منٹو! عزرائیل صاحب تشریف لے آئے۔"

صحیح بات ہے کہ میں نے اس وقت خط دیکھ کر خوف سا محسوس کیا مگر برج موہن نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ خط کا کاغذ نکال کر پڑھا۔ بالکل مختصر تحریر تھی۔ میں نے برج سے پوچھا۔ "کیا فرماتی ہیں؟"

"فرماتی ہیں۔ اتوار کو مجھ سے ضرور ملو۔ ایک اشد ضروری کام ہے۔" برج موہن نے خط لفافے میں واپس ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

میں نے اس پوچھا۔ ''جاؤ گے؟''

''جانا ہی پڑے گا............ ''پھر اس نے یہ فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔

''مت بھول مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا''

میں نے اس سے کہا۔ ''برج مت جاؤ اس سے ملنے...... بڑے اچھے دن گزر رہے ہیں ہمارے...... تم نہیں جانتے، میں خدا معلوم کس طرح تمہیں آٹھ آنے دیا کرتا تھا۔''

اتوار کو برج، پیرن سے ملنے باندرہ گیا۔ واپس آیا تو اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ ''میں نے اس سے کہا، یہ بارہویں مرتبہ ہے کہ مجھے تمہاری نحوست کی وجہ سے برطرف ہونا پڑے گا...... تم پر رحمت ہو زرتشت کی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس نے یہ سن کر کچھ کہا۔''

برج نے جواب دیا۔ ''فقط یہ...... تم سلی ایڈیٹ ہو۔''

''تم ہو؟''

''سو فیصدی!'' یہ کہہ کر برج ہنسا۔ ''اب میں کل صبح دفتر جاتے ہی استعفیٰ پیش کر دینے والا ہوں۔ میں نے وہیں پیرن کے ہاں لکھ لیا تھا۔''

برج موہن نے مجھے استعفیٰ کا کاغذ دکھایا۔ دوسرے روز خلافِ معمول اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ مجھے ہی بالآخر اس سے پوچھنا پڑا۔ ''کیوں برج کیا ہوا؟''

اس نے بڑی ناامیدی سے سر ہلایا۔ ''کچھ نہیں یار...... سارا قصہ ہی ختم ہو

گیا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے سیٹھ نیاز علی کو اپنا استعفیٰ پیش کیا تو اس نے مسکرا کر مجھے ایک آفیشل خط دیا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ میری تنخواہ پچھلے مہینے سے دو سو کے بجائے تین سو روپے ماہوار کر دی گئی ہے۔''

پیرن سے برج موہن کی دلچسپی ختم ہوگئی اس نے مجھ سے ایک روز کہا۔

''پیرن کی نحوست ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہوگئی...... اور میرا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ بھی ختم ہوگیا۔ اب کون مجھے بیکار رکھنے کا موجب ہوگا۔''

ترقی پسند

جوگندر سنگھ کے افسانے جب مقبول ہونا شروع ہوئے تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلائے اور ان کی دعوت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یوں اس کی شہرت اور مقبولیت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

جوگندر سنگھ بڑا خوش فہم انسان تھا۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلا کر اور ان کی خاطر تواضع کرنے کے بعد جب وہ اپنی بیوی امرت کور کے پاس بیٹھتا تو کچھ دیر کے لیے بالکل بھول جاتا کہ اس کا کام ڈاکخانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اپنی تین گزی پٹیالہ فیشن کی رنگی ہوئی پگڑی اتار کر جب وہ ایک طرف رکھ دیتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے لمبے لمبے کالے گیسوؤں کے نیچے جو چھوٹا سا سر چھپا ہوا ہے اس میں ترقی پسند ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس احساس سے اس کے دل و دماغ میں ایک عجب قسم کی ہمت پیدا ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتا کہ دنیا میں جس قدر افسانہ نگار اور ناول نویس موجود ہیں۔ سب کے سب اس کے ساتھ ایک نہایت ہی لطیف رشتے کے ذریعے سے منسلک ہیں۔

امرت کور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا خاوند لوگوں کو مدعو کرنے پر اس سے ہر بار یہ کیوں کہا کرتا ہے۔ ''امرت! یہ جو آج چائے پر آرہے ہیں ہندوستان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ سمجھیں، بہت بڑے شاعر! دیکھو ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہے۔''

آنے والا کبھی ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہوتا تھا یا بہت بڑا افسانہ نگار اس سے کم پایہ کا کوئی آدمی وہ کبھی بلاتا ہی نہیں تھا اور پھر دعوت میں اونچے اونچے سروں میں جو باتیں ہوتی تھیں ان کا مطلب ہو آج تک نہ سمجھ سکی تھی۔ ان گفتگوؤں میں ترقی پسندی کا ذکر عام ہوتا تھا۔ اس ترقی پسندی کا مطلب بھی امرت کور کو معلوم نہیں ہوا تھا۔

ایک دفعہ جب جوگندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آ کر بیٹھا تو امرت کور نے پوچھا۔ ''یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟''

جوگندر سنگھ نے پگڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا۔ ''ترقی پسندی...... اس کا مطلب تم فوراً ہی نہیں سمجھ سکو گی۔ ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔ انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار، یعنی کہانیاں لکھنے والے، جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہوں۔ ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں جن میں میرا نام بھی شامل ہے۔''

جوگندر سنگھ عادتاً انگریزی لفظوں اور جملوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت پک کر اب طبیعت بن گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ بلا تکلف ایک ایسی انگریزی زبان میں سوچتا تھا جو چند مشہور انگریزی ناول نویسوں کے اچھے اچھے چست فقروں پر مشتمل تھی۔ عام گفتگو میں وہ پچاس فیصد انگریزی لفظ اور انگریزی کتابوں سے چنے ہوئے فقرے استعمال کرتا تھا۔ افلاطون کو وہ

ہمیشہ پلیٹو کہتا تھا۔ اسی طرح ارسطو کو ارسٹوٹل۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ، شوپنہار اور نطشے کا ذکر وہ اپنی ہر معرکے کی گفتگو میں کیا کرتا تھا۔ عام بات چیت میں وہ ان فلسفیوں کا نام نہیں لیتا تھا اور بیوی سے گفتگو کرتے وقت وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا کہ انگریزی لفظ اور یہ فلسفی نہ آنے پائیں۔

جوگندر سنگھ سے جب اس کی بیوی نے ترقی پسندی کا مطلب سمجھا تو اسے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ترقی پسندی کوئی بہت بڑی چیز ہوگی۔ جس پر بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اس کے خاوند کے ساتھ مل کر بحث کرتے رہتے ہیں لیکن جب اس نے یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں تو اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔ یہ چمک دیکھ کر جوگندر سنگھ کے مونچھوں بھرے ہونٹ ایک دبی دبی سی مسکراہٹ کے باعث کپکپائے۔

"امرت............ تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا آدمی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے میرے افسانے پڑھے ہیں اور بہت پسند کیے ہیں۔"

امرت کور نے پوچھا۔ "یہ بڑا آدمی کوی ہے یا آپ کی طرح کہانیاں لکھنے والا۔"

جوگندر سنگھ نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "یہ آدمی کوئی بھی ہے۔ افسانہ نگار بھی ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی جو اس کی نہ مٹنے والی شہرت کا باعث ہے اور رہی ہے۔"

"وہ خوبی کیا ہے؟"

"وہ ایک آوارہ گرد ہے۔"

"آوارہ گرد؟"

"ہاں...... وہ ایک آوارہ گرد ہے جس نے آوارہ گردی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہے...... وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے...... کبھی کشمیر کی ٹھنڈی وادیوں میں ہوتا ہے اور کبھی ملتان کے تپتے ہوئے میدانوں میں...... کبھی لنکا میں کبھی تبت میں......"

امرت کور کی دلچسپی بڑھ گئی۔ "مگر یہ کرتا کیا ہے؟"

"گیت اکٹھے کرتا ہے...... ہندوستان کے ہر حصے کے گیت...... پنجابی، گجراتی، مرہٹی، پشاوری، سرحدی، کشمیری، مارواڑی...... ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کے جتنے گیت اس کے ملتے ہیں اکٹھے کرلیتا ہے۔"

"اتنے گیت اکٹھے کرکے کیا کرے گا۔"

"کتابیں چھاپتا ہے، مضمون لکھتا ہے تاکہ دوسرے بھی یہ گیت سن سکیں۔ انگریزی زبان کے کئی رسالوں میں اس کے مضمون چھپ چکے ہیں۔ گیت اکٹھے کرنا اور پھر ان کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے امرت بہت بڑا آدمی ہے اور دیکھو اس نے مجھے خط کیسا لکھا ہے۔"

یہ کہہ کر جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کو وہ خط پڑھ کر سنایا جو ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے اس کو اپنے گاؤں سے ڈاکخانہ کے پتے سے بھیجا تھا۔ اس خط میں ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے بڑی میٹھی زبان میں جوگندر سنگھ کے افسانوں کی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ آپ ہندوستان کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ جب یہ فقرہ جوگندر سنگھ نے

پڑھا تو بول اٹھا۔ ''لو دیکھو ترپاٹھی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں۔''

جوگندر سنگھ نے پورا خط سنانے کے بعد ایک دو سیکنڈ اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اثر معلوم کرنے کے لیے پوچھا۔ ''کیوں؟''

امرت کور اپنے خاوند کی تیز نگاہی کے باعث کچھ جھینپ سی گئی اور مسکرا کر کہنے لگی۔ ''مجھے کیا معلوم............ بڑے آدمیوں کی باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں۔''

جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کی اس ادا پر غور نہ کیا۔ وہ دراصل ہرندرناتھ ترپاٹھی کو اپنے یہاں بلانے اور اسے کچھ ٹھہرانے کی بابت سوچ رہا تھا۔ ''امرت! میں کہتا ہوں ترپاٹھی صاحب کو دعوت دے دی جائے، کیا خیال ہے تمہارا...... لیکن میں یہ سوچتا ہوں کیا پتہ ہے وہ انکار کر دے...... بہت بڑا آدمی ہے، ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔''

ایسے موقعوں پر وہ بیوی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا کرتا تھا تاکہ دعوت کا بوجھ دو آدمیوں میں بٹ جائے۔ چنانچہ جب اس نے ''ہماری'' کہا تو امرت کور نے جو اپنے خاوند جوگندر سنگھ کی طرح بے حد سادہ لوح تھی ہرندرناتھ ترپاٹھی سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ حالانکہ اس کا نام ہی اس کے لیے ناقابل فہم تھا اور یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک آوارہ گرد گیت جمع کر کر کے کیسے بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ جب اس سے یہ کہا گیا تھا کہ ہرندرناتھ ترپاٹھی گیت جمع کرتا ہے تو اسے اپنے خاوند کی ایک سنائی ہوئی بات یاد آ گئی تھی کہ ولایت میں کئی لوگ تیتریاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں اور یوں کافی روپیہ کماتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خیال کیا تھا کہ شاید ترپاٹھی صاحب نے گیت جمع کرنے کا کام ولایت کے کسی

آدمی سے سیکھا ہوگا۔

جوگندر سنگھ نے پھر اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ ''ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔''

''اس میں خوشامد کی کیا بات ہے اور بھی تو کئی بڑے آدمی آپ کے پاس آتے ہیں۔ آپ ان کو خط لکھ دیجیے، میرا خیال ہے وہ آپ کی دعوت ضرور قبول کر لیں گے اور پھر ان کو بھی تو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے...... ہاں یہ تو بتائیے کیا ان کی بیوی بچے ہیں؟''

''بیوی بچے؟'' جوگندر سنگھ نے خط کا مضمون انگریزی زبان میں سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہوں گے...... ضرور ہوں گے...... ہاں ہیں۔ میں نے ان کے ایک مضمون میں پڑھا تھا ان کی بیوی بھی ہے اور ایک بچی بھی ہے۔''

یہ کہہ کر جوگندر سنگھ اٹھا، خط کا مضمون اس کے دماغ میں مکمل ہو چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے چھوٹے سائز کا پیڈ نکالا جس پر وہ خاص خاص آدمیوں کو خط لکھا کرتا تھا اور ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے نام اردو میں دعوت نامہ لکھا۔ یہ اس مضمون کا ترجمہ تھا جو اس نے اپنی بیوی سے گفتگو کرتے وقت سوچ لیا تھا۔

تیسرے روز ہرندر ناتھ ترپاٹھی کا جواب آیا۔ جوگندر سنگھ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔ جب اس نے پڑھا کہ اس کی دعوت قبول کر لی گئی ہے تو اس کا دل اور بھی دھڑکنے لگا۔ اس کی بیوی امرت کور دھوپ میں اپنے چھوٹے بچے کے کیسوں میں دہی ڈال کر مل رہی تھی کہ جوگندر سنگھ لفافہ ہاتھ میں لے کر اس کے پاس پہنچا۔ ''انہوں نے ہماری دعوت قبول کر لی، کہتے ہیں کہ وہ لاہوریوں بھی

ایک ضروری کام سے آرہے تھے......اپنی تازہ کتاب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں ......اور ہاں......انہوں نے تم کو پرنام کہا ہے۔''

امرت کور اس احساس سے بہت خوش ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی نے جس کا کام گیت اکٹھے کرنا ہے اس کو پرنام کہا ہے۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا بیاہ ایسے آدمی سے ہوا جس کو ہندوستان کا ہر بڑا آدمی جانتا ہے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ نومبر کے پہلے دن تھے۔ جوگندر سنگھ صبح سات بجے بیدار ہو گیا اور دیر تک بستر میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ اس کی بیوی امرت کور اور اس کا بچہ دونوں لحاف میں لپٹے پاس والی چارپائی پر پڑے تھے۔ جوگندر سنگھ نے سوچنا شروع کیا۔ ترپاٹھی صاحب سے مل کر اسے کتنی خوشی ہوگی اور خود ترپاٹھی صاحب کو بھی یقیناً اس سے مل کر مسرت حاصل ہوگی۔ کیونکہ وہ ہندوستان کا جواں افکار افسانہ نویس اور ترقی پسند ادیب ہے......ترپاٹھی صاحب سے وہ ہر موضوع پر گفتگو کرے گا۔ گیتوں پر، دیہاتی بولیوں پر، افسانوں پر اور تازہ جنگی حالات پر......وہ ان کو بتائے گا کہ دفتر کا ایک محنتی کلرک ہونے پر بھی وہ کیسے اچھا افسانہ نگار بن گیا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ ڈاکخانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا انسان طبعاً آرٹسٹ ہو۔

جوگندر سنگھ کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ ڈاکخانہ میں مزدوروں کی طرح چھ سات گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی وہ اتنا وقت نکال لیتا ہے کہ ایک ماہانہ پرچہ

مرتب کرتا ہے اور دو تین پرچوں کے لیے ہر مہینے ایک افسانہ بھی لکھتا ہے۔ دوستوں کو ہر ہفتے جو لمبے چوڑے خط لکھے جاتے تھے، ان کا ذکر الگ رہا۔

دیر تک وہ بستر پر لیٹا ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے اپنی پہلی ملاقات کی ذہنی تیاریاں کرتا رہا۔ جوگندر سنگھ نے اس کے افسانے اور مضمون پڑھے تھے اور اس کا فوٹو بھی دیکھا تھا اور کسی کے افسانے پڑھ کر اور فوٹو دیکھ کر وہ عام طور پر یہی محسوس کیا کرتا تھا کہ اس نے اس آدمی کو اچھی طرح جان لیا ہے لیکن ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے معاملے میں اس کو اپنے اوپر اعتبار نہیں آتا تھا کبھی اس کا دل کہتا تھا کہ ترپاٹھی ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش ہوتا تھا جس نے کپڑوں کے بجائے اپنے جسم پر کاغذ لپیٹ رکھے ہوں اور جب وہ کاغذوں کے متعلق سوچتا تھا تو اسے انارکلی کی وہ دیوار یاد آجاتی تھی جس پر سینما کے اشتہار اوپر تلے اتنی تعداد میں چپکے ہوئے تھے کہ ایک اور دیوار بن گئی تھی۔

جوگندر سنگھ بستر پر لیٹا دیر تک سوچتا رہا کہ اگر وہ ایسا ہی آدمی نکل آیا تو اس کو سمجھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب اس کو اپنی ذہانت کا خیال آیا تو اس کی مشکلیں آسان ہو گئیں اور وہ اٹھ کر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

خط و کتابت کے ذریعے سے یہ طے ہو گیا تھا کہ ہرندر ناتھ ترپاٹھی خود جوگندر سنگھ کے مکان پر چلا آئے گا۔ کیونکہ ترپاٹھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ لاری سے سفر کرے گا یا ریلوے ٹرین سے۔ بہر حال یہ بات تو قطعی طور پر طے ہو گئی تھی کہ جوگندر سنگھ سوموار کو ڈاکخانہ سے چھٹی لے کر سارا دن اپنے مہمان کا انتظار کرے

گا۔

نہادھوکراور کپڑے بدل کر جوگندر سنگھ دیر تک باورچی خانہ میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا رہا۔ دونوں نے چائے دیر سے پی، اس خیال سے کہ شاید ترپاٹھی آ جائے لیکن جب وہ نہ آیا تو انہوں نے کیک وغیرہ سنبھال کر الماری رکھ لیے اور خود خالی چائے پی کر مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

جوگندر سنگھ باورچی خانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اس نے اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے کلپ اٹکانے شروع کیے کہ وہ نیچے کی طرف تہہ ہو جائیں تو باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاڑھی کو ویسے ہی نامکمل حالت میں چھوڑ کر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ جیسا کہ اس کو معلوم تھا سب سے پہلے اس کی نظر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کی سیاہ گھنی ڈاڑھی پر پڑی جو اس کی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ہرندر ناتھ کے ہونٹوں پر جو بڑی بڑی مونچھوں کے اندر چھپے ہوئے تھے مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کی ایک آنکھ جو قدرے ٹیڑھی تھی زیادہ ٹیڑھی ہو گئی اور اس نے اپنی لمبی لمبی زلفوں کو ایک طرف جھٹک کر اپنا ہاتھ جو کسی کسان کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا جوگندر سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

جوگندر سنگھ نے جب اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت محسوس کی اور اس کو ترپاٹھی کا وہ چرمی تھیلا نظر آیا جو حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ ''ترپاٹھی صاحب آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی

ہوئی ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆

ہرندرناتھ ترپاٹھی کو آئے اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اس کی آمد کے دوسرے روز ہی اس کی بیوی اور بچی بھی آ گئی تھیں۔ یہ دونوں ترپاٹھی کے ساتھ ہی گاؤں سے آئی تھیں مگر دو روز کے لیے مزنگ میں ایک دور کے رشتے دار کے ہاں ٹھہر گئی تھیں اور چونکہ ترپاٹھی نے اس رشتے دار کے پاس ان کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے اس نے ان کو اپنے پاس بلوا لیا تھا۔

پہلے چار دن بڑی دلچسپ باتوں میں صرف ہوئے۔ ہرندرناتھ ترپاٹھی سے اپنے افسانوں کی تعریف سن کر جوگندر بہت خوش ہوتا رہا۔ اس نے ایک مکمل افسانہ جو کہ غیر مطبوعہ تھا ترپاٹھی کو سنایا اور داد حاصل کی۔ وہ نامکمل افسانے بھی سنائے جن کے متعلق ترپاٹھی نے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ ترقی پسند ادب پر بھی بحثیں ہوتی رہیں۔ مختلف افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریاں نکالی گئیں۔ نئی اور پرانی شاعری کا مقابلہ کیا گیا۔ غرضیکہ یہ چار دن بڑی اچھی طرح گزرے اور جوگندر سنگھ ترپاٹھی کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی گفتگو کا انداز جس میں بیک وقت بچپنا اور بڑھاپا تھا جوگندر کو بہت پسند آیا۔ اس کی لمبی ڈاڑھی جو اس کی اپنی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی اس کے خیالات پر چھا گئی اور اس کی کالی کالی زلفیں جن میں دیہاتی گیتوں کی سی روانی تھی ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں۔ ڈاکخانے میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے کے دوران میں بھی ترپاٹھی کی یہ زلفیں اسے نہ بھولیں۔

چار دن میں ترپاٹھی نے جوگندر سنگھ کو موہ لیا۔ وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ میں بھی اس کی خوبصورتی نظر آنے لگی۔ بلکہ ایک بار تو اس نے سوچا۔

''اگر ان کی آنکھ میں ٹیڑھا پن نہ ہوتا تو چہرے پر یہ بزرگی کبھی پیدا نہ ہوتی۔''

ترپاٹھی کے موٹے موٹے ہونٹ جب ترپاٹھی کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ہلتے تو جوگندر ایسا محسوس کرتا کہ جھاڑیوں میں پرندے بول رہے ہیں۔ ترپاٹھی ہولے ہولے بولتا تھا اور بولتے بولتے جب وہ اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو جوگندر کے دل کو بہت راحت پہنچتی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل پر پیار سے ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔

چار روز تک جوگندر ایسی فضا میں رہا جس کو اگر وہ اپنے کسی افسانے میں بھی بیان کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا لیکن پانچویں روز ایکا ایکی ترپاٹھی نے اپنا چرمی تھیلا کھولا اور اس کو اپنے افسانے سنانے شروع کیے اور دس روز تک وہ متواتر اس کو اپنے افسانے سناتا رہا۔ اس دوران میں ترپاٹھی نے جوگندر کو کئی کتابیں سنا دیں۔

جوگندر سنگھ تنگ آ گیا۔ اب اس کو افسانوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ترپاٹھی کا چرمی تھیلا جس کا پیٹ بنیوں کی توند کی طرح پھولا ہوا تھا اس کے لیے ایک مستقل عذاب بن گیا۔ ہر روز شام کو دفتر سے لوٹتے ہوئے اسے اس بات کا کھٹکا رہنے لگا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی ترپاٹھی سے ملاقات ہو گی۔ ادھر ادھر کی چند سرسری باتیں ہوں گی، وہ چرمی تھیلا کھولا جائے اور اس کو ایک یا دو طویل افسانے سنا دیئے جائیں گے۔

جوگندر سنگھ ترقی پسند تھا۔ یہ ترقی پسندی اگر اس کے اندر نہ ہوتی تو وہ صاف

لفظوں میں ترپاٹھی سے کہہ دیتا۔ ''بس......بس......ترپاٹھی صاحب بس......بس اب مجھ میں آپ کے افسانے سننے کی طاقت نہیں رہی۔'' مگر وہ سوچتا۔ ''نہیں نہیں......میں ترقی پسند ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ دراصل یہ میری کمزوری ہے کہ اب ان کے افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہوگی......اس لیے کہ ان کے پہلے افسانے مجھے خوبیوں سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے......میں......میں......متعصب ہوگیا ہوں۔''

ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک جوگندر سنگھ کے ترقی پسند دماغ میں یہ کشمکش جاری رہی اور وہ سوچ سوچ کر اس حد تک پہنچ گیا جہاں سوچ بچار ہو ہی نہیں سکتا۔ طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آئے مگر وہ ان کی ٹھیک طور پر جانچ پڑتال نہ کرسکتا۔ اس کی ذہنی افراتفری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں بے شمار کھڑکیاں ہیں۔ اس مکان کے اندر وہ اکیلا ہے۔ آندھی آ گئی ہے، کبھی اس کھڑکی کے پٹ بجتے ہیں کبھی اس کھڑکی کے اور اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی کھڑکیوں کو ایک دم بند کیسے کرے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں آئے بیس روز ہوگئے تو اسے بے چینی محسوس ہونے لگی۔ ترپاٹھی اب شام کو نیا افسانہ لکھ کر جب اسے سناتا تو جوگندر کو ایسا محسوس ہوتا کہ بہت سی مکھیاں اس کے کانوں کے پاس بھنبھنا رہی ہیں وہ کسی اور ہی سوچ میں غرق ہوتا۔

ایک روز ترپاٹھی نے جب اس کو اپنا تازہ افسانہ سنایا۔ جس میں کسی عورت اور

مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر تھا تو یہ سوچ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا کہ پورے اکیس دن اپنی بیوی کے پاس سونے کے بجائے وہ ایک لمڈ ڈھیل کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتا رہا ہے۔ اس احساس نے جوگندر کے دل و دماغ میں ایک لمحہ کے لیے انقلاب برپا کر دیا۔ "یہ کیسا مہمان ہے کہ جونک کی طرح چمٹ کر ہی رہ گیا ہے۔ یہاں سے ملنے کا نام ہی نہیں لیتا...... اور...... اور...... میں ان کی بیوی صاحبہ کو تو بھول ہی گیا تھا اور ان کی بچی...... سارا گھر اٹھ کر یہاں چلا آیا ہے۔ ذرہ بھی خیال نہیں کہ ایک غریب آدمی کا کچومر نکل جائے گا...... میں ڈاکخانے میں ملازم ہوں صرف پچاس روپے ماہوار کماتا ہوں، آخر کب تک ان کی خاطر تواضع کرتا رہوں گا اور پھر افسانے...... اس کے افسانے جو کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے۔ میں انسان ہوں۔ لوہے کا ٹرنک نہیں ہوں جو ہر روز اس کے افسانے سنتا رہوں...... اور کس قدر غضب ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس تک نہیں گیا...... سردیوں کی یہ راتیں ضائع تو ہو رہی ہیں۔"

اکیس دنوں کے بعد جوگندر ترپاٹھی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب اس کو ترپاٹھی کی ہر چیز معیوب نظر آنے لگی۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ جس میں جوگندر پہلے خوبصورتی دیکھتا تھا اب صرف ایک ٹیڑھی آنکھ تھی۔ اس کی کالی زلفوں میں بھی اب جوگندر کو وہ ملائمی دکھائی نہیں دیتی تھی اور اس کی ڈاڑھی دیکھ کر اب وہ سوچتا تھا کہ اتنی لمبی ڈاڑھی رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں آئے پچیس دن ہو گئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت اس کے اوپر طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس

ہونے لگا جیسے وہ کبھی جوگندر سنگھ کو جانتا تھا مگر اب نہیں جانتا۔ اپنی بیوی کے متعلق وہ سوچتا۔ ”جب ترپاٹھی چلا جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا تو میری نئے سرے سے شادی ہوگی ...... میری وہ پرانی زندگی جس کو ناٹ کے طور پر لوگ استعمال کر رہے ہیں پھر عود کر آئے گی ...... میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ سو سکوں گا ...... اور ...... اور ......“

اس کے آگے جب وہ سوچتا تو جوگندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور اس کے حلق میں کوئی تلخ سی چیز پھنس جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ دوڑا دوڑا اندر جائے اور امرت کور کو جو کبھی اس کی بیوی ہوا کرتی تھی اپنے گلے سے لگا لے اور رونا شروع کر دے۔ مگر ایسا کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی کیونکہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔

کبھی کبھی جوگندر سنگھ کے دل میں یہ خیال دودھ کے ابال کی طرح اٹھتا کہ ترقی پسندی کا لحاف جو اس نے اوڑھ رکھا ہے اتار پھینکے اور چلانا شروع کر دے۔ ”ترپاٹھی! ترقی پسندی کی ایسی تیسی۔ تم اور تمہارے اکٹھے کیے ہوئے گیت سب بکواس ہیں۔ مجھے اپنی بیوی چاہیے ...... تمہاری خواہشیں تو ساری گیتوں میں جذب ہو چکی ہیں مگر میں ابھی نوجوان ہوں ...... میری حالت پر رحم کرو۔ ذرا غور تو کرو میں جو ایک منٹ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا پچیس دنوں سے تمہارے ساتھ ایک ہی لحاف میں سو رہا ہوں ...... کیا یہ ظلم نہیں۔“

جوگندر سنگھ بس گھل کے رہ جاتا۔ ترپاٹھی اس کی حالت سے بے خبر ہر روز شام کو اسے اپنا تازہ افسانہ سنا دیتا اور اس کے ساتھ لحاف میں سو جاتا۔

جب ایک مہینہ گزر گیا تو جوگندر سنگھ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ موقع پا کر غسل خانے میں وہ اپنی بیوی سے ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ڈر کے مارے کہ ترپاٹھی کی بیوی نہ آ جائے اس نے جلدی سے اس کا یوں بوسہ لیا جیسے ڈاکخانہ میں لفافوں پر مہر لگائی جاتی ہے اور کہا۔ "آج رات تم جاگتی رہنا۔ میں ترپاٹھی سے یہ کہہ کر باہر جا رہا ہوں کہ رات کے ڈھائی بجے واپس آؤں گا لیکن میں جلدی آ جاؤں گا۔ بارہ بجے...... پورے بارہ بجے میں ہولے ہولے دستک دوں گا تم چپکے سے دروازہ کھول دینا اور پھر ہم...... ڈیوڑھی بالکل الگ تھلگ ہے لیکن تم احتیاط کے طور پر وہ دروازہ جو غسل خانہ کی طرف کھلتا ہے بند کر دینا۔"

بیوی کو اچھی طرح سمجھا کر وہ ترپاٹھی سے ملا اور اس سے رخصت لے کر چلا گیا۔ بارہ بجنے میں چار سرد گھنٹے باقی تھے جن میں سے دو جوگندر سنگھ نے اپنی سائیکل پر ادھر ادھر گھومنے میں کاٹے۔ اس کو سردی کی شدت کا بالکل احساس نہ ہوا اس لیے کہ بیوی سے ملنے کا خیال کافی گرم تھا۔

دو گھنٹے سائیکل پر گھومنے کے بعد وہ اپنے مکان کے پاس میدان میں بیٹھ گیا اور محسوس کرنے لگا کہ وہ رومانی ہو گیا ہے۔ جب اس نے سرد رات کی دھندیالی خاموشی کا خیال کیا تو اسے یہ ایک جانی پہچانی چیز معلوم ہوئی۔ اوپر ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر تارے چمک رہے تھے جیسے پانی کی موٹی موٹی بوندیں جم کر موتی بن گئی ہیں۔ کبھی کبھی ریلوے انجن کی چیخ خاموشی کو چھیڑ دیتی اور جوگندر سنگھ کا افسانہ نگار دماغ یہ سوچتا کہ خاموشی بہت بڑا برف کا ڈھیلا ہے اور سیٹی کی آواز میخ ہے جو اس کے سینے میں کھب گئی ہے۔

بہت دیر تک جوگندر ایک نئے قسم کے رومان کو اپنے دل و دماغ میں پھیلاتا رہا اور رات کی اندھیاری خوبصورتیوں کو گنتا رہا۔ ایکا ایکی ان خیالات سے چونک کر اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو بارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ اٹھ کر اس نے گھر کا رخ کیا اور دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ پانچ سیکنڈ گزر گئے۔ دروازہ نہ کھلا ایک بار اس نے پھر دستک دی۔

دروازہ کھلا۔ جوگندر سنگھ نے ہولے سے کہا۔ ''امرت'' اور جب نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا تو امرت کور کے بجائے ترپاٹھی کھڑا تھا۔ اندھیرے میں جوگندر سنگھ کو ایسا معلوم ہوا کہ ترپاٹھی کی ڈاڑھی اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ زمین کو چھو رہی ہے اس کو پھر ترپاٹھی کی آواز سنائی دی۔ ''تم جلدی آ گئے ...... چلو یہ بھی اچھا ہوا میں نے ابھی ابھی ایک افسانہ مکمل کیا ہے۔ آؤ سنو۔''

تلون

بارش کا شور...... آہستہ آہستہ یہ شور شدت پکڑتا ہے۔

نیلم: (ڈرتے ہوئے لہجے میں) کھڑکی بند کر دو جمیل...... باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے...... اف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے۔

جمیل: (جلدی سے) اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری کالی زلفیں ہیں۔

نیلم: تو ڈرنا چاہیے آپ کو۔

جمیل: (ہنستا ہے) ان کالی رسیوں سے جو سانپ کی طرح بل تو کھاتی ہیں مگر ڈس نہیں سکتیں۔ (ہنستا ہے) تمہارے سر کے یہ کالے دھاگے صرف شاعروں ہی کے لیے جان بن سکتے ہیں نیلم...... ہاں تو کھڑکی کیا سچ مچ بند کر دوں...... کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے۔

نیلم: اس بھیانک رات سے زیادہ اس وقت مجھے تم سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

(کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل: خوف...... مجھ سے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے...... ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ خوف ہی تم جیسی عورتوں کو رام کر سکتا ہے...... وہ شاعر...... وہ شاعر...... کیا نام تھا اس شاعر کا۔

نیلم: تم اپنے دوست کو اتنی جلدی بھول گئے۔

جمیل: میں اسے اس کی موت کے بعد بھولا ہوں، اس لیے کہ اب اس کو یاد رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا...... اور تم تو اسے اس کی زندگی ہی میں بھول گئی تھیں۔

نیلم: خدا کے لیے...... خدا کے لیے گڑے مردے نہ اکھاڑو جمیل!

جمیل: جو تم کفنائے بغیر دفن کر چکی ہو...... نیلم واللہ اگر میں کبھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں تو مزہ آ جائے...... تمہیں اپنی اس انگوٹھی میں نگینے کی طرح نہ جڑ لوں تو میرا نام جمیل نہیں...... وہ لوگ بیوقوف تھے جو تمہارے عشق میں آہیں بھرتے مر گئے...... مجھے تعجب ہے کہ ان میں سے کسی نے تمہارا گلا کیوں نہیں کاٹ ڈالا...... یہ سفید سفید گلا جس میں تم اتنے اچھے سر نکال سکتی ہو اور ایسے راگ کا جادو جگاتی ہو۔

نیلم: تم کیوں نہیں کاٹ ڈالتے۔

جمیل: اس لیے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔

نیلم: مانتی ہوں، لیکن پھر تم مجھ سے دلچسپی کیوں لیتے ہو؟

جمیل: سیاح جب بمبئی میں آتے ہیں تو مالا بار کی پہاڑی پر وہ مقام دیکھنے کے لیے ضرور ٹھہر جاتے ہیں جہاں باؤلہ قتل کیا گیا تھا...... میں تم سے ملتا ہوں اس لیے کہ تم ایک ایسا تاریخی مقام بن گئی ہو جہاں کئی بیوقوفوں نے جان دی ہے۔

نیلم: تم چاہو تو شاعر بن سکتے ہو۔

جمیل: مگر تم چاہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتیں...... عورت اڑ کے ایک ہی راگ لے کر آتی ہے جسے وہ وقت بے وقت گاتی رہتی ہے...... بتاؤ تمہارے ساز حیات میں دھوکے اور فریب کے سوا کیا اور کوئی راگ ہے؟

نیلم: بہت سے راگ ہیں۔ جب تم مجھ سے محبت کرو گے تو سناؤں گی...... فی الحال یہ چند شعر سنو۔

جمیل: کیا اس بے وقوف شاعر کے ہیں؟

نیلم: نہیں میرے اپنے ہیں۔

(باجے پر انگلیاں چلاتی ہے اور ذیل کے شعر گاتی ہے)

زندگی ایک سرگرانی ہے
یہ مرا عالم جوانی ہے
یہ جو پلکوں پہ قطرۂ خوں ہے
تیرے اکرام کی نشانی ہے
مسکرانا جسے نصیب نہ ہو
وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے

(احمد ندیم قاسمی)

جمیل: اچھا گاتی ہو...... (گلاس میں شراب انڈیلتا ہے)...... اور یہ شراب بھی بری نہیں۔

نیلم: (آخری شعر گاتی ہے).........

ہے ان آنکھوں کا رنگ پانی میں
ورنہ کیا ہے شراب، پانی ہے

جمیل: خودستائی کا دوسرا نام عورت ہے، کیوں نیلم......؟ اور معلوم ہوتا ہے آج کسی نے تمہاری آنکھوں کی تعریف نہیں کی، جب ہی تم نے ان کا رنگ شراب

میں گھولنا پڑا...... بخدا نیلم تم بڑی دلچسپ عورت ہو۔ تمہاری پلکوں میں چھنے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے ریگستان کے کنویں یاد آ جاتے ہیں...... ہاں یہ تو بتاؤ آج تم رو کیوں رہی ہو...... اگر مجھے مرغوب کرنے کے لیے تم نے یہ آنسو بہائے ہیں تو میں کہوں گا کہ تم نے ناحق تکلیف کی...... میرے دل کی چھت ٹپکتی نہیں۔

نیلم: (باجے کے پردے چھیڑتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے)

......جمیل عورتیں روتی ہیں...... جانتے ہو عورتیں کیوں روتی ہیں۔

جمیل: کہ مرد زیادہ شراب پئیں۔ (اور شراب گلاس میں ڈالتا ہے)

نیلم: (تنگ آ کر بلند آواز میں)...... جمیل...... (ایک دم آواز دبا کر) اب میں تم سے کیا کہوں جمیل؟

جمیل: کہو کہ جمیل تم خوبصورت ہو...... تمہاری گفتگو ایسی ہے جیسے شراب کے یہ متحرک بلبلے...... تمہاری جوانی ایسی ہے جیسے اس ساز کے تنے ہوئے تار...... تم عورتوں کا...... تم حسین عورتوں کا...... کہو کیا کہو گی...... ہاں کہو کہ تم حسین عورتوں کا خواب جمیل ہو...... کہو۔ کچھ ایسا ہی کہو اور کہے چلی جاؤ...... اگر عورتیں اپنی تعریف سے خوش ہو سکتی ہیں تو کیا ایک مرد نہیں ہو سکتا...... ہاں یہ تو بتاؤ نیلم، آج تمہاری شراب سسکیاں کیوں بھر رہی ہے...... میں نے دو گھونٹ پئے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ میرے حلق سے دو آہیں نیچے اتر گئی ہیں...... یہ شراب کسی دل جلے کا تحفہ تو نہیں۔

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے۔ بارش کا شور سنائی دیتا ہے)

جمیل: کھڑکی بند کر دو نیلم...... باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمیں

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے...... اف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے۔

نیلم: اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری گفتگو ہے۔

جمیل: تو مجھ سے ڈرنا چاہیے تمہیں۔

نیلم: (ہنستی ہے) ڈرنا چاہیے ...... تمہاری ان باتوں سے جو بالکل کھوکھلی ہیں (ہنستی ہے) ان چنگاریوں سے جن میں خود بھی جلنے کی قوت نہیں۔ ہاں تو کھڑکی کیا سچ مچ بند کر دوں ...... کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے؟

جمیل: مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام مردوں کی روحیں جو تمہاری محبت کا زہر بن کر اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ آج رات اس کالی بارش میں نہا رہی ہیں ...... نیلم ذرا خیال تو کرو، اگر سچ مچ یہ روحیں تمہارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو ...... تو

نیلم: اگر تمہاری روح بھی اس قطار میں ہوئی تو شاید مجھے ایک لمحے کے لیے ٹھٹکنا پڑے۔

جمیل: کیوں؟

نیلم: اس کیوں کا جواب اس وقت دوں گی جب تمہاری روح کالی بارش میں نہائے گی اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی۔

جمیل: تم اب دلیر ہو گئی ہو۔

نیلم: تم اسے دلیری کہتے ہو مگر یہ عورت کی سب سے بڑی بزدلی ہے۔

جمیل: کیا؟

نیلم: یہی ...... یہی دلیری۔

جمیل: تمہاری باتیں اس وقت شراب کے گھونٹوں سے زیادہ مزہ دے رہی ہیں۔

نیلم: تو شراب چھوڑ دو۔ یہی پیو۔

جمیل: بخدا آج تم نے میری طبیعت خوش کردی .... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب میرے ہوش وحواس بجا نہ رہے تو چند دنوں کے لیے تم سے ضرور محبت کروں گا .... جانتی ہو محبت کسے کہتے ہیں۔

نیلم: ہوش وحواس بحال نہ رہنے کی صورت میں کسی عورت سے چند دنوں کے لیے کھیلنا۔

جمیل: تمہاری یہ باتیں کسی روز مجھے مجبور کردیں گی کہ میں ...... کہ میں ......

نیلم: .... کہو .... کہو۔

جمیل: کہ میں تمہیں ایک کتاب بنا کر اپنی الماری میں رکھ لوں ...... تم سی عورتوں کو فرصت کے وقت ضرور پڑھنا چاہیے۔

نیلم: پہلے قاعدہ تو پڑھ لیا ہوتا۔

جمیل: ہوشیار طالب علموں کے لیے ابتدائی معلومات اتنی ضروری نہیں ہوتیں۔

نیلم: ہائے تمہاری ہوشیاری .... تمہیں اس ہوشیاری پر کتنا ناز ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ہوشیاری کسی عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔

جمیل: میری ہوشمندی شاعروں کی ہوشمندی نہیں ...... ہاں یہ تو بتاؤ تم نے اس بیچارے شاعر سے اتنا برا سلوک کیوں کیا؟

نیلم: اس لیے کہ مجھ سے تمہارا سلوک اچھا نہیں تھا۔

جمیل: یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آیا۔

نیلم: اور نہ کبھی آئے گا...... اپنے گھروں میں آسانی کے ساتھ سوٹ کیسوں کا تالا کھولنے والے مرد جب کسی عورت کے دل کا تالا کھولنا چاہیں تو یہی مشکل پیش آیا کرتی ہے۔ اور وہ لوگ جو تم ایسے مشکل پسند ہوتے ہیں آسانیاں ان کے لیے دشواریاں ہوتی ہیں۔

جمیل: کون سی آسان بات سمجھنا میرے لیے دشوار ہے۔

نیلم: کہ تمہارے برے سلوک نے مجھے تمہارے شاعر دوست سے برا سلوک کرنے پر مجبور کیا۔

جمیل: کتنی آزادانہ مجبوری ہے۔

نیلم: تمہیں سیدھی سادی بات میں الجھاؤ پیدا کر کے شاید لطف آتا ہے...... لیکن یاد رکھو کسی روز تم خود ان بھول بھلیوں میں ایسے پھنسو گے کہ نکلنے کا نام نہ لو گے...... حقائق کا ہر وقت منہ چڑانا بھی اچھا نہیں۔ تم جانتے ہو...... نہیں تم محسوس کرتے ہو اس لیے کہ محسوس کرنا جاننے سے بہت بہتر ہے کہ تمہارے دوست شاعر کی محبت کو میں نے صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ تمہاری ٹھوکروں سے مجھے پیار ہو گیا تھا۔

جمیل: میں زیادہ شراب تو نہیں پی گیا۔

نیلم: نہیں تم نے صرف دو گلاس پیے ہیں...... مدہوش میں ہو رہی ہوں۔

جمیل: تو پھر کوئی حرج نہیں...... کہو کیا کہہ رہی تھیں۔ تم نے میرے شاعر

دوست کی محبت کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ میری ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا

...... ہاں پھر کیا ہوا؟

نیلم: جو ہونا تھا۔

جمیل: یعنی

نیلم: شاعروں کے سینکڑوں شعر میں ہر روز پھانکتی رہی مگر میرے دل میں محبت کی شعریت پیدا نہ ہوئی اور تمہاری خشک باتوں نے .... (کھڑکی شور کے ساتھ کھلتی ہے۔ ہوا کی تیز سیٹیاں کمرے میں پھیل جاتی ہیں۔ عباس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتا ہے۔ نیلم چیختی ہے) عباس!

عباس: (زور سے کھڑکی بند کر دیتا ہے اور فرش پر اپنے وزنی بوٹوں کے ساتھ چلتا نیلم کے پاس آ جاتا ہے) .... ہاں شاعر عباس .... مگر چیخ کیسی .... کیا پرانے دوستوں کا استقبال ایسی چیخوں سے کیا جاتا ہے؟ اور جمیل تم کیوں ڈر گئے ...... کیا میں تمہارا عزیز دوست عباس نہیں ہوں جس کے سینکڑوں شعر ہر رز پھانکنے پر بھی نیلم کے دل کا ہاضمہ درست نہیں ہوا ...... خبردار جو تم اپنی جگہ سے ہلے .... میرا پستول شعر نہیں کہتا۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے بدکلامی ہو جائے .... ہاں کہو نیلم تم کیا کہہ رہی تھیں .... جمیل کی خشک باتوں نے جمیل کی خشک باتوں نے کیا کیا۔

نیلم: (بھنچے ہوئے لہجہ میں) .... عباس تم زندہ ہو؟

عباس: مجھے خود تو یہی محسوس ہوتا ہے۔

جمیل: ریل گاڑی کے حادثہ میں تمہارے مر جانے کی افواہ ....

عباس: غلط تھی لیکن آج شب کے حادثے میں تمہارے مرجانے کی افواہ غلط نہ ہوگی۔

جمیل: تو مجھے ابھی وصیت کر دینا چاہیے اور اپنی ساری جائیداد تمہارے حق میں محفوظ کر دینا چاہیے۔

عباس: تمہاری جائیداد............ کیا ہے تمہاری جائیداد؟

جمیل: میری خشک باتیں جو تمہارے شعروں کے ساتھ مل کر شاید نیلم کا دل موہ سکیں۔

عباس: (ایک دم غصے میں آ کر)............ جو میں نہ موہ سکا۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم............ دبی زبان میں آج تم نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے اگر مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میرے دل کا بوجھ اس قدر زیادہ نہ ہوتا............ وہ بوجھ جو اب تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے گا............ میں بیوقوف ہوں...... جیسا کہ تم نیلم سے کہہ رہے تھے شاعر بے وقوف ہی ہوا کرتے ہیں مگر وہ تم جیسے غدار نہیں ہوتے......بھیڑ کی کھال میں تم جیسے چیتے نہیں ہوتے......تم......تم......اپنی طرف سے شاید ایک دلچسپ کھیل کھیلتے رہے مگر جانتے ہو تم نے مجھے بے حد دکھ پہنچایا ہے............ تم نے میری حساس روح کو پاؤں تلے روند دیا ہے............ تم نے شاعر کو تکلیف نہیں دی ایک انسان کو دکھ دیا ہے جو محبت میں گرفتار تھا............ جانتے ہو محبت کرنے والے انسانوں کی روح بہت حساس ہوتی ہے۔

جمیل: میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

عباس: لیکن اب تمہیں کرنا ہوگی۔

جمیل: کس سے؟

عباس: نیلم سے ...... اس عورت سے جس سے میں محبت کرتا ہوں ......

اس مغنیہ سے جس کے حلق سے نکلے ہوئے سروں میں اتنے برس میری روح آشیانہ بناتی رہی اور جس کے تنکے تم نے ہوائی بگولا بن کر اڑا دیئے ...... سنتے ہو اس عورت سے جس کی نسوانیت میری نرم و نازک شاعری نے بنائی ہے تم اپنی کھردری باتوں سمیت محبت کرو گے۔

جمیل: اور تم؟

عباس: میں ...... میں تمہارا تماشا دیکھوں گا۔

جمیل: تمہیں کیسے معلوم ہو گا کہ میں واقعی نیلم سے محبت کرتا ہوں۔

عباس: تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہو گا ...... اور اس سے میری محبت کا ثبوت یہ ہے کہ آج نصف شب کے بعد شاعر عباس، نیلم پر اپنی جان قربان کر دے گا۔ اس دنیا میں چلا جائے گا جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔

جمیل: دوسرے لفظوں میں مجھے اس دنیا میں جانا پڑے گا جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔

عباس: تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔

نیلم: عباس ...... خدا کے لیے عباس ایسے بے رحم نہ بنو۔

عباس: اس سے تمہاری محبت کا ثبوت لینا کوئی بے رحمی نہیں ...... میں بھی تو اس بات کا ثبوت دوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

نیلم: کیسے؟

عباس: اس گلاس میں جس میں جمیل شراب پیتا رہا ہے۔ میں زہر گھولنے لگا ہوں (گلاس کی آواز) .... پہلا گھونٹ جمیل پیے گا۔ جب زہر اس کو ہلاک کر دے گا تو دوسرا گھونٹ میں پیوں گا۔

نیلم: یہ کیسے ہو سکتا ہے عباس .... تمہارا دماغ بہک گیا ہے۔

جمیل: اور اگر میں انکار کر دوں؟

عباس: تو میرا پستول کبھی انکار نہیں کرے گا۔

جمیل: پستول کی گولی سے مرنا شاندار نہیں ...... میں زہر ہی پیوں گا مگر مجھے پہلے اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ میری موت کے بعد تمہاری موت بھی ہو گی .... کیا نیلم مجھے اس بات کا یقین دلا سکتی ہے۔

نیلم: میں .... میں .... لیکن عباس شاعر ہے۔

جمیل: تو ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے عباس زہر پیے اور اس دنیا کا دروازہ کھٹکھٹائے جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔ میں اس کے پیچھے آنے کا وعدہ کرتا ہوں ...... اس تھوڑے سے وقفے میں مجھے نیلم کی محبت میں گرفتار ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔

نیلم: ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سارا زہر میں ہی اپنے حلق سے نیچے اتار لوں ...... اور تم پھر سے ایک دوسرے کے دوست بن جاؤ ...... ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کر دو۔

عباس: (بلند آواز میں) نہیں ...... ہرگز نہیں ...... موت کا یہ جال میری مرضی کے مطابق پانی میں ڈالا جائے گا .... پہلے جمیل تم اس جال میں آؤ گے پھر

میں...... اور نیلم زندہ رہے گی...... اس کو زندہ رہنا پڑے گا...... جب زہر تمہارے اندر سرایت کر جائے گا اور موت کا مضبوط ہاتھ تمہیں رسی کے مانند بٹ دے گا تو نیلم کے دل پر تریڑے پڑیں گے اور میں جیوں گا۔ میں جیوں گا اور تم مرو گے (دیوانہ وار ہنستا ہے)...... ہاں ہاں تمہیں مرنا ہوگا...... میں خود مر جاؤں گا مگر زندہ ہو کر اور تم مرو گے ادھ موئے ہو کر (ہنستا ہے) برف کے ٹکڑوں سے اپنی تابانی ادھار لینے والی نیلم کے لیے آج کڑی آزمائش کا دن ہے...... اس کی آنکھوں کے سامنے آج اس کے دو چاہنے والے موت کی گہرائیوں میں اتریں گے۔

جمیل: مذاق ختم ہو چکا...... رات بہت گزر چکی ہے عباس...... میں سمجھتا ہوں کہ اب تماشے کو بند کر دینا چاہیے...... نیلم برف کی سلوں سے اپنی تابانی ادھار لیتی ہے تم ان سے تھوڑی سی سردی مانگ لو اور خدا کے لیے اس آگ کو بجھاؤ...... میں آگ تاپنے کا عادی نہیں ہوں۔

عباس: (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) صرف باتیں ہی بنانے کے عادی ہو...... تم آگ لگا سکتے ہو مگر آگ لگا کر اس کا تماشا دیکھنے کی تاب تم میں نہیں...... نیلم تمہاری ٹھوس چٹان چٹخنا شروع ہو گئی...... بس اب کچھ دم میں ریزہ ریزہ ہوا چاہتی ہے...... (ہنستا ہے)...... تمہیں عورتوں سے کھیلنا پسند ہے مگر زہر کا ایک گھونٹ تم سے نہیں پیا جاتا...... میرے دوست، عورتیں زہر سے زیادہ زہریلی ہوتی ہیں۔

جمیل: ہوں گی مگر ان کے لیے جوان سے دلچسپی لیتے ہیں۔

نیلم: عباس .... جمیل ٹھیک کہتا ہے .... اسے مجھ سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ میں اس کی دلچسپ باتوں میں دلچسپی لوں۔

عباس: کیا دلچسپ بات ہے .... اور زہر کے یہ گھونٹ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ...... کتنے پیو گے۔ میرے لیے تو ایک ہی کافی ہو گا۔

جمیل: میں نہیں پیوں گا۔

عباس: تمہیں پینا ہو گا .... (گلاس اٹھاتا ہے) ...... اسی شراب میں رہے۔ (نیلم لپک کر ہاتھ سے گلاس گرا دیتی ہے۔ عباس اس کی کلائی پکڑ لیتا ہے۔ نیلم کی چوڑیاں کھنکھناتی ہیں) .... زہر کی پڑیا واپس دے دو نیلم ...... (نیلم، عباس کی زبردست گرفت کے باعث کراہتی ہے اور کہتی ہے ''میری کلائی ٹوٹ جائے گی'') .... میرا دل ٹوٹ چکا ہے ...... لاؤ ...... یہ زہر میرے حوالے کرو۔ (نیلم کی ہلکی سے چیخ) ...... بس اب ایک طرف ہو جاؤ اور ہمارا تماشا دیکھو ...... خبردار جمیل .... اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ (گلاس اٹھاتا ہے اور اس میں زہر کی پڑیا گھولتا ہے) ...... لو ...... اس کا ایک گھونٹ پی جاؤ۔ گلاس ہاتھ میں لو ...... ورنہ ......

جمیل: (ڈرتے ہوئے لہجے میں) ...... نیلم ...... کیا سچ مچ مجھے یہ زہر پینا پڑے گا۔

نیلم: حالات کا تقاضا یہی ہے۔

جمیل: حالات کا تقاضا ...... حالات کا تقاضا ...... مجھے حالات سے کیا واسطہ ہے ...... مجھے کسی سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے ...... نیلم یہ کیا ہو رہا ہے ...... خدا کے

لیے مجھے اس موت سے بچاؤ۔

نیلم: گلاس میں سے ایک گھونٹ پی جاؤ......تم بچ جاؤ گے۔

عباس: (ہنستا ہے)

نیلم: پی جاؤ...... میرا منہ کیا دیکھتے ہو......شہد سمجھ کے پی جاؤ۔

جمیل: شہد......شہد......

عباس: (بلند آواز میں) پی جاؤ......ورنہ......

نیلم: پی جاؤ تمہیں کچھ نہ ہوگا۔

جمیل: کیسے۔ کیسے؟

عباس: پی جاؤ۔

نیلم: پی جاؤ......پی جاؤ......

عباس: بس ایک گھونٹ......باقی میری طرف بڑھا دو۔

نیلم: پی جاؤ۔ ڈرو نہیں۔

عباس: ہاں......ہاں......پی جاؤ۔

نیلم: پی جاؤ۔

جمیل: تم بھی پیو گے۔

عباس: وقت ضائع نہ کرو جمیل۔

نیلم: ڈرتے کیوں ہو۔

جمیل: (گلاس میں سے وہ پیتا ہے۔ حلق میں غرغراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پھر کھانستا ہے)

نیلم: بس اتنی سی بات تھی۔

عباس: بس اتنی سی بات تھی.......لاؤ گلاس مجھے دو.........شاباش..........

ارے تمہارا رنگ اتنی جلدی زرد کیوں ہو گیا......ابھی تو زہر تمہارے اندر ٹھیک طور سے اترا بھی نہیں۔

نیلم: گھبراؤ نہیں جمیل......حوصلہ رکھو۔

عباس: حوصلہ، ....زہر پی کر یہ کس قسم کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ لو دیکھو ....مٹھیاں بھنچنا شروع ہو گئیں۔

جمیل: عباس..........

عباس: عباس کو کیوں پکارتے ہو......اس کا نام نہ لو ورنہ تمہاری جان اٹک جائے گی۔

نیلم: پریشان کیوں ہوتے ہو جمیل......تم نہیں مرو گے۔

جمیل: نیلم......میں..........

عباس: (زور زور سے ہنستا ہے) ہاہاہا......بس پانچ منٹ میں تمہاری لاش اس فرش پر ہو گی اور مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں گی۔ تمہارے اس منحوس چہرے پر جو ابھی سے نیلا پڑ گیا ہے۔

جمیل: نیلا......تم قاتل ہو......تم میرے قاتل ہو..........میں شور مچانا شروع کر دوں گا..........میں چلانا شروع کر دوں گا..........

عباس: کچھ فائدہ نہ ہو گا......چیخنے اور چلانے سے جو کام تم کرنا چاہتے ہو وہ میں خود کرنے والا ہوں..........اس گلاس کا باقی زہر ابھی میرے اندر چلا جائے

گا......مگر تمہیں پہلے مرنا ہوگا......تم میری جانکنی کا تماشا نہیں دیکھو گے...... اس کا مزہ صرف میں لوں گا (ہنستا ہے) نیلم......ذرا اس بہادر کی حالت تو دیکھو جس کی ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا (ہنستا ہے) ہاہاہا......تم کانپ رہے ہو جمیل......تمہارا رواں رواں کانپ رہا ہے......زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا......بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو۔

جمیل: (دیوانہ وار) میں نہیں مرنا چاہتا......میں نہیں مرنا چاہتا......کوئی مجھے بچائے......کوئی مجھے بچائے۔

عباس: شریف آدمیوں کی طرح جان دو جمیل......یوں چیخو چلاؤ نہیں...... موت بہت حساس ہوتی ہے۔

جمیل: موت......موت......

نیلم: ڈرو نہیں، تم زندہ رہو گے۔

عباس: (ہنستا ہے) تم زندہ رہو گے اس لیے کہ تم اس عورت کے لیے اپنی جان دے رہے ہو (ہنستا ہے)......تمہارا رنگ اب بالکل نیلا پڑ گیا ہے...... تمہارے ہونٹ خزاں دیدہ پتوں کے مانند کانپ رہے ہیں......تمہاری آنکھیں بلبلوں کی طرح ابل رہی ہیں (ہنستا ہے) بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو ......کچھ کہنا ہو تو کہہ لو نیلم سے (ہنستا ہے) کتنا خوش ہوں......(ہنستا ہے)...... (قہقہوں کے درمیان جمیل دیوانہ وار چلاتا ہے۔ ''پانی پانی'' نیلم کہتی ہے۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے جمیل......تم تو سچ مچ مر رہے ہو'' عباس ہنستا رہتا ہے آخر میں دھڑام سے جمیل زمین پر گر پڑتا ہے......

عباس: مر گیا......لواب میں چلا............ (اسی گلاس میں سے زہر پیتا ہے اور ہونٹ چاٹتا ہے)......لوگ کہتے ہیں زہر کڑوا ہوتا ہے مگر یہ تو میٹھا تھا۔

نیلم: جمیل......جمیل............جمیل......عباس: جمیل تو سچ مچ مر گیا۔

عباس: تو کیا جھوٹ موٹ کی موت مرتا......نیلم اب اس کا ذکر نہ کرو جو مر کھپ چکا ہے۔ میرے ساتھ باتیں کرو جو ابھی مرا نہیں ہے (ہنستا ہے) موت ......موت اور زندگی میں فرق ہی کیا ہے......زندگی ایک نیند ہے جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور موت ایسی بلند ہے جس میں آنکھیں بند رہتی ہیں۔

نیلم: (آہ بھر کر) جمیل مر گیا۔

عباس: اور اب میری باری ہے......ایک مرد جس سے تمہیں محبت تھی موت کی آغوش میں جا چکا ہے......دوسرا جس کو تم سے محبت ہے جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

نیلم: تم غلط کہتے ہو......مجھے جمیل سے محبت نہیں تھی۔

عباس: پھر کس سے تھی؟

نیلم: اس کی خشک باتوں سے......تم لوگ اتنی معمولی سی بات کیوں نہیں سمجھتے ......بادلوں میں گھرے ہوئے لوگ کیا صاف آسمان کی خواہش نہیں کرتے برف کے تودوں میں دبی ہوئی چیزیں کیا سورج کی تپش کے لیے نہیں تڑپتیں ......زمین پر رہنے والے کیا تاروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتے......کیا فرشتوں نے آسمان چھوڑ کر زمین پر آنے کی غلطی نہیں کی ......شعروں کے نرم و نازک بستر سے نکل کر حقیقت کے پتھروں پر چلنے

پھرنے کی خواہش کیا دل میں پیدا نہیں ہو سکتی .... اور پھر نیلم تو ایک عورت ہے۔

عباس: عورتوں اور چڑیوں کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ اونچا رہا ہے۔

نیلم: اس لیے کہ تم شاعر زیادہ اور آدمی کم ہو ...... عباس ہر شے کو شعریت کی نظروں سے دیکھو مگر عورت کو ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھو۔

عباس: (ہنستا ہے) یہ دونوں آنکھیں اب موت ہمیشہ کے لیے میچ دے گی۔ (حیرت سے) مگر اس زہر نے مجھ پر اثر کیوں نہیں کیا ...... میں ...... میں موت کو اپنے قریب محسوس کیوں نہیں کرتا ...... میرا حلق بھی تو خشک نہیں ہوا .... میرا رنگ بھی ویسے کا ویسا ہے۔

نیلم: اس لیے کہ تم نے زہر نہیں پیا۔

عباس: (حیرت سے) زہر نہیں پیا .... جمیل کیسے مر گیا؟

نیلم: مر گیا ...... اس کی ہوشیاری اور چالاکی اس کی مدد نہ کر سکی .... حالانکہ میں نے تم دونوں کو بچانے کے لیے کوشش کی تھی .... زہر کی پڑیا کے بجائے میں نے شکر کی پڑیا بڑی پھرتی سے تمہارے ہاتھ میں دے دی تھی۔

عباس: پہیلیاں بوجھنے کے فن سے میں بالکل کورا ہوں نیلم۔

نیلم: اسی لیے تم مرے نہیں ...... اگر جمیل نے زہر پیا ہوتا تو شاید وہ نہ مرتا۔ مگر شکر نے اس پر زہر کا کام کیا ...... اب چھوڑو ان باتوں کو۔

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے۔ بارش کا شور سنائی دیتا ہے)

نیلم: کھڑکی بند کر دو عباس .... باہر رات کا اندھیرا ایسا محسوس ہوتا ہے گویا

ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے............ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیل کی روح اس کالی بارش میں نہا رہی ہے............ اف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے............

عباس: اتنی بھیانک نہیں جتنا تمہارا سفید چہرہ ہے............

(کھڑکی بند کر دیتا ہے)

تانگے والے کا بھائی

سید غلام مرتضیٰ جیلانی میرے دوست ہیں۔ میرے ہاں اکثر آتے ہیں .... گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں کافی پڑھے لکھے ہیں۔

ان سے میں نے ایک روز کہا۔

"شاہ صاحب! آپ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ تو سنایئے۔"

شاہ صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا .... "منٹو صاحب .... میری زندگی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے .... کون سا واقعہ آپ کو سناؤں۔"

میں نے ان سے کہا۔ "جو بھی آپ کے ذہن میں آجائے۔"

شاہ صاحب مسکرائے .... "آپ مجھے بڑا پرہیزگار آدمی سمجھتے ہوں گے .... آپ کو معلوم نہیں میں نے دس برس تک دن رات شراب پی ہے اور خوب کھل کھلا ہوں۔ اب چونکہ دل اچاٹ ہو گیا ہے اس لیے میں نے یہ شغل چھوڑ رکھے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کہیں آپ نے شادی تو نہیں کر لی۔"

"حضرت میں پانچ برس سے لاہور میں ہوں .... اگر میں نے شادی کی ہوتی تو آپ کو اس کی اطلاع مل جاتی۔"

"تو کیا آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔"

"جی ہاں ...."

"بڑے تعجب کی بات ہے۔"

شاہ صاحب نے ایک آہ بھری.........

"چلیے......آپ کو ایک داستان سنا دوں.........آپ اسے لکھ کر اپنے پیسے کھرے کر لیجیے گا۔"

مجھے پیسے کھرے کرنے تو تھے، پھر بھی میں نے ان سے کہا۔ "نہیں شاہ صاحب.........آپ اپنی داستان سنائیے دیکھئے اس کا افسانہ بنتا بھی ہے کہ نہیں......ویسے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں نے آپ کی داستان کو افسانے میں ڈھال لیا تو مجھے جو معاوضہ ملے گا سب کا سب آپ کا ہوگا۔"

شاہ صاحب ہنسے.........

"چھوڑو یار.........میں اپنی بیتی ہوئی زندگی کے ٹکڑوں کی قیمت وصول نہیں کرنا چاہتا......تم افسانہ نگار لوگ عجیب ذہن کے ہوتے ہو۔ داستان سن لو......باقی تم جانو......مجھے معاوضے وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔"

شاہ صاحب کے لب و لہجہ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ انہیں میری بات پسند نہیں آئی اس لیے میں نے اس کے بارے میں مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھی اور ان سے کہا.........

"آپ اپنی داستان بیان کرنا شروع کر دیں۔"

شاہ صاحب نے میرے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگایا.........

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اس لیے کہ میں نے انہیں چار پانچ برس کے عرصے میں کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا.........میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان

سے کہا۔

''شاہ صاحب آپ سگریٹ پیتے ہیں۔''

شاہ صاحب کے ہونٹوں پر جن میں سگریٹ اٹکا ہوا تھا عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''منٹو صاحب! آپ نے اپنی زندگی میں اتنے سگریٹ نہیں پیے ہوں گے جتنے میں پی چکا ہوں ...... آج آپ نے ایسی بات چھیڑ دی کہ خود بخود میرے ہاتھ آپ کے سگریٹ کیس کی طرف اٹھ گئے ...... وسکی ہے آپ کے پاس۔''

میں نے جواب دیا۔

''جی ہاں ...... ہے۔''

''تو لاؤ ...... ایک پٹیالہ پیگ ...... میں دس برس کا رکھا ہوا روزہ توڑوں گا ...... تم نے آج ایسی باتیں کی ہیں کہ میرا سارا جسم ماضی میں چلا گیا ہے۔''

میں نے اپنی الماری سے وسکی کی بوتل نکالی اور شاہ صاحب کے لیے ایک پٹیالہ پیگ بنا کر حاضر کر دیا انہوں نے ایک ہی جرعے میں گلاس خالی کر دیا آستین سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''ہاں تو اب کہانی سنو۔ لیکن یہ بوتل یہاں سے غائب کرو۔''

میں نے وسکی کی بوتل اٹھائی اور اندر جا کر الماری میں رکھ دی واپس آیا تو دیکھا شاہ صاحب دوسرا سگریٹ سلگا رہے ہیں۔

میں کرسی اٹھا کر ان کے پاس بیٹھ گیا ...... وہ مسکرائے ...... لیکن وہ مسکراہٹ کچھ زخمی سی تھی ...... انہوں نے زخمی مسکراہٹ سے کہنا شروع کیا ...... ''جو واقعہ میں

اب بیان کرنے والا ہوں...... آج سے قریب قریب دس برس پہلے کا ہے...... ہمارا حلقہ احباب زیادہ تر کھاتے پیتے اور کافی مالدار ہندوؤں کا تھا...... بڑے اچھے لوگ تھے...... ہر روز پینے پلانے کا شغل رہتا...... اس حلقے میں مجھ سے علاوہ کئی اور دوستوں کو شراب کے علاوہ عورتوں کی بھی ضرورت محسوس ہوا کرتی...... وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت پوری کرتے...... مجھ سے کہتے کہ تم بھی آؤ...... مگر میں انکار کر دیتا...... اپنی مرضی کے خلاف...... میرا دل ویسے چاہتا تھا کہ کسی عورت کی قربت نصیب ہو۔''

میں نے شاہ صاحب سے کہا۔

''آپ نے شادی کیوں نہ کر لی۔''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔

''میں نے...... سچ پوچھو تو اس کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔''

''کیوں؟''

''بس کبھی خیال ہی نہ آیا۔''

''خیر...... آپ اپنی داستان جاری رکھیے۔''

شاہ صاحب نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں دبایا۔ ''پیارے منٹو! میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کے سوا کسی اور شغل میں نہ پھنسوں...... لیکن ان کم بختوں نے آخر ایک دن مجھے آمادہ کر لیا۔ طے پایا کہ کسی دلال کے ذریعہ سے خوش شکل لونڈیا منگوائی جائے۔ ہم چار دوست فلیٹ سے باہر نکلے تو ایک تانگے والا جو کہ میرا واقف تھا۔''

مجھے دیکھ کر پکار اٹھا...... ''شاہ جی...... شاہ جی...... آؤ...... آؤ''

ہم چاروں دوست اس کے تانگے پر بیٹھ گئے...... اس وقت میں پورا پورا قائل ہو چکا تھا کہ شراب کے ساتھ عورت ضرور ہونی چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنی ساری شرافت اپنی جیب میں ڈال کے اس کے کان میں کہا۔ کہ وہ کسی لونڈیا کا بندوبست کر دے۔

جب اس نے یہ سنا تو وہ بھونچکا سا ہو کر رہ گیا...... اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں کبھی ایسی واہیات بات کروں گا...... لیکن جب میں نے اس کے کان میں پھر کہا کہ مجھے واقعی ایک لڑکی کی اشد ضرورت ہے تو اس نے بڑے ادب سے کہا۔

''شاہ جی تسیں جو حکم دیو...... بندہ حاضر اے...... ایسی تکڑی کواری کڑی لے کے آواں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔''

تانگے والا چلا گیا اور ہم واپس اپنے فلیٹ میں آ گئے شام کا وقت تھا جب وہ یہ مہم سر کرنے کے لیے گیا تھا...... ہم دیر تک انتظار کرتے رہے طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آتے تھے وہ کواری لڑکی کس قسم کی ہو گی کہیں کوئی بازاری عورت تو نہ نکل آئے۔

ہم جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو تاش کھیلنا شروع کر دی۔ رات کے بارہ بج گئے...... ہم مایوس ہو کر باہر نکلے تو دیکھا کہ تانگے والا گھوڑے کے چابک لگاتا چلا آ رہا ہے۔ پچھلی نشست پر ایک برقع پوش عورت بیٹھی تھی...... میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

تانگے والے نے مجھ سے کہا۔

"شاہ جی جو مال میں لینے گیا تھا وہ وساور چلا گیا ہے...... اب یہ دوسرا مال بڑی کوششوں سے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔"

میں نے اس کو پانچ روپے دیئے۔ پھر ہم چاروں دوست سوچنے لگے کہ اس برقع پوش عورت کو کہاں لے جائیں...... اپنے فلیٹ میں لے جانا ٹھیک نہیں تھا اس لیے کہ محلّہ داری تھی...... لوگ چہ میگوئیاں کرتے۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا...... خواہ مخواہ ایک فضیحتا ہو جاتا...... چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے دوست رحمان کے پاس چلے۔

رات کے ایک بجے کے قریب ہم اس برقع پوش عورت کے ہمراہ رحمان کے مکان پر پہنچے۔ بہت دیر تک دستک دینے کے بعد اس نے دروازہ کھولا کمبل اوڑھے تھا اسے غالباً بخار تھا۔

میں نے اس کو ساری بات دبی زبان میں بتائی تو اس نے بھی دبی زبان ہی میں کہا۔

"شاہ جی...... آپ کو کیا ہو گیا ہے...... میرا مکان حاضر ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اس مہینے کی بیس تاریخ کو میری شادی ہونے والی ہے...... میرا سالا اندر ہے...... اس کی موجودگی میں یہ سلسلہ جو آپ چاہتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے۔"

کچھ دیر...... میری سمجھ میں نہ آیا اس سے کیا کہوں...... لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس کو ڈانٹا۔

"یار تم نرے کھرے بے وقوف ہو...... اپنے سالے کو چلتا کرو...... ہم اتنی دور سے تمہارے پاس آئے ہیں...... کیا تم میں اتنی مروت بھی باقی نہیں رہی......

بیس تاریخ کو تمہاری شادی آ رہی ہے ٹھیک ہے...... لیکن آج میری شادی ہے ...... یہ میری دلہن برقع پہنے تانگے میں بیٹھی ہے...... تمہیں اپنے دوستوں کا کچھ تو خیال آنا چاہیے۔"

رحمان کو میری حالت پر کچھ ترس آ گیا...... چنانچہ اس نے اپنے سالے کو جگایا اور اس کو اپنے بخار کے لیے کوئی ضروری دوا لینے کے لیے باہر بھیج دیا شہر میں قریب قریب کیمسٹوں کی سب دکانیں بند تھیں لیکن اس نے اپنے سالے سے کہا۔

"سارے شہر کی دکانیں دیکھو جہاں سے بھی تمہیں یہ دوا ملے لے کر آؤ۔"

لڑکا برخوردار قسم کا تھا نسخہ لے کے آنکھیں ملتا چلا گیا اس غریب کو تانگہ بھی شاید نظر نہ آیا...... جس میں برقع پوش عورت بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا ...... کہ ہجوم ٹھیک نہیں ہو گا ...... معلوم نہیں میرے دوست کیا حرکتیں کریں۔ چنانچہ میں نے ان کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ وہ تانگے میں واپس ہو جائیں۔ پانچ روپے تانگے والے کو اور دے دیئے مگر اس نے برقع پوش سواری اتاری تو کہا۔

"حضور اس کی فیس تو دیتے جایئے......"

میں نے پوچھا کتنی ہے۔

"پچیس روپے۔"

میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور گن کر پانچ پانچ کے پانچ نوٹ اس کے حوالے کر دیئے اور اس برقع پوش عورت کو اپنے دوست کے مکان میں لے آیا۔

رحمان کو بخار تھا...... وہ علیحدہ کمرہ میں جا کر لیٹ گیا۔ میں بہت دیر تک اس

برقع پوش عورت سے گفتگو کرتا رہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ اپنے چہرے سے نقاب ہی ہٹایا۔

میں تنگ آ گیا۔

اس کو ٹٹولا...... تو وہ بالکل سپاٹ تھی...... آخر میں نے زبردستی اس کا برقع الٹ دیا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی...... جب دیکھا کہ وہ عورت نہیں...... ہیجڑہ تھا...... نہایت مکروہ قسم کا......

مجھے سخت غصہ آیا...... میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ کیا واہیات پن ہے۔''

اس ہیجڑے نے جس کے چہرے پر روؤں کا نیلا نیلا غبار موجود تھا بڑے نسوانی انداز میں جواب دیا۔

''میں...... میں تانگے والے کا بھائی ہوں۔''

شاہ صاحب نے اس کے بعد مجھ سے کہا۔

''منٹو صاحب اس دن کے بعد مجھے اس سلسلے سے کوئی رغبت نہیں رہی۔''

ٹوٹو

میں سوچ رہا تھا۔

دنیا کی سب سے پہلی عورت جب ماں بنی تو کائنات کا ردِعمل کیا تھا؟

دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تمتمائی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا۔ ''میں بھی خالق ہوں۔''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بالکنی سے اٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلی فون ضدی بچے کی طرح چلائے جا رہا تھا۔

ٹیلی فون بڑی مفید چیز ہے، مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس لیے کہ یہ وقت بے وقت بجنے لگتا ہے...... چنانچہ بہت ہی بددلی سے میں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر بتایا ''فورفورفائیوسیون''

دوسرے سرے سے ہلو ہلو شروع ہوئی میں جھنجھلا گیا۔ ''کون ہے؟''

جواب ملا۔ ''آیا۔''

میں نے آیاؤں کے طرزِ گفتگو میں پوچھا۔ ''کس کو مانگتا ہے؟''

''میم صاحب ہے۔''

''ہے......ٹھہرو۔''

ٹیلی فون کا ریسیور ایک طرف رکھ کر میں نے اپنی بیوی کو جو غالباً اندر سو رہی

تھی، آواز دی۔ ''میم صاحب.........میم صاحب۔''

آواز سن کر میری بیوی اٹھی اور جمائیاں لیتی ہوئی آئی۔ ''یہ کیا مذاق ہے......
میم صاحب، میم صاحب!''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''میم صاحب ٹھیک ہے...... یاد ہے تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بدلے بیگم صاحبہ کہا کرو تو اس نے بیگم صاحبہ بینگن صاحبہ بنا دیا تھا۔''

ایک مسکراتی ہوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''دریافت کر لو۔''

میری بیوی نے ٹیلی فون اٹھایا اور ہلو ہلو شروع کر دیا...... میں باہر بالکنی میں چلا گیا...... عورتیں ٹیلی فون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ تک ہلو ہلو ہوتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا۔

ٹیلی فون پر ہر دو تین الفاظ کے بعد ہلو کیوں کہا جاتا ہے؟

کیا اس ہلو ہلو کے عقب میں احساسِ کمتری تو نہیں؟......... بار بار ہلو صرف اسے کرنی چاہیے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کی مہمل گفتگو سے تنگ آ کر سننے والا ٹیلی فون چھوڑ دے گا...... یا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔

دفعتاً میری بیوی گھبرائی ہوئی آئی۔ ''سعادت صاحب! اس دفعہ معاملہ بہت ہی سیریس معلوم ہوتا ہے۔''

''کون سا معاملہ۔''

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا۔ ''بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ہے...... پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے...... میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہوگی۔ بس پھسری کا بھگندر بنا ہوگا...... دونوں سر پھرے ہیں۔''

''اجی حضرت کون؟''

''میں نے بتایا نہیں آپ کو؟...... اوہ...... ٹیلی فون طاہرہ کا تھا۔''

''طاہرہ...... کون طاہرہ؟''

''مسز یزدانی۔''

''اوہ!'' میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ''کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے؟''

''نیا اور بہت بڑا...... جائیے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟''

''معلوم نہیں...... طاہرہ نے ٹیلی فون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا۔ بھائی جان! ذرا منٹو صاحب کو بلا دیجئے۔''

''خواہ مخواہ میرا مغز چاٹے گا۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور ٹیلی فون پر یزدانی سے مخاطب ہوا۔

اس نے صرف اتنا کہا۔ ''معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے...... تم اور بھابی جان ٹیکسی میں فوراً یہاں آ جاؤ۔''

میں اور میری بیوی جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے یزدانی کی طرف روانہ ہو گئے...... راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں

کیں۔

طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطا یزدانی ایک پٹھان آڑھتی کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی، پھر ڈرامہ نگاری، اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا...... طاہرہ کا باپ اپنے آٹھویں عشق میں مشغول تھا اور عطا یزدانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لیے ''بیلچہ'' نامی ڈرامہ لکھنے میں...... ایک شام پریڈ کرتے ہوئے عطا یزدانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا ...... چند ماہ تک دونوں میں نامہ و پیام جاری رہا اور آخر کو دونوں کی شادی بغیر کسی حیل حجت ہو گئی۔ عطا یزدانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔

طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی...... عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شوپنگ کو جاتی تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی...... گنجے آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو جاتی۔ ''میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماؤں گی، چاہے تم کچھ ہی کرو۔''

ذہین تھی...... ایک دفعہ اس کے پاس کوئی پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کمرے کے گرد ازار بند باندھا اور اس میں ساڑھی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔

کیا طاہرہ واقعی عطا یزدانی کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقیہ خط ملنے پر اس کا ردِعمل غالباً یہ تھا کہ کھیل دلچسپ ہے کیا ہرج ہے کھیل لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا ردِعمل کچھ

اسی قسم کا تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی، یعنی جہاں تک باعصمت ہونے کا تعلق ہے لیکن کھلنڈری اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا، میں سمجھتا ہوں ایک کھیل ہی تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ کھیل بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے۔ گلے، شکوے، طعنے مہنے، پرانے مردوں پر نئی لاشیں، نئی لاشوں پر پرانے مردے...... جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پلک نکلنے لگی۔

طاہرہ کو شکایت تھی کہ عطا اسٹوڈیو کی ایک واہیات ایکٹرس کو ٹیکسیوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔

یزدانی کا بیان تھا یہ سراسر بہتان ہے۔

طاہرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ عطا کا اس ایکٹرس سے ناجائز تعلق ہے۔ جب وہ صاف انکاری ہوا تو طاہرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا۔ ”کتنے پارسا بنتے ہو...... یہ آیا جو کھڑی ہے۔ کیا تم نے اسے چومنے کی کوشش نہیں کی تھی ...... وہ تو میں اوپر سے آ گئی۔“

یزدانی گرجا۔ ”بکواس بند کرو۔“

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہو گیا۔

میں نے سمجھایا۔ میری بیوی نے سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عطا کو تو میں نے ڈانٹا بھی۔ ”زیادتی سراسر تمہاری ہے...... معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو۔“

عطا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ''سعادت یہ قصہ یوں ختم نہیں ہوگا............ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے، لیکن میں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا............ عنایت کو جانتے ہو تم؟''

''عنایت؟''

''پلے بیک سنگر............ اس کے باپ کا شاگرد!''

''ہاں............ ہاں۔''

''اول درجے کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے............ مگر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلاتی ہے...... بہانہ یہ ہے کہ............''

طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بہانہ وہانہ کچھ نہیں...... بولو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

عطا نے انتہائی نفرت کے ساتھ کہا۔ ''کچھ نہیں۔''

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی۔ ''عنایت میرا چاہنے والا ہے...... بس............''

عطا نے گالی دی...... عنایت کو موٹی اور طاہر کو چھوٹی............ پھر شور برپا ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کچھ دہرایا گیا جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا...... میں نے اور میری بیوی نے بہت ثالثی کی مگر نتیجہ وہی صفر۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑکتے تھے اور کوئی مرئی نتیجہ پیدا کیے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے لیکن ہوتا

ہوا تا کچھ نہیں تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور طاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا...... مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک بک اور جھک جھک جاری تھی لیکن انجام خدا معلوم کہاں بھٹک رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے کہا۔ ''بھئی اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں نبھ سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔''

طاہرہ خاموش رہی لیکن عطا نے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا۔ ''علیحدگی نہیں...... طلاق۔''

طاہرہ چلائی۔ ''طلاق، طلاق، طلاق ...... دیتے کیوں نہیں طلاق ...... میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو۔''

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''دے دوں گا اور بہت جلد۔''

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر سے بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی۔ ''آج ہی دو۔''

عطا اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ ''میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔''

جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے تو اٹھ کر عطا کو روکا۔ ''بے وقوف نہ ہو...... بیٹھو آرام سے۔''

طاہرہ نے کہا۔ ''نہیں بھائی جان! آپ مت روکیے۔''

میری بیوی نے طاہرہ کو ڈانٹا۔ ''بکواس بند کرو۔''

''یہ بکواس صرف طلاق ہی سے بند ہو گی۔'' یہ کہہ کر طاہرہ ٹانگ ہلانے لگی۔

''سن لیا تم نے۔'' عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا لیکن

میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

طاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے طلاق دے کر اس چڑیل ایکٹرس سے بیاہ رچائے گا۔“

عطا نے طاہرہ سے پوچھا۔ ”اور تو؟“

طاہرہ نے ماتھے پر بالوں کے پسینے میں بھیگی ہوئی جھالر ہاتھ سے اوپر کی۔

”میں ......تمہارے اس یوسف ثانی عنایت خاں سے۔“

”بس اب پانی سر سے گزر چکا ہے ...... حد ہو گئی ہے ...... تم ہٹ جاؤ ایک طرف۔“ عطا نے ڈائریکٹری اٹھائی اور نمبر دیکھنے لگا۔ جب وہ ٹیلی فون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا لیکن نمبر نہ ملا۔ مجھے موقع ملا تو میں نے سارے پرزور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ اس پر طاہرہ نے کہا۔ ”صفیہ! تم کچھ نہ کہو...... اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے...... میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے...... اس وقت میں اس کے دل کا قرار اس کی آنکھوں کا نور تھی۔ میری زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا...... میرے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھ کر یہ بخوشی مرنے کے لیے تیار تھا...... لیکن آج اسے میری ذرہ برابر پرواہ نہیں۔“

عطا نے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔

طاہر بولتی رہی۔ ”میرے باپ کی موسیقی سے بھی اسے عشق تھا...... اس کو

فخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے۔ شادی کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے ان کے پاؤں تک داب، پر آج اسے ان کا کوئی خیال نہیں۔"

عطا ڈائل گھماتا رہا۔

طاہرہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ کو یہ بھائی کہتا ہے، آپ کی عزت کرتا ہے کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا...... لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ٹیلی فون کر رہا ہے قاضی کو...... مجھے طلاق دینے کے لیے۔"

میں نے ٹیلی فون ایک طرف ہٹا دیا۔ "عطا! اب چھوڑو بھی۔"

"نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

طاہرہ بولی۔ "جانے دیجیے بھائی جان...... اس کے دل میں میرا کیا، ٹوٹو کا بھی کچھ خیال نہیں۔"

عطا تیزی سے پلٹا۔ "نام نہ لو ٹوٹو کا۔"

طاہرہ نے نتھنے پھلا کر کہا۔ "کیوں نام نہ لوں اس کا۔"

عطا نے ریسیور رکھ دیا۔ "وہ میرا ہے۔"

طاہرہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ "جب میں تمہاری نہیں ہوں تو وہ کیسے تمہارا ہو سکتا ہے...... تم تو اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔"

عطا نے کچھ دیر سوچا۔ "میں سب بندوبست کر لوں گا۔"

طاہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھا گئی۔ "ٹوٹو کو چھین لو گے مجھ سے؟"

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں"

''ظالم۔''

طاہرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ بے ہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ میری بیوی نے اسے تھام لیا۔ عطا پریشان ہو گیا پانی کے چھینٹے یوڈی کلون، سملنگ سالٹ۔ ڈاکٹروں کو ٹیلیفون...... اپنے بال نوچ ڈالے، قمیض پھاڑ ڈالی......

طاہرہ ہوش میں آئی تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگا۔ ''جانم ٹُوٹُو تمہارا ہے...... ٹُوٹُو تمہارا ہے۔''

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔ ''نہیں وہ تمہارا ہے۔''

عطا نے طاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ ''میں تمہارا ہوں۔ تم میری ہو...... ٹُوٹُو تمہارا بھی ہے، میرا بھی ہے۔''

میں نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چل دیا...... ٹیکسی کھڑی تھی، ہم دونوں بیٹھ گئے میری بیوی مسکرا رہی تھی میں نے اس سے پوچھا ''یہ ٹُوٹُو کون ہے؟''

میری بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ان کا لڑکا۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''لڑکا؟''

میری بیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا۔ ''کب پیدا ہوا تھا...... میرا مطلب ہے......''

''ابھی پیدا نہیں ہوا...... چوتھے مہینے میں ہے۔''

چوتھے مہینے، یعنی اس واقعے کے چار مہینے بعد، میں باہر بالکنی میں بالکل خالی

الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے والا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کون تھا؟"

"یزدانی صاحب۔"

"کوئی نئی لڑائی تھی؟"

"نہیں .... طاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے .... مری ہوئی۔" یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں سوچنے لگا۔ "اگر طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ٹوٹو چکائے گا۔"

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے الجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا۔ ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ گو سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے۔ مگر اس کے قد و قامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اسی قدر کہہ سکی۔ ''ایشر سیاں۔''

ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی۔ ''ایشر سیاں'' لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی۔ ''کہاں رہے تم اتنے دن؟''

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''مجھے معلوم نہیں۔''

کلونت کور بھنا گئی۔ ''یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے؟''

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ جواب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟''

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ''کلونت!''

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔ ''ہاں جانی'' کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولہے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔''

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''ایشر سیاں کہاں رہے تم اتنے دن۔''

''برے کی ماں کے گھر۔'' ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔ ''قسم واہگورو کی بڑی جاندار عورت ہو۔''

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیئے اور پوچھا۔ ''تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے؟ شہر گئے تھے؟''

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

کلونت کور چڑ گئی۔ ''نہیں تم ضرور شہر گئے تھے .... اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔''

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا؟ اچھلے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کے لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔''

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا۔ ''دیکھا کیسے

رنگ نیلا پڑ گیا............ ایشر سیاں، قسم واہگورو کی ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟''

''تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔''

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا، بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایشر سیاں، کیا بات ہے تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟''

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تنو مند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ ''جانی میں وہی ہوں .... گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی ....''

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔ ''تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟''

''بُرے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔''

''بتاؤ گے نہیں؟''

''کوئی بات ہو تو بتاؤں۔''

مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیئے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ

کر کہا۔ ’’آ جاؤ ایک بازی تاش کی ہو جائے۔‘‘

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں، ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا۔ ’’چل دفعان ہو۔‘‘

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولہے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ’’نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔‘‘

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے پھینک دیا اور کہا۔ ’’لو پھر ہو جائے ترپ چال.........‘‘

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا۔ ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ ’’کلونت، قسم واہگورو کی بڑی کراری عورت ہے تو۔‘‘

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی۔ ’’بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں؟‘‘

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا۔ ’’ہونے دے آج ظلم۔‘‘ اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا۔ کان کی لووں کو کاٹا، ابھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولہوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے۔ گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے۔

چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔ لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیئے۔ پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے۔ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا۔ ''ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک۔''

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھیلا کر بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایشر سیاں، وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟''

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے ابلنے لگی۔ ''میں پوچھتی ہوں؟ کون ہے وہ چڈو............ کون ہے وہ الفتی............ کون ہے وہ چور پتا؟''

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کوئی بھی نہیں کلونت کوئی بھی نہیں۔''

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا۔ ''ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی.......... کھاوا ہگورو کی قسم.......... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟''

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ ''قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں.......... تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا.......... لے اب کھاوا ہگورو کی قسم.......... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟''

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی، لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کی موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی۔ ''جانے دے اب کلونت! جانے دے۔''

آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔

"میری جان! تم نے بہت جلدی کی......... لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔"

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔ "مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟"

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا، جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"اور میں......... اور میں......... بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں .... اسی کرپان سے"

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔ "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟"

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ "گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔"

کلونت چلائی۔ "میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی، بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔ "انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔"

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔ "ایشر سیاں تو مطلب کی بات کر۔"

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں زیادہ پھیل گئی ....

"مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں .... گلا چرا ہے ماں یا میرا......... اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔"

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے

لگے کلونت! میری جان .... میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا؟ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے .... شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا .... گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیئے .... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

ایشر سنگھ نے موچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا۔ ''جس مکان پر .... میں نے دھاوا بولا تھا .... اس میں سات .... اس میں سات آدمی تھے .... چھ میں نے .... قتل کر دیئے۔ .... اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے .... چھوڑ اسے .... سن ایک لڑکی تھی بہت ہی سندر .... اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔''

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے موچھوں پر سے لہو اڑایا۔ ''کلونت جانی! میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی .... میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا۔ ''نہیں'' ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔''

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا۔ ''ہوں ....''

اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔ راستے میں .... کیا کہہ رہا تھا میں؟ .... ہاں راستے میں .... نہر کی پٹڑی کے پاس، تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا .... پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں۔

یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔ ''میں نے .... میں نے پتا پھینکا .... لیکن .... لیکن''

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ ''وہ .... وہ مری ہوئی تھی .... لاش تھی .... بالکل ٹھنڈا گوشت .... جانی مجھے اپنا ہاتھ دے ....''

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

ٹیڑھی لکیر

اگر سڑک سیدھی ہو...... بالکل سیدھی ہو تو اس پر اس کے قدم منوں بھاری ہو جاتے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا یہ زندگی کے خلاف ہے۔ جو پیچ در پیچ راستوں سے بھری ہے۔ جب ہم دونوں باہر سیر کو نکلتے تو اس دوران میں وہ کبھی سیدھے راستے پر نہ چلتا۔ اسے باغ کا وہ کونا بہت پسند تھا۔ جہاں لہراتی ہوئی روشیں بنی ہوئی تھیں۔

ایک بار اس نے اپنی ٹانگوں کو سینے کے ساتھ جوڑ کر، بڑے دلکش انداز میں مجھ سے کہا تھا۔ "عباس اگر مجھے اور کوئی کام نہ ہو۔ تو بخدا میں اپنی ساری زندگی کشمیر کی پہاڑی سڑکوں پر چڑھنے اترنے میں گزار دوں...... کیا پیچ ہیں...... ابھی تم مجھے نظر آ رہے ہو اور ایک موڑ مڑنے کے بعد میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہو۔ کتنی پر اسرار چیز ہے...... سیدھے راستے پر تم ہر آنے والی چیز دیکھ سکتے ہو مگر یہاں آنے والی چیزیں تمہاری آنکھوں کے سامنے اچانک آ جائیں گی۔ موت کی طرح اچانک............ اس میں کتنا مزہ ہے۔"

وہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ بے حد دبلا۔ اس کو ایک نظر دیکھنے سے اکثر اوقات معلوم ہوتا کہ ہسپتال کے کسی بستر پر سے کوئی زرد رو بیمار اٹھ کر چلا آیا ہے۔ اس کی عمر بمشکل بائیس برس کے قریب ہو گی۔ مگر بعض اوقات وہ اس سے بہت زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اس کو دیکھ کر میں یہ خیال کرنے لگتا کہ وہ بچہ بن گیا ہے۔ اس میں ایکا ایکی اس قدر تبدیلی ہو جایا کرتی تھی کہ مجھے اپنی نگاہوں کی صحت پر شبہ ہونے لگ جاتا تھا۔

آخری ملاقات سے دس روز پہلے جب وہ مجھے بازار میں ملا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ہاتھ میں ایک بڑا سیب لیے اسے دانتوں سے کاٹ کر کھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بچوں کے مانند ایک ناقابلِ بیان خوشی کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔ اس کا سارا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ سیب بہت لذیذ ہے۔

سیب کے رس سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو بچوں کی مانند اپنی پتلون سے صاف کر کے اس نے میرا ہاتھ بڑے جوش سے دبایا اور کہا .... ''عباس وہ دو آنے مانگتا تھا مگر میں نے بھی ایک ہی آنے میں خریدا۔''

اس کے ہونٹ ظفر مندانہ ہنسی کے باعث تھرتھرانے لگے۔ پھر اس نے جیب سے ایک چیز نکالی۔ اور میرے ہاتھ میں دے کر کہا ''تم نے لٹو بہت دیکھے ہوں گے، پر ایسا لٹو کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہوگا .... اوپر کا بٹن دباؤ ...... دباؤ .... ارے دباؤ!''

میں سخت متحیر ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر لٹو کا بٹن دبا دیا۔ جو میری ہتھیلی پر سے اچھل کر سڑک پر لنگڑانے لگا ...... اس پر خوشی کے مارے میرے دوست نے اچھلنا شروع کر دیا۔

''دیکھو، عباس، دیکھو اس کا ناچ۔''

میں نے لٹو کی طرف دیکھا جو میرے سر کی مانند گھوم رہا تھا۔ ہمارے اردگرد بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میرا دوست دوائیاں بیچے گا۔

''لٹو اٹھاؤ اور چلیں ..... لوگ ہمارا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔''

میرے لہجے میں شاید تھوڑی سی تیزی تھی کیونکہ اس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی اور اس کے چہرے کی تمتماہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اٹھا اور اس نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک ننھا منا بچہ رونی صورت بنا کر کہہ رہا ہے۔ میں نے تو کوئی بری بات نہیں کی۔ پھر مجھے کیوں جھڑکا گیا ہے؟

اس نے لٹو وہیں سڑک پر چھوڑ دیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ گھر تک میں نے اور اس نے کوئی بات نہیں کی۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا...... اس قلیل میں اس کے چہرے پر انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ایک تفکر زدہ بوڑھا نظر آیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں یہ سوچ رہا ہوں۔ اگر خدا کو انسان کی زندگی بسر کرنی پڑ جائے تو کیا ہو؟''

وہ اسی قسم کی بے ڈھنگی باتیں سوچا کرتا تھا بعض لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو نرالا ظاہر کرنے کے لیے ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ بات غلط تی۔ دراصل اس کی طبیعت کا رجحان ہی ایسی چیزوں کی طرف رہتا تھا جو کسی اور دماغ میں نہیں آتی تھیں۔

آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر اس کو اپنے جسم پر رستا ہوا زخم بہت پسند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا اگر میرے جسم پر ہمیشہ کے لیے کوئی زخم بن جائے تو کتنا اچھا ہو...... مجھے درد میں بڑا مزہ آتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسکول میں ایک روز اس نے میرے سامنے اپنے

بازو کو استرے کے تیز بلیڈ سے زخمی کر دیا۔ صرف اس لیے کہ کچھ روز اس میں درد ہوتا رہے۔ ٹیکہ اس نے کبھی اس خیال سے نہیں لگوایا تھا کہ اس سے ہیضے، پلیگ یا ملیریا کا خوف نہیں رہتا اس کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ دو تین روز اس کا بدن بخار کے باعث تپتا رہے۔ چنانچہ جب کبھی وہ بخار کو دعوت دیا کرتا تھا تو مجھ سے کہا کرتا تھا۔ ''عباس میرے گھر ایک مہمان آنے والا ہے۔ اس لیے تین روز تک مجھے فرصت نہیں ملے گی۔''

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ تم آئے دن ٹیکہ کیوں لگواتے ہو اس نے جواب دیا۔ ''عباس، میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ ٹیکہ لگوانے سے جو بخار چڑھتا ہے اس میں کتنی شاعری ہوتی ہے...... جب جوڑ جوڑ میں درد ہوتا ہے اور اعضا شکنی ہوتی ہے تو بخدا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی نہایت ہی ضدی آدمی کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو...... اور پھر بخار بڑھ جانے سے جو خواب آتے ہیں۔ واللہ، کس قدر بے ربط ہوتے ہیں...... بالکل ہماری زندگی کے مانند!...... ابھی تم یہ دیکھتے ہو کہ تمہاری شادی کسی نہایت ہی حسین عورت سے ہو رہی ہے۔ دوسرے لمحے یہی عورت تمہاری آغوش میں ایک قوی ہیکل پہلوان بن جاتی ہے۔''

میں اس کی عجیب و غریب باتوں کا عادی ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود ایک روز مجھے اس کے دماغی توازن پر شبہ ہونے لگا۔ گزشتہ مئی میں میں نے اس سے اپنے استاد کا تعارف کرایا۔ جس کی میں بے حد عزت کرتا تھا۔ ڈاکٹر شاکر نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دبایا اور کہا۔ ''میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔''

''اس کے برعکس مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔'' یہ میرے دوست

کا جواب تھا۔ جس نے مجھے بے حد شرمندہ کیا۔ آپ قیاس فرمایئے کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ شرم کے مارے میں اپنے استاد کے سامنے گڑا جا رہا تھا۔ اور وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا کر ہال میں ایک تصویر دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر شاکر نے میرے دوست کی اس حالت کو برا سمجھا اور تخلیے میں مجھ سے بڑے تیز لہجے میں کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دوست کا دماغ ٹھکانے نہیں۔''

میں نے اس کی طرف سے معذرت طلب کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ میں واقعی بے حد شرمندہ تھا کہ ڈاکٹر شاکر کو میری وجہ سے ایسا سخت فقرہ سننا پڑا۔

شام کو میں اپنے دوست کے پاس گیا۔ اس ارادے کے ساتھ کہ اس سے اچھی طرح باز پرس کروں گا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں گا۔ وہ مجھے لائبریری کے باہر ملا۔ میں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا۔ ''تم نے آج ڈاکٹر شاکر کی بہت بے عزتی کی۔ معلوم ہوتا ہے تم نے مجلسی آداب کو خیر باد کہہ دیا ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''ارے چھوڑو اس قصے کو......... آؤ کوئی اور کام کی بات کریں۔''

یہ سن کر میں اس پر برس پڑا۔ خاموشی سے میری تمام باتیں سن کر اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''اگر مجھ سے مل کر کسی شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے تو ضروری نہیں کہ اس سے مل کر مجھے بھی خوشی حاصل ہو...... اور پھر پہلی ملاقات پر صرف ہاتھ ملانے سے میں نے اس کے دل میں خوشی پیدا کر دی.................. میری سمجھ میں نہیں آتا.......... تمہارے ڈاکٹر صاحب نے اس روز 25 آدمیوں سے تعارف کیا ہر شخص سے انہوں نے یہی کہا تھا کہ آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت حاصل

ہو رہی ہے............ کیا یہ ممکن ہے کہ ہر شخص ایک ہی قسم کے تاثرات پیدا کرے۔ تم مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کرو...... آؤ اندر چلیں۔"

میں ایک سحر زدہ آدمی کی طرح اس کے ساتھ ہولیا۔ اور لائبریری کے اندر جا کر اپنا سب غصہ بھول گیا۔ بلکہ یہ سوچنے لگا کہ میرے دوست نے جو کچھ کہا تھا۔ صحیح ہے لیکن فوراً ہی میرے دل مین ایک حسد سا پیدا ہوا۔ کہ اس شخص میں اتنی قوت کیوں ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بے دھڑک کر دیتا ہے۔ پچھلے دنوں میرے ایک افسر کی دادی مر گئی تھی اور مجھے اس کے سامنے مجبوراً اپنے اوپر غم کی کیفیت طاری کرنی پڑی تھی اور اس سے اپنی مرضی کے خلاف دس پندرہ منٹ تک افسوس ظاہر کرنا پڑا تھا۔ اس کی دادی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی موت کی خبر نے میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے نقلی جذبات تیار کرنے پڑتے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میرا کریکٹر اپنے دوست کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اس خیال ہی نے میرے دل میں حسد کی چنگاری پیدا کی تھی اور میں اپنے حلق میں ایک ناقابل بیان تلخی محسوس کرنے لگا تھا لیکن یہ ایک وقتی اور ہنگامی جذبہ تھا۔ جو ہوا کے ایک تیز جھونکے کے مانند آیا اور گزر گیا۔ میں بعد میں اس پر بھی نادم ہوا۔

مجھے اس سے بے حد محبت تھی لیکن اس محبت میں غیر ارادی طور پر کبھی کبھی نفرت کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر کہا تھا "یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات میں تم سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔" اور اس نے مجھے یہ جواب دے کر مطمئن کر دیا تھا۔ تمہارا دل جو میری محبت سے بھرا ہوا

ہے۔ ایک ہی چیز کو بار بار دیکھ کر کبھی کبھی تنگ آ جاتا ہے اور کسی دوسری شے کی خواہش کرنے لگ جاتا ہے......اور پھر اگر تم مجھ سے کبھی کبھی نفرت نہ کرو تو مجھ سے ہمیشہ محبت بھی نہیں کر سکتے.........انسان اس قسم کی الجھنوں کا مجموعہ ہے۔

میں اور وہ اپنے وطن سے بہت دور تھے۔ ایک ایسے بڑے شہر میں جہاں زندگی تاریک قبر سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسے کبھی ان گلیوں کی یاد نہ ستاتی تھی۔ جہاں اس نے اپنا بچپن اور اپنے شباب کا زمانہ گزارا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی شہر میں پیدا ہوا ہے۔ میرے چہرے سے ہر شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ میں غریب الوطن ہوں۔ مگر میرا دوست ان جذبات سے یکسر عاری ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ وطن کی یاد بہت بڑی کمزوری ہے۔ ایک جگہ سے خود کو چپک دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک آزادی پسند سانڈ کو کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔

اس قسم کے خیالات کے مالک کی جو ہر شے کو ٹیڑھی عینک سے دیکھتا ہو اور مروجہ رسوم کے خلاف چلتا ہو۔ باقاعدہ نکاح خوانی ہو، یعنی پرانی رسوم کے مطابق اس کا عقد عمل میں آئے تو کیا آپ کو تعجب نہ ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ ضرور ہوگا۔

ایک روز شام کو جب وہ میرے پاس آیا اور بڑے سنجیدہ انداز میں اس نے مجھے اپنے نکاح کی خبر سنائی۔ تو آپ یقین کریں کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس حیرت کا باعث یہ چیز نہ تھی کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ نہیں...... مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اس نے لڑکی بغیر دیکھے، پرانے خطوط کے مطابق نکاح کی رسم میں شامل ہونا قبول کیسے کر لیا۔ جبکہ وہ ہمیشہ ان مولویوں کا مضحکہ اڑایا کرتا تھا۔ جو لڑکی اور لڑکے کو رشتۂ ازدواج میں باندھتے ہیں؟ وہ کہا کرتا تھا ”یہ مولوی مجھے

بڈھے اور گنٹھیا کے مارے پہلوان معلوم ہوتے ہیں۔ جو اپنے اکھاڑے میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی کشتیاں دیکھ کر اپنی حرص پوری کرتے ہیں۔''

اور پھر ہو شادی یا نکاح پر لوگوں کے جمگھٹے کا بھی تو قائل نہ تھا مگر...... اس کا نکاح پڑھا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مولوی نے............ اس مولوی نے جس سے اس کو سخت چڑ تھی اور جس کو وہ بوڑھا طوطا کہا کرتا تھا اس کا نکاح پڑھا۔ چھوہارے بانٹے گئے اور میں ساری کارروائی یوں دیکھ رہا تھا گویا سوتے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔

نکاح ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں انہونی بات ہو گئی اور جو تعجب مجھے پہلے پیدا ہوا تھا بعد میں بھی برقرار رہا۔ مگر میں نے اپنے متعلق اپنے دوست سے ذکر نہ کیا۔ اس خیال سے کہ شاید اسے اس دائرے میں لوٹنا پڑا۔ جس میں دوسرے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نکاح کر کے میرا دوست اپنے اصولوں کے ٹیڑھے منارے سے بہت بری طرح پھسلا تھا اور اس گڑھے میں سر کے بل آ گرا تھا۔ جس کو وہ بے حد غلیظ کہا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ سوچا تو میرے جی میں آئی کہ اپنے کج رفتار دوست کے پاس جاؤں اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ مگر جس روز میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی اسی روز وہ دوپہر کو میرے گھر آیا۔

نکاح کو 3 مہینے گزرے گئے تھے اور اس دوران میں وہ ہمیشہ اداس رہتا تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور ناک جو چند روز پہلے بھدی نیام کے اندر چھپی ہوئی تلوار کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس پر سب سے نمایاں نظر آ رہی تھی۔

وہ میرے کمرے کے اندر داخل ہوا اور سگریٹ سلگا کر میرے پاس بیٹھ گیا اس کے ہونٹوں کے اختتامی کونے کپکپا رہے تھے۔ ظاہر تھا وہ مجھے بڑی اہم بات سنانے والا ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

اس نے سگریٹ کے دھوئیں سے چھلہ بنایا اور اس میں اپنی انگلی گاڑتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''عباس میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''جا رہے ہو؟'' میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

''میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔ شاید ہمیشہ کے لیے، میں اس خبر سے تمہیں مطلع کرنے کے لیے نہ آتا۔ مگر مجھے تم سے کچھ روپے لینا ہیں جو تم نے مجھ سے قرض لے رکھے ہیں...... کیا تمہیں یاد ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یاد ہے، پر تم جا کہاں رہے ہو............ اور پھر ہمیشہ کے لیے............؟''

بات یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے عشق ہوگیا ہے اور کل رات میں اسے بھگا کر اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں............ وہ تیار ہوگئی ہے۔

یہ سن کر مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ میں بیوقوفوں کی مانند ہنسنے لگا اور دیر تک ہنستا رہا۔ وہ اپنی منکوحہ بیوی کو جسے وہ جب چاہتا انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لا سکتا تھا۔ اغوا کر کے لے جا رہا تھا...... بھگا کر لے جا رہا تھا۔ جیسے...... جیسے...... میں کیا کہوں کہ اس وقت میں نے کیا سوچا...... دراصل میں کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔

مجھے ہنستا دیکھ کر اس نے ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"عباس، یہ ہنسنے کا موقع نہیں۔ کل رات وہ اپنے مکان کے ساتھ والے باغ میں میرا انتظار کرے گی اور مجھے سفر کے لیے کچھ روپیہ فراہم کر کے اس کے پاس ضرور پہنچنا چاہیے۔ وہ کیا کہے گی۔ اگر میں اپنے وعدہ پر قائم نہ رہا.......... تمہیں کیا معلوم، میں نے کن کن مشکلوں کے بعد رسائی حاصل کر کے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے۔"

میں نے پھر ہنسنا چاہا۔ مگر اس غایت درجہ سنجیدہ و متین دیکھ کر میری ہنسی دب گئی اور مجھے قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ واقعی اپنی منکوحہ بیوی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔ کہاں؟.......... یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

میں زیادہ تفصیل میں نہ گیا اور اسے وہ روپے ادا کر دیئے جو میں نے عرصہ ہوا اس سے قرض لیے تھے اور یہ سمجھ کر ابھی تک نہ دیئے تھے کہ وہ نہ لے گا۔ مگر اس نے خاموشی سے نوٹ گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور بغیر ہاتھ ملائے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔ "تم جا رہے ہو.......... لیکن مجھے بھلا نہ دینا۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

"میں کوشش کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں بہت دیر تک جہاں کھڑا تھا بت بنا رہا۔

جب ادھر اس کے سسرال والوں کو پتہ چلا کہ ان کی لڑکی رات رات میں کہیں غائب ہو گئی ہے تو ایک ہیجان برپا ہو گیا ہے۔ ایک ہفتے تک انہوں نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا اور کسی کو اس واقعے کی خبر تک نہ ہونے دی۔ مگر بعد میں لڑکی کے

بھائی کو میرے پاس آنا پڑا اور مجھے اپنا ہمراز بنا کر اسے ساری رام کہانی سنانی پڑی۔

وہ بے چارے یہ خیال کر رہے تھے کہ لڑکی کسی اور آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور لڑکی کا بھائی میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ ان کی طرف سے میں اپنے دوست کو اس تلخ واقعہ سے آگاہ کر دوں۔ وہ بے چارا شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

جب میں نے اس کو اصل واقعہ سے آگاہ کیا تو حیرت کے باعث اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس بات سے تو اسے بہت ڈھارس ہوئی کہ اس کی بہن کسی غیر مرد کے ساتھ نہیں گئی بلکہ اپنے شوہر کے پاس ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے دوست نے یہ فضول اور نازیبا حرکت کیوں کی؟

"بیوی اس کی تھی۔ جب چاہتا لے جاتا۔ مگر اس حرکت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے .... جیسے ...."

وہ کوئی مثال پیش نہ کر سکا۔ اور میں بھی اسے کوئی اطمینان وہ جواب نہ دے سکا۔

کل صبح کی ڈاک سے مجھے اس کا خط ملا جس کو میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لفافے میں ایک کاغذ تھا۔ جس پر ایک ٹیڑھی لکیر کھینچی ہوئی تھی .... خالی لفافہ ایک طرف رکھ کر میں اس عمود کی طرف دیکھنے لگا .... جو میں نے بورڈ پر چسپے ہوئے کاغذ پر گرایا تھا۔

ٹیٹوال کا کتا

کئی دن سے طرفین اپنے اپنے مورچے پر جمے ہوئے تھے۔ دن میں ادھر اور ادھر سے دس بارہ فائر ہو جاتے جن کی آواز کے ساتھ کوئی انسانی چیخ بلند نہیں ہوتی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہوا خودرو پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی اونچائیوں اور ڈھلوانوں پر جنگ سے بے خبر قدرت اپنے مقررہ اشغال میں مصروف تھی۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے تھے۔ پھول اسی طرح کھل رہے تھے اور شہد کی سست رو مکھیاں اسی پرانے ڈھنگ سے ان پر اونگھ اونگھ کر رس چوستی تھیں۔

جب پہاڑیوں میں کسی فائر کی آواز گونجتی تو چہچہاتے ہوئے پرندے چونک کر اڑنے لگتے، جیسے کسی کا ہاتھ ساز کے غلط تار سے جا ٹکرایا ہے اور ان کی سماعت کو صدمہ پہنچانے کا موجب ہوا ہے۔ ستمبر کا انجام اکتوبر کے آغاز سے بڑے گلابی انداز میں بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ موسم سرما اور گرما میں صلح صفائی ہو رہی ہے۔ نیلے نیلے آسمان پر دھنکی ہوئی روئی ایسے پتلے پتلے اور ہلکے ہلکے بادل یوں تیرتے تھے جیسے اپنے سفید بجروں میں تفریح کر رہے ہیں۔

پہاڑی مورچوں میں دونوں طرف کے سپاہی کئی دن سے بڑی کوفت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی فیصلہ کن بات کیوں وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ اکتا کر ان کا جی چاہتا تھا کہ موقع بے موقع ایک دوسرے کو شعر سنائیں۔ کوئی نہ سنے تو ایسے ہی گنگناتے رہیں۔ پتھریلی زمین پر اوندھے یا سیدھے لیٹے رہتے تھے۔ اور جب

حکم ملتا تھا ایک دو فائر کر دیتے تھے۔

دونوں کے مورچے بڑی محفوظ جگہ تھے۔ گولیاں پوری رفتار سے آتی تھیں اور پتھروں کی ڈھال کے ساتھ ٹکرا کر وہیں چت ہو جاتی تھیں۔ دونوں پہاڑیاں جن پر یہ مورچے تھے قریب قریب ایک قد کی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی سبز پوش وادی تھی جس کے سینے پر ایک نالہ موٹے سانپ کی طرح لوٹتا رہتا تھا۔

ہوائی جہازوں کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ توپیں ان کے پاس تھیں نہ ان کے پاس، اس لیے دونوں طرف بے خوف و خطر آگ جلائی جاتی تھی۔ ان سے دھوئیں اٹھتے اور ہواؤں میں گھل مل جاتے۔ رات کو چونکہ بالکل خاموشی ہوتی تھی، اس لیے کبھی کبھی دونوں مورچوں کے سپاہیوں کو ایک دوسرے کے کسی بات پر لگائے ہوئے قہقہے سنائی دے جاتے تھے۔ کبھی کوئی لہر میں آ کے گانے لگتا تو اس کی آواز رات کے سناٹے کو جگا دیتی۔ ایک کے پیچھے ایک صدائے بازگشت گونجتیں تو ایسا لگتا کہ پہاڑیاں آموختہ دہرا رہی ہیں۔

چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ پتھروں کے چولہے میں چیڑ کے ہلکے پھلکے کوئلے قریب قریب سرد ہو چکے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک نہیں تھی جیسے رات کو انہوں نے اپنے عطردان بند کر لیے تھے، البتہ چیڑ کے پسینے یعنی بروزے کی بو تھی مگر یہ بھی کچھ ایسی ناگوار نہیں تھی۔ سب کمبل اوڑھے سو رہے تھے، مگر کچھ اس طرح کہ ہلکے سے اشارے پر اٹھ کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ جمعدار ہرنام سنگھ خود پہرے پر تھا۔ اس کی راسکوپ گھڑی میں دو بجے تو اس نے گنڈا سنگھ کو جگایا اور پہرے پر متعین کر دیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سو

جائے، پر جب لیٹا تو آنکھوں سے نیند کو اتنا دور پایا جتنے کہ آسمان کے ستارے تھے۔ جمعدار ہرنام سنگھ چت لیٹا ان کی طرف دیکھتا رہا.............. اور گنگنانے لگا:

جتی لینی آں ستاریاں والی.............. ستاریاں والی........ وے ہرنام سنگھا

ہو یارا، بھاویں تیری مہیں وک جائے

اور ہرنام سنگھ کو آسمان پر ہر طرف ستاروں والے جوتے بکھرے نظر آئے۔ جو جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔

جتی لے دوں ستاریاں والی.............. ستاریاں والی........ نی ہرنام کورے

ہو نارے، بھاویں میری مہیں وک جائے

یہ گا کر وہ مسکرایا، پھر یہ سوچ کر کہ نیند نہیں آئے گی۔ اس نے اٹھ کر سب کو جگایا نار کے ذکر نے اس کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ واٹ پٹانگ گفتگو ہو، جس سے اس بولی کی ہرنام کوری کیفیت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ باتیں شروع ہوئیں مگر اکھڑی اکھڑی رہیں۔ بنتا سنگھ جوان سب میں کم عمر اور خوش آواز تھا، ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ باقی اپنی بظاہر پر لطف باتیں کرتے اور جمائیاں لیتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بنتا سنگھ نے ایک دم اپنی پر سوز آواز میں ہیر گانا شروع کر دی۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں، کون روٹھڑے یار مناؤندائی

ایسا کوہی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاؤندائی

اک باز توں کانگ نے کونج کھوئی دیکھاں چپ ہے کہ کرلاؤندائی

دکھاں والیاں نوں گلاں سکھدیاں نی قصے جوڑ جہان سناؤندای

پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے ہیر کی ان باتوں کا جواب رانجھے کی زبان میں گایا۔

جیہڑے باز توں کانگ نے کونج کھوئی صبر شکر کر باز فناہ ہویا

اینویں حال ہے اس فقیر دانی دھن مال گیا تے تباہ ہویا

کریں صدق تے کم معلوم ہووے تیرا رب رسول گواہ ہویا

دنیا چھڈ اداسیاں پہن لیاں سید وارثوں ہن وارث شاہ ہویا

بنتا سنگھ نے جس طرح ایک دم گانا شروع کیا تھا، اسی طرح وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری پہاڑیوں نے بھی اداسیاں پہن لی ہیں۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد کسی غیر مرئی چیز کو موٹی سی گالی دی اور لیٹ گیا۔ دفعتاً رات کے آخری پہر کی اس اداس فضا میں کتے کے بھونکنے کی آواز گونجی۔ سب چونک پڑے۔ آواز قریب سے آئی تھی۔ صوبیدار ہرنام سنگھ نے بیٹھ کر کہا۔ ''یہ کہاں سے آ گیا بھونکو؟''

کتا پھر بھونکا۔ اب اس کی آواز اور بھی نزدیک سے آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد دور جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ بنتا سنگھ اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آوارہ کتا تھا جس کی دم ہل رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔

''جمعدار صاحب، میں ہو کمز ادھر بولا تو کہنے لگا، میں ہوں چپڑ جھن جھن!''

سب ہنسنے لگے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے کتے کو پکارا۔ ''ادھر آ چپڑ جھن جھن۔''

کتا دم ہلاتا ہرنام سنگھ کے پاس چلا گیا اور یہ سمجھ کر شاید کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، زمین کے پتھر سونگھنے لگا۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھیلا کھول کر ایک بسکٹ

نکالا اور اس کی طرف پھینکا۔ کتے نے اسے سونگھ کر منہ کھولا، لیکن ہرنام سنگھ نے لپک کر اسے اٹھالیا۔ ''ٹھہر...... کہیں پاکستانی تو نہیں!''

سب ہنسنے لگے۔ سردار بنتا سنگھ نے آگے بڑھ کر کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور جمعدار ہرنام سنگھ سے کہا۔ ''نہیں جمعدار صاحب، چپڑ جھن جھن ہندوستانی ہے۔''

جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا اور کتے سے مخاطب ہوا۔ ''نشانی دکھا اوئے؟''

کتا دم ہلانے لگا۔

ہرنام سنگھ ذرا کھل کے ہنسا۔ ''یہ کوئی نشانی نہیں۔ دم تو سارے کتے ہلاتے ہیں۔''

بنتا سنگھ نے کتے کی لرزاں دم پکڑ لی۔ ''شرنارتھی ہے بے چارہ۔''

جمعدار ہرنام سنگھ نے بسکٹ پھینکا کتے نے فوراً دبوچ لیا۔ ایک جوان نے اپنے بوٹ کی ایڑھی سے زمین کھودتے ہوئے کہا۔ ''اب کتوں کو بھی یا تو ہندوستانی ہونا پڑے گا یا پاکستانی!''

جمعدار نے اپنے تھیلے سے ایک بسکٹ نکالا اور پھینکا۔ ''پاکستانیوں کی طرح پاکستانی کتے بھی گولی سے اڑا دیئے جائیں گے!''

ایک نے زور سے نعرہ بلند کیا۔ ''ہندوستان زندہ باد!''

کتا جو بسکٹ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دم ٹانگوں کے اندر گھس گئی۔ جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا۔ ''اپنے نعرے سے کیوں ڈرتا ہے چپڑ جھن جھن...... کھا...... لے ایک اور لے۔'' اس نے تھیلے سے ایک اور بسکٹ نکال کر اسے دیا۔

باتوں باتوں میں صبح ہوگئی۔ سورج ابھی نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ چار سو اجالا ہوگیا۔ جس طرح بٹن دبانے سے ایک دم بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح سورج کی شعاعیں دیکھتے ہی دیکھتے اس پہاڑی علاقے میں پھیل گئیں جس کا نام ٹیٹوال تھا۔

اس علاقے میں کافی دیر سے لڑائی جاری تھی۔ ایک ایک پہاڑی کے لیے درجنوں جوانوں کی جان جاتی تھی، پھر بھی قبضہ غیر یقینی ہوتا تھا۔ آج یہ پہاڑی ان کے پاس ہے، کل دشمن کے پاس، پرسوں پھر ان کے قبضے میں۔ اس سے دوسرے روز وہ پھر دوسروں کے پاس چلی جاتی تھی۔

صوبیدار ہرنام سنگھ نے دوربین لگا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ سامنے پہاڑی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ چائے وغیرہ تیار ہو رہی ہے ادھر بھی ناشتے کی فکر ہو رہی تھی۔ آگ سلگائی جا رہی تھی۔ ادھر والوں کو بھی یقیناً ادھر سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔

ناشتے پر سب جوانوں نے تھوڑا تھوڑا کتے کو دیا جو اس نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ سب اس سے دلچسپی لے رہے تھے جیسے وہ اس کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے آنے سے کافی چہل پہل ہوگئی تھی۔ ہر ایک اس کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پچکار کر "چپڑ جھن جھن" کے نام سے پکارتا اور اسے پیار کرتا۔

شام کے قریب دوسری طرف پاکستانی مورچے میں صوبیدار ہمت خان اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو جن سے بے شمار کہانیاں وابستہ تھیں، مروڑے دے کر ٹیٹوال کے نقشے کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وائرلیس اوپریٹر بیٹھا تھا اور

صوبیدار ہمت خاں کے لیے پلاٹون کمانڈر سے ہدایات وصول کر رہا تھا۔ کچھ دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے اور اپنی بندوق لیے بشیر ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

چن کتھے گوائی آئی رات وے.........چن کتھے گوائی آئی

بشیر نے مزے میں آ کر آواز ذرا اونچی کی تو صوبیدار ہمت خاں کی کڑک بلند ہوئی۔ ''اوئے کہاں رہا ہے تو رات بھر؟''

بشیر نے سوالیہ نظروں سے ہمت خان کو دیکھنا شروع کیا۔ جو بشیر کے بجائے کسی اور سے مخاطب تھا۔ ''بتا اوئے۔''

بشیر نے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر وہ آوارہ کتا بیٹھا تھا جو کچھ دن ہوئے ان کے مورچے میں بن بلائے مہمان کی طرح آیا تھا اور وہیں ٹک گیا تھا۔ بشیر مسکرایا اور کتے سے مخاطب ہو کر بولا۔

''چنے کتھے گوائی آئی رات وے......چن کتھے گوائی آئی؟''

کتے نے زور سے دم ہلانا شروع کی جس سے پتھریلی زمین پر جھاڑو سی پھرنے لگی۔

صوبیدار ہمت خاں نے ایک کنکر اٹھا کر کتے کی طرف پھینکا۔ ''سالے کو دم ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا!''

بشیر نے ایک دم کتے کی طرف غور سے دیکھا۔ ''اس کی گردن میں کیا ہے؟''

یہ کہہ کر وہ اٹھا، مگر اس سے پہلے ایک اور جوان نے کتے کو پکڑ کر اس کی گردن میں بندھی ہوئی رسی اتاری۔ اس میں گتے کا ایک ٹکڑا پرویا ہوا تھا۔ جس پر کچھ لکھا تھا۔ صوبیدار ہمت خاں نے یہ ٹکڑا لیا اور اپنے جوانوں سے پوچھا۔ ''لنڈے ہیں

...........جانتا ہے تم میں سے کوئی پڑھنا۔"

بشیر نے آگے بڑھ کر گتے کا ٹکڑا لیا۔ "ہاں.......... کچھ کچھ پڑھ لیتا ہوں۔"

اور اس نے بڑی مشکل سے حرف جوڑ جوڑ کر یہ پڑھا۔ "چپ......... چپڑ

.........جھن........ جھن............ چپڑ جھن جھن......... کیا ہوا؟"

صوبیدار رحمت خان نے اپنی بڑی بڑی تاریخی مونچھوں کو زبردست مروڑا دیا۔ "کوڈ ورڈ ہوگا کوئی۔" پھر اس نے بشیر سے پوچھا۔ "کچھ اور لکھا ہے بشیرے۔"

بشیرے نے جو حروف شناسی میں مشغول تھا جواب دیا۔ "جی ہاں......... یہ .... یہ .... ہند......... ہند......... ہندوستانی......... یہ ہندوستانی کتا ہے!"

صوبیدار رحمت خاں نے سوچنا شروع کیا۔ "مطلب کیا ہوا اس کا؟............ کیا پڑھا تھا تم نے......... چپڑ؟"

بشیر نے جواب دیا۔ "چپڑ جھن جھن!"

ایک جوان نے بڑے عاقلانہ انداز میں کہا۔ "جو بات ہے اسی میں ہے۔"

صوبیدار رحمت خان کو یہ بات معقول معلوم ہوئی۔ "ہاں کچھ ایسا لگتا ہے۔"

بشیر نے گتے پر لکھی ہوئی پوری عبارت پڑھی۔ "چپڑ جھن جھن......... یہ ہندوستانی کتا ہے!"

صوبیدار رحمت خان نے وائرلیس سیٹ لیا اور کانوں پر ہیڈ فون جما کر پلاٹون کمانڈر سے خود اس کتے کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ کیسے آتا تھا کس طرح ان کے پاس کئی دن پڑا رہا۔ پھر ایکا ایکی غائب ہوگیا اور رات بھر غائب رہا۔ اب

آیا ہے تو اس کے گلے میں رسی نظر آئی جس میں گتے کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس پر جو عبارت لکھی تھی وہ اس نے تین چار مرتبہ دہرا کر پلاٹون کمانڈر کو سنائی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

بشیر الگ کتے کے پاس بیٹھ کر اسے کبھی پچکار کر کبھی ڈرا دھمکا کر پوچھتا رہا کہ وہ رات کہاں غائب رہا تھا اور اس کے گلے میں وہ رسی اور گتے کا ٹکڑا کس نے باندھا تھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ جو سوال کرتا، اس کے جواب میں کتا اپنی دم ہلا دیتا۔ آخر غصے میں آ کر بشیر نے اسے پکڑ لیا اور زور سے جھٹکا دیا۔ کتا تکلیف کے باعث چاؤں چاؤں کرنے لگا۔

وائرلیس سے فارغ ہو کر صوبیدار رحمت خان نے کچھ دیر نقشے کا بغور مطالعہ کیا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور سگریٹ کی ڈبیا کا ڈھکنا کھول کر بشیر کو دیا۔ ''بشیرے لکھ اس پر گورمکھی میں .... ان کیڑے مکوڑوں میں ....''

بشیر نے سگریٹ کی ڈبیا کا گتا لیا اور پوچھا۔ ''کیا لکھوں صوبیدار صاحب!''

صوبیدار رحمت خان نے مونچھوں کو مروڑے دے کر سوچنا شروع کیا۔ ''لکھ دے .... بس لکھ دے!'' یہ کہہ اس نے جیب سے پنسل نکال کر بشیر کو دی۔

''کیا لکھنا چاہیے؟''

بشیر پنسل کے منہ کو لب لگا کر سوچنے لگا! پھر ایک دم سوالیہ انداز میں بولا۔ ''سپڑ سن سن؟ ....'' لیکن فوراً ہی مطمئن ہو کر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے .... چپڑ جھن جھن کا جواب سپڑ سن سن ہی ہو سکتا ہے .... کیا یاد رکھیں گے اپنی ماں کے سکھڑے۔''

بشیر نے پنسل سگرٹ کی ڈبیا پر جمائی۔ ''سپڑ سن سن؟''

''سولہ آنے......لکھ......سپ......سپڑ......سن سن!'' یہ کہہ کر صوبیدار ہمت خاں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''اور آگے لکھ......یہ پاکستانی کتا ہے!''

صوبیدار ہمت خاں نے کتا بشیر کے ہاتھ سے لیا۔ پنسل سے اس میں ایک طرف چھید کیا اور رسی میں پرو کر کتے کی طرف بڑھا۔ ''لے جا، یہ اپنی اولاد کے پاس!''

یہ سن کر سب جوان خوب ہنسے۔ صوبیدار ہمت خاں نے کتے کے گلے میں رسی باندھ دی۔ وہ اس دوران میں اپنی دم ہلاتا رہا۔ اس کے بعد صوبیدار نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو دوست غداری مت کرنا......یاد رکھو غداری کی سزا موت ہوتی ہے!''

کتا دم ہلاتا رہا۔ جب وہ اچھی طرح کھا چکا تو صوبیدار ہمت خاں نے رسی سے پکڑ کر اس کا رخ پہاڑی کی اکلوتی پگڈنڈی کی طرف پھیرا اور کہا۔ ''جاؤ......ہمارا خط دشمنوں تک پہنچا دو......مگر دیکھو واپس آ جانا......یہ تمہارے افسر کا حکم ہے، سمجھے؟''

کتے نے اپنی دم ہلائی اور آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر جو بل کھاتی ہوئی نیچے پہاڑی کے دامن میں جاتی تھی چلنے لگا۔ صوبیدار ہمت خان نے اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں ایک فائر کیا۔

فائر اور اس کی بازگشت دوسری طرف ہندوستانیوں کے مورچے میں سنی گئی۔ اس کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ جمعدار ہرنام سنگھ معلوم نہیں کس بات پر چڑچڑا

ہو رہا تھا، یہ آواز سن کر اور بھی چڑ چڑا ہو گیا۔ اس نے فائر کا حکم دے دیا۔ آدھے گھنٹے تک چنانچہ دونوں موریچوں سے گولیوں کی بیکار بارش ہوتی رہی۔ جب اس شغل سے اکتا گیا تو جمعدار ہرنام سنگھ نے فائر بند کرا دیا اور ڈاڑھی میں کنگھا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے جالی کے اندر سارے بال بڑے سلیقے سے جمائے اور بنتا سنگھ سے پوچھا۔ ''اوئے بنتاں سیاں! چپڑ جھن جھن کہاں گیا؟''

بنتا سنگھ نے چیڑ کی خشک لکڑی سے بروزہ اپنے ناخنوں لیں جدا کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

''کتے کو گھی ہضم نہیں ہوا؟'' ہرنام سنگھ نے کہا۔

بنتا سنگھ اس محاورے کا مطلب نہ سمجھا۔ ''ہم نے تو اسے گھی کی کوئی چیز نہیں کھلائی تھی۔''

یہ سن کر جمعدار ہرنام سنگھ بڑے زور سے ہنسا۔ ''اوئے ان پڑھ..............

تیرے ساتھ تو بات کرنا پچانویں کا گھاٹا ہے!''

اتنے میں وہ سپاہی جو پہرے پر تھا اور دوربین لگائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا ایک دم چلایا۔ ''وہ..............وہ آرہا ہے!''

سب چونک پڑے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے پوچھا۔ ''کون؟''

پہرے کے سپاہی نے کہا۔ ''کیا نام تھا اس کا؟..............چپڑ جھن جھن!''

''چپڑ جھن جھن؟'' یہ کہہ کر جمعدار ہرنام سنگھ اٹھا۔ ''کیا کر رہا ہے۔''

پہرے کے سپاہی نے جواب دیا۔ ''آرہا ہے۔''

جمعدار ہرنام سنگھ نے دوربین اس کے ہاتھ سے لی اور دیکھنا شروع کیا

........"ادھر ہی آ رہا ہے...... رسی بندھی ہوئی ہے گلے میں...... لیکن...... یہ تو ادھر سے آ رہا ہے دشمن کے مورچے سے۔" یہ کہہ کر اس نے کتے کی ماں کو بہت بڑی گالی دی۔ اس کے بعد اس نے بندوق اٹھائی اور شست باندھ کر فائر کیا۔ نشانہ چوک گیا۔ گولی کتے سے کچھ فاصلے پر پتھروں کی کرچیں اڑاتی زمین میں دفن ہو گئی۔ وہ سہم کر رک گیا۔

دوسرے مورچے میں صوبیدار ہمت خاں نے دوربین میں سے دیکھا کہ کتا پگڈنڈی پر کھڑا ہے۔ ایک اور فائر ہوا تو وہ دم دبا کر الٹی طرف بھاگا۔ صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف۔ وہ زور سے پکارا۔ "بہادر ڈرا نہیں کرتے...... چل واپس" اور اس نے ڈرانے کے لیے ایک فائر کیا۔ کتا رک گیا۔ ادھر سے جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق چلائی۔ گولی کتے کے کان سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اچھل کر زور زور سے دونوں کان پھڑپھڑانے شروع کیے۔ ادھر سے صوبیدار ہمت خاں نے دوسرا فائر کیا جو اس کے اگلے پنجوں کے پاس پتھروں میں پیوست ہو گیا۔ بوکھلا کر کبھی وہ ادھر دوڑا، کبھی ادھر۔ اس کی اس بوکھلاہٹ سے ہمت خاں اور ہرنام دونوں بہت مسرور ہوئے اور خوب قہقہے لگاتے رہے۔ کتے نے جمعدار ہرنام سنگھ کے مورچے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس نے یہ دیکھا تو بڑے تاؤ میں آ کر موٹی سی گالی دی اور اچھی طرح شست باندھ کر فائر کیا۔ گولی کتے کی ٹانگ میں لگی۔ ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ اس نے اپنا رخ بدلا۔ لنگڑا لنگڑا کر صوبیدار ہمت خاں نے مورچے کی طرف دوڑنے لگا تو ادھر سے بھی فائر ہوا، مگر وہ صرف ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ بہادر پروا نہیں کیا کرتے، زخموں کی

کھیل جاؤ اپنی جان پر .... جاؤ .... جاؤ!

کتا فائر سے گھبرا کر مڑا۔ ایک ٹانگ اس کی بالکل بیکار ہوگئی تھی۔ باقی تین ٹانگوں کی مدد سے اس نے خود کو چند قدم دوسری جانب گھسیٹا کہ جمعدار ہرنام سنگھ نے نشانہ تاک کر گولی چلائی جس نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

صوبیدار ہمت خاں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ''چچ چچ .... شہید ہو گیا ہے بے چارہ!''

جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق کی گرم گرم نال اپنے ہاتھ میں لی اور کہا۔ ''وہی موت مرا جو کتے کی ہوتی ہے!''

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

جسم اور روح

مجیب نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔ ''کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو۔''

گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دنیا میں ایسے کئی اشخاص موجود ہیں جو ایک منٹ کے اندر اندر لاکھوں اور کروڑوں کو ضرب دے سکتے ہیں ان کی تقسیم کر سکتے ہیں۔ آنے پائی کا حساب چشم زدن میں آپ کو بتا سکتے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران میں مغنی یہ کہہ رہا تھا۔ ''انگلستان میں ایک آدمی ہے جو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد فوراً بتا دیتا ہے کہ اس قطعہ زمین کا طول و عرض کیا ہے رقبہ کتنا ہے............ اس نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ وہ اپنی اس خداداد صلاحیت سے تنگ آ گیا ہے وہ جب بھی کہیں باہر کھلے کھیتوں میں نکلتا ہے تو ان کی ہر دلکشی، ان کا حسن اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اس قطعہ زمین کی پیمائش اپنی آنکھوں کے ذریعہ سے شروع کر دیتا ہے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا کتنا رقبہ رکھتا ہے اس کی لمبائی کتنی ہے چوڑائی کتنی ہے پھر اسے مجبوراً اپنے اندازے کا امتحان لینا پڑتا ہے۔ فیتہ ٹیپ کے ذریعہ سے اس خطہ زمین کو بھانپتا اور وہ اس کے اندازے کے عین مطابق نکلتا اگر اس کا اندازہ غلط ہوتا تو اسے بہت تسکین ہوتی۔ بعض اوقات فاتح اپنی شکست سے بھی ایسی لذت محسوس کرتا ہے جو اسے فتح سے نہیں ملتی اصل میں شکست دوسری شاندار فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے''

میں نے مغنی سے کہا۔ ''تم درست کہتے ہو...... دنیا میں ہر قسم کے عجائبات

موجود ہیں۔''

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مجیب جو اس گفتگو کے دوران کافی پی رہا تھا اچانک مجھ سے سوال کیا۔

''کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو۔''

میں سوچنے لگا کہ مجیب کس آدمی کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ حامد نہیں .... وہ آدمی نہیں میرا دوست ہے۔

عباس ...... اس کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔

شبیر ...... اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ آخر یہ کس آدمی کا حوالہ دیا گیا تھا۔

میں نے مجیب سے کہا۔ ''تم کس آدمی کا حوالہ دے رہے ہو۔''

مجیب مسکرایا۔ ''تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے۔''

''بھئی میرا حافظہ تو بچپن سے ہی کمزور ہے۔ تم پہیلیوں میں باتیں نہ کرو .... بتاؤ وہ کون آدمی ہے۔ جس سے تم میرا تعارف کرانا چاہتے ہو۔''

مجیب کی مسکراہٹ میں اب ایک طرح کا اسرار تھا۔ ''بوجھ لو۔''

''میں کیا بوجھوں گا جبکہ وہ آدمی تمہاری پیٹ میں ہے۔''

عارف، اصغر اور مسعود بے اختیار ہنس پڑے عارف نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''وہ آدمی اگر مجیب کے پیٹ میں ہے تو آپ کو اس کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

میں نے مجیب کی طرف ایک نظر دیکھا اور عارف سے مخاطب ہوا۔ ''میں اپنی ساری عمر اس مہدی کی ولادت کا انتظار نہیں کر سکتا ہوں۔''

مسعود نے اپنے سگریٹ کو ایش ٹرے کے قبرستان میں دفن کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھئے صاحبان ہمیں اپنے دوست مجیب کی بات کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ مجیب سے مخاطب ہوا........''مجیب صاحب فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے........ہم سب بڑے غور سے سنیں گے۔''

مجیب تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اپنا بجھا ہوا چرٹ سلگا کر بولا۔ ''معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے اس آدمی کے متعلق آپ سے پوچھا۔ جسے آپ جانتے نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجیب تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ بہر حال تم اس آدمی کو جانتے ہو۔''

مجیب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔ ''بہت اچھی طرح .... جب ہم دونوں برما میں تھے تو دن رات اکٹھے رہتے تھے۔ عجیب وغریب آدمی تھا۔''

مسعود نے پوچھا۔ ''کس لحاظ سے۔''

مجیب نے جواب دیا۔ ''ہر لحاظ سے........اس جیسا آدمی آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی مجیب اب بتا بھی دو وہ کون حضرت تھے۔''

''وہ بس حضرت ہی تھے۔''

عارف مسکرایا۔ ''چلو قصہ ختم ہوا........وہ حضرت تھے اور بس........''

مسعود یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ وہ حضرت کون تھے؟ ''بھئی مجیب تمہاری ہر بات نرالی ہوتی ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ وہ کون آدمی تھا۔ جس کا

ذکر تم نے اچانک چھیڑ دیا۔''

مجیب طبعاً خاموش پسند تھا۔ اس کے دوست احباب ہمیشہ اس کی طبیعت سے نالاں رہتے............ لیکن اس کی باتیں نپی تلی ہوتی تھیں۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''معذرت خواہ ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کو اس مخمصے میں گرفتار کر دیا............ بات دراصل یہ ہے کہ جب یہ گفتگو شروع ہوئی تو میں کھو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ ایسا کون سا زمانہ تھا؟''

مجیب نے اب ایک لمبی کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ ''اگر آپ سمجھتے ہوں کہ اس زمانے سے میری زندگی کے کسی رومان کا تعلق ہے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کم فہم ہیں۔''

میں نے مجیب سے کہا۔ ''ہم تو آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔''

''اگر آپ یہی سمجھتے ہیں کہ آپ کم فہم ہیں تو ٹھیک ہے لیکن وہ آدمی۔'' مجیب مسکرایا۔ ''وہ آدمی آدمی ہی تھا............ لیکن اس میں خدا نے بہت سی قوتیں بخشی تھیں۔''

مسعود نے پوچھا۔ ''مثال کے طور پر............''

''مثال کے طور پر یہ کہ وہ ایک نظر دیکھنے کے بعد بتا سکتا تھا کہ آپ نے کس رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ ٹائی کیسی تھی۔ آپ کی ناک ٹیڑھی تھی یا سیدھی............ آپ کے کس گال پر کہاں اور کس جگہ تل تھا۔ آپ کے ناخن کیسے ہیں۔ آپ کی

داہنی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔ آپ نے بھنویں مونڈی ہوئی ہیں۔ موزے فلاں ساخت کے پہنے ہوئے تھے قمیض پوپلین کی تھی مگر گھر میں دھلی ہوئی۔‘‘

یہ سن کر میں نے واقعتاً محسوس کیا کہ جس شخص کا ذکر مجیب کر رہا ہے عجیب و غریب ہستی کا مالک ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ’’بڑا معرکہ خیز آدمی تھا۔‘‘

’’جی ہاں .... بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ...... اس کو اس بات کا زعم تھا کہ اگر وہ کوئی منظر، کوئی مرد، کوئی عورت صرف ایک نظر دیکھ لے تو وہ اسے من و عن اپنے الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ جو کبھی غلط نہیں ہوں گے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اندازہ ہمیشہ درست ثابت ہوتا تھا۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’کیا یہ واقعی درست تھا۔‘‘

’’سو فیصد .... ایک مرتبہ میں نے اس سے بازار میں پوچھا۔ یہ لڑکی جو ابھی ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے۔ کیا تم اس کے متعلق بھی تفصیلات بیان کر سکتے ہو۔‘‘

میں اس لڑکی سے ایک گھنٹہ پہلے مل چکا تھا۔ وہ ہمارے ہمسائے مسٹر لوجوائے کی بیٹی تھی اور میری بیوی سے سلائی کے مستعار لینے آئی تھی میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس لیے بغرض امتحان میں نے مجیب سے یہ سوال کیا تھا۔

مجیب مسکرایا۔

’’تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔‘‘

’’نہیں .... نہیں .... یہ بات نہیں .... میں .... میں۔‘‘

’’نہیں .... تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔ خیر سنو .... وہ لڑکی جو ابھی

ابھی ہمارے پاس سے گزری ہے اور جسے...... جسے میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا
.... مگر لباس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے اس لیے کہ ہر وہ شخص جس کی آنکھیں سلامت ہوں اور ہوش و حواس درست ہوں کہہ سکتا ہے کہ وہ کس قسم کا تھا۔ ویسے ایک چیز جو مجھے اس میں خاص طور پر دکھائی دی وہ اس کے داہنے ہاتھ کی چھنگلیا تھی اس میں کسی قدر خم ہے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن مضروب تھا۔ اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرائش کے فن سے محض کوری ہے۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے ایک معمولی سی نظر میں یہ سب چیزیں کیسے بھانپ لیں ...... میں ابھی اسی حیرت میں غرق تھا کہ مجیب نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں جو خاص چیز مجھے نظر آئی وہ اس کے داہنے گال کا داغ تھا......... غالباً لاہور سول پھوڑے کا ہے۔"

مجیب کا کہنا درست تھا......... میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ سب باتیں جو تم اتنے وثوق سے کہتے ہو تمہیں کیونکر معلوم ہو جاتی ہیں۔"

مجیب مسکرایا۔ "میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں ہر آدمی کو صاحب نظر ہونا چاہیے۔ صاحب نظر سے میری مراد ہر اس شخص سے ہے جو ایک ہی نظر میں دوسرے آدمی کے تمام خدوخال دیکھ لے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"خدوخال دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے...... خدوخال ہی تو انسان کا صحیح کردار بیان کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے۔ میں تمہارے اس نظریئے سے متفق نہیں ہوں۔"

"نہ ہوں .... مگر میرا نظریہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔"

"رہے .... مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے .... ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو۔"

"یار غلطیاں درستیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔"

"یہ تمہارا عجیب فلسفہ ہے۔"

"فلسفہ گائے کا گوبر ہے۔"

"اور گوبر۔"

مجیب مسکرایا۔ "وہ .... وہ .... اپلا کہہ لیجیے۔ جو ایندھن کے کام آتا ہے۔"

ہمیں معلوم ہوا کہ مجیب ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے پہلی ہی نگاہ میں اس نے اس کے جسم کے ہر خدوخال کا صحیح جائزہ لے لیا تھا۔ وہ لڑکی بہت متاثر ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی موجود ہوں جو صرف ایک نظر میں سب چیزیں دیکھ جاتے ہیں تو وہ مجیب سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو گئی۔ ان کی شادی ہو گئی .... دلہن نے کیسے کپڑے پہنے تھے اس کی دائیں کلائی میں کس ڈیزائن کی دست پچھی تھی .... اس میں کتنے نگینے تھے۔

یہ سب تفصیلات اس نے ہمیں بتائیں۔

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔

جنٹل مینوں کا برش

یہ غالباً آج سے بیس برس پیچھے کی بات ہے۔ میری عمر یہی کوئی کوئی بائیس برس کے قریب ہوگی، یا شاید اس سے دو برس کم۔ کیونکہ تاریخوں اور سنوں کے معاملے میں میرا حافظہ بالکل صفر ہے۔ میری دوستی کا حلقہ ان نوجوانوں پر مشتمل تھا جو عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔

حفیظ پینٹر کی دکان میں جو بجلی والے چوک سے بائیں ہاتھ بازار کے پاس ہی واقع تھی، ہم سب بیٹھتے اور گھنٹوں گپ بازی ہوتی رہتی۔ میں پڑھائی وڑھائی قریب قریب چھوڑ چکا تھا۔ اسی طرح مبارک اپنی ملازمت پر لات مار کر امرتسر واپس چلا آیا تھا۔ وہ کسی ریاست میں ملازم تھا۔ حفیظ پینٹر کی اپنی باپ سے ٹھن ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے علیحدہ ایک بڑی دکان جس میں کچھ عرصہ پہلے ایک کمیونسٹ سکھ کی دکان تھی، جو گراموفون ڈیلر تھا۔ خیر دین کی مسجد سے ملحقہ دکان ہال بازار میں تھی، مگر اچھے موقع پر تھی۔ یعنی عین ہال بازار کے وسط میں اور مسجد کے زیر سایہ خرابات مروجہ اصولوں کے ماتحت ہونی ہی چاہیے۔ اس لیے وہ اسے بہت پسند آ گئی تھی۔ ادھر اذان ہوتی تو ادھر ریکارڈ بجتے۔ لیکن کوئی دنگہ فساد اس بات پر وہاں کبھی نہ ہوا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سینکڑوں خون ہوتے رہتے۔

امرود پرستی پر، رنڈی بازی پر، گنڈوں کی دو مخالف پارٹیوں پر، ایسے مسلم مسلم اور مسلم ہندو فساد عام تھے۔ جو ایک دو دن اپنی دھاک بٹھا کر جھاگ کے مانند غائب ہو جاتے۔ گرمی کی پیلی پیلی بھڑوں کے مانند جو اپنے ارد گرد جالا تن لیتی ہیں

اور بظاہر بالکل مردہ ہو جاتی ہیں لیکن معلوم نہیں پھر موافق موسم آنے پر زندہ ہو جاتی ہیں اور بے قصور آدمیوں کو کاٹنے کے شغل میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

امرتسر ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ یہاں ہر ایک قسم کی شے اس زمانے میں پائی جاتی تھی۔ بھنگنوں کی لڑائی سے لے کر گورنمنٹ سے پنجہ کشی کرنے تک۔ لوگ بھی بھانت بھانت کے تھے۔ لالے جوانچی بزازی کی دکانوں پر پادتے رہتے اور کچھ ایسے من چلے بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے پٹاخے بنا کر چلاتے تھے کہ لوگوں کے دل ایک لحظے کے لیے دہل جاتے۔ دہشت پسند بھی تھے اور امن پسند بھی۔ نمازی اور پرہیز گار بھی تھے اور اول درجے کے اوباش اور گناہ گار بھی۔ مسجدیں تھیں اور مندر بھی۔ ان میں گناہ کے کام بھی ہوتے تھے اور ثواب کے بھی۔

غرض یہ کہ انسانی زندگی کے یہ سب دھارے ساتھ ساتھ متواتر بہا کرتے تھے .... کئی سیاسی تحریکیں ہوئیں۔ کئی گنڈوں کا آپس میں کشت خون ہوا۔ مسلمانوں اور قادیانیوں میں کئی مباہلے ہوئے، جن میں بڑے بڑے جغادری علمائے کرام نے حصہ لیا۔ قحط پڑے، وبائیں آئیں۔ جلیاں والا کا تاریخی حادثہ ہوا، ہزاروں انسان، جن میں مسلمان، سکھ، ہندو سب شامل تھے، موت کے گھاٹ اتارے گئے، لیکن امرتسر جوں کا توں رہا۔

حفیظ پینٹر کی دکان پر یوں تو دنیا بھر کے سیاسی، مجلسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیالات اور بحث ہوتی رہتی، مگر بڑے خادم انداز میں۔ اصل میں وہ سب کے سب آرٹسٹ تھے۔ گو نیم رس...... ان کو دراصل موسیقی سے شغف تھا۔ کوئی طبلے کی جوڑی اٹھا لیتا، کوئی ستار، کوئی سارنگی اور کوئی تانپورہ ہاتھ میں لے کر میاں کی

ٹوڈی، مالکونس یا بھاگیری کا الاپ شروع کر دیتا۔

یہاں بھنگ بھی گھوٹی جاتی، چرس بھرے سگریٹ بھی پیے جاتے، شراب کے دور اکثر چلتے، اس لیے کہ دن اتنا بڑا بے باک نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ روپے میں ایک پوری بوتل بڑھیا سے بڑھیا اسکاچ وسکی کی آ جاتی تھی۔ حفیظ شام کو اپنی دکان کے بھاری بھرکم کواڑ بند کر دیتا اور ہم چٹائیوں پر بیٹھ کر اس مشروف سے آہستہ آہستہ لطف اندوز ہوتے۔ پھر آدھی رات کو جب آس پاس کی ساری دکانیں بند ہوتیں ہم موسیقی کا دور شروع کر دیتے۔

یہاں قریب قریب سب گویئے، بڑے اور چھوٹے فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس لیے کہ زندہ دل نوجوانوں کی محفل تھی۔ پھکڑ بازی بھی ہوتی تو کوئی برا نہ مانتا تھا۔

ایک دن میں صبح دس بجے کے قریب حفیظ پینٹر کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ذرا آگے چل کر ایک کیمسٹ کی دکان سے اپنے کان کے لیے دوا لینا تھی کہ حفیظ نے برش کان میں اڑس کر مجھے با آواز بلند پکارا اور اسی کان میں اڑے ہوئے برش کو نکال کر اس سے مجھے اشارہ کیا، جس کا یہ مطلب تھا کہ میں اس کی بات سنتا جاؤں۔

میں اس کی دکان کے تھڑے کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے حفیظ صاحب؟''

حفیظ نے برش پھر کان میں اڑس لیا اور جواب دیا۔ ''بات یہ ہے میری جان کہ آج توکل کا گانا ہوگا۔ اس کے ساتھ مچھر خان اور لبے خان بھی ہوں گے

وہ معاملہ بھی ہو گا............ چھ بجے سے پہلے پہلے ہی آ جانا............ میں نے تمام دوستوں کو اطلاع دے دی ہے۔ تو کل کو میں نے سنا تو نہیں لیکن نئے خیال کے لوگ اسے بہت پسند کر رہے ہیں۔ نوجوان ہے۔ کہتے ہیں کہ خاں صاحب کے عاشق کے مانند بے ڈر گاتا ہے اور حق ادا کرتا ہے۔"

میں بہت خوش ہوا۔ "آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ مگر یہ مچھر خان کیا بلا ہے............ کیا تم اسے کسی مچھر دانی کے اندر بٹھاؤ گے؟"

حفیظ پینٹر کھلکھلا کر ہنسا۔ "ارے نہیں یار! اس کی عادت ہے کہ جب کوئی تان لیتا ہے اور واپس سم پر آتا ہے اور بڑے زور سے اپنی رانوں پر دو ہتڑ مارتا ہے............ اس لیے اس کا نام مچھر خان پڑ گیا ہے۔ جیسے وہ گا نہیں رہا، بلکہ اپنے بدن پر کاٹنے والے مچھر مار رہا ہے۔"

میں نے اس سے کہا۔ "چلو............ اس کا تماشہ بھی دیکھ لیں گے............ پر اگر اس نے آج رات کوئی مچھر نہ مارا تو یہ طے ہے کہ تمہارے آرٹ اسٹوڈیو سے وہ زندہ باہر نہیں نکلے گا۔"

حفیظ کھلکھلا کر ہنسا، کان میں سے اڑسا ہوا برش نکالا اور سائن بورڈ پینٹ کرنے لگا۔ "جاؤ یا جاؤ............ میرا وقت ہرج کر رہے ہو............ مجھے یہ کام وقت پر مکمل کرنا ہے۔"

میں وہاں سے چلا گیا............ کیمسٹ کی دکان سے دوائی لی۔ باہر نکلا تو شیخ صاحب جو وہاں کے بہت بڑے رئیس تھے، ان سے دو آدمی دکان کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے شیخ صاحب کو سلام کیا............ انہوں نے

جیسا کہ ان کی عادت تھی، چھڑی بجلی کے کھمبے کے ساتھ ماری۔ جب آواز پیدا ہوئی تو ان کا اطمینان ہو گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''کہو بھئی سعادت کیا حال ہے؟''

میں نے عرض کی۔ ''جناب کی دعا سے سب ٹھیک ہے۔''

جن دو آدمیوں سے شیخ صاحب باتیں کر رہے تھے، وہ سیاہ فام تھے، لیکن اچکن کا رنگ ان کے رنگ سے کہیں زیادہ کالا۔

دبلا، پتلا لیکن چہرے کے نقش تیکھے۔ شیخ صاحب چلنے لگے تو اس آبنوسی گوشت پوست کے ٹکڑے نے تیزی سے بڑھ کر شیخ صاحب کے کوٹ کی پیٹھ جھاڑنی شروع کی، بڑی نفاست سے، شیخ صاحب نے گرما کر اس سے پوچھا۔

''کیا بات تھی؟''

اس آبنوسی آدمی نے بڑی پتلی آواز میں جواب دیا۔ ''چند بال تھے اور تھوڑی سی گرد۔''

شیخ صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ''اچھا تم کل صبح گھر پہ آنا'' اور وہ پھر بجلی کے کھمبے کو اپنی چھڑی سے بجاتے ہوئے غالباً کمپنی باغ کی طرف نکل گئے۔

ایک دن میں نے پھر اسے دیکھا۔ اپنے کٹڑے کے بازار میں وہ دو والوں کی مصاحبی میں مصروف تھا۔ اس نے صاف ستھرے کوٹوں پر سے کئی مرتبہ غیر مرئی چیزیں جدا کیں۔ اس دن بھی وہ اپنی کالی اچکن پہنے تھا۔ حالانکہ کالے کپڑے پر گرد و غبار فوراً نمایاں ہوتا ہے، مگر میں نے غور سے دیکھا کہ اس پر ایسی کوئی چیز بھی

نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ جنٹل مینوں کے برش کے علاوہ اپنا برش خود بھی تھا۔

مجھے راستے میں ایک دوست مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ آبنوسی آدمی کون ہے؟''

اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون سا آبنوسی آدمی...... بن مانس سنے تھے مگر آبنوسی کہاں سے تم نے گھڑ لیا۔''

میں نے اس سے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''ارے یہ آدمی جو ہمارے آگے آگے جا رہا ہے...... چغد ہو پرلے درجے کے۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آبنوس ایک لکڑی ہوتی ہے۔''

''تو کیا یہ لکڑی ہے جو چل پھر رہی ہے؟''

''ابے نہیں...... آبنوس کا رنگ کالا ہوتا ہے، چونکہ اس نے کالی اچکن پہنی ہے''

اور رنگ بھی اس کا خدا کے فضل و کرم سے خاصا کالا ہے، تو میں نے اسے آبنوسی آدمی کہہ دیا۔

میرا دوست ہنسا ''ارے، تم اسے نہیں جانتے، اس کا نام جنٹل مینوں کا برش ہے۔''

''اتنا تو میں جانتا ہوں''

''تو اس سے زیادہ تم اور کیا جاننا چاہتے ہو؟''

میں نے چڑ کر کہا ''یہی کہ اس کا محل وقوع کیا ہے۔۔۔۔اس کا پیشہ کیا ہے؟''

میرا دوست مسکرایا ''یہ ذات کا ربابی ہے، جو دربار صاحب میں چوکی کرتے

ہیں۔۔۔۔مگر یہ وہاں نہیں جاتا‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’بس اس کو امیروں کی صحبت حاصل ہے ان میں ہی اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کے کوٹوں پر برش کرتا رہتا ہے۔‘‘

میں نے اس سے پوچھا ’’کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟‘‘

جواب ملا ’’جن کی مصاحب داری کرتا ہے۔۔۔اس کے علاوہ گاتا بہت اچھا ہے۔‘‘

میں نے پوچھا ’’تم نے کبھی سنا ہے اس کو؟‘‘

’’نہیں، البتہ تعریف بہت سنی ہے‘‘

ہم باتوں میں مشغول پیچھے رہ گئے اور وہ جنٹل مینوں کا آبنوسی برش ان دو لالوں کے کوٹ جھاڑتا بہت دور نکل گیا

تھوڑی دیر کے بعد میرا دوست بھی مجھ سے جدا ہو گیا اس کو کوئی ضروری کام تھا ورنہ میں اس شخص کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرتا۔

اتفاق سے مجھے اپنے بہنوئی (جو امرتسر کے آنریری مجسٹریٹ تھے اور خدا معلوم کیا کیا تھے) کے ساتھ ایک تقریب پر جانا پڑا۔ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ تقریب تھی جو نئے ڈپٹی کمشنر کے تقرر کے سلسلے میں تھی وہ شخص وہی کالی اچکن پہنے معزز اور رئیس لوگوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا اس نے بلا مبالغہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر چن چن کر کئی روساء کے کوٹ صاف کیے۔ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے۔ کسی کے کالر پر سے اس نے بال اٹھائے کسی کے کوٹ کی پیٹھ پر

سے۔۔۔بعضوں کے کوٹوں کو، جب اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ گرد اپنے رومال سے جھاڑ دی اور ہر ایک سے شکریہ وصول کیا۔

بڑی جرأت سے کام لے کر وہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس بھی جا پہنچا، اور اس کی پتلون صاف کر دی وہ انگریز تھا اس نے جنٹل مینوں کے برش کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد ایک رات جب کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی اور حفیظ پینٹر کی دکان میں ہم معشوق علی فوٹو گرافر سے اس کا گانا سن کر محظوظ ہو رہے تھے، اور ساتھ ساتھ وسکی بھی پی رہے تھے، کہ اچانک دکان کا پھاٹک نما دروازہ کھلا اور جنٹل مینوں کا برش نمودار ہوا۔ اس نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا ''میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ گانے کی آواز سنائی دی۔۔۔ ماشاء اللہ بڑی سریلی تھی۔۔۔ ہے تو یہ تہذیب کے خلاف کہ میں بن بلائے چلا آیا۔۔۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا تھوڑی دیر کے لیے آپ کی محفل میں شریک ہو سکتا ہوں''

حفیظ پینٹر اور معشوق علی فوٹو گرافر بیک وقت بولے ''ہاں۔۔۔ ہاں تشریف رکھیے۔''

مبارک نے کہا'' سر آنکھوں پر۔۔۔ یہاں میرے پاس بیٹھیے۔۔۔ آپ تو خود بڑے معرکے کے گانے والے ہیں۔۔۔ کچھ نوش فرمایئے گا''

مبارک کی مراد وسکی سے تھی، مگر جنٹل مینوں کے برش نے بڑی شائستگی سے کہا ''جی نہیں۔۔۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں''

سب کے اصرار پر اس نے گانا شروع کیا میاں کی ٹوڈی تھی جو اس نے ایسی خوش الحانی سے گائی کہ مزے آ گئے اس کے بعد اس نے اجازت چاہی۔۔۔۔۔سب نشے میں چور تھے، اس لیے ان کو یہ خبر نہیں تھی کہ باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔۔۔۔لیکن جب جنٹل مینوں کے برش نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا ''حضور! باہر بہت بارش ہو رہی ہے، کیسے جائیے گا''

آبنوسی برش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی ''آپ فکر نہ کریں، ابھی لالہ جگت نارائن کمبل والے کی گاڑی مجھے لینے کے لیے آ جائے گی۔۔۔آپ اپنا شغل جاری رکھیے۔۔۔۔شکریہ!''

یہ کہہ کر اس نے دکان کا پھاٹک نما دروازہ بند کر دیا

ایک گھنٹے کے بعد بارش تھمی تو محفل برخاست کر دی گئی۔۔۔۔۔باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ کوئی آدمی بدرو میں اوندھا گرا پڑا ہے۔۔۔۔میں نے غور سے دیکھا تو چلایا ''ارے یہ تو وہی جنٹل مینوں کا برش ہے''

حفیظ نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا'' جنٹل مینوں کی ایسی تیسی۔۔۔۔۔چلو اپنے اپنے گھر۔''

سب نے اس فیصلے پر صاد کیا۔۔۔جب وہ چلے گئے تو تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص جو بے داغ کالی اچکن پہنتا تھا اور روسا کے کوٹ صاف کیا کرتا ہے، ہوش میں آیا۔۔۔اس کی اچکن کیچڑ سے اٹی ہوئی تھی مگر اسے صاف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

جھوٹی کہانی

کچھ عرصے سے اقلیتیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بیدار ہو رہی تھیں ان کو خواب گراں سے جگانے والی اکثریتیں تھیں جو ایک مدت سے اپنے ذاتی فائدے کے لیے ان پر دباؤ ڈالتی رہی تھیں اس بیداری کی لہر نے کئی انجمنیں پیدا کر دی تھیں ہوٹل کے بیروں کی انجمن، حجاموں کی انجمن، کلرکوں کی انجمن، اخبار میں کام کرنے والے صحافیوں کی انجمن، ہر اقلیت اپنی انجمن یا تو بنا چکی تھی یا بنا رہی تھی تاکہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکے۔

ایسی ہر انجمن کے قیام پر اخباروں میں تبصرے ہوتے تھے اکثریت کے حمایتی ان کی مخالفت کرتے تھے اور اقلیت کے طرف دار موافقت غرضیکہ کچھ عرصے سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا جس سے رونق لگی رہتی تھی مگر ایک روز جب اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ **ملک** کے دس نمبری غنڈوں نے اپنی انجمن قائم کی ہے تو اکثریتیں اور اقلیتیں دونوں سنسنی زدہ ہو گئیں۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے خیال کیا کہ بے پر کی اڑا دی ہے کسی نے پر جب اس انجمن نے اپنے اغراض و مقاصد شائع کیے اور ایک باقاعدہ منشور ترتیب دیا تو پتا چلا کہ یہ کوئی مذاق نہیں۔ غنڈے اور بدمعاش واقعی خود کو اس انجمن کے سائے تلے متحد اور منظم کرنے کا پورا پورا تہیہ کر چکے ہیں۔

اس انجمن کی ایک دو میٹنگیں ہو چکی تھیں ان کی روداد اخباروں میں شائع ہو چکی تھی لوگ پڑھتے اور دم بخود ہو جاتے بعض کہتے کہ بس اب قیامت آنے میں

زیادہ دیر باقی نہیں۔

اغراض و مقاصد کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ غنڈوں اور بدمعاشوں کی یہ انجمن سب سے پہلے تو اس بات پر صدائے احتجاج بلند کرے گی کہ معاشرے میں ان کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ بھی دوسروں کی طرح بلکہ ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ امن پسند شہری ہیں ان کو غنڈے اور بدمعاش نہ کہا جائے اس لیے کہ اس سے ان کی تذلیل و توہین ہوتی ہے وہ خود اپنے لیے کوئی مناسب اور معزز نام تجویز کر لیتے۔ مگر اس خیال سے کہ اپنے منہ میاں مٹھو کی کہاوت ان پر چسپاں نہ ہو، وہ اس کا فیصلہ عوام و خواص پر چھوڑتے ہیں چوری چکاری ڈکیتی اور رہزنی، جیب تراشی اور جعل سازی، سٹے بازی اور بلیک مارکیٹنگ وغیرہ، افعال قبیحہ کے بجائے فنون لطیفہ میں شمار ہونے چاہئیں ان لطیف فنون کے ساتھ اب تک جو برا سلوک روا رکھا گیا ہے اس کی مکمل تلافی اس یونین کا نصب العین ہے۔

ایسے ہی کئی اور اغراض و مقاصد تھے جو سننے اور پڑھنے والوں کو بڑے عجیب و غریب معلوم ہوتے تھے بظاہر ایسا تھا کہ چند بے فکرے ظریفوں نے لوگوں کی تفریح کے لیے یہ سب باتیں گھڑی ہیں۔ یہ چٹکلہ ہی تو معلوم ہوتا تھا کہ یونین اپنے ممبروں کی قانونی حفاظت کا ذمہ لے گی اور ان کی سرگرمیوں کے لیے سازگار اور خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے پوری پوری جدوجہد کرے گی وہ حکام وقت پر زور دے گی کہ یونین کے ہر رکن پر اس کے مقام اور رتبے کے لحاظ سے مقدمہ چلایا جائے اور سزا دیتے وقت بھی اس کو پیش نظر رکھا جائے۔ حکومت لوگوں کو اپنے

گھروں میں چوروں کا برقی الارم نہ لگانے دے اس لیے کہ بعض اوقات یہ ہلاکت خیز ثابت ہوتا ہے جس طرح سیاسی قیدیوں کو جیل میں اے اور بی کلاس کی مراعات دی جاتی ہیں، اسی طرح اس یونین کے ممبروں کو دی جائیں یونین اس بات کا بھی ذمہ لیتی تھی کہ وہ اپنے ممبروں کو ضعیف اور ناکارہ یا کسی حادثے کا شکار ہو جانے کی صورت میں ہر ماہ گزارے کے لیے معقول رقم دے گی جو ممبر کسی خاص شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے باہر کے ممالک میں جانا چاہے گا اسے وظیفہ دے گی وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اخباروں میں اس یونین کے قیام پر خوب تبصرہ بازی ہوئی قریب قریب اس کے خلاف تھے بعض رجعت پسند کہتے تھے کہ یہ کمیونزم کی انتہائی شکل ہے اور اس کے بانیوں کے ڈانڈے کریملن سے ملاتے تھے حکومت سے چنانچہ بار بار درخواست کی جاتی کہ وہ اس فتنے کو فوراً کچل دے، کیونکہ اگر اس کو ذرا بھی پنپنے کا موقع دیا گیا تو معاشرے میں ایسا زہر پھیلے گا کہ اس کا تریاق ملنا مشکل ہو جائے گا۔

خیال تھا کہ ترقی پسند اس یونین کی طرف داری کریں گے کہ اس میں ایک جدت تھی اور پرانی قدروں سے ہٹ کر اس نے اپنے لیے ایک بالکل نیا راستہ تلاش کیا تھا اور پھر یہ کہ رجعت پسند اسے کمیونسٹوں کے اختراع سمجھتے تھے مگر حیرت ہے کہ اقلیتوں کے یہ سب سے بڑے طرف دار پہلے تو اس معاملے میں خاموش رہے اور بعد میں دوسروں کے ہم نوا ہو گئے اور اس یونین کی بیخ کنی پر زور دینے لگے۔

اخباروں میں ہنگامہ برپا ہوا تو ملک کے گوشے گوشے میں اس یونین کے قیام

کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ قریب قریب ہر پارٹی کے نامی وگرامی لیڈروں نے پلیٹ فارم پر آکر اس ننگ تہذیب وتمدن جماعت کو ملعون قرار دیا اور کہا کہ یہی وقت ہے جب تمام لوگوں کو اپنے آپس کے جھگڑے چھوڑ کر اس فتنہ عظیم کا مقابلہ کرنے کے لیے اتحاد، نظم اور یقین محکم کو اپنا موٹو بنا کر ڈٹ جانا چاہیے۔

اس سارے ہنگامے کا جواب یونین کی طرف سے ایک پوسٹر کے ذریعے سے دیا گیا جس میں بڑے اختصار کے ساتھ یہ کہا گیا کہ پریس اکثریت کے ہاتھ میں ہے قانون اس کی پشت پر ہے، مگر انجمن کے حوصلے اور ارادے پست نہیں ہوئے وہ کوشش کر رہی ہے کہ بہت سی رقم دے کر کچھ اخبار خرید لے اور ان کو اپنے حق میں کرلے۔

یہ پوسٹر ملک کے درودیوار پر نمودار ہوا، تو فوراً بعد کئی شہروں سے بڑی بڑی چوریوں اور ڈکیتیوں کی اطلاعیں وصول ہوئیں۔ اور اس کے چند روز بعد جب ایکا ایکی دو اخباروں نے دبی زبان میں غنڈوں اور بدکاروں کی یونین کے اغراض و مقاصد میں اصلاحی پہلو کریدنا شروع کیا تو لوگ سمجھ گئے کہ پس پردہ کیا ہوا ہے۔

پہلے ان دو اخباروں کی اشاعت ہونے نہ ہونے کے برابر تھی نہایت ہی گھٹیا کاغذ پر چھپتے تھے لیکن دیکھتے دیکھتے ہی کچھ ایسی کایا کلپ ہوئی کہ لوگ دنگ رہ گئے سب سے اچھا ایڈیٹوریل اسٹاف ان دو پرچوں کے پاس تھا دفتر میں ایک کے بجائے دو دو ٹیلی پرنٹر تھے تنخواہ مقررہ وقت سے پہلے مل جاتی تھی بونس الگ ملتا تھا گھر کا الاؤنس، تانگے کا الاؤنس، سگریٹوں کا الاؤنس، چائے کا الاؤنس، مہنگائی الاؤنس، یہ سب الاؤنس مل کر تنخواہ سے دوگنے ہو جاتے تھے۔ جو دختِ رز کے رسیا

تھے، ان کو مفت پرمٹ ملتا تھا اور بہترین سکاچ وسکی کنٹرولڈ قیمت پر دستیاب ہوتی تھی عملے کے ہر آدمی سے باقاعدہ کنٹریکٹ کیا گیا تھا جس میں مالک کی طرف سے یہ اقرار تھا کہ اگر اس کے گھر میں کبھی چوری ہوئی، یا اس کی جیب کاٹ لی گئی تو اسے نقصان کے علاوہ ہرجانہ بھی ادا کیا جائے گا۔

ان دو اخباروں کی اشاعت دیکھتے دیکھتے ہزاروں تک پہنچ گئی تعجب ہے کہ پہلے جب ان کی اشاعت کچھ بھی نہیں تھی تو یہ ہر روز کثیر الاشاعت ہونے کے بلند بانگ دعوے کرتے تھے، مگر جب ان کی کایا کلپ ہوئی تو اس معاملے میں بالکل خاموش ہو گئے بیک وقت البتہ ان دونوں اخباروں نے کچھ عرصے کے بعد یہ اعلان چھاپا کہ ہماری اشاعت اس حد تک جا پہنچی ہے کہ اگر ہم نے اس سے تجاوز کیا تو تجارتی نقطہ نظر سے نقصان ہی نقصان ہے۔

ان کے علمی و ادبی اڈیشنوں میں عجیب و غریب موضوعات پر مضمون شائع ہوتے تھے، یہ چار پانچ تو بڑے ہی سنسنی خیز تھے۔

بلیک مارکیٹنگ کے فوائد۔۔۔۔۔معاشیات کی روشنی میں

معاشرتی اور مجلسی دائرے میں قحبہ خانوں کی اہمیت

دروغ گورا حافظہ باشد۔۔۔۔۔جدید سائنٹفک تحقیق

بچوں میں قتل و غارت گری کے فطری رجحانات۔۔۔۔۔سادیت پر سیر حاصل تبصرہ دنیا کے خوف ناک ڈاکو اور تقدیس مذہب

اشتہار بھی کم عجیب و غریب نہیں تھے ان میں مشتہر کا نام اور پتا نہیں ہوتا تھا سرخیاں دے کر مطلب کی بات مختصر لفظوں میں ادا کر دی جاتی تھی چند سرخیاں

ملاحظہ ہوں۔

چوری کے زیورات خریدنے سے پہلے ہمارا نشان ضرور دیکھ لیا کریں جو کھرے مال کی ضمانت ہے۔

بلیک مارکیٹ میں صرف اسی فلم کے ٹکٹ فروخت کیے جاتے ہیں جو تفریح کا بہترین سامان پیش کرتا ہے

دودھ میں کن طریقوں سے ملاوٹ کی جاتی ہے رسالہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی مطالعہ فرمائیے۔

ٹونے، ٹوٹکے، گنڈے اور تعویذ، عمل ہمزاد اور تسخیر محبوب کے جنتر منتر سب جھوٹے ہیں خود کو دھوکا دینے کے بجائے معشوق کو دھوکا دیجیے۔

کھانے پینے کو صرف وہ چیزیں خریدیئے جن میں ضرر رساں چیزوں کی ملاوٹ نہ ہو

ایک الگ کالم میں ''بلیک مارکیٹ کے آج کے بھاؤ'' کے عنوان تلے ان تمام چیزوں کی کنٹرولڈ قیمت درج ہوتی تھی جو صرف بلیک مارکیٹ سے دستیاب ہوتی تھیں لوگوں کا کہنا تھا کہ ان قیمتوں میں ایک پائی کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ جو چھپے چوری، چوری کا خاص نشان لگایا ہوا مال خریدتے تھے ارزاں قیمت پر سولہ آنے کھرا مال ملتا تھا۔

غنڈوں، چوروں اور بدکاروں کی انجمن جب آہستہ آہستہ نیک نامی حاصل کرنے لگی تو ارباب بست وکشاد کی تشویش دو چند ہوگئی حکومت نے اپنی طرف سے خفیہ طور پر بہت کوشش کی کہ اس کے اڈے کا سراغ لگائے مگر کچھ پتہ نہ چلا

یونین کی تمام سرگرمیاں زیر زمین یعنی انڈر گراؤنڈ تھیں اونچی سوسائٹی کے چند اراکین کا خیال تھا کہ پولیس کے بعض بدقماش افسر اس یونین سے ملے ہوئے ہیں بلکہ اس کے باقاعدہ ممبر ہیں اور ہر ماہ اپنی ناجائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی آمدن کا بیشتر حصہ بطور چندہ دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قانون کا نشتر معاشرے کے اس نہایت ہی مہلک پھوڑے تک نہیں پہنچ سکا۔۔۔۔ جتنے منہ اتنی باتیں مگر یہ بات قابل غور تھی کہ عوام میں جو اس یونین کے قیام سے بے چینی پھیلی تھی اب بالکل مفقود تھی متوسط طبقہ اس کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا صرف اونچی سوسائٹی تھی جو دن بدن خائف ہوتی جا رہی تھی۔

اس یونین کے خلاف یوں تو آئے دن تقریریں ہوتی تھیں اور جگہ جگہ جلسے منعقد ہوتے تھے، مگر اب وہ پہلا سا جوش وخروش نہیں تھا چنانچہ اس کو از سرنو شدید بنانے کے لیے ٹاؤن ہال میں ایک بہت عظیم الشان جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔قریب قریب ہر شہر کی معزز ہستیوں کو نمائندگی کے لیے مدعو کیا گیا مقصد اس جلسے کا یہ تھا کہ اتفاق رائے سے غنڈوں، شہدوں اور بدکاروں کی اس یونین کے خلاف مذمت کا ووٹ پاس کیا جائے اور عوام الناس کو ان خوفناک جراثیم سے کماحقہ آگاہ کیا جائے جو اس کے وجود سے معاشری ومجلسی دائرے میں پھیل چکے ہیں اور بڑی سرعت سے پھیل رہے ہیں۔

جلسے کی تیاری پر ہزاروں روپے خرچ کیے گئے مجلس انتظامیہ اور مجلس استقبالیہ نے مندوبین کے آرام وآسائش کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کی کئی اجلاس ہوئے اور بڑے کامیاب رہے ان کی رپورٹ یونین کے پرچوں میں من وعن شائع ہوتی

رہی۔ مذمت کے جتنے ووٹ پاس ہوئے بلا تبصرہ چھپتے رہے دونوں اخباروں میں ان کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔

آخری اجلاد بہت اہم تھا ملک کی تمام مکرم و معظم ہستیاں جمع تھیں امراء و وزراء سب موجود تھے حکومت کے اعلیٰ اعلیٰ افسر بھی مدعو تھے بڑے زور دار الفاظ میں تقریریں ہوئیں اور مذہبی، مجلسی، معاشی، جمالیاتی اور نفسیاتی، غرض کہ ہر ممکن نقطہ نظر سے غنڈوں اور بد معاشوں کی تنظیم کے خلاف دلائل و براہین پیش کیے گئے اور ثابت کر دیا گیا کہ اس طبقہ اسفل کا وجود حیات انسانی کے حق میں زہر قاتل ہے مذمت کا آخری ریزولیشن جو بڑے باثر الفاظ پر مشتمل تھا اتفاق رائے سے پاس ہوا تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا جب تھوڑا سکون ہوا تو پچھلے بنچوں میں ایک شخص کھڑا ہوا اس نے صدر سے مخاطب ہو کر کہا ''صاحب صدر! اجازت ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں''

سارے ہال کی نگاہیں اس آدمی پر جم گئیں صدر نے بڑی تمکنت سے پوچھا'' میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں؟''

اس شخص نے جو بڑے سادہ مگر خوش وضع کپڑوں میں ملبوس تھا تعظیم کے ساتھ کہا ''ملک و ملت کا ایک ادنیٰ ترین خادم'' اور کورنش بجا لایا

صدر نے چشمہ لگا کر اسے غور سے دیکھا اور پوچھا'' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں''

اس معمہ نما مرد نے مسکرا کر کہا'' کہ۔۔۔۔۔۔ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں''

اس پر سارے ہال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں ڈائس پر خصوصاً سب کے سب معززین اور قائدین سوالیہ نشان بن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے

صدر نے اپنی تمکنت کو ذرا اور تمکین بنا کر پوچھا ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''میں ابھی عرض کرتا ہوں'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک بے داغ سفید رومال نکالا اپنا منہ صاف کیا اور اسے واپس جیب میں رکھ کر بڑے پارلیمانی انداز میں گویا ہوا ''صاحب صدر اور معزز حضرات۔۔۔۔۔'' ڈائس کے ایک طرف دیکھ کر وہ رک گیا معافی کا طلب گار ہوں۔۔۔ محترمہ بیگم مرزبان خلاف معمول آج پچھلے صوفے پر تشریف فرما ہیں۔۔۔ صاحب صدر، خاتون مکرم اور معزز حضرات!

بیگم مرزبان نے وے نیٹی بیگ میں سے آئینہ نکال کر اپنا میک اپ دیکھا اور غور سے سننے لگی باقی بھی ہمہ تن گوش تھے۔

اس شخص نے بڑی شائستگی سے کہنا شروع کیا

''حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز''

کچھ دیر رک کر وہ ایک ادا سے مسکرایا ''حضرت غالب!۔۔۔۔۔ اس اجلاس میں اور اس سے پہلے مجلسی دائرے کے ایک مفروضہ طبقہ اسفل کے بارے میں جو زہر فشانی کی گئی ہے، آپ کے اس خاکسار نے بڑے غور سے سنی ہے۔''

سارے ہال میں کھسر پھسر ہونے لگی صدر کی ناک کے بانسے پر چشمہ پھسل گیا

''آپ ہیں کون؟''

سر کے ایک ہلکے سے خم کے ساتھ اس شخص نے جواب دیا ''**ملک و ملت**'' کا ایک ادنیٰ خادم۔۔۔ مجلسی دائرے کے مفروضہ طبقہ اسفل کی جماعت کا ایک رکن

جسے اس کی نمائندگی کا فخر حاصل ہے!

ہال میں کسی نے زور سے "واہ" کہا اور تلا ی بجائی چوروں، اچکوں اور غنڈوں کی یونین کے نمائندے نے سر کو پھر ہلکی سی جنبش دی اور کہنا شروع کیا" کیا عرض کروں کچھ کہا نہیں جاتا۔"

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اس اجلاس میں اس جماعت کے خلاف جس کا یہ خاکسار نمائندہ ہے اس قدر گالیاں دی گئی ہیں اس قدر لعنت ملامت کی گئی ہے کہ صرف اتنا کہنے کو جی چاہتا ہے

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

صاحب صدر، محترمہ بیگم مرزبان اور معزز حضرات!

بیگم مرزبان کی لپ اسٹک مسکرائی بولنے والے نے آنکھیں اور سر جھکا کر تسلیم عرض کیا" محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات ۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں میری جماعت کا کوئی ہمدرد موجود نہیں آپ میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو ہمارا طرف دار ہو۔"

دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی ایک تمنائے دوا ہے تو سہی

ڈائس پر ایک اچکن پوش رئیس کلے میں پان دبا کر بولے" مکرر!"

صدر نے جب ان کی طرف سرزنش بھری نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے

چوروں اور بدکاروں کی یونین کے نمائندے کے پتلے پتلے ہونٹوں پر شفاف مسکراہٹ نمودار ہوئی ”میں اپنی مختصر تقریر میں جو شعر بھی استعمال کروں گا۔۔۔حضرت غالب کا ہوگا!“

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن سے کہا ”آپ تو بڑے لائق معلوم ہوتے ہیں“ بولنے والا کورنش بجالایا اور مسکرا کر کہنے لگا

”سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے!“

سارا حال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا بیگم مرزبان نے اٹھ کر صدر کے کان میں کچھ کہا جس نے حاضرین کو چپ رہنے کا حکم دیا خاموشی ہوئی تو چوروں اور لفنگوں کی یونین کے نمائندے نے پھر بولنا شروع کیا ”صاحب صدر محترم بیگم مرزبان اور معزز حضرات“

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

۔۔۔۔۔۔لیکن سچ پوچھیے تو اس سے تسلی نہیں ہوتی میں تاسف کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس طبقے کے ساتھ جس کی نمائندگی میری جماعت کرتی ہے نہایت بے انصافی ہوئی ہے اس کو اب تک بالکل غلط رنگ میں دیکھا جاتا رہا ہے اور یہی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ اسے ملعون و مطعون قرار دے کر خارج از سماج کر دیا جائے میں ان مطہر ہستیوں کو کیا کہوں جنہوں نے اس شریف اور معزز طبقے کو سنگسار کرنے کے لیے پتھر اٹھائے ہیں۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے
اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

صدر نے دفعتاً گرج کر کہا "خاموش۔۔۔۔بس اب آپ کو مزید بولنے کی اجازت نہیں ہے۔"

مقرر نے مسکرا کر کہا "حضرت غالب کی اسی غزل کا ایک شعر ہے"

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا صدر نے اجلاس برخاست کرنا چاہا مگر لوگوں نے کہا کہ نہیں چوروں اور غنڈوں کی یونین کے نمائندے کی تقریر ختم ہو جائے تو کارروائی بند کی جائے۔ صدر اور دوسرے اراکین اجلاس نے پہلے آمادگی ظاہر نہ کی لیکن بعد میں رائے عامہ کے سامنے انہیں جھکنا پڑا مقرر کو بولنے کی اجازت مل گئی۔

اس نے صاحب صدر کا مناسب و موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور کہنا شروع کیا "ہماری یونین کو صرف اس لیے نفرت و تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ چوروں، اٹھائی گیروں، رہزنوں اور ڈاکوؤں کی انجمن ہے جو ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قائم کی گئی ہے میں آپ لوگوں کے جذبات بخوبی سمجھتا ہوں آپ کا فوری رد عمل کس قسم کا تھا، میں اس کا تصور بھی کر سکتا ہوں مگر چوروں، ڈاکوؤں اور رہزنوں کے حقوق کیا نہیں ہوتے؟ یا نہیں ہو سکتے؟ میں سمجھتا ہوں کوئی سلیم الدماغ آدمی ایسا نہیں سوچ سکتا۔۔۔۔۔جس طرح سب سے پہلے آپ انسان ہیں، بعد میں سیٹھ صاحب ہیں، رئیس اعظم ہیں، میونسپل کمشنر ہیں، وزیر داخلہ ہیں یا خارجہ اسی طرح وہ

بھی سب سے پہلے آپ ہی کی طرح انسان ہے، چور، ڈاکو، اٹھائی گیرا، جیب کترا اور بلیک مارکیٹر بعد میں ہے۔ جو حقوق دوسرے انسانوں کو اس سقف نیلوفری کے نیچے مہیا ہیں، وہ اسے بھی مہیا ہیں اور ہونے چاہئیں جن نعمتوں سے دوسرے انسان متمتع ہوتے ہیں ان سے وہ بھی مستفیض ہونے کا حق رکھتا ہے۔۔۔۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک چور یا ڈاکو کیوں شے لطیف سے خالی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں اسے ایک ایسا شخص متصور کیا جاتا ہے جو معمولی حسیات سے بھی عاری ہے۔۔۔۔ معاف فرمائیے وہ اچھا شعر سن کر اسی طرح پھڑک اٹھتا ہے جس طرح کوئی دوسرا سخن فہم صبح بنارس اور شام اودھ سے صرف آپ ہی لطف اندوز نہیں ہوتے وہ بھی ہوتا ہے۔ ہڑتال کی اس کو بھی خبر ہے۔ وہ صرف پولیس کے ہاتھوں ہی گرفتار ہونا نہیں جانتا کسی حسینہ کے دام الفت میں گرفتار ہونے کا سلیقہ بھی جانتا ہے شادی کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے۔ ان کو چوری سے منع کرتا ہے جھوٹ بولنے سے روکتا ہے۔۔۔۔ خدانخواستہ اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کے دل کو صدمہ بھی پہنچتا ہے" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کسی قدر گلوگیر ہو گئی لیکن فوراً ہی اس نے رخ بدلا اور مسکراتے ہوئے کہا" حضرت غالب کے اس شعر کا جو مزہ وہ لے سکتا ہے، معاف کیجئے آپ میں سے کوئی بھی نہیں لے سکتا۔"

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو!

سارا ہال شگفتہ ہو کر ہنسنے لگا بیگم مرزبان بھی جو تقریر کے آخری حصے پر کچھ افسردہ سی ہو گئی تھیں مسکرائیں مقرر نے اسی طرح پتلی پتلی شفاف مسکراہٹ کے

ساتھ کہنا شروع کیا ''مگر اب ایسے دعا دینے والے کہاں!''

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن کے ساتھ آہ بھر کر کہا'' اور وہ رہزن بھی کہاں؟''

مقرر نے تسلیم کیا'' آپ نے بجا ارشاد فرمایا بیگم مرزبان ہمیں اس افسوسناک حقیقت کا کامل احساس ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے مل کر اپنی انجمن بنا ڈالی ہے مرورزمانہ کے ساتھ رہزن، چور اور جیب کترے فریب سب اپنی اپنی روش اور وضعداری بھول گئے ہیں لیکن مقام مسرت ہے کہ وہ اب بہت تیزی سے اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔۔۔۔لیکن میں ان حضرات سے جو ان غریبوں کی بیخ کنی میں مصروف ہیں یہ گستاخانہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی اصلاح کے لیے اب تک انہوں نے کیا کیا ہے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر تقابل کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں نہایت ذلیل، چور اور سفاک ڈاکو کہا جاتا ہے، مگر وہ لوگ کیا ہیں۔۔۔۔کچھ اس عالی مرتبت ڈائس پر بھی بیٹھے ہیں جو عوام کا مال و متاع دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہے ہیں''

ہال میں ''شیم شیم'' کے نعرے بلند ہوئے

مقرر نے کچھ توقف کے ساتھ کہنا شروع کیا'' ہم چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، مگر اسے کوئی اور نام نہیں دیتے یہ معزز ہستیاں بدترین قسم کی ڈاکہ زنی کرتی ہیں مگر یہ جائز سمجھی جاتی ہے اپنی آنکھ کے اس طویل و عریض اور بھاری بھرکم شہتیر کو کوئی نہیں دیکھتا اور نہ دیکھنا چاہتا ہے۔۔۔۔کیوں؟۔۔۔۔یہ بڑا گستاخ سوال ہے میں اس کا جواب سننا چاہتا ہوں چاہے وہ اس سے بھی زیادہ گستاخ

ہو۔۔۔‘‘تھوڑے توقف کے بعد وہ مسکرایا ’’وزیر صاحبان اپنی مسند وزارت کی سان پر استرا تیز کر کے ملک کی ہر روز حجامت کرتے رہیں یہ کوئی جرم نہیں، لیکن کسی کی جیب سے بڑی صفائی کے ساتھ بٹوہ چرانے والا قابل تعزیر ہے۔۔۔تعزیر کو چھوڑیئے مجھے اس پر کوئی زیادہ اعتراض نہیں۔۔۔وہ آپ کی نظروں میں قابل گردن زدنی ہے۔‘‘

ڈائس پر بہت سے حضرات بے چینی اور اضطراب محسوس کرنے لگے۔۔۔بیگم مرزبان مسرور تھیں۔

مقرر نے اپنا گلا صاف کیا، پھر کہنا شروع کیا ’’تمام محکموں میں اوپر سے لے کر نیچے تک رشوت ستانی کا سلسلہ قائم ہے یہ کسے معلوم نہیں کیا یہ بھی کوئی راز ہے جس کے انکشاف کی ضرورت ہے کہ خویش پروری اور کنبہ نوازی کی بدولت سخت نا اہل، خر دماغ اور بد قماش بڑے بڑے عہدے سنبھالے بیٹھے ہیں۔ معاف فرمایئے گا ادھر ہمارے طبقے میں ایسے افسوس ناک حالات موجود نہیں ہیں کوئی چور اپنے کسی عزیز کو بڑی چوری کے لیے منتخب نہیں کرے گا ہمارے ہاں لوگ اس قسم کی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا بھی چاہیں تو نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے کہ چوری کرنے، جیب کاٹنے یا ڈاکہ ڈالنے کے لیے دل گردے اور مہارت و قابلیت کی ضرورت ہے یہاں کوئی سفارش کام نہیں آتی۔ ہر شخص کا کام ہی خود اس کا امتحان ہوتا ہے جو اس کو فوراً نتیجے سے باخبر کر دیتا ہے۔‘‘

ہال میں سب خاموش تھے اور بڑے غور سے تقریر سن رہے تھوڑے سے وقفے کے بعد مقرر کی آواز پھر بلند ہوئی ’’میں بدکاری معاف کر سکتا ہوں لیکن خامکاری ہر

گز ہرگز معاف نہیں کرسکتا۔۔۔۔وہ لوگ یقیناً قابل مواخذہ ہیں جو نہایت ہی بھونڈے طریقے پر ملک کی دولت لوٹتے ہیں ایسے بھونڈے طریقے پر کہ ان کے کرتوتوں کے بھانڈے ہر دوسرے روز چوراہوں میں پھوٹتے ہیں وہ پکڑے جاتے ہیں مگر بچ نکلتے ہیں کہ ان کے نام دس نمبر کے بستہ الف میں درج ہیں نہ بستہ ب میں۔۔۔۔یہ کس قدر نا انصافی ہے۔۔۔۔۔میں تو سمجھتا ہوں بے چارے انصاف کا۔۔۔اندھے انصاف کا خون یہیں پر ہوتا ہے۔۔۔۔۔نہیں ایسے اور بھی کئی مقتل ہیں جہاں انصاف، انسانیت، شرافت و نجابت، تقدیس و طہارت، دین و دنیا، سب کو ایک ہی پھندے میں ڈال کر ہر روز پھانسی دی جاتی ہے۔۔۔۔میں پوچھتا ہوں انسانوں کی خام کھالوں کی تجارت کرنے والے ہم ہیں یا آپ۔۔۔۔۔میں سوال کرتا ہوں، ازمنہ عتیق کی بربریت کی طرف امن پسند انسانوں کو کشاں کشاں کھینچ کر لے جانے والے ہم ہیں یا آپ۔۔۔اور استفسار کرتا ہوں کہ دوسری اجناس کی ملاوٹ کرکے اپنے ایمان کو آپ بیچتے ہیں یا ہم؟"

ہال پر قبر کی سی خاموشی طاری تھی مقرر نے جیب سے اپنا سفید رومال نکال کر منہ صاف کیا اور اسے ہوا میں لہرا کر کہا "صاحب صدر، خاتون مکرم اور معزز حضرات مجھے معاف فرمایئے کہ میں ذرا جذبات کی رو میں بہہ گیا۔۔۔۔عرض ہے کہ جدھر نظر اٹھائی جائے ایمان فروش ہوتا ہے یا ضمیر فروش، وطن فروش ہوتا ہے یا ملت فروش سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی فروخت کرنے کی چیزیں ہیں انسان تو انہیں نہایت مشکل وقت میں بھی ایک لمحے کے لیے گرو نہیں رکھ سکتا مگر میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں معاف کیجئے میرے لہجے میں پھر تلخی پیدا ہوگئی"

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ کہتا وہ ڈائس کی طرف بڑھا" صاحب صدر، محترمہ بیگم مرزبان اور معزز حضرات! میں اپنی یونین کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے لب کشائی کا موقعہ دیا" ڈائس کے پاس پہنچ کر اس نے صدر کی طرف ہاتھ بڑھایا" میں ایک دوست کی حیثیت سے رخصت چاہتا ہوں۔"

صدر نے ہچکچاتے ہوئے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اس کے بعد اس نے بیگم مرزبان کی طرف ہاتھ بڑھایا" اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔۔۔۔"

بیگم مرزبان نے بڑے بھولپن سے اپنا ہاتھ پیش کر دیا باقی معززین اور رؤسا سے ہاتھ ملا کر جب فارغ ہوا تو خدا حافظ کہہ کر چلنے لگا لیکن فوراً ہی رک گیا اپنی دونوں جیبوں سے اس نے بہت سی چیزیں نکالیں اور صدر کی میز پر ایک ایک کر کے رکھ دیں پھر وہ مسکرایا" ایک عرصے سے جیب تراشی چھوڑ چکا ہوں آج کل سیف توڑنا میرا پیشہ ہے۔۔۔۔۔آج صرف ازراہ تفریح آپ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر دیا" یہ کہہ کر وہ بیگم مرزبان سے مخاطب ہوا" خاتون مکرم معاف کیجئے آپ کے وینٹی بیگ سے بھی میں نے ایک چیز نکالی تھی مگر وہ ایسی ہے کہ سب کے سامنے آپ کو واپس نہیں کر سکتا۔"

اور وہ تیزی کے ساتھ ہال سے باہر نکل گیا

8 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆☆

جیب کفن

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

(غالب)

جی چاہتا ہے آج آپ سے اپنی تحریریں پڑھنے والوں سے تمام ''مقدمائی اور دیباجائی'' تکلفات بر طرف رکھ کے باتیں کروں یوں تو میرے افسانوں، ڈراموں اور نیم افسانوی مضمونوں میں بھی اکثر ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا تعلق براہ راست دل و دماغ کے اس خانے سے ہوتا ہے جو عام طور پر انسان کی اپنی ذات کے لیے مخصوص ہوتا ہے لیکن ان پر چوکھٹا چونکہ افسانے کا ہوتا ہے اس لیے آپ انہیں اسی شکل میں دیکھتے رہے ہیں۔

آج میرا دل بہت افسردہ ہے ایک عجیب سا اضمحلال اس پر چھایا ہوا ہے چار ساڑھے چار برس پہلے جب میں نے اپنے دوسرے وطن بمبئی کو خیر باد کہی تھی تو میرا دل اسی طرح مغموم تھا مجھے وہ جگہ چھوڑنے کا صدمہ تھا جہاں میں نے اپنی زندگی کے بڑے پر مشقت دن گزارے تھے اس خطہ زمین نے مجھ ایسے آوارہ اور خاندان کے دھتکارے ہوئے انسان کو اپنے دامن میں جگہ دی تھی اس نے مجھ سے کہا تھا تم یہاں دو پیسے روزانہ پر بھی خوش رہ سکتے ہو اور دس ہزار روپے روزانہ پر بھی اگر تم چاہو تو دونوں صورتوں میں دنیا کے مغموم ترین انسان کی زندگی بسر کر سکتے ہو یہاں تم جو چاہو کرو تمہاری عیب جوئی کوئی نہیں کرے گا یہاں تمہیں کوئی

ناصح بھی نہیں ملے گا ہر کٹھن کام تمہیں خود کرنا ہوگا اپنی زندگی کا ہر اہم فیصلہ تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا تم فٹ پاتھ پر رہو یا کسی عالیشان محل میں اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تم جاؤ یا رہو مجھے اس سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا میں جہاں ہوں موجود ہوں اور موجود رہوں گی۔

یہاں بارہ برس رہنے کے بعد جو کچھ میں نے سیکھا یہ اسی کا باعث ہے کہ میں یہاں پاکستان میں موجود ہوں یہاں سے کہیں اور چلا گیا تو وہاں بھی موجود رہوں گا میں چلتا پھرتا بمبئی ہوں جہاں بھی قیام کروں گا وہیں میرا اپنا جہان آباد ہو جائے گا۔

بمبئی چھوڑنے کے بعد میں افسردہ تھا میرے وہاں دوست تھے جن کی دوستی پر مجھے ناز ہے، وہاں میری شادی ہوئی، وہیں میرا پہلا بچہ ہوا دوسرے نے بھی اپنی زندگی کا پہلا دن وہیں شروع کیا میں نے وہاں چند روپوں سے لے کر ہزاروں اور لاکھوں تک کمائے اور خرچ کیے مجھے اس سے محبت تھی اور آج بھی ہے۔

ملک کے بٹوارے سے جو انقلاب برپا ہوا اس سے میں ایک عرصے تک باغی رہا اور اب بھی ہوں لیکن بعد میں اس خوفناک حقیقت کو میں نے تسلیم کر لیا مگر اس طرح کہ مایوسی کو میں نے اپنے پاس تک نہ آنے دیا۔

میں نے اس خون کے سمندر میں غوطہ لگایا جو انسان نے انسان کی رگوں سے بہایا تھا اور چند موتی چن کر لایا، عرق انفعال کے، مشقت کے جو اس نے اپنے بھائی کے خون کا آخری قطرہ بہانے میں صرف کی تھی ان آنسوؤں کے جو اس جھنجھلاہٹ میں کچھ انسانوں کی آنکھوں سے نکلے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کیوں ختم

نہیں کر سکے۔۔۔۔۔یہ موتی میں نے اپنی کتاب "سیاہ حاشیے میں پیش کیے۔"

میں انسان ہوں، وہی انسان جس نے انسانیت کی عصمت دری کی تھی جس نے فنا کو بادہ ہر جام بنایا تھا جس نے دوسری اجناس کی طرح انسان کے گوشت پوست کو دکانوں میں سجا سجا کر بیچا تھا میں وہی انسان ہوں جس نے پیغمبری کا رتبہ حاصل کیا اور میں وہی انسان ہوں جس نے پیغمبروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔۔۔۔۔۔مجھ میں وہ تمام کمزوریاں اور خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہیں یقین مانیے کہ مجھے اس وقت دکھ ہوا بہت بڑا دکھ جب میرے چند ہمعصروں نے میری اس کوشش کا مضحکہ اڑایا، مجھے لطیفہ باز، یا وہ گو، سنکی، نا معقول اور رجعت پسند کہا گیا۔میرے ایک عزیز دوست نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے لاشوں کی جیبوں میں سے سگریٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں نکال کر جمع کی ہیں اس عزیز نے میرے نام ایک کھلی چٹھی بھی شائع کی جو وہ بڑی آسانی سے مجھے خود دے سکتے تھے۔اس میں بھی انہوں نے "سیاہ حاشیے" کی تضحیک میں کھلے طور پر قلمکاری کی۔

میں انسان ہوں مجھے غصہ آیا میں نے اس عالم میں اس کیچڑ کے جواب میں ایسی کیچڑ تیار کی جو بہت دیر تک میرے نام نہاد نقادوں کے چہروں پر جمی رہتی لیکن میں نے سوچا اور محسوس کیا کہ ایسا کرنا غلطی ہے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا انسان کی خصلت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں لیکن خاموش رہنا اس کی دانشمندی ہے اس کا تحمل ہے اس کی بردباری ہے۔

مجھے غصہ تھا اس کا نہیں کہ الف نے مجھے کیوں غلط سمجھا مجھے غصہ تھا اس بات کا

کہ الف نے محض فیشن کے طور پر ایک سقیم و عقیم تحریک کی انگلی پکڑ کر بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر میری نیت پر شک کیا اور مجھے اس کسوٹی پر پرکھا۔ جس پر صرف ''سرخی'' ہی سونا تھی۔

مجھے غصہ تھا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے یہ کیسے ترقی پسند ہیں جو تنزل کی طرف جاتے ہیں یہ ان کی سرخی کیسی ہے جو سیاہی کی طرف دوڑتی ہے یہ ان کی مزدور دوستی کیا ہے جو مزدور کو پسینہ بہانے سے پہلے ہی مزدوری کے مطالبے پر اکسا رہی ہے یہ ان کی سرمائے کے خلاف محنت کی مبارزت کس قسم کی ہے کہ یہ خود سرمائے سے مسلح ہونا چاہتے ہیں اور اپنے محبوب ہتھیار درانتی اور ہتھوڑا اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں دے رہے ہیں یہ ان کا ادب میں کس قسم کا اجتہاد ہے کہ غزل کو مشین اور مشین کو غزل بنانے کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں۔

مجھے غصہ تھا ان کے آئے ان کے منشوروں پر، ان کی طویل طویل قراردادوں پر، ان کے مختلف بیانوں پر جن کا مسالہ براہ راست روس کے کریملن سے بمبئی کی کھیت واڑی میں آتا تھا اور وہاں سے میکلوڈ روڈ پہنچتا تھا روس کے فلاں شاعر نے یہ کہا ہے روس کے فلاں افسانہ نگار کا یہ بیان ہے روس کے فلاں دانشور نے یہ دانشمندانہ بات کہی ہے مجھے غصہ آتا تھا یہ لوگ اس خطہ ارض کی بات کیوں نہیں کرتے، جس پر کہ خود سانس لیتے ہیں اگر ہم نے دانش ور پیدا کرنے بند کر دیئے ہیں تو اس بانجھ پن کا علاج کیا سرخ تخم ریزی ہی باقی رہ گیا ہے۔

مجھے غصہ تھا اس لیے کہ میری بات کوئی بھی نہیں سنتا تھا تقسیم **ملک** کے بعد **ملک** میں افراط و تفریط کا عالم تھا جس طرح لوگ مکان اور ملیں الاٹ کروا رہے تھے اسی

طرح وہ بلند مقاموں پر بھی قبضہ کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے کوئی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتا تھا کہ اتنے بڑے انقلاب کے بعد حالات وہ نہیں رہیں گے جو پہلے تھے پرانی پگڈنڈیاں بڑی سڑکیں بنیں گی یا ان کا وجود ہی مٹ جائے گا اس کے متعلق وثوق سے اس وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا غیر کی حکومت اور اپنوں کی حکومت میں کیا فرق ہو گا اس کے بارے میں بھی حتمی طور پر کوئی قیاس آرائی نہیں ہو سکتی تھی فضا کیسی ہو گی۔۔۔اور اس میں خیالات و احساسات کی صحیح نشوونما کیونکر ہو گی۔ ریاست اور حکومت سے فرد اور جماعت کا رشتہ کیسا ہو گا یہ ایسی باتیں تھیں جن پر انتہائی غور و فکر کی ضرورت تھی یہ کام ایسا تھا جس میں ہمیں بیرونی نسخوں پر عمل نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ ہمارے نام نہاد دانشوروں نے بڑی جلد بازی سے کام لیا اور قیادت کے شوق میں اپنا نیم رس جوہر پیال میں ڈال دیا۔ جہاں وہ عدم نگہداشت کے باعث گلنے سڑنے لگا۔

ادب کے ان ترقی پسند ٹھیکے داروں نے پہلے فیصلہ کیا کہ ان کی جماعت کا کوئی رکن سرکاری پرچے میں کام کرے گا نہ اس کے لیے لکھے گا میں نے اس کی مخالفت کی اور ان کو سمجھایا کہ یہ اقدام صریحاً غلط ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز ہے اس لیے کہ یہ فیصلہ اس احتمال پر چغلی کھاتا تھا جو ترقی پسند مصنفین کی جماعت کو اپنے ارکان کی غیر ثابت قدمی کے متعلق تھا یا ہو سکتا تھا اس کے علاوہ وہ ایسا فیصلہ تو فریق مخالف کی طرف سے ہونا چاہیے تھا لیکن میں اسے بھی بے ہودہ قرار دیتا کیونکہ کوئی بھی سرکار صرف وہی چیز منتخب کرے گی، جو اس کی منشاء کے مطابق ہو۔

ہماری سرکار نے بھی چنانچہ یہی مضحکہ خیز بات کی مگر کچھ دیر کے بعد، جب کہ

ترقی پسند اپنی عدم تعاون کی قرارداد کا ڈھول کافی اونچے سروں میں پیٹ چکے تھے۔ ریڈیو کی نشریات اور سرکاری پرچوں کے اوراق ترقی پسندوں کے افکار کے لیے بند کردیئے گئے۔ بعد میں کچھ ترقی پسند ''امرت ادھارا ایکٹ'' کے تحت جیل میں ٹھونس دیئے گئے حکومت حماقت کا دوسرا نام ہے اس لیے جو حماقتیں پے در پے اس سے ترقی پسندوں کو خاموش کرنے کے سلسلے میں سرزد ہوئیں میں ان پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔

مجھے افسوس ہے کہ احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری وغیرہ جو بڑے بے ضرر قسم کے انسان ہیں جن کی دماغی اور جسمانی ساخت لفظ سازش کے صحیح معنوں کی متحمل نہیں ہو سکتی بیکار جیل میں ڈالے گئے ایک کو بھائی بنانے کا شوق ہے دوسرے کو بہنیں معلوم نہیں دونوں کے اس معصوم شغل میں سیاسی ردعمل کی شرارت حکومت کو کہاں سے نظر آ گئی۔

غصے میں آ کر بغیر سوچے سمجھے حکومت نے ان لوگوں کو جیل میں ڈال دیا۔ ایسے نائی کے سپرد کر دیا گیا جو ان کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دے گا کچھ دیر کے بعد جب یہ رہا ہو کر آئیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کس قسم کی مخلوق ہوں گے سر سے پاؤں تک منڈے ہوں گے، یا ان پر بال ہی بال ہوں گے۔ غازی کہلائیں گے یا شہید، لیڈر بن جائیں گے یا بازار میں مجمعے لگا کر دوائیاں بیچیں گے۔ شاعری اور افسانہ نگاری سے توبہ کر لیں گے یا اس پر مرد تسمہ پا کی طرح سوار ہو جائیں گے اس میں تضحیک کا کوئی پہلو نہیں اگر مجھے جیل میں ٹھونسا جاتا تو میں اپنے متعلق بھی یہی کہتا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے کہ میں بہت ذکی الحس ہوں۔

حکومت اور ترقی پسند مصنفین کی جماعت دونوں احساس کمتری کا شکار ہوئے۔ مجھے اس کا افسوس تھا اور اب بھی ہے زیادہ افسوس ترقی پسندوں کا تھا جنہوں نے خوامخواہ سیاست کے پھٹے میں اپنی ٹانگ اڑائی۔ ادب اور سیاست کا جوشاندہ تیار کرنے والے یہ عطائی کریملن کے تجویز کردہ نسخے پر عمل کر رہے تھے مریض جس کے لیے یہ جوشاندہ بنایا جا رہا تھا اس کا مزاج کیسا ہے اس کی نبض کیسی ہے اس کے متعلق کسی نے غور نہ کیا نتیجہ جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے کہ آج سب ادب کے جمود کا رونا رو رہے ہیں۔

میرا دل آج بہت افسردہ ہے کہ وہ پرچے جو ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے نمائندے تھے انہیں اپنے ناخداؤں کے ساتھ کئی الٹی سیدھی زقندیں لگانا پڑیں اور آخر میں اپنے تمام مشوروں اپنے تمام بیانوں اور اپنی تمام قراردادوں کو کاغذوں پر سے کھرچنا پڑا اور ان ادیبوں کا دوبارہ تعاون حاصل کرنے کے لیے کئی تاویلیں اور کئی معذرتیں پیش کرنا پڑیں جن کو یہ اپنی سیاہ فہرست میں داخل کر چکے تھے اور اپنی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون ومطعون قرار دے چکے تھے۔

میرا دل آج بہت افسردہ ہے جب میں سرکار سے عدم تعاون کا فیصلہ کرنے والوں کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے دیکھتا ہوں انہوں نے کیوں نہ سوچا کہ انسان کی جدوجہد کے وسیع دائرے میں سب سے اہم جدوجہد پیٹ کی ہے ہماری ہمت مردانہ یزداں پر کمند ڈال سکتی ہے، ہمارے جنون کے دشت میں جبریل ایک زبوں صید ہو سکتا ہے، گو یہ چھپی ہوئی حقیقت نہیں کہ ہمیں پیٹ کی خاطر بعض اوقات کسی الو کے پٹھے نواب کی مدح سرائی بھی کرنا پڑتی ہے یہ انسان کا بہت بڑا

المیہ ہے لیکن یہ المیہ ہی انسان کا دوسرا نام ہے۔

میرے دل میں اب سارا غصہ افسردگی میں تبدیل ہو گیا ہے میں بہت ملول اور مغموم ہوں، جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس سے میری افسردگی مضمحل ہوتی جا رہی ہے۔ میری موجودہ زندگی مصائب سے پر ہے دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کماتا ہوں جو میری روزمرہ کی ضروریات کے لیے پورا ہو سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی اور تین کم سن بچیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں فحش نویس، دہشت پسند، سنکی، لطیفہ باز اور رجعت پسند ہی لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ ہوں۔۔۔۔ان میں سے اگر کوئی بیمار ہو جائے اور موزوں و مناسب علاج کے لیے مجھے در در کی بھیک مانگنی پڑے تو مجھے بہت کوفت ہوتی ہے میرے دوست بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ مفلوک الحال ہیں بر وقت اگر میں ان کی مدد نہ کرسکوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے دینوی معاملات میں اگر میں کسی کا یا اپنا سر جھکا ہوا دیکھوں تو خدا کی قسم مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن جب میں سوچتا ہوں اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو اور لائبریریوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت بے چین ہو گی میں اس بے چینی کے پیش نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا گیا ہے خدا مجھے اس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی ہڈیاں چاٹے گی۔

میں آج بہت افسردہ ہوں، جب میں اپنے گردوپیش نبض شناسوں کو یہ کہتے سنتا ہوں کہ ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے ادب انحطاط پذیر ہے ادب ایک تعطل میں گرفتار ہے یہ گفتار ''اسلام خطرے میں ہے'' کی گفتارلایعنی سے ملتی جلتی ہے ادب قائم بالذات ہے جس طرح کہ اسلام ہے، قوت کبھی انحطاط پذیر نہیں ہوتی اس پر کبھی جمود یا تعطل طاری نہیں ہوتا ایٹم کی قوت اس کے انکشاف سے پہلے بھی موجود تھی، اور اس کے انکشاف کے بعد بھی موجود رہے گی اس کا غلط استعمال یا اس کے عدم استعمال کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ نحیف ہوگئی ہے جاں بلب ہے یا مرگئی ہے۔

ادب اسی قوت اسی توانائی، اسی آب و تاب سے زندہ ہے جس طرح کہ وہ منصۂ شہود پر آنے سے پہلے زندہ تھا اس پر جمود اور تعطل طاری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ ہمارا اپنا جمود اور تعطل ہے جسے ہم ادب کے جمود اور تعطل سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بحران کے اسباب و علل چنانچہ ہمیں ادب میں نہیں خود اپنے اذہان میں ڈھونڈنے چاہئیں اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ادب کے مستقیم راستے سے ہٹ کر اگر ہم ادھر ادھر نکل جائیں تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ راستہ ہمارے آگے سے ہٹ گیا ہے سیاست کا اپنا مقام الگ ہے اس تک پہنچنے کے لیے سیاست کے پیچ در پیچ راستوں پر گامزن ہونا بھی غلطی ہے۔

سوویت روس کے ادب کا لاکھ ڈھنڈورا پیٹا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ دوغلی تحریریں جو وہاں لاکھوں ٹن کاغذوں پر چھپتی ہیں ادب نہیں ہیں، ہرگز نہیں ہیں

ادب، ادب ہے، یا کوئی اور شے ہے۔ جس کا ایک نمونہ روسی ادیبوں کی حالیہ تحریروں کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ادب پر کسی کی اجارہ داری ہوئی ہے نہ ہوگی یہ کوئی ایسا کام نہیں جسے ٹھیکے پر دے کر کرالیا جائے "ادب پر جمود طاری ہے" یہ ایک ڈھکوسلا ہے "اسلام خطرے میں ہے" کی قسم کا اسے کھڑا کرنے والے بھی وہی ہیں جو آج سے چند ماہ پیشتر منبروں پر چڑھ کر پکارتے رہے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین نے تقسیم ہند کے بعد ادب کی لاج رکھ لی ہے غریب مر رہا تھا، مگر انہوں نے اپنا خون دے کر اسے زندہ کر دیا ہے۔۔۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی جلدی ان کے گنتی کے چند ارکان کے مقید ہونے کے فوراً بعد ادب کی زندگی پھر کیوں خطرے میں پڑ گئی؟

میں آج بہت افسردہ ہوں۔۔۔ پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا بعد میں مجھے ایک دم رجعت پسند بنا دیا گیا۔ اور اب فتوے دینے والے سوچ رہے ہیں اور پھر سے یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور فتوؤں پر اپنے فتوے دینے والی سرکار مجھے ترقی پسند یقین کرتی ہے یعنی ایک سرخا۔۔۔ ایک کمیونسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا دیتی ہے اور مقدمہ چلا دیتی ہے۔ دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں یہ اشتہار دیتی ہے۔۔۔ کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے جس کا قلم گزشتہ ہنگامی دور میں بھی رواں دواں رہا۔۔۔۔ میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تمغہ میرے کفن سے ٹانک دے گی جو میرے داغ عشق کی بہت بڑی توہین ہوگی۔

بٹوارے کے بعد اب تک میں یہ کتابیں ترتیب وار آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں ان سے آپ بطریق احسن میری دماغی کیفیات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

1 تلخ ترش اور شیریں 2 لذت سنگ

3 سیاہ حاشیے 4 خالی باتلیں، خالی ڈبے

5 ٹھنڈا گوشت 6 نمرود کی خدائی

7 بادشاہت کا خاتمہ

ان کے بعد افسانوں کا یہ تازہ مجموعہ پیش خدمت ہے اس میں صرف دو افسانے مطبوعہ ہیں ''یزید'' اور ''1919ء کی ایک بات'' باقی غیر مطبوعہ ہیں یہ مجموعہ کتنے عرصے میں لکھا گیا اور کتنے عرصے میں شائع ہو کر آپ تک پہنچا ہے یہ آپ کو متعلقہ تاریخوں سے معلوم ہو سکتا ہے مجموعے کا آخری افسانہ ''ممی'' لکھنا شروع کیا تھا کہ 16 اکتوبر کو خان لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کے قتل کی خبر موصول ہوئی جس سے دماغ بہت مضطرب رہا اس کے بعد میری منجھلی بچی جیاجی تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئی اس کے باعث بھی کئی دن پریشان رہا نتیجتاً اس افسانے کی تکمیل میں تعویق ہو گئی۔

سعادت حسن منٹو

لاہور 28 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆☆

چوری

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اس بوڑھے آدمی سے جو ٹاٹ پر بیٹھا اپنے استخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے تھا کہنے لگے۔ ''بابا جی کوئی کہانی سنایئے؟''

مرد معمر نے جو غالباً کسی گہری سوچ میں غرق تھا اپنا بھاری سر اٹھایا جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے کو جھکا ہوا تھا ''کہانی! میں خود ایک کہانی ہوں مگر۔۔۔۔''

اس کے بعد کے الفاظ اس نے اپنے پوپلے منہ ہی میں بڑبڑائے شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ وہ فلسفیانہ نکات حل کر سکے

لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر آتشیں شکم کو پر کر رہے تھے شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب الٹ الٹ کر حیرت میں سربلند شعلوں کا منہ تک رہی تھیں۔

بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں لڑکوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا'' کہانی۔۔۔۔ ہر روز کہانی۔۔۔۔۔ کل سناؤں گا''

لڑکوں کے تمتماتے ہوئے چہروں پر افسردگی چھا گئی ناامیدی کے عالم میں وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے'' آج رات کہانی سنے بغیر سونا ہوگا'' یکایک ان میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی بہ نسبت

بہت ہشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا الاؤ کے قریب سرک کر بلند آواز میں بولا مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں ہے۔۔۔کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں ہے جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا۔

''درست! میں بھول گیا تھا'' بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے تھوڑی دیر کے بعد وہ اس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا ''میرے بچے! مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کر دو مگر میں کون سی کہانی سناؤں؟ ٹھہرو مجھے یاد کر لینے دو'' یہ کہتے ہوئے وہ سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے جن اور پریوں کی لایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی وہ بچوں کو ایسی کہانیاں سنایا کرتا تھا جو ان کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں اسے بہت سے فضول قصے یاد تھے جو اس نے بچپن میں سنے تھے۔یا کتابوں میں پڑھے تھے مگر اس وقت وہ اپنے بربط پیری کے بوسیدہ تار چھیڑ رہا تھا کہ شاید ان میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اٹھے۔

لڑکے بابا جی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے غالباً اس لڑکے کی بابت جسے کتاب چرانے پر بید کی سزا ملی تھی باتوں باتوں میں ان میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا'' ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چرائی تھی مگر اسے سزا او زنا ملی''

''کتاب چرائی تھی'' ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کئے گئے تھے بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعہ کو جگا دیا اس نے اپنا سپید سر اٹھایا اور اپنی آنکھوں

کے سامنے بھولی بسری داستان کو انگڑائیاں لیتے پایا ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر وہیں غرق ہوگئی اضطراب کی حالت میں اس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کیا اس کے چہرے کے تغیر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ کسی واقعہ کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا ''بچو! آج میں اپنی کہانی سناؤں گا''

لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے الاؤ کی چٹختی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ابھر کر خاموش ہو گئیں۔۔۔۔ایک لمحہ کے لیے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا۔

''بابا جی اپنی کہانی سنائیں گے؟'' ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

''ہاں۔۔۔۔اپنی کہانی'' یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھوؤں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر مخاطب ہوا ''میں آج تمہیں اپنی پہلی چوری کی داستان سناؤں گا''

لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے انہیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ بابا جی کسی زمانہ میں چوری بھی کرتے رہے ہیں بابا جی جو ہر وقت انہیں برے کاموں سے بچنے کے لیے نصیحت کیا کرتے ہیں۔

لڑکا جوان سب میں دلیر تھا اپنی حیرت نہ چھپا سکا ''پر کیا آپ نے واقعی چوری

کی؟''

''واقعی''

''آپ اس وقت کس جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟''

''نویں میں''

یہ سن کر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی اسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا وہ اس سے عمر میں دوگنا بڑا تھا اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی وہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھ چکا تھا اور اسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس عمر کا اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے؟ اس کی عقل اس معمہ کو حل نہ کر سکی چنانچہ اس نے پھر سوال کیا ''آپ نے چوری کیوں کی؟''

اس مشکل سوال نے بڈھے کو تھوڑی دیر کے لیے گھبرا دیا۔۔۔۔ آخر وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا کہ فلاں کام اس نے کیوں کیا؟ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا ''اس لیے کہ اس وقت اس کے دماغ میں یہی خیال آیا''

اس نے دل میں یہی جواب سوچا مگر اس نے مطمئن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من و عن بیان کر دے۔

''اس کا جواب میری کہانی ہے جو میں اب تمہیں سنانے والا ہوں''

''سنائیے؟''

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کے لیے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے جو الاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا اور جسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔

بڈھا کچھ عرصے تک اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا پھر اس بھولے ہوئے واقعہ کے تمام منتشر ٹکڑے فراہم کر کے بولا

''ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے میری زندگی میں سب سے برا فعل ایک کتاب کی چوری ہے۔''

یہ کہہ کر وہ رک گیا اس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں دھندلی پڑ گئیں اس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا

''سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے یہ میں نے ایک کتاب فروش کی دکان سے چرائی یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب میں نویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا قدرتی طور پر جیسا کہ اب تمہیں کہانی سننے کا شوق ہے مجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا۔۔۔۔دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب ضرور پڑھا کرتا تھا وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فضول جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا والدین کو اس بات کا علم نہ تھا اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنے دیتے اس لیے کہ اس قسم کی کتابیں سکول کے لڑکے کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں میں ان کے مہلک نقصان سے غافل تھا چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا میں نے چوری کی اور پکڑا گیا''

ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا ''آپ پکڑے گئے؟''

”ہاں پکڑا گیا چونکہ میرے والدین اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھے یہ عادت پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی گھر سے جتنے پیسے ملتے میں انہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا سکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس نے لکھی ہے ضرور پڑھنی چاہیے یا فلاں کتب فروش کے پاس نئی ناولوں کا جو ذخیرہ موجود ہے ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیے شوق کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے یا کیا کر رہا ہے۔“ اس وقت وہ بے عقل بچے کی مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لئے جلتی ہوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلا دے گی ٹھیک یہی حالت میری تھی فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے اس لیے وہ بغیر سمجھے بوجھے بری سے بری حرکت کر بیٹھتا ہے مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے چوری ایسے مکروہ جرم کا ارتکاب کیا۔۔۔۔ یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا۔۔۔۔ اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً اسے برے کاموں پر مجبور کرتا ہے یہ شیطان مجھ پر اس وقت غالب آیا جبکہ سوچنے کے لیے میرے پاس بہت کم وقت تھا خیر۔۔۔۔

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ملتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے اس

کی داستان سن رہے تھے داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹتا دیکھ کر جب کہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا وہ بڑی بے قراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

''مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا۔۔۔۔سرد ہوا آرہی ہے'' بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈال لیا

مسعود''اچھا بابا جی!'' کہہ کر اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو ایک دن جبکہ والد گھر سے باہر تھے''بوڑھے نے اپنی داستان کا بقایا حصہ شروع کیا''مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا ختم ہونے کے قریب تھی اس لیے میرے جی میں آئی کہ چلو اس کتب فروش تک ہو آئیں جس کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی تھیں۔''

میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے موجود تھے جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لیے کافی ہوں چنانچہ میں گھر سے سیدھا اس کتب فروش کی دکان پر گیا۔۔۔یوں تو اس دکان پر ہر وقت بہت سی اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں مگر اس دن خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا تھا ان کتابوں کے رنگ برنگ سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا دل میں اس خواہش نے گدگدی لی کہ وہ تمام میری ہو جائیں۔

میں دکاندار سے اجازت لے کر ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہو گیا ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی

''ناممکن ہے کہ اس کا مطالعہ آپ پر سنسنی طاری نہ کر دے''

''مصور اسرار کالا ثانی شاہکار''

''تمثیل! ہیجان، رومان۔۔۔سب یکجا''

اس قسم کی عبارتیں شوق بڑھانے کے لیے کافی تھیں مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی اس لیے کہ میری نظروں سے اکثر ایسے الفاظ گزر چکے تھے میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا خیال مطلقاً نہ تھا بلکہ میں نے خریدنے کے لیے ایک قیمت کی ناول چن کر الگ بھی رکھ لی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے کہ میں دوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا میں نے اپنی چنی ہوئی کتاب اٹھائی۔۔۔۔کتاب کا اٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں سرورق کے کونے پر میرے محبوب ناولسٹ کا نام سرخ لفظوں میں چھپا تھا اس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا۔

''منتقم شعاعیں۔۔۔۔۔۔۔کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا''

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں طغیانی سی آ گئی کتاب کا مصنف وہی تھا جس نے اس سے پیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا۔

''منتقم شعاعیں۔۔۔دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد۔۔۔۔۔۔کیسا دلچسپ افسانہ ہوگا''

''لندن تباہ کرنے کا ارادہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟''

''اس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں''

''یہ کتاب ضرور ان سب سے بہتر ہوگی''

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا اور خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہا تھے میں نے اس کتاب کو اٹھایا اور کھول کر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی ''مصنف اس کتابی کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے۔''

''ان الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام دیا ایکا ایکی میرے دماغ کے خدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کود پڑا۔۔۔۔۔۔وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مڑیں جو کاغذ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا دکان کی دوسری طرف دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے۔۔۔۔میں سر سے پیر تک لرز گیا''

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واقعہ کی یاد سے کانپا۔۔۔۔۔۔تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اس نے پھر اپنی داستان شروع کر دی'' ایک لحظہ کے لیے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت برا کام ہے مگر ضمیر کی آواز سر ورق پر بنی ہوئی لا نبی لا نبی شعاعوں میں غرق ہو گئی میرا دماغ '' منتقم شعاعیں۔۔۔۔۔۔منتقم شعاعیں'' کی گردان کر رہا تھا میں نے ادھر ادھر جھانکا اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبالی مگر میں کانپنے لگا''

اس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا اور اس کتاب کے دام ادا

کر دیئے جو میں نے پہلے خریدی تھی قیمت لیتے وقت اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اس نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا میری طرف اس نے گھور کر بھی دیکھا جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہوگئی جی میں بھی آئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔

میں نے اس دوران میں کئی بار اس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے ابھری ہوئی تھی نگاہ ڈالی ۔۔۔۔اور شاید اسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی میری ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر اسے شک ضرور ہوا اس لیے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر کے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

میں نے باقی پیسے جلدی سے لیے اور وہاں سے چل دیا دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سنی مڑ کر دیکھا تو کتب فروش ننگے پاؤں چلا آ رہا تھا اور مجھے ٹھہرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔۔۔۔میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے معلوم نہ تھا میں کدھر بھاگ رہا ہوں میرا رخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا میں شروع ہی سے اس طرف بھاگ رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا اس غلطی کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا

بوڑھا اتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان لبوں پر پھیرنے لگا کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا

''مسعود! پانی کا ایک گھونٹ پلوانا''

مسعود خاموشی سے اٹھا اور کوٹھری کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر لے آیا بوڑھے نے گلاس لیتے ہی منہ سے لگا لیا اور

ایک گھونٹ میں سارا پانی پی گیا اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا ''ہاں میں کیا بیان کر رہا تھا؟''

ایک لڑکے نے جواب دیا ''آپ بھاگے جا رہے تھے''

میرے پیچھے کتب فروش ''چور چور'' کی آواز بلند کرتا چلا آ رہا تھا جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آ گئیں بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی میں لڑکھڑایا اور گر پڑا اٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دے دیا اس وقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی ایک تند دھواں سا مرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا آنکھیں فرط خوف سے ابل رہی تھیں اور کانوں میں ایک زبردست شور برپا تھا جیسے بہت سے لوگ آہنی چادریں ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں میں ابھی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کتب فروش اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا اس وقت میری کیا حالت تھی اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے سینکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرا ٹکرا کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے جب انہوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنجہ نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے۔۔۔میں بالکل خاموش تھا وہ مجھے دکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔

جیل خانہ کی کوٹھڑی اور عدالت کا منہ دیکھنا یقینی تھا اس خیال پر میرے ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور میرے پاس اپنے ضمیر کو جواب دینے کے لیے کوئی الفاظ موجود نہ تھے اس لیے میری گرم آنکھوں

میں آنسو تر آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دھندلی آنکھیں غمناک ہوگئیں۔

''کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا اپنی کتاب لے لی اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا'' بوڑھے نے اپنے آنسو کھردرے کمبل سے خشک کیے'' خدا اس کو جزائے خیر دے میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا مگر اس واقعہ کی والد اور سکول کے لڑکوں کو خبر ہوگئی والد مجھ سے سخت خفا ہوئے لیکن انہوں نے بھی آخیر میں مجھے معاف کر دیا۔''

دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخار آتا رہا اس کے بعد جب میں نے دیکھا میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اٹھا سکوں تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا اس وقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے ہزاروں مصائب برداشت کیے ہیں صرف اس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تادم مرگ نادم و شرمسار رکھے گی

''اس آوارہ گردی کے دوران میں، میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا مگر ان پر نادم نہیں ہوں مجھے فخر ہے''

بوڑھے کی دھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہوگئی اور اس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا' ہاں مجھے فخر ہے'' یہ الفاظ اس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔

الاؤ میں آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا اور ایک لمحہ فضا میں تھرتھرا کر وہیں سو گیا

بوڑھے نے شعلے کی جرأت دیکھی اور مسکرا دیا پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا''
کہانی ختم ہوگئی ہے اب تم جاؤ تمہارے ماں باپ انتظار کرتے ہوں گے''

مسعود نے سوال کیا''مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟''

''فخر کیوں ہے؟''بوڑھا مسکرا دیا''اس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں اپنی مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی میرے عزیز! بڑے ہو کر اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں''

''ہر وہ چیز جو تم سے چرا لی گئی ہے تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقہ سے اپنے قبضہ میں لے آؤ پر یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیے ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے۔''

لڑکے اٹھے اور بابا جی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھری کے دروازے سے باہر چلے گئے بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا

''کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں''بوڑھے کو خدا معلوم ان لڑکوں سے کیا امید تھی۔

☆☆☆☆☆

چوہے دان

شوکت کو چوہے پکڑنے میں بہت مہارت حاصل ہے وہ مجھ سے کہا کرتا ہے یہ ایک فن ہے جس کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے اور سچ پوچھیے تو جو ترکیبیں شوکت کو چوہے پکڑنے کے لیے یاد ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کافی محنت کی ہے اگر چوہے پکڑنے کا کوئی فن نہیں ہے تو اس نے اپنی ذہانت سے اسے فن بنا دیا ہے اس کو آپ کوئی چوہا دکھا دیجئے وہ فوراً آپ کو بتا دے گا کہ اس ترکیب سے وہ اتنے گھنٹوں میں پکڑا جائے اور اس طریقے سے اگر آپ اسے پکڑنے کی کوشش کریں تو اتنے دن لگ جائیں گے۔

چوہوں کی نسلوں اور ان کی عادات واطوار کا شوکت بہت گہرا مطالعہ کر چکا ہے اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس ذات کے چوہے جلدی پھنس جاتے ہیں اور کس نسل کے چوہے بڑی مشکلوں کے بعد قابو میں آتے ہیں اور پھر ہر قسم کے چوہوں کو پھانسنے کی ایک سو ایک ترکیب شوکت کو معلوم ہے۔

موٹے موٹے اصول اس نیا یک روز مجھے بتائے تھے کہ چھوٹی چھوٹی چوہیاں اگر پکڑنا ہوں تو ہمیشہ نیا چوہے دان استعمال کرنا چاہیے چوہے دان کی ساخت کسی قسم کی بھی ہو، اس کی کوئی پروا نہیں خیال اس بات کا رکھنا چاہیے کہ چوہے دان ایسی جگہ پر نہ رکھا جائے جہاں آپ نے چوہیا یا چوہیاں دیکھی تھیں ٹرنکوں کے پیچھے الماریوں کے نیچے، کہیں بھی جہاں آپ نے چوہیا نہ دیکھی ہو۔ چوہے دان رکھ دیا جائے اور اس میں تلی ہوئی مچھلی کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیا جائے ٹکڑا بڑا نہ ہو اگر

چوہے دان کھٹ سے بند ہونے والا ہے تو اس میں خاص طور پر بڑا ٹکڑا نہیں لگانا چاہیے کہ چوہیا اندر آ کر اس ٹکڑے کا کچھ حصہ کتر کر باہر چلی جائے گی ٹکڑا چھوٹا ہو گا تو وہ اسے اتارنے کی کوشش کرے گی اور یوں جھٹ پٹ پنجرے میں قید ہو جائے گی۔۔۔۔۔ایک چوہیا پکڑنے کے بعد چوہے دان کو گرم پانی سے دھولینا چاہیے۔اگر آپ اسے اچھی طرح نہ دھوئیں گے تو پہلی چوہیا کی بو اس میں رہ جائے گی جو دوسری چوہیوں کے لیے خطرے کے الارم کا کام دے گی۔اس لیے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے ہر چوہے یا چوہیا کو پکڑنے کے بعد چوہے دان کو دھولینا چاہئے اگر گھر میں زیادہ چوہے چوہیاں ہوں اور ان سب کو پکڑنا ہو تو ایک چوہے دان کام نہیں دے گا تین چار چوہے دان پاس رکھنے چاہئیں جو بدل بدل کر کام میں لائے جائیں چوہے کی ذات بڑی سیانی ہوتی ہے اگر ایک ہی چوہے دان گھر میں رکھا جائے گا تو چوہے اس سے خوف کھانا شروع کر دیں گے اور اس کے نزدیک تک نہیں آئیں گے بعض اوقات ان تمام باتوں کا خیال رکھنے پر بھی چوہے چوہیاں قابو میں نہیں آتیں اس کی بہت سی وجہیں ہوتی ہیں بہت ممکن ہے کہ آپ سے پہلے جو مکان میں رہتا تھا اس نے اسی قسم کا چوہے دان استعمال کیا تھا جیسا کہ آپ کر رہے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے چوہے کو پکڑ کر باہر گلی یا بازار میں چھوڑ دیا ہو اور چند دنوں کے بعد پھر واپس گھر آ گیا ہو۔ ایسے چوہے جو ایک بار چوہے دان میں پھنس کر پھر اپنی جگہ پر واپس آ جائیں اس قدر ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ بڑی مشکلوں سے قابو میں آتے ہیں یہ چوہے دوسرے چوہوں کو بھی خبردار کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی تمام کوششیں بے

سود ثابت ہوتی ہیں اور چوہے بڑے اطمینان سے ادھر ادھر دوڑتے رہتے ہیں اور آپ کا اور آپ کے چوہے دان کا منہ چڑاتے رہتے ہیں۔۔۔۔چوہے کے بل کے پاس تو چوہے دان ہرگز ہرگز نہیں رکھنا چاہیے، اس لیے کہ اتنی بڑی چیز اپنے گھر کے پاس دیکھ کر جو پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی چوہا فوراً چوکنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کو دال میں کالا کالا نظر آ جاتا ہے جب کسی حیلے سے چوہے نہ پکڑے جائیں تو گردوپیش کی فضا کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ آس پاس کے لوگ کیسے ہیں، کس قسم کی چیزیں کھاتے ہیں اور ان کے گھروں کے چوہے کس چیز پر جلدی گرتے ہیں یہ تمام باتیں معلوم کر کے آپ کو تجربے کرنا پڑیں گے اور ایسی ترکیب ڈھونڈنا پڑے گی جس کے ذریعے سے آپ اپنے گھر کے چوہے گرفتار کر سکیں۔

شوکت چوہے پکڑنے کے فن پر ایک طویل لیکچر دے سکتا ہے کتاب لکھ سکتا ہے مگر چونکہ وہ طبعاً خاموشی پسند ہے اس لیے اس کے متعلق زیادہ بات چیت نہیں کرتا صرف مجھے معلوم ہے کہ وہ اس فن میں کافی مہارت رکھتا ہے، محلے کے دوسرے آدمیوں کو اس کی مطلق خبر نہیں، البتہ اس کے پڑوسی اس کے یہاں سے کبھی کبھی چوہے دان عاریتاً ضرور منگایا کرتے ہیں اور اس نے اس غرض کے لیے ایک پرانا چوہے دان مخصوص کر رکھا ہے۔

پچھلی برسات کی بات ہے میں شوکت کے یہاں بیٹھا تھا کہ اس کے پڑوسی خواجہ احمد صادق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بڑا لڑکا ارشد صادق آیا، میں نے جب اٹھ کر دروازہ کھولا تو اس نے کہنا شروع کیا ”ان کم بخت چوہوں نے

ناک میں دم کر رکھا ہے ابا جی سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ زہر منگوایئے ان کو مارنے کے لیے مگر انہیں اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی اور یہاں ہر روز میری کتابوں کا ستیاناش ہو رہا ہے آج الماری کھولی تو یہ بڑا چوہا میرے سر پر آن گرا۔۔۔ تمہیں کیا بتاؤں ان چوہوں نے مجھے کتنا تنگ کیا ہے کسی کتاب کی جلد سلامت نہیں بعض بڑی کتابوں کی جلد تو اس صفائی سے ان کم بختوں نے کتری ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے آری سے کاٹ دی ہے۔''

میں ارشد کو شوکت کے پاس لے گیا اور کہا ''ارشد صاحب تشریف لائے ہیں چوہوں کی شکایت لے کر آئے ہیں''

ارشد کرسی پر بیٹھ گیا اور پیشانی پر سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا ''شوکت صاحب! میں کیا عرض کروں ابھی الماری کی تمام کتابیں باہر نکال کر آیا ہوں یا ک بھی تو ان میں ایسی نہیں رہی جس پر چوہوں نے اپنے دانت تیز کیے ہوں باورچی خانہ موجود ہے، دوسری الماریاں ہیں جن میں ہر وقت کھانے پینے کی چیزیں پڑی رہتی ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کتابیں کترنے میں ان کو کیا مزہ آتا ہے۔۔۔ یعنی کاغذ اور دفتی بھلا کوئی غذا ہے۔ جی صاحب ایک انبار کترے ہوئے گتے اور دھجے ہوئے کاغذوں کا میں نے الماری سے نکالا ہے''

شوکت مسکرایا ''ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے گھر میں چوہے ہر روز سینده لگاتے پھریں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

ارشد نے اس مذاق سے لطف نہ اٹھایا اس لیے کہ وہ واقعی بہت پریشان تھا ''شوکت صاحب! وہ معمولی چوہے تھوڑے ہیں موٹے موٹے سنڈے ہیں جو کھلے

بندوں پھرتے رہتے ہیں میرے سر پر ایک آن پڑا خدا کی قسم ابھی تک درد ہو رہا ہے"

شوکت اور میں دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے، ارشد بھی مسکرا دیا "آپ تو دل لگی کر رہے ہیں اور یہاں غصہ کے مارے برا حال ہو رہا ہے"

شوکت نے اٹھ کر ارشد کو سگریٹ پیش کیا "اپنے دل کا غبار اس کے دھوئیں کے ساتھ باہر نکال لیے اور مجھے بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

ارشد نے سگریٹ سلگایا اور کہا "میں آپ سے چوہے دان مانگنے آیا تھا امی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ شوکت کے گھر میں میں نے دو تین پڑے دیکھے ہیں"

شوکت نے فوراً نوکر کو آواز دی اور اس سے کہا "وہ چوہے دان جو تم نے کل گرم پانی سے دھو کر خوب صاف کیا تھا ارشد صاحب کے گھر دے آؤ اور دیکھو ان کے نوکر سے کہنا کہ اس الماری کے نیچے اس کو نہ رکھے جہاں ارشد صاحب اپنی کتابیں رکھتے ہیں اس الماری سے دور کہیں بھی اس میں مچھلی یا تیل میں تلی ہوئی کسی چیز کا ٹکڑا لگا کر رکھ دیا جائے" پھر ارشد سے مخاطب ہو کر کہا "آپ بھی اچھی طرح سن لیجیے گا۔۔۔ بازار سے اگر پکوڑے مل جائیں تو ایک پکوڑا کافی رہے گا اور جب چوہا پکڑا جائے تو خدا کے لیے اسے میرے گھر کے پاس نہ چھوڑ دیجیے گا اور بہت جگہیں آپ کو مل جائیں گی جہاں سے وہ پھر واپس نہ آسکے"

دیر تک ارشد ہمارے پاس بیٹھا رہا شوکت اس کو مزید ہدایات دیتا رہا جب نوکر چوہے دان اس کے گھر پہنچا کر واپس آگیا تو اس نے اجازت چاہی اور چلا گیا۔

اس واقعہ کے چار روز بعد ارشد میرے گھر آیا۔ میں اور وہ چونکہ اکٹھے کالج میں پڑھتے رہے ہیں اس لیے وہ میرے بے تکلف دوست ہیں، شوکت سے اس کا تعارف میں نے ہی کرایا تھا آتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا جیسے مجھ سے کوئی راز کی بات تخلیے میں کہنا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟

"میں تمہیں ایک بڑی دلچسپ بات سنانے آیا ہوں مگر یہاں نہیں سناؤں گا تم باہر چلو" یہ کہہ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔

راستے میں اس نے مجھے اپنی داستان سنانا شروع کی "عجیب و غریب کہانی ہے جو مین تمہیں سنانے آیا ہوں بخدا ایسی بات ہوئی ہے کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی یعنی کسے یقین تھا کہ اتنی ضدی اور نفاست پسند لڑکی ایک چوہے دان کے ذریعہ سے میرے قابو میں آ جائے گی۔۔۔۔۔۔ اسی چوہے دان کے ذریعہ سے جو اس روز تمہارے سامنے میں نے شوکت سے لیا تھا"

میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کون سی لڑکی اس چوہے دان میں پھنس گئی۔۔۔۔۔۔ لڑکی نہ ہوئی چوہیا ہو گئی۔۔۔۔۔۔ آخر بتاؤ تو سہی لڑکی کون ہے"

"اماں وہی سلیمہ جس کی نفاست پسندیوں کی بڑی دھوم ہے اور جس کی ضدی طبیعت کے بڑے چرچے ہیں"

میری حیرت اور زیادہ بڑھ گئی "سلیمہ۔۔۔۔۔۔ جھوٹ؟"

"خدا کی قسم۔۔۔۔۔۔ جھوٹ بولنے والے پر لعنت اور بھلا میں تم سے جھوٹ کیوں کہنے لگا۔۔۔ یہی سلیمہ، شوکت کے دیئے ہوئے چوہے دان کے ذریعہ سے

میرے قابو میں آگئی اور بخدا یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسی آسانی سے پھنس جائے گی''

میں نے پھر اس سے حیرت بھرے لہجہ میں کہا ''لیکن یہ ہوا کیوں کر تم مجھے پوری داستان سناؤ تو کچھ پتا چلے۔۔۔۔۔چوہے دانوں سے بھی کبھی کسی نے لڑکیاں پھانسی ہیں بڑی بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے مجھے۔''

میں سلیمہ کو اچھی طرح جانتا ہوں ہمارے یہاں اس کا اکثر آنا جانا ہے وہ صرف نفاست پسند ہی نہیں بلکہ بڑی ذہین لڑکی ہے انگریزی زبان پر اسے خوب عبور حاصل ہے تین چار مرتبہ اس سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تو میں نے معلوم کیا کہ ادب اور شعر کے متعلق اس کی معلومات بہت وسیع ہیں مصور بھی ہے، پیانو بجانے میں بڑی مہارت رکھتی ہے اس کی ضدی اور نفاست پسند طبیعت کے بارے میں بھی چونکہ مجھے بہت کچھ معلوم ہے اسی لیے مجھے ارشد کی یہ بات سن کر سخت تعجب ہوا وہ تو کسی کو خاطر ہی میں لانے والی نہیں ارشد جیسے چغد کو اس نے کیسے پسند کرلیا یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ارشد بے حد خوش تھا اس نے میری طرف فتح مند نظروں سے دیکھا اور کہا'' میں سارا واقعہ سنا دیتا ہوں اس کے بعد کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت نہ رہے گی۔۔۔قصہ یہ ہے کہ پرسوں رات کو امی جان اور ابا جی اور دوسرے لوگ سب سینما دیکھنے چلے گئے میں گھر میں اکیلا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں آرام کرسی میں ٹانگیں پھیلائے لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ ایک موٹا سا چوہا مجھے نظر آیا اس کو دیکھنا تھا کہ مارے غصہ کے میرا خون کھولنے لگا فوراً اٹھا اور اس کو پکڑنے کی

ترکیب سوچنے لگا اسے ہاتھ سے پکڑنا تو ظاہر ہے۔۔۔ بالکل محال تھا، میں کسی طریقے سے اس کو مار بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ کمرے میں بے شمار فرنیچر اور ٹرنک وغیرہ پڑے تھے میں نے شوکت کے دیئے ہوئے چوہے دان کا خیال کیا جس سے آٹھ چوہے ہم لوگ پکڑ چکے تھے مگر شوکت کی ہدایات کے مطابق اس کو گرم پانی سے دھونا ضروری تھا مجھے کوئی کام تو تھا نہیں اور وقت بھی کافی تھا، چنانچہ میں نے خود ہی سماوار میں پانی گرم کیا اور چوہے دنا کو دھونا شروع کر دیا ابھی میں نے لوٹے سے گرم پانی کی دھار اس کے آہنی تاروں پر ڈالی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سلیمہ کھڑی ہے میں نے کہا'' آیئے۔۔۔ آیئے'' وہ اندر چلی آئی اور کہنے لگی'' کیا کر رہے ہیں آپ؟'' میں نے جھینپ کر جواب دیا'' جی چوہے دان دھو رہا ہوں'' وہ بے اختیار ہنس پڑی'' چوہے دان دھو رہے ہیں یہ صفائی آخر کس لیے ہو رہی ہے کوئی بڑا چوہا انسپکشن کے لیے تو نہیں آ رہا'' یہ سن کر میری جھینپ دور ہو گئی اور میں نے قہقہہ لگا کر کہا جی ہاں۔۔۔ ایک بہت بڑا چوہا انسپکشن کے لیے آنا چاہتا ہے یہ صفائی اسی سلسلے میں ہو رہی ہے''

یہ کہہ کر ارشد خاموش ہو گیا اس پر میں نے اس سے کہا'' سناتے جاؤ رکو نہیں تمہاری داستان بہت دلچسپ ہے۔۔۔ ہاں تو پھر سلیمہ نے کیا کہا''

'' کچھ نہیں میری بات سن کر وہ صحن ہی میں چوکی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی آپ صفائی کیجئے اس صفائی کی انسپکشن میں کروں گی۔۔۔ ہاں یہ تو بتایئے آج یہ سب لوگ کہاں گئے ہیں'' میں نے جواب دیا'' سینما گئے ہیں میں بے کار بیٹھا تھا کہ

ایک چوہا اپنے کمرے میں مجھے نظر آیا میں کیا عرض کروں ہمارے گھر میں کس طرح بڑے بڑے موٹے سنڈے چوہے سینہ دھ مارتے پھرتے ہیں میری کتابوں کا تو انہوں نیس تیاناس کر دیا ہے اب ان کے ظلم وستم سے میرے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا ہے یہ چوہے دان لے آیا ہوں اس سے ہر روز دو تین چوہے پکڑتا ہوں اور ان کو کالے پانی بھیج دیتا ہوں'' سلیمہ نے میری گفتگو میں دلچسپی ظاہر کی'' خوب۔۔۔۔خوب۔۔۔۔لیکن یہ تو کہیے کالا پانی یہاں سے کتنی دور ہے'' میں نے کہا'' بہت دور نہیں کوتوالی کے پاس ہی جو گندہ نالا بہتا ہے اس کو فی الحال میں نے کالا پانی بنا لیا ہے چوہوں نے اس پر اعتراض نہیں کیا، کیونکہ اس موری کا پانی کالا ہی ہے۔'' ہم دونوں خوب ہنسے پھر میں نے لوٹا اٹھا اور چوہے دان کو برش کے ساتھ دھونا شروع کر دیا جب چھینٹے اڑے تو میں نے سلیمہ سے کہا'' آپ یہاں سے اٹھ جائیے، چھینٹے اڑ رہے ہیں ویسے بھی یہ میری بڑی بدتمیزی ہے کہ میں آپ کے سامنے ایسی غلیظ چیز صاف کرنے بیٹھ گیا ہوں'' اس نے فوراً ہی کہا'' آپ تکلیف نہ کیجئے اور اپنا کام کرتے چلے جائیے چھینٹوں کے متعلق بھی آپ کوئی فکر نہ کریں'' جب میں نے چوہے دان اچھی طرح دھو کر صاف کر لیا تو سلیمہ نے پوچھا'' اچھا۔۔۔اب آپ یہ بتائیے کہ اس کو دھونے کی کیا ضرورت تھی، بغیر دھوئے کیا آپ اس ظالم چوہے کو نہیں پکڑ سکتے'' میں نے کہا'' جی نہیں اس سے پہلے چونکہ اس چوہے دان میں ہم ایک چوہا پکڑ چکے ہیں اور اس کی بو اس میں ابھی تک باقی ہے اس لیے دھونا ضروری ہے گرم پانی سے پہلے چوہے کی بو غائب ہو جائے گی اس لیے دوسرا چوہا آسانی کے ساتھ پھنس جائے گا'' میری یہ بات سن کر سلیمہ

نے بالکل بچوں کی طرح کہا ''اگر چوہے دان میں چوہے کی بو رہ جائے تو دوسرا چوہا نہیں آتا'' میں نے سکول ماسٹروں کا سا انداز اختیار کر لیا ''بالکل نہیں اس لیے کہ چوہوں کی ناک بڑی تیز ہوتی ہے آپ نے سنا نہیں، عام طور پر یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی کی تو چوہے کی ناک ہے یعنی اس کی قوت شامہ بڑی تیز ہے۔۔۔''مجھے آپ؟'' سلیمہ نے میری طرف جب دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے ایک بہت بڑی بات اس سے کہہ دی ہے جس کو سن کر وہ بہت مرعوب ہو گئی ہے اس کی نگاہوں میں مجھے اپنے متعلق قدر و منزلت کی جھلک نظر آئی اس سے مجھے شہہ مل گئی چنانچہ وہ تمام باتیں جو میں نے شوکت سے اس روز سنی تھیں ایک لیکچر کی صورت میں دہرانا شروع کر دیں اور وہ۔۔۔۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''یہ سب مجھے افسانہ معلوم ہوتا ہے تم جھوٹ کہتے ہو''

''تم بھی عجیب قسم کے منکر ہو'' ارشد نے بگڑ کر کہا ''بھئی قسم خدا کی اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے، مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے تمہیں حیرت ضرور ہو گی، اس لیے کہ میں خود بہت متحیر ہوں۔ سلیمہ جیسی پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ایسی فضول باتوں سے متاثر ہو گئی یہ بات مجھے ہمیشہ متحیر رکھے گی مگر بھئی حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے میری اوٹ پٹانگ باتیں بڑے غور سے سنیں جیسے میں اسے دنیا کا کوئی راز نہفتہ بتا رہا ہوں واللہ یہ ذہین لڑکیاں بھی پرلے درجے کی سادہ لوح ہوتی ہیں سادہ لوح نہیں کہنا چاہیے خدا معلوم کیا ہوتی ہیں تم ان سے کوئی عقل کی بات کہو تو بس بگڑ جائیں گی یہ سمجھیں گی کہ ہم نے ان کی عقل و دانش پر حملہ کر دیا

ہے اور جب ان سے کوئی معمولی سی بات کہو جس سے ذہانت کو دور کا تعلق بھی نہ ہو تو وہ یہ سمجھیں گی کہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے تم کسی فلسفہ داں اور بال کی کھال اتارنے والی عورت سے کہا کہ خدا ایک ہے تو وہ نکتہ چینی شروع کر دے گی اگر اس سے یہ کہو دیکھو میں نے تمہارے سامنے ماچس کی ڈبیہ سے یہ ایک تیلی نکالی ہے، یہ ہوئی ایک تیلی، اب میں دوسری نکالتا ہوں۔ میز پر ان تیلیوں کو پاس پاس رکھ کر جب تم اس سے یہ کہو گے، دیکھو اب یہ دو تیلیاں ہو گئی ہیں تو وہ اس قدر خوش ہو گی کہ اٹھ کر تمہیں چومنا شروع کر دے گی۔"

یہ کہہ کر ارشد خوب ہنسا مجھے بھی ہنسنا پڑا اس لیے کہ بات ہی ہنسی پیدا کرنے والی تھی جب ہم دونوں کی ہنسی کم ہوئی میں نے اس سے کہا "اب تم اپنی بقایا کہانی سناؤ اور ہنسی مذاق کو چھوڑو"

"ہنسی مذاق میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں بھائی!" ارشد نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میں تو اس میں ہنسی مذاق ہی میں باتیں کر رہا تھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے سن رہی تھی ہاں تو جب میں نے چوہے پکڑنے کے اصول اس کو بتا دیئے تو اور زیادہ بچہ بن کر اس نے مجھ سے کہا "ارشد صاحب آپ تو فوراً چوہے پکڑ لیتے ہوں گے؟" میں نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا "جی ہاں ـــــ کیوں نہیں" اس پر سلیمہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا "کیا آپ اس چوہے کو جو آپ نے ابھی ابھی دیکھا تھا میرے سامنے پکڑ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ سلیمہ کا یہ سوال بہت ہی مشکل تھا مگر میں نے فوراً ہی جواب دیا "اجی یہ بھی کوئی مشکل بات ہے، یوں چٹکیوں میں اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے" سلیمہ اٹھ کھڑی ہوئی تو چلیے ـــــ میرے سامنے اسے

گرفتار کیجئے میں سمجھتی ہوں آپ کبھی اس چوہے کو نہیں پکڑ سکیں گے میں یہ سن کر یونہی مسکرا دیا" آپ غلط سمجھتی ہیں پندرہ نہیں تو بیس منٹ میں وہ چوہا اس چوہے دان میں ہوگا اور آپ کی نظروں کے سامنے بشرطیکہ آپ اتنے عرصہ تک انتظار کر سکیں" سلیمہ نے کہا "میں ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں مگر میں آپ سے پھر کہتی ہوں کہ آپ ناکام رہیں گے؟ وقت مقرر کر کے آپ چوہے کو کیسے پکڑ سکتے ہیں؟" میں اس وقت عجیب وغریب موڈ میں تھا اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ تم خدا دکھا سکتے ہو تو میں فوراً کہتا، ہاں دکھا سکتا ہوں، چنانچہ میں نے بڑے فخریہ لہجہ میں سلیمہ سے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔۔۔ میں ابھی آپ کو وہ چوہا پکڑ کے دکھا دیتا ہوں مگر شرط باندھیے" اس نے کہا "میں ہر شرط باندھنے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ ہار آپ ہی کی ہوگی" اس پر خدا معلوم مجھ میں کہاں سے جرأت آگئی جو میں نے اس سے کہا "تو یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں نے چوہا پکڑ لیا تو آپ سے جو چیز میں طلب کروں گا آپ بخوشی دے دیں گی" سلیمہ نے جواب دیا "مجھے منظور ہے" چنانچہ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چوہے دان میں صبح کی تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا لگایا اور اس کو اپنی کتابوں کی الماری سے دور صوفے کے پاس رکھ دیا شرط ورط کا مجھے اس وقت کوئی خیال نہیں تھا لیکن میں دل میں یہ دعا ضرور مانگ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی چوہا ضرور پھنس جائے تاکہ میری سرخروئی ہو نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت میں نے گپ ہانک دی بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا، چنانچہ ایک بار میرے جی میں آئی کہ اس سے کہہ دوں، میں تو آپ سے یونہی مذاق کر رہا تھا چوہا پندرہ منٹ میں کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔۔۔ گاندھی جی کا

ستیہ گرہ ہی ہوتا تو اسے جب چاہے پکڑ لیتے مگر یہ تو چوہا ہے آپ خود ہی غور فرمائیں مگر میں اس سے یہ نہ کہہ سکا اس لیے کہ اس میں میری شکست تھی۔

یہ کہہ کر ارشد نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور مجھ سے پوچھا ''کیا خیال ہے تمہارا اس داستان کے متعلق؟''

میں نے کہا ''بہت دلچسپ ہے مگر اس کا دلچسپ ترین حصہ تو ابھی باقی ہے جلدی جلدی وہ بھی سنا دو''

''کیا پوچھتے ہو دوست! وہ پندرہ منٹ جو میں نے انتظار میں گزارے ساری عمر مجھے یاد رہیں گے میں اور سلیمہ کمرے کے باہر کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ خدا معلوم کیا سوچ رہی تھی مگر میری بری حالت تھی سلیمہ نے میری جیب گھڑی اپنی ران پر رکھی ہوئی تھی میں بار بار جھک کر اس میں وقت دیکھ رہا تھا دس منٹ گزر گئے مگر پاس والے کمرے میں چوہے دان بند ہونے کی کھٹ نہ سنائی دی گیارہ منٹ گزر گئے کوئی آواز نہ آئی ساڑھے گیارہ منٹ ہو گئے خاموشی طاری رہی بارہ منٹ گزرنے پر بھی کچھ نہ ہوا سوا بارہ منٹ ہو گئے، ساڑھے بارہ ہوئے کہ دفعتاً کھٹ کی آواز بلند ہوئی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چوہے دان میرے سینے میں بند ہوا ہے ایک لمحہ کے لیے میرے دل کی دھڑکن بند سی ہو گئی، لیکن فوراً ہی ہم دونوں اٹھے دوڑ کر کمرے میں گئے اور چوہے دان کے تاروں میں سے جب مجھے ایک موٹے چوہے کی تھوتھنی اور اس کی لمبی لمبی مونچھیں نظر آئیں تو میں خوشی سے اچھل پڑا۔ پاس ہی سلیمہ کھڑی تھی، اس کی طرف میں نے فتح مند نظروں سے دیکھا اور جھٹ پٹ اس کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں کو چوم لے یہ سب کچھ اس قدر جلدی

میں ہوا کہ سلیمہ چند لمحات تک بالکل خاموش رہی لیکن اس کے بعد اس نے خفگی آمیز لہجہ میں مجھ سے کہا ''یہ کیا بیہودگی ہے؟'' اس وقت خدا معلوم میں کیسے موڈ میں تھا کہ ایک بار میں نے پھر اسی افراتفری میں اس کا بوسہ لے لیا اور کہا ''اجی مولانا آپ نے شرط ہاری ہے'' اور۔۔۔اور تیسری مرتبہ اس نے اپنے ہونٹ بوسے کے لیے خود پیش کر دیئے جس طرح چوہا ہاتھ آیا اسی طرح سلیمہ بھی ہاتھ آ گئی مگر بھئی میں شوکت کا بہت ممنون ہوں اگر میں نے چوہے دان کو گرم پانی سے نہ دھویا ہوتا تو چوہا کبھی نہ پھنستا۔''

یہ داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا لیکن افسوس بھی ہوا، اس لیے کہ شوکت اس لڑکی سلیمہ کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے۔

☆☆☆☆☆☆

چور

آصف نے کہا ''کام چور نوکر تو قریب قریب سبھی ہوتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر باقاعدہ چور ہوتے ہیں'' اور اس نے اپنے ایک نئے نوکر کی داستان سنائی جو بے حد مستعد تھا اس قدر مستعد کہ بعض اوقات آصف کے آواز نہ دینے پر بھی بھاگا بھاگا آتا تھا اور اس سے پوچھتا تھا'' کیوں صاحب آپ نے بلایا مجھے؟''

آصف نے مسکراتے ہوئے کہا'' مجھے نوکروں میں اس قدر پھرتی، چالاکی اور مستعدی پسند نہیں یہی وجہ ہے کہ جب راجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ آسو تم بہت خوش قسمت ہو کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں ایسا نوکر مل گیا تو۔۔۔۔''

راجہ غلام علی نے بات کاٹ کر کہا'' بخدا مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کم بخت چور ہو گا!''

آصف راجہ سے مخاطب ہوا'' میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ وہ یا تو چور ہے یا پہنچا ہوا ولی۔۔۔ اس کے بین بین وہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے راجہ صاحب سے کہا، قبلہ اگر آپ اس نوکر کو ایک ایسا دفینہ سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے مل گیا ہے تو میں آپ کی دوستی کی خاطر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔ آپ بڑے شوق سے یہ سوغات اپنے گھر لے جا سکتے ہیں''

راجہ نے کہا'' میں نے انکار نہیں کیا تھا''

''درست ہے!'' آصف مسکرایا'' غلطی میری تھی، اگر میں نے اس وقت وہ

نعمت غیر مترقبہ آپ کو سونپ دی ہوتی تو جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے چالیس روپے اور ایک عدد ریلوے پاس کا داغ مفارقت برداشت نہ کرنا پڑتا''

راجہ ہم سے مخاطب ہوا'' آصف سے ذرا ساری داستان سنو کافی دلچسپ ہے!''

آصف نے کہا'' معاف فرمائیے مجھے یہ داستان غم سناتے کوئی فرحت حاصل نہیں ہوتی'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا'' بات یہ ہے منٹو۔۔۔۔۔ کہ چغد پن اصل میں میں نے کیا وہ بہت چالاک تھا اس میں کوئی شک نہیں لیکن اپنی ہوشیاری پر مجھے کافی اعتماد تھا صبح سویرے اٹھ کر جب میں نے میز کی ٹرے دیکھی تو اس میں خلاف معمول میرا ریلوے پاس نہیں تھا اس کے خانے میں دس دس کے چار نوٹ تھے۔۔۔۔۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ساتھ ہی غائب تھے نوکر میری توقع کے مطابق موجود تھا چنانچہ میں نے ادھر ادھر تلاش کی میز کے نچلے دراز میں پاس معہ روپوں کے فائلوں کے نیچے موجود تھا میں نے اسے وہیں رکھ دیا۔۔۔ یہ تم سمجھ سکتے ہو کیوں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا'' بہت اچھی طرح''

راجہ مسکرانے لگا آصف نے اس کی طرف دیکھا'' راجہ صاحب مسکرا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ میں نے خود کو چغد ثابت کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ۔۔۔''

وہ مجھ سے مخاطب ہوا'' بات یہ ہوئی منٹو کہ میں نے ایک پلان بنایا۔۔۔۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اس نوکر نے جس کا نام مومن تھا کس نیت سے وہ روپے فائلوں کے نیچے چھپائے تھے اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بڑے اطمینان سے اپنا کام کرتا

چاہتا تھا اور میں بھی اسے بڑے اطمینان سے رنگے ہاتھوں پکڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔۔۔۔۔پلان یہ تھا کہ میں حسب معمول نہانے کے لیے غسل خانے میں جاؤں اور تھوڑا سا دروازہ کھلا رکھوں اور دیکھتا رہوں۔۔۔۔غسل خانے سے اس کمرے پر جس میں وہ میز پڑا تھا بڑی آسانی سے نگاہ رکھی جا سکتی تھی یہ پلان اس قدر واضح اور مکمل تھا کہ میں نے دل ہی دل میں اس مردمومن کو گرفتار کر کے بعد میں اپنی روایتی گناہ بخش طبیعت کے باعث اسے چھوڑ بھی دیا تھا''

راجہ ہنسا آصف بھی ہنسا ''ہاں تو منٹو، میں نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔۔۔۔دروازہ پلان کے عین مطابق میں نے تھوڑا سا کھلا رکھا۔۔۔مگر نہانے میں کچھ ایسا مشغول ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔۔۔۔معلوم نہیں غسل خانے میں آدمی کام کی باتیں بھول کر کیوں ایسی دنیا میں کھو جاتا ہے جہاں اور سب کچھ ہوتا ہے مگر کوئی غسل خانہ نہیں ہوتا!''

میں نے مسکرا کر کہا ''فقرہ خوبصورت ہے، گو کچھ معنی نہیں رکھتا''

آصف نے ذرا تیزی سے کہا ''کیوں معنی نہیں رکھتا۔۔۔۔۔اگر غسل خانے کے بجائے میں پینٹری میں گیا ہوتا یا دوسرے کمرے کو میں نے اپنا محاذ بنایا ہوتا تو یقیناً اپنے مجوزہ اوپریشن میں کامیاب رہتا۔۔۔۔بخدا مجھے تو اس دن سے نفرت ہو گئی ہے دنیا کے تمام غسل خانوں سے''

راجہ مسکرایا ''آج کل آپ غسل آفتابی فرماتے ہیں''

آصف بھی مسکرایا ''غسل آبی ہو، آفتابی ہو یا مہتابی۔۔۔۔مجھے سب سے نفرت ہو گئی ہے میں تو اس دن سے تیمم پر گزارہ کر رہا ہوں۔۔۔باہر نکل کر نگاہی

کرتے ہوئے جب مجھے اپنا پلان یاد آیا تو دوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا۔۔۔فائلوں کے نیچے پاس غائب تھا۔۔۔خدا کی قسم منٹو مجھے ان چالیس روپوں کا افسوس نہیں تھا صدمہ اس بات کا تھا کہ سارا پلان غسل خانے کی بدولت غارت ہوگیا اور پاس ضائع ہوگیا۔"

خواجہ ظہیر جو اس وقت تک خاموش تھا بولا "آصف صاحب نے اس روز جھنجھلاہٹ میں ٹکٹ کے بغیر سفر کیا اور دھر لیے گئے۔۔۔واپسی پر آنے کا پھر ارادہ تھا کہ چار پانچ دوستوں سمیت انتقام لینے کے لیے ٹکٹ کے بغیر سفر کریں مگر آپ کی روایتی دور اندیشی کام آگئی اور آپ اس خطرناک عزم سے باز رہے۔"

راجہ نے سگریٹ سلگایا اور اپنے موٹے موٹے گدگدے گالوں پر ہاتھ پھیر کر ایک لمبی داستان سنانے کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "چور نوکروں کا ذکر آیا ہے تو مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔۔۔"

میں نے ان کی بات کاٹی "اتفاق کی بات ہے کہ یہ دلچسپ واقعہ آپ اتنی مرتبہ اس قدر غیر دلچسپ طریقے پر بیان فرما چکے ہیں کہ اب اس غریب کی ساری وقوعیت ختم ہو چکی ہے۔۔۔اور دلچسپی۔۔۔۔"

راجہ کے گال تھرتھرائے "چلو ہٹاؤ"

خواجہ ظہیر نے مجھ سے اجازت لی "اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک واقعہ سناؤں۔۔۔ممکن ہے آپ کو اس میں دلچسپی کا کوئی پہلو مل جائے"

خواجہ ظہیر عام طور پر شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہونے والی گفتگو میں حصہ نہیں لیا کرتا تھا اور اپنا وہی تجربہ معرض بیان میں لایا کرتا تھا۔ جو اس پر کافی اثر

انداز ہوا ہو چنانچہ میں نے اس سے کہا" آپ تکلف سے کام نہ لیں خواجہ صاحب۔۔۔۔۔۔بے تکلف ارشاد فرمائیں"

خواجہ ظہیر نے قدرے تکلف سے کہنا شروع کیا" دس روپے کی چوری بظاہر بالکل معمولی چوری ہے۔۔۔گھر میں آئے دن نوکر ایسی چوریوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں میں دہلی میں تھا۔۔۔۔۔فتح پوری میں میرا مکان تھا۔۔۔۔میرا خیال ہے بمبئے جاتے ہوئے آپ ایک دفعہ وہاں ٹھہرے بھی تھے۔"

میں نے جواب دیا" جی ہاں۔۔۔۔۔۔ٹھہرا کیا تھا پورے دس روز قیام کیا تھا"

"تو آپ نے غلام قادر کو ضرور دیکھا ہوگا۔۔۔ادھیڑ عمر کا تھا۔۔۔۔بڑی بڑی مونچھیں۔۔۔۔"

مجھے یاد آ گیا" جی ہاں۔۔۔جی ہاں میں اب اس کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے لا سکتا ہوں۔۔۔مگر وہ تو۔۔وہ تو اچھا خاصا۔۔۔میرا مطلب ہے ایماندار آدمی معلوم ہوتا تھا۔"

خواجہ ظہیر نے کہا" میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔۔۔۔آپ سارا واقعہ سن لیجئے اس سے آپ یقیناً کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد کر لیں گے۔۔۔واقعہ یوں ہے۔۔۔۔۔میری بیوی کی عادت ہے کہ جب میں تنخواہ لا کر اس کے حوالے کرتا ہوں تو اس میں سے کچھ روپے نکال کر کسی کپڑے کی تہہ میں رکھ دیتی ہے یا کسی الماری کے کسی کونے میں چھپا دیتی ہے اور بھول جاتی ہے۔"

راجہ نے مسکرا کر کہا" آپ تو عیش کرتے ہوں گے؟"

خواجہ ظہیر نے راحیلہ سے مختصراً ''جی نہیں'' کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا ''وہ بھولتی نہیں دل میں یہ فرض کر لیتی ہے کہ بھول گئی ہے اس کو پس انداز کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ آتا ہے۔''

آصف نے میری طرف دیکھا ''منٹو۔۔۔۔۔۔یوں کہیں خواجہ صاحب کہ ان کی بیگم صاحب پس انداز کا ترجمہ کر دیتی ہیں''

خواجہ ظہیر مسکرایا ''جی ہاں۔۔۔۔۔۔۔کچھ ایسا ہی سمجھئے۔۔۔۔تو قصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اس نے دس کا ایک نوٹ بک شیلف کے نیچے رکھ دیا اور بھول گئی''

''اپنے نہ بھولنے والے انداز میں'' آصف نے اپنا سگریٹ سلگایا اور ظہیر کو پیش کیا۔

ظہیر نے سگریٹ لے کر شکریہ ادا کیا اور واقعہ کی تفصیل بیان کرنے لگا ''اپنے نہ بھولنے والے انداز میں وہ دس روپے کے اس نوٹ کو بھول چکی تھی۔۔۔۔۔وہ کس پوزیشن میں پڑا ہے، کب سے پڑا ہے یہ اس کو اچھی طرح یاد تھا اس لیے جب وہ غائب ہوا تو اس نے مجھ سے اس کے بارے میں استفسار کیا۔''

آصف نے ازراہ مذاق پوچھا ''کیا وہ ہر روز صبح اٹھ کر کونے کھدرے دیکھ لیا کرتی ہیں جہاں انہوں نے حسب توفیق کچھ نہ کچھ بھولا ہوتا ہے؟''

ظہیر نے جواب دیا ''ہر روز صبح اٹھ کر نہیں۔۔۔۔۔۔۔لیکن دن میں ایک مرتبہ سرسری طور پر دیکھ لیا کرتی ہیں۔۔۔۔چنانچہ جب ان کو اس نوٹ کی گمشدگی کا علم ہوا تو سب سے پہلے ان کو مجھ پر شبہ ہوا''

راحیلہ نے پوچھا ''آپ کبھی کبھی خود کو یہ دھوکا دینے کے لیے کہ آپ نے ایسی

چوری کی ہے جس کا علم آپ کی بیگم صاحب کو۔۔۔آپ۔۔۔آپ خود کو یہ دھوکا۔۔۔" راجہ صاحب نے فقرے کو صحیح اور بامطلب کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا" منٹو۔۔۔۔تم سمجھ گئے نا میرا مطلب؟"

میرے بجائے خواجہ ظہیر نے جواب دیا" ایسی چوریاں کون خاوند نہیں کرتا۔۔۔کبھی کبھی بوقت ضرورت اس جرم کا ارتکاب کرنا ہی پڑتا ہے۔۔۔لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس موقعہ پر اس کا شبہ غلط تھا مجھے ضرورت تھی اس لیے کہ ایک دوست کو سینما لے جانا تھا لیکن میں نے وہ نوٹ اٹھا کر پھر اس خیال سے وہیں رکھ دیا تھا کہ دو تین روز کے بعد اس کی شدید ضرورت پڑنے والی تھی۔۔۔میں نے چنانچہ اپنی بیوی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے اس نوٹ کی چوری کا کوئی علم نہیں۔"

راجہ نے پوچھا" ان کو یقین آ گیا"

"جی نہیں" خواجہ ظہیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا" وہ بیوی ہی نہیں جسے خاوند کی بات پر یقین آ جائے۔۔۔لیکن پھر بھی میں نے اپنی سی کوشش کی اور بالآخر اس کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نوٹ میں نے نہیں چرایا تھا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ چوری اگر میں نے نہیں تو کس نے کی تھی کیونکہ یہ تو مسلمہ امر تھا کہ نوٹ خود بخود غائب نہیں ہوا چرایا گیا ہے اور دو اور دو چار بنانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے دفتر جانے کے بعد کسی نے اس پر ہاتھ صاف کیا ہے کیونکہ دفتر جاتے ہوئے میں نے اسے چرانے کا خیال کیا تھا اور اسے کسی دوسرے وقت پر اٹھا دیا تھا۔"

راجہ مسکرایا "بزرگوں نے وہ ٹھیک کہا ہے آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔۔۔۔"

خواجہ ظہیر نے راجہ کی بات سنی مگر بزرگوں کے اس کہے کے متعلق اپنے خیال کا اظہار نہ کیا " گھر میں دو نوکر تھے، ایک ملازم قادر۔۔۔۔دوسرا صادق۔۔۔صادق دو دن سے چھٹی پر تھا اس کی ماں بیمار تھی بس ایک غلام قادر ہی تھا جس پر شک کیا جا سکتا تھا مگر۔۔۔۔" اس نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا " جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی فرمایا تھا وہ اچھا خاصا ایمان دار آدمی معلوم ہوتا تھا۔۔۔۔کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہم اپنے شک کا اظہار کیسے کریں۔۔۔۔نوکروں کو ڈانٹنے ڈپٹنے، مارنے پیٹنے اور ملازمت سے برطرف کرنے کا کام میرے ذمے ہے۔"

راجہ نے ازراہ مذاق کہا "بڑا اہم پورٹ فولیو آپ کے ذمے ہے"

"جی ہاں، بہت اہم۔۔۔۔لیکن بڑا نازک۔۔۔۔۔وہ ملازم خود رکھتی ہیں لیکن برطرف مجھ سے کراتی ہیں" یہ کہہ کر خواجہ ظہیر مسکرایا

راجہ صاحب کے گال بھی مسکرائے "جس کا کام اسی کو ساجھے۔۔۔۔کوئی اور کرے تو خدا معلوم کیا باجے"

آصف نے کہا "ڈنکا"

"ڈنکا ہی ہوگا" جلدی سے کہہ کر وہ خواجہ ظہیر سے مخاطب ہوا " آپ ذرا جلدی اپنی داستان ختم کیجئے۔۔۔۔مجھے اپنی ڈنکا کے ساتھ ایک جگہ جانا ہے۔"

آصف بے تحاشا ہنسا "اپنی ڈنکا کے ساتھ؟"

راجہ کے گال بوکھلا گئے "آئی ایم سوری۔۔۔۔اپنی بیوی کے ساتھ!"

سب ہنسنے لگے میں نے خواجہ ظہیر سے کہا" راجہ صاحب کو اپنی بیوی کے ساتھ جانا ہے اس لیے آپ یہ داستان جلدی ختم کر دیجئے تاکہ یہ راستے میں اسے سنا سکے!"

خواجہ مسکرایا" بہت بہتر ۔۔۔۔۔" پھر تھوڑی دیر رک کر اس نے کہنا شروع کیا" معاملہ بہت ٹیڑھا تھا غلام قادر کو ملازم ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا اس دوران میں اس نے مجھے اور میری بیوی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا بڑا اطاعت گزار قسم کا آدمی تھا ان دنوں سخت گرمیوں کے باعث برف کی بہت قلت تھی ملتی تھی تو آٹھ آنے سیر مگر غلام قادر دو آنے کی اتنی ساری لے آتا تھا۔۔۔ صادق کو بہت تاؤ آتا تھا جب میری بیوی اس سے کہتی کہ دیکھو غلام قادر کتنا اچھا ہے تم تو اول درجے کے چور ہو تو وہ بھنا جاتا اور اسے گالیاں دیتا کہ وہ یہ سب کچھ اسے نکلوانے کے لیے کرتا ہے۔۔۔۔ جب پہلی مرتبہ وہ دو آنے کی توقع سے بہت زیادہ برف لایا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اتنی سستی تم کہاں سے لے آئے ہو تو اس نے جواب دیا کہ صاحب برف والا اپنی دکان بڑھا رہا تھا، جتنی بچی تھی، سب کی سب اس نے مجھے دے دی جواب معقول تھا لیکن دوسرے روز وہ پھر دو آنے کی اتنی ہی برف لایا اور قریب قریب ہر روز لاتا رہا کیونکہ میری بیوی نے اب سودا سلف لانے کا کام اسی کے سپرد کر دیا تھا۔۔۔۔ اس کو میرے لڑکے سے بہت محبت تھی ہر دوسرے تیسرے دن اس کو چاکلیٹ وغیرہ لے دیتا تھا دو تین مرتبہ وہ میری بیوی کے لیے چنگیر بھر بھر کے موتیے کے پھول بھی لایا۔۔۔۔ اس پر چوری کا شک ہو سکتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کا اظہار کیسے کیا جائے اور اس کی

تصدیق کیونکر ہو۔۔۔۔میں طبعاً نرم ہوں لیکن بیوی کی خاطر مجھے اکثر نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ جب چوری کا پتہ لگانے کے لیے مجھے بار بار اکسایا گیا تو میں نے ایک دن غلام قادر سے پوچھ گچھ کا تہیہ کرلیا۔''

خواجہ نے ڈبیا سے ایک سگریٹ نکالا راجہ نے گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا'' اللہ بیوی سے بچائے۔۔۔۔''

خواجہ نے سگریٹ سلگایا'' چنانچہ میں نے اس کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا، دیکھو غلام قادر وہ دس روپے کا نوٹ جو تم نے بک شیلف کے نیچے سے اٹھایا تھا واپس کردو۔''

راجہ نے کہا'' یہ طریقہ خوب تھا''

خواجہ ظہیر نے راجہ کی بات کی طرف دھیان نہ دیا'' اس نے کسی قدر گھبرا کر جواب دیا، صاحب کون سا دس روپے کا نوٹ۔۔۔۔مجھے بالکل معلوم نہیں۔۔۔۔اس پر میں نے اس کو ڈانٹا مگر وہ پھر بھی نہ قبولا جب میں نے محسوس کیا کہ مجھے شکست ہو رہی ہے تو میں نے زور کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا یہ اس کی توقع کے خلاف تھا ایک دو سیکنڈ کے لیے چنانچہ وہ بالکل مبہوت ہو گیا۔۔۔۔میں نے ایک اور جڑ دیا اور بڑے سنگین لہجے میں اس سے کہا دیکھو غلام قادر تم نے اگر سچ نہ بولا تو میں پولیس کے حوالے کردوں گا اس نے جواب دیا صاحب میں نے چوری نہیں کی آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیجیے!''

راجہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا'' بڑا پکا چور تھا''

خواجہ ظہیر نے نفی میں اپنا سر ہلایا'' جی نہیں۔۔۔وہ پکا چور نہ تھا نہ

کچا۔۔۔میں نے جب دیکھا کہ میرا وار خالی گیا ہے تو بڑی پریشانی ہوئی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں میں نے آغاز ہی انتہا سے کیا تھا۔۔۔اب کیا کرتا۔۔۔وہ بڑے زناٹے کے تھپڑ میں نے اس کو مارے تھے۔۔۔۔۔وہ بے گناہ بھی ہو سکتا تھا مجھے بہت افسوس ہوا چنانچہ میں نے صدق دل سے معافی مانگی اور کہا دیکھو غلام قادر۔۔۔مجھ سے زیادتی ہوئی ہے لیکن بات یہ ہے کہ وہ دس روپے کا نوٹ غائب ضرور ہوا ہے میں نے اٹھایا نہیں تم انکار کرتے ہو اس کا یہ مطلب ہوا کہ یا تو ہم دونوں سچے ہیں یا دونوں جھوٹے۔۔۔۔۔بیگم صاحبہ تمہارا کہنا مان لیں گی لیکن مجھ پر ان کا شک بہت مضبوط ہو جائے گا۔۔۔میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری نیت تھی وہ نوٹ اٹھانے کی۔۔۔بلکہ میں نے اٹھایا بھی تھا مگر پھر وہیں رکھ دیا تھا کہ جب بہت اشد ضرورت ہو گی تو لے لوں گا۔۔۔۔''

میں اسی جذباتی رو میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ غلام قادر مضبوط لہجے میں بولا ''وہ نوٹ میں نے اٹھایا تھا صاحب۔۔۔۔'' ایک لمحے کے لیے میں چکرا گیا

راجہ نے کہا ''بات چکرانے ہی والی تھی!''

خواجہ ظہیر نے سگریٹ فرش پر پھینک کر بوٹ کے تلے سے بجھایا ''تم نے۔۔۔۔تم نے یہ چوری کیوں کی؟۔۔۔غلام قادر نے جواب دیا۔۔۔کیا کرتا صاحب۔۔۔بیگم صاحبہ نے تنخواہ نہیں دی۔۔۔۔کہتی تھیں کہ میں ہمیشہ نوکر کی ایک مہینے کی تنخواہ دبا کر رکھا کرتی ہوں تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔اس نے رک رک کر کہا۔۔۔مجھے عادت

ہے۔۔۔ مالکوں کی خدمت کرنے کی۔۔ان کے سوا میرا کون ہوتا ہے۔۔۔۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔۔ میلے جھاڑن سے ان کو پونچھتے ہوئے وہ کمرے سے چلا گیا''

رابعہ نے پوچھا ''پھر کیا ہوا؟''

خواجہ ظہیر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا '' کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔وہ گھر ہی سے چلا گیا تھا!''

13 اکتوبر 1951ء

☆☆☆☆☆

حامد کا بچہ

لاہور سے بابو ہرگوپال آئے تو حامد گھر کا رہا نہ گھاٹ کا انہوں نے آتے ہی حامد سے کہا ''لو بھئی فوراً ایک ٹیکسی کا بندوبست کرو''

حامد نے کہا'' آپ ذرا آرام کر لیجئے اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آئے ہیں تھکاوٹ ہو گی۔''

بابو ہرگوپال اپنی دھن کے پکے تھے ''نہیں بھائی مجھے تھکاوٹ واوٹ کچھ نہیں میں یہاں سیر کی غرض سے آیا ہوں۔ آرام کرنے نہیں آیا، بڑی مشکل سے دس دن نکالے ہیں یہ دس دن تم میرے ہو جو میں کہوں گا تمہیں ماننا ہو گا میں اب کے عیاشی کی انتہا کر دینا چاہتا ہوں۔۔۔ سوڈا منگواؤ''

حامد نے بہت منع کیا کہ دیکھئے بابو ہرگوپال صبح سویرے مت شروع کیجئے مگر وہ نہ مانے بکس کھول کر جونی واکر کی بوتل نکالی اور اسے کھولنا شروع کر دیا۔

''سوڈا نہیں منگواتے تو لاؤ تھوڑا سا پانی لاؤ۔۔۔۔ کیا پانی بھی نہیں دو گے''

بابو ہرگوپال، حامد سے عمر میں بڑے تھے حامد تیس کا تھا تو وہ چالیس کے تھے حامد ان کی عزت کرتا تھا اس لیے کہ اس کے مرحوم باپ سے بابو صاحب کے مراسم تھے۔اس نے فوراً سوڈا منگوا دیا اور بڑی لجاجت سے کہا'' دیکھئے مجھے مجبور نہ کیجئے گا آپ جانتے ہی ہیں کہ میری بیوی بڑی سخت گیر ہے۔'' مگر بابو ہرگوپال کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اور اسے ساتھ دینا ہی پڑا۔

جیسی کہ امید تھی، چار پیگ پینے کے بعد بابو ہرگوپال نے حامد سے کہا'' لو بھئی

اب چلیں گھومنے مگر دیکھو کوئی ایسی ٹیکسی پکڑنا جو ذرا شاندار ہو۔ پرائیویٹ ٹیکسی ہو تو بہت اچھا ہے مجھے ان میٹروں سے نفرت ہے۔''

حامد نے پرائیویٹ ٹیکسی کا بندوبست کر دیا نئی فورڈ تھی ڈرائیور بھی بہت اچھا تھا۔۔۔ بابو ہرگوپال بہت خوش ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنا چوڑا بٹوا نکالا، کھول کر دیکھا سو سو کے کئی نوٹ تھے اور اطمینان کا سانس لیا اور اپنے آپ سے کہا ''کافی ہیں۔۔۔ لو بھئی ڈرائیور اب چلو''

ڈرائیور نے اپنے سر پر ٹوپی کو ترچھا کیا اور پوچھا ''کہاں سیٹھ''

بابو ہرگوپال حامد سے مخاطب ہوئے ''بولو بھئی تم''

حامد نے کچھ دیر سوچ کر ایک ٹھکانا بتایا ٹیکسی نے ادھر کا رخ کیا تھوڑی ہی دیر کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا دلال ان کے ساتھ تھا اس نے مختلف مقامات سے مختلف لڑکیاں نکال نکال کر پیش کیں مگر حامد کو کوئی پسند نہ آئی وہ نفاست پسند تھا صفائی کا شیدا تھا یہ لڑکیاں سرخی پاؤڈر کے باوجود اس کو گندی دکھائی دیں اس کے علاوہ ان کے چہرے پر کسبیت کی مہر تھی یہ اسے بہت گھناؤنی معلوم ہوتی تھی وہ چاہتا تھا کہ عورت کسبی ہونے پر بھی عورت ہی رہنا چاہیے اپنے عورت پن کو اپنے پیشے کے نیچے دبا نہیں دینا چاہیے۔ اس کے برعکس بابو ہرگوپال غلاظت پسند تھا لاکھوں میں کھیلتا تھا چاہتا تو بمبئی کا پورا شہر صابن پانی سے دھلوا دیتا مگر اپنی ذاتی صفائی کا اسے کچھ خیال نہیں تھا نہاتا تھا تو بہت ہی تھوڑے پانی سے کئی کئی دن شیو نہیں کرتا تھا گلاس چاہے میلا چکٹ ہو، اٹھا کر اس میں فرسٹ کلاس وسکی انڈیل دیتا تھا غلیظ بھکارن کو بیٹے کے ساتھ چمٹا کر سو جاتا تھا اور کہتا تھا، لطف آ

گیا۔۔۔کیا چیز تھی۔

حامد کو حیرت ہوئی کہ یہ بابو کس قسم کا انسان ہے اوپر نہایت ہی قیمتی شیروانی ہے نیچے ایسی بنیان ہے کہ اس کو دیکھنے سے ابکائیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں رومال پاس ہے لیکن کرتے کے دامن سے ناک کا بہتا ہوا رینٹھ صاف کر رہا ہے غلیظ پلیٹ میں چاٹ کھا کر خوش ہو رہا ہے تکیے کے غلاف میلے ہو کر بدبو چھوڑ رہے ہیں مگر اسے ان کو بدلوانے کا خیال تک نہیں آتا۔۔۔۔۔حامد نے اس کے متعلق بہت غور کیا تھا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچا اس نے کئی مرتبہ بابو ہرگوپال سے کہا "بابو جی آپ کو غلاظت سے گھن کیوں نہیں آتی"

یہ سن کر بابو ہرگوپال مسکرا دیتے "کیوں نہیں آتی۔۔۔۔۔لیکن تمہیں تو ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے اب اس کا کیا علاج ہے۔"

حامد خاموش ہو جاتا اور دل ہی دل میں بابو ہرگوپال کی غلاظت پسندی پر کڑھتا رہتا۔

ٹیکسی دیر تک ادھر ادھر آوارہ گھومتی رہی دلال نے جب دیکھا کہ حامد انتخاب کے معاملے میں بہت کڑا ہے تو اس نے دل میں کچھ سوچا اور ڈرائیور سے کہا "شیوا جی پارک کی طرف دباؤ۔۔وہ بھی پسند نہ آئی تو قسم خدا کی بھڑوا گیری چھوڑ دوں گا"

ٹیکسی شیوا جی پارک کی ایک بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس رکی۔دلال اوپر چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور بابو ہرگوپال اور حامد کو اپنے ساتھ لے گیا۔

بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔فرش کی ٹائلیں چمک رہی تھیں فرنیچر پر گرد کا ذرہ تک

نہیں تھا ادھر دیوار پر سوامی وویکا نند کی تصویر لٹک رہی تھی سامنے گاندھی جی کی تصویر سوبھاش کا فوٹو بھی تھا میز پر مرہٹی کی کتابیں پڑی تھیں۔

دلال نے ان کو بیٹھنے کے لیے کہا دونوں صوفے پر بیٹھ گئے حامد گھر کی صفائی سے بہت متاثر ہوا چیزیں مختصر تھیں مگر قرینے سے رکھی گئی تھیں فضا بڑی سنجیدہ تھی اس میں کسبیوں کا وہ بے شرم تیکھا پن نہیں تھا۔

حامد بڑی بے صبری سے لڑکی کی آمد کا انتظار کرنے لگا دوسرے کمرے سے ایک مرد نمودار ہوا اس نے ہولے ہولے سرگوشیوں میں دلال سے باتیں کیں بابو ہرگوپال اور حامد کی طرف دیکھا اور کہا ''ابھی آتی ہے۔۔۔۔۔نہا رہی تھی کپڑے پہن رہی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا

حامد نے غور سے کمرے کی چیزیں دیکھنا شروع کیں میز کے پاس کونے میں بڑی خوبصورت رنگین چٹائی پڑی تھی میز پر کتابوں کے ساتھ دس پندرہ رسالے تھے نیچے بڑے نازک چپل چمکیلے فرش پر پڑے تھے کچھ اس انداز سے کہ ابھی ابھی ان سے پاؤں نکل کر گئے ہیں سامنے شیشوں والی الماری میں قطار در قطار کتابیں تھیں۔

بابو ہرگوپال نے فرش پر جب اپنے سگریٹ کا آخری حصہ اپنی گرگابی کے نیچے دبایا تو حامد کو بہت غصہ آیا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے کہ دوسرے کمرے کے دروازے سے اس کے کانوں میں ریشمیں سرسراہٹ پہنچی اس نے زاویہ بدل کر دیکھا ایک گوری چٹی لڑکی بالکل نئے کاشے میں ملبوس نکلے

پیر آ رہی تھی۔۔۔کاشنے کا پلو اس کے سر سے ڈھلکا سیدھی مانگ تھی جب قریب آ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تو اس کے چمکیلے جوڑے میں حامد نے ایک پتا اڑسا ہوا دیکھا پتے کا رنگ سفیدی مائل تھا موٹے جوڑے میں جو بڑی صفائی سے کیا گیا تھا یہ پتا بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا حامد نے پرنام کا جواب اٹھ کر دیا لڑکی شرماتی لجاتی ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی عمر حامد کے اندازے کے مطابق سترہ برس سے اوپر نہیں تھی قد میانہ، رنگ گورا جس میں ہلکی ہلکی پیازی جھلک تھی جس طرح اس کی ساڑھی نئی تھی اسی طرح وہ خود نئی معلوم ہوتی تھی کرسی پر بیٹھ کر اس نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھکا لیں حامد کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے وجود میں سرایت کر رہی ہے۔لڑکی بڑی صاف ستھری بڑی اجلی تھی۔

بابو ہرگوپال نے حامد سے کچھ کہا تو وہ چونک پڑا جیسے اس کو کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہے ''کیا کہا بابو ہرگوپال؟''

بابو ہرگوپال نے کہا ''بات کرو بھئی'' پھر آواز دھیمی کر دی ''مجھے تو کوئی خاص پسند نہیں''

حامد کباب ہو گیا اس نے لڑکی کی طرف دیکھا دھلا ہوا شباب اس کے سامنے بیٹھا تھا نکھری ہوئی بے داغ جوانی، ریشم میں لپٹی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے تھی جس کو وہ حاصل کر سکتا تھا ایک رات کے لیے نہیں کئی راتوں کے لئے کیونکہ وہ قیمت دلوا کر کے اپنائی جا سکتی تھی لیکن حامد نے جب یہ سوچا تو اسے دکھ ہوا کہ ایسا کیوں ہے یہ لڑکی بکاؤ مال ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی پھر اسے خیال آیا کہ اگر ایسا

ہوتا تو اس کو حاصل کیسے کرتا۔

بابو ہر گوپال نے بڑے بھونڈے انداز میں پوچھا ''کیا خیال ہے بھئی''

''خیال؟'' حامد پھر چونکا ''آپ کو تو پسند نہیں لیکن میں۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا

بابو ہر گوپال بڑے دوست نواز تھے اٹھے اور دلال سے کاروباری انداز میں پوچھا ''بھئی کیا دینا پڑے گا''

دلال نے جواب دیا ''چھوکری دیکھ لیجئے ابھی تازہ تازہ دھندا شروع کیا ہے''

بابو ہر گوپال نے اس کی بات کاٹی ''تم اسے چھوڑو معاملے کی بات کرو''

دلال نے بیڑی سلگائی اور کہا ''سو روپے ہوں گے پورا دن رکھیے یا پوری رات رکھیے ایک ڈیڑھ پیسہ کم نہیں ہوگا''

بابو ہر گوپال حامد سے مخاطب ہوئے ''کیوں بھئی''

حامد کو بابو ہر گوپال اور دلال کی گفتگو بہت ناگوار گزر رہی تھی اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس لڑکی کی توہین ہو رہی ہے۔۔۔۔سو روپے میں یہ دھڑکتا ہوا شباب یہ دہکتی ہوئی جوانی۔۔۔۔اس کو یہ سن کر بہت کوفت ہوئی کہ مرہٹی حسن کا جو یہ نادر نمونہ اس کے سامنے سانس لے رہا تھا اس کی قیمت صرف سو روپے ہے۔۔۔۔مگر اس کوفت کے ساتھ ہی اس خیال نے اس کے دل میں چٹکی لی کہ سو روپے دے کر آدمی اس کو حاصل کر سکتا ہے ایک دن یا ایک رات کے لیے پھر اس نے سوچا ''صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے۔۔۔اس کے ساتھ تو آدمی کو اپنی ساری عمر بتا دینی چاہیے۔۔۔اس کی ہستی میں اپنی ہستی مدغم کر دینی چاہیے۔''

بابو ہر گوپال نے پھر پوچھا ’’کیوں بھئی کیا خیال ہے‘‘

حامد اپنا خیال ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا بابو ہر گوپال مسکرایا جیب سے بٹوہ نکالا اور سو کا ایک نوٹ دلال کو دے دیا ایک ڈیڑھ سیا کم نہ ایک ڈیڑھ سیا زیادہ پھر وہ حامد سے مخاطب ہوا ’’چلو بھئی ۔۔۔۔ معاملہ طے ہو گیا‘‘

حامد خاموش ہو گیا دونوں نیچے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھے دلال لڑکی لے کر آگیا وہ شرماتی لجاتی ان کے ساتھ بیٹھ گئی ۔۔۔۔ ہوٹل میں ایک کمرے کا بندوبست کر کے بابو ہر گوپال اپنے لیے کوئی لڑکی تلاش کرنے چلا گیا۔

لڑکی پلنگ پر آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی حامد کا دل دھک دھک کر رہا تھا بابو ہر گوپال وسکی کی بوتل چھوڑ گیا تھا آدھی کے قریب باقی تھی حامد نے سوڈا منگوا کر ایک بہت بڑا پیگ لگایا اس سے اس میں کچھ جرأت پیدا ہوئی اس نے لڑکی کے پاس بیٹھ کر پوچھا ’’آپ کا نام؟‘‘

لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر جواب دیا ’’لتا منگلاؤں کر‘‘

بڑی پیاری آواز تھی حامد نے ایک بڑا پیگ اپنے اندر انڈیلا اور لتا کے سر سے کاشٹے کا پلو ہٹا کر اس کے چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ لتا نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھپکائیں حامد نے ساڑھی کا پلو بالکل نیچے گرا دیا چست چولی کے کھلے گریبان سے اس کو لتا کے سینے کے ابھار کی ننھی سی دھڑکتی ہوئی جھلک دکھائی دی حامد کا سارا وجود تھرا گیا اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چولی بن کر لتا کے ساتھ چمٹ جائے اس کی میٹھی میٹھی گرمی محسوس کرے اور سو جائے۔

لتا ہندوستانی نہیں جانتی تھی اس کو منگلاؤں سے آئے صرف دو مہینے ہوئے

تھے مرہٹی بولتی تھی بڑی کرخت زبان ہے لیکن اس کے منہ میں یہ بڑی ملائم ہوگئی تھی وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں حامد کی باتوں کا جواب دیتی تو وہ اس سے کہتا "نہیں تم مرہٹی میں بات کرو مجھے بہت چانگلی لگتی ہے۔"

لفظ چانگلی سن کر لتا ہنس پڑتی اور صحیح لفظ کو بتاتی لیکن حامد چ اور ے کی درمیانی آواز پیدا نہ کرسکتا۔ اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگتے حامد اس کی باتیں نہ سمجھتا لیکن اس نہ سمجھنے میں اس کو لطف آتا تھا کبھی کبھی وہ اس کے ہونٹ چوم لیتا اور اس سے کہتا "یہ پیارے پیارے بول جو تم اپنے منہ سے نکال رہی ہو میرے منہ میں ڈال دو میں انہیں پینا چاہتا ہوں"

وہ کچھ نہ سمجھتی اور ہنس دیتی حامد اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا لتا کی بانہیں بڑی سڈول اور گوری گوری تھیں ان پر چولی کی چھوٹی چھوٹی آستینیں پھنسی ہوئی تھیں حامد نے ان کو بھی کئی بار چوما لتا کا ہر عضو حامد کو پیارا لگتا تھا۔

رات کو نو بجے جب حامد نے لتا کو اس کے گھر چھوڑا تو اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کیا اس کے ملائم جسم کا لمس جیسے ایک دم چھال کی طرح اتر کر اس سے جدا ہو گیا ساری رات کروٹیں بدلتا رہا صبح بابو ہرگوپال آئے انہوں نے تخلیے میں اس سے پوچھا "کیوں کیسی رہی؟"

حامد نے صرف اتنا کہا "ٹھیک تھی"

"چلتے ہو پھر؟"

"نہیں مجھے ایک ضروری کام ہے"

"بکواس نہ کرو ۔۔۔۔۔ میں نے تم سے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دس دن تم

میرے ہو''

حامد نے بابو ہر گوپال کو یقین دلایا کہ اسے واقعی بہت ضروری کام ہے پونے جا رہا ہے وہاں اس کو ایک آدمی سے مل کر اپنا کام کرانا ہے بابو ہر گوپال انجام کار مان گئے اور اکیلے عیاشی کرنے چلے گئے۔

حامد نے ٹیکسی لی بینک سے روپے نکلوائے اور سیدھا لتا کے ہاں پہنچا وہ اندر نہا رہی تھی۔ کمرے میں ایک مرد بیٹھا تھا وہی جس نے پہلے دن کہا تھا ''ابھی آتی ہے۔۔۔۔نہا رہی تھی، کپڑے بدل رہی ہے'' حامد نے اس سے کچھ دیر باتیں کیں اور سو کا ایک نوٹ اس کے حوالے کر دیا لتا آئی پہلے سے بھی زیادہ صاف ستھری اور نکھری ہوئی ہاتھ جوڑ کر اس نے پرنام کیا حامد اٹھا اور اس مرد سے مخاطب ہوا ''میں چلتا ہوں تم لے آؤ انہیں۔۔۔۔وقت پر چھوڑ جاؤں گا''

یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گیا لتا آئی اور حامد کے پاس بیٹھ گئی اس کا لمس محسوس کر کے حامد کر بڑی راحت ہوئی وہ اس کو وہیں ٹیکسی میں اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیتا مگر لتا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

شام کے ساڑھے سات بجے تک وہ اس کے ساتھ رہی۔۔۔۔۔۔۔جب اس کو گھر چھوڑا تو ایسا محسوس کیا کہ اس کے دل کی راحت اس سے جدا ہو گئی ہے رات بھر وہ بے چین رہا حامد شادی شدہ تھا چھوٹے چھوٹے دو بچوں کا باپ تھا اس نے سوچا کہ وہ سخت حماقت کر رہا ہے اگر اس کی بیوی کو پتہ چل گیا تو آفت برپا ہو جائے گی ایک بار سلسلہ ہو گیا ٹھیک ہے، مگر یہ سلسلہ تو اب دراز ہونے کی طرف مائل تھا اس نے عہد کر لیا کہ اب شیواجی پارک کا رخ نہیں کرے گا مگر صبح دس بجے

وہ پھر لتا کے ساتھ ہوٹل میں لیٹا تھا۔

پندرہ روز تک حامد بلا ناغہ لتا کے ہاں جاتا رہا۔۔۔اس کے بینک اکاؤنٹ سے دو ہزار روپے اڑ چکے تھے کاروبار الگ اس کی غیر موجودگی کے باعث نقصان اٹھا رہا تھا حامد کو اس کا کامل احساس تھا مگر لتا اس کے دل و دماغ پر بری طرح چھا چکی تھی لیکن حامد نے ہمت سے کام لیا اور ایک دم یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دوران میں بابو ہرگوپال اپنی میلی اور غلیظ عیاشیاں ختم کر کے لاہور واپس جا چکا تھا حامد نے خود کو زبردستی اپنے کاروباری کاموں میں مصروف کر دیا اور لتا کو بھولنے کی کوشش کی۔

چار مہینے گزر گئے حامد ثابت قدم رہا لیکن ایک دن اتفاق سے اس کا گزر شیوا جی پارک سے ہوا حامد نے غیر ارادی طور پر ٹیکسی والے سے کہا ''روک لو یہاں'' ٹیکسی رکی حامد سوچنے لگا ''نہیں ٹھیک نہیں۔۔۔ٹیکسی والے سے کہو چلے!'' مگر دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور اوپر چلا گیا۔

لتا آئی تو حامد نے دیکھا کہ وہ پہلے سے موٹی ہے چھاتیاں زیادہ بڑی ہیں چہرے پر گوشت بڑھ گیا ہے حامد نے سو روپے دیئے اور اس کو ہوٹل میں لے گیا یہاں اس کو جب معلوم ہوا کہ لتا حاملہ ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے سارا نشہ ہرن ہو گیا گھبرا کر اس نے پوچھا ''یہ۔۔۔یہ حمل کس کا ہے''

لتا کچھ نہ سمجھی حامد نے اس کو بڑی مشکل سے سمجھایا تو اس نے سر ہلا کر کہا ''ہم کو مالوم نہیں۔''

حامد پسینہ پسینہ ہو گیا ''تمہیں بالکل معلوم نہیں''

لتا نے سر ہلایا "نہیں"

حامد نے تھوک نگل کر پوچھا "کہیں میرا تو نہیں"

"معلوم نہیں"

حامد نے مزید استفسار کیا بہت سی باتیں کیں تو اسے معلوم ہوا کہ لتا کے لواحقین نے حمل گروانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ کوئی دوا اثر نہیں کرتی تھی ایک دوا نے تو اسے بیمار کر دیا چنانچہ ایک مہینہ وہ بستر پر پڑی رہی حامد نے بہت سوچا ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آئی کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور بہت جلدی کرے کیونکہ بچے کی خاطر لتا کو گاؤں بھیجا جا رہا تھا۔

حامد نے اس کو گھر چھوڑا اور ایک ڈاکٹر کے پاس گیا جو اس کا دوست تھا اس نے حامد سے کہا "دیکھو یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہوتا ہے۔"

حامد نے اس سے کہا "یہاں میری زندگی اور موت کا سوال ہے نطفہ یقیناً میرا ہے میں نے اچھی طرح حساب لگایا ہے اس سے بھی اچھی طرح دریافت کیا ہے خدا کے لیے آپ سوچئے میری پوزیشن کیا ہے۔۔۔۔۔۔میری اولاد۔۔۔میں تو یہ سوچتے ہی کانپ جاتا ہوں آپ میری مدد نہیں کریں گے تو سوچتا سوچتا پاگل ہو جاؤں گا"

ڈاکٹر نے اس کو دوا دے دی حامد نے لتا کو پہنچا دی مگر کوئی اثر نہ ہوا حامد خوشخبری سننے کے لیے بے قرار تھا مگر لتا نے اس سے کہا کہ اس پر پہلے بھی کسی دوا نے اثر نہیں کیا تھا حامد بڑی مشکلوں سے ایک اور دوا لایا مگر یہ بھی کارگر ثابت نہ

ہوئی اب لتا کا پیٹ صاف نمایاں تھا اس کے لواحقین اسے گاؤں بھیجنا چاہتے تھے لیکن حامد نے ان سے کہا ”نہیں ابھی ٹھہر جاؤ۔۔۔میں کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔“

بندوبست کچھ بھی نہ ہوا سوچ سوچ کر حامد کا دماغ عاجز آ گیا کیا کرے کیا نہ کرے کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔۔۔۔بابو ہرگوپال پر سو لعنتیں بھیجتا تھا اپنے آپ کو کوستا تھا کہ کیوں اس نے حماقت کی یہ سوچتا تو لرز جاتا کہ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بھی اپنی ماں کی طرح پیشہ کرے گی ڈوب مرنے کی بات ہے۔

اس کو لتا سے نفرت ہو گئی اس کا حسن اس کے دل میں اب پہلے سے جذبات پیدا نہ کرتا غلطی سے اس کا ہاتھ لتا سے چھو جاتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس نے انگاروں میں ہاتھ جھونک دیا ہے اس کو اب لتا کی کوئی ادا پسند نہیں تھی اس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس کا بچہ جننے سے پہلے مر جائے وہ اور مردوں کے پاس بھی جاتی رہی تھی، کیا اسے حامد ہی کا نطفہ قبول کرنا تھا؟

حامد کے جی میں آئی کہ وہ اس کے سوجے ہوئے پیٹ میں چھرا بھونک دے یا کوئی ایسا حیلہ کرے کہ اس کا بچہ پیٹ ہی میں مر جائے لتا بھی کافی فکرمند تھی اس کی کبھی خواہش نہیں تھی کہ بچہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کو بہت بوجھ محسوس ہوتا تھا شروع شروع میں تو اس کو الٹیوں نے نڈھال کر دیا تھا اب ہر وقت اس کے پیٹ میں اینٹھن سی رہتی تھی مگر حامد سمجھتا تھا کہ وہ فکرمند نہیں ہے اور کچھ نہیں تو کم بخت میری حالت دیکھ کر ہی ترس کھا کر بچہ قے کر دے۔

دوائیں چھوڑ کر ٹونے ٹوٹکے بھی کیے مگر بچہ اتنا ہٹ دھرم تھا کہ اپنی جگہ پر قائم

رہا۔۔۔۔۔۔تھک ہار کر حامد نے لتا کو گاؤں جانے کی اجازت دے دی لیکن خود وہاں جا کر مکان دیکھ آیا حساب کے مطابق بچہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پیدا ہونا تھا حامد نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے کسی نہ کسی طرح مروا ڈالے گا چنانچہ اس غرض سے اس نے بمبئی کے ایک بہت بڑے دادا سے راہ و رسم پیدا کی اس کو خوب کھلاتا پلاتا رہا اس پر اس کا کافی روپیہ خرچ ہوا مگر حامد نے کوئی خیال نہ کیا۔

وقت آیا تو اس نے اپنی ساری اسکیم دادا کریم کو بتا دی ایک ہزار روپے طے ہوئے حامد نے فوراً دے دیئے دادا کریم نے کہا ''اتنا چھوٹا بچہ مجھ سے نہیں مارا جائے گا میں لا کر تمہارے حوالے کر دوں گا آگے تم جانو اور تمہارا کام ویسے یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا اس کی تم کچھ فکر نہ کرو۔''

حامد مان گیا۔۔۔اس نے سوچا کہ وہ بچے کو گاڑی کی پٹڑی پر رکھ دے گا اپنے آپ کچلا جائے گا یا کسی اور ترکیب سے اس کا خاتمہ کر دے گا۔۔۔۔۔دادا کریم کو ساتھ لے کر وہ لتا کے گاؤں آپہنچا دادا کریم نے پا لیا کہ بچہ پندرہ روز ہوئے پیدا ہو چکا ہے حامد کے دل میں وہ جذبہ پیدا ہوا جو اپنے لڑکے کی پیدائش پر اس کو محسوس ہوا تھا مگر اس نے اس کو وہیں دبا دیا اور کریم سے کہا ''دیکھو آج رات یہ کام ہو جائے''

رات کے بارہ بجے ایک اجاڑ جگہ پر حامد کھڑا انتظار کر رہا تھا اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب طوفان برپا تھا وہ خود کو بڑی مشکلوں سے قاتل میں تبدیل کر چکا تھا وہ پتھر جو اس کے سامنے پڑا تھا بچے کا سر کچلنے کے لیے کافی تھا کئی بار اسے اٹھا کر وہ اس کے وزن کا اندازہ کر چکا تھا۔

ساڑھے بارہ ہوئے تو حامد کو قدموں کی آواز آئی حامد کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا جیسے سینے سے باہر آ جائے گا دادا کریم اندھیرے میں نمودار ہوا اس کے ہاتھوں میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی پاس آ کر اس نے حامد کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دے دی اور کہا ''میرا کام ختم ہوا۔۔۔۔ میں چلا''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا حامد بہت بری طرح کانپ رہا تھا بچہ کپڑے کے اندر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ حامد نے اسے زمین پر رکھ دیا تھوڑی دیر اپنے لرزے پر قابو پانے کی کوشش کی جب یہ کچھ کم ہوا تو اس نے وزنی پتھر اٹھایا ٹٹول کر سر دیکھا پتھر زور سے پٹکنے ہی لگا تھا کہ اس نے سوچا بچے کو ایک نظر دیکھ تو لوں پتھر ایک طرف رکھ کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیا سلائی نکالی اور ایک تیلی سلگائی یہ اس کی انگلیوں ہی میں جل گئی اس کی ہمت نہ پڑی کچھ دیر سوچا دل مضبوط کیا دیا سلائی کی تیلی جلائی کپڑا ہٹایا پہلے سرسری نظر سے پھر ایک دم غور سے دیکھا تیلی بجھ گئی۔۔۔ یہ کس کی شکل تھی؟۔۔۔ اس نے کہیں دیکھی تھی کہاں؟۔۔۔ کب؟

حامد نے جلدی جلدی ایک تیلی جلائی اور بچے کے چہرے کو غور سے دیکھا ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے اس مرد کا چہرہ آ گیا جس کے ساتھ لتا شیواجی پارک میں رہتی تھی۔۔۔ ہت تیری ایسی کی تیسی۔۔۔۔ ہو بہو وہی شکل۔۔۔ وہی ناک نقشہ!

حامد نے بچے کو وہیں چھوڑا اور قہقہے لگاتا چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

حجامت

"میری تو آپ نے زندگی حرام کر رکھی ہے۔۔۔۔۔خدا کرے میں مر جاؤں"

"اپنے مرنے کی دعائیں کیوں مانگتی ہو میں مر جاؤں تو سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔۔۔۔کہو تو میں ابھی خودکشی کرنے کے لیے تیار ہوں یہاں پاس ہی افیم کا ٹھیکہ ہے ایک تولہ افیم کافی ہو گی۔"

"جاؤ۔۔۔سوچتے کیا ہو؟"

"جاتا ہوں۔۔۔تم اٹھو اور مجھے۔۔۔۔۔معلوم نہیں ایک تولہ افیم کتنے میں آتی ہے تم مجھے اندازاً دس روپے دے دو"

"دس روپے؟"

"ہاں بھئی۔۔۔۔اپنی جان گنوانی ہے۔۔۔دس روپے زیادہ تو نہیں"

"میں نہیں دے سکتی"

"ضرور آپ وک افیم کھا کے ہی مرنا ہے؟"

"سنکھیا بھی ہو سکتا ہے"

"کتنے میں آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔۔۔میں نے آج تک کبھی سنکھیا نہیں کھایا"

"آپ کو ہر چیز کا علم ہے، بنتے کیوں ہیں؟"

"بنا تم مجھے رہی ہو۔۔۔بھلا مجھے زہروں کی قیمتوں کے متعلق کیا علم ہو سکتا

ہے''

''آپ کو ہر چیز کا علم ہے''

''تمہارے متعلق تو میں ابھی تک کچھ بھی نہ جان سکا''

''اس لیے کہ آپ نے میرے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں''

''یہ صریحاً تمہاری زیادتی ہے۔۔۔۔پانچ برس ہو گئے ہیں تم ان میں سے کوئی ایسا دن پیش کرو جب میں نے تمہارے متعلق نہ سوچا ہو''

''ہٹایئے۔۔۔۔ان پانچ برسوں کے جتنے دن ہوتے ہیں، ان میں آپ مجھ سے یہی خرافات کہتے رہے ہیں''

''تم حقیقت کو خرافات کہتی ہو؟۔۔۔۔میں اب کیا کہوں''

''جو کہنا چاہتے ہیں کہہ ڈالیے۔۔۔۔۔آپ کی زبان میں لگام ہی کہاں ہے''

''پھر تم نے بدزبانی شروع کر دی''

''بدزبان تو آپ ہیں۔۔۔۔۔۔میں نے ان پانچ برسوں میں، آپ سر پر قرآن اٹھا کر کہیے، کب آپ سے اس قسم کی گستاخی کی ہے؟ گستاخ ہوں گے آپ کے۔۔۔''

''رک کیوں گئی ہو۔۔۔۔جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو''

''میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔آپ سے کوئی کیا کہے۔۔آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو تکلیف پہنچے، لیکن وہ اف بھی نہ کرے میں تو ایسی زندگی سے گھبرا گئی ہوں''

''تم چاہتی کیا ہو، یہ بھی تو پتا چلے''

’’میں کچھ نہیں چاہتی‘‘

’’پھر یہ گلے شکوے کیا معنی رکھتے ہیں؟‘‘

’’ان کے معنی آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔۔۔۔انجان کیوں بنتے ہیں؟ ان گلے شکووں کے پیچھے کوئی بات تو ہوگی‘‘

’’کیا؟‘‘

’’میں کیا جانوں‘‘

’’یہ عجیب منطق ہے۔۔۔۔خود ہی پھاڑتی ہو خود ہی رفو کرتی ہو۔۔۔۔جو صحیح بات ہے اس کو بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ہر روز کے جھگڑے ہمیں کہاں لے جائیں گے۔‘‘

’’جہنم میں‘‘

’’وہاں بھی تو ہمارا ساتھ ہوگا‘‘

’’میں تو وہاں بالکل نہیں جاؤں گی‘‘

’’تو کہاں ہوگی تم؟‘‘

’’مجھے معلوم نہیں‘‘

’’تمہیں بہت سی باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔سب سے بڑی بات میری محبت ہے، جس کا احساس تمہیں ابھی تک نہیں ہوا۔۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔۔یا میں نے اس کے اظہار میں بخل کیا ہے، یا تم میں وہ حس نہیں جو اس جذبے کو پہچان سکے۔‘‘

’’اصل میں بے حس تو آپ ہیں‘‘

''کیسے؟''

''یہ بھی کوئی بات ہے ان پانچ برسوں میں ہر روز۔۔۔۔۔۔۔ہر روز''

''یہی تو میری محبت کا ثبوت ہے''

''لعنت ہے ایسی محبت سے کہ آدمی تنگ آجائے''

''محبت سے کون تنگ آسکتا ہے؟''

''میری مثال موجود ہے''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟''

''میں نے کب اقرار کیا ہے؟''

''یہ اقرار ہی تو تھا''

''ہو گا''

''ہو گا نہیں۔۔۔تھا۔۔۔لیکن تم مانو گی نہیں اس لیے کہ ضدی ہو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کی نفسیات کیا ہیں جب ان سے پیار کیا جائے تو گھبرا جاتی ہیں،اور جب ان سے ذرا بے اعتنائی برتی جائے تو برہم ہو جاتی ہیں''

''محض بکواس ہے''

''اس لیے کہ یہ پرخلوص خاوند کی زبان سے نکلی ہے''

''ہٹائیے۔۔۔۔آپ کا خلوص میں دیکھ چکی ہوں''

''جب دیکھ چکی ہو تو ایمان کیوں نہیں لاتی ہو؟''

''مجھے تنگ نہ کیجیے،میری طبیعت خراب ہے۔۔۔مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی''

"اپنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتی؟"

"خدا کی قسم ۔۔۔۔ آج نہیں"

"کل تو اچھا سمجھو گی"

"مجھے کچھ معلوم نہیں"

"یہ عجیب بات ہے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ مگر تمہیں معلوم نہیں ہوتا ۔۔۔۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟ ۔۔۔۔۔ تم صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو"

"تو سن لیجئے ۔۔۔ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں"

"مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ہے ۔۔۔ میں نے تمہاری ہر آسائش کا خیال رکھا ۔"

"لیکن ایک بات کا خیال نہیں رکھا"

"کس بات کا؟"

"آپ عقل مند ہیں ۔۔۔۔ خود سمجھئے ۔۔۔۔ میں کیوں بتاؤں"

"کوئی اشارہ تو کر دو"

"میں ایسی اشارہ بازیاں نہیں جانتی"

"تم نے ایسی گفتگو کہاں سے سیکھی ہے؟"

"آپ سے"

"مجھ سے ۔۔۔۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ الزام تم نے مجھ پر کیوں لگایا ہے"

"آپ پر تو ہر الزام لگ سکتا ہے"

"مثال کے طور پر؟"

''میں آپ کو مثال نہیں دے سکتی۔۔۔۔۔خدا کے لیے یہ گفتگو بند کیجئے، میں تنگ آ گئی ہوں۔۔۔بس۔۔۔۔۔۔بس میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے۔۔۔''

''کیا؟''

''یا اللہ میری توبہ!۔۔۔۔۔مجھے زیادہ تنگ نہ کیجئے۔۔۔میرا جی چاہتا ہے اپنے سر کے بال نوچنا شروع کر دوں''

''میرا سر موجود ہے۔۔۔۔تم اس کے بال بڑے شوق سے نوچ سکتی ہو''

''آپ کو تو اپنے بال بڑے عزیز ہیں''

''انسان کو اپنی ہر چیز عزیز ہوتی ہے''

''لیکن مردوں کے سر پر بالوں کے چھتے بھڑوں کے چھتے معلوم ہوتے ہیں۔۔۔آپ معلوم نہیں بال کٹوانے سے کیوں پرہیز کرتے ہیں۔''

''میں پرہیزی آدمی ہوں''

''اس قدر جھوٹ۔۔۔۔ابھی پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ نے ایک پارٹی میں شراب پی تھی۔''

''لاحول ولا۔۔۔۔۔میں نے صرف شیری کا ایک گلاس پیا تھا''

''وہ کیا بلا ہوتی ہے؟''

''بڑی بے ضرر قسم کی چیز ہے''

''تمہاری بدزبانیاں کہیں مجھے بھی بدزبان نہ بنا دیں''

''جیسے آپ بدزبان نہیں ہیں''

''بدزبان تمہارا باپ تھا۔۔۔۔۔جانتی ہو۔۔۔۔۔۔وہ ہر بات میں مغلظا

ت بکتا تھا''

''میں کہتی ہوں میرے موئے باپ کے متعلق کچھ نہ کہیے۔۔۔۔۔۔آپ بڑے واہیات ہوتے جا رہے ہیں''

''واہیات کیسے ہوتا جا رہا ہوں؟''

''میں نہیں جانتی''

''جاننے کے بغیر تم نے یہ فتویٰ کیسے عائد کر دیا''

''میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اتنے بال کیوں بڑھا رکھے ہیں، مجھے وحشت ہوتی ہے۔''

''بس اتنی سی بات تھی جس کو تم نے بتنگڑ بنا دیا۔۔۔۔۔میں جا رہا ہوں''

''کہاں؟''

''بس جا رہا ہوں''

''خدا کے لیے مجھے بتا دیجیے۔۔۔میں خودکشی کر لوں گی''

''میں نصرت ہیئر کٹنگ سیلون میں جا رہا ہوں''

☆☆☆☆☆☆

حج اکبر

امتیاز اور صغیر کی شادی ہوئی تو شہر بھر میں دھوم مچ گئی آتش بازیوں کا رواج باقی نہیں رہا تھا مگر دولہے کے باپ نے اس پرانی عیاشی پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔

"جب صغیر زیوروں سے لدے پھندے شفیق براق گھوڑے پر سوار ہوا تو اس کے چاروں طرف انار چھوٹ رہے تھے مہتابیاں اپنے رنگ برنگ شعلے بکھیر رہی تھیں پٹاخے چھوٹ رہے تھے صغیر خوش تھا بہت خوش کہ اس کی شادی امتیاز سے طے پا گئی تھی جس سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔"

صغیر نے امتیاز کو ایک شادی کی تقریب میں دیکھا اس کی صرف ایک جھلک اسے دکھائی دی تھی مگر وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اور اس نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کسی کو اپنی رفیقہ حیات نہیں بنائے گا، چاہے دنیا ادھر کی ادھر نہ ہو جائے۔

دنیا ادھر کی ادھر نہ ہوئی صغیر نے امتیاز سے ملنے کے راستے ڈھونڈ لیے شروع شروع میں اس خوبرو لڑکی کے حجاب آڑے آیا، لیکن بعد میں صغیر کو اس کا التفات حاصل ہو گیا۔

صغیر بہت مخلص دل نوجوان تھا اس میں ریاکاری نام کو بھی نہ تھی اس کو امتیاز سے محبت ہو گئی تو اس نے یہ سمجھا کہ اسے اپنی زندگی کا اصل مقصد حاصل ہو گیا ہے اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ امتیاز اسے قبول کرے گی یا نہیں وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ اپنی محبت کے جذبے ہی کے سہارے ساری زندگی بسر کر دیتا۔

اس کو جب امتیاز سے پہلی مرتبہ بات کرنے کا موقع ملا تو اس نے گفتگو کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی "دیکھو لالی! میں ایک نامحرم آدمی ہوں میں نے مجبور کیا ہے کہ تم مجھ سے ملو۔۔۔۔اب اس ملاپ کا انجام نیک ہونا چاہیے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے علاوہ اور کوئی عورت زندگی میں نہیں آئے گی یہ میرے ضمیر اور دل کی اکٹھی آواز ہے۔۔۔تم بھی وعدہ کرو کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھے کوئی آزار نہیں پہنچاؤ گی اور میری موت کے بعد بھی مجھے یاد کرتی رہوگی اس لیے کہ قبر میں بھی میری سوکھی ہڈیاں تمہارے پیار کی بھوکی ہوں گی۔"

امتیاز نے دھڑکتے ہوئے دل سے وعدہ کیا کہ وہ اس عہد پر قائم رہے گی اس کے بعد ان دونوں میں چھپ چھپ کے ملاقاتیں ہوتی ہیں صغیر اس کو نکاح سے پہلے ہاتھ لگانا بہت بڑا گناہ سمجھتا تھا ان ملاقاتوں میں ان کا موضوع عشق و محبت نہیں ہوتا تھا صغیر مطمئن تھا کہ امتیاز اس کی محبت کی دعوت قبول کر چکی ہے اس پر اب اور زیادہ گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی ویسے وہ اپنی محبوبہ سے ملنا اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ وہ اس کی عادات و خصائل سے واقف ہو جائے اور وہ بھی اس کو اچھی طرح جان پہچان لے تا کہ وہ اس کی جبلت کا اندازہ کر سکے، اور اس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔

اس نے ایک دن امتیاز سے بڑے غیر عاشقانہ انداز میں کہا "تازی میں اب بھی تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم نے مجھ میں کوئی خامی دیکھی ہے، اگر میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اترا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو، تم کسی بندھن میں گرفتار نہیں

ہو۔۔۔تم مجھے دھتکار دو تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہو گی میری محبت میرے لیے کافی ہے میں اس کے اور ان ملاقاتوں کے سہارے کافی دیر تک جی سکتا ہوں‘‘

امتیاز اس سے بہت متاثر ہوئی اس کا جی چاہا کہ صغیر کو اپنے گلے سے لگا کر رونا شروع کر دے، مگر وہ اسے ناپسند کرتا اس لیے اس نے اپنے جذبات اندر ہی اندر مسل ڈالے۔

وہ چاہتی تھی کہ صغیر اس سے فلسفیانہ باتیں نہ کرے لیکن کبھی کبھی اس طور پر بھی اس سے پیش آئے، جس طرح فلموں میں ہیرو، اپنی ہیروئن سے پیش آتا ہے مگر صغیر کو ایسی عامیانہ حرکات سے نفرت تھی۔

بہر حال ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

پہلی رات کو حجلہ عروسی میں جب صغیر داخل ہوا تو امتیاز چھینک رہی تھی۔ وہ بہت متفکر ہوا امتیاز کو بلاشبہ زکام ہو رہا تھا، لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا خاوند اس معمولی سے عارضے کی طرف اتنا متوجہ ہو کہ اس کی تمام امنگوں کو فراموش کر دے۔ وہ سر تا پا سپردگی تھی مگر صغیر کو اس بات کی تشویش تھی کہ امتیاز اس کی جان سے زیادہ عزیز ہستی علیل ہے، چنانچہ اس نے فوراً ڈاکٹر بلوایا جو دوائیاں اس نے تجویز کیں بازار سے خرید کرایا اور اپنی نئی نویلی دلہن کو جس کو ڈاکٹر کی آمد سے کوئی دلچسپی تھی نہ اپنے خاوند کی تیمارداری سے، اسے مجبور کیا کہ وہ انجکشن لگوائے اور چار چار گھنٹے کے بعد دوا پیئے۔

تنگ آ کر ایک دن اس نے اپنے ضرورت سے زیادہ شریف شوہر سے کہا’’ آپ چھوڑیئے میرے علاج معالجے کو۔۔۔میں اچھی بھلی ہوں‘‘ پھر اس نے

دعوت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "میں دلہن ہوں آپ کے گھر آئی ہوں، اور آپ نے اسے ہسپتال بنا دیا ہے۔"

صغیر نے بڑے پیار سے اپنی دلہن کا ہاتھ دبایا اور مسکرا کر کہا "تازی! خدا نہ کرے کہ یہ ہسپتال ہو یہ میرا گھر نہیں تمہارا گھر ہے"

اس کے بعد امتیاز کو جو فوری شکایت تھی رفع ہوگئی اور وہ شیر و شکر ہو کر رہنے لگی صغیر اس سے محبت کرتا تھا، لیکن اس کو ہمیشہ امتیاز کی صحت، اس کے جسم کی خوبصورتیوں اور اس کو تروتازہ دیکھنے کا خیال رہتا۔ وہ اسے کانچ کے نازک پھولدان کی طرح سمجھتا تھا جس کے متعلق ہر وقت یہ خدشہ ہو کہ ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جائے گا۔

امتیاز اور صغیر کا رشتہ دوہرا تھا۔ دو بھائی اصغر حسین اور امجد حسین تھے۔ کھاتے پیتے تاجر، صغیر بڑے بھائی اصغر حسین کا لڑکا تھا، اور امتیاز امجد حسین کی بیٹی اب یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ شادی سے پہلے دونوں بھائیوں میں کچھ اختلاف تھے جو اس کے بعد دور ہو گئے تھے۔

امتیاز کی دو بہنیں اور تھیں جو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ امتیاز کا بیاہ ہوا تو ان دونوں کی باری قدرتی طور پر آ گئی وہ اپنے گھروں میں آباد بہت خوش تھیں کبھی کبھی امتیاز سے ملنے آتیں اور صغیر کے اخلاق سے بہت متاثر ہوتیں ان کی نظر میں وہ آئیڈیل شوہر تھا۔

دو برس گزر گئے، امتیاز کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا در اصل صغیر چاہتا تھا اتنی چھوٹی عمر میں وہ اولاد کے بکھیڑوں میں نہ پڑے۔۔۔ ان دونوں کے دن ابھی تک کھیلنے

کو دنے کے تھے صغیر اسے ہر روز سینما لے جاتا، باغ کی سیر کراتا نہر کے کنارے کنارے اس کے ساتھ چہل قدمی کرتا۔ اس کی آسائش کا اسے خیال تھا بہترین سے بہترین کھانے، اچھے سے اچھے باورچی مگر امتیاز کبھی باورچی خانے کا رخ کرتی تو وہ اس سے کہتا۔ ’’تازی، انگیٹھیوں پر پتھر کے کوئلے جلتے ہیں ان کی بو بہت بری ہوتی ہے اور صحت کے لیے بھی نامفید۔۔۔۔میری جان تم اندر نہ جایا کرو، دو نوکر ہیں کھانے پکانے کا کام جب تم نے ان کے سپرد کر رکھا ہے تو پھر اس زحمت کی کیا ضرورت؟‘‘

امتیاز مان جاتی

سردیوں میں صغیر کا بڑا بھائی اکبر جو نیروبی میں ایک عرصہ سے مقیم تھا اور ڈاکٹر تھا کسی کام کے سلسلے میں کراچی آیا تو اس نے سوچا کہ چلو لاہور صغیر سے مل آئیں۔ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچا اور اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ٹھہرا وہ صرف چار روز کے لیے آیا کہ ہوائی جہاز میں اس کی سیٹ پانچویں روز کے لیے بک تھی مگر جب اس کی بھابی نے جو اس کی آمد پر بہت خوش ہوئی تھی اصرار کیا تو چھوٹے بھائی صغیر نے اس سے کہا ’’بھائی جان! آپ اتنی دیر کے بعد آئے ہیں کچھ دن اور ٹھہر جایئے میری شادی میں آپ شریک نہیں ہوئے تھے، جتنے دن آپ فالتو ٹھہریں گے، انہیں جرمانہ سمجھ لیجئے گا‘‘

امتیاز مسکرائی اور اکبر سے مخاطب ہوئی ’’اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔۔۔۔اور پھر مجھے آپ نے شادی پر کوئی تحفہ بھی تو نہ دیا میں جب تک وصول نہیں کر لوں گی، آپ کیسے جا سکتے ہیں اور آپ کو میں جانے بھی کب دوں گی‘‘

دوسرے روز اکبر اس کو ساتھ لے کر گیا اور سچے موتیوں کا ایک ہار لے دیا صغیر نے اپنے بھائی کا شکریہ ادا کیا اس لیے کہ ہار بہت قیمتی تھا، کم از کم پانچ ہزار روپے کا ہوگا۔

اسی دن اکبر نے واپس نیروبی جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور صغیر سے کہا کہ وہ ہوائی جہاز میں اس کا ٹکٹ کا بندوبست کر دے اس لیے کہ اس کی لاہور شہر میں کافی واقفیت تھی اکبر نے اس کو روپے دیئے مگر اس نے برخوردارانہ انداز میں کہا ''آپ ابھی اپنے پاس رکھیے میں لے لوں گا'' اور ٹکٹ کا بندوبست کرنے چلا گیا۔

اسے کوئی دقت نہ ہوئی، اس لیے کہ ہوائی سروس کا جنرل منیجر اس کا دوست تھا اس نے فوراً ٹکٹ لے دیا صغیر کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھا گپ لڑاتا رہا اس کے بعد گھر کا رخ کیا۔

موٹر گراج میں بند کر کے وہ اندر داخل ہوا، لیکن فوراً باہر نکل آیا گراج سے موٹر نکالی اور اس میں بیٹھ کر جانے کہاں روانہ ہوگیا۔

اکبر اور امتیاز دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آیا انہوں نے موٹر کے آنے اور گراج بند کیے جانے کی آواز سنی تھی مگر انہوں نے سوچا کہ شاید ان کے کانوں کو دھوکہ ہوا تھا اس لیے کہ صغیر موجود نہ تھا نہ اس کی موٹر مگر وہ غائب کہاں ہوگیا تھا؟

اکبر کو واپس جانا تھا مگر اس نے پورا ایک ہفتہ انتظار کیا ادھر ادھر کئی جگہ پوچھ گچھ کی پولیس میں رپورٹ لکھوائی مگر صغیر کی کوئی سن گن نہ ملی آخری دن جب کہ اکبر جا رہا تھا، پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ پی بی ایل کے 10059 نمبر کی موٹر

کار جس کے ایک خانے میں صغیر اختر کا لائسنس نکلا ہے، ہوائی اڈے کے باہر کئی دنوں سے پڑی ہے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اکبر امجد حسین، نام کے ایک آدمی نے آٹھ روز پہلے ہوائی جہاز میں نیروبی کا سفر کیا ہے۔۔۔۔اکبر کی سیٹ نیروبی کے لیے بک تھی امتیاز سے رخصت لے کر جب وہ کینیا پہنچا تو اسے بڑی مشکلوں کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک صاحب جن کا نام اکبر امجد تھا ہوائی جہاز کے ذریعے سے یہاں پہنچے تھے ایک ہوٹل میں دو روز ٹھہرے اس کے بعد چلے گئے۔

اکبر نے بہت کوشش کی مگر پتہ نہ چلا اس دوران میں اس کو امتیاز کے کئی خط آئے پہلے دو تین خطوں کی تو اس نے رسید بھیجی، اس کے بعد جو بھی خط آتا پھاڑ دیتا کہ اس کی بیوی نہ پڑھ لے۔

دس برس گزر گئے امجد حسین، یعنی امتیاز کا باپ بہت پریشان تھا بہت لوگوں کا خیال تھا کہ صغیر مر کھپ چکا ہے مگر امجد کا دل نہیں مانتا تھا کہیں اس کی لاش ہی مل جاتی خودکشی کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بڑا نیک، شریف اور برخوردار لڑکا تھا امجد کو اس سے بہت محبت تھی ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آتی تھی کہ اس کی بیٹی امتیاز نے کہیں اس جیسے ذکی الحس آدمی کو ایسی ٹھیس نہ پہنچائی ہو کہ وہ شکستہ دل ہو کر کہیں روپوش ہو گیا ہے چنانچہ اس نے امتیاز سے کئی مرتبہ اس بارے میں پوچھا مگر وہ صاف منکر ہو گئی خدا اور رسول کی قسمیں کھا کر اس نے اپنے باپ کی تشفی کر دی کہ اس سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی اکثر اوقات وہ روتی بھی تھی اس کو صغیر یاد آتا تھا اس کی نرم و نازک محبت یاد آتی تھی اس کا وہ دھیما دھیما، نسیم سحری کا سلوک

یاد آتا تھا جو اس کی فطرت تھی۔

امجد حسین کا ایک دوست حج کو گیا واپس آیا تو اس نے اس کو یہ خوشخبری سنائی کہ صغیر زندہ ہے اور ایک عرصے سے مکے میں مقیم ہے امجد حسین بہت خوش ہوا اس کو اس کے دوست نے صغیر ہندی کا اتا پتا بتا دیا تھا اس نے اپنی بیٹی امتیاز کو تیار کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ حجاز چلے فوراً ہوائی جہاز کے سفر کا انتظام ہو گیا امتیاز جانے کے لیے تیار نہیں تھی، اس کو جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

بہر حال باپ بیٹی سرزمین حجاز پہنچے ہر مقدس مقام کی زیارت کی امجد حسین نے ایک ایک کونہ چھان مارا مگر صغیر کا پتہ نہ چلا چند آدمیوں سے جو اس کو جانتے تھے، صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ آپ کی آمد سے دس روز پہلے، کیونکہ اسے کسی نہ کسی طریقے سے معلوم ہو چکا تھا کہ آپ تشریف لا رہے ہیں، کھڑکی سے کودا اور گر کر ہلاک ہو گیا مرنے سے چند لمحات پہلے اس کے ہونٹوں پر ایک لفظ کانپ رہا تھا۔۔۔۔۔غالباً امتیاز تھا۔

اس کی قبر کہاں تھی وہ کب اور کیسے دفن ہوا اس کے متعلق صغیر کے جاننے والوں نے کچھ نہ بتایا یہ ان کے علم میں نہیں تھا امتیاز کو یقین آ گیا کہ اس کے خاوند نے خودکشی کر لی ہے اس کو شاید اس کا سبب معلوم تھا، مگر اس کا باپ یہ ماننے سے یکسر منکر تھا چنانچہ اس نے کئی بار اپنی بیٹی سے کہا "میرا دل نہیں مانتا۔۔۔۔۔۔وہ زندہ ہے۔۔۔وہ تمہاری محبت کی خاطر اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک خدا اس کو موت کے فرشتے کے حوالے نہ کر دے۔۔۔۔۔میں اس کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔۔تمہاری جگہ اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تو میں خود کو دنیا کا سب سے

خوش نصیب انسان سمجھتا۔"

یہ سن کر امتیاز خاموش رہی۔

وہ سرزمین حجاز سے بے نیل و مرام واپس آ گئے۔۔۔۔ایک برس اور گزر گیا۔اس دوران میں امجد حسین بڑی مہلک بیماری، یعنی دل کے عارضے میں گرفتار ہوا اور وفات پا گیا مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی سے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ بات شاید بڑی اذیت دہ تھی کہ وہ خاموش رہا اور صرف سرزنش بھری نگاہوں سے امتیاز کو دیکھتے دیکھتے مر گیا۔

اس کے بعد امتیاز اپنی بہن ممتاز کے پاس راولپنڈی چلی گئی ان کی کوٹھی کے سامنے ایک اور کوٹھی تھی جس میں ایک ادھیڑ عمر کا مرد جو بہت تھکا تھکا سا دکھائی دیتا تھا دھوپ تاپتا اور کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔

ممتاز اس کو ہر روز دیکھتی۔۔ایک دن اس نے امتیاز سے کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ صغیر ہے۔۔۔۔کیا تم نہیں پہچان سکتی ہو وہی ناک نقشہ ہے، وہی متانت وہی سنجیدگی۔"

امتیاز نے اس آدمی کی طرف غور سے دیکھا اور ایک دم چلائی "ہاں ہاں وہی ہے" پھر فوراً رک گئی "لیکن وہ کیسے ہو سکتے ہیں وہ تو وفات پا چکے ہیں"

انہی دنوں ان دونوں کی چھوٹی بہن شہناز بھی آ گئی ممتاز اور امتیاز نے اس کو یہ قبل از وقت مرجھایا اور افسردہ مرد دکھایا جس کی ڈاڑھی کھچڑی تھی اور اس سے پوچھا "تم بتاؤ، اس کی شکل صغیر سے ملتی ہے یا کہ نہیں؟"

شہناز نے اس کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا "شکل

مانتی کیا ہے۔۔۔یہ خود صغیر ہے۔۔۔سو فیصد صغیر‘‘

اور یہ کہہ کر وہ سامنے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی وہ شخص جو کتاب پڑھنے میں مشغول تھا، چونکا۔ شہناز جس نے شادی کے موقعے پر اس کی جوتی چرائی تھی، اسی پرانے انداز میں کہا ’’جناب! آپ کب تک چھپے رہیں گے۔‘‘

اس شخص نے شہناز کی طرف دیکھا اور بڑی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا ’’آپ کون ہیں؟‘‘

شہناز طرار تھی اس کے علاوہ اس کو یقین تھا کہ جس سے وہ ہم کلام ہے وہ اس کا بہنوئی ہے چنانچہ اس نے بڑے نوکیلے لہجے میں کہا ’’جناب، میں آپ کی سالی شہناز ہوں‘‘

اس شخص نے شہناز کو سخت ناامید کیا اس نے کہا ’’مجھے افسوس ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔‘‘

اس کے بعد شہناز نے اور بہت سی باتیں کیں مگر اس نے بڑے ملائم انداز میں اس سے جو کچھ کہا، اس کا یہ مطلب تھا کہ تم ناحق اپنا وقت ضائع کر رہی ہو میں تمہیں جانتا ہوں نہ تمہاری بہن کو جس کے متعلق تم کہتی ہو کہ میری بیوی ہے۔۔۔۔میری بیوی، میری اپنی زندگی ہے اور میں ہی اس کا خاوند۔

شہناز اور ممتاز نے لاکھ سر پٹکا، مگر وہ شخص جس کا نام راولپنڈی میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا، مانتا ہی نہیں تھا کہ وہ صغیر ہے۔۔۔اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی، سوائے کتابوں کے۔

لیکن شہناز اور ممتاز کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ امتیاز کے متعلق تمام معلومات

حاصل کرتا ہے ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا، اس پراسرار مرد کے نوکر کے ذریعے سے کہ وہ راتوں کو اکثر روتا ہے، نمازیں پڑھتا ہے اور دعائیں مانگتا ہے کہ وہ زندہ رہے۔۔۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کو جو اذیت پہنچی ہے اس سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہے۔

نوکر حیران تھا کہ انسان کی زندگی میں ایسی کون سی تکلیف ہو سکتی ہے جس سے وہ لطف اٹھا سکتا ہے۔۔۔ سب باتیں امتیاز سنتی تھی اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ مر جائے چنانچہ اس نے جب یہ سنا کہ وہ شخص جس کو امتیاز اچھی طرح پہچانتی تھی، اس کے نام سے قطعاً ناآشنا ہے تو اس نے ایک روز تولہ افیم کھالی اور یہ ظاہر کیا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اکیلی آرام کرنا چاہتی ہے۔

وہ آرام کرنے چلی گئی۔۔۔ لیکن شہناز نے جب اس کو غنودگی کے عالم میں دیکھا تو اسے کچھ شبہ ہوا اس نے ممتاز سے بات کی اس کا ماتھا بھی ٹھنکا کمرے میں جا کر دیکھا تو امتیاز بالکل بے ہوش تھی اس کو جھنجھوڑا مگر وہ نہ جاگی شہناز دوڑی دوڑی سامنے والی کوٹھی میں گئی اور اس شخص سے جس کا نام راولپنڈی میں کسی کو معلوم نہیں تھا، سخت گھبراہٹ میں یہ اطلاع دی کہ اس کی بیوی نے زہر کھالیا ہے اور مرنے کے قریب ہے یہ سن کر صرف اس نے اتنا کہا ''آپ کو غلط فہمی ہے، وہ میری بیوی نہیں ہے۔۔۔ لیکن میرے ہاں اتفاق سے ایک ڈاکٹر آیا ہوا ہے آپ چلیے میں اسے بھیج دیتا ہوں۔''

شہناز گئی تو وہ اندر کوٹھی میں گیا، اور اپنے بھائی اکبر سے کہا ''یہ کوٹھی جو سامنے ہے اس میں کسی عورت نے زہر کھالیا ہے۔۔۔ بھائی جان آپ جلدی جائیے

اور کوشش کیجئے کہ بچ جائے''

اس کا بھائی جو نیروبی میں بہت بڑا ڈاکٹر تھا، امتیاز کو نہ بچا سکا۔ دونوں نے جب ایک دوسرے کو دیکھا تو اس کا رد عمل بہت مختلف تھا۔۔۔۔۔۔امتیاز فوراً مر گئی اور اکبر اپنا بیگ لے کر واپس چلا گیا۔

صغیر نے اس سے پوچھا ''کیا حال ہے مریضہ کا؟''

اکبر نے جواب دیا ''مر گئی''

صغیر نے اپنے ہونٹ بھینچ کر بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔۔۔۔۔۔''میں زندہ رہوں گا''

لیکن ایک دم سنگین فرش پر لڑکھڑانے کے بعد گرا اور۔۔جب اکبر نے اس کی نبض دیکھی تو وہ ساکت تھی۔

☆☆☆☆☆☆

اختتام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حصہ دوم

منٹو کے سو بہترین افسانے

(افسانے)

حصہ سوم

Presented by: S A M I

فہرست

حسن کی تخلیق

خالی بوتلیں خالی ڈبے

خالد میاں

خورشٹ

خوشیا

خوشبودار تیل

دس روپے

دھواں

دیوالی کے دیئے

ڈرپوک

رام کھلاون

رحمت خداوندی کے پھول

رشوت

ساڑھے تین آنے

سجدہ

سرکنڈوں کے پیچھے

سنتر پنچ

سونے کی انگوٹھی

سہائے

شاردا

حسن کی تخلیق

کالج میں شاہدہ حسین ترین لڑکی تھی اس کو اپنے حسن کا احساس تھا اسی لیے وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی اور خود کو مغلیہ خاندان کی کوئی شہزادی سمجھتی اس کے خدوخال واقعی مغلئی تھے ایسا لگتا تھا کہ نور جہاں کی تصویر جو اس زمانے کے مصوروں نے بنائی تھی اس میں جان پڑ گئی تھی۔

کالج کے لڑکے اسے شہزادی کہتے تھے لیکن اس کے سامنے نہیں پر اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسے یہ لقب دیا گیا ہے وہ اور بھی مغرور ہو گئی۔

کالج میں مخلوط تعلیم تھی لڑکے زیادہ تھے اور لڑکیاں کم، آپس میں ملتے جلتے، لیکن بڑے تکلف کے ساتھ، شاہدہ الگ الگ رہتی اس لیے کہ اس کو اپنے حسن پر بڑا ناز تھا وہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتی تھی کلاس میں آتی تو ایک کونے میں بیٹھ جاتی اور بت سی بنی رہتی۔ بڑا حسین بت۔۔۔۔۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن پر گھنی پلکوں کی چھاؤں رہتی تھی، ساکت و صامت رہتیں۔ لڑکے اسے دیکھتے اور جی ہی جی میں بہت کڑھتے کہ یہ حسن خاموش کیوں ہے اس قدر منجمد کس لیے ہے، اسے تو متحرک ہونا چاہیے

اس کا رنگ گورا تھا۔۔۔۔۔ بہت گورا جس میں تھوڑی سی غلط روی بھی گھلی ہوئی تھی اگر یہ نہ ہوتی تو شکر کی بنی ہوئی پتلی تھی جو دیوالی کے تہوار پر بکا کرتی ہیں۔ اس میں مٹھاس تھی، لیکن وہ ظاہر یہ کرنا چاہتی تھی کہ بڑی کڑوی کسیلی ہے۔۔۔ کالج میں اس کا رویہ ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ ہر وقت نیم کی نبولی بنی رہتی

تھی۔

ایک دن اس کے ایک ہم جماعت لڑکے نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا "حضور۔۔۔۔خاکساری میں اپنی جگہ دے کر کبھی کسی کو سرفراز تو کریں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا دوسرے دن اس طالب علم کو پرنسپل نے بلایا اور اسے نکال باہر کیا۔

اس حادثے کے بعد تمام لڑکے محتاط ہو گئے انہوں نے شاہدہ کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا کہ مبادا ان کا وہی حشر ہو جو اس طالب علم کا ہوا۔

شاہدہ اب بی اے میں تھی، خوبصورت ہونے کے علاوہ کافی ذہین تھی اس کے پروفیسر اس کی ذہانت اور خوبصورتی سے بڑے مرعوب تھے پرنسپل کی چہیتی تھی، اس لیے کہ وہ اس کی بڑی بہن کے بڑے لڑکے کی بیٹی تھی۔

کالج میں چہ میگوئیاں ہوتی ہی رہتی ہیں شاہدہ کے متعلق قریب قریب ہر روز طالب علموں میں باتیں ہوتی تھیں وہ اس کے متعلق کوئی بری رائے قائم نہیں کر پاتے تھے اس لیے کہ اس کا کیریکٹر بڑا مضبوط تھا۔

ٹک شاپ میں باتیں ہوتیں اور شاہدہ کا حسن زیر بحث ہوتا سب سوچتے کہ یہ حسین قلعہ کون سر کرے گا۔

شاہدہ کو، جیسا کہ سب کو معلوم تھا، صرف خوبصورت چیزیں پسند تھیں وہ کسی بد صورت چیز کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ایک دن کلاس میں ایک لڑکے کی رینٹھ بہہ رہی تھی شاہدہ نے جب اس کی طرف دیکھا تو فوراً اٹھ کر چلی گئی۔

وہ بڑی نفاست پسند تھی اس کو وہ ہر چیز کھلتی تھی جو بدنما ہو۔

کالج میں ایک لڑکی جمیلہ تھی۔۔۔۔بڑی بدصورت، مگر شاہدہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین اس کو وہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی ویسے وہ اس کی ذہانت کی قائل تھی اور کوئی رشک محسوس نہیں کرتی تھی۔

کالج کے سب لڑکے سوچتے تھے کہ شاہدہ اگر حسین نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔۔۔۔وہ اس سے بات چیت تو کر سکتے مگر وہ اپنے حسن کے غرور میں سرشار رہتی اور کسی کو منہ ہی نہیں لگاتی تھی۔

ایک دن کالج میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔۔۔۔ایک لڑکا جس کے والد کی تبدیلی ہو گئی تھی، اس کالج میں داخلہ لینے کے لیے آیا لڑکوں اور لڑکیوں نے اسے دیکھا اور ششدر رہ گئے وہ شاہدہ سے زیادہ خوبصورت تھا۔

اس کا نام شاہد تھا۔۔۔۔اس کو داخلہ مل گیا

جس کلاس میں شاہدہ تھی، اسی میں شاہد بھی تھا۔۔۔۔اتفاق کی بات ہے کہ جب شاہد پہلے روز کلاس روم میں آیا تو شاہدہ موجود نہیں تھی اس کو زکام ہو گیا تھا اور اس کے باعث اس نے دو روز کے لیے چھٹی لے لی تھی۔

دو دن کے بعد جب شاہد کالج کے باغ میں ٹہل رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت، مگر بے جان مورت آ رہی ہے اس نے اپنی کتابیں بینچ پر رکھیں اور آگے بڑھا۔

شاہدہ نے اسے دیکھا وہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کے قدم رک گئے زمین گیلی تھی، کیچڑ سی ہو رہی تھی، شاہد جب اس کی

طرف بڑھا تو وہ گھبرا سی گئی اس گھبراہٹ میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔

شاہد نے لپک کر اسے اٹھایا۔۔۔۔۔شاہدہ کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی مگر اس نے مسکرا کر کہا "شکریہ۔۔۔۔آپ کون ہیں؟"

شاہد نے جواب دیا "ایک خادم!"

"آپ خادم تو دکھائی نہیں دیتے"

"کیا دکھائی دیتا ہوں۔۔۔۔۔بعض اوقات صحیح شکلیں غلط دکھائی دیا کرتی ہیں"

شاہدہ کو یہ بات پسند آئی اس کے ٹخنے میں بہت درد ہو رہا تھا مگر وہ اسے چند لمحوں کے لیے بھول گئی "آپ کا نام؟"

"شاہد!"

شاہد نے سوچا کہ شاید وہ اس کا نام سن چکا ہے اور شرارت کے طور پر شاہد بن رہا ہے "آپ غلط کہہ رہے ہیں"

"آپ کالج کے رجسٹر سے اس کی تصدیق کر سکتی ہیں"

"آپ اس کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔۔آپ یہاں کیسے چلی آئیں؟"

"واہ۔۔۔۔میں بھی تو یہیں پڑھتی ہوں"

"کس کلاس میں؟"

"بی اے میں!"

''میں تو بی اے میں ہوں''

''جھوٹ۔۔۔ آپ تو مالی معلوم ہوتے ہیں''

''اس شکل کے آدمی واقعی مالی معلوم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔لیکن افسوس ہے کہ میں نے ابھی تک کوئی پھول نہیں توڑا''

''پھول کیا توڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔انہیں تو صرف سونگھنا چاہیئے''

شاہد ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا پھر اس نے سنبھل کر کہا ''میں آپ کو سونگھ رہا ہوں''

شاہدہ بھنا گئی ''آپ بڑے بدتمیز ہیں''

شاہد نے بینچ پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا ''میں نے آپ کو توڑا تو نہیں۔۔۔۔۔۔صرف سونگھ لیا ہے۔۔۔۔اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی پنکھڑیوں میں سے غرور کی بو آتی ہے۔۔۔۔وہ معاف کیجئے گا غرور میں کر سکتا ہوں لیکن مردوں کے ساتھ۔۔۔۔میں بھی ایک پھول ہوں، پر آپ کلی ہیں میں آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

شاہدہ اپنا ٹخنہ پکڑے بیٹھی تھی ایک دم کراہنے لگی ''ہائے۔۔۔۔۔۔ہائے بڑا درد ہو رہا ہے۔''

شاہد نے اس سے اجازت طلب کی ''کیا میں اسے دبا دوں؟''

''دبایئے۔۔۔۔۔خدا کے لیے دبایئے''

شاہد نے اس کے موچ آئے ہوئے ٹخنے پر اس طور پر مساس کیا کہ پندرہ

منٹ کے اندر اندر شاہدہ کا درد دور ہوگیا۔

اس واقعے کے بعد کالج میں وہ دونوں خالی پیریڈوں میں اکٹھے باہر جاتے اور باغ میں بیٹھ کر جانے کیا باتیں کرتے رہتے شاید وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ دونوں گیلی زمین پر پھسلیں اور ان کے دل کے ٹخنوں میں موچ آ جائے اور وہ ساری زندگی ان کو سہلاتے رہیں۔

دونوں نے بی اے پاس کر لیا بڑے اچھے نمبروں پر شاہدہ کے نمبر شاہد کے مقابلے میں پانچ زیادہ تھے اس نے اس کا بدلہ لینا چاہا ''شاہدہ! میں یہ پانچ نمبر ابھی لیے لیتا ہوں''

''کیسے؟''

شاہد نے اس کو پہلی مرتبہ اپنی گود میں اٹھایا اور اس کو پانچ مرتبہ چوم لیا

شاہدہ نے کوئی اعتراض نہ کیا وہ بہت خوش ہوئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے شاہد سے بڑی سنجیدگی سے کہا ''ہمارے نمبر پورے ہو گئے لیکن آج کے اس واقعے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کی میری شادی ہو جانی چاہیے۔۔۔۔میں اپنے ہونٹ اب کسی اور کے ہونٹوں سے آلودہ نہیں کروں گی۔''

شاہد بہت خوش ہوا۔۔۔۔۔اسے یقین ہی نہیں تھا کہ اس کی دلی آرزو کبھی پوری ہو گی اس نے اسی خوشی میں پانچ نمبر اور حاصل کر لیے اور شاہدہ سے کہا'' میری جان! میں اسی امید میں تو اب تک جیتا رہا ہوں''

شاہدہ کے والدین نے اس کی شادی کی ایک جگہ بات چیت کی مگر شاہدہ نے

صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی بدصورت مرد سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بہت جھگڑے ہوئے آخر شاہدہ نے بتا دیا کہ وہ اپنے ہم جماعت شاہد کو جو بہت خوش شکل ہے پسند کرتی ہے اس کے علاوہ کسی اور مرد کو اپنی رفاقت میں نہیں لے گی۔

اس کے ماں باپ شاہد کے والدین سے ملے بڑے شریف اور متمول آدمی تھے۔۔۔۔اور روشن خیال بھی۔

شاہد کو جب انہوں نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جا رہا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ پہلے شادی کر لے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جائے تاکہ وہ بھی باہر کی دنیا دیکھے۔

جب والدین رضامند ہو گئے تو ان کی شادی ہو گئی وہ بہت خوش تھے پہلی رات شاہد نے اپنی بیوی سے کہا ''ہمارا بچہ۔۔۔لڑکی ہو یا لڑکا۔۔۔۔جب پیدا ہو گا تو اسے دنیا دیکھنے آئے گی''

شاہدہ نے پوچھا ''کیوں؟''

شاہد ہنسا ''میری جان! تم اتنی حسین ہو۔۔۔۔۔میں بھی کچھ بدشکل نہیں ہمارا بچہ یقیناً ہم دونوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو گا''

ہنی مون منانے کے لیے وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے وہ یہاں چار مہینے رہے اس کے بعد لندن چلے گئے جہاں شاہد کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لینا تھی۔

شاہد کے باپ میاں ہدایت اللہ کی وہاں ایک کوٹھی تھی، جو ان کی آمد سے پہلے

ہی خالی کرائی گئی تھی۔۔۔۔۔شاہدہ بہت خوش تھی اور شاہد بھی۔۔۔اس لیے کہ وہ ایک بچے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

شاہد کہتا تھا ''ہمارا بچہ اتنا حسین اور خوبصورت ہوگا کہ اس کا جواب نہ ہوگا''

شاہدہ کہتی ''خدا نظر بد سے بچائے۔۔۔۔ضرور گل گوتھنا سا ہوگا''

پورے دن ہوئے تو بچہ ہونے کے آثار پیدا ہوئے شاہد نے اپنی بیوی کو میٹرنٹی ہوم میں داخل کرا دیا۔

لیبر وارڈ کے باہر شاہد بڑے اضطراب میں ادھر ادھر چل رہا تھا۔۔۔اس کی نظروں کے سامنے ایک ایسے بچے کی تصویر تھی جس کے خدوخال اس کے اور اس کی بیوی کے آپس میں بڑے حسین طور پر مدغم ہو گئے ہوں۔

لیبر وارڈ سے نرس باہر آئے شاہد نے لپک کر اس سے پوچھا ''خیریت ہے؟''

''جی ہاں''

''لڑکا ہوا یا لڑکی؟''

نرس پریشان سی تھی اس نے صرف اتنا کہا'' پتہ نہیں لڑکا ہے یا لڑکی۔۔۔۔۔پر ہم نے ایسا بچہ کبھی نہیں دیکھا''

شاہد نے خوش ہو کر پوچھا ''بہت خوبصورت ہے نا؟''

نرس نے منہ بنا کر جواب دیا ''بڑا اگلی ہے۔۔۔۔۔اس کے سر پر ایسا مالوم ہوتا ہے سینگ ہیں دانت بھی ہیں۔۔۔۔ناک بڑی ٹیڑھی ہے۔۔۔۔۔دو آنکھیں ہیں، پر ایک آنکھ ایسا لگتا ہے ماتھے پر بھی ہے۔۔۔۔۔تم لوگ اتنے خوبصورت ہو کر کیسے بچے پیدا کرتا ہے۔''

شاہد اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے نہ گیا۔۔۔۔لیکن دوسرے دن میٹرنٹی ہوم میں ٹکٹ لگا دی گئی کہ جو آدمی چاہے، اس عجیب الخلقت بچے کو دیکھ سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All Rights Reserved ©2003-2006

خالی بوتلیں خالی ڈبے

یہ حیرت مجھے اب بھی ہے کہ خاص طور پر خالی بوتلوں اور ڈبوں سے مجرو مردوں کو اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟۔۔۔۔۔مجرو مردوں سے میری مراد ان مردوں سے ہے۔جن کو عام طور پر شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

یوں تو اس قسم کے مرد عموماً سنکی اور عجیب وغریب عادات کے مالک ہوتے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہیں خالی بوتلوں اور ڈبوں سے کیوں اتنا پیار ہوتا ہے؟۔۔۔۔پرندے اور جانور اکثر ان لوگوں کے پالتو ہوتے ہیں یہ میلان سمجھ میں آسکتا ہے کہ تنہائی میں ان کا کوئی تو مونس ہونا چاہیے لیکن خالی بوتلیں اور خالی ڈبے ان کی کیا غمگساری کرسکتے ہیں؟

سنک اور عجیب وغریب عادات کا جواز ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں کہ فطرت کی خلاف ورزی ایسے بگاڑ پیدا کرسکتی ہے لیکن اس کی نفسیاتی باریکیوں میں جانا البتہ بہت مشکل ہے۔

میرے ایک عزیز ہیں عمر آپ کی اس وقت پچاس کے قریب قریب ہے آپ کو کبوتر اور کتے پالنے کا شوق ہے اور اس میں کوئی عجیب وغریب پن نہیں لیکن آپ کو یہ مرض ہے کہ بازار سے ہر روز دودھ کی بالائی خرید کرلاتے ہیں چولہے پر رکھ کر اس کا روغن نکالتے ہیں اور اس روغن میں اپنے لیے علیحدہ سالن تیار کرتے ہیں اس کا خیال ہے کہ اس طرح خالص گھی تیار ہوتا ہے۔

پانی پینے کے لیے اپنا گھڑا الگ رکھتے ہیں اس کے منہ پر ہمیشہ ململ کا ٹکڑا بندھا

رہتا ہے تا کہ کوئی کیڑا مکوڑا اندر نہ چلا جائے مگر ہوا برابر داخل ہوتی رہے پاخانے جاتے وقت سب کپڑے اتار کر ایک چھوٹا سا تولیہ باندھ لیتے ہیں اور لکڑی کی کھڑاؤں پہن لیتے ہیں۔۔۔اب کون ان کی بالائی کے روغن، گھڑے کی ململ انگ کے تولیے اور لکڑی کی کھڑاؤں کے نفسیاتی عقدے کو حل کرنے بیٹھے۔

میرے ایک مجرد دوست ہیں بظاہر بڑے ہی نورمل انسان ہائی کورٹ میں ریڈر ہیں آپ کو ہر جگہ سے، ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے چنانچہ ان کا رومال سدا ان کی ناک سے چپکا رہتا ہے۔۔۔آپ کو خرگوش پالنے کا شوق ہے۔

ایک اور مجرد ہیں آپ کو جب موقع ملے نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کا دماغ بالکل صحیح ہے سیاسیات عالم پر آپ کی نظر بہت وسیع ہے طوطوں کو باتیں سکھانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

ملٹری کے ایک میجر ہیں سن رسیدہ اور دولت مند آپ کو حقے جمع کرنے کا شوق ہے گڑگڑیاں، پیچوان، چموڑے، غرضیکہ ہر قسم کا حقہ ان کے پاس موجود ہے آپ کئی مکانوں کے مالک ہیں مگر ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہتے ہیں بٹیریں آپ کی جان ہیں۔

ایک کرنل صاحب ہیں ریٹائرڈ، بہت بڑی کوٹھی میں اکیلے دس بارہ چھوٹے بڑے کتوں کے ساتھ رہتے ہیں ہر برانڈ کی وسکی ان کے یہاں موجود رہتی ہے ہر روز شام کو چار پیگ پیتے ہیں اور اپنے ساتھ کسی نہ کسی لاڈلے کتے کو بھی پلاتے ہیں۔

میں نے اب تک جتنے مجردوں کا ذکر کیا ہے، ان سب کو حسب توفیق خالی

بوتلوں اور ڈبوں سے دلچسپی ہے، میرے، دودھ کی بالائی سے کالص گھی تیار کرنے والے عزیز گھر میں جب بھی کبھی کوئی خالی بوتل دیکھیں تو اسے دھو دھا کر اپنی الماری میں سجا دیتے ہیں کہ ضرورت کے وقت کام آئے گی۔ ہائی کورٹ کے ریڈر جن کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے، صرف ایسی بوتلیں اور ڈبے جمع کرتے ہیں، جن کے متعلق وہ اپنا پورا اطمینان کرلیں کہ اب ان سے بدبو آنے کا کوئی احتمال نہیں رہا۔ جب موقع ملے، نماز پڑھنے والے، خالی بوتلیں آب دست کیلئے اور ٹین کے خالی ڈبے وضو کے لئے درجنوں کی تعداد میں جمع رکھتے ہیں۔

ان کے خیال کے مطابق یہ دونوں چیزیں سستی اور پاکیزہ رہتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔قسم قسم کے حقے جمع کرنے والے میجر صاحب کو خالی بوتلیں اور خالی ڈبے جمع کر کے ان کو بیچنے کا شوق ہے اور ریٹائرڈ کرنل صاحب کو صرف وسکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے کا۔

آپ کرنل صاحب کے ہاں جائیں تو ایک چھوٹے، صاف ستھرے کمرے میں کئی شیشے کی الماریوں میں آپ کو وسکی کی بوتلیں سجی ہوئی نظر آئیں گی۔۔۔۔۔۔۔پرانے سے پرانے برانڈ کی وسکی کی خالی بوتل بھی آپ کو ان کے اس نادر مجموعے میں مل جائے گی۔ جس طرح لوگوں کو ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے اسی طرح ان کو وسکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے اور ان کی نمائش کرنے کا شوق بلکہ خبط ہے۔

کرنل صاحب کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں کوئی ہے تو اس کا مجھے علم نہیں دنیا میں تن تنہا ہیں لیکن وہ تنہائی بالکل محسوس نہیں کرتے۔۔۔۔۔۔دس بارہ کتے ہیں ان کی

دیکھ بھال وہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح شفیق باپ اپنی اولاد کی کرتے ہیں۔ سارا دن ان کا ان پالتو حیوانوں کے ساتھ گزر جاتا ہے فرصت کے وقت وہ الماریوں میں اپنی چہیتی بوتلیں سنوارتے رہتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے، خالی بوتلیں تو ہوئیں۔ یہ تم خالی ڈبے کیوں ساتھ لگا دیئے؟۔۔۔۔ کیا ضروری ہے کہ تجرد پسند مردوں کو خالی بوتلوں کے ساتھ ساتھ خالی ڈبوں کے ساتھ بھی دلچسپی ہو۔۔۔؟ اور پھر ڈبے اور بوتلیں، صرف خالی کیوں؟ بھری ہوئی کیوں نہیں؟۔۔۔۔ میں آپ سے شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے خود اس بات کی حیرت ہے یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوال اکثر میرے دماغ میں پیدا ہو چکے ہیں باوجود کوشش کے میں ان کا جواب حاصل نہیں کر سکتا۔

خالی بوتلیں اور خالی ڈبے، خلا کا نشان ہیں اور خلا کا کوئی منطقی جوڑ تجرد پسند مردوں سے غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ خود ان کی زندگی میں ایک خلا ہوتا ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا وہ اس خلا کو ایک اور خلا سے پر کرتے ہیں۔۔۔۔ کتوں بلیوں خرگوشوں اور بندروں کے متعلق آدمی سمجھ سکتا ہے کہ وہ خالی خولی زندگی کی کمی ایک حد تک پوری کر سکتے ہیں کہ وہ دل بہلا سکتے ہیں نازنخرے کر سکتے ہیں دلچسپ حرکات کے موجب ہو سکتے ہیں پیار کا جواب بھی دے سکتے ہیں لیکن خالی بوتلیں اور ڈبے دلچسپی کا کیا سامان بہم پہنچاتے ہیں؟

بہت ممکن ہے آپ کو ذیل کے واقعات میں ان سوالوں کا جواب مل جائے۔

دس برس پہلے میں جب بمبئی گیا تو وہاں ایک مشہور فلم کمپنی کا ایک فلم تقریباً

بیس ہفتوں سے چل رہا تھا۔۔۔۔ہیروئن پرانی تھی لیکن ہیرو نیا تھا جو اشتہاروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں نوخیز دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔۔اخباروں میں اس کی کردار نگاری کی تعریف پڑھی تو میں نے یہ فلم دیکھا۔۔۔۔اچھا خاصا تھا کہانی جاذب توجہ تھی اور اس نئے ہیرو کا کام بھی اس لحاظ سے قابل تعریف تھا کہ اس نے پہلی مرتبہ کیمرے کا سامنا کیا تھا۔

پردے پر کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی عمر کا اندازہ لگانا عام طور پر مشکل ہوتا ہے کیونکہ میک اپ جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے مگر یہ نیا ہیرو بلاشبہ نوخیز تھا۔۔۔کالج کے طالب علم کی طرح تروتازہ اور چاق و چوبند۔۔۔۔۔خوبصورت تو نہیں تھا مگر اس کے گٹھے ہوئے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھا۔

اس فلم کے بعد ایک ایکٹر کے میں نے اور کئی فلم دیکھے اب وہ منجھ گیا تھا۔چہرے کے خط و خال کی طفلانہ نمائش، عمر اور تجربے کی تختی میں تبدیل ہو چکی تھی اس کا شمار اب چوٹی کے اداکاروں میں ہونے لگا تھا۔

فلمی دنیا میں اسکینڈل عام ہوتے ہیں آئے دن سننے میں آتا ہے کہ فلاں ایکٹر کا فلاں ایکٹرس سے تعلق ہو گیا ہے فلاں ایکٹرس فلاں ایکٹر کو چھوڑ کر فلاں ڈائریکٹر کے پہلو میں چلی گئی ہے قریب قریب ہر ایکٹر اور ہر ایکٹرس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رومان جلد یا بدیر وابستہ ہو جاتا ہے لیکن اس نئے ہیرو کی زندگی میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ان بکھیڑوں سے پاک تھی، مگر اخباروں میں اس کا چرچا نہیں تھا کسی نے بھولے سے حیرت کا بھی اظہار نہیں کیا تھا کہ فلمی دنیا میں رہ کر

رام سروپ کی زندگی جنسی آلائشوں سے پاک ہے۔

میں نے سچ پوچھئے تو اس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اس لیے کہ مجھے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی نجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فلم دیکھا، اس کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کی اور بس۔۔۔۔ لیکن جب رام سروپ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے اس کے متعلق بہت ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔۔۔۔۔ یہ ملاقات اس کا پہلا فلم دیکھنے کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔

شروع شروع میں تو وہ بمبے سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتا تھا مگر اب فلمی سرگرمیاں بڑھ جانے کے باعث اس نے شیواجی پارک میں سمندر کے کنارے ایک متوسط درجے کا فلیٹ لے رکھا تھا اس سے میری ملاقات اسی فلیٹ میں ہوئی جس کے چار کمرے تھے، باورچی خانے سمیت۔

اس فلیٹ میں جو کنبہ تھا اس کے آٹھ افراد تھے خود رام سروپ اس کا نوکر جو باورچی بھی تھا تین کتے، دو بندر اور ایک بلی، رام سروپ اور اس کا نوکر مجرد تھے تین کتوں اور ایک بلی کے مقابلے میں ان کی مخالف جنس نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ ایک بندر تھا اور ایک بندریا دونوں اکثر اوقات ایک جالی دار پنجرے میں بند رہتے تھے۔

ان نصف درجن حیوانوں کے ساتھ رام سروپ کو والہانہ محبت تھی نوکر کے ساتھ بھی اس کا سلوک اچھا تھا مگر اس میں جذبات کا دخل بہت کم تھا لگے بندھے کام تھے جو مقررہ وقت پر مشین کی سی بے روح باقاعدگی کے ساتھ گویا خود بخود ہو جاتے تھے اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام سروپ نے اپنے نوکر کو اپنی

زندگی کے تمام قواعد و ضوابط ایک پرچے پر لکھ کر دے دیئے تھے جو اس نے حفظ کر لیے تھے۔

اگر رام سروپ کپڑے اتار کر نیکر پہننے لگے تو اس کا نوکر فوراً تین چار سوڈے اور برف کی فلاسک شیشے والی تپائی پر رکھ دیتا تھا۔۔۔۔اس کا یہ مطلب تھا کہ صاحب رم پی کر اپنے کتوں کے ساتھ کھیلیں گے اور جب کسی کا ٹیلی فون آئے گا تو کہہ دیا جائے گا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

رم کی بوتل یا سگریٹ کا ڈبہ جب خالی ہو گا تو اسے پھینکا یا بیچا نہیں جائے گا بلکہ احتیاط سے اس کمرے میں رکھ دیا جائے گا جہاں خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار لگے ہیں۔

کوئی عورت ملنے کے لیے آئے گی تو اسے دروازے ہی سے یہ کہہ کر واپس کر دیا جائے گا کہ رات صاحب کی شوٹنگ تھی، اس لیے سو رہے ہیں ملاقات کرنے والی شام کو یا رات کو آئے تو اس سے یہ کہا جاتا تھا کہ صاحب شوٹنگ پر گئے ہیں۔

رام سروپ کا گھر تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ عام طور پر اکیلے رہنے والے مجرد مردوں کا ہوتا ہے، یعنی وہ سلیقہ، وہ قرینہ اور رکھ رکھاؤ غائب تھا جو نسائی لمس کا خاصا ہوتا ہے صفائی تھی مگر اس میں کھرا پن تھا۔۔۔۔۔۔۔پہلی مرتبہ جب میں اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو مجھے بہت شدت سے محسوس ہوا کہ میں چڑیا گھر کے اس حصے میں داخل ہو گیا ہوں جو شیر، چیتے اور دوسرے حیوانوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے کیونکہ ویسی ہی بو آ رہی تھی۔

ایک کمرہ سونے کا تھا دوسرا اٹھنے بیٹھنے کا تیسرا خالی بوتلوں اور ڈبوں کا، اس میں رم

کی وہ بوتلیں اور سگریٹ کے وہ تمام ڈبے موجود تھے جو رام سروپ نے پی کر خالی کیے تھے کوئی اہتمام نہیں تھا بوتلوں پر ڈبے اور ڈبوں پر بوتلیں اوندھی سیدھی پڑی ہیں ایک کونے میں قطار لگی ہے تو دوسرے کونے میں انبار گرد جمی ہوئی ہے اور باسی تمباکو اور باسی رم کی ملی جلی تیز بو آ رہی ہے۔

میں نے جب پہلی مرتبہ یہ کمرہ دیکھا تو بہت حیران ہوا ان گنت بوتلیں اور ڈبے تھے۔۔۔۔ سب خالی میں نے رام سروپ سے پوچھا ''کیوں بھئی یہ کیا سلسلہ ہے؟''

اس نے پوچھا ''کیا سلسلہ؟''

میں نے کہا ''یہ۔۔۔ یہ کباڑ خانہ؟''

اس نے صرف اتنا کہا ''جمع ہو گیا ہے''

یہ سن کر میں نے بولتے ہوئے سوچا ''اتنا؟۔۔۔ اتنا کوڑا جمع ہونے میں کم از کم سات آٹھ برس چاہئیں۔''

میرا اندازہ غلط نکلا مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا یہ ذخیرہ پورے دس برس کا تھا جب وہ شیوا جی پارک رہنے آیا تھا تو وہ تمام بوتلیں اور ڈبے اٹھوا کے اپنے ساتھ لے آیا تھا جو اس کے پرانے مکان میں جمع تھے ایک بار میں نے اس سے کہا ''سروپ! تم یہ بوتلیں اور ڈبے بیچ کیوں نہیں دیتے؟۔۔۔ میرا مطلب ہے، اول تو ساتھ ساتھ بیچتے رہنا چاہئیں۔۔۔۔۔ پر اب کہ اتنا انبار جمع ہو چکا ہے اور جنگ کے باعث دام بھی اچھے مل سکتے ہیں میں سمجھتا ہوں تمہیں یہ کباڑ خانہ اٹھوا دینا چاہیے۔''

اس نے جواب میں صرف اتنا کہا ''ہٹاؤ یار۔۔۔۔۔کون اتنی بک بک کرے''

اس جواب سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے خالی بوتلوں اور ڈبوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے نوکر سے معلوم ہوا کہ اگر اس کمرے میں کوئی بوتل یا ڈبہ ادھر کا ادھر ہو جائے تو رام سروپ قیامت برپا کر دیتا تھا۔

عورت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی میری، اس کی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں میں نے کئی بار اس سے دریافت کیا ''کیوں بھئی شادی کب کرو گے؟'' اور ہر بار اس قسم کا جواب ملا ''شادی کر کے کیا کروں گا؟''۔۔۔۔۔۔میں نے سوچا واقعی رام سروپ شادی کر کے کیا کرے گا؟۔۔۔کیا وہ اپنی بیوی کو خالی بوتلوں اور ڈبوں والے کمرے میں بند کر دے گا؟۔۔یا سب کپڑے اتار کر نیکر پہن کر رم پیتے اس کے ساتھ تاش کھیلا کرے گا؟۔۔۔۔۔میں اس سے شادی بیاہ کا ذکر تو اکثر کرتا تھا مگر تصور پر غور دینے کے باوجود اسے کسی عورت سے منسلک نہ دیکھ سکتا۔

رام سروپ سے ملتے کئی برس گزر گئے اس دوران میں کئی مرتبہ میں نے اڑتی اڑتی سنی کہ اسے ایک ایکٹرس سے جس کا نام شیلا تھا، عشق ہو گیا ہے۔ مجھے اس افواہ کا بالکل یقین نہ آیا اول تو رام سروپ سے اس کی توقع ہی نہیں تھی دوسرے شیلا سے کسی بھی ہوش مند نوجوان کو عشق نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ اس قدر بے جان تھی کہ دق کی مریض معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔شروع شروع میں جب وہ ایک دو فلموں میں آئی تھی تو کسی قدر گوارا تھی مگر بعد میں تو وہ بالکل ہی بے کیف او

ر بے رنگ ہوگئی تھی اور صرف تیسرے درجے کے فلموں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے صرف ایک مرتبہ اس شیلا کے بارے میں رام سروپ سے دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر کہا ''میرے لیے کیا یہی رہ گئی تھی''

اس دوران میں اس کا سب سے پیارا کتا اسٹالن نمونیہ میں گرفتار ہو گیا رام سروپ نے دن رات بڑی جانفشانی سے اس کا علاج کیا مگر وہ جانبر نہ ہوا اس کی موت سے اسے بہت صدمہ ہوا کئی دن اس کی آنکھیں اشک آلود رہیں اور جب اس نے ایک روز باقی کتے کسی دوست کو دے دیئے تو میں نے خیال کیا کہ اس نے اسٹالن کی موت کے صدمے کے باعث ایسا کیا ہے، وہ ان کی جدائی کبھی برداشت نہ کرتا۔

کچھ عرصے کے بعد جب اس نے بندر اور بندریا کو بھی رخصت کر دیا تو مجھے کسی قدر حیرت ہوئی لیکن میں نے سوچا کہ اس کا دل اب اور کسی کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرنا چاہتا اب وہ نیکر پہن کر رم پیتے ہوئے صرف اپنی بلی نرگس سے کھیلتا تھا وہ بھی اس سے بہت پیار کرنے لگی تھی کیونکہ رام سروپ کا سارا التفات اب اسی کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔

اس اس کے گھر سے شیر، چیتوں کی بو نہیں آتی تھی۔ صفائی میں کسی قدر نظر آ جانے والا سلیقہ اور قرینہ بھی پیدا ہو چلا تھا، اس کے اپنے چہرے پر ہلکا سا نکھار آ گیا تھا مگر یہ سب کچھ اس قدر آہستہ آہستہ ہوا تھا کہ اس کے نقطہ آغاز کا پتا چلانا بہت مشکل تھا

دن گزرتے گئے رام سروپ کا تازہ فلم ریلیز ہوا تو میں نے اس کی کردار نگاری میں ایک نئی تازگی دیکھی میں نے اسے مبارک باد دی تو وہ مسکرایا ’’وسکی پیو‘‘

میں نے تعجب سے پوچھا ’’وسکی؟‘‘ اس لیے کہ وہ صرف رم پینے کا عادی تھا۔

پہلی مسکراہٹ کو ہونٹوں کے ذرا سکیڑتے ہوئے اس نے جواب دیا ’’رم پی پی کر تنگ آ گیا ہوں‘‘

میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا

آٹھویں روز جب اس کے ہاں شام کو گیا تو وہ قمیض پانجامہ پہنے رم ۔۔۔۔۔۔۔ نہیں وسکی پی رہا تھا دیر تک ہم تاش کھیلتے اور وسکی پیتے رہے اس دوران میں میں نے نوٹ کیا کہ وسکی کا ذائقہ اس کی زبان اور تالو پر ٹھیک نہیں بیٹھ رہا کیونکہ گھونٹ بھرنے کے بعد وہ کچھ اس طرح منہ بناتا تھا جیسے کسی ان چکھی چیز سے اس کا واسطہ پڑا ہوا ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا ’’تمہاری طبیعت قبول نہیں کر رہی وسکی کو؟‘‘

اس نے مسکرا کر جواب دیا ’’آہستہ آہستہ قبول کر لے گی‘‘

رام سروپ کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا ایک روز میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ دیکھا، نیچے گراج کے پاس خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار پڑے ہیں سڑک پر دو چھکڑے کھڑے ہیں جن میں تین چار کباڑیئے ان کو لاد رہے ہیں، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ یہ خزانہ رام سروپ کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا تھا ۔۔۔ آپ یقین جانیئے اس کو جدا ہوتے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا درد محسوس کیا ۔۔۔ دوڑا اوپر گیا گھنٹی بجائی دروازہ کھلا میں نے اندر

داخل ہونا چاہا تو نوکر نے خلاف معمول راستہ روکتے ہوئے کہا ''صاحب! رات شوٹنگ پر گئے تھے اس وقت سو رہے ہیں''

میں حیرت سے اور غصے سے بوکھلا گیا۔۔۔۔۔ کچھ بڑبڑایا اور چل دیا۔

اسی روز شام کو رام سروپ میرے ہاں آیا۔۔۔ اس کے ساتھ شیلا تھی، نئی بنارسی ساڑھی میں ملبوس۔۔۔۔ رام سروپ نے اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا ''میری دھرم پتنی سے ملو۔''

اگر میں نے وسکی کے چار پیگ نہ پیے ہوتے تو یقیناً یہ سن کر بے ہوش ہو گیا ہوتا۔

رام سروپ اور شیلا صرف تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔۔۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ بنارسی ساڑھی میں شیلا کس سے مشابہ تھی۔۔۔۔ دبلے پتلے بدن پر ہلکے بادامی رنگ کی کاغذی سی ساڑھی کسی جگہ پھولی ہوئی، کسی جگہ دبی ہوئی۔۔۔۔ ایک دم میری آنکھوں کے سامنے ایک خالی بوتل آ گئی، باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی۔

شیلا عورت تھی۔۔۔۔ بالکل خالی لیکن ہو سکتا ہے ایک خلا نے دوسرے خلا کو پر کر دیا ہو۔

☆☆☆☆☆

خالد میاں

ممتاز نے صبح سویرے اٹھ کر حسب معمول تینوں کمروں میں جھاڑو دی۔کونے کھدروں سے سگرٹوں کے ٹکڑے، ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اور اسی طرح کی اور چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں جب تینوں کمرے اچھی طرح صاف ہو گئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی بیوی باہر صحن میں سو رہی تھی بچہ پنگھوڑے میں تھا ممتاز ہر روز صبح سویرے اٹھ کر صرف اس لیے خود تینوں کمروں میں جھاڑو دیتا تھا کہ اس کا لڑکا خالد اب چلتا پھرتا تھا اور عام بچوں کے مانند، ہر چیز جو اس کے سامنے آئے، اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔

ممتاز ہر روز تینوں کمرے بڑی احتیاط سے صاف کرتا مگر اس کو حیرت ہوتی جب خالد فرش پر سے اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں کی مدد سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لیتا۔فرش کا پلستر کئی جگہ اکھڑا ہوا تھا جہاں کوڑے کرکٹ کے چھوٹے چھوٹے ذرے پھنس جاتے تھے ممتاز اپنی طرف سے پوری صفائی کرتا مگر کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا جو اس کا پلوٹھی کا بیٹا خالد جس کی عمر ابھی ایک برس کی نہیں ہوئی تھی اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیتا۔

ممتاز کو صفائی کا خبط ہو گیا تھا اگر وہ خالد کو کوئی چیز فرش پر سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتے دیکھتا وہ خود کو اس کا ملزم سمجھتا اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوستا کہ اس نے کیوں بد احتیاطی کی خالد سے اس کو پیار ہی نہیں عشق تھا لیکن عجیب بات ہے کہ

جوں جوں خالد کی پہلی سالگرہ کا دن نزدیک آتا تھا اس کا یہ وہم یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا کہ اس کا بیٹا ایک سال کا ہونے سے پہلے پہلے مر جائے گا۔

اپنے اس خوفناک وہم کا ذکر ممتاز اپنی بیوی سے بھی کر چکا تھا۔ ممتاز کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اوہام کا بالکل قائل نہیں اس کی بیوی نے جب پہلی بار اس کے منہ سے ایسی بات سنی تو کہا "آپ اور ایسے وہم۔۔۔۔۔۔اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا بیٹا سو سال زندہ رہے گا۔۔۔میں نے اس کی پہلی سالگرہ کے لیے ایسا اہتمام کیا ہے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔"

یہ سن کر ممتاز کے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا وہ کب چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا زندہ نہ رہے لیکن اس کے وہم کا کیا علاج تھا۔۔۔۔۔۔۔خالد بڑا تندرست بچہ تھا۔ سردیوں میں جب نوکر ایک دفعہ اس کو باہر سیر کے لیے لے گیا تھا تو واپس آ کر اس نے ممتاز کی بیوی سے کہا تھا "بیگم صاحب! آپ خالد میاں کے گالوں پر سرخی نہ لگایا کریں۔۔۔۔کسی کی نظر لگ جائے گی"

یہ سن کر اس کی بیوی بہت ہنسی تھی "بے وقوف مجھے کیا ضرورت ہے سرخی لگانے کی ماشاءاللہ اس کے گال ہی قدرتی لال ہیں"

سردیوں میں خالد کے گال بہت سرخ رہتے تھے مگر اب گرمیوں میں کچھ زردی مائل ہو گئے تھے اس کو پانی کا بہت شوق تھا چنانچہ جب وہ انگڑائی لے کر اٹھتا اور دودھ کی بوتل پی لیتا تو دفتر جانے سے پہلے ممتاز اس کو پانی کی بالٹی میں کھڑا کر دیتا۔ دیر تک وہ پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کر کھیلتا رہتا ممتاز اور اس کی بیوی خالد کو دیکھتے اور بہت خوش ہوتے لیکن ممتاز کی خوشی میں غم کا ایک برقی دھکا سا ضرور

ہوتا۔ وہ سوچتا، خدا میری بیوی کی زبان مبارک کرے لیکن یہ کیا ہے کہ مجھے اس کی موت کا کھٹکا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ وہم کیوں میرے دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ مر جائے گا۔۔۔ کیوں مر جائے گا؟۔۔۔ اچھا بھلا صحت مند ہے اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ صحت مند۔۔۔۔۔ میں یقیناً پاگل ہوں اس سے میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت دراصل اس وہم کا باعث ہے۔۔۔ لیکن مجھے اس سے اتنی زیادہ محبت کیوں ہے؟۔۔ کیا سارے باپ اسی طرح بچوں سے پیار کرتے ہیں۔۔۔۔ کیا ہر باپ کو اپنی اولاد کی موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے؟۔۔۔۔ مجھے آخر ہو کیا گیا ہے؟

ممتاز نے جب حسب معمول تینوں کمرے اچھی طرح صاف کر دیئے تو وہ فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا یہ اس کی عادت تھی صبح اٹھ کر جھاڑو وغیرہ دے کر وہ گرمیوں میں ضرور آدھے گھنٹے کے لئے چٹائی پر لیٹا کرتا تھا بغیر تکیے کے اس طرح اس کو لطف محسوس ہوتا تھا۔

لیٹ کر وہ سوچنے لگا ''پرسوں میرے بچے کی پہلی سالگرہ ہے۔۔۔ اگر یہ بخیر و عافیت گزر جائے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا یہ میرا وہم بالکل دور ہو جائے گا۔۔۔ اللہ میاں یہ سب تیرے ہاتھ میں ہے۔''

اس کی آنکھیں بند تھیں دفعتاً اس نے اپنے ننگے سینے پر بوجھ سا محسوس کیا آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھا خالد ہے اس کی بیوی پاس کھڑی تھی اس نے کہا'' ساری رات بے چین سا رہا ہے سوتے میں جیسے ڈر ڈر کے کانپتا رہا ہے۔''

خالد، ممتاز کے سینے پر زور سے کانپا، ممتاز نے اس پر ہاتھ رکھا اور کہا ''خدا

میرے بیٹے کا محافظ ہو۔''

ممتاز کی بیوی نے خفگی آمیز لہجے میں کہا ''تو بہ آپ کو بس وہموں نے گھیر رکھا ہے ہلکا سا بخار ہے، انشاء اللہ دور ہو جائے گا''

یہ کہہ کر ممتاز کی بیوی کمرے سے باہر چلی گئی

ممتاز نے ہولے ہولے بڑے پیار سے خالد کو تھپکنا شروع کیا جو اس کی چھاتی پر اوندھا لیٹا تھا اور سوتے میں کبھی کبھی کانپ اٹھتا تھا تھپکنے سے وہ جاگ پڑا آہستہ آہستہ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور باپ کو دیکھ کر مسکرایا ممتاز نے اس کا منہ چوما ''کیوں میاں خالد کیا حالت ہے۔۔۔آپ کانپتے کیوں تھے''

خالد نے مسکرا کر اپنا اٹھا ہوا سر باپ کی چھاتی پر گرا دیا ممتاز نے پھر اس کو تھپکانا شروع کر دیا دل میں وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی عمر دراز ہو اس کی بیوی نے خالد کی پہلی سالگرہ کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا اپنی ساری سہیلیوں سے کہا تھا کہ وہ اس تقریب پر ضرور آئیں درزی سے خاص طور پر اس کی سالگرہ کے کپڑے سلوائے تھے دعوت پر کیا کیا چیز ہوگی، یہ سب سوچ لیا تھا۔۔۔ممتاز کو یہ ٹھاٹ پسند نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور سالگرہ گزر جائے خود اس کو بھی پتا نہ چلے اور اس کا بیٹا ایک برس کا ہو جائے اس کو اس بات کا علم صرف اس وقت ہو جب خالد ایک برس اور کچھ دنوں کا ہو گیا ہو۔

خالد اپنے باپ کی چھاتی پر سے اٹھا ممتاز نے اس سے محبت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''خالد بیٹا سلام نہیں کرو گے ابا جی کو''

خالد نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور اپنے سر پر ہاتھ رکھ دیا ممتاز نے اس کو دعا دی''

جیتے رہو' لیکن یہ کہتے ہی اس کے دل پر اس کے وہم کی ضرب لگی اور وہ غم وفکر کے سمندر میں غرق ہو گیا۔

خالد سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گیا دفتر جانے میں ابھی کافی وقت تھا ممتاز چٹائی پر لیٹا رہا اور اپنے وہم کو دل و دماغ سے محو کرنے کی کوشش کرتا رہا اتنے میں باہر صحن سے اس کی بیوی کی آواز آئی ''ممتاز صاحب، ممتاز صاحب۔۔۔۔ادھر آیئے''

آواز میں شدید گھبراہٹ تھی ممتاز چونک کر اٹھا دوڑ کر باہر گیا دیکھا کہ اس کی بیوی خالد کو غسل خانے کے باہر گود میں لیے کھڑی ہے اور وہ اس کی گود میں بل پہ بل کھا رہا ہے۔۔۔ممتاز نے اس کو اپنی بانہوں میں لیا اور بیوی سے جو کانپ رہی تھی پوچھا ''کیا ہوا؟''

اس کی بیوی نے خوفزدہ لہجے میں کہا ''معلوم نہیں۔۔۔۔پانی سے کھیل رہا تھا۔۔۔۔میں نے ناک صاف کی تو دوہرا ہو گیا''

ممتاز کی بانہوں میں خالد ایسے بل کھا رہا تھا جیسے کوئی اسے کپڑے کی طرح نچوڑ رہا ہے سامنے چارپائی پڑی تھی ممتاز نے اس کو وہاں لٹا دیا میاں بیوی بہت پریشان تھے وہ پڑا بل کھا رہا تھا اور ان دونوں کے اوسان خطا تھے کہ وہ کیا کریں تھپکایا، چوما، پانی کے چھینٹے مارے مگر اس کا تشنج دور نہ ہوا تھوڑی دیر کے بعد خود بخود دورہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور خالد پر بے ہوشی طاری ہو گئی ممتاز نے سمجھا، مر گیا ہے چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا ''ختم ہو گیا''

وہ چلائی ''لاحول ولا۔۔۔۔کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں کنولشن تھی، ختم ہو

گئی ابھی ٹھیک ہو جائے گا''

خالد نے اپنی مرجھائی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور اپنے باپ کی طرف دیکھا ممتاز کی ساری دنیا زندہ ہو گئی بڑے ہی درد بھرے پیار سے اس نے خالد سے کہا ''کیوں خالد بیٹا ۔۔۔۔۔ یہ کیا ہوا تھا آپ کو؟''

خالد کے ہونٹوں پر تشنج زدہ مسکراہٹ نمودار ہوئی ممتاز نے اس کو گود میں اٹھالیا اور اندر کمرے میں لے گیا لٹانے ہی والا تھا کہ دوسری کنولشن آئی خالد پھر بل کھانے لگا جس طرح مرگی کا دورہ ہوتا ہے یہ تشنج بھی اسی قسم کا تھا ممتاز کو ایسا محسوس ہوتا کہ خالد نہیں بلکہ وہ خود اس اذیت کے شکنجے میں کسا جا رہا ہے۔

دوسرا دورہ ختم ہوا تو خالد اور زیادہ مرجھا گیا اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دھنس گئیں ممتاز اس سے باتیں کرنے لگا۔

''خالد بیٹے! یہ کیا ہوتا ہے آپ کو؟''

''خالد میاں اٹھو نا ۔۔۔۔۔ چلو پھرو''

''خالدی ۔۔۔۔ مکھن کھائیں گے آپ؟''

خالد کو مکھن بہت پسند تھا مگر اس نے یہ سن کر بھی اپنا سر ہلا کر ہاں نہ کی لیکن جب ممتاز نے کہا ''بیٹے، گگو کھائیں گے آپ؟'' تو اس نے نحیف انداز میں نہیں کے طور پر اپنا سر ہلایا ممتاز مسکرایا اور خالد کو اپنے گلے سے لگا لیا پھر اس کو اپنی بیوی کے حوالے کیا اور اس سے کہا ''تم اس کا دھیان رکھو میں ڈاکٹر لے کر آتا ہوں''

ڈاکٹر ساتھ لے کر آیا تو ممتاز کی بیوی کے ہوش اڑے ہوئے تھے اس کی غیر حاضری میں خالد پر تشنج کے تین اور دورے پڑ چکے تھے ان کے باعث وہ بے جان

سا ہو گیا تھا ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور کہا ”تردد کی کوئی بات نہیں ایسی کنولشن بچوں کو عموماً آیا کرتی ہے۔۔۔۔اس کی وجہ دانت ہیں معدے میں کرم وغیرہ ہوں تو وہ بھی اس کا باعث ہو سکتے ہیں۔۔۔۔میں دوا لکھ دیتا ہوں آرام آ جائے گا بخار تیز نہیں ہے، آپ کوئی فکر نہ کریں“

ممتاز نے دفتر سے چھٹی لے لی اور سارا دن خالد کے پاس بیٹھا رہا ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس کو دو مرتبہ اور دورے پڑے اس کے بعد وہ نڈھال لیٹا رہا شام ہو گئی تو ممتاز نے سوچا ”شاید اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے۔۔۔۔اتنے عرصے میں کوئی کنولشن نہیں آئی۔۔۔۔خدا کرے رات اسی طرح کٹ جائے۔“

ممتاز کی بیوی بھی خوش تھی ”اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کل میرا خالد دوڑتا پھرے گا“

رات کو چونکہ مقررہ وقت پر دوا دینی تھی اس لیے ممتاز چارپائی پر نہ لیٹا کہ شاید سو جائے خالد کے پنگھوڑے کے پاس آرام کرسی رکھ کر وہ بیٹھ گیا اور ساری رات جاگتا رہا کیونکہ خالد بے چین تھا کانپ کانپ کر بار بار جاگتا تھا حرارت بھی تیز تھی۔

صبح سات بجے کے قریب ممتاز نے تھرما میٹر لگا کے دیکھا تو ایک سو چار ڈگری بخار تھا ڈاکٹر بلایا اس نے کہا ”تردد کی کوئی بات نہیں برونکائٹس ہے میں نسخہ لکھ دیتا ہوں تین چار روز میں آرام آ جائے گا۔“

ڈاکٹر نسخہ لکھ کر چلا گیا ممتاز دوا بنوا لایا خالد کو ایک خوراک پلائی مگر اس کو تسکین نہ ہوئی دس بجے کے قریب وہ ایک بڑا ڈاکٹر لایا اس نے اچھی طرح خالد کو دیکھا اور تسلی دی ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا“

سب ٹھیک نہ ہوا بڑے ڈاکٹر کی دوا نے کوئی اثر نہ کیا بخار تیز ہوتا گیا

ممتاز کے نوکر نے کہا "صاحب! بیماری وغیرہ کوئی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔خالد میاں کو نظر لگ گئی ہے میں ایک تعویذ لکھوا کر لایا ہوں اللہ کے حکم سے یوں چٹکیوں میں اثر کرے گا"

سات کنوؤں کا پانی اکٹھا کیا گیا اس میں یہ تعویذ گھول کر خالد کو پلایا گیا کوئی اثر نہ ہوا، ہمسائی آئی، وہ ایک یونانی دوا تجویز کر گئی، ممتاز دوا لے آیا مگر اس نے خالد کو نہ دی شام کو ممتاز کا ایک رشتے دار آیا ساتھ اس کے ایک ڈاکٹر تھا اس نے خالد کو دیکھا اور کہا "ملیریا ہے۔۔۔۔اتنا بخار ملیریا ہی میں ہوتا ہے۔۔۔۔آپ اس پر برف کا پانی ڈالیے میں کونین کا انجکشن دیتا ہوں"

برف کا پانی ڈالا گیا بخار ایک دم کم ہو گیا درجہ حرارت اٹھانوے ڈگری تک آ گیا ممتاز اور اس کی بیوی کی جان میں جان آئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں بخار بہت ہی تیز ہو گیا ممتاز نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا درجہ حرارت ایک سو چھ تک پہنچ گیا۔

ہمسائی آئی اس نے خالد کو مایوس نظروں سے دیکھا اور ممتاز کی بیوی سے کہا "بچے کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا ہے۔"

ممتاز اور اس کی بیوی کے دل بیٹھ گئے ممتاز نے نیچے کارخانے سے ہسپتال فون کیا۔ ہسپتال والوں نے کہا مریض کو لے آؤں۔ ممتاز نے فوراً تانگہ منگوایا خالد کو گود میں لیا بیوی کے ساتھ بٹھایا اور ہسپتال کا رخ کیا سارا دن وہ پانی پیتا رہا تھا مگر پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہیں تھی ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں اس کا حلق بے

حد خشک ہو گیا اس نے سوچا اتر کر کسی دکان سے ایک گلاس پانی پی لے لیکن خدا معلوم کہاں سے یہ وہم ایک دم اس کے دماغ میں آن ٹپکا ''دیکھو اگر تم نے پانی پیا تو تمہارا خالد مر جائے گا''

ممتاز کا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا مگر اس نے پانی نہ پیا ہسپتال کے قریب تانگہ پہنچا تو اس نے سگریٹ سلگایا دو ہی کش لیے تھے تو اس نے ایک دم سگریٹ پھینک دیا اس کے دماغ میں یہ وہم گونجا تھا ''ممتاز سگریٹ نہ پیو تمہارا بچہ مر جائے گا''

ممتاز نے تانگہ ٹھہرایا اس نے سوچا ''یہ کیا حماقت ہے۔۔۔۔یہ وہم سب فضول ہیں۔ سگریٹ پینے سے بچے پر کیا آفت آ سکتی ہے''

تانگے سے اتر کر اس نے سڑک پر سے سگریٹ اٹھایا واپس تانگے میں بیٹھ کر جب اس نے کش لینا چاہا تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو روکا ''نہیں ممتاز! ایسا نہ کرو خالد مر جائے گا''

ممتاز نے سگریٹ زور سے پھینک دیا۔۔۔۔تانگے والے نے گھور کے اس کو دیکھا۔ ممتاز نے محسوس کیا کہ جیسے اس کو اس کی دماغی کیفیت کا علم ہے اور وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے اپنی خفت دور کرنے کی خاطر اس نے تانگے والے سے کہا ''خراب ہو گیا تھا سگریٹ'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نیا سگریٹ نکالا سلگانا چاہا مگر ڈر گیا اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی ادراک کہتا تھا کہ یہ اوہام سب فضول ہیں مگر کوئی ایسی آواز تھی کوئی ایسی طاقت تھی جو اس کی منطق اس کے استدلال، اس کے ادراک پر غالب آ جاتی تھی۔

تانگہ ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اس نے سگریٹ انگلیوں میں مسل کر

پھینک دیا اس کو اپنے اوپر بہت ترس آیا کہ وہ اوہام کا غلام بن گیا ہے۔

ہسپتال والوں نے فوراً ہی خالد کو داخل کر لیا ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا "برونکو نمونیا ہے حالت مخدوش ہے۔"

خالد بے ہوش تھا ماں اس کے سرہانے بیٹھی ویران نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا۔ ممتاز کو سخت پیاس لگ رہی تھی نل کھول کر اوک سے پانی پینے لگا تو پھر وہی وہم اس کے دماغ میں گونجا "ممتاز یہ کیا کر رہے ہو تم پانی مت پیو۔۔۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔"

ممتاز نے دل میں اس وہم کو گالی دی اور انتقاماً اتنا پانی پیا کہ اس کا پیٹ اپھر گیا پانی پی کر غسل خانے سے باہر آیا تو اس کا خالد اسی طرح مرجھایا ہوا بے ہوش ہسپتال کے آہنی پلنگ پر پڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہیں بھاگ جائے۔۔۔۔۔ اس کے ہوش حواس غائب ہو جائیں۔۔۔ خالد اچھا ہو جائے اور وہ اس کے بدلے نمونیا میں گرفتار ہو جائے۔

ممتاز نے محسوس کیا کہ خالد اب پہلے سے زیادہ زرد ہے اس نے سوچا، یہ سب اس کے پانی پی لینے کا باعث ہے۔۔۔۔ اگر وہ پانی نہ پیتا تو ضرور خالد کی حالت بہتر ہو جاتی۔ اس کو بہت دکھ ہوا اس نے خود کو بہت لعنت ملامت کی مگر پھر اس کو خیال آیا کہ جس نے یہ بات سوچی تھی وہ ممتاز نہیں کوئی اور تھا۔۔۔۔۔ یہ اور کون تھا؟۔۔۔ کیوں اس کے دماغ میں ایسے وہم پیدا ہوتے تھے پیاس لگی تھی، پانی پی لیا، اس سے خالد پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔۔۔۔ خالد ضرور اچھا ہو جائے گا۔۔۔ پرسوں اس کی سالگرہ ہے ان شاء اللہ خوب ٹھاٹ سے منائی جائے گی۔

لیکن فوراً ہی اس کا دل بیٹھ جاتا کوئی آواز اس سے کہتی "خالد ایک برس کا ہونے ہی نہیں پائے گا" ممتاز کا جی چاہتا کہ وہ اس آواز کی زبان پکڑ لے اور اسے گدی سے نکال دے مگر یہ آواز تو خود اس کے دماغ میں پیدا ہوتی تھی خدا معلوم کیسے ہوتی تھی کیوں ہوتی تھی۔

ممتاز اس قدر تنگ آیا کہ اس نے دل ہی دل میں اپنے اوہام سے گڑگڑا کر کہا "خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔۔۔۔۔۔ کیوں تم مجھ غریب کے پیچھے پڑ گئے ہو"

شام ہو چلی تھی کئی ڈاکٹر خالد کو دیکھ چکے تھے دوا دی جا رہی تھی کئی انجکشن بھی لگ چکے تھے مگر خالد ابھی تک بے ہوش تھا دفعتاً ممتاز کے دماغ میں یہ آواز گونجی "تم یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔۔ فوراً چلے جاؤ ورنہ خالد مر جائے گا"

ممتاز کمرے سے باہر چلا گیا ہسپتال سے باہر چلا گیا اس کے دماغ میں آوازیں گونجتی رہیں اس نے اپنے آپ کو ان آوازوں کے حوالے کر دیا اپنی ہر جنبش، اپنی ہر حرکت ان کے حکم کے سپرد کر دی۔۔۔۔۔۔ یہ اسے ایک ہوٹل میں لے گئیں انہوں نے اس کو شراب پینے کے لیے کہا شراب آئی تو اسے پھینک دینے کا حکم دیا ممتاز نے ہاتھ سے گلاس پھینک دیا تو اور منگوانے کے لیے کہا دوسرا گلاس آیا تو اسے بھی پھینک دینے کے لیے کہا

شراب اور ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے بل ادا کر کے ممتاز باہر نکلا اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔۔۔۔۔ صرف اس کا دماغ ہے جہاں شور برپا ہے چلتا چلتا وہ ہسپتال پہنچ گیا خالد کے کمرے کا رخ کیا تو اسے حکم ہوا "مت جاؤ ادھر۔۔۔۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔"

وہ لوٹ آیا۔۔۔گھاس کا میدان تھا وہاں ایک بنچ پڑی تھی اس پر لیٹ گیا۔۔۔رات کے دس بج چکے تھے میدان میں اندھیرا تھا چاروں طرف خاموشی تھی کبھی کبھی موٹر کے ہارن کی آوازیں خاموشی میں خراش پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی۔سامنے اونچی دیوار میں ہسپتال کا روشن کلاک تھا۔۔۔۔ممتاز، خالد کے متعلق سوچ رہا تھا ''کیا وہ بچ جائے گا۔۔۔یہ بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں جنہیں مرنا ہوتا ہے۔۔۔۔وہ زندگی کیوں پیدا ہوتی ہے جسے اتنی جلدی موت کے منہ میں چلا جانا ہوتا ہے۔۔۔۔خالد ضرور۔۔۔۔''

ایک دم اس کے دماغ میں ایک وہم پھوٹا بنچ پر سے اتر کر وہ سجدے میں گر گیا حکم تھا اسی طرح پڑے رہو جب تک خالد ٹھیک نہ ہو جائے ممتاز سجدے میں پڑا رہا وہ دعا مانگنا چاہتا تھا مگر حکم تھا کہ مت مانگو ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ خالد کے لیے نہیں، اپنے لیے دعا مانگنے لگا'' خدایا مجھے اس اذیت سے نجات دے۔۔۔۔تجھے اگر خالد کو مارنا ہے تو مار دے، یہ میرا کیا حشر کر رہا ہے تو۔''

دفعتاً اسے آوازیں سنائی دیں اس سے کچھ دور دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''بچہ بڑا خوبصورت ہے''

''ماں کا حال مجھ سے تو دیکھا نہیں گیا''

''بے چاری ہر ڈاکٹر کے پاؤں پڑ رہی تھی''

''ہم نے اپنی طرف سے تو ہر ممکن کوشش کی''

''بچنا محال ہے''

”میں نے یہی کہا تھا ماں سے کہ دعا کرو بہن“

ایک ڈاکٹر نے ممتاز کی طرف دیکھا جو سجدے میں پڑا تھا اس کو زور سے آواز دی ”اے کیا کر رہا ہے تو۔۔۔۔ادھر آ“

ممتاز اٹھ کر دونوں ڈاکٹروں کے پاس گیا ایک نے اس سے پوچھا ”کون ہو تم؟“

ممتاز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا ”جی میں ایک مریض۔۔۔“

ڈاکٹر نے سختی سے کہا ”مریض ہو تو اندر جاؤ۔۔۔یہاں میدان میں ڈنٹر کیوں پیلتے ہو“

ممتاز نے کہا ”جی میرا بچہ ہے۔۔۔ادھر اس وارڈ میں“

”وہ تمہارا بچہ ہے جو۔۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔شاید آپ اسی کی باتیں کر رہے تھے۔۔۔وہ میرا بچہ ہے۔۔۔۔خالد“

”آپ اس کے باپ ہیں؟“

ممتاز نے اپنا غم و اندوہ سے بھرا ہوا سر ہلایا ”جی ہاں، میں اس کا باپ ہوں“

ڈاکٹر نے کہا ”آپ یہاں بیٹھے ہیں جائیے آپ کی وائف بہت پریشان ہیں“

”جی اچھا“ کہہ کر ممتاز وارڈ کی طرف روانہ ہوا سیڑھیاں طے کر کے جب اوپر پہنچا تو کمرے کے باہر اس کا نوکر رو رہا تھا ممتاز کو دیکھ کر اور زیادہ رونے لگا“

صاحب خالد میاں فوت ہو گئے ۔"

ممتاز اندر کمرے میں گیا اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی ایک ڈاکٹر اور نرس اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے ممتاز پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا خالد آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سکون تھا ممتاز نے اس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دل چیر دینے والے لہجے میں اس سے پوچھا "خالد میاں ۔۔۔۔ گلو کھائیں گے آپا؟"

خالد کا سر نفی میں نہ ہلا ممتاز نے پھر درخواست بھرے لہجے میں کہا "خالد میاں ۔۔۔۔۔ میرے وہم لے جائیں گے اپنے ساتھ؟"

ممتاز کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خالد نے سر ہلا کر ہاں کی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

خورشٹ

ہم دلی میں تھے میرا بچہ بیمار تھا میں نے پڑوس کے ڈاکٹر کاپڑیا کو بلایا وہ ایک کبڑا آدمی تھا بہت پست قد لیکن بے حد شریف اس نے میرے بچے کا بڑے اچھے طریقے پر علاج کیا اس کو فیس دی اس نے قبول نہ کی یوں تو وہ پارسی تھا لیکن بڑی شستہ و رفتہ اردو بولتا تھا اس لیے کہ وہ دلی ہی میں پیدا ہوا تھا اور تعلیم اس نے وہیں حاصل کی تھی۔

ہمارے سامنے کے فلیٹ میں مسٹر کھیش والا رہتا تھا یہ بھی پارسی تھا اسی کے ذریعے سے ہم نے ڈاکٹر کاپڑیا کو بلایا تھا تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آیا تو اس سے ہمارے تعلقات بڑھ گئے۔ ڈاکٹر کے ہاں میرا اور میری بیوی کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ہماری ملاقات اپنے لڑکے سے کرائی اس کا نام ساوک کاپڑیا تھا۔ وہ بہت ہی ملنسار آدمی تھا رنگ بے حد زرد، ایسا لگتا تھا کہ اس میں خون ہے ہی نہیں سنگر مشین کمپنی میں ملازم تھا غالباً پانچ چھ سو روپے ماہوار پاتا تھا بہت صاف ستھرا رہتا تھا اس کا گھر جو ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا بہت نفاست سے سجا ہوا تھا مجال ہے کہ گرد و غبار کا ایک ذرہ بھی کہیں نظر آ جائے۔

جب میں اور میری بیوی شام کو اس کے ہاں جاتے تو وہ اور اس کی بیوی خورشید جس کو پارسیوں کی زبان میں خورشٹ کہا جاتا تھا، بڑے تپاک سے پیش آتے اور ہماری خوب خاطر تواضع کرتے۔

خورشید یعنی خورشٹ لمبے قد کی عورت تھی عام پارسیوں کی طرح اس کی ناک

بدنما نہیں تھی، لیکن خوبصورت بھی نہیں تھی موٹی پکوڑا ایسی ناک تھی، لیکن رنگ سفید تھا اس لیے گوارا ہوگئی تھی بال کٹے ہوئے تھے چہرہ گول تھا خوش پوش تھی اس لیے اچھی لگتی تھی میری بیوی سے چند ملاقاتوں ہی میں دوستی ہوگئی چنانچہ ہم ان کے ہاں اکثر جانے لگے وہ دونوں میاں بیوی بھی ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے ہاں آ جاتے تھے اور دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔

ہم جب بھی ساوک کے ہاں گئے، ایک سکھ کو ان کے ہاں دیکھا یہ سکھ ایک تنومند آدمی تھا بہت خوش خلق، ساوک نے مجھے بتایا کہ سردار زور آور سنگھ اس کا بچپن کا دوست ہے دونوں اکٹھے پڑھتے تھے ایک ساتھ انہوں نے بی اے پاس کیا لیکن شکل وصورت کے اعتبار سے سردار زور آور سنگھ، ساوک کے مقابلے میں زیادہ معمر نظر آتا تھا۔ ساوک شاید خون کی کمی کے باعث بہت ہی چھوٹا معلوم ہوتا تھا ایسا لگتا تھا کہ اس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہیں، لیکن سردار زور آور سنگھ چالیس کے اوپر معلوم ہوتا تھا۔

سردار زور آور سنگھ کنوارا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا اس نے گورنمنٹ سے کئی ٹھیکے لے رکھے تھے اس کا باپ بہت پرانا گورنمنٹ کنٹریکٹر تھا لیکن باپ بیٹے میں بنتی نہیں تھی سردار زور آور سنگھ آزاد خیال تھا لیکن وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا پر وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے البتہ اس کی ماں اس سے بہت پیار کرتی تھی جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ماں کا اکلوتا لڑکا تھا تین لڑکیاں تھیں، وہ اپنے گھر میں آباد ہو چکی تھیں اب اس کی خواہش تھی کہ وہ شادی کرلے اور اس کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے، مگر وہ اس کے متعلق بات کرنے کے لیے تیار

ہی نہیں تھا۔

میں نے ایک دفعہ اس سے دریافت کیا ''سردار صاحب! آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟''

اس نے مونچھوں کے اندر ہنس کر جواب دیا ''اتنی جلدی کیا ہے؟''

میں نے پوچھا ''آپ کی عمر کیا ہے؟''

اس نے کہا ''آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میرے خیال کے مطابق آپ کی عمر غالباً چالیس برس ہوگی''

سردار زورآور سنگھ مسکرایا ''آپ کا اندازہ غلط ہے''

''آپ فرمایئے آپ کی کیا عمر ہے؟''

سردار زورآور سنگھ پھر مسکرایا ''میں آپ سے بہت چھوٹا ہوں۔۔۔۔۔عمر کے لحاظ سے بھی۔۔۔۔میں ابھی پرسوں انتیس اگست کو پچیس برس کا ہوا ہوں۔''

میں نے اپنے غلط اندازے کی معافی چاہی ''لیکن آپ کی شکل وصورت سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی عمر پچیس برس ہے''

سردار زورآور سنگھ ہنسا ''میں سکھ ہوں۔۔۔۔۔اور بڑا غیر معمولی سکھ'' یہ کہہ کر اس نے غور سے مجھے دیکھا ''منٹو صاحب! آپ حجامت کیوں نہیں کراتے اتنے بڑے بالوں سے آپ کو وحشت نہیں ہوتی۔''

میں نے گردن پر ہاتھ پھیرا بال واقعی بہت بڑھے ہوئے تھے غالباً تین مہینے ہوگئے تھے جب میں نے بال کٹوائے تھے سردار زورآور سنگھ نے بات کی تو مجھے سر پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا ''یاد ہی نہیں رہا اب آپ نے کہا ہے تو مجھے وحشت محسوس

ہوتی ہے خدا معلوم مجھے کیوں بال کٹوانے یاد نہیں رہتے۔۔۔یہ سلسلہ ہے ہی کچھ واہیات۔۔۔ایک گھنٹہ نائی کے سامنے سر نیوڑھائے بیٹھے رہو۔وہ اپنی خرافات بکتا رہے اور آپ مجبوراً کان سمیٹے سنتے رہیں۔۔۔فلاں ایکٹرس ایسی ہے فلاں ایکٹرس ویسی ہے، امریکہ نے ایٹم بم ایجاد کرلیا ہے روس کے پاس اس کا بہت ہی تگڑا جواب موجود ہے یہ ایلی کون ہے؟ اور وہ مسولینی کہاں گیا؟ اب میں اگر اس سے کہوں کہ جہنم میں گیا ہے تو وہ ضرور پوچھتا کہ صاحب کیسے گیا، کس راستے سے گیا۔کون سے جہنم میں گیا۔''

میری اتنی لمبی چوڑی بات سن کر سردار زور آور سنگھ نے اپنی سفید پگڑی اتاری۔۔۔۔مجھے سخت حیرت ہوئی اس لیے کہ اس کے کیس ندارد تھے ان کے بجائے ہلکے خشخشی بال تھے لیکن وہ پگڑی کچھ اس انداز سے باندھتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کیس ہیں اور ثابت و سالم ہیں۔

بڑی صفائی سے پگڑی اتار کر اس نے میری تپائی پر رکھی اور مسکرا کر کہا ''میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کرسکتا''

میں نے اس کے بالوں کے متعلق کوئی بات نہ کی، اس لیے کہ میں نے مناسب خیال نہ کیا۔اس نے بھی ان کے متعلق کوئی بات نہ چھیڑی پگڑی تپائی پر رکھ دینے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا تھا ''میں تو اس سے بڑے بال کبھی برداشت نہیں کرسکتا'' اس کے بعد اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور کہا ''منٹو صاحب! خورشید کے لیے آپ کچھ کیجیے؟''

میں کچھ نہ سمجھا ''کون خورشید؟''

سردار زورآور سنگھ نے پگڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی ”خورشید کا پڑیا کے لیے“

”میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں“

”اس کو گانے کا بہت شوق ہے“

”مجھے معلوم نہیں کہ خورشٹ گاتی ہے“ کیا گاتی ہیں؟

سردار زورآور سنگھ نے خورشٹ کی گائیکی کے بارے میں اتنی تعریف کی کہ مجھے سب مبالغہ معلوم ہوا ”منٹو صاحب بہت اچھی آواز پائی ہے۔ خصوصاً ٹھمری ایسی اچھی گاتی ہے کہ آپ وجد میں آ جائیں گے آپ کو ایسا معلوم ہو گا کہ خان صاحب عبدالکریم کو سن رہے ہیں اور لطف یہ کہ خورشید نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔۔۔بس جو ملا ہے قدرت سے ملا ہے، آپ آج شام کو آئیے۔۔۔۔۔مسز منٹو بھی ضرور تشریف لائیں۔ میں خورشید کو بلاؤں گا آپ ذرا اسے سنیئے گا۔“

میں نے کہا ”ضرور۔۔۔ضرور۔۔۔۔۔۔۔مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گاتی ہیں۔“

سردار زورآور سنگھ نے سفارش کے طور پر کہا ”آپ ریڈیو اسٹیشن میں ہیں میں چاہتا ہوں کہ خورشید کو ہر مہینے کچھ پروگرام مل جایا کریں روپے کی اس کو کوئی خواہش نہیں ہے۔“

”لیکن اگر ان کو پروگرام ملے گا تو معاوضہ بھی ضرور ملے گا گورنمنٹ ان کا معاوضہ کس کھاتے میں ڈالے گی؟“

یہ سن کر سردار زورآور سنگھ مسکرایا ”تو ٹھیک ہے لیکن اسے پروگرام ضرور

دلوائیے گا۔۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ سننے والے اسے بہت پسند کریں گے۔"

اس گفتگو کے بعد ہم تیسرے روز ساوک کے ہاں گئے وہ موجود نہیں تھا لیکن ڈرائنگ روم میں سردار زورآور سنگھ سگریٹ پی رہا تھا پارسیوں میں سگریٹ پینا منع ہے، سکھ بھی سگریٹ نہیں پیتے لیکن وہ بڑے اطمینان اور ٹھاٹ سے کش پہ کش لے رہا تھا میں اور میری بیوی کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے سگریٹ پینا بند کر دیا ایش ٹرے میں اس کی گردن مروڑ کر اس نے ہمیں خالص اسلامی انداز میں سلام کیا اور کہا "خورشید کی طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔"

خورشید کچھ دیر کے بعد آئی میں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت قطعاً ناساز نہیں ہے میں نے اس سے پوچھا تو اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے کہا "ذرا زکام تھا"

مگر اس کو زکام نہیں تھا سردار زورآور سنگھ نے بڑے زوردار انداز میں خورشید سے اس کا حال پوچھا، زکام کے لیے کم از کم دس دوائیں تجویز کیں، پانچ ڈاکٹروں کے حوالے دیئے، مگر وہ خاموش رہی، جیسے وہ اس قسم کی بکواس سننے کی عادی ہے اتنے میں خورشید کا خاوند ساوک کا پڑیا آ گیا۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی مجھ سے اور میری بیوی سے اس نے معذرت چاہی، سردار زورآور سنگھ سے کچھ دیر مذاق کیا اور ہم سے چند منٹ کی رخصت لے کر اندر چلا گیا اس لیے کہ اسے اپنی بچی کو دیکھنا تھا۔

اس کی پلوٹھی کی بچی بہت پیاری تھی میاں بیوی کی بس یہی ایک اولاد تھی قریباً ڈیڑھ برس کی تھی۔ رنگ باپ کی طرح زرد۔۔۔۔ کچھ نقش ماں پر تھے۔ باقی

معلوم نہیں کس کے تھے بہت ہنس مکھ تھی ساوک اس کو گود میں اٹھا کر لایا اور ہمارے پاس بیٹھ گیا اس کو اپنی بچی سے بے حد پیار تھا دفتر سے واپس آ کر وہ سارا وقت اس کے ساتھ کھیلتا رہتا میرا خیال ہے قریب قریب ہر ہفتے وہ اس کے لئے کھلونے لاتا تھا شیشیوں والی بڑی الماری تھی جو ان کھلونوں سے بھری ہوئی تھی۔

سردار زورآور سنگھ کے متعلق بات چھڑی تو ساوک نے اس کی بہت تعریف کی اس نے مجھ سے اور میری بیوی سے کہا "سردار زورآور میرا بہت پرانا دوست ہے ہم دونوں لنگوٹیے ہیں اس کے والد صاحب اور میرے والد صاحب اسی طرح لنگوٹیے تھے دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے پہلی جماعت سے لے کر اب تک ہم دونوں ہر روز ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں بعض اوقات تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سکول ہی میں پڑھ رہے ہیں۔"

سردار زورآور سنگھ مسکراتا رہا اس کے سر پر سکھوں کی بہت بڑی پگڑی تھی مگر مجھے اس کے ہوتے ہوئے اس کے سر کے حسخسی بال نظر آ رہے تھے اور مجھے اپنے سر پر اپنے بالوں کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

سردار زورآور سنگھ کے پیہم اصرار پر خورشید نے باجا منگا کر ہمیں گانا سنایا وہ کن سری تھی لیکن خورشید اس کے خاوند اور سردار زورآور سنگھ کی خاطر مجھے اس کے گانے کی مجبوراً تعریف کرنی پڑی میں نے صرف اتنا کہا "ماشاء اللہ آپ خوب گاتی ہیں"

سردار زورآور سنگھ نے بڑے زور سے تالی بجائی اور کہا "خورشید! آج تو تم نے کمال کر دیا ہے" پھر مجھ سے مخاطب ہوا "اس کو آفتاب موسیقی کا خطاب مل چکا ہے منٹو صاحب!"

میں نے تو کچھ نہ کہا لیکن میری بیوی نے پوچھا ''کب؟''

سردار زور آور سنگھ نے کہا ''اخبار کا وہ کٹنگ لاتا''

خورشید اخبار کا کٹنگ لائی کوئی خوشامدی قسم کا رپورٹر تھا جس نے چھ مہینے پہلے ایک پرائیویٹ محفل میں خورشید کا گانا سن کر اسے آفتاب موسیقی کا خطاب عطا فرمایا تھا میں یہ کٹنگ پڑھ کر مسکرایا اور شرارتاً خورشید سے کہا ''آپ کا یہ خطاب غلط ہے''

سردار زور آور سنگھ نے مجھ سے پوچھا ''کیوں؟''

میں نے پھر شرارتاً کہا ''عورت کے لیے آفتاب نہیں۔۔۔۔۔آفتابہ ہونا چاہیئے''

میرا مذاق سب کے سر پر سے گزر گیا میں نے خدا کا شکر کیا، کیونکہ یہ مذاق کرنے کے بعد میں نے فوراً ہی سوچا کہ اور کوئی نہیں تو سردار زور آور سنگھ ضرور اس کو سمجھ جائے گا، مگر وہ مسکرایا ''یہ اخبار والے ہمیشہ غلط بیان لکھتے ہیں آفتاب کی جگہ آفتابہ ہونا چاہیئے تھا آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔''

میں نے کچھ اور نہ کہا، اس لیے کہ مجھے احساس تھا کہ کہیں میرا مذاق فاش نہ ہو جائے۔

ساوک کچھ اور ہی خیالات میں غرق تھا اس کو سردار زور آور سنگھ کی دوستی کے واقعات یاد آ رہے تھے ''مسٹر منٹو! ایسا دوست مجھے کبھی نہیں ملے گا اس نے ہمیشہ میری مدد کی ہے ہمیشہ میرے ساتھ انتہائی خلوص برتا ہے پچھلے دنوں میں ہسپتال میں بیمار تھا اس نے نرسوں سے بڑھ کر میری خدمت کی میرے گھر بار کا خیال رکھا خورشید اکیلی گھبرا جاتی، مگر اس نے ہر طرح اس کی دلجوئی کی میری بچی کو گھنٹوں کھلاتا

رہا اس کے علاوہ میرے پاس بیٹھ کر کئی اخبار پڑھ کر سناتا رہا میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔''

یہ سن کر سردار زور آور سنگھ مسکرایا اور خورشید سے مخاطب ہوا ''خورشید آج تمہارا خاوند بہت سنٹی مینٹل ہو رہا ہے۔۔۔۔میں نے کیا کیا تھا جو یہ میری اتنی تعریف کر رہا ہے۔''

ساوک نے کہا'' بکواس نہ کرو۔۔۔۔۔۔تمہاری تعریف میں کر ہی نہیں سکتا میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری دوستی پر مجھے ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بچپن سے لے کر اب تک تم ایک سے رہے ہو۔ میرے ساتھ تمہارے سلوک میں کبھی فرق نہیں آیا''

میں نے سردار زور آور سنگھ کی طرف دیکھا وہ یہ تعریفی کلمات یوں سن رہا تھا جیسے ریڈیو سے خبریں جب ساوک بول چکا تو اس نے مجھ سے پوچھا ''تو خورشید کو پروگرام مل جائیں گے نا؟''

میں نے چونک کر جواب دیا ''جی۔۔۔۔میں کوشش کروں گا''

سردار زور آور سنگھ نے ذرا حیرت سے کہا ''کوشش؟ یعنی ان کے لئے پروگرام حاصل کرنے کے لیے آپ کو کوشش کرنی پڑے گی آپ بھی کمال کرتے ہیں۔۔۔۔۔کل صبح ان کو اپنے ساتھ لے جائیے میرا خیال ہے ان کا گانا سنتے ہی میوزک ڈائریکٹر اسی مہینے میں ان کو کم از کم دو پروگرام دے دے گا۔''

میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور کہا ''یقیناً!''

لیکن خورشید نے سردار زور آور سے کہا ''میں صبح نہیں جا سکتی بے بی صبح کو

میرے بغیر گھر میں نہیں رہ سکتی دوپہر کو البتہ جا سکتی ہوں"

سردار زورآور سنگھ مجھ سے مخاطب ہوا "منٹو صاحب! واقعی بچی اس کو صبح بہت تنگ کرتی ہے میں کسی روز خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لے آؤں گا"

خورشید کو دوپہر کے وقت ریڈیو اسٹیشن لانے کی نوبت نہ آئی کیونکہ میں نے دوسرے روز ہی ایک دم ارادہ کیا کہ میں دلی چھوڑ کر بمبئی چلا جاؤں گا، چنانچہ میں اس سے اگلے دن استعفٰی دے کر بمبئی روانہ ہو گیا میری بیوی مجھ سے کچھ دن بعد چلی آئی ہم مسز خورشٹ کا پڑیا اور سردار زورآور سنگھ کو بھول گئے۔

میں ایک فلم کمپنی میں ملازم تھا بیماری کے باعث اتفاق سے ایک روز میں وہاں نہ گیا دوسرے روز میں وہاں پہنچا تو گیٹ کیپر نے مجھے ایک کاغذ دیا کہ کل ایک صاحب آپ سے ملنے یہاں آئے تھے وہ یہ دے گئے ہیں میں نے رقعہ پڑھا سردار زورآور سنگھ کا تھا مختصر سی تحریر تھی، میں اور میری بیوی آپ سے ملنے یہاں آئے مگر آپ موجود نہیں تھے۔۔۔ ہم تاج ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔۔۔ اگر آپ تشریف لائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔۔۔ مسز منٹو کو ضرور ساتھ لائیے گا

کمرے کا نمبر وغیرہ درج تھا میں اور میری بیوی اسی شام ٹیکسی میں تاج ہوٹل گئے کمرہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی سردار زورآور سنگھ وہاں موجود تھا ہم جب اندر کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے کھچڑی بالوں میں کنگھی کر رہا تھا بڑے تپاک سے ملا میری بیوی اس کی بیوی کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، چنانچہ اس نے پوچھا "سردار صاحب! آپ کی مسز کہاں ہیں؟"

سردار زورآور سنگھ مسکرایا "ابھی آتی ہیں۔۔۔ باتھ روم میں ہیں"

اس نے یہ کہا اور دوسرے کمرے سے خورشٹ نمودار ہوئی میری بیوی اٹھ کر اس سے گلے ملی اور سب سے پہلا سوال اس سے یہ کیا ''بچی کیسی ہے خورشید!''

خورشٹ نے جواب دیا ''اچھی ہے''

''پھر میری بیوی نے اس سے پوچھا ساوک کہاں ہیں؟''

خورشٹ نے کوئی جواب نہ دیا جب وہ اور میری بیوی پاس پاس بیٹھ گئیں تو میں نے سردار زور آور سنگھ سے پوچھا ''سردار صاحب! آپ اپنی بیوی کو تو باہر نکالیے''

سردار زور آور سنگھ مسکرایا'' خورشٹ کی طرف دیکھ کر اس نے کہا'' خورشید میری بیوی کو باہر نکالو۔

خورشٹ میری بیوی سے مخاطب ہو کر مسکرائی ''میں نے سردار زور آور سنگھ سے شادی کر لی ہے ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں''

میری بیوی نے یہ سنا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے اٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ''چلئے سعادت صاحب!'' اور ہم کمرے سے باہر تھے خدا معلوم سردار زور آور سنگھ اور خورشٹ نے ہماری اس بدتمیزی کے متعلق کیا کہا ہو گا۔

28 جولائی 1950ء

☆☆☆☆☆☆

خوشیا

خوشیا سوچ رہا تھا

بنواری سے کالے تمباکو والا پان لے کر وہ اس کی دکان کے ساتھ اس سنگین چبوترے پر بیٹھا تھا جو دن کے وقت ٹائروں اور موٹروں کے مختلف پرزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موٹر کے پرزے اور ٹائر بیچنے والوں کی یہ دکان بند ہو جاتی ہے اور اس کا سنگین چبوترہ خوشیا کے لیے خالی ہو جاتا ہے۔

وہ کالے تمباکو والا پان آہستہ آہستہ چبا رہا تھا اور سوچ رہا تھا پان کی گاڑھی تمباکو ملی پیک اس کے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر اس کے منہ میں ادھر ادھر پھسل رہی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے خیال دانتوں تلے پس کر اس کی پیک میں گھل رہے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔

خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلا رہا تھا اور اس واقعہ پر غور کر رہا تھا جو اس کے ساتھ ابھی ابھی پیش آیا تھا یعنی آدھ گھنٹہ پہلے

وہ اس سنگین چبوترے پر حسب معمول بیٹھنے سے پہلے کھیت واڑی کی پانچویں گلی میں گیا تھا منگلور سے جو نئی چھوکری کانتا آئی تھی اس گلی کے نکڑ پر رہتی تھی خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے چنانچہ وہ اسی بات کا پتہ لگانے کے لیے وہاں گیا تھا۔

کانتا کی کھولی کا دروازہ اس نے کھٹکھٹایا اندر سے آواز آئی ''کون ہے؟'' اس

پر خوشیا نے کہا ''میں خوشیا''

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا خوشیا اندر داخل ہوا جب کانتا نے دروازہ اندر سے بند کیا تو خوشیا نے مڑ کر دیکھا اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے کانتا کو بالکل ننگا دیکھا بالکل ننگا ہی سمجھو کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تولیے سے چھپائے ہوئے تھی چھپائے ہوئے بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ چھپانے کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔

'' کہو خوشیا کیسے آئے؟۔۔۔۔ میں بس اب نہانے والی ہی تھی۔ بیٹھو۔۔۔۔ بیٹھو۔۔۔۔ باہر والے سے اپنے لیے چائے کے لیے تو کہہ آئے ہوتے۔۔۔۔ جانتے تو ہو وہ موا راما یہاں سے بھاگ گیا ہے۔''

خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا بہت گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے؟ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دوچار ہو گئی تھیں اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا '' جاؤ۔۔۔ جاؤ تم نہا لو'' پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی '' پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟۔۔۔۔ اندر سے کہہ دیا ہوتا میں پھر آ جاتا۔۔۔۔ لیکن جاؤ۔۔۔۔ تم نہا لو''

کانتا مسکرائی '' جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو۔۔۔۔''

کانتا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی اس وقت

بھی کانتا کا ننگا جسم موسم کے پتلے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔

اس کا جسم خوبصورت تھا پہلی مرتبہ خوشیا کو معلوم ہوا تھا کہ جسم بیچنے والی عورتیں بھی ایسا سڈول بدل رکھتی ہیں اس کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی یہ سب سے زیادہ تعجب اسے اس بات پر ہوا تھا کہ ننگ دھڑنگ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس کو لاج تک نہ آئی کیوں؟

اس کا جواب کانتا نے یہ دیا تھا ''جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو کیا ہرج ہے''

کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے وہ اس کا دلال تھا اس لحاظ سے وہ اسی کا تھا۔۔۔۔۔۔پر یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے ننگی ہو جاتی کوئی خاص بات تھی کانتا کے الفاظ میں خوشیا کوئی اور ہی مطلب کرید رہا تھا۔

یہ مطلب بیک وقت اس قدر صاف اور اس قدر مبہم تھا کہ خوشیا کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا جو ڈھولکی پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنا ہوا تھا اس کی لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پروا کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اس نے اس کے سانولے سلونے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں مگر اس کا ایک رواں تک بھی نہ کپکپایا تھا۔ بس سانولے پتھر کی مورتی کے مانند کھڑی رہی جو احساس سے عاری ہوئی۔

بھئی ایک مرد اس کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔مرد جس کی نگاہیں کپڑوں میں

بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پرماتما جانے خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور۔۔۔۔۔اور اس کی آنکھیں ایسا سمجھ لو کہ ابھی لانڈری سے دھل کر آئی ہیں۔۔۔۔اس کو تھوڑی سی لاج تو آنی چاہیے تھی ذرا سی سرخی تو اس کے دیدوں میں پیدا ہونی چاہیے مان لیا کسبی تھی پر کسبیاں یوں ننگی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں۔

دس برس اس کو دلالی کرتے ہو گئے تھے اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرانے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا مثال کے طور پر اسے یہ معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھوکری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنا کر رہتی ہے اس لیے اچھوت کنیا کا ریکارڈ ''کاہے کرتا مورکھ پیار، پیار، پیار'' اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بجایا کرتی ہے کہ اسے اشوک مارے بہت بری طرح عشق ہے کئی منچلے لونڈے اشوک مارے اس کی ملاقات کرانے کا جھانسہ دے کر اپنا الو سیدھا کر چکے تھے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ داور میں جو پنجابن رہتی ہے صرف اس لیے کوٹ پتلون پہنتی ہے کہ اس کے ایک یار نے اس سے کہا تھا کہ تیری ٹانگیں تو بالکل اس انگریز ایکٹریس کی طرح ہیں جس نے ''مراکو عرف خون تمنا'' میں کام کیا تھا یہ فلم اس نے کئی بار دیکھا اور جب اس کے یار نے کہا کہ مارلین ڈیٹرچ اس لیے پتلون پہنتی ہے کہ اس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں اور ان ٹانگوں کا اس نے دو لاکھ کا بیمہ کرا رکھا ہے تو اس نے بھی پتلون پہننا شروع کر دی جو اس کے چوتڑوں میں بہت پھنس کر آتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ''مزگاؤں'' والی دکھشنی چھوکری صرف اس لیے کالج کے خوبصورت لونڈوں کو پھانستی ہے کہ اسے

ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی اس لیے کہ بانجھ ہے اور اس کالی مدراسن کی بابت جو ہر وقت کانوں میں ہیرے کی ''بوٹیاں'' پہنے رہتی ہے اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہوگا اور وہ ان دواؤں پر بیکار روپیہ برباد کر رہی ہے جو آئے دن خریدتی رہتی ہے۔

اس کو ان تمام چھوکریوں کا اندر باہر کا حال معلوم تھا جو اس کے حلقے میں شامل تھیں مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کانتا ماری جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا اس کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائے گی اور اس کو زندگی کے سب سے بڑے تعجب سے دو چار کرائے گی۔

سوچتے سوچتے اس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان ننھے ننھے ریزوں کو چبا سکتا تھا جو اس کے دانتوں کی ریخوں میں سے ادھر ادھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔

اس کے تنگ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہے۔۔۔۔ اس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پہنچتا تھا۔ جب وہ کانتا کے ننگے جسم کو اپنے تصور میں لاتا تھا اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا اپمان ہوا ہے۔

ایک دم اس نے اپنے دل میں کہا'' بھئی یہ اپمان نہیں ہے تو کیا ہے۔۔۔۔ یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم خوشیا ہی تو ہو۔۔۔۔۔۔ خوشیا نہ ہوا،

سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے۔۔۔اور کیا؟''

اب اسے یقین ہونے لگا کہ سچ مچ اس کی ہتک ہوئی ہے وہ مرد تھا اور اس کو اس بات کی غیر محسوس طریق پر توقع تھی کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری اس کو مرد ہی سمجھیں گی اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پردہ قائم رکھیں گی جو ایک مدت سے چلا آرہا ہے وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لیے کانتا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب مکان تبدیل کر رہی ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ کانتا کے پاس اس کا جانا یکسر بونس سے متعلق تھا اگر خوشیا کانتا کی بابت سوچتا کہ جب وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو وہ اندر کیا کر رہی ہو گی تو اس کے تصور میں زیادہ سے زیادہ اتنی باتیں آسکتی تھیں۔

سر پر پٹی باندھے لیٹے رہی ہو گی

بلے کے بالوں میں سے پسو نکال رہی ہو گی

اس پوڈر سے اپنی بغلوں کے بال اڑا رہی ہو گی جو اتنی باس مارتا تھا کہ خوشیا کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی

پلنگ پر اکیلی بیٹھی تاش پھیلائے پیشنس کھیلنے میں مشغول ہو گی

بس اتنی چیزیں تھیں جو اس کے ذہن میں آتیں گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی اس لیے اس بات کا خیال ہی نہیں آسکتا تھا پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا وہ وہ کام سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانتا۔۔۔یعنی کپڑے پہننے والی کانتا۔۔۔مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا اس کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہو گئی۔۔۔۔بالکل ننگی ہی سمجھو یہ کیونکہ ایک چھوٹا سا تولیہ سب کچھ تو

چھپا نہیں سکتا خوشیا کو یہ نظارہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چھلکا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا اچھل کر اس کے سامنے آ گرا ہے نہیں اسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا جیسے۔۔۔۔۔ جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دور کر دیتا مگر یہاں مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ اس لونڈیا نے مسکرا کر کہا تھا ''جب تم نے کہا، خوشیا ہے، تو میں نے سوچا اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو'' یہ بات اسے کھائے جا رہی تھی۔

''سالی مسکرا رہی تھی''۔۔۔۔۔۔ وہ بار بار بڑبڑاتا جس طرح کانتا ننگی تھی اسی طرح اس کی مسکراہٹ خوشیا کو ننگی نظر آئی تھی یہ مسکراہٹ ہی نہیں، اسے کانتا کا جسم بھی اس حد تک نظر آیا تھا گویا اس پر رندا پھیرا ہوا ہے۔

اسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے جب پڑوس کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی ''خوشیا بیٹا! جا دوڑ کے جا، یہ بالٹی پانی سے بھر لا'' جب وہ بالٹی بھر کے لایا کرتا تھا تو وہ دھوتی سے بنائے ہوئے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی ''اندر آ کے یہاں میرے پاس رکھ دے میں نے منہ پر صابن ملا ہوا ہے مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا'' وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر بالٹی اس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا اس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی ننگی عورت اسے نظر آیا کرتی تھی مگر اس کے دل میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بھئی میں اس وقت بچہ تھا بالکل بھولا بھالا بچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے بچوں سے کون پردہ کرتا ہے مگر اب تو میں پورا مرد ہوں میری عمر اس وقت اٹھائیس برس کے قریب ہے اور اٹھائیس برس کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی

عورت بھی ننگی کھڑی نہیں ہوتی۔

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا؟ کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک ننگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا۔ لیکن چور نگاہوں سے کیا اس نے کانتا کی ان چیزوں کا جائزہ نہیں لیا تھا جو روزانہ استعمال کے باوجود اصلی حالت پر قائم تھیں اور کیا تعجب کے مرد ہوتے ہونے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں کانتا بالکل مہنگی نہیں اور دسہرے کے روز بنک کا وہ منشی جو دو روپے کی رعایت نہ ملنے پر واپس چلا گیا تھا بالکل گدھا تھا اور۔۔۔۔ان کے سب کے اوپر، کیا ایک لمحے کے لیے اس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ پیدا نہیں ہو گیا تھا اور اس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی جس سے اس کی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں؟ پھر کیا وجہ تھی کہ منگلور کی اس سانولی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف۔۔۔۔۔صرف خوشیا سمجھ کر اس کو اپنا سب کچھ دیکھنے دیا؟

اس نے غصے میں آ کر پان کی گاڑھی پیک تھوک دی جس نے فٹ پاتھ پر کئی بیل بوٹے بنا دیئے۔ پیک تھوک کر وہ اٹھا اور ٹرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر میں اس نے نہا دھو کر نئی دھوتی پہنی جس بلڈنگ میں رہتا تھا اس کی ایک دکان میں سیلون تھا اس کے اندر جا کر اس نے آئینے کے سامنے بالوں میں کنگھی کی پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا تو کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی سنجیدگی سے اس نے ڈاڑھی مونڈنے کے لیے حجام سے کہا آج چونکہ دوسری مرتبہ وہ ڈاڑھی منڈوا رہا تھا اس لیے حجام نے کہا "ارے بھئی خوشیا بھول گئے کیا؟ صبح میں نے ہی تو تمہاری

ڈاڑھی مونڈی تھی اس پر خوشیا نے بڑی متانت سے ڈاڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کھونٹی اچھی طرح نہیں نکلی ۔۔۔

اچھی کھونٹی نکلوا کر اور چہرے پر پوڈر ملوا کر وہ سیلون سے باہر نکلا سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا بمبئے کے مخصوص انداز میں اس نے "چھی چھی" کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انگلی کے اشارے سے اسے ٹیکسی لانے کے لیے کہا۔

جب وہ ٹیکسی پر بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے مڑ کر اس سے پوچھا "کہاں جانا ہے صاحب!"

ان چار لفظوں نے خاص طور پر "صاحب" نے خوشیا کو بہت مسرور کیا مسکرا کر اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں جواب دیا "بتائیں گے پہلے تم" پسیرا ہاؤس کی طرف چلو ۔۔۔ لیمنگٹن روڈ سے ہوتے ہوئے ۔۔۔ سمجھے

ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے کی طرف دبا دیا ٹن ٹن ہوئی اور ٹیکسی نے لیمنگٹن روڈ کا رخ کیا لیمنگٹن روڈ کا جب آخری سرا آ گیا تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی "بائیں طرف موڑ لو۔"

ٹیکسی بائیں طرف مڑ گئی ابھی ڈرائیور نے گیئر بھی نہ بدلا تھا کہ خوشیا نے کہا "یہ سامنے والے کھمبے کے پاس روک لینا ذرا" ڈرائیور نے عین کھمبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی خوشیا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ایک پان والے کی دکان کی طرف بڑھا یہاں سے اس نے ایک پان لیا اور اس آدمی سے جو کہ دکان کے پاس کھڑا تھا چند باتیں کیں اور اسے اپنے ساتھ ٹیکسی پر بٹھا کر ڈرائیور سے کہا "سیدھے لے

چلو!''

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی خوشیا نے جدھر اشارہ کیا ڈرائیور نے ادھر ہینڈل پھیر دیا مختلف پر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی جس میں آمدورفت بہت کم تھی کچھ لوگ سڑک پر بستر جمائے لیٹے تھے ان میں سے کچھ بڑے اطمینان سے تمپی کرا رہے تھے جب ٹیکسی ان تمپی کرانے والوں کے آگے نکل گئی اور ایک کاٹھ کے بنگلہ نما مکان کے پاس پہنچی تو خوشیا نے ڈرائیور کو ٹھہرنے کے لیے کہا ''بس اب یہاں رک جاؤ'' ٹیکسی ٹھہر گئی تو خوشیا نے اس آدمی سے جس کو وہ پان والے کی دکان سے اپنے ساتھ لایا تھا آہستہ سے کہا'' جاؤ میں یہاں انتظار کرتا ہوں''

وہ آدمی بیوقوفوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا ٹیکسی سے باہر نکلا اور سامنے چوبی مکان میں داخل ہوگیا۔

خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک دو کش لے کر باہر سڑک پر پھینک دی وہ بہت مضطرب تھا اس لیے اسے ایسا لگا کہ ٹیکسی کا انجن بند نہیں ہوا اس کے سینے میں چونکہ پھڑ پھڑاہٹ سی ہو رہی تھی اس لیے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پٹرول چھوڑ رکھا ہے چنانچہ اس نے تیزی سے کہا''یوں بیکار انجن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھا لوگے؟''

ڈرائیور نے مڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا ''سیٹھ انجن تو بند ہے''

جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا اور اس

نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیئے پھر ایکا ایکی سر پر وہ کشتی نما کالی ٹوپی پہن کر جو اب تک اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اس نے ڈرائیور کا شانہ ہلایا اور کہا "دیکھو ابھی ایک چھوکری آئے گی جونہی اندر داخل ہو تم موٹر چلا دینا، مجھے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے معاملہ ایسا ویسا نہیں۔"

اتنے میں سامنے سے چوبی مکان سے دو آدمی باہر نکلے آگے آگے خوشیا کا دوست تھا اور اس کے پیچھے پیچھے کانتا جس نے شوخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

خوشیا جھٹ سے اس طرف کو سرک گیا جدھر اندھیرا تھا خوشیا کے دوست نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کانتا کو اندر داخل کر کے دروازہ بند کر دیا فوراً ہی کانتا کی حیرت بھری آواز سنائی دی جو چیخ سے ملتی جلتی تھی "خوشیا تم" ۔۔۔۔ہاں میں لیکن تمہیں روپے مل گئے نا؟ خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی "دیکھو ڈرائیور جوہو لے چلو"

ڈرائیور نے سلف دبایا انجن پھڑ پھڑانا شروع ہوا، وہ بات جو کانتا نے کہی سنائی نہ دے سکی ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ بڑھی اور خوشیا کے دوست کو سڑک کے بیچ حیرت زدہ چھوڑ کر اس نیم روشن گلی میں غائب ہو گئی۔

اس کے بعد کسی نے خوشیا کو موٹروں کی دکان کے سنگین چبوترے پر نہیں دیکھا۔

☆☆☆☆☆☆

خوشبودار تیل

"آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔۔اچھا بھلا ہوں۔۔۔مجھے کیا تکلیف تھی؟"

"تکلیف تو آپ کو کبھی نہیں ہوئی۔۔۔۔ایک فقط میں ہوں جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف یا عارضہ چمٹا رہتا ہے۔"

"یہ تمہاری بداحتیاطیوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔۔۔۔ورنہ آدمی کو کم از کم سال بھر میں دس مہینے تو تندرست رہنا چاہیے۔"

"آپ تو بارہ مہینے تندرست رہتے ہیں۔۔۔۔۔ابھی پچھلے دنوں دو مہینے ہسپتال میں رہے۔۔۔۔میرا خیال ہے اب پھر آپ کا وہیں جانے کا ارادہ ہو رہا ہے۔"

"ہسپتال میں جانے کا ارادہ کون کرتا ہے"

"آپ ایسے آدمی۔۔۔۔۔اور کس کا دماغ پھرا ہے کہ وہ بیمار ہو کر وہاں پڑ جائے اور اپنے عزیزوں کی جان کا عذاب بن جائے"

"تو گویا، میں اپنے سب رشتہ داروں کی جان کا عذاب بنا بیٹھا ہوں۔۔۔۔۔میرا تو یہ نظریہ ہے کہ ہر رشتے دار خود جان کا بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔"

"آپ کو تو رشتہ داروں کی کوئی پرواہ نہیں۔۔۔۔۔۔حالانکہ وہی ہمیشہ آپ کے آڑے وقت میں کام آتے رہتے ہیں"

"کون سے آڑے وقت میں کام آتے رہے ہیں"

"پچھلے برس جب آپ بیمار ہوئے۔۔۔۔تو کس نے آپ کے علاج پر روپیہ خرچ کیا تھا۔"

"مجھے معلوم نہیں۔۔۔۔میرا خیال ہے تمہیں نے کیا ہوگا"

"آپ کا حافظہ بھی کمزور ہو گیا ہے۔۔۔۔یا آپ جان بوجھ کر اپنے رشتہ داروں کی مدد کو فراموش کر رہے ہیں"

"میں اپنے کسی رشتہ دار کی امداد کا محتاج نہیں رہا اور نہ رہوں گا۔۔۔۔اچھا خاصہ کما لیتا ہوں۔۔۔کھاتا ہوں۔۔۔۔پیتا ہوں"

جتنا کھا سکتا ہوں کھاتا ہوں۔۔۔۔جتنی پی سکتا ہوں پیتا ہوں

"آپ کو معلوم نہیں کہ پینا حرام ہے"

"معلوم ہے۔۔۔۔آج کل تو جینا بھی حرام ہے۔۔۔۔مگر چچا غالب کہہ گئے ہیں۔"

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

"یہ چچا غالب کون تھے۔۔۔۔زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔۔۔۔میں نے تو آج پہلی مرتبہ ان کا نام سنا ہے"

"وہ سب کے چچا تھے۔۔۔۔بہت بڑے شاعر"

"شاعروں پر خدا کی لعنت۔۔۔۔بیڑا غرق کرتے ہیں لوگوں کا۔"

"بیگم یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔۔ان ہی کے دم سے تو زندگی کی رونق قائم

ہے۔۔۔۔۔۔یہ نہ ہوں تو چاروں طرف خشکی ہی خشکی نظر آئے۔۔۔۔یہ لوگ پھول ہوتے ہیں۔۔۔۔صاف و شفاف پانی کے دھارے ہوتے ہیں جو انسانوں کے ذہن کی آبیاری کرتے ہیں۔۔۔۔یہ نہ ہوں تو ہماری زندگی بے نمک ہو جائے۔''

''بے نمک ہو جائے۔۔۔۔کیسے بے نمک ہو جائے۔۔۔۔۔۔یہاں نمک کی کوئی کمی ہے۔۔۔۔جتنا چاہے لے لیجئے۔۔۔اور وہ بھی سستے داموں پر۔۔۔ان لوگوں کو جنہیں آپ شاعر کہتے ہیں۔۔۔میں تو چاہتی ہوں کہ ان کو کھیوڑے کی کسی کان میں زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ وہ بھی نمک بن جائے اور آپ ان کو چاٹتے رہیں۔''

''یہ آج تم نے کیسے پر پرزے نکال لیے''

''پر پرزوں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔۔۔۔میں تو اتنا جانتی ہوں کہ جب آپ سے کوئی معاملے کی بات کرے تو آپ بھنا جاتے ہیں۔۔۔۔۔معلوم نہیں کیوں۔۔۔۔میں نے کبھی آپ کی ذات پر تو حملہ نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ہمیشہ سیدھی سادی بات کر دی۔''

''تمہاری سیدھی باتیں ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔تمہیں ہو کیا گیا ہے۔۔۔۔دو برس سے تم ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہو۔''

''ان برسوں میں مجھے آپ نے کیا سکھ پہنچایا ہے''

''بھئی معاف کرو مجھے۔۔۔۔میں سونا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ساری رات

ہی جاگتا رہا ہوں۔"

"کیا تکلیف تھی آپ کو۔۔۔مجھے بھی تو کچھ اس کا علم ہو"

"تمہیں اگر اس کا علم بھی ہو جائے۔۔۔تو اس کا مداوا کیا کرو گی"

"میں تو سخت نا اہل ہوں۔۔۔۔کسی کام کی بھی نہیں۔۔۔بس ایک صرف آپ ہیں جو دنیا کی ساری حکمت جانتے ہیں"

"بھئی میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔۔۔لیکن عورت ذات ہمیشہ خود کو افضل سمجھتی ہے۔۔۔حالانکہ وہ عام طور پر کم عقل ہوتی ہے۔"

"دیکھئے آپ طعن طروز پر اتر آئے۔۔۔۔یہ کہاں کی عقلمندی ہے"

"میں معافی چاہتا ہوں۔۔۔تم نے چونکہ مجھے اکسایا تو یہ لفظ میری زبان سے نکل گئے ورنہ تم جانتی ہو کہ میں گفتگو کے معاملے میں بڑا محتاط رہتا ہوں"

"جی ہاں۔۔۔رہتے ہوں گے۔۔۔۔مجھ سے تو آپ نے ہمیشہ نوکرانیوں کا سلوک کیا۔"

"یہ سراسر بہتان ہے۔۔۔۔۔تم تو میری ملکہ ہو"

"آپ بادشاہ کیسے بن بیٹھے۔۔۔۔آپ کی سلطنت کہاں ہے"

"میری سلطنت یہ میرا گھر ہے"

"اور آپ یہاں کے شہنشاہ ہیں"

"اس میں کیا شک ہے۔۔۔۔تم نے طنزاً کہا ہے لیکن حقیقت میں اس سلطنت کا حکمران میں ہی ہوں"

"حکمران تو میں ہوں۔۔۔اس لیے کہ اس گھر کا سارا بندوبست مجھے ہی کرنا

پڑتا ہے۔۔۔سب دیکھ بھال مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔''

''تم میری ملکہ ہو۔۔۔۔اور ملکہ کو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہنا چاہیے۔۔۔اپنی ملکیت کا دھیان رکھنا چاہیے۔۔۔۔تم بھی یہاں کی حکمران ہو، اس لیے کہ تم اس کا نظم برقرار رکھتی ہو۔۔۔۔نوکروں کی دیکھ بھال وغیرہ، اچھے سے اچھا کھانا پکوانا سارا دن پلنگ پر لیٹی آرام کرتی رہتی ہو۔''

''میں تو جو آرام کرتی ہو، سو کرتی ہوں۔۔۔۔پر آپ مجھے یہ بتائیے''

''کیا؟''

''کچھ نہیں۔۔۔آپ اس گھر کے حکمران ہیں۔۔۔۔اب میں آپ سے کیا کہوں''

''تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، بلا خوف وخطر کہو۔۔۔۔تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے''

''کہیں جہاں پناہ بگڑ نہ جائیں''

''مذاق برطرف کرو، یہ بتاؤ تم کہنا کیا چاہتی ہو''

''کہنا تو میں بہت کچھ چاہتی ہوں۔۔۔۔مگر آپ میں ٹھنڈے دل سے سننے کا مادہ ہی کہاں ہے۔''

''مادہ تو تم ہو۔۔۔میں نر ہوں''

''اب آپ نے واہیات قسم کی گفتگو شروع کردی''

''کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایسی باتیں بھی کر لینی چاہئیں۔۔۔۔۔اس لیے کہ طبیعت میں انقباض پیدا نہ ہو''

"آپ کی طبیعت میں کئی دنوں سے انقباض ہے۔۔۔۔۔۔سیدھے منہ کوئی بات ہی نہیں کرتے۔"

"میں تو چنگا بھلا ہوں۔۔۔۔۔مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ تمہارے نخس نے بہت اونچی پروازکی ہو۔۔۔اگر ایسا ہی ہے تو کوئی مسہل تجویز کر دو تا کہ تمہاری تشفی ہو جائے۔"

"میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔۔صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں"

"بھئی پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے۔۔۔۔۔مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو"

"آپ تو ذرا سی بات پر تنگ آجاتے ہیں"

"یہ ذرا سی بات ہے کہ تم نے مجھ سے اتنی بکواس کرائی۔۔۔۔۔۔یہی وقت میں اور کہیں صرف کرتا تو کچھ فائدہ بھی ہوتا"

"کیا فائدہ ہوتا۔۔۔۔۔۔بڑے لاکھوں کما لیے ہیں آپ نے بغیر اس بکواس کے"

"کمائے تو ہیں۔۔۔۔لیکن تم یہ بتاؤ کہ کہنا کیا چاہتی ہو"

"میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ جب سے نئی نوکرانی آئی ہے، آپ کی طبیعت کیوں خراب رہنے لگی ہے۔"

"نئی نوکرانی کو کوئی بیماری ہے"

"جی نہیں۔۔۔۔بیماری تو نہیں۔۔۔۔لیکن میں نے اسے آج رخصت کر دیا ہے"

’’کیوں۔۔۔۔۔۔وہ تو بڑی اچھی تھی‘‘

’’آپ کی نظروں میں ہو گی۔۔۔۔میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ بیس روپے ماہوار میں اتنے اچھے کپڑے کیسے پہن سکتی تھی۔۔۔بالوں میں خوشبودار تیل کہاں سے ڈالتی تھی۔‘‘

’’مجھے کیا معلوم‘‘

’’آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔۔۔۔آپ کے بالوں سے بھی اسی تیل کی خوشبو آتی ہے۔۔۔۔۔معلوم نہیں یہ تیل آپ نے کہاں چھپا رکھا ہے۔‘‘

☆☆☆☆☆☆

دس روپے

وہ گلی کی اس نکڑ پر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اس کی ماں اسے چالی (بڑا مکان جس میں کوئی منزلیں اور کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں) میں ڈھونڈ رہی تھی کشوری کو اپنی کھولی میں بٹھا کر اور باہر والے سے کافی ملی چائے لانے کے لئے کہہ کر وہ اس چالی کی تینوں منزلوں میں اپنی بیٹی کو تلاش کر چکی تھی مگر جانے وہ کہاں مر گئی تھی سنڈاس کے پاس جا کر بھی اس نے آواز دی ''اے سرتیا۔۔۔سرتیا!'' مگر وہ تو چالی میں تھی ہی نہیں اور جیسا کہ اس کی ماں سمجھ رہی تھی اب اسے پیچش کی شکایت بھی نہیں تھی دوا پئے بغیر اس کو آرام آ چکا تھا اور وہ باہر گلی کے اس نکڑ پر جہاں کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا ہے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے کھیل رہی تھی اور ہر قسم کے فکر و تردد سے آزاد تھی۔

اس کی ماں بہت متفکر تھی کشوری اندر کھولی میں بیٹھا تھا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا وہ سیٹھ باہر بڑے بازار میں موٹر لیے کھڑے تھے لیکن سرتیا کہیں غائب ہی ہو گئی تھی موٹر والے سیٹھ ہر روز تو آتے نہیں، یہ تو کشوری کی مہربانی ہے کہ مہینے میں ایک دو بار موٹی آسامی لے آتا ہے ورنہ ایسے گندے محلے میں جہاں پان کی پیکوں اور جلی ہوئی بیڑیوں کی ملی جلی بو سے کشوری گھبراتا ہے سیٹھ لوگ کیسے آ سکتے ہیں کشوری چونکہ ہوشیار ہے اس لیے وہ کسی آدمی کو مکان پر نہیں لاتا بلکہ سرتیا کو کپڑے وپڑے پہنا کر باہر لے جایا کرتا ہے اور ان لوگوں سے کہہ دیتا ہے کہ صاحب آج کل زمانہ بڑا نازک ہے پولیس کے سپاہی ہر وقت گھات میں لگے رہتے ہیں اب

تک دو سو دھندا کرنے والی چھوکریاں پکڑی جا چکی ہیں کورٹ میں میرا ابھی ایک کیس چل رہا ہے اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

سرتیا کی ماں کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ نیچے اتری تو سیڑھیوں کے پاس رام دئی بیٹھی بیڑیوں کے پتے کاٹتی رہی تھی اس سے سرتیا کی ماں نے پوچھا تو نے سرتیا کو کہیں دیکھا ہے جانے کہاں مرگئی ہے بس آج مجھے مل جائے وہ چار چوٹ کی ماروں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے۔۔۔۔لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے پر سارا دن لونڈوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی رہتی ہے۔

رام دئی بیڑیوں کے پتے کاٹ رہی اور اس نے سرتیا کی ماں کو جواب نہ دیا دراصل رام دئی سے سرتیا کی ماں نے خاص طور پر کچھ پوچھا ہی نہیں تھا وہ یونہی بڑبڑاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی جیسا کہ اس کا عام دستور تھا ہر دوسرے تیسرے دن اسے سرتیا کو ڈھونڈنا پڑتا تھا اور رام دئی کو جو کہ سارا دن سیڑھیوں کے پاس پٹاری سامنے رکھے بیڑیوں پر لال اور سفید دھاگے لپیٹتی رہتی تھی مخاطب کر کے یہی الفاظ دوہرایا کرتی تھی۔

ایک اور بات وہ چالی کی ساری عورتوں سے کہا کرتی تھی ''میں تو اپنی سرتیا کا کسی بابو سے بیاہ کروں گی اس لیے تو اس سے کہتی ہوں کہ کچھ پڑھ لکھ لے''

یہاں پاس ہی ایک سکول منسی پالٹی ''میونسپلٹی'' نے کھولا ہے، سوچتی ہوں اس میں سرتیا کو داخل کرا دوں، بہن اس کے پتا کو بڑا شوق تھا کہ میری لڑکی پڑھی لکھی ہو۔۔۔۔اس کے بعد وہ ایک لمبی آہ بھر کر عام طور پر اپنے مرے ہوئے شوہر کا قصہ چھیڑ دیتی تھی جو چالی کی ہر عورت کو زبانی یاد تھا رام دئی سے اگر آپ پوچھیں کہ

اچھا جب سرتیا کے باپ کو جو ریلوائی میں کام کرتا تھا بڑے صاحب نے گالی دی تو کیا ہوا تو رام دائی فوراً آپ کو بتا دے گی کہ سرتیا کے باپ کے منہ میں جھاگ بھر آیا اور وہ صاحب سے کہنے لگا ”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں، سرکار کا نوکر ہوں تم مجھ پر رعب نہیں جما سکتے دیکھو اگر پھر گالی دی تو یہ دونوں جبڑے حلق کے اندر کر دوں گا“ بس پھر کیا تھا صاحب تاؤ میں آ گیا اور اس نے ایک اور گالی سنا دی اس پر سرتیا کے باپ نے غصے میں آ کر صاحب کی گردن پر ایسی دھول جمائی کہ اس کا ٹوپ دس گز پرے جا گرا اور اس کو دن میں تارے نظر آ گئے پھر بھی وہ بڑا آدمی تھا آگے بڑھ کر اس نے سرتیا کے باپ کے پیٹ میں اپنے فوجی بوٹ سے اس زور کی ٹھوکر ماری کہ اس کی تلی پھٹ گئی اور وہیں لائنوں کے پاس گر کر اس نے جان دے دی سرکار نے صاحب پر مقدمہ چلایا اور پورے پانچ سو روپے سرتیا کی ماں کو اس سے دلوائے مگر قسمت بری تھی اس کو کھیلنے کی چاٹ پڑ گئی اور پانچ مہینے کے اندر اندر سارا روپیہ برباد ہو گیا۔

سرتیا کی ماں کی زبان پر ہر وقت یہ کہانی جاری رہتی تھی لیکن کسی کو یقین نہ تھا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ، چالی میں سے کسی آدمی کو بھی سرتیا کی ماں سے ہمدردی نہ تھی شاید اس لیے کہ وہ سب کے سب خود ہمدردی کے قابل تھے کوئی کسی کا دوست نہیں تھا اس بلڈنگ میں اکثر آدمی ایسے رہتے تھے جو دن کو سوتے تھے اور رات کو جاگتے تھے کیونکہ انہیں کو پاس والی مل میں کام پر جانا ہوتا تھا اس بلڈنگ میں سب آدمی بالکل پاس پاس رہتے تھے لیکن کسی کو ایک دوسرے سے دلچسپی نہ تھی۔

چالی میں قریب قریب سب لوگ جانتے تھے کہ سرتیا کی ماں اپنی جوان بیٹی

سے پیشہ کراتی ہے لیکن چونکہ وہ کسی کے ساتھ اچھا برا سلوک کرنے کے عادی ہی نہ تھے اس لیے سرتیا کی ماں کو کوئی جھٹلانے کی کوشش نہ کرتا تھا جب وہ کہا کرتی تھی میری بیٹی کو تو دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں البتہ ایک روز صبح سویرے نل کے پاس جب تکا رام نے سرتیا کو چھیڑا تھا تو سرتیا کی ماں بہت چیخی چلائی تھی اس موٹے گنجے کو تو کیوں سنبھال کے نہیں رکھتی پرماتما کرے دونوں آنکھوں سے اندھا ہو جائے جن سے اس نے میری کنواری بیٹی کی طرف بری نظروں سے دیکھا۔۔۔۔سچ کہتی ہوں ایک روز ایسا فساد ہوگا کہ اس تیری سوغات کا مارے جوتوں کے سر پلپلا کر دوں گی۔۔۔۔باہر جو چاہے جھک مارے پر یہاں اسے بھلے مانسوں کی طرح رہنا ہوگا سنا!

اور یہ سن کر تکا رام کی بھینگی بیوی دھوتی باندھتے باہر نکل آئی تھی ''خبردار موٹی چڑیل جو تو نے ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا۔۔۔۔یہ تیری دیوی تو ہوٹل کے چھوکروں سے بھی آنکھ مچولی کھیلتی ہے اور تو کیا ہم سب کو اندھا سمجھتی ہے کیا ہم سب جانتے نہیں کہ تیرے گھر میں نت نئے بابو کس لیے آتے ہیں اور یہ تیری سرتیا آئے دن بن سنور کر باہر کیوں جاتی ہے۔۔۔۔بڑی آئی عزت آبرو والی جا جا دور دفا ہو یہاں سے۔''

تکا رام کی بھینگی بیوی کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں لیکن یہ خاص طور پر سب لوگوں کو معلوم تھی کہ گھاسلیٹ والا، مٹی کا تیل بیچنے والا، تیل دینے کے لیے آتا ہے تو وہ اسے اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا کرتی ہے چنانچہ سرتیا کی ماں نے اس خاص بات پر بہت زور دیا وہ بار بار نفرت بھرے لہجے میں اس سے کہتی ''اور وہ تیرا

یار گھا نسلیٹ والا۔۔۔۔۔۔دو دو گھنٹے اسے کھولی میں بٹھا کر تو اس کا گھا نسلیٹ سونگھتی رہتی ہے؟‘‘

تکا رام کی بیوی سے سرتیا کی ماں کی بول چال زیادہ دیر تک بند نہ رہی تھی، کیونکہ ایک روز سرتیا کی ماں نے رات کو اپنی پڑوسن کو گھپ اندھیرے میں کسی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے پکڑ لیا تھا اور دوسرے ہی روز تکا رام کی بیوی نے جب وہ رات کو پائے دھونی کی طرف سے آ رہی تھی سرتیا کو ایک ’’جنٹلمین آدمی‘‘ کے ساتھ موٹر میں بیٹھے دیکھ لیا چنانچہ ان دونوں کا آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تھا اس لیے سرتیا کی ماں نے تکا رام کی بیوی سے پوچھا ’’تو نے کہیں سرتیا کو نہیں دیکھا؟‘‘

تکا رام کی بیوی نے بھینگی آنکھ سے گلی کے نکڑ کی طرف دیکھا ’’وہاں گھوڑے کے پاس پٹواریوں کی لونڈیا سے کھیل رہی ہے‘‘ پھر اس نے دھیمی آواز کر کے اس سے کہا ’’ابھی ابھی کشوری اوپر گیا تھا کیا تجھ سے ملا؟‘‘

سرتیا کی ماں نے ادھر ادھر دیکھ کر ہولے سے کہا ’’اوپر بٹھا آئی ہوں پر یہ سرتیا ہمیشہ وقت پر کہیں غائب ہو جاتی ہے کچھ سوچتی نہیں، کچھ سمجھتی نہیں، بس دن بھر کھیل کود چاہیے‘‘ یہ کہہ کر وہ گھوڑے کی طرف بڑھی اور جب سیمنٹ کی بنی ہوئی موتری و پیشاب گاہ، کے پاس آئی تو سرتیا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اس کی ماں نے خشم آلود لہجے میں اس کا بازو پکڑ کر کہا ’’چل گھر میں چل مر۔۔۔۔۔۔تجھے تو سوائے اچھل کود کے اور کوئی کام ہی نہیں‘‘ پھر راستے میں اس نے ہولے سے کہا ’’کشوری بڑی دیر سے آیا بیٹھا ہے ایک موٹر والے سیٹھ کو لایا ہے۔۔۔۔چل تو بھاگ کے اوپر چل اور جلدی جلدی

تیار ہوجا۔۔۔اور سن۔۔۔وہ نیلی جارجٹ کی ساڑھی پہنیو۔۔۔۔۔اور دیکھ یہ تیرے بال بھی بہت بری طرح بکھر رہے ہیں۔۔تو جلدی سے تیار ہو کنگھی میں کر دوں گی‘‘

یہ سن کر کہ موٹر والے سیٹھ آئے ہیں سرتیا بہت خوش ہوئی اسے سیٹھ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ موٹر سے تھی موٹر کی سواری اسے بہت پسند تھی جب موٹر فراٹے بھرتی کھلی کھلی سڑکوں پر چلتی اور اس کے منہ پر ہوا کے طمانچے پڑتے تو اس کے دل میں ایک ناقابل بیان مسرت ابلنا شروع ہو جاتی موٹر میں بیٹھ کر اس کو ہر شے ایک ہوائی چکر دکھائی دیتی اور سمجھتی کہ وہ خود ایک بگولا ہے جو سڑکوں پر اڑتا چلا جا رہا ہے۔

سرتیا کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی ہوگی مگر اس میں بچپنا تیرہ برس کی لڑکیوں کا سا تھا عورتوں سے ملنا جلنا اور ان سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔سارا دن چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مصروف رہتی ایسے کھیل جن کا کوئی مطلب ہی نہ ہو مثال کے طور پر وہ گلی کے کالے لگ پھرے فرش پر کھریا مٹی سے لکیریں کھینچنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کھیل میں وہ اس انہماک سے مصروف رہتی جیسے سڑک پر یہ ٹیڑھی لکیریں اگر نہ کھینچی گئیں تو آمدو رفت بند ہو جائے گی اور پھر کھولی سے پرانے ٹاٹ اٹھا کر وہ اپنی ننھی ننھی سہیلیوں کے ساتھ کئی کئی گھنٹے ان کو فٹ پاتھ پر جھٹکنے صاف کرنے، بچھانے اور ان پر بیٹھنے کے غیر دلچسپ کھیل میں مشغول رہتی تھی۔

سرتیا خوبصورت نہیں تھی رنگ اس کا سیاہی مائل گندمی تھا بمبئی کے مرطوب

موسم کے باعث اس کے چہرے کی جلد ہر ممکن چکنی رہتی تھی اور پتلے پتلے ہونٹوں پر جو چیکو کے (ایک پھل جس کا رنگ گندمی ہوتا ہے) چھلکے دکھائی دیتے تھے ہر وقت خفیف سی لرزش طاری رہتی تھی اوپر کے ہونٹ پر پسینے کی تین چار ننھی ننھی بوندیں کپکپاتی رہتی تھیں اس کی صحت اچھی تھی غلاظت میں رہنے کے باوجود اس کا جسم سڈول اور متناسب تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر جوانی کا حملہ بڑی شدت سے ہوا ہے جس نے مخالف قوتوں کو دبا کر رکھ دیا ہے قد چھوٹا تھا جو اس کی تندرستی میں اضافہ کرتا تھا سڑک پر پھرتی سے ادھر ادھر چلتے ہوئے جب اس کی میلی گھگری اوپر کو اٹھ جاتی تو کئی راہ چلنے والے مردوں کی نگاہیں اس کی پنڈلیوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں جن میں جوانی کے باعث تازہ زندہ کی ہوئی ساگوان کی لکڑی جیسی چمک دکھائی دیتی تھی ان پنڈلیوں پر جو بالوں سے بالکل بے نیاز تھیں مساموں کے ننھے ننھے نشان دیکھ کر ان سنگتروں کے چھلکے یاد آ جاتے تھے جن کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں تیل بھرا ہوتا ہے اور جو تھوڑے سے دباؤ پر فوارے کی طرح اوپر اٹھ کر آنکھوں میں گھس جایا کرتا ہے۔

سرتیا کی باہیں بھی سڈول تھیں کندھوں پر ان کی گولائی موٹی اور بڑے بے ڈھب طریقے پر سلے ہوئے بلاؤز کے باوجود باہر جھانکتی تھی بال بڑے گھنے اور لمبے تھے ان میں سے کھوپرے کے تیل کی بو آتی رہتی تھی ایک موٹے کوڑے کے مانند اس کی چوٹی پیٹھ کو تھپکتی رہتی تھی سرتیا اپنے بالوں کی لمبائی سے خوش نہیں تھی کیونکہ کھیل کود کے دوران میں اس کی چوٹی اسے بہت تکلیف دیا کرتی تھی اور اسے مختلف طریقوں سے اس کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔

سرتیا کا دل و دماغ ہر قسم کے فکر و تردد سے آزاد تھا دونوں وقت اسے کھانے کو مل جاتا تھا اس کی ماں گھر کا سب کام کاج کرتی تھی صبح کو سرتیا دو بالٹیاں پانی سے بھر کر اندر رکھ دیتی اور شام کو ہر روز لیمپ میں ایک پیسے کا تیل بھروا لاتی۔ کئی برسوں سے وہ یہ کام بڑی باقاعدگی سے کر رہی تھی چنانچہ شام کو عادت کے باعث خود بخود اس کا ہاتھ اس پیالے کی طرف بڑھتا جس میں پیسے پڑے رہتے تھے اور لیمپ اٹھا کر وہ نیچے چلی جاتی۔

کبھی کبھی یعنی مہینے میں چار پانچ بار جب کشوری سیٹھ لوگوں کو لاتا تھا تو ان کے ساتھ ہوٹل میں یا باہر اندھیرے مقاموں پر جانے کو وہ تفریح خیال کرتی تھی اس نے اس باہر جانے کے سلسلے میں دوسرے پہلوؤں پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا شاید یہ سمجھتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کے گھر میں بھی کشوری جیسے آدمی ہوتے ہوں گے اور ان کو سیٹھ لوگوں کے ساتھ باہر جانا پڑتا ہوگا اور وہاں رات کو ورلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے بنچوں پر یا جوہو کی گیلی ریت پر جو کچھ ہوتا ہے سب کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ایک بار اپنی ماں سے کہا تھا ماں اب تو شانتا بھی کافی بڑی ہو گئی اس کو بھی میرے ساتھ بھیج دو نا یہ سیٹھ جو اب آئے ہیں مجھے انڈے کھانے کو دیا کرتے ہیں اور شانتا کو انڈے بہت بھاتے ہیں'' اس پر اس کی ماں نے بات گول مول کر دی تھی'' ہاں ہاں کسی روز اس کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں گی اس کی ماں پونے سے واپس تو آ جائے اور سرتیا نے دوسرے روز ہی شانتا کو جب وہ سنڈاس سے نکل رہی تھی یہ خوشخبری سنائی تھی'' تیری ماں پونا سے آ جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا تو بھی میری ساتھ ورلی جایا کرے گی'' اور اس کے بعد سرتیا نے رات کی

بات اس کو کچھ اس طریقے سے سنانا شروع کی تھی جیسے اس نے ایک نہایت ہی پیارا سپنا دیکھا ہے شانتا کو جو سرتیا سے دو برس چھوٹی تھی یہ باتیں سن کر ایسا لگا تھا جیسے اس کے سارے جسم کے اندر ننھے ننھے گھنگھرو بج رہے ہیں سرتیا کی سب باتیں سن کر بھی اس کو تسلی نہ ہوئی تھی اور اس کا بازو کھینچ کر اس نے کہا تھا ''چل نیچے چلتے ہیں۔۔۔وہاں باتیں کریں گے'' اور نیچے اس موتری کے پاس جہاں گردھاری بنیا نے بہت سے ٹاٹوں پر کھوپرے کے میلے ٹکڑے سکھانے کے لئے ڈال رکھے تھے وہ دونوں دیر تک کپکپی پیدا کرنے والی باتیں کرتی رہی تھیں اس وقت بھی جبکہ سرتیا دھوتی کے پردے پیچھے نیلی جارجٹ کی ساڑھی پہن رہی تھی کپڑے کے مس ہی سے اس کے بدن پر گدگدی ہو رہی تھی اور موٹر کی سیر کا خیال اس کے دماغ میں پرندوں کی سی پھڑپھڑاہٹیں پیدا کر رہا تھا۔اب کی بار سیٹھ کیسا ہوگا اور اسے کہاں لے جائے گا یہ اور اسی قسم کے اور سوال کے دماغ میں نہیں آ رہے تھے، البتہ جلدی جلدی کپڑے بدلتے ہوئے اس نے ایک دو مرتبہ یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا نہ ہو موٹر چلے اور چند ہی منٹوں میں کسی ہوٹل کے دروازے پر ٹھہر جائے اور ایک بند کمرے میں سیٹھ شراب پینا شروع کر دے اور اس کا دم گھٹنا شروع ہو جائے، اسے ہوٹلوں کے بند کمرے پسند نہیں تھے جن میں عام طور پر لوہے کی دو چارپائیاں اس طور پر بچھی ہوتی تھیں گویا ان سے پر جی بھر کے سونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

جلدی جلدی اس نے جارجٹ کی ساڑھی پہنی اور اس کی شکنیں درست کرتی ہوئی ایک لمحے کے لئے کشوری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''کشوری، ذرا دیکھو

پیچھے سے ساڑھی ٹھیک ہے نا؟'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ لکڑی کے اس ٹوٹے ہوئے بکس کی طرف بڑھی جس میں اس نے جاپانی پوڈر اور جاپانی سرخی رکھی ہوئی تھی۔۔۔۔ایک دھندلے آئینے کو کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا کر اس نے دوہری ہوکر اپنے گالوں پر پوڈر ملا اور سرخی لگا کر جب بالکل تیار ہوگئی تو مسکرا کر کشوری کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

شوخ رنگ کی نیلی ساڑھی میں، ہونٹوں پر بے ترتیبی سے سرخی کی دھڑی جمائے اور سانولے گالوں پر پیازی رنگ کا پاؤڈر ملے وہ مٹی کا ایک ایسا کھلونا معلوم ہوئی جو دیوالی پر کھلونے بیچنے والوں کی دکان میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیا کرتا ہے۔

اتنے میں اس کی ماں آگئی اس نے جلدی جلدی سریتا کے بال درست کیے اور کہا ''دیکھو بیٹا! اچھی اچھی باتیں کرنا۔۔۔۔اور جو کچھ وہ کہیں مان لینا۔۔۔سیٹھ جو آئے ہیں نا بڑے آدمی ہیں، موٹر ان کی اپنی ہے۔۔۔۔پھر کشوری سے مخاطب ہو کر کہا'' اب تو جلدی سے لے جا اسے، بیچارے کب سے کھڑے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

(باہر بڑے بازار میں جہاں ایک کارخانے کی لمبی سی دیوار دور تک چلی گئی ہے ایک پیلے رنگ کی موٹر''یہاں پیشاب کرنا منع ہے'' کے چھوٹے سے بورڈ کے پہلو میں کھڑی تھی اور موٹر میں تین حیدر آبادی نوجوان اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کشوری کا انتظار کر رہے تھے) وہ موٹر آگے لے جاتے مگر مصیبت یہ ہے کہ دیوار دور تک چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی پیشاب کا سلسلہ بھی جب گلی کے موڑ

سے اس نوجوان کو جو موٹر کا ہینڈل تھامے بیٹھا تھا کشوری نظر آیا تو اس نے اپنے باقی دو ساتھیوں سے کہا ''لو بھئی آ گئے۔۔۔۔۔۔ یہ کشوری اور۔۔۔۔۔ اور'' اس نے موڑ کی طرف نگاہیں جمائے رکھیں'' اور۔۔۔۔ اور۔۔۔ ارے۔۔۔۔ یہ تو بالکل ہی چھوٹی لڑکی ہے۔۔۔ ذرا تم بھی دیکھو نا۔۔۔ ارے بھئی وہ۔۔۔۔ وہ نیلی ساڑھی میں''

جب کشوری اور سریتا دونوں موٹر کے پاس آ گئے تو پچھلی سیٹ پر جو دو نوجوان بیٹھے تھے انہوں نے درمیان میں سے اپنے ہیٹ وغیرہ اٹھا لیے اور جگہ خالی کر دی کشوری نے آگے بڑھ کر موٹر کے پچھلے حصے کا دروازہ کھولا اور پھرتی سے سریتا کو اندر داخل کر دیا دروازہ بند کر کے کشوری نے اس نوجوان سے جو موٹر کا ہینڈل تھامے تھا کہا'' معاف کیجئے گا دیر ہو گئی یہ باہر اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہوئی تھی۔۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔؟''

نوجوان نے مڑ کر سریتا کی طرف دیکھا اور کشوری سے کہا'' ٹھیک ہے۔۔۔۔ لیکن دیکھو'' سرک کر موٹر کی اس کھڑکی سے اس نے اپنا سر باہر نکالا اور ہولے سے کشوری کے کان میں کہا۔۔۔ ''شور وور تو نہیں مچائے گی؟''

کشوری نے اس کے جواب میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا'' سیٹھ، آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔''

یہ سن کر اس نے جیب میں سے دو روپے نکالے اور کشوری کے ہاتھ میں تھما دیئے'' جاؤ عیش کرو'' کشوری نے سلام کیا اور موٹر اسٹارٹ ہوئی

شام کے پانچ بجے تھے بمبئی کے بازاروں میں گاڑیوں، ٹراموں، بسوں اور

لوگوں کی آمدورفت بہت زیادہ تھی سرتیا خاموشی سے دو آدمیوں کے بیچ میں دبکی بیٹھی رہی۔ بار بار اپنی رانوں کو جوڑ کر اوپر ہاتھ رکھ دیتی اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی وہ دراصل موٹر چلانے والے نوجوان سے کہنا چاہتی تھی "سیٹھ جلدی جلدی موٹر چلاؤ میرا تو یوں دم گھٹ جائے گا"

بہت دیر تک موٹر میں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہ کی موٹر والا موٹر چلاتا اور پچھلی سیٹ پر دونوں حیدر آبادی نوجوان اپنی اچکنوں میں وہ اضطراب چھپاتے رہے جو پہلی دفعہ ایک نوجوان لڑکی کو بالکل اپنے پاس دیکھ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا ایسی نوجوان لڑکی کو جو کچھ عرصے کے لئے ان کی اپنی تھی یعنی جس سے وہ بلا خوف و خطر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔

وہ نوجوان جو موٹر چلا رہا تھا دو برس سے بمبئی میں قیام پذیر تھا اور سرتیا جیسی کئی لڑکیاں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں دیکھ چکا تھا اس کی پچھلی موٹر میں مختلف رنگ و نسل کی چھوکریاں داخل ہو چکی تھیں اس لیے اسے کوئی خاص بے چینی محسوس نہیں ہو رہی تھی حیدر آباد سے اس کے دو دوست آئے تھے ان میں سے ایک جس کا نام شہاب تھا جو بمبئی میں پوری طرح سیر و تفریح کرنا چاہتا تھا اس لیے کنایت نے یعنی موٹر کے مالک نے ازراہ دوست نوازی کشوری کے ذریعہ سے سرتیا کا انتظام کر دیا تھا دوسرے دوست انور سے کنایت نے کہا تھا کہ بھئی تمہارے لیے بھی ایک رہے تو کیا حرج ہے مگر اس میں چونکہ اخلاقی قوت کم تھی اس لیے شرم کے مارے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں بھئی میرے لیے بھی ایک رہے۔

کنایت نے سرتیا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کیونکہ کشوری بہت دیر کے بعد یہ

نئی چھوکری نکال کر لایا تھا لیکن اس نئے پن کے باوجود اس نے ابھی تک اس سے دلچسپی نہ لی تھی شاید اس لیے کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک کام کر سکتا تھا موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ سرتیا کی طرف دھیان نہیں دے سکتا تھا۔

جب شہر ختم ہو گیا اور موٹر مضافات کی ایک سڑک پر چلنے لگی تو سرتیا اچھل پڑی۔ وہ دباؤ جو اب تک اس نے اپنے اوپر ڈال رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور اڑتی ہوئی موٹر نے ایک دم اٹھا دیا اور سرتیا کے اندر بجلیاں سی دوڑ گئیں وہ سرتاپا حرکت بن گئی اس کی ٹانگیں تھرکنے لگیں بازو ناچنے لگے، انگلیاں کپکپانے لگیں اور وہ اپنے دونوں طرف بھاگتے ہوئے درختوں کو دوڑتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اب انور اور شباب آرام محسوس کر رہے تھے شباب نے جو سرتیا پر اپنا حق سمجھتا تھا ہولے سے اپنا بازو اس کی کمر میں حائل کرنا چاہا ایک دم سرتیا کے گدگدی اٹھی تڑپ کر وہ انور پر جا گری اور چلتی موٹر کی کھڑکیوں میں سے دور تک سرتیا کی ہنسی بہتی گئی شباب نے جب ایک بار پھر اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سرتیا دوہری ہو گئی اور ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہو گیا انور ایک کونے میں دبکا رہا اور منہ میں تھوک پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

شباب کے دل و دماغ میں شوخ رنگ بھر گئے اس نے نہایت سے کہا "واللہ بڑی کراری لونڈیا ہے" یہ کہہ کر اس نے زور سے سرتیا کی ران میں چٹکی بھری سرتیا نے اس کے جواب میں انور کا ہولے سے کان مروڑ دیا اس لیے کہ وہ اس کے بالکل پاس تھا موٹر میں قہقہے ابلنے لگے

کنایت بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا تھا حالانکہ اسے اپنے سامنے چھوٹے سے آئینے میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا قہقہوں کے زور کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے موٹر کی رفتار بھی تیز کر دی۔

سرتیا کا جی چاہا کہ باہر نکل کر موٹر کے منہ پر بیٹھ جائے جہاں لوہے کی اڑتی ہوئی پری لگی تھی وہ آگے بڑھی شباب نے اسے چھیڑا تو سنبھلنے کی خاطر اس نے کنایت کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دیں کنایت نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ چوم لیے ایک سنسنی سی سرتیا کے جسم میں دوڑ گئی اور پھاند کر اگلی سیٹ پر کنایت کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی ٹائی سے کھیلنا شروع کر دیا ''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے کنایت سے پوچھا

''میرا نام!'' کنایت نے پوچھا ''میرا نام کنایت ہے'' یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا

سرتیا نے اس کے نام کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نوٹ اپنی چولی میں اڑس کر بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا ''تم بہت اچھے آدمی ہو تمہاری یہ ٹائی بہت اچھی ہے''

اس وقت سرتیا کو ہر شے اچھی نظر آ رہی تھی وہ چاہتی تھی کہ جو برے بھی ہیں اچھے ہو جائیں اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔پھر ایسا ہو، ایسا ہو۔۔۔۔۔کہ موٹر تیز دوڑتی رہے اور ہر شے ہوائی بگولہ بن جائے۔

ایک دم اس کا جی چاہا کہ گائے چنانچہ اس نے کنایت کی ٹائی سے کھیلنا بند کر کے گانا شروع کر دیا ہے۔

تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا۔۔۔۔۔سوئے ہوئے ہردے کو جگایا

کچھ دیر یہ فلمی گیت گانے کے بعد سرتیا ایک دم پیچھے مڑی اور انور کو خاموش دیکھ کر کہنے لگی "تم کیوں چپ چاپ بیٹھے ہو کوئی بات کرو کوئی گیت گاؤ" یہ کہتی ہوئی وہ اچک کر پچھلی سیٹ پر چلی گئی اور شہاب کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی "آؤ ہم دونوں گائیں تمہیں یاد ہے وہ گانا جو دیویکا رانی نے گایا تھا"

میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے۔۔۔۔ دیویکا رانی کتنی اچھی ہے یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی تھوڑی کے نیچے رکھ لیے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا "اشوک کمار اور دیویکا رانی پاس پاس کھڑے تھے۔۔۔ دیویکا رانی کہتی تھی۔۔۔۔ میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے۔۔۔۔ اور اشوک کمار کہتا تھا۔۔۔۔ تم کہو نا"

سرتیا نے گانا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ "میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں گے"

شہاب نے بھدی آواز بلند کی "میں بن کا پنچھی بن کے بن بن بولوں رے"

اور پھر باقاعدہ ڈوئٹ شروع ہو گیا کنایت نے موٹر کا ہارن بجا کر تال کا ساتھ دیا سرتیا نے تالیاں بجانا شروع کر دیں سرتیا کا باریک سر، شہاب کی پھٹی ہوئی آواز، ہارن کی پوں پوں، ہوا کی سائیں سائیں اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ، یہ سب مل جل کر ایک آرکسٹرا بن گئے۔

سرتیا خوش تھی، شہاب خوش تھا، کنایت خوش تھا ان سب کو خوش دیکھ کر انور کو بھی خوش ہونا پڑا وہ دل میں بہت شرمندہ تھا کہ خواہ مخواہ اس نے اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے۔۔۔ اس کے بازوؤں میں حرکت پیدا ہوئی اس کے سوئے ہوئے جذبات

نے انگڑائیاں لیں اور وہ سرتیا، شہاب اور کنایت کی شور افشاں خوشی میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

گاتے گاتے سرتیا نے انور کے سر پر سے اس کا ہیٹ اتار کر اپنے سر پر پہن لیا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کے سر پر کیسا لگتا ہے اچک کر اگلی سیٹ پر چلی گئی اور ننھے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔۔۔ انور سوچنے لگا کہ کیا موٹر میں وہ شروع ہی سے ہیٹ پہنے بیٹھا تھا؟

سرتیا نے زور سے کنایت کی موٹی ران پر طمانچہ مارا ''اگر میں تمہاری پتلون پہن لوں اور قمیص پہن کر ایسی ٹائی لگا لوں تو کیا پورا صاحب نہ بن جاؤں؟''

یہ سن کر شہاب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے چنانچہ اس نے انور کے بازوؤں کو جھنجھوڑ دیا ''واللہ تم نرے چغد ہو'' اور انور نے تھوڑی دیر کے لئے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت بڑا چغد ہے۔

کنایت نے سرتیا سے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام!'' سرتیا نے ہیٹ کے فیتے کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے جماتے ہوئے کہا ''میرا نام سرتیا ہے''

شہاب پچھلی سیٹ سے بولا ''سرتیا تم عورت نہیں پھلجھڑی ہو''

انور نے کچھ کہنا چاہا مگر سرتیا نے اونچے سروں میں گانا شروع کر دیا

پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں
تج کے سب سن سا آ ر

کنایت اور شہاب کے دل میں بیک وقت یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ موٹر یونہی

ساری عمر چلتی ہے۔

پریم نگر میں بنگاؤں گی گھر میں

تج کے سب سن سا آ آر

سنسارے کے ٹکڑے دیر تک اڑتے رہے۔۔۔۔۔۔سر تیا کے بار جو اس کی چوٹی کی گرفت سے آزاد تھے یوں لہرا رہے تھے جیسے گاڑھا سا دھواں ہوا کے دباؤ سے بکھر رہا ہے وہ خوش تھی۔

شباب خوش تھا، کنایت خوش تھا اور اب انور بھی خوش ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔

گیت ختم ہو گیا اور سب کو تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ زور سے بارش ہو رہی تھی ایکا ایکی تھم گئی ہے۔

کنایت نے سر تیا سے کہا "کوئی اور گیت گاؤ"

شباب پچھلی سیٹ سے بولا "ہاں ہاں ایک اور رہے۔۔۔۔۔یہ سینما والے بھی کیا یاد کریں گے۔"

سر تیا نے گانا شروع کر دیا

مورے آنگنا میں آئے آلی

میں چال چلوں متوالی

موٹر بھی متوالی چال چلنے لگی۔۔۔۔۔آخر کار سڑک کے سارے پیچ ختم ہو گئے اور سمندر کا کنارہ آ گیا۔۔دن ڈھل رہا تھا اور سمندر سے آنے والی ہوا خنکی اختیار کر رہی تھی۔

موٹر رکی سر تیا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک بے

مقصد دوڑتی چلی گئی کنایت اور شہاب بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے کھلی فضا میں بے پایاں سمندر کے پاس تاڑ کے اونچے اونچے پیڑوں تلے گیلی گیلی ریت پر سرتیا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا چاہتی ہے اس کا جی چاہتا تھا کہ بیک وقت فضا میں گھل جائے، سمندر میں پھیل جائے اتنی اونچی ہو جائے کہ تاڑ کے درختوں کو اوپر سے دیکھے ساحل کی ریت کی ساری نمی پیروں کے ذریعے سے اپنے اندر جذب کر لے اور پھر۔۔۔۔۔۔اور پھر۔۔۔۔۔وہی موڑ ہو اور وہی اڑانیں وہی تیز تیز جھونکے اور وہی مسلسل پوں پوں وہ بہت خوش تھی جب تینوں حیدر آبادی نوجوان ساحل کی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ کر بیئر پینے لگے تو کنایت کے ہاتھ سے سرتیا نے بوتل چھین لی "ٹھہرو میں ڈالتی ہوں"

سرتیا نے اس طریقے سے گلاس میں بیئر انڈیلی کہ جھاگ ہی جھاگ پیدا ہو گئے سرتیا یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوئی سانولے سانولے جھاگوں میں اس نے اپنی انگلی گھولی اور منہ میں ڈال لی جب کڑوی لگی تو بہت برا منہ بنایا کنایت اور شہاب بے اختیار ہنس پڑے جب دونوں کی ہنسی بند ہوئی تو کنایت نے مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا انور بھی ہنس رہا تھا۔

بیئر کی چھ بوتلیں، کچھ تو جھاگ بن کر ساحل کی ریت میں جذب ہو گئیں اور کچھ کنایت شہاب اور انور کے پیٹ میں چلی گئیں سرتیا گاتی رہی۔۔۔۔انور نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور خیال کیا کہ سرتیا بیئر کی بنی ہوئی ہے اس کے سانولے گال سمندر کی نم آلود ہوا کے مس سے گیلے ہو رہے تھے۔۔۔۔۔وہ بے حد مسرور تھی اب انور بھی خوش تھا اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ

سمندر کا سب پانی بیئر بن جائے اور وہ اس میں غوطے کھائے سرتیا بھی ڈبکیاں لگائے۔

دو خالی بوتلیں لے کر سرتیا نے ایک دوسرے سے ٹکرا دیں جھنکار پیدا ہوئی سرتیا نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا کنایت، شباب اور انور بھی ہنسنے لگے۔

ہنستے ہنستے سرتیا نے کنایت سے کہا ''آؤ موٹر چلائیں''

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔خالی بوتلیں گیلی گیلی ریت پر اوندھی پڑی رہیں اور وہ سب بھاگ کر موٹر میں بیٹھ گئے۔۔۔۔۔پھر وہی ہوا کے تیز تیز جھونکے آنے لگے۔۔۔۔وہی مسلسل پوں پوں شروع ہوئی اور سرتیا کے بال پھر دھوئیں کی طرح بکھرنے لگے۔

گیتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا

موٹر ہوا میں آرے کی طرح چلتی رہی۔۔۔۔۔سرتیا گاتی رہی۔۔۔۔۔پچھلی سیٹ پر شباب اور انور کے درمیان سرتیا بیٹھی تھی انور اونگھ رہا تھا۔۔۔۔۔سرتیا نے شرارت سے شباب کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سو گیا سرتیا نے جب انور کی طرف رخ کیا تو اسے ویسا ہی سویا ہوا پایا ان دونوں کے بیچ میں سے اٹھ کر وہ اگلی سیٹ پر کنایت کے پاس بیٹھ گئی اور آواز دبا کر ہولے سے کہنے لگی ''آپ کے دونوں دوستوں کو سلا آئی ہوں۔۔۔۔۔اب آپ بھی سو جائیے۔''

کنایت مسکرایا ''پھر موٹر کون چلائے گا''

سرتیا بھی مسکرائی ''چلتی رہے گی''

دیر تک کنایت او رسرتیا آپ میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں وہ بازار آ گیا جہاں کشوری نے سرتیا کو موٹر کے اندر داخل کیا تھا۔۔۔۔۔ جب وہ دیوار آئی جس پر یہاں پیشاب کرنا منع ہے کے کئی بورڈ لگے تھے تو سرتیا نے کنایت سے کہا "بس یہاں روک لو"

موٹر کی پیشتر اس کے کہ کنایت کچھ سوچنے یہ کہنے پائے سرتیا موٹر سے باہر تھی اس نے اشارے سے سلام کیا اور چل دی۔۔۔۔۔ کنایت ہینڈل پر ہاتھ رکھے غالباً سارے واقعہ کو ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سرتیا کے قدم رکے مڑی اور چولی میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر کنایت کے پاس سیٹ پر رکھ دیا۔

کنایت نے حیرت سے نوٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا "سرتیا یہ کیا؟"

"یہ۔۔۔۔۔ یہ روپے میں کس بات کے لوں؟" کہہ کر سرتیا پھرتی سے دوڑ گئی اور کنایت سیٹ کے گدے میں پڑے نوٹ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا شہاب اور انور بھی نوٹ کی طرح سو رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

دھواں

وہ جب سکول کی طرف روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں دوڑ جاتی تھیں، پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھیں پھڑکا کرتی تھیں۔

اس وقت سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے سردی میں شدت نہیں تھی لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم ساوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے آوازیں مدھم تھیں، جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں، چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے سکول جا رہا تھا آج اس کی چال بھی سست تھی جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے

ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اجلا پن نہیں تھا روشنی تھی مگر دھندلی کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب سکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے یہ قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ سکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر سکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا اس کا دل جذبات سے بالکل خالی نہ تھا البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقام ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں سردی کی شدت اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید دھبے پڑ

جاتے تھے ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔۔۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے دیکھے ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا دوسرا تختے پر پڑا تھا جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے، چنانچہ آگے بڑھ کر اس نے انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں اب گھر میں صرف دو آدمی تھے ماں اور بڑی بہن، ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی

بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کررہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ سکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ سکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ سکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے اباجی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اس کو طبعاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانہ میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا ''امی جان! آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے''

''اچھا۔۔۔۔۔'' یہ کہہ کر اس کی ماں چولہے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی

''ہاں ۔۔۔ اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا''

''اچھا ۔۔۔'' یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانہ سے باہر چلی گئی۔

''اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا''

''اچھا ۔۔۔۔'' مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی'' کیسے پھڑکتا تھا؟''

''یوں ۔۔۔ یوں ۔۔۔'' مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

''تو پھر کیا ہوا؟''

''یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لمحے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا'' پھر کیا ہونا تھا، میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا گرم تھا۔

''گرم تھا ۔۔۔۔ اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے''

''بتائیے''

''آؤ ۔۔۔ میرے ساتھ آؤ''

''نہیں پہلے آپ بتائیے، کام کیا ہے؟''

''تم آؤ تو سہی میرے ساتھ''

''جی نہیں ۔۔۔ آپ پہلے کام بتائیے''

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔۔میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا۔۔۔اچھے بھائی جو ہوئے۔۔۔اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے جب دیکھو درد ہو رہا ہے اور پھر آپ دبواتی بھی مجھ سے ہیں، کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں" مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیے۔۔۔لیکن میں یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا"

"شاباش۔۔۔شاباش!" اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے "مسعود! آج ضرور بارش ہو گی" یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا "دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔"

"بہت اچھا۔۔۔لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔۔۔ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی کمر دباؤ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی" کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار

کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزہ لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولہوں پر گوشت زیادہ تھا، جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی اس نے بڑی بد دلی سے کمر دبانا شروع کر دی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی ''شاباش مسعود! شاباش لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح ۔۔۔۔ شاباش میرے بھائی!''

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تلوؤں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے چنانچہ اس نے کہا "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا سیدھی لیٹ جائیے میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا "نا بھائی۔۔۔ میرے گدگدی ہوتی ہے تم اوٹ پٹانگ طریقے سے دباتے ہو"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے "نہیں۔۔۔ اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا۔۔۔ آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے اپنے پیر چلانے شروع کیے کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں مسعود نے ایک بار سکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازی گر کو چلتے دیکھا تھا اس نے سوچا کہ بازی گر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو

کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا ایک دو مرتبہ اس نے سوچا ''کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت سے بھی دھواں نکلے گا؟'' لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

''بس ۔۔۔ بس ۔۔'' کلثوم تھک گئی ''بس ۔۔۔۔۔۔ بس''

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی وہ پلنگ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زور سے باہر گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کیے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھری جھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھیلائے بیٹھے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ داؤدی اور ریناز بو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا

رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جس کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا، پھر بھی ایک گمنام سا مزہ اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا کھانا تیار تھا، ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دُکھن پیدا ہوئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزہ آیا اس کے جسم

کے کسی حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس کا سارا جسم کھینچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آ نکلا۔ نہ کوئی باورچی خانہ میں تھا اور نہ صحن میں ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے بارش اب رک گئی تھی مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی ''کون؟''

''جی میں ہوں مسعود!''

اندر سے آواز آئی ''کیا کر رہے ہو''

''جی کھیل رہا ہوں''

''کھیلو۔۔۔۔۔۔'' پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا'' تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔۔۔۔۔زیادہ شور نہ مچانا''

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وا۔۔۔۔مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے

جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا، اس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا، اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

☆☆☆☆☆

دیوالی کے دیئے

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے ہانپتے ہوئے بچوں کے دل کی طرح دھڑک رہے تھے۔

منی دوڑتی ہوئی آئی اپنی ننھی سی گھگری کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھائے چھت کے نیچے گلی میں موری کے پاس کھڑی ہوگئی اس کی روتی ہوئی آنکھوں میں منڈیر پر پھیلے ہوئے دیوں نے کئی چمکیلے نگینے جڑ دیئے۔۔۔۔اس کا ننھا سا سینہ دیئے کی لو کی طرح کانپا، مسکرا کر اس نے اپنی مٹھی کھولی، پسینے سے بھیگا ہوا پیسہ دیکھا اور بازار میں دیے لینے کے لئے دوڑ گئی۔

چھت کی منڈیر پر شام کی خشک ہوا میں دیوالی کے دیے پھڑ پھڑاتے رہے۔

سریندر دھڑکتے ہوئے دل کو پہلو میں چھپائے چوروں کے مانند گلی میں داخل ہوا اور منڈیر کے نیچے بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ اس نے دیوں کی قطاروں کی طرف دیکھا۔ اسے ہوا میں اچھلتے ہوئے یہ شعلے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے رقصاں قطرے معلوم ہوئے دفعتاً سامنے والی کھڑکی کھلی۔۔۔۔۔سریندر سرتاپا نگاہ بن گیا۔ کھڑکی کے ڈنڈے کا سہارا لے کر ایک دوشیزہ نے جھک کر گلی میں دیکھا اور فوراً اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

کچھ اشارے ہوئے کھڑکی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کے ساتھ بند ہوئی اور سریندر وہاں سے مخموری کی حالت میں چل دیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے دلہن کی ساڑھی میں ٹکے ہوئے تاروں کی

طرح چمکتے رہے۔

سرجو کمہار لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا بلغم اس کی چھاتی میں سڑکیں کوٹنے والے انجن کی مانند پھر رہا تھا گلے کی رگیں دمے کے دورے کے باعث دھونکنی کی طرح پھولتی تھیں کبھی سکڑ جاتی تھیں اس نے گردن اٹھا کر جگمگ جگمگ کرتے دیوں کی طرف اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ دور۔۔۔۔۔بہت دور۔۔۔۔۔بہت سے بچے قطار باندھے کھیل کود میں مصروف ہیں سرجو مار کی لاٹھی منوں بھاری ہوگئی بلغم تھوک کر وہ پھر چیونٹی کی چال چلنے لگا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے جگمگاتے رہے۔

پھر ایک مزدور آیا پھٹے ہوئے گریبان میں سے اس کی چھاتی کے بال برباد گھونسلوں کی تیلیوں کے مانند بکھر رہے تھے دیوں کی قطار کی طرف اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کی گدلی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے ہیں پھر اسے اپنے گھر کے اندھیارے کا خیال آیا اور وہ ان تھرکتے ہوئے شعلوں کی روشنی کنکھیوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے آنکھیں جھپکتے رہے۔

نئے اور چمکیلے بوٹوں کی چرچراہٹ کے ساتھ ایک آدمی آیا اور دیوار کے قریب سگریٹ سلگانے کے لیے ٹھہر گیا اس کا چہرہ اشرفی پر لگی ہوئی مہر کے مانند جذبات سے عاری تھا کالر چڑھی گردن اٹھا کر اس نے دیوں کی طرف دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سی کٹھالیوں میں سونا پگھل رہا ہے اس کے چرچراتے ہوئے

چمکیلے جوتوں پر ناچتے ہوئے شعلوں کا عکس پڑ رہا تھا وہ ان سے کھیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چھت کی منڈیر پر دیوالی کے دیے جلتے رہے

جو کچھ انہوں نے دیکھا، جو کچھ انہوں نے سنا کسی کو نہ بتایا، ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سب دیے ایک ایک کر کے بجھ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

ڈرپوک

میدان بالکل صاف تھا مگر جاوید کا خیال تھا کہ میونسپلٹی کمیٹی کی لالٹین جو دیوار میں گڑی ہے، اس کو گھور رہی ہے بار بار وہ اس چوڑے صحن کو جس پر نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش بنا ہوا تھا، طے کر کے اس نکڑ والے مکان تک پہنچنے کا ارادہ کرتا جو دوسری عمارتوں سے بالکل الگ تھلگ تھا مگر یہ لالٹین جو مصنوعی آنکھ کی طرح ہر طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اس کے ارادے کو متزلزل کر دیتی اور وہ اس بڑی موری کے اس طرف ہٹ جاتا، جس کو پھاند کر وہ صحن کو چند قدموں میں طے کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔صرف چند قدموں میں۔

جاوید کا گھر اس جگہ سے کافی دور تھا مگر یہ فاصلہ بڑی تیزی سے طے کر کے یہاں پہنچ گیا تھا اس کے خیالات کی رفتار اس کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیز تھی راستے میں اس نے بہت سی چیزوں پر غور کیا وہ بے وقوف نہیں تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک بیسوا کے پاس جا رہا ہے اور اس کو اس بات کا بھی شعور تھا کہ وہ کس غرض سے اس کے یہاں جانا چاہتا ہے۔

وہ عورت چاہتا ہے عورت، خواہ وہ کسی شکل میں ہو عورت کی ضرورت اس کی زندگی میں یک بیک پیدا نہیں ہوئی تھی ایک زمانے سے یہ ضرورت اس کے اندر آہستہ آہستہ موجود شدت اختیار کرتی رہی تھی اور اب دفعتاً اس نے محسوس کیا تھا کہ عورت کے بغیر وہ ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت اس کو ضرور ملنی چاہیے۔ ایسی عورت جس کی ران پر ہولے سے طمانچہ مار کر وہ اس کی آواز سن سکے۔ ایسی عورت

جس سے وہ واہیات قسم کی گفتگو کرسکے۔

جاوید پڑھا لکھا ہوشمند آدمی تھا ہر باپ کی اونچ نیچ سمجھتا تھا مگر اس معاملے میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی جو اس کے لیے نئی نہ تھی عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش اس سے پہلے کئی بار اس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انتہائی کوششوں کے بعد جب اسے نا امیدی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی زندگی میں سالم عورت کبھی نہیں آئے گی اور اگر اس نے اس سالم عورت کی تلاش جاری رکھی تو کسی روز وہ دیوانے کتے کی طرح راہ چلتی عورت کو کاٹ کھائے گا۔

کاٹ کھانے کی حد تک اپنے ارادہ میں ناکام رہنے کے بعد اب دفعتاً اس کے دل میں اس خواہش نے کروٹ بدلی تھی اب کسی عورت کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا خیال اس کے دماغ سے نکل چکا تھا عورت کا تصور اس کے دماغ میں موجود تھا اس کے بال بھی تھے مگر اب اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان بالوں کو وحشیوں کی طرح کھینچے، نوچے، اکھیڑے۔

اب اس کے دماغ میں سے وہ عورت نکل چکی تھی جس کے ہونٹوں پر وہ اپنے ہونٹ اس طرح رکھنے کا آرزومند تھا جیسے تتلی پھولوں پر بیٹھتی ہے، اب وہ ان ہونٹوں کو اپنے گرم ہونٹوں سے داغنا چاہتا تھا۔ ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں نہیں تھا اب وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا ایسی باتیں جو اس کے موجودہ ارادے کی طرح ننگی ہوں۔

اب سالم عورت اس کے پیش نظر نہیں تھی ۔۔۔۔۔۔ وہ ایسی عورت چاہتا تھا جو گھس گھسا کا شکستہ حال مرد کی شکل اختیار کر گئی ہو ایسی عورت جو آدھی عورت ہو آدھی کچھ بھی نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا جب جاوید عورت کہتے وقت اپنی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتا تھا جب عورت کا تصور اسے چاند کی ٹھنڈی دنیا میں لے جاتا تھا وہ عورت کہتا تھا بڑی احتیاط سے جیسے اس کو اس بے جان لفظ کے ٹوٹنے کا ڈر ہو۔ ایک عرصہ تک وہ اس دنیا کی سیر کرتا رہا مگر انجام کار اس کو معلوم ہوا کہ عورت جس کی تمنا اس کے دل میں ہے اس کی زندگی کا ایسا خواب ہے جو خراب معدے کے ساتھ دیکھا جائے۔

جاوید اب خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا بہت دیر تک ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو بہلاتا رہا مگر اب اس کا جسم خوفناک حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے تصور کی شدت نے اس کی جسمانی حیات کی نوک پلک کچھ اس طور پر نکالی تھی کہ اب زندگی اس کے لئے سوئیوں کا بستر بن گئی ہر خیال ایک نشتر بن گیا اور عورت اس کی نظروں میں ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

جاوید کبھی انسان تھا مگر اب انسانوں سے اسے نفرت تھی، اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی متنفر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا اس طور پر کہ ایک عرصہ تک اس کے خوبصورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھتا رہا تھا غلاظت سے لتھڑے رہیں۔

’’مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے

چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح اور اپنے جسم کے ہر ذرے کو اس غلاظت سے آلودہ کر دوں، میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے اب بدبودار اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لئے بیتاب ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چغہ اتار کر اس محلے کا رخ کیا ہے جہاں ہر شے ایک پراسرار تعفن میں لپٹی نظر آتی ہے یہ دنیا کس قدر بھیانک طور پر حسین ہے'' نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے تھا لالٹین کی بیمار روشنی میں جاوید نے جب اس فرش کی طرف اپنی بدلی ہوئی نظروں سے دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی ننگی عورتیں اوندھی سیدھی لیٹی ہیں جن کی ہڈیاں جا بجا ابھر رہی ہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس فرش کو طے کر کے نکڑ والے مکان کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے اور کوٹھے پر چڑھ جائے مگر میونسپل کمیٹی کی لالٹین غیر مختتم ٹکٹکی باندھے اس کی طرف گھور رہی تھی اس کے بڑھنے والے قدم رک گئے اور وہ بھنا سا گیا ''یہ لالٹین مجھے کیوں گھور رہی ہے۔۔۔ یہ میرے راستے میں کیوں روڑے اٹکا رہی ہے۔'' وہ جانتا تھا کہ یہ محض واہمہ ہے اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی اس کے قدم رک جاتے تھے اور وہ اپنے دل میں تمام بھیانک ارادے لیے موری کے اس پار کھڑا رہ جاتا تھا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی کے ستائیس برسوں کی جھجک جو اسے ورثے میں ملی تھی، اس لالٹین میں جمع ہو گئی ہے یہ جھجک جس کو پرانی کینچلی کی طرح اتار کر وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی جہاں اسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھیلنا تھا۔ ایسا کھیل جو اسے کیچڑ میں لت پت کر دے اس کی روح کو ملوث کر دے۔

ایک میلی کچیلی عورت اس مکان میں رہتی تھی اس کے پاس چار پانچ جوان عورتیں تھیں، جو رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں یکساں بھدے پن سے پیشہ کراتی تھیں یہ عورتیں گندی موری سے غلاظت نکالنے والے پمپ کی طرح دن رات چلتی رہتی تھیں جاوید کو اس قحبہ خانے کے متعلق اس کے ایک دوست نے بتایا تھا جو حسن و عشق کی تاش کئی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا جاوید سے وہ کہا کرتا تھا تم عورت عورت پکارتے ہو۔۔۔۔عورت ہے کہاں؟۔۔۔۔ مجھے تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی مستورات البتہ دیکھی ہیں اور ان کے متعلق سنا بھی ہے لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو میں نے مائی جیواں کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے بخدا مائی جیواں انسان نہیں فرشتہ ہے۔۔۔۔خدا اس کو خضر کی عمر عطا فرمائے۔

جاوید مائی جیواں اور اس کے یہاں کی چار پانچ پیشہ کرانے والی عورتوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اس کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک ہر وقت گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ پہنے رہتی ہے اس لیے کہ کسی بیماری کے باعث اس کی آنکھیں خراب ہو چکی ہیں ایک کالی کلوٹی لونڈیا ہے جو ہر وقت ہنستی رہتی ہے اس کے متعلق جاوید جب سوچتا تو عجیب وغریب تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ''مجھے ایسی ہی عورت چاہیے جو ہر وقت ہنستی ہے ایسی عورتوں کو ہنستے ہی رہنا چاہیے۔۔۔۔جب وہ ہنستی ہو گی تو اس کے کالے کالے ہونٹ یوں کھلتے ہوں گے جیسے بدبودار گندے پانی میں میلے کچیلے بن بن کر پھٹتے ہیں۔''

مائی جیواں کے پاس ایک اور چھوکری بھی تھی جو باقاعدہ طور پر پیشہ کرانے سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگا کرتی تھی اب ایک برس سے وہ اس مکان میں تھی جہاں اٹھارہ برسوں سے یہی کام ہو رہا تھا یہ اب پوڈر اور سرخی لگاتی تھی جاوید اس کے متعلق بھی سوچتا "اس کے سرخی لگے گال بالکل" داغدار سیبوں کے مانند ہوں گے ۔۔۔۔۔ جو ہر کوئی خرید سکتا ہے۔

ان چار پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہیں تھی ۔۔۔۔۔" مجھے کوئی بھی مل جائے میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لیے جائیں اور کھٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھما دی جائے ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہونی چاہیے کسی قسم کی گفتگو نہ ہو کوئی نرم و نازک فقرہ منہ سے نکلنے نہ پائے قدموں کی چاپ سنائی دے دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو ۔۔۔۔ روپے کھنکھنائیں اور آوازیں بھی آئیں مگر منہ بند رہے اگر آواز نکلے تو ایسی جو انسانی آواز معلوم نہ ہو ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح، تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالا لگ جائے ۔ تھوڑی دیر کے لیے ایک ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سونگھنے، دیکھنے اور سننے کی نازک حسیات زنگ لگے استرے کے مانند کند ہو جائیں"

جاوید بے چین ہو گیا ایک الجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ ان سے بھڑ جاتا ۔ مگر میونسپل کمیٹی کی ایک اندھی لالٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بجھا سکتا تھا، اس کی راہ میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی ۔

اس کی بغل میں پان والے کی دکان کھلی تھی، تیز روشنی میں اس کی چھوٹی سی

دکان کا اسباب اس قدر نمایاں ہو رہا تھا کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتی تھیں بجلی کے قمقمے کے ارد گرد مکھیاں اس انداز سے اڑ رہی تھیں جیسے ان کے پر بوجھل ہو رہے ہیں جاوید نے جب ان کی طرف دیکھا تو اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی سست رفتار چیز نظر آئے اس کا کر گزرنے کا ارادہ جو وہ اپنے گھر سے لے کر یہاں آیا تھا ان مکھیوں کے ساتھ بار بار ٹکرایا اور وہ اس کے احساس سے اس قدر پریشان ہوا کہ ایک بلڑ سا اس کے دماغ میں مچ گیا ''میں ڈرتا ہوں۔۔۔۔ میں خوف کھاتا ہوں اس لالٹین سے مجھے ڈر لگتا ہے میرے تمام ارادے اس نے تباہ کر دیئے۔۔۔۔ میں ڈرپوک ہوں۔۔۔۔ میں ڈرپوک ہوں۔۔۔۔ لعنت ہو مجھ پر!''

اس نے کئی لعنتیں اپنے آپ پر بھیجیں مگر خاطر خواہ اثر پیدا نہ ہوا۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے لیٹا رہا۔

گرمیوں کے دن تھے نصف رات گزرنے پر بھی ہوا ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی بازار میں آمد و رفت بہت کم تھی گنتی کی صرف چند دکانیں کھلی تھیں فضا خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی البتہ کبھی کبھی کسی کوٹھے سے ہوا کے گرم جھونکے کے ساتھ تھکی ہوئی موسیقی کا ایک ٹکڑا اڑ کر ادھر چلا آتا تھا اور گاڑھی خاموشی میں گھل جاتا تھا۔

جاوید کے سامنے یعنی مائی جیواں کے قحبہ خانے سے ادھر ہٹ کر بڑے بازار میں جو دکانوں کے اوپر کوٹھوں کی ایک قطار تھی اس میں کئی جگہ زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے اس کے بالمقابل کھڑکی میں تیز روشنی کے قمقمے کے نیچے ایک سیاہ فام عورت بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی اس کے سر کے اوپر بجلی کا بلب جل رہا تھا اور ایسا

دکھائی دیتا تھا کہ سفید آگ کا ایک گولا ہے جو پگھل پگھل کر اس ویشیا پر گر رہا ہے۔

جاوید اس سیاہ فام عورت کے متعلق کچھ غور کرنے ہی والا تھا کہ بازار کے اس سرے سے جو اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا بڑے بھدے نعروں کی صورت میں چند آوازیں بلند ہوئیں تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی جھومتے جھامتے شراب کے نشے میں چور نمودار ہوئے تینوں کے تینوں اس سیاہ فام عورت کے کوٹھے کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور جاوید کے کانوں نے ایسی ایسی واہیات باتیں سنیں کہ اس کے تمام ارادے اس کے اندر سمٹ کر رہ گئے۔

ایک شرابی نے جس کے قدم بہت زیادہ لڑکھڑا رہے تھے، اپنے مونچھوں بھرے ہونٹوں سے بھری بھدی آواز کے ساتھ ایک بوسہ نوچ کر اس کالی ویشیا کی طرف اچھالا اور ایک ایسا فقرہ کسا کہ جاوید کی ساری ہمت پست ہو گئی کوٹھے پر برقی لیمپ کی روشنی میں اس سیاہ فام عورت کے ہونٹ ایک آبنوسی قہقہے نے وا کئے اور اس نے شرابی کے فقرے کا جواب یوں دیا جیسے ٹوکری بھر کوڑا نیچے پھینک دیا ہے نیچے غیر مربوط قہقہوں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا اور جاوید کے دیکھتے دیکھتے وہ تینوں شرابی کوٹھے پر چڑھے تھوڑی دیر کے بعد وہ نشست جہاں وہ کالی ویشیا بیٹھی تھی، خالی ہو گئی۔

جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ متنفر ہو گیا۔ ’’تم ------ تم ------ تم کیا ہو؟ --- میں پوچھتا ہوں، آخر تم کیا ہو ------ نہ تم یہ ہو، نہ تم وہ ہو ------ نہ تم انسان ہو نہ حیوان ------ تمہاری ذہانت ذکاوت آج سب دھری کی دھری رہ گئی ہے تین شرابی آتے ہیں، تمہاری طرح ان کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا لیکن بے

دھڑک اس ویشیا سے واہیات باتیں کرتے ہیں اور ہنستے، قہقہے لگاتے کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں گویا پتنگ اڑانے جا رہے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ تم۔۔۔ اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے یوں بے وقوفوں کی طرح بیچ بازار میں کھڑے ہو اور ایک بے جان لالٹین سے خوف کھا رہے ہو تمہارا ارادہ اس قدر صاف اور شفاف ہے لیکن پھر بھی تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے۔۔۔ لعنت ہو تم پر"

جاوید کے اندر ایک لمحے کے لیے خود انتقامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے قدموں میں جنبش ہوئی اور موری پھاند کر وہ مائی جیواں کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سیڑھیوں کے پاس پہنچ جائے کہ اوپر سے ایک آدمی اترا۔ جاوید پیچھے ہٹ گیا غیر ارادی طور پر اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش بھی کی لیکن کوٹھے پر سے نیچے آنے والے آدمی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس آدمی نے اپنا ململ کا کرتہ اتار کر کاندھے پر دھرا تھا اور داہنی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا مسلا ہوا ہار لپیٹا تھا اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا جاوید کے وجود سے بے خبر وہ اپنے تہمد کو دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں تک اونچا کیے نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش طے کر کے موری کے اس پار چلا گیا اور جاوید نے سوچنا شروع کیا کہ اس آدمی نے اس کی طرف کیوں نہیں دیکھا۔

اس دوران میں اس نے لالٹین کی طرف دیکھا تو وہ اسے یہ کہتی معلوم ہوئی تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ تم ڈرپوک ہو یاد ہے تمہیں، پچھلے برس برسات میں جب تم نے اس ہندو لڑکی اندرا سے اپنی محبت کا

اظہار کرنا چاہا تھا تو تمہارے جسم میں سکت تک نہیں رہی تھی کیسے کیسے بھیانک خیال تمہارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے یاد ہے تم نے ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی سوچا تھا اور ڈر گئے تھے اس لڑکی کو تم نے اسی ڈر کے مارے بھلا دیا اور حمیدہ سے تم اس لیے محبت نہ کر سکے کہ وہ تمہاری رشتہ دار تھی اور تمہیں اس بات کا خوف تھا کہ تمہاری محبت کو غلط نظروں سے دیکھا جائے گا کیسے کیسے وہم تمہارے اوپر ان دنوں مسلط تھے۔۔۔۔اور پھر تم نے بلقیس سے محبت کرنا چاہی مگر اس کو صرف ایک بار دیکھ کر تمہارے سب ارادے غائب ہو گئے اور تمہارا دل ویسے کا ویسے بنجر رہا۔۔۔۔۔۔کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے اپنی بے لوث محبت کو آپ ہی شک کی نظروں سے دیکھا ہے تمہیں اس بات کا کبھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمہاری محبت ٹھیک فطری حالت میں ہے تم ہمیشہ ڈرتے ہو اس وقت بھی تم خائف ہو یہاں گھریلو عورتوں اور لڑکیوں کا سوال نہیں، ہندو مسلم فساد کا بھی اس جگہ کوئی خدشہ نہیں لیکن اس کے باوجود تم کبھی اس کوٹھے پر نہیں جا سکو گے۔ میں دیکھوں گی تم کس طرح اوپر جاتے ہو جاوید کی رہی سہی ہمت بھی پست ہو گئی اس نے محسوس کیا وہ واقعی پرلے درجے کا ڈرپوک ہے۔۔۔۔۔بیتے ہوئے واقعات تیز ہوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح اس کے دماغ میں دیر تک پھڑ پھڑاتے رہے اور پہلی مرتبہ اس کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس کے وجود کی بنیادوں میں ایک ایسی جھجک بیٹھی ہوئی ہے جس نے اسے قابل رحم حد تک ڈرپوک بنا دیا ہے۔

سامنے سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز آئی تو جاوید اپنے خیالات سے

چونک پڑا وہی جو گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک پہنتی تھی اور جس کے متعلق وہ کئی بار اپنے دوست سے سن چکا تھا سیڑھیوں کے اختتامی چبوترے پر کھڑی تھی، جاوید گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ وہ آگے سرک جائے اس نے بڑے بھدے طریقے پر اسے آواز دی ''اجی ٹھہر جاؤ میری جان گھبراؤ نہیں ۔۔۔۔آؤ۔۔۔آؤ۔'' اس کے بعد اس نے پچکارتے ہوئے کہا'' چلے آؤ۔۔۔۔آجاؤ''

یہ سن کر جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا تو اس کی پیٹھ میں دم اگ آئے گی جو اس ویشیا کے پچکارنے پر ہلنا شروع کر دے گی اس احساس سمیت اس نے چبوترے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا مائی جیواں کے قحبہ خانے کی اس عینک چڑھی لونڈیا نے کچھ اس طرح اپنے بالائی جسم کو حرکت دی کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے بیروں کے مانند جھڑ گئے۔ اس نے پھر پچکارا'' آؤ۔۔۔۔میری جان! اب آ بھی جاؤ''

جاوید اٹھ بھاگا موری پھاند کر جب وہ بازار میں پہنچا تو اس نے ایک ایسے قہقہے کی آواز سنی جو خطرناک طور پر بھیانک تھا وہ کانپ اٹھا۔

جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اس کے خیالات کے ہجوم میں سے دفعتاً ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا جس نے اس کو تسکین دی'' جاوید! تم ایک بہت بڑے گناہ سے بچ گئے خدا کا شکر بجا لاؤ۔''

☆☆☆☆☆

رام کھلاون

کھٹمل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا۔۔۔۔۔۔میں نے اس تصویر سے اس کو پر کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔۔مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ مفلسی کے زمانے میں میرے پاس صرف اتنے کپڑے تھے جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضعداری قائم رکھ سکتے تھے۔

میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں ماہم جا رہا تھا دھوبی شریف آدمی تھا، یعنی دھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میرے کپڑے لے آتا تھا لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو، میری نادہندگی سے تنگ آکر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے اور مجھے اپنی شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی۔

کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بو پھیلی ہوئی تھی میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباؤں کہ دھوبی آگیا ''صاحب سلام'' کر کے اس نے اپنی گٹھڑی کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیے ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے

دیکھنا شروع کر دیا اور ایک عجیب و غریب آواز حلق سے نکالی ''ہے ہے ہے ہیں''

میں نے اس سے پوچھا ''کیا بات ہے دھوبی؟''

دھوبی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں ''یہ تو ساعید شالیم بالشٹر ہے؟''

''کون؟''

دھوبی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا ''ساعید شالیم بالشٹر

''تم جانتے ہو نہیں''

دھوبی نے زور سے سر ہلایا ''ہاں۔۔۔دو بھائی ہوتا۔۔۔ادھر کولا با میں ان کا کوٹھی ہوتا۔۔۔ساعید شالیم بالشٹر۔۔۔میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا''

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہو گی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک برس بمبے میں پریکٹس کی تھی چنانچہ میں نے اس سے کہا ''دس برس پہلے کی بات کرتے ہو تم''

دھوبی نے زور سے سر ہلایا ''ہاں۔۔۔۔ساعید شالیم بالشٹر جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی دیا۔۔۔ایک دھوتی دیا۔۔۔ایک کرتہ دیا۔۔۔نیا بہت اچھا لوگ ہوتا۔۔۔ایک کا ڈاڑھی ہوتا۔۔۔یہ بڑا'' اس نے ہاتھ سے ڈاڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ چھوٹا ہوتا۔۔۔اس کا تین باوا لوگ ہوتا دو لڑکا، ایک لڑکی۔۔۔۔ہمارے سنگ بہت کھیلتا ہوتا۔۔۔کولابے میں کوٹھی ہوتا۔۔۔۔بہت بڑا''

میں نے کہا ''دھوبی یہ میرے بھائی ہیں''

دھوبی نے حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی'' ہے ہے ہے

ہیں۔۔۔۔۔ساعید شالیم بالشعر؟''

میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا''یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے۔۔۔ڈاڑھی والے محمد حسن ہیں۔۔۔۔ہم سب سے بڑے''

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غلاظت کا جائزہ لیا۔۔۔ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی بجلی کی لائٹ سے محروم، ایک میز تھا ایک کرسی ار ایک ٹاٹ کی کوٹ جس میں ہزار ہا کھٹمل تھے دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعید شالیم بالشعر کا بھائی ہوں لیکن جب میں نے اس کو ان کی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا''ساعید شالیم بالشعر کولابے میں رہتا اور تم اس کھولی میں''

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا''دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی۔۔۔۔کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔۔۔۔پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں''

''ہاں صاحب۔۔۔۔۔تم بروبر کہتا ہے''یہ کہہ کر دھوبی نے گٹھڑی اٹھائی اور باہر جانے لگا مجھے اس کے حساب کا خیال آیا جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک جانے کے لئے بمشکل کافی تھے صرف یہ بتانے کے لئے کہ میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھہرایا اور کہا''دھوبی۔۔۔کپڑوں کا حساب یاد رکھنا۔۔۔خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں۔''

دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا''ساب ہم حساب نہیں رکھت۔۔۔ساعید شالیم بالشعر کا ایک برس کام کیا۔۔۔جو دے دیا لے

لیا۔۔۔ہم حساب جانت ہی نا ہیں"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

بات چیت کامیاب رہی ۔۔۔۔۔۔میری شادی وہ گئی حالات بھی بہتر ہو گئے اور میں سیکنڈ پیر خان، اسٹریٹ کی کھولی سے جس کا کرایہ نو روپے ماہوار تھا کلیئر روڈ کے ایک فلیٹ میں جس کا کرایہ پینتیس روپے ماہوار تھا، اٹھ آیا اور دھوبی کو ماہ بہ ماہ باقاعدگی سے اس کی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا "بیگم صاحب۔۔۔۔صاب کا بھائی ساعید سالیم بالشٹر بہت بڑا آدمی ہوتا۔۔۔۔۔ادھر کولابہ میں رہتا ہوتا۔۔۔۔۔۔جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔۔۔تمہارا صاب بھی ایک دن بڑا آدمی بنتا ہوتا۔"

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سنا چکا تھا اور اس کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ مفلسی کے زمانے میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا تھا۔۔۔۔جب دے دیا جو دے دیا۔ اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی۔۔۔۔۔لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہوگئی کہ وہ حساب نہیں کرتا میں نے اس سے کہا "چار برس میرا کام کرتا رہا ہے۔۔۔۔اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔"

جواب ملا "حساب کیوں کرتا۔۔ویسے دوگنے چوگنے وصول کر لیتا ہوگا"

"وہ کیسے؟"

" آپ نہیں جانتے۔۔۔۔جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو

ایسے لوگ بے وقوف بنانا جانتے ہیں‘‘

قریب قریب ہر مہینے دھوبی سے میری بیوی کی چخ چخ ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا ’’بیگم صاحب۔۔۔ ہم حساب جانت ناہیں ہم جھوٹ ناہیں بولے گا۔۔۔ ساعید شالیم بالشفر جو تمہارے صاحب کا بھائی ہوتا۔۔۔ ہم ایک برس اس کا کام کیا کرتا۔ بیگم صاب بولتا دھوبی تمہارا اتنا پیسہ ہوا۔۔۔ ہم بولتا ٹھیک ہے۔‘‘

ایک مہینے ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے میری بیوی نے آزمانے کے لیے اس سے کہا ’’دھوبی اس مہینے ساٹھ کپڑے ہوئے‘‘

اس نے کہا ’’ٹھیک ہے۔۔۔ بیگم صاب! تم جھوٹ ناہیں بولے گا‘‘

میری بیوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیئے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھو کر سلام کیا اور چلنے لگا میری بیوی نے اسے روکا ’’ٹھہرو دھوبی۔۔۔ ساٹھ نہیں، ڈھائی سو کپڑے تھے۔۔۔ لو اپنے باقی روپے میں نے مذاق کیا تھا۔‘‘

دھوبی نے صرف اتنا کہا ’’بیگم صاب تم جھوٹ ناہیں بولے گا‘‘ باقی کے روپے اپنے ماتھے کے ساتھ چھوا کر سلام کیا اور چلا گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دلی چلا گیا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا، پھر واپس بمبئی آ گیا اور ماہم میں رہنے لگا تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوبی تبدیل کیے کیونکہ بے حد بے ایمان اور جھگڑالو تھے۔ ہر دھلائی پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا کبھی

کپڑے کم نکلتے تھے کبھی دھلائی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ہمیں اپنا پرانا دھوبی یاد آنے لگا ایک روز جب کہ ہم بالکل بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے وہ اچانک آ گیا اور کہنے لگا صاب کو ہم نے تک دن بس میں دیکھا۔۔۔۔۔۔ہم بولا ایسا کیسا۔۔۔ صاب تو دلی چلا گیا تھا۔۔۔ہم نے ادھر بانی کھلہ میں تپاس کیا چھاپہ والا بولا، ادھر ماہم میں تپاس کرو۔۔۔۔باجو والی چالی میں صاب کا دوست ہوتا۔۔۔۔اس سے پوچھا اور آ گیا۔

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

کانگریس برسر اقتدار آئی تو امتناع شراب کا حکم نافذ ہو گئے انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہو گئی ننانوے فیصدی دھوبی شراب کے عادی تھے۔۔۔۔دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔۔۔۔۔۔ہمارا دھوبی بیمار ہو گیا اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری بکتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑبڑ پیدا ہو گئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔

میں بے حد مصروف تھا صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی نوکر اور شوفر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی ڈاکٹر بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا لیکن میری بیوی نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے''

ڈاکٹر مسکرایا ''تو آدھا آدھا کر لیجئے''

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کر لی

دھوبی کا باقاعدہ علاج ہوا معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی سے دور ہو گئی نقاہت تھی وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال سے ختم ہو گئی چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا بھگوان صاحب کو سا عید شالیم بالشٹر بنائے۔۔۔ادھر کولا بے میں صاب رہنے کو جائے۔۔۔باوا لوگ ہوں۔۔۔بہت بہت پیسہ ہو۔۔۔۔۔بیگم صاب دھوبی کو لینے آیا۔۔۔۔موٹر میں۔۔ادھر کلے (قلعے) میں بہت بڑے ڈاکدر کے پاس لے گیا جس کے پاس میم ہوتا۔۔۔بھگوان بیگم صاب کو خس رکھے۔۔۔۔۔

کئی برس گزر گئے اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے دھوبی بلا ناغہ اتوار کو آتا رہا اس کی صحت اب بہت اچھی تھی اتنا عرصہ گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا ہمیشہ دعائیں دیتا تھا شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کرتا تھا پر اب نام تک نہ لیتا تھا سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن دور کرنے کے لیے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کیے جانے لگے میری بیوی لاہور چلی گئی۔

جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو میں نے دھوبی سے کہا '' دیکھو دھوبی اب تم کام بند کر دو۔۔۔یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے ایسا نہ ہو کوئی تمہیں مار ڈالے''

دھوبی مسکرایا ''صاب اپن کو کوئی نہیں مارتا''

ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہوئیں مگر دھوبی برابر آتا رہا

ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا سکور درج تھا اور پہلے صفحے پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار۔۔۔ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوبی آ گیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کر دی تو دھوبی نے ہنس ہنس کے باتیں شروع کر دیں ساعید شالیم بالشٹر بہت اچھا آدمی ہوتا۔۔۔ یہاں سے جاتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا۔۔۔ تمہارا بیگم صاب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا۔۔۔ باہر گام گیا ہے نا؟۔۔۔ اپنے ملک میں؟۔۔۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا سلام بولا۔۔۔ موٹر لے کر آیا ہماری کھولی میں۔۔۔ ہم کو اتنا جلاب آتا ہوتا ڈاکڈر نے سوئی لگایا۔۔۔ ایک دم ٹھیک ہو گیا۔۔۔ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا سلام بولا۔۔۔ بولو رام کھلاون بولتا ہے ہم کو بھی کاگج لکھو۔۔۔

میں نے اس کی بات کاٹ کا ذرا تیزی سے کہا ''دھوبی۔۔۔ دارو شروع کر دی؟''

دھوبی ہنستا ''دارو؟۔۔۔ دارو کہاں ملتی ہے صاب؟''

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اس نے میلے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے لاہور سے تار پر تار آنے

لگے کہ سب کچھ چھوڑو اور جلدی چلے آؤ میں نے ہفتے کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دوں گا۔۔۔لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا کپڑے دھوبی کے پاس تھے میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کر لے آؤں، چنانچہ شام کو وکٹوریہ لے کر مہالکشمی روانہ ہو گیا۔

کرفیو کے وقت میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، اس لیے آمد و رفت جاری تھی ٹریمیں چل رہی تھیں میری وکٹوریہ پل کے پاس پہنچی تو ایک دم شور برپا ہوا لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔۔۔ہجوم چھدرا ہوا تو دیکھا دور بھٹیوں کے پاس بہت سے دھوبی لاٹھیاں ہاتھ میں لیے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کر دیا میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا۔۔۔جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک دھوبی سے پوچھا ’’رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟‘‘

ایک دھوبی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جھومتا ہوا اس دھوبی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا تھا ’’کیا پوچھت ہے؟‘‘

’’پوچھت ہے رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟‘‘

شراب سے دھت دھوبی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا ’’تم کون ہے؟‘‘

’’میں؟۔۔۔رام کھلاون میرا دھوبی ہے‘‘

’’رام کھلاون تہارا دھوبی ہے۔۔۔تو کس دھوبی کا بچہ ہے‘‘

ایک چلایا "ہندو دھوبی کا یا مسلمین دھوبی کا"

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں چور تھے مکے تانتے اور لاٹھیاں گھماتے میرے اردگرد جمع ہو گئے مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا مسلمان ہوں یا ہندو؟ ۔۔۔۔۔۔ میں بے حد خوفزدہ ہو گیا بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا جس کو مدد کے لیے پکارتا ۔۔۔۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر دی "رام کھلاون ہندو ہے ۔۔۔۔ ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے ۔۔۔ اس کی کھولی کہاں ہے ۔۔۔۔۔۔ دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے ۔۔۔۔ بہت بیمار تھا ۔۔۔ ہم نے اس کا علاج کرایا تھا ۔۔۔ ہماری بیگم ۔۔۔۔ ہماری میم صاحب یہاں موٹر لے کر آئی تھی ۔۔۔" یہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لئے کتنی نیچی سطح پر اتر آتا ہے اس احساس نے جرأت پیدا کر دی چنانچہ میں نے ان سے کہا "میں مسلمین ہوں"

"مار ڈالو ۔۔۔ مار ڈالو ۔۔۔۔۔۔" کا شور بلند ہوا

وہ دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا "ٹھہرو ۔۔۔۔۔۔ اسے رام کھلاون مارے گا"

میں نے پلٹ کر دیکھا رام کھلاون موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لیے لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا میں نے تحکمانہ لہجے میں

کہا ''رام کھلاون''

رام کھلاون دھاڑا ''چپ کر بے رام کھلاون کے۔۔۔۔''

میری آخری امید بھی ڈوب گئی جب وہ میرے قریب آ پہنچا تو میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا ''مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون؟''

رام کھلاون نے وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔۔۔ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں، ڈنڈا ہاتھ سے گر کر اس نے قریب آ کر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا ''صاب!'' پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا ''یہ مسلمین نہیں۔۔۔یہ میرا صاب ہے۔۔۔بیگم صاب کا صاب۔۔۔۔۔۔وہ موٹر لے کر آیا تھا۔۔۔۔ڈاکدر کے پاس لے گیا تھا۔۔۔جس نے میرا جلاب ٹھیک کیا تھا''

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔۔۔۔سب شرابی تھے تو تو میں میں شروع ہو گئی کچھ دھوبی رام کھلاون کی طرف ہو گئے اور رہا تھا پائی پر نوبت آ گئی میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب میرا سامان تیار تھا صرف جہاز کے ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔

میں بہت بے قرار تھا دل میں طرح طرح کے جذبات ابل رہے تھے جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آ جائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چل دوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہو گئی تو میرا فلیٹ مجھے اپنے اندر قید کر لے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی میں نے سوچا ٹکٹ آ گئے دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

’’صاب سلام‘‘

’’سلام‘‘

میں اندر آ جاؤں

’’آؤ‘‘

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا گٹھڑی کھول کر اس نے کپڑے پلنگ پر رکھے دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا ’’آپ جا رہے ہیں صاب؟‘‘

’’ہاں‘‘

اس نے رونا شروع کر دیا ’’صاب! مجھے ماف کر دو۔۔۔۔۔۔۔یہ سب دارو کا قصور تھا۔۔۔۔اور دارو۔۔۔۔دارو آج کل مفت ملتی ہے۔۔۔۔۔۔سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو۔۔۔۔۔۔مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے صاب۔۔۔۔۔ہم کو ماف کر دو۔۔۔۔۔۔ہم پیئے لا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ساعید شالیم بالشٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا۔۔۔۔ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا تمہارا بیگم صاب ہمارا جان بچایا ہوتا۔۔۔۔جلاب سے ہم مرتا ہوتا۔۔۔۔وہ موٹر لے کر آتا ڈاکڈر کے پاس لے جاتا اتنا پیسہ خرچ کرتا۔۔۔۔تم ملک جاتا۔۔۔۔بیگم صاب سے مت بولنا، رام کھلاون۔۔۔۔۔‘‘

اس کی آواز گلے میں رندھ گئی گٹھڑی کی چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا تو میں نے روکا ’’ٹھہرو رام کھلاون‘‘

لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

رحمت خداوندی کے پھول

''زمیندار'' اخبار میں جب ڈاکٹر راتھر پر رحمت خداوندی کے پھول بجتے تھے تو یاردوستوں نے غلام رسول کا نام ڈاکٹر راتھر رکھ دیا تھا معلوم نہیں کیوں، اس لیے کہ غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر سے کوئی نسبت نہیں تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایم بی بی ایس میں تین بار فیل ہو چکا تھا مگر کہاں ڈاکٹر راتھر، کہاں غلام رسول۔

ڈاکٹر راتھر ایک اشتہاری ڈاکٹر تھا جو اشتہاروں کے ذریعے سے قوت مردمی کی دوائیں بیچتا تھا خدا اور اس کے رسول کی قسمیں کھا کھا کر اپنی دواؤں کو مجرب بتاتا تھا اور یوں سینکڑوں روپے کماتا تھا غلام رسول کو ایسی دواؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ شادی شدہ تھا اور اس کی قوت مردمی بڑھانے والی چیزوں کی کوئی حاجت نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کے یار دوست اس کو ڈاکٹر راتھر کہتے تھے۔ اس کایا کلپ کو اس نے تسلیم کر لیا تھا اس لیے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا اس کے دوستوں کو یہ نام پسند آ گیا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ غلام رسول کے مقابلے میں ڈاکٹر راتھر کہیں زیادہ ماڈرن ہے۔

اب غلام رسول کو ڈاکٹر راتھر ہی کے نام سے یاد کیا جائے گا اس لیے کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور نہ بننا چاہتا تھا وہ ایک اطاعت مند بیٹے کی طرح اپنے ماں باپ کی خواہش کے مطابق میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا اتنے عرصے سے کہ اب کالج کی

عمارت اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کے کسی بزرگ کا گھر ہے جہاں اس کو ہر روز سلام عرض کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔

اس کے والدین مصر تھے کہ وہ ڈاکٹری پاس کرے اس کے والد کو یقین تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر کی صلاحیتیں رکھتا ہے اپنے بڑے لڑکے کے متعلق مولوی صباح الدین نے اپنی بیوی سے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بیرسٹر ہوگا، چنانچہ جب اس کو ایل ایل بی پاس کرا کے لندن بھیجا گیا تو وہ بیرسٹر بن کر ہی آیا یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی پریکٹس دوسرے بیرسٹروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔

گو ڈاکٹر راتھر تین مرتبہ ایم بی بی ایس کے امتحان میں فیل ہو چکا تھا مگر اس کے باپ کو یقین تھا کہ وہ انجام کار بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ڈاکٹر راتھر اپنے باپ کا اس قدر فرمانبردار تھا کہ اس کو بھی یقین تھا کہ ایک روز وہ لنڈن کے ہارلے اسٹریٹ میں بیٹھا ہوگا اور اس کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوگی۔

ڈاکٹر راتھر میں بے شمار خوبیاں تھیں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ سادہ لوح تھا لیکن سب سے بڑی برائی اس میں یہ تھی کہ پیتا تھا اور اکیلا پیتا تھا شروع شروع میں تو اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ ملائے لیکن یار دوستوں نے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا ان کو اس کا ٹھکانا معلوم ہو گیا، سیوائے بار، میں شام کو سات بجے پہنچ جاتے مجبوراً ڈاکٹر راتھر کو انہیں اپنے ساتھ پلانا پڑتی۔ یہ لوگ اس کا گن گاتے، اس کے مستقبل کے متعلق بڑی حوصلہ افزا باتیں کرتے راتھر نشے کی ترنگ میں بہت خوش ہوتا اور اپنی جیب خالی کر دیتا۔

پانچ چھ مہینے اسی طرح گزر گئے اس کو اپنے باپ سے دو سو روپے ماہوار ملتے

تھے رہتا الگ تھا، مکان کا کرایہ بیس روپے ماہانہ تھا دن اچھے تھے ورنہ راتھر کی بیوی کو فاقے کھینچنے پڑتے لیکن پھر بھی اس کا ہاتھ تنگ ہو گیا اس لیے کہ راتھر کو دوسروں کو پلانا پڑتی تھی۔

ان دنوں شراب بہت سستی تھی آٹھ روپے کی ایک بوتل، ادھار چار روپے آٹھ آنے میں ملتا تھا مگر ہر روز ایک ادھار لینا، یہ ڈاکٹر راتھر کی بساط سے باہر تھا اس نے سوچا کہ گھر میں پیا کرے مگر یہ کیسے ممکن تھا اس کی بیوی فوراً طلاق لے لیتی اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا خاوند شراب کا عادی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو شرابیوں سے سخت نفرت تھی، نفرت ہی نہیں ان سے بہت خوف آتا تھا کسی کی سرخ آنکھیں دیکھتی تو ڈر جاتی ''ہائے ڈاکٹر صاحب، کتنی ڈراؤنی آنکھیں تھیں اس آدمی کی۔۔۔۔ایسا لگتا تھا کہ شرابی ہے۔''

اور ڈاکٹر راتھر دل ہی دل میں سوچتا کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں، کیا پی کر آنکھوں میں سرخ ڈورے آتے ہیں؟ کیا اس کی بیوی کو اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ نظر نہیں آئیں؟ کب تک اس کا راز راز رہے گا؟ منہ سے بو تو ضرور آتی ہو گی۔۔۔۔کیا وجہ ہے کہ اس کی بیوی نے کبھی نہیں سونگھی پھر وہ یہ سوچتا ''نہیں'' میں بہت احتیاط برتتا ہوں میں نے ہمیشہ منہ پرے کر کے اس سے بات کی ہے ایک دفعہ اس نے پوچھا تھا کہ آپ کی آنکھیں آج سرخ کیوں ہیں تو میں نے اس سے کہا تھا، دھول پڑ گئی ہے اسی طرح ایک بار اس نے دریافت کیا تھا، یہ بو کیسی ہے، تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا۔ آج سگار پیا تھا۔۔۔۔بہت بو ہوتی ہے کم بخت میں

ڈاکٹر راتھر اکیلا پینے کا عادی تھا اس کو ساتھی نہیں چاہیے تھے وہ کنجوس تھا اس کے علاوہ اس کی جیب بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ دوستوں کو پلائے اس نے بہت سوچا کہ ایسی ترکیب کیا ہو سکتی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی یہ مسئلہ کچھ اس طرح حل ہو کہ وہ گھر میں پیا کرے جہاں اس کے دوستوں کو شرکت کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر راتھر، پورا ڈاکٹر تو نہیں تھا لیکن اس کو ڈاکٹری کی چند چیزوں کا علم ضرور تھا وہ اتنا جانتا تھا کہ دوائیں بوتلوں میں ڈال کر دی جاتی ہیں اور ان پر اکثر یہ لکھا ہوتا ہے۔ ''شیک دی بوٹل بی فور یوز'' اس نے اتنے علم پر اپنی ترکیب کی دیواریں استوار کیں آخر میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نے سوچا کہ وہ گھر ہی میں پیا کرے گا سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی وہ دوا کی بوتل میں شراب ڈلوا کر گھر رکھ دے گا بیوی سے کہے گا کہ اس کے سر میں درد ہے اور اس کے استاد ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے یہ نسخہ دیا ہے اور کہا ہے کہ شام کو ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک خوراک پانی کے ساتھ پیا کرے، انشاءاللہ شفا ہو جائے گی۔

یہ ترکیب تلاش کر لینے پر ڈاکٹر راتھر بے حد خوش ہوا اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس نے امریکہ دریافت کر لیا ہے، چنانچہ صبح سویرے اٹھ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا'' نسیمہ، آج میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔۔ایسا لگتا ہے پھٹ جائے گا۔''

نسیمہ نے بڑے تردد سے کہا'' کالج نہ جائیے آج''

ڈاکٹر راتھر مسکرایا ''پگلی! آج تو مجھے ضرور جانا چاہیے۔۔۔۔۔ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ صاحب سے پوچھوں گا ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔ضرور جایئے۔۔۔میرے متعلق بھی ان سے بات کیجئے گا''

نسیمہ کو سیلان الرحم کی شکایت تھی جس سے ڈاکٹر راتھر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی ،مگر اس نے کہا ''ہاں بات کروں گا۔۔۔۔مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لیے کوئی نہایت ہی کڑوی اور بدبودار دوا تجویز کر دیں گے''

''آپ خود ڈاکٹر ہیں دوائیں مٹھائیاں تو نہیں ہوتیں''

''ٹھیک ہے ،لیکن بدبودار دواؤں سے مجھے نفرت ہے''

''آپ دیکھئے تو سہی کیسی دوا دیتے ہیں ابھی سے کیوں ایسی رائے قائم کر رہے ہیں آپ؟''

''اچھا'' کہہ کر ڈاکٹر راتھر اپنے سر کو دباتا کالج چلا گیا شام کو وہ دوا کی بوتل میں وسکی ڈلوا کر لے آیا اور اپنی بیوی سے کہا ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ ضرور کوئی ایسی دوا لکھ کر دیں گے جو بے حد کڑوی اور بدبودار ہو گی۔۔۔لو ذرا اسے سونگھو'' بوتل کا کارک اتار کر اس نے بوتل کا منہ اپنی بیوی کی ناک کے ساتھ لگا دیا اس نے سونگھا اور ایک دم ناک ہٹا کر کہا ''بہت واہیات سی بو ہے''

''اب ایسی دوا کون پئے؟''

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔آپ ضرور پئیں گے۔۔۔۔سر کا درد کیسے دور ہو گا''

"ہو جائے گا اپنے آپ"

"اپنے آپ کیسے دور ہوگا۔۔۔یہی تو آپ کی بری عادت ہے دوا لاتے ہیں مگر استعمال نہیں کرتے"

"یہ بھی کوئی دوا ہے۔۔۔ایسا لگتا ہے جیسے شراب ہے"

"آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انگریزی دواؤں میں شراب ہوا کرتی ہے"

"لعنت ہے ایسی دواؤں پر"

ڈاکٹر راٹھر کی بیوی نے خوراک کے نشان دیکھے اور حیرت سے کہا "اتنی بڑی خوراک"

ڈاکٹر راٹھر نے برا سا منہ بنایا "یہی تو مصیبت ہے"

"آپ مصیبت مصیبت نہ کہیں، اللہ کا نام لے کر پہلی خوراک پئیں۔۔۔۔۔۔۔پانی کتنا ڈالنا ہے۔"

ڈاکٹر راٹھر نے بوتل اپنی بیوی کے ہاتھ سے لی اور مصنوعی طور پر بادل ناخواستہ کہا "سوڈا منگوانا پڑے گا۔۔۔عجیب وغریب دوا ہے۔۔۔پانی نہیں سوڈا"

یہ سن کر نسیمہ نے کہا "سوڈا اس لیے کہا ہوگا کہ آپ کا معدہ خراب ہے"

"خدا معلوم کیا خراب ہے" یہ کہہ کر ڈاکٹر راٹھر نے ایک خوراک گلاس میں ڈالی "بھئی خدا کی قسم میں نہیں پیوں گا"

بیوی نے بڑے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "نہیں۔۔۔پی جائیے۔۔۔۔ناک بند کر لیجئے۔۔۔۔میں اسی طرح فیور مکسچر پیا کرتی ہوں"

ڈاکٹر راتھر نے بڑے نخرے کے ساتھ شام کا پہلا پیگ پیا، بیوی نے اس کو شاباش دی اور کہا "پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک خدا کے فضل و کرم سے درد یوں چٹکیوں سے دور ہو جائے گا"

ڈاکٹر راتھر نے سارا ڈھونگ کچھ ایسے خلوص سے رچایا تھا کہ اس کو محسوس ہی نہ ہوا کہ اس نے دوا کے بجائے شراب پی ہے، لیکن جب ہلکا سا سرور اس کے دماغ میں نمودار ہوا تو وہ دل ہی دل میں خوب ہنسا ترکیب خوب تھی اس کی بیوی نے عین پندرہ منٹ کے بعد دوسری خوراک گلاس میں انڈیلی اس میں سوڈا ڈالا اور ڈاکٹر راتھر کے پاس لے آئی "یہ لیجئے دوسری خوراک۔۔۔کوئی ایسی بری بو تو نہیں ہے۔"

ڈاکٹر راتھر نے گلاس پکڑ کر بڑی بد دلی سے کہا "تمہیں پینا پڑے تو معلوم ہو۔۔۔۔خدا کی قسم شراب کی سی بو ہے۔۔۔۔۔ذرا سونگھ کر تو دیکھو"

"آپ تو بالکل میری طرح ضد کرتے ہیں"

"نسیمہ! خدا کی قسم ضد نہیں کرتا۔۔۔۔ضد کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے لیکن۔۔۔۔خیر، ٹھیک ہے" یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے گلاس منہ سے لگایا اور شراب کا دوسرا پیگ غٹا غٹ چڑھا گیا۔

تین خوراکیں ختم ہو گئیں ڈاکٹر راتھر نے کسی قدر افاقہ محسوس کیا لیکن دوسرے روز پھر سر میں درد عود کر آیا ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے کہا "ڈاکٹر سید رمضان علی شاہ نے کہا ہے کہ یہ مرض آہستہ آہستہ دور ہو گا لیکن دوا کا استعمال برابر جاری رہنا چاہیے خدا معلوم کیا نام لیا تھا انہوں نے بیماری کا۔۔۔۔۔کہا تھا معمولی سر کا درد

ہوتا تو وہ خوراکوں ہی سے دور رہو جاتا مگر تمہارا کیس ذرا سیریس ہے۔''

یہ سن کر نسیمہ نے تردد سے کہا ''تو آپ کو دوا اب باقاعدہ پینی پڑے گی''

''میں نہیں جانتا۔۔۔تم وقت پر دے دیا کرو گی تو قہر درویش بر جان درویش پی لیا کروں گا۔''

نسیمہ نے ایک خوراک سوڈے میں حل کر کے اس کو دی اس کی بو ناک میں گھسی تو متلی آنے لگی مر اس نے اپنے خاوند پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ وہ پینے سے انکار کر دے گا۔

ڈاکٹر راتھر نے تین خوراکیں اپنی بیوی کے بڑے اصرار پر پیں وہ بہت خوش تھی کہ اس کا خاوند اس کا کہا مان رہا ہے، کیونکہ بیوی کی بات ماننے کے معاملے میں ڈاکٹر بہت بدنام تھا۔

کئی دن گزر گئے خوراکیں پینے اور پلانے کا سلسلہ چلتا رہا ڈاکٹر راتھر بڑا مسرور تھا کہ اس کی ترکیب سودمند ثابت ہوئی اب اسے دوستوں کا کوئی خدشہ نہیں تھا ہر شام گھر میں بسر ہوتی ایک خوراک پیتا اور لیٹ کر کوئی افسانہ پڑھنا شروع کر دیتا دوسری خوراک عین پندرہ منٹ کے بعد اس کی بیوی تیار کر کے لے آتی۔ اسی طرح تیسری خوراک اس کو بن مانگے مل جاتی۔۔۔ڈاکٹر راتھر بے حد مطمئن تھا اتنے دن گزر جانے پر اس کے اور اس کی بیوی کے لیے یہ دوا کا سلسلہ ایک معمول ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر راتھر اب ایک پوری بوتل لے آیا تھا اس کا لیبل وغیرہ اتار کر اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا ''کیمسٹ میرا دوست ہے اس نے مجھ سے کہا آپ ہر روز تین

خوراکیں لیتے ہیں، دوا آپ کو یوں مہنگی پڑتی ہے پوری بوتل لے جایئے اس میں سے چھوٹی نشانوں والی بوتل میں ہر روز تین خوراکیں ڈال لیا کیجئے۔۔۔۔۔۔بہت سستی پڑے گی اس طرح آپ کو یہ دوا''

یہ سن کر نسیمہ خوش ہوئی کہ چلو بچت ہو گئی ڈاکٹر راتھر بھی خوش تھا کہ اس کے کچھ پیسے بچ گئے، کیونکہ روزانہ کے تین پیگ لینے میں اسے زیادہ دام دینے پڑتے تھے اور بوتل آٹھ روپوں میں مل جاتی تھی۔

کالج سے فارغ ہو کر ڈاکٹر راتھر ایک دن گھر آیا تو اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی ڈاکٹر راتھر نے اس سے کہا ''نسیمہ کھانا نکالو، بہت بھوک لگی ہے۔''

نسیمہ نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا ''کھانا۔۔۔۔۔۔۔۔کیا آپ کھانا کھا نہیں چکے''

''نہیں تو'' ڈاکٹر راتھر نے حیرت سے کہا ''کب دیا تھا میں ابھی کالج سے آرہا ہوں۔''

نسیمہ نے ایک جمائی لی ''جھوٹ ہے۔۔۔۔آپ کالج تو گئے ہی نہیں''

ڈاکٹر راتھر نے سمجھا، نسیمہ مذاق کر رہی ہے چنانچہ مسکرایا ''چلو اٹھو کھانا نکالو سخت بھوک لگی ہے''

نسیمہ نے ایک اور لمبی ''نہیں'' کہی ''آپ جھوٹ بولتے ہیں میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔''

''کب؟'' حد ہو گئی ہے۔۔۔۔چلو اٹھو مذاق نہ کرو'' یہ کہہ کر ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی کا بازو پکڑا ''خدا کی قسم پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں

نسیمہ کھلکھلا کر ہنسی ''چوہے۔۔۔آپ یہ چوہے کیوں نہیں کھاتے؟''

ڈاکٹر راتھر نے بڑے تعجب سے پوچھا ''کیا ہو گیا ہے تمہیں''

نسیمہ نے سنجیدگی اختیار کر کے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے خاوند سے کہا ''میں۔۔میں۔۔۔سر میں درد تھا میرے۔۔۔آپ کی دوا کی دو خو۔۔۔خو۔۔۔خوراکیں پی ہیں۔۔۔۔چوہے۔۔۔۔۔۔چوہے بہت ستاتے ہیں۔۔۔ان کو مارنے والی گولیاں لے آئیے۔۔۔۔۔کھانا؟ نکالتی ہوں کھانا''

ڈاکٹر راتھر نے اپنی بیوی سے صرف اتنا کہا ''تم سو جاؤ، میں کھانا کھا چکا ہوں''

نسیمہ زور سے ہنسی ''میں نے جھوٹ تو نہیں کہا تھا''

ڈاکٹر راتھر نے جب دوسرے کمرے میں جا کر مضطرب حالت میں ''زمیندار'' کا تازہ پرچہ کھولا تو اس کو ایک خبر کی سرخی نظر آئی ''ڈاکٹر راتھر پر رحمت خداوندی کے پھول'' اس کے نیچے یہ درج تھا کہ پولیس نے اس کو دھوکا دہی کے سلسلے میں گرفتار کر لیا ہے۔

غلام رسول عرف ڈاکٹر راتھر نے یہ خبر پڑھ کر یوں محسوس کیا کہ اس پر رحمت خداوندی کے پھول برس رہے ہیں۔

25 جولائی 1950ء

☆☆☆☆☆

رشوت

احمد دین کھاتے پیتے آدمی کا لڑکا تھا۔۔۔۔اپنے ہم عمر لڑکوں میں سب سے زیادہ خوش پوش مانا جاتا تھا۔۔۔۔لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ بالکل خستہ حال ہو گیا۔

اس نے بی اے کیا اور اچھی پوزیشن حاصل کی۔۔۔۔۔۔وہ بہت خوش تھا۔۔۔اس کے والد خان بہادر عطاءاللہ کا ارادہ تھا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں گے۔۔۔۔پاسپورٹ لے لیا گیا تھا۔۔۔۔سوٹ وغیرہ بھی بنوا لیے گئے تھے کہ اچانک خان بہادر عطاءاللہ نے جو بہت شریف آدمی تھے کسی دوست کے کہنے پر سٹہ کھیلنا شروع کر دیا۔

شروع میں انہیں اس کھیل میں کافی منافع ہوا۔۔۔وہ خوش تھے کہ چلو میرے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ ہی نکل آیا۔۔۔۔مگر لالچ بری بلا ہے انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی پشت پر جو گنی ہے۔۔۔۔۔۔جتنے ہی چلے جائیں گے۔

ان کا وہ دوست جس نے ان کو اس راستے پر لگایا تھا بار بار ان سے کہتا تھا ”خان صاحب۔۔۔۔۔ماشاءاللہ آپ قسمت کے دھنی ہیں۔۔۔مٹی میں بھی ہاتھ ڈالیں تو سونا بن جائے“

اور وہ اس قسم کی چاپلوسیوں کے ذریعہ خان بہادر سے سو دو سو روپے اینٹھ لیتا خان بہادر کو بھی تکلیف محسوس نہ ہوتی اس لیے کہ انہیں بغیر محنت کے ہزاروں روپے مل رہے تھے۔

احمد دین ذہین اور باشعور لڑکا تھا۔۔۔۔اس نے ایک دن اپنے باپ سے کہا

’’ابا جی۔۔۔۔۔یہ آپ نے جو سٹہ بازی شروع کی ہے۔۔۔۔۔۔معاف کیجئے گا اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا‘‘

خان بہادر نے تیز لہجے میں اس سے کہا

’’برخوردار تمہیں میرے کاموں میں دخل دینے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے۔۔۔۔۔جتنا روپیہ آ رہا ہے وہ میں اپنے ساتھ قبر میں لے کر نہیں جاؤں گا یہ سب تمہارے کام آئے گا‘‘

احمد دین نے بڑی معصومیت سے پوچھا

’’لیکن ابا جی یہ کب تک آتا رہے گا۔۔۔۔۔۔۔ہو سکتا ہے کل کو یہ جانے بھی لگے‘‘

خان بہادر اور بھنا گئے

’’بکو مت۔۔۔۔۔آتا ہی رہے گا‘‘

روپیہ آتا رہا

لیکن ایک روز خان بہادر نے کئی ہزار روپے کی رقم داؤ پر لگا دی۔۔۔۔۔لیکن نتیجہ صفر نکلا۔۔۔دس ہزار ہاتھ سے دینے پڑے۔

تاؤ میں آ کر انہوں نے بیس ہزار روپے کا سٹہ کھیلا۔۔۔۔۔ان کو یقین تھا کہ ساری کسر پوری ہو جائے گی۔۔۔لیکن صبح جب انہوں نے اخبار دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ بیس ہزار بھی گئے۔

خان بہادر ہمت ہارنے والے نہیں تھے انہوں نے اپنا ایک مکان گروی رکھ کر پچاس ہزار روپے لیے اور سب کے سب اللہ کا نام لے کر چاندی کے سٹے پر لگا دیئے۔

اللہ کا نام تو خیر اللہ کا نام ہے۔۔۔وہ چاندی اور سونے کی مارکیٹ پر کیا کنٹرول کر سکتا ہے۔۔۔صبح ہوئی تو خان بہادر کو معلوم ہوا کہ چاندی کا بھاؤ ایک دم گر گیا ہے۔۔۔ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ دل کے دورے پڑنے لگے۔

احمد دین نے ان سے کہا

''ابا جی۔۔۔۔۔چھوڑ دیجیے اس بکواس کو''

خان بہادر نے بڑے غصہ میں اپنے بیٹے سے کہا

''تم بکواس مت کرو۔۔۔۔۔۔میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہے''

احمد دین نے مودبانہ کہا

''لیکن ابا جان۔۔۔یہ جو آپ کو دل کی تکلیف شروع ہوگئی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟''

''مجھے کیا معلوم۔۔۔۔۔اللہ بہتر جانتا ہے۔۔۔۔۔ایسے عارضے انسان کو ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

احمد دین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا

''جی ہاں۔۔۔۔۔انسان کو ہر قسم کے عارضے ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے مثال کے طور پر اگر آپ کوئی ایسی چیز کھا لیں جس میں ہیضے کے جراثیم ہوں اور۔۔۔''

خان بہادر کو اپنے بیٹے کی یہ گفتگو پسند نہیں تھی

"تم چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔۔میرا مغز مت چاٹو۔۔۔میں ہر چیز سے واقف ہوں"

احمد دین نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا

"یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔۔۔کوئی انسان بھی ہر چیز سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔"

احمد دین چلا گیا

خان بہادر اندرونی طور پر خود کو بہت بڑا چغد سمجھنے لگے تھے لیکن وہ اپنے اس احساس کو اپنے لڑکے پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے

بستر پر لیٹے انہوں نے بار بار خود سے کہا

"خان بہادر عطاء اللہ۔۔۔۔۔۔تم خان بہادر بنے پھرتے ہو۔۔۔۔۔لیکن اصل میں تم اول درجے کے بےوقوف ہو"

"تم اپنے بیٹے کی بات پر کان کیوں نہیں دھرتے۔۔۔۔جبکہ تم جانتے ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے صحیح ہے"

"جتنا روپیہ تم نے حاصل کیا تھا اس سے دوگنا زیادہ تم ضائع کر چکے ہو۔۔۔۔کیا یہ درست ہے۔"

خان بہادر جھنجھلا گئے اور بڑبڑانے لگے

"سب درست ہے۔۔۔۔سب درست ہے۔۔۔ایک میں ہی غلط ہوں لیکن میرا غلط ہونا ہی صحیح ہوگا۔۔۔بعض اوقات غلطیاں بھی صحت کا سامان مہیا

کر دیتی ہیں''

پندرہ دن بستر پر لیٹے اور علاج کرانے کے بعد جب وہ کسی قدر ہی تندرست ہوئے تو انہوں نے اپنا ایک اور مکان بیچ دیا۔۔۔۔یہ پچیس ہزار روپے میں بکا

خان صاحب نے یہ سب روپے سٹے پر لگا دیئے ان کو پوری امید تھی کہ وہ اپنی اگلی پچھلی کسر پوری رک لیں گے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور وہ ان پچیس ہزار روپوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

احمد دین پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔۔۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔۔۔کہ اپنے باپ کو کس طرح سمجھائے۔۔۔۔۔۔۔وہ اس کی کوئی بات سنتے ہی نہیں تھے۔

احمد دین نے آخری کوشش کی۔

اور ایک دن جب اس کا باپ اپنے کمرے میں حقہ پی رہا تھا اور معلوم نہیں کس سوچ میں غرق تھا کہ اس سے ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوا

''ابا جی۔۔۔۔''

خان بہادر صاحب سوچ میں اس قدر غرق تھے کہ انہوں نے اپنے لڑکے کی آواز ہی نہیں سنی۔

احمد دین نے آواز کو ذرا بلند کیا

''ابا جی۔۔۔۔ابا جی۔۔۔''

خان بہادر چونکے

''کیا ہے؟''

احمد دین کانپ گیا

"کچھ نہیں ابا جی ۔۔۔۔۔ مجھے ۔۔۔۔ مجھے آپ سے ایک بات کہنا تھی"

خان بہادر نے حقے کی نڑی اپنے منہ سے جدا کی

"کہو کیا کہنا ہے"

احمد دین نے بڑی لجاجت سے کہا

"مجھے یہ عرض کرنا ہے ۔۔۔۔۔ یہ درخواست کرنا تھی ۔۔۔ کہ ۔۔۔ آپ سٹہ کھیلنا بند کر دیں۔"

حقے کا ایک زوردار کش لے کر وہ احمد دین پر برس پڑے

"تم کون ہوتے ہو مجھے نصیحت کرنے والے ۔۔۔۔۔ میں جانوں میرا کام، کیا اب تک تمہارے ہی مشورے سے میں سارے کام کرتا رہا ہوں ۔۔۔ دیکھو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ میرے معاملے میں کبھی دخل نہ دینا ۔۔۔۔ مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں ۔۔۔۔۔ سمجھے ۔۔۔۔"

احمد دین کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

"جی میں سمجھ گیا"

اور یہ کہہ کر وہ اپنے باپ کے کمرے سے نکل گیا

سٹے کی لت شراب کی عادت سے بھی کہیں زیادہ بری ہوتی ہے ۔۔۔۔ خان بہادر اس میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے کہ جتنی جائیداد تھی ۔۔۔۔ سب کی سب اس خطرناک کھیل کی نذر ہو گئی۔

مرحوم بیوی کے زیور تھے ۔۔۔۔ وہ بھی بک گئے ۔۔۔۔۔ اور نتیجہ اس کا یہ

نکلا کہ ان کے دل کے عارضے نے کچھ ایسی شکل اختیار کی کہ وہ ایک روز صبح سویرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی دھم سے گرے اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر دم توڑ دیا۔

احمد دین کو ظاہر ہے کہ اپنے باپ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔۔۔۔۔۔۔وہ کئی دن نڈھال رہا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔۔۔۔بی اے پاس تھا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔۔مگر اب سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔۔۔۔اس کے باپ نے ایک پھوٹی کوڑی بھی اس کے لیے نہیں چھوڑی تھی۔مکان۔۔۔۔۔جس میں وہ تنہا رہتا تھا۔۔۔۔۔۔رہن تھا۔

یہاں سے اس کو کچھ عرصے کے بعد نکلنا پڑا گھر کی مختلف چیزیں بیچ کر اس نے چار پانچ سو روپے حاصل کیے اور ایک غلیظ محلے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔

مگر پانچ سو روپے کب تک اس کا ساتھ دے سکتے تھے زیادہ سے زیادہ ایک برس تک بڑی کفایت شعاری سے گزارہ کر لیتا

لیکن اس کے بعد کیا ہوتا

احمد دین نے سوچا

"مجھے ملازمت کر لینی چاہیے چاہے وہ کیسی بھی ہو۔۔۔۔پچاس ساٹھ روپے ماہوار مل جائیں۔۔۔۔۔تو گزارا ہو جائے گا۔"

اس کی ماں کو مرے اتنے ہی برس ہو گئے تھے جتنے اس کو جیتے، احمد دین نے حالانکہ اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔۔۔۔۔نہ اس کو دودھ پینا نصیب ہوا

تھا۔۔۔۔۔پھر بھی وہ اکثر اس کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا۔

احمد دین نے ملازمت حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی۔۔۔۔۔۔مگر کامیابی نہ ہوئی۔۔۔اتنے بے روزگار اور بے کار آدمی تھے کہ وہ خود کو اس بے روزگاری اور بے کاری کے سمندر میں ایک قطرہ سمجھتا تھا۔

لیکن اس احساس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری۔۔۔۔۔۔۔اور اپنی تگ و دو جاری رکھی۔

بہت دنوں کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اگر کسی افسر کی مٹھی گرم کی جائے تو ملازمت ملنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ مٹھی گرم کرنے کا مصالحہ کہاں سے لاتا۔

ایک دفتر میں جب وہ ملازمت کے سلسلے میں گیا تو ہیڈ کلرک نے اس سے شفیقانہ انداز میں کہا۔

"دیکھو برخوردار۔۔۔یوں خالی خولی کام نہیں چلے گا۔۔۔۔۔جس آسامی کے لیے تم نے درخواست دی ہے اس کے لیے پہلے ہی دو سو پچاس درخواستیں وصول ہو چکی ہیں۔۔۔میں بڑا اصاف گو آدمی ہوں۔۔۔۔۔۔پانچ سو روپے اگر تم دے سکتے ہو تو یہ ملازمت تمہیں یقیناً مل جائے گی۔"

اب احمد دین پانچ سو روپے کہاں سے لاتا۔۔۔۔۔۔اس کے پاس بمشکل بیس یا تیس روپے تھے۔

چنانچہ اس نے ہیڈ کلرک سے کہا

"جناب میرے پاس اتنے روپے نہیں۔۔۔۔۔۔آپ ملازمت دلوا

دیجیے تنخواہ میں سے آدھی رقم آپ لے لیا کریں‘‘

ہیڈ کلرک ہنسا

’’تم ہمیں بے وقوف بناتے ہو جاؤ چلتے پھرتے بنو‘‘

احمد دین بہت دیر تک چلتا پھرتا رہا۔۔۔۔ مگر اسے اطمینان سے کہیں بیٹھنے کا موقع نہ ملا۔

جہاں جاتا رشوت کا سوال سامنے۔۔۔۔ دنیا شاید رشوت ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آئی ہے۔

شاید خدا کو کسی نے رشوت دی ہو اور اس نے یہ دنیا بنا دی ہو

احمد دین کے پاس جب ایک پیسہ بھی نہ رہا تو مزدوری شروع کردی بوجھ اٹھاتا اور روز ایک دو روپے کمالیتا۔

مہنگائی کا زمانہ تھا۔۔۔۔۔ گو دونوں وقت کا کھانا بھٹیار خانے میں کھاتا لیکن اسے کافی خرچ برداشت کرنا پڑتا۔

زیادہ سے زیادہ ایک آنہ بچ رہتا۔

احمد دین مزدوری کرتا۔۔۔۔ مگر اس کے دل و دماغ پر رشوت کا چکر گھومتا رہتا تھا۔۔ یہ ایک بہت بڑی لعنت تھی۔۔۔۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس سے کسی طرح نجات حاصل کرے۔۔۔۔ اور مزدوری چھوڑ کر کوئی ایسی ملازمت اختیار کرے جو اس کے شایان شان ہو۔۔۔ آخر وہ بی اے پاس تھا۔۔۔ فرسٹ کلاس فرسٹ

اس نے سوچا کہ نماز پڑھنا شروع کردے۔۔۔۔ خدا سے دعا مانگے کہ وہ اس کی سنے۔۔۔۔ چنانچہ اس نے باقاعدہ پانچ وقت کی نماز شروع کردی یہ سلسلہ

ایک وقت تک جاری رہا مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔

اس دوران میں اس کے پاس تیس روپے جمع ہو چکے تھے صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ ڈاک خانے گیا تیس روپے کا پوسٹل آرڈر لیا اور ایک لفافے میں ڈال کر ساتھ ہی ایک رقعہ بھی رکھ دیا۔۔۔۔۔جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"اللہ میاں۔۔۔۔۔میں سمجھتا ہوں تم بھی رشوت لے کر کام کرتے ہو میرے پاس تیس روپے ہیں جو تمہیں بھیج رہا ہوں۔۔۔۔مجھے کہیں اچھی سی ملازمت دلوادو۔۔۔بوجھ اٹھا اٹھا کر میری کمر دوہری ہوگئی ہے۔"

لفافے پر اس نے پتہ لکھا

"بخدمت جناب اللہ میاں۔۔۔۔۔مالک کائنات"

چند روز بعد احمد دین کو ایک خط مولوی جو کائنات اخبار کے ایڈیٹر کی طرف سے تھا اس کا نام محمد میاں تھا۔۔۔اس نے احمد دین کو بلایا تھا۔

وہ کائنات کے دفتر گیا جہاں اس کو مترجم کی حیثیت سے سو روپیہ ماہوار پر رکھ لیا گیا۔

احمد دین نے سوچا۔۔۔۔۔۔۔آخر رشوت کام آہی گئی۔

ساڑھے تین آنے

''میں نے قتل کیوں کیا۔ ایک انسان کے خون میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جب تک میں اس کے تمام عواقب و عواطف سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا، آپ کو کچھ پتہ نہیں چلے گا...... مگر اس وقت آپ لوگوں کی گفتگو کا موضوع جرم اور سزا ہے۔ انسان اور جیل...... چونکہ میں جیل میں رہ چکا ہوں، اس لیے میری رائے درست نہیں ہو سکتی۔ مجھے منٹو صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ جیل، مجرم کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ مگر یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے...... یہ لطیفہ نہیں کہ اس حقیقت کو جانتے پہچانتے ہوئے بھی ہزار ہا جیل خانے موجود ہیں۔ ہتھکڑیاں اور وہ ہتکِ انسانیت بیڑیاں...... میں قانون کا یہ زیور پہن چکا ہوں۔''

یہ کہہ کر رضوی نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اس کے موٹے موٹے حبشیوں کے سے ہونٹ عجیب انداز میں پھڑکے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھیں، جو قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں چمکیں۔ ہم سب چونک پڑے تھے جب اس نے یکا یک ہماری گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب کرسی پر بیٹھا کریم ملی ہوئی کافی پی رہا تھا۔ جب اس نے خود کو متعارف کیا تو ہمیں وہ تمام واقعات یاد آ گئے جو اس کی قتل کی واردات سے وابستہ تھے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر اس نے بڑی صفائی سے اپنی اور اپنے دوستوں کی گردن پھانسی کے پھندے

سے بچالی تھی۔

وہ اسی دن رہا ہو کر آیا تھا۔ بڑے شائستہ انداز میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''معاف کیجیے گا منٹو صاحب...... آپ لوگوں کی گفتگو سے مجھے دلچسپی ہے۔ میں ادیب تو نہیں لیکن آپ کی گفتگو کا جو موضوع ہے اس پر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہوں۔'' پھر اس نے کہا۔ ''میرا نام صدیق رضوی ہے ...... لنڈا بازار میں جو قتل ہوا تھا، میں اس سے متعلق تھا۔''

میں نے اس قتل کے متعلق صرف سرسری طور پر پڑھا تھا لیکن جب رضوی نے اپنا تعارف کرایا تو میرے ذہن میں خبروں کی تمام سرخیاں ابھر آئیں۔

ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ آیا جیل مجرم کی اصلاح کر سکتی ہے۔ میں خود محسوس کر رہا تھا۔ ہم ایک باسی روٹی کھا رہے ہیں۔ رضوی نے جب یہ کہا۔ ''یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہوا لطیفہ بیان کر رہا ہے۔'' تو مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔

کریم ملی ہوئی کافی کی پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''منٹو صاحب آدمی جرم کیوں کرتا ہے...... جرم کیا ہے، سزا کیا ہے...... میں نے اس کے متعلق غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر جرم کے پیچھے ایک ہسٹری ہوتی ہے...... زندگی کے واقعات کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ہوتا ہے بہت الجھا ہوا، ٹیڑھا میڑھا...... میں نفسیات کا ماہر نہیں

……لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خود جرم سرزد نہیں ہوتا۔ حالات سے ہوتا ہے۔''

نصیر نے کہا۔ ''آپ نے بالکل درست کہا ہے۔''

رضوی نے ایک اور کافی کا آرڈر دیا اور نصیر سے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں جناب! لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے مشاہدات کی بنا پر عرض کیا ہے۔ ورنہ یہ موضوع بہت بڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو…… فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ تھا…… شاید کسی اور ملک کا ہو…… آپ تو خیر جانتے ہی ہوں گے۔ جرم اور سزا پر اس نے کافی لکھا ہے…… مجھے اس کی ایک تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''منٹو صاحب! غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا …… کیا تھا؟ وہ سیڑھی اتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے…… لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ سیڑھی کون سی ہے۔ اس کے کتنے زینے ہیں۔

کچھ بھی ہو، یہ سیڑھی ضرور ہے، اس کے زینے بھی ہیں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں، ان کو گننا، ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے…… منٹو صاحب! حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد شماری کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں…… اس سیڑھی کے زینوں کی شماری کیوں نہیں کرتیں…… کیا یہ ان کا فرض نہیں…… میں نے قتل کیا…… لیکن اس سیڑھی کے کتنے زینے طے کر کے کیا…… حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا، اس لیے کہ قتل کا ثبوت اس کے پاس نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی کس سے مانگوں…… وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب

میرے نزدیک نہیں ہیں، ان میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے۔ میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دور کھڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں۔"

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ بظاہر تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی گفتگو سے ثابت ہوا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ کہا ہوتا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ اسی لیے میں اس کی گفتگو میں حائل نہ ہوا۔

اس کے لیے نئی کافی آ گئی تھی۔ اسے بنا کر اس نے چند گھونٹ پیے اور کہنا شروع کیا۔ "خدا معلوم میں کیا بکواس کرتا رہا ہوں لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا خیال رہا ہے...... اس آدمی کا، اس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں ہے۔ اس کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔"

نصیر نے حیرت سے پوچھا۔ "صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر؟"

رضوی نے یخ آلود جواب دیا۔ "جی ہاں...... صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر...... اور جو اس کو نصیب نہ ہوئے، کیونکہ وہ پکڑا گیا...... یہ رقم خزانے میں محفوظ ہے اور ریھگو بھنگی غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا پیٹ پھر اسے مجبور کر دے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے گوں موت صاف کرانے والے اس کی تنخواہ نہ دے سکیں، کیونکہ ہوسکتا ہے اس کی تنخواہ دینے والوں کو اپنی تنخواہ نہ ملے...... یہ ہوسکتا ہے کا سلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھیے تو دنیا میں سب کچھ ہوسکتا ہے...... رضوی سے قتل بھی ہوسکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تھوڑے عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اس سے کہا۔ ''آپ پھگو بھنگی بات کر رہے تھے؟''

رضوی نے اپنی چھدری مونچھوں پر سے کافی رومال کے ساتھ پونچھی۔ ''جی ہاں...... پھگو بھنگی چور ہونے کے باوجود یعنی وہ قانون کی نظروں میں چور تھا لیکن ہماری نظروں میں پورا ایماندار...... خدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسا ایماندار آدمی نہیں دیکھا، ساڑھے تین آنے اس نے ضرور چرائے تھے، اس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش نہیں کرنا چاہتا...... میں دو دن کا بھوکا تھا، مجبوراً مجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اس سے مجھے پانچ روپے لینے تھے...... دو مہینوں کی تنخواہ...... حضور اس کا بھی کچھ قصور نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے کئی گاہکوں نے اس کی سلائی کے پیسے مارے ہوئے تھے...... حضور! میں پہلے بھی چوریاں کر چکا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے دس روپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے نکال لیے تھے۔ مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلونا چرایا تھا۔ اس لیے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا...... حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں...... کچھ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے چوریاں کرنی پڑیں...... اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا...... مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں لیکن وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے...... حضور! اب میرا بچہ بھی نہیں ہے۔ بیوی بھی نہیں ہے...... لیکن حضور افسوس ہے کہ میرا پیٹ ہے یہ مر جائے تو سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے، حضور مجھے معاف کر دو

......لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید بامشقت کی سزا دے دی۔"

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا۔ اس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں بالکل خاموش تھا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پی رہا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "آپ پھگو کی ایمانداری کی بات کر رہے تھے؟"

"جی ہاں............" رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔ "میں نہیں جانتا۔ قانون کی نگاہوں میں ایمانداری کیا چیز ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے بڑی ایمانداری سے قتل کیا تھا اور میرا خیال ہے پھگو بھنگی نے بھی بڑی ایمانداری سے ساڑھے تین آنے چرائے تھے......میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایمانداری کو صرف اچھی باتوں سے کیوں منسوب کرتے ہیں اور سچ پوچھیے تو میں اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور برائی ہے کیا۔ ایک چیز آپ کے لیے اچھی ہو سکتی ہے، میرے لیے بری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دوسری میں بری......ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے بال بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے لیکن سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گنا ہے تو خدا ان کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ اگر کوئی خدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لیے تم یہ انسانوں کے قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو......اور آسمانوں پر اپنی جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم خدا تو ہو۔"

رضوی کی اس تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی خامکاری ہی اصل میں تاثر کا باعث تھی۔ وہ باتیں کرتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے دل ہی دل میں گفتگو کر رہا ہے۔

اس کی بیڑی بجھ گئی تھی۔ غالباً اس میں تمباکو کی گانٹھ اٹکی ہوئی تھی، اس لیے کہ اس نے پانچ چھ مرتبہ اس کو سلگانے کی کوشش کی۔ جب نہ سلگی تو پھینک دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''منٹو صاحب! پھگو مجھے اپنی تمام زندگی یاد رہے گا...... آپ کو بتاؤں گا تو آپ ضرور کہیں گے کہ جذباتیت ہے لیکن خدا کی قسم جذباتیت کا اس میں کوئی دخل نہیں...... وہ میرا دوست نہیں تھا...... نہیں وہ میرا دوست تھا کیونکہ اس نے ہر بار خود کو ایسا ہی ثابت کیا۔''

رضوی نے جیب میں سے دوسری بیڑی نکالی مگر وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا۔ ''شکریہ...... منٹو صاحب! معاف کیجیے گا، میں نے اتنی بکواس کی ہے حالانکہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی اس لیے کہ ماشاء اللہ آپ.........''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''رضوی صاحب! میں اس وقت منٹو نہیں ہوں صرف سعادت حسن ہوں۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھیے۔ میں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔''

رضوی مسکرایا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ''آپ کی بڑی نوازش ہے۔'' پھر وہ نصیر سے مخاطب ہوا۔ ''میں کیا کہہ رہا تھا۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''آپ پھگو کی ایمانداری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے

تھے۔‘‘

’’جی ہاں ......‘‘ یہ کہہ کر اس نے میرا پیش کیا ہوا سگریٹ سلگایا۔ ’’منٹو صاحب! قانون کی نظروں میں وہ عادی چور تھا۔ بیڑیوں کے لیے ایک دفعہ اس نے آٹھ آنے چرائے تھے۔ بڑی مشکلوں سے دیوار پھاند کر جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کراتا رہا تھا مگر جب میرا ہم الزام دوست جر جی بیس بیڑیاں اس کی معرفت بھیجتا تو وہ سب کی سب پولیس کی نظریں بچا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعدہ معاف گواہوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے لیکن جر جی نے پھگو کو اپنا دوست اور ہمراز بنا لیا تھا۔ وہ بھنگی تھا، لیکن اس کی فطرت بہت خوشبودار تھی۔ شروع شروع میں جب وہ جر جی کی بیڑیاں لے کر میرے پاس آیا تو میں نے سوچا، اس حرامزادے چور نے ضرور ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قطعی طور پر ایماندار تھا...... بیڑی کے لیے اس نے آٹھ آنے چراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوا لی تھی مگر یہاں جیل میں جہاں اس کو تمباکو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا، وہ جر جی کی دی ہوئی بیڑیاں تمام و کمال میرے حوالے کر دیتا تھا، جیسے وہ امانت ہوں...... پھر وہ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد مجھ سے کہتا، بابو جی، ایک بیڑی تو دیجیے اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا...... انسان بھی کتنا کمینہ ہے۔‘‘

رضوی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھٹکا جیسے وہ اپنے آپ سے متنفر ہے۔

’’جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھ پر بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وعدہ معاف

گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے جرجی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ اس کو رشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے۔ صابن مل جاتا تھا۔ بیڑیاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لیے روپے بھی مل جاتے تھے......... پھگو بھنگی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، جب اس نے آخری بار جرجی کی دی ہوئی بیس بیڑیاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خوش نہیں تھا۔ میں نے جب اس کو مبارکباد دی تو اس نے کہا۔ ''بابو جی! میں پھر یہاں آ جاؤں گا...... بھوکے انسان کو چوری کرنی ہی پڑتی ہے......... بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھوکے انسان کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے...... ''بابو جی آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیڑیاں دیتے رہے...... خدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جرجی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔''

نصیر نے یہ سن کر غالباً اپنے آپ سے کہا۔ ''اور اس کو صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں سزا ملی تھی۔''

رضوی نے گرم کافی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا۔ ''جی ہاں صرف ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں......... اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں...... خدا معلوم ان سے کس پیٹ کی آگ بجھے گی۔'' رضوی نے کافی کا ایک اور گھونٹ پیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہاں منٹو صاحب! اس کی رہائی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی...... میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ روپے ایک سلسلے میں سنتری کو رشوت کے طور پر دینے

تھے میں نے بڑی مشکلوں سے کاغذ پنسل مہیا کرکے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور پھگو کے ذریعہ سے اس تک بھجوایا تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس روپے بھیج دے۔ پھگو ان پڑھ تھا۔ شام کو وہ مجھ سے ملا۔ جرجی کا رقعہ اس نے مجھے دیا۔ اس میں دس روپے کا سرخ پاکستانی نوٹ قید تھا میں نے رقعہ پڑھا۔ یہ لکھا تھا۔ رضوی پیارے دس روپے بھیج تو رہا ہوں مگر ایک عادی چور کے ہاتھ، خدا کرے تمہیں مل جائیں کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے۔'' میں نے یہ تحریر پڑھی تو پھگو بھنگی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کو ساڑھے تین آنے چرانے کے جرم میں ایک برس کی سزا ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر اس نے دس روپے چرائے ہوتے تو ساڑھے تین آنے فی برس کے حساب سے اس کو کیا سزا ملتی؟

یہ کہہ کر رضوی نے کافی کا آخری گھونٹ پیا اور رخصت مانگے بغیر کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۰ء

سجدہ

گلاس پر بوتل جھکی تو ایک دم حمید کی طبیعت پر بوجھ سا پڑ گیا۔ **ملک** جو اس کے سامنے تیسرا پیگ پی رہا تھا فوراً تاڑ گیا کہ حمید کے اندر روحانی کشمکش پیدا ہو گئی ہے۔ وہ حمید کو سات برس سے جانتا تھا اور ان سات برسوں میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے جن کا مطلب اس کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا تھا لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے لاغر دوست کے سینے پر کوئی بوجھ جس کا احساس شراب پینے کے دوران میں کبھی کبھی حمید کے اندر یوں پیدا ہوتا ہے جیسے بے دھیان بیٹھے ہوئے آدمی کی پسلیوں میں کوئی زور سے ٹھوکا دے دے۔

حمید بڑا خوش باش انسان تھا۔ ہنسی مذاق کا عادی، حاضر جواب، بذلہ سنج، اس میں بہت سی خوبیاں تھیں جو زیادہ نزدیک آ کر اس کے دوست **ملک** نے معلوم کی تھیں۔ مثال کے طور پر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بے حد مخلص تھا، اس قدر مخلص کہ بعض اوقات اس کا اخلاص **ملک** کے لیے عہد عتیق کا رومانی افسانہ بن جاتا تھا۔

حمید کے کردار میں ایک عجیب و غریب بات جو **ملک** نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ناآشنا تھیں۔ یوں تو **ملک** بھی رونے کے معاملے میں بڑا بخیل تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب کبھی رونے کا موقع آئے گا وہ ضرور رو دے گا۔ اس پر غم افزا باتیں اثر ضرور کرتی تھیں مگر وہ اس اثر کو اتنی دیر اپنے دماغ پر بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا جتنی دیر گھوڑا اپنے تنے ہوئے جسم پر مکھی کو۔

غموں سے دور رہنے والے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے عادی حمید کی زندگی میں نہ جانے ایسا کون سا واقعہ الجھا ہوا تھا کہ وہ کبھی کبھی قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ ایسے لمحات جب اس پر طاری ہوتے تو اس کا چہرہ ایسی رنگ اختیار کر لیتا تھا جو تین دن کی باسی شراب میں بے جان سوڈا گھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔

سات برس کے دوران میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے مگر **ملک** نے آج تک اس سے ان کی وجہ دریافت نہ کی تھی۔ اس لیے نہیں کہ ان کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ **ملک** پرلے درجے کا سست اور کاہل واقع ہوا تھا۔ اس خیال سے بھی وہ حمید کے ساتھ اس معاملے پر بات چیت نہیں کرتا تھا کہ ایک طول طویل کہانی اسے سننا پڑے گی اور اس کے چوتھے پیگ کا سارا سرور غارت ہو جائے گا۔ شراب پی کر لمبی چوڑی آپ بیتیاں سننا یا سنانا اس کے نزدیک بہت بڑی بدذوقی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کہانیاں سننے کے معاملے میں بہت ہی خام تھا۔ اسی خیال کی وجہ سے کہ وہ اطمینان حمید کی داستان نہیں بن سکے گا اس نے آج تک اس سے ان دوروں کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔

کرپا رام نے حمید کے گلاس میں تیسرا پیگ ڈال کر بوتل میز پر رکھ دی اور **ملک** سے مخاطب ہوا۔ ”**ملک**! اسے کیا ہو گیا ہے۔“

ملک خاموش رہا لیکن حمید مضطرب ہو گیا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب زور سے کانپ اٹھے۔ کرپا رام کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس میں جب ناکامی ہوئی تو اس کا اضطراب اور بھی زیادہ ہو گیا۔

حمید کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا اور اگر چھپانے کی کوشش کرتا تو اس کی وہی حالت ہوتی جو آندھی میں صرف ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی عورت کی ہوتی ہے۔

ملک نے اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور اس فضا کو جو کچھ عرصہ پہلے طرب افزا باتوں سے گونج رہی تھی اپنی بے محل ہنسی سے خوشگوار بنانے کے لیے اس نے کرپا رام سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کرپا...... تم مان لو اسے اشوک کمار کا فلمی عشق ہو گیا ہے...... بھئی یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کاسٹر آئل پی رہا ہے۔''

کرپا رام، اشوک کمار کو اتنا ہی جانتا تھا جتنا کہ مہاراجہ اشوک اور اس کی مشہور آہنی لاٹھ کو۔ فلم اور تاریخ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، البتہ وہ ان کے فوائد سے ضرور آگاہ تھا۔ کیونکہ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا۔ ''مجھے اگر کبھی شب خوابی کا عارضہ لاحق ہو جائے تو میں یا تو فلم دیکھنا شروع کر دوں گا یا چکرورتی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا شروع کر دوں گا۔''

وہ ہمیشہ حساب داں چکرورتی کو مورخ بنا کر اپنی مسرت کے لیے ایک بات پیدا کر لیا کرتا تھا۔

کرپا رام چار پیگ پی چکا تھا۔ چار پیالہ پیگ، نشہ اس کے دماغ کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ آنکھیں سکیڑ کر اس نے حمید کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کیمرے کا فوکس کر رہا ہے۔ ''تمہارا گلاس ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا ہے۔''

حمید نے دردِ سر کے مریض کی سی شکل بنا کر کہا۔ ''بس...... اب مجھ سے زیادہ

نہیں پی جائے گی۔"

"تم چغد ہو...... نہیں چغد نہیں کچھ اور ہو...... تمہیں پینا ہوگی...... سمجھے، یہ گلاس اور اس بوتل میں جتنی پڑی ہے سب کی سب تمہیں پینا ہوگی۔ شراب سے جو انکار کرے وہ انسان نہیں حیوان ہے...... حیوان بھی نہیں، اس لیے کہ حیوانوں کو اگر انسان بنا دیا جائے تو وہ بھی اس خوبصورت شے کو کبھی نہ چھوڑیں۔ تم سن رہے ہو **ملک**...... میں نے اگر یہ ساری شراب اس کے حلق میں نہ انڈیل دی تو میرا نام کرپا رام نہیں گھسیٹا رام آرٹسٹ ہے۔"

گھسیٹا رام آرٹسٹ سے کرپا رام کو سخت نفرت تھی صرف اس لیے کہ آرٹسٹ ہو کر اس کا نام گھسیٹا رام تھا۔

ملک کا منہ سوڈا ملی وسکی سے بھرا ہوا تھا۔ کرپا رام کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا جس کے باعث اس کے منہ سے ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔ "کرپا رام خدا کے لیے تم گھسیٹا رام آرٹسٹ کا نام نہ لیا کرو۔ میری انتڑیوں میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے...... لاحول ولا...... میری پتلون کا ستیاناس ہو گیا ہے...... لو بھئی، حمید، اب تو تمہیں پینا ہی پڑے گی۔ کرپا رام گھسیٹا رام بنے یا نہ بنے لیکن میں ضرور کرپا رام بن جاؤں گا اگر تم نے یہ گلاس خالی نہ کیا...... لو پیو...... پی جاؤ...... ارے، میرا منہ کیا دیکھتے ہو...... یہ تمہارے چہرے پر قیامت کیسی برس رہی ہے...... کرپا رام اٹھو...... لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ زبردستی کرنا ہی پڑے گی۔"

کرپا رام اور **ملک** دونوں اٹھے اور حمید کو زبردستی پلانے کی کوشش کرنے لگے۔

حمید کو روحانی کوفت تو ویسے ہی محسوس ہو رہی تھی، جب کرپا رام اور **ملک** نے اس کو

جھنجھوڑنا شروع کیا تو اس کو جسمانی اذیب بھی پہنچی جس کے باعث وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

اس کی پریشانی سے کرپا رام اور ملک بہت محظوظ ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کھیل سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ کرپا رام نے گلاس پکڑ کر اس کے سر میں تھوڑی سی شراب ڈال دی۔ اور نائیوں کے انداز میں جب اس نے حمید کا سر ہلایا تو وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس کے سارے جسم میں تشنج سا پیدا ہوا اور ایک دم کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے رونی اور مردہ آواز میں کہا۔ ''میں بیمار ہوں...... خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔''

کرپا رام اسے بہانہ سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچنے ہی والا تھا کہ ملک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پرے ہٹا دیا۔ ''کرپا، اس کی طبیعت واقعی خراب ہے...... دیکھو تو رو رہا ہے۔''

کرپا رام نے اپنی موٹی کمر جھکا کر غور سے دیکھا۔ ''ارے...... تم تو سچ مچ رو رہے ہو۔''

حمید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟...... خیر تو ہے؟''

''یہ تم رو کیوں رہے ہو؟''

''بھئی حد ہو گئی...... ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔''

"کچھ سمجھ میں بھی تو آئے.........کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

ملک اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "بھئی مجھے معاف کردو اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔"

حمید نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ جذبات کی شدت کے باعث اس کی قوت گویائی جواب دے گئی۔

تیسرے پیگ سے پہلے اس کے چہرے پر رونق تھی، اس کی باتیں سوڈے کے بلبلوں کی طرح تروتازہ اور شگفتہ تھیں مگر اب وہ باسی شراب کی طرح بے رونق تھا۔ وہ سکڑ سا گیا تھا۔ اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی بھیگی ہوئی پتلون کی ہوتی ہے۔

کرسی پر وہ اس انداز سے بیٹھا تھا گویا وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔ اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔

ملک کو اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ "حمید، لو اب خدا کے لیے چپ ہو جاؤ.....واللہ تمہارے آنسوؤں سے مجھے روحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ مزہ تو سب کرکرا ہو ہی گیا تھا مگر یوں تمہارے ایکا ایکی آنسو بہانے سے میں بہت مغموم ہو گیا ہوں.....خدا جانے تمہیں کیا تکلیف ہے؟............"

"کچھ نہیں، میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھے ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔"

کرپارام بوتل میں بچی ہوئی شراب کو دیکھتا رہا اور ملک یہ ارادہ کرتا رہا کہ حمید

سے آج پوچھ ہی لے کہ وقتاً فوقتاً اسے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں مگر وہ جا چکا تھا۔

حمید گھر پہنچا تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ کمرے میں چونکہ اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس لیے وہ رو بھی نہ سکتا تھا۔ اس کی آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی آنکھوں کو کرسیاں و ارمیز یں نہیں چھلکا سکتی تھیں۔

اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو جس کے چھیڑنے سے وہ جی بھر کے رو سکے۔ مگر ساتھ ہی اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ بالکل اکیلا ہو...... ایک عجیب کشمکش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے۔ سامنے میز پر اس کی ایک پرانی تصویر چمکدار فریم میں جڑی رکھی تھی۔ حمید نے اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو سات برس اس تصویر اور اس کے درمیان تھان کی طرح کھلتے چلے گئے۔

ٹھیک سات برس پہلے برسات کے انہی دنوں میں رات کو وہ ریلوے ریستوران میں ملک عبدالرحمٰن کے ساتھ بیٹھا تھا...... اس وقت کے حمید اور اس وقت کے حمید میں کتنا فرق تھا...... کتنا فرق تھا۔ حمید نے یہ فرق اس شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنی تصویر میں ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے ملے اس کو ایک زمانہ گزر گیا ہے۔

اس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو اس کے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہوا کہ انسانیت کے لحاظ سے وہ اس کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ تصویر میں جو حمید ہے اس حمید کے مقابلے میں بدرجہا افضل و برتر ہے جو کرسی پر سر نیوڑھائے بیٹھا

ہے۔ چنانچہ اس احساس نے اس کے دل میں حسد بھی پیدا کر دیا۔

ایک سجدے..... صرف ایک سجدے نے اس کا ستیاناس کر دیا تھا۔

آج سے ٹھیک سات برس پہلے کا ذکر ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ رات کو وہ ریلوے ریستوران میں اپنے دوست **ملک** عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حمید کو یہ شرارت سوجھی تھی کہ بغیر بو کی شراب جن کا ایک پورا پیگ لیمونیڈ میں ملا کر اس کو پلا دے اور جب وہ پی جائے تو آہستہ سے اس کے کان میں کہے۔ ''مولانا ایک پورا پیگ آپ کے ثوابوں بھرے پیٹ میں داخل ہو چکا ہے۔''

بیرے سے مل ملا کر اس نے اس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ آرڈر دینے پر لیمونیڈ کی بوتل میں جن کا ایک پیگ ڈال کر **ملک** کو دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حمید نے وسکی پی اور **ملک** بظاہر بے خبری کی حالت میں جن کا پورا پیگ چڑھا گیا۔

حمید چونکہ تین پیگ پینے کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''**ملک** صاحب، آپ یوں بیکار نہ بیٹھیے۔ میں تیسرا پیگ بڑی عیاشی سے پیا کرتا ہوں۔ آپ ایک اور لیمونیڈ منگوا لیجیے۔''

ملک رضامند ہو گیا، چنانچہ ایک اور لیمونیڈ آ گیا۔ اس میں بیرے نے اپنی طرف سے جن کا ایک پیگ ملا دیا تھا۔

ملک سے حمید کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حمید اس شرارت سے باز رہتا مگر ان دنوں وہ اس قدر زندہ دل اور شرارت پسند تھا کہ جب بیرا **ملک** کے لیے لیمونیڈ کا دوسرا گلاس لایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ اس خیال سے بہت خوش ہوا کہ ایک کے بجائے دو پیگ **ملک** کے پیٹ کے اندر چلے جائیں

گے۔

ملک آہستہ آہستہ لیمونیڈ ملی جن پیتا رہا اور حمید دل ہی دل میں اس کبوتر کی طرح گٹگٹا تا رہا جس کے پاس ایک کبوتری آ بیٹھی ہو۔

اس نے جلدی جلدی اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور ملک سے پوچھا۔ ''اور پئیں گے آپ۔''

ملک نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''نہیں۔'' پھر اس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ ''اگر تمہیں اور پینا ہے تو پیو، میں جاؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔''

اس مختصر گفتگو کے بعد دونوں اٹھے۔ حمید نے دوسرے کمرے میں جا کر بل ادا کیا۔ جب وہ ریستوران سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حمید کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ وہ ملک پر اپنی شرارت واضح کر دے مگر اچھے موقع کی تلاش میں کافی وقت گزر گیا۔ ملک بالکل خاموش تھا اور حمید کے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ رہی تھی۔ بے شمار ننھی ننھی خوبصورت اور شوخ و شنگ باتیں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو ہو کر بجھ رہی تھیں۔ وہ ملک کی خاموشی سے پریشان ہو رہا تھا اور جب اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو آہستہ آہستہ اس کی طبیعت پر ایک افسردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی شرارت اب دم کٹی گلہری بن کر رہ گئی ہے۔

دیر تک دونوں بالکل خاموش چلتے رہے۔ جب کمپنی باغ آیا تو ملک ایک بنچ پر متکبرانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چند لمحات ایسی خاموشی میں گزرے کہ حمید کے دل میں

وہاں سے اٹھ بھاگنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر اس وقت زیادہ دیر تک دبے رہنے کے باعث اس کی تمام تیزی اور طراری ماند پڑ چکی تھی۔

ملک بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''حمید، تم نے آج مجھے روحانی تکلیف پہنچائی ہے...... تمہیں یہ شرارت نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' اس کی آواز میں اور درد پیدا ہو گیا۔ ''تم نہیں جانتے کہ تمہاری شرارت سے مجھے کس قدر روحانی تکلیف پہنچی ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور حمید اپنے آپ کو بڑی شدت سے گناہگار محسوس کرنے لگا۔ معافی مانگنے کا خیال اس کو آیا تھا مگر ملک باغ سے نکل کر باہر سڑک پر پہنچ چکا تھا۔

ملک کے چلے جانے کے بعد حمید گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنس گیا۔ شراب کے حرام ہونے کے متعلق اس نے جتنی باتیں لوگوں سے سنی تھیں سب کی سب اس کے کانوں میں بھنبھنانے لگیں۔

''شراب اخلاق بگاڑ دیتی ہے...... شراب، خانہ خراب ہے، شراب پی کر آدمی بے ادب اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ شراب اسی لیے حرام ہے۔ شراب صحت کا ستیا ناس کر دیتی ہے۔ اس کے پینے سے پھیپھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں...... شراب......''

شراب، شراب کی ایک لا متناہی گردان حمید کے دماغ میں شروع ہو گئی اور اس کی تمام برائیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ گئیں۔

''سب سے بڑی برائی تو یہ ہے۔'' حمید نے محسوس کیا۔ ''کہ میں نے بے ضرر

شرارت سمجھ کر ایک شریف آدمی کو دھوکے سے شراب پلا دی ہے۔ ممکن ہے وہ پکا نمازی اور پرہیز گار ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی میری ہے اور سارا گناہ میرے ہی سر ہوگا مگر اسے جو روحانی تکلیف پہنچی ہے اس کا کیا ہوگا؟ واللہ باللہ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اسے تکلیف پہنچے..... میں اس سے معافی مانگ لوں گا اور...... لیکن اس سے معافی مانگ کر بھی تو میرا گناہ ہلکا نہیں ہوگا۔ ایک میں نے شراب پی اوپر سے اس کو دھوکا دے کر پلائی۔"

وسکی کا نشہ اس کے دماغ میں جمائیاں لینے لگا جس سے اس کا احساس گناہ گھناؤنی شکل اختیار کر گیا۔ "مجھے معافی مانگنی چاہیے۔ مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیے...... مجھے گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیے۔"

اس کو شراب شروع کیے صرف دو برس ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ اس کا عادی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیا۔ "میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ یہ کوئی ضروری چیز نہیں۔ میں اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں...... دنیا کہتی ہے...... دنیا کہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ منہ سے لگی ہوئی یہ چھٹ ہی نہیں سکتی میں اسے بالکل چھوڑ دوں گا...... میں اس خیال کو غلط ثابت کر دوں گا۔"

یہ سوچتے ہوئے حمید نے خود کو ایک ہیرو محسوس کیا۔ پھر ایک دم اس کے دماغ میں خدا کا خیال آیا جس نے اسے تباہی سے بچا لیا تھا۔ "مجھے شکر بجا لانا چاہیے کہ میرے سینے میں نور پیدا ہو گیا ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس کھائی میں پڑا رہتا۔"

وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ اوپر آسمان پر گدلے بادلوں میں چاند صابن کے جھاگ لگے گالوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ فضا بالکل خاموش تھی......

حمید پر خدا کے رعب اور شراب نوشی سے بچ جانے کے احساس نے رقت طاری کر دی۔ اس نے شکرانے کا سجدہ کرنا چاہا۔ وہیں پتھریلی زمین پر اس نے گھٹنے ٹیک کر اپنا ماتھا رگڑنا چاہا۔ اس خیال سے کہ اسے کوئی دیکھ لے گا وہ کچھ دیر کے لیے ٹھٹک گیا مگر فوراً ہی یہ سوچ کر کہ یوں خدا کی نگاہوں میں اس کی وقعت بڑھ جائے گی وہ ڈبکی لگانے کے انداز میں جھکا اور اپنی پیشانی گلی کے ٹھنڈے پتھریلے فرش کے ساتھ جوڑ دی۔

جب وہ اٹھا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی محسوس کیا۔ اس نے جب آس پاس کی اونچی دیواروں کو دیکھا تو وہ اسے اپنے قد کے مقابلے میں بہت پست معلوم ہوئیں۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد اسی کمرے میں جہاں اب حمید بیٹھا اپنی سات برس کی پرانی تصویر پر رشک کھا رہا تھا، اس کا دوست **ملک** آیا۔ اندر آتے ہی اس نے اپنی جیب سے بلیک اینڈ وائٹ کا ادھا نکالا اور زور سے میز پر رکھ کر کہا۔ ''حمید آؤ......آج پئیں اور خوب پئیں......یہ ختم ہو جائے گی تو اور لائیں گے۔''

حمید اس قدر متحیر ہوا کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ **ملک** نے دوسری جیب سے سوڈے کی بوتل نکالی، تپائی پر سے گلاس اٹھا کر اس میں شراب انڈیلی، سوڈے کی بوتل انگوٹھے سے کھولی، اور حمید کی متحیر آنکھوں کے سامنے وہ دو پیگ غٹاغٹ پی گیا۔

حمید نے تتلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ......لیکن ....اس روز تم نے مجھے اتنا برا بھلا کہا تھا.........''

ملک نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ''تم نے مجھ سے شرارت کی میں نے بھی اس کے جواب میں تم سے شرارتاً کچھ کہہ دیا ....مگر بھئی ایمان کی بات ہے جو مزہ اس روز جن کے دو پیگ پینے میں آیا ہے زندگی بھر کبھی نہیں آئے گا......لو اب چھوڑو اس قصے کو ....وسکی پیو۔ جن ون بکواس ہے۔ شراب پینی ہو تو وسکی پینی چاہیے۔''

یہ سن کر حمید کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ جو سجدہ اس نے گلی میں کیا تھا ٹھنڈے فرش سے نکل کر اس کی پیشانی پر چپک گیا ہے۔

یہ سجدہ بھوت کی طرح حمید کی زندگی سے چمٹ گیا تھا۔ اس نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے پھر پینا شروع کی مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔

ان سات برسوں میں جو اس کی پرانی تصویر اور اس کے درمیان کھلے ہوئے تھے یہ ایک سجدہ بے شمار مرتبہ حمید کو اس کی اپنی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کر چکا تھا۔ اس کی خودی، اس کی تخلیقی قوت، اس کی وندگی وہ حرارت جس سے حمید اپنے ماحول کو گرما کے رکھنا چاہتا تھا اس سجدے نے قریب قریب سرد کر دی تھی۔ یہ سجدہ اس کی زندگی میں ایک ایسی خراب بریک بن گئی تھی جو کبھی کبھی اپنے آپ اس کے چلتے ہوئے پہیوں کو ایک دھچکے کے ساتھ ٹھہرا دیتی تھی۔

سات برس کی پرانی تصویر اس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔ جب سارا واقعہ اس کے دماغ میں پوری تفصیل کے ساتھ دہرایا جا چکا تو اس کے اندر ایک ناقابل

بیان اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اس کو قے ہونے والی ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا............ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اے خدا، میرا سجدہ مجھے واپس دے دے............''

سرکنڈوں کے پیچھے

کون سا شہر تھا۔ اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ کو معلوم کرنے اور مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جگہ جو اس کہانی سے متعلق ہے پشاور کے مضافات میں تھی۔ سرحد کے قریب اور جہاں وہ عورت رہتی تھی اس کا گھر جھونپڑا نما تھا............ سرکنڈوں کے پیچھے!

گھنی باڑھ سی تھی، جس کے پیچھے اس عورت کا مکان تھا۔ کچی مٹی کا بنا ہوا، چونکہ یہ باڑھ سے کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے سرکنڈوں کے پیچھے چھپ سا گیا تھا کہ باہر کچی سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سرکنڈے بالکل سوکھے ہوئے تھے مگر وہ کچھ اس طرح زمین میں گڑے تھے کہ ایک دبیز پردہ بن گئے تھے۔ معلوم نہیں اس عورت نے خود وہاں پیوست کیے تھے یا پہلے ہی سے موجود تھے۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ وہ آہنی قسم کے پردہ پوش تھے۔

مکان کہہ لیجیے، یا مٹی کا جھونپڑا، صرف چھوٹی چھوٹی تین کوٹھریاں تھیں مگر صاف ستھری۔ سامان مختصر تھا مگر اچھا............ پچھلے کمرے میں ایک بہت بڑا نواڑی پلنگ تھا............ اس کے ساتھ ایک طاقچہ تھا جس میں سرسوں کے تیل کا دیا رات بھر جلتا رہتا تھا...... مگر یہ طاقچہ بھی صاف ستھرا رہتا تھا اور وہ دیا بھی جس میں ہر روز نیا تیل اور بتی ڈالی جاتی تھی۔

اب میں آپ کو اس عورت کا نام بتا دوں جو اس مختصر سے مکان میں، جو سرکنڈوں کے پیچھے چھپا رہتا تھا، اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی۔ ایک یتیم لڑکی تھی جس کو اس نے بچپن سے گود لے کر پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اس کی ناجائز لڑکی تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اس کی سگی بیٹی تھی .... حقیقت جو کچھ بھی ہے اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ خود بخود کوئی نہ کوئی رائے قائم کر لیجیے گا۔

دیکھیے میں آپ کو اس عورت کا نام بتانا بھول گیا ...... بات دراصل میں یہ ہے کہ اس کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیجیے .... گلشن یا کوئی اور۔ آخر نام میں کیا رکھا ہے لیکن آپ کی سہولت کی خاطر میں اسے سردار کہوں گا۔

یہ سردار، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہو گی۔ اس کے سرخ و سفید گالوں پر گو کسی قدر جھریاں پڑ گئی تھیں، مگر پھر بھی وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ مگر ہمیں اس کے گالوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کی بیٹی (معلوم نہیں وہ اس کی بیٹی تھی یا نہیں) شباب کا بڑا دلکش نمونہ تھی۔ اس کے خدوخال میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ وہ فاحشہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ماں اس سے پیشہ کراتی تھی اور خوب دولت کما رہی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لڑکی کو جس کا نام پھر آپ کی سہولت کی خاطر نواب رکھے دیتا ہوں، اس پیشے سے نفرت نہیں تھی۔ اصل میں، اس نے آبادی سے دور ایک ایسے مقام پر پرورش پائی تھی کہ اس کو صحیح ازدواجی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب سردار نے اس سے پہلا مرد بستر پر .... اس نواڑی پلنگ پر

متعارف کرایا تو غالباً اس نے یہ سمجھا کہ تمام لڑکیوں کی جوانی کا آغاز کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کسبیانہ زندگی سے مانوس ہوگئی تھی اور وہ مرد جو دور دور سے چل کر اس کے پاس آتے تھے اور اس کے ساتھ اس بڑے نواڑی پلنگ پر لیٹتے تھے اس نے سمجھا تھا کہ یہی اس کی زندگی کا منتہی ہے۔

یوں تو وہ ہر لحاظ سے ایک فاحشہ عورت تھی۔ ان معنوں میں جن میں ہماری شریف اور مطہر عورتیں ایسی عورتوں کو دیکھتی ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو اس کو اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے .... وہ اس کے متعلق غور بھی کیسے کر سکتی تھی جب کہ اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اس کے جسم میں خلوص تھا۔ وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی۔ اس لیے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے اور وہ اس مرد کی ہر آسائش اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس کی کوئی ننھی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کو شہر کے لوگوں کے تکلفات کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ قطعاً نہیں جانتی تھی کہ جو مرد اس کے پاس موٹروں میں آتے ہیں صبح سویرے اپنے دانت برش کے ساتھ صاف کرنے کے عادی ہیں اور آنکھیں کھول کر سب سے پہلے بستر میں چائے کی ایک پیالی پیتے ہیں، پھر رفع حاجت کے لیے جاتے ہیں مگر اس نے آہستہ آہستہ بڑے الھڑ طریقے پر ان مردوں کی عادات سے کچھ واقفیت حاصل کر لی تھی۔ پر اسے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ سب مرد ایک طرح کے نہیں ہوتے تھے۔ کوئی صبح سویرے اٹھ کر سگریٹ مانگتا تھا، کوئی چائے، اور بعض ایسے بھی ہوتے جو اٹھنے کا

نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کچھ ساری رات جاگتے رہتے اور صبح موٹر میں سوار ہو کر بھاگ جاتے تھے۔

سردار، بے فکر تھی۔ اس کو اپنی بیٹی پر، یا جو کچھ بھی وہ تھی، پورا اعتماد تھا کہ وہ گاہکوں کو سنبھال سکتی ہے، اس لیے وہ افیم کی ایک گولی کھا کر کھاٹ پر سوئی رہتی تھی۔ کبھی کبھار جب اس کی ضرورت پڑتی .... مثال کے طور پر جب کسی گاہک کی طبیعت زیادہ شراب پینے کے باعث ایک دم خراب ہو جائے، تو وہ غنودگی کے عالم میں اٹھ کر نواب کو ہدایات دے دیتی تھی کہ اس کو اچار کھلا دے یا کوشش کرے کہ وہ نمک ملا گرم گرم پانی پلا کر قے کرا دے اور بعد میں تھپکیاں دے کر سلا دے۔

سردار اس معاملے میں بڑی محتاط تھی کہ جونہی کوئی گاہک آتا وہ اس سے نواب کی فیس پہلے ہی وصول کر کے اپنے نیفے میں محفوظ کر لیتی تھی اور اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دے کر، کہ تم آرام سے جھولے جھولو، افیم کی ایک گولی ڈبیا میں سے نکال کر منہ میں ڈال کر سو جاتی۔

جو روپیہ آتا اس کی مالک سردار تھی۔ لیکن جو تحفے تحائف وصول ہوتے وہ نواب ہی کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ دولتمند ہوتے، اس لیے وہ بڑھیا سے بڑھیا کپڑا پہنتی اور قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں کھاتی تھی۔

وہ خوش تھی ...... مٹی سے لپے پتے اس مکان میں جو صرف تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنی دانست کے مطابق بڑی دلچسپ اور خوشگوار زندگی

بسر کر رہی تھی...... ایک فوجی افسر نے اسے گراموفون اور بہت سے ریکارڈ لا دیئے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ ان کو بجا بجا کر فلمی گانے سنتی اور ان کی نقل اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی...... اس کے گلے میں کوئی رس نہیں تھا۔ مگر شاید وہ اس سے بے خبر تھی............ سچ پوچھئے تو اس کو کسی بات کی خبر نہیں تھی اور نہ اس کو اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسی چیز سے باخبر ہو۔ جس راستے پر وہ ڈال دی گئی تھی، اس کو اس نے قبول کر لیا تھا۔ بڑی بے خبری کے عالم میں۔

سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا کیسی ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ سوائے اس کے کہ ایک پکی سڑک ہے، جس پر ہر دوسرے تیسرے دن ایک موٹر دھواں اڑاتی ہوئی آتی ہے اور رک جاتی ہے۔ ہارن بجتا ہے۔ اس کی ماں یا جو کوئی بھی وہ تھی۔ کھٹیا پر سے اٹھتی ہے اور سرکنڈوں کے پاس جا کر موٹر والے سے کہتی ہے کہ موٹر ذرا دور کھڑی کر کے اندر آ جائے۔ اور وہ اندر آ جاتا ہے اور نواڑی پلنگ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اس کے ہاں آنے جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہی پانچ چھ ہوں گے مگر یہ پانچ چھ مستقل گاہک تھے اور سردار نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کا باہم تصادم نہ ہو۔ بڑی ہوشیار عورت تھی...... وہ ہر گاہک کے لیے خاص دن مقرر کر دیتی اور ایسے سلیقے سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔

اس کے علاوہ ضرورت کے وقت اس کا بھی انتظام کرتی رہتی کہ نواب ماں نہ بن جائے۔ جن حالات میں نواب اپنی زندگی گزار رہی تھی ان میں اس کا ماں بن جانا یقینی تھا۔ مگر سردار دو ڈھائی برس سے بڑی کامیابی کے ساتھ اس قدرتی

خطرے سے نبٹ رہی تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے یہ سلسلہ دو ڈھائی برس سے بڑے ہموار طریقے سے چل رہا تھا۔ پولیس والوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ بس صرف وہی لوگ جانتے تھے جو وہاں آتے تھے۔ یا پھر سردار تھی اور اس کی بیٹی نواب یا جو کوئی بھی وہ تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے، ایک دن منی کے اس مکان میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ ایک بہت بڑی موٹر جو غالباً ڈوج تھی وہاں آ کے رکی۔ ہارن بجا۔ سردار باہر آئی تو اس نے دیکھا کوئی اجنبی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اجنبی نے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ موٹر دور کھڑی کر کے وہ اترا اور سیدھا ان کے گھر میں گھس گیا جیسے برسوں کا آنے جانے والا ہے۔

سردار بہت سٹپٹائی لیکن دروازہ کی دہلیز پر نواب نے اس اجنبی کا بڑی پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس میں نواڑی پلنگ تھا۔ دونوں اس پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ سردار آ گئی...... ہوشیار عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کسی دولت مند گھرانے کا آدمی ہے۔ خوش شکل ہے، صحت مند ہے...... اس نے اندر کوٹھڑی میں داخل ہو کر سلام کیا اور پوچھا۔ ’’آپ کو ادھر کا راستہ کس نے بتایا؟‘‘

اجنبی مسکرایا اور بڑے پیار سے نواب کے گوشت بھرے گالوں میں اپنی انگلی چبھو کر کہا۔ ’’اس نے؟‘‘

نواب تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ایک ادا کے ساتھ کہا۔ ’’ہائیں...... میں تو کبھی تم سے ملی بھی نہیں۔‘‘

اجنبی کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ ''ہم تو کئی بار تم سے مل چکے ہیں۔''

نواب نے پوچھا۔ ''کہاں...... کب؟'' حیرت کے عالم میں اس کا چھوٹا سا منہ کچھ اس طور پر وا ہوا کہ اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا موجب ہو گیا۔

اجنبی نے اس کا گدگدا ہاتھ پکڑ لیا اور سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھ سکتیں...... اپنی ماں سے پوچھو۔''

نواب نے بڑے بھولپن کے ساتھ اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص اس سے کب اور کہاں ملا تھا۔ سردار سارا معاملہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ جو اس کے یہاں آتے ہیں، ان میں سے کسی نے اس کے ساتھ نواب کا ذکر کیا ہو گا اور سارا اتا پتا بتا دیا ہو گا۔ چنانچہ اس نے نواب سے کہا۔ ''میں بتا دوں گی تمہیں۔''

اور یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ کھٹیا پر بیٹھ کر اس نے ڈبیا میں سے افیم کی گولی نکالی اور لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ آدمی اچھا ہے۔ گڑبڑ نہیں کرے گا۔

وثوق سے اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا، لیکن اغلب یہی ہے کہ اجنبی جس کا نام ہیبت خان تھا اور ضلع ہزارہ کا بہت بڑا رئیس تھا، نواب کے الھڑ پن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت سردار سے کہا کہ آئندہ نواب کے پاس اور کوئی نہ آیا کرے۔ سردار ہوشیار عورت تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا۔ ''خان صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے...... کیا آپ اتنا روپیہ دے سکیں گے ......''

ہیبت خان نے سردار کی بات کاٹ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے نوٹوں

کی ایک موٹی گڈی نکالی اور نواب کے قدموں میں پھینک دی۔ پھر اس نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے نکالی اور نواب کو پہنا کر تیزی سے سرکنڈوں کے اس پار چلا گیا۔

نواب نے نوٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس دیر تک اپنی سجی ہوئی انگلی کو دیکھتی رہی جس پر کافی بڑے ہیرے سے رنگ رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ چونکی اور سرکنڈوں کے پاس آئی، مگر اب گرد وغبار کے سوا سڑک پر کچھ بھی نہیں تھا۔

سردار نوٹوں کی گڈی اٹھا کر انہیں گن چکی تھی ایک نوٹ اور ہوتا تو پورے دو ہزار تھے۔ مگر اس کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ سارے نوٹ اس نے اپنی گھیرے دار شلوار کے نیفے میں بڑی صفائی سے اڑسے اور نواب کو چھوڑ کر اپنی کھٹیا کی طرف بڑھی اور ڈبیا میں سے افیم کی ایک بڑی گولی نکال کر اس نے منہ میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی اور دیر تک سوتی رہی۔

نواب بہت خوش تھی۔ بار بار اپنی اس انگلی کو دیکھتی تھی جس میں ہیرے کی انگوٹھی پڑی تھی...... تین چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا ایک پرانا گاہک آیا جس سے سردار نے کہہ دیا کہ پولیس کا خطرہ ہے۔ اس لیے اس نے یہ دھندا بند کر دیا ہے۔ یہ گاہک جو خاصا دولت مند تھا، بے نیل و مرام واپس چلا گیا۔ سردار کو ہیبت خان نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے افیم کھا کر پینک کے عالم میں سوچا تھا کہ اگر آمدن اتنی ہی رہے جتنی کہ پہلے تھی اور آدمی صرف ایک ہو تو بہت اچھا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقیوں کو آہستہ آہستہ یہ کہہ کر ٹرخا دے گی کہ

پولیس والے اس کے پیچھے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتی کہ ان کی عزت خطرے میں پڑے۔

ہیبت خان ایک ہفتے کے بعد نمودار ہوا۔ اس دوران میں سردار دو گاہکوں کو منع کر چکی تھی کہ وہ اب ادھر کا رخ نہ کریں۔

وہ اسی شان سے آیا، جس شان سے پہلے روز آیا تھا۔ آتے ہی اس نے نواب کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔ سردار نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ نواب اسے .... بلکہ یوں کہیے کہ ہیبت خان اسے اس کوٹھڑی میں لے گیا جہاں نواڑی پلنگ تھا۔ اب کی سردار اندر نہ آئی اور اپنی کھٹیا پر افیم کی گولی کھا کر اونگھتی رہی۔

ہیبت خان بہت محظوظ ہوا۔ اس کو نواب کا الھڑ پن اور بھی زیادہ پسند آیا۔ وہ پیشہ ور رنڈیوں کے چلتروں سے قطعاً ناواقف تھی۔ اس میں وہ گھریلو پن بھی نہیں تھا جو عام گھریلو عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو خود اس کی اپنی تھی دوسروں سے بالکل مختلف۔ وہ بستر میں اس کے ساتھ اس طرح لیٹتی تھی جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ لیٹتا ہے۔ اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس کی ناک کے نتھنوں میں انگلیاں ڈالتا ہے، اس کے بال نوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سو جاتا ہے۔

ہیبت خان کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے لیے عورت کی یہ قسم بالکل نرالی، دلچسپ اور فرحت بخش تھی۔ وہ اب ہفتے میں دو بار آنے لگا تھا۔ نواب، اس کے لیے ایک بے پناہ کشش بن گئی تھی۔

سردار خوش تھی کہ اس کے نیفے میں اڑسنے کے لیے کافی نوٹ مل جاتے ہیں

......لیکن نواب اپنے الہڑ پن کے باوجود بعض اوقات سوچتی تھی کہ ہیبت خان ڈرا ڈرا سا کیوں رہتا ہے۔ اگر کچی سڑک پر سے، سرکنڈوں کے اس پار کوئی لاری یا موٹر گزرتی ہے تو وہ کیوں سہم سا جاتا ہے۔ کیوں اس سے الگ ہو کر باہر جاتا ہے اور چھپ چھپ کر دیکھتا ہے کہ کون تھا۔

ایک رات بارہ بجے کے قریب سڑک پر سے کوئی لاری گزری ہیبت خان اور نواب دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے سو رہے تھے کہ ایک دم ہیبت خان بڑے زور سے کانپا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نواب کی نیند بڑی ہلکی تھی وہ کانپا تو وہ سر سے پیر تک یوں لرزی جیسے اس کے اندر زلزلہ آ گیا ہے۔ چیخ کر اس نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

ہیبت خان اب کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ اس نے خود کو اور زیادہ سنبھال کر اس سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں...... میں...... میں شاید خواب میں ڈر گیا تھا۔''

لاری کی آواز دور سے رات کی خاموشی میں ابھی تک آ رہی تھی۔

نواب نے اس سے کہا۔ ''نہیں خان...... کوئی اور بات ہے۔ جب بھی کوئی موٹر یا لاری سڑک پر سے گزرتی ہے، تمہاری یہی حالت ہوتی ہے۔''

ہیبت خان کی شاید یہ دکھتی رگ تھی جس پر نواب نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنا مردانہ وقار قائم رکھنے کے لیے بڑے تیز لہجے میں کہا۔ ''بکتی ہو تم...... موٹروں اور لاریوں سے ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

نواب کا دل بہت نازک تھا۔ ہیبت خان کے تیز لہجے سے اس کے ٹھیس لگی اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ ہیبت خان نے جب اس کو چپ کرایا تو وہ

اپنی زندگی کے ایک لطیف ترین حظ سے آشنا ہوا اور اس کا جسم نواب جسم سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

ہیبت خان اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ خوبصورت تھا۔ اس کی باہوں میں نواب نے پہلی بار بڑی پیاری حرارت محسوس کی تھی اس کو جسمانی لذت کی الف بے اسی نے سکھائی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ یوں کہیے کہ وہ شے جو محبت ہوتی ہے اس کے معانی اب اس پر آشکار ہو رہے تھے۔ وہ اگر ایک ہفتہ غائب رہتا تو نواب گراموفون پر دردیلے گیتوں کے ریکارڈ لگا کر خود ان کے ساتھ گاتی اور آہیں بھرتی تھی۔ مگر اس کو اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ ہیبت خان موٹروں اور لاریوں کی آمد و رفت سے کیوں گھبراتا ہے۔

مہینوں گزر گئے۔ نواب کی سپردگی اور اس کے التفات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر اس کی الجھن بڑھتی گئی کہ اب ہیبت خان چند گھنٹوں کے لیے آتا اور افراتفری کے عالم میں واپس چلا جاتا تھا۔ نواب محسوس کر سکتی تھی کہ یہ سب کسی مجبوری کی وجہ سے ہے، ورنہ ہیبت خان کا جی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔

اس نے کئی مرتبہ اس سے اس بارے میں پوچھا مگر وہ گول کر گیا۔ ایک دن صبح سویرے اس کی ڈوج سرکنڈوں کے پار رکی۔ نواب سو رہی تھی۔ ہارن بجا تو چونک کر اٹھی۔ آنکھیں ملتی ملتی باہر آئی۔ اس وقت ہیبت خان اپنی موٹر دور کھڑی کر کے مکان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نواب دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر اندر اس کمرے میں لے گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا۔

دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ پیار محبت کی باتیں...... معلوم نہیں نواب

کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی زندگی کی پہلی فرمائش کی۔ ''خان............ مجھے سونے کے کڑے لادو۔''

ہیبت خان نے اس کی موٹی موٹی گوشت بھری سرخ وسفید کلائیوں کو کئی مرتبہ چوما اور کہا۔ ''کل ہی آجائیں گے۔ تمہارے لیے تو میری جان حاضر ہے۔''

نواب نے ایک ادا کے ساتھ مگر اپنے مخصوص الھڑ انداز میں کہا۔ ''خان صاحب...... جانے دیجیے...... جان تو مجھے ہی دینی پڑے گی۔''

ہیبت خان یہ سن کر کئی بار اس کے صدقے ہوا............ اور بڑا پر لطیف وقت گزار کے چلا گیا اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے دن آئے گا اور سونے کے کڑے اس کے نرم نرم ہاتھوں میں خود پہنائے گا۔

نواب خوش تھی۔ اس رات وہ دیر تک مسرت بھرے ریکارڈ بجا بجا کر اس چھوٹی کوٹھڑی میں ناچتی رہی جس میں نواڑی پلنگ تھا...... سردار بھی خوش تھی۔ اس رات اس نے پھر اپنی ڈبیا سے افیم کی ایک بڑی گولی نکالی اور اسے نگل کر سوگئی۔

دوسرے دن نواب اور زیادہ خوش تھی کہ سونے کے کڑے آنے والے ہیں اور ہیبت خان خود اس کو پہنانے والا ہے۔ وہ سارا دن منتظر رہی پر وہ نہ آیا۔ اس نے سوچا، شاید موڈ خراب ہوگئی ہو...... شاید رات ہی کو آجائے۔ مگر وہ ساری رات جاگتی رہی اور ہیبت خان نہ آیا۔ اس کے دل کو، جو بہت نازک تھا بڑی ٹھیس پہنچی۔ اس نے اپنی ماں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھی، بار بار کہا۔ ''دیکھو، خان نہیں آیا، وعدہ کر کے پھر گیا ہے۔'' لیکن پھر وہ سوچتی اور کہتی۔ ''ایسا نہ ہو، کچھ ہوگیا ہو۔'' اور وہ سہم سی جاتی۔

کئی باتیں اس کے دماغ میں آتی تھیں۔ موٹر کا حادثہ، اچانک بیماری، کسی ڈاکو کا حملہ...... لیکن بار بار اس کو لاریوں اور موٹروں کی آوازوں کا خیال آتا تھا۔ جن کو سن کر ہیبت خان ہمیشہ بوکھلا جاتا تھا...... وہ اس کے متعلق پہروں سوچتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں اس کا کوئی پرانا گاہک بھی نہ آیا۔ اس لیے کہ سرداراں سب کو منع کر چکی تھی۔ تین چار لاریاں اور دو موٹریں البتہ اس پکی سڑک پر سے دھول اڑاتی گزریں۔ نواب کا ہر بار یہی جی چاہا کہ دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے جائے اور ان کو آگ لگا دے۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہیبت خان کے یہاں آنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں مگر پھر سوچتی کہ موٹریں اور لاریاں رکاوٹ کا کیا باعث ہو سکتی ہیں اور اپنی کم عقلی پر ہنستی۔

لیکن یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ ہیبت خان جیسا تنومند مردان کی آواز سن کر سہم کیوں جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اس کے دماغ کی پیدا کی ہوئی کوئی دلیل جھٹلا نہیں سکتی تھی اور جب ایسا ہوتا تو بے حد رنجیدہ اور مغموم ہو جاتی اور گراموفون پر درد بھرے ریکارڈ لگا سننا شروع کر دیتی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

ایک ہفتے کے بعد دوپہر کو جب نواب اور سردار کھانا کھا کر فارغ ہو چکی تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کی سوچ رہی تھیں کہ اچانک باہر سڑک پر سے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ دونوں یہ آواز سن کر چونکیں۔ کیونکہ یہ ہیبت خان کی ڈوج کے ہارن کی آواز نہیں تھی...... سردار باہر لپکی کہ دیکھے کون ہے۔ پرانا آدمی ہو تو اسے

ڑ کھا دے۔ مگر جب وہ سرکنڈوں کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک نئی موٹر میں ہیبت خان بیٹھا ہے پچھلی نشست پر ایک خوش پوش اور خوبصورت عورت ہے۔

ہیبت خان نے موٹر کچھ دور کھڑی کی اور باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست سے وہ عورت...... دونوں ان کے مکان کی طرف بڑھے سردار نے سوچا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ عورت کے لیے تو ہیبت خان اتنی دور سے چل کر یہاں آتا، پھر یہ عورت جو اتنی خوبصورت ہے، جوان ہے، قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہے، اس کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ہیبت خان اس خوبصورت عورت کے ساتھ جس نے بیش قیمت زیور پہنے ہوئے تھے، مکان داخل ہو گیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ اس کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

جب وہ اندر گئی تو ہیبت خان، نواب اور وہ عورت تینوں فوراً ہی پلنگ پر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی...... عجیب قسم کی خاموشی۔ زیوروں سے لدی پھندی عورت البتہ کسی قدر مضطرب نظر آتی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔

سردار دہلیز کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر جب ہیبت خان نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سلام کیا...... ہیبت خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

اس عورت کی ٹانگ ہلنا بند ہوئی اور وہ سردار سے مخاطب ہوئی۔ ''ہم آئے ہیں۔ کھانے پینے کا تو بندوبست کرو۔''

سردار نے سرتاپا مہمان نواز بن کر کہا۔ ”جو تم کہو، ابھی تیار ہو جاتا ہے۔“

اس عورت نے جس کے خدوخال سے صاف مترشح تھا کہ بڑی دھڑلے کی عورت ہے، سردار سے کہا۔ ”تو چلو تم باورچی خانے میں...... چولہا سلگاؤ...... بڑی دیگچی ہے گھر میں؟“

”ہے!“ سردار نے اپنا وزنی سر ہلایا۔

”تو جاؤ، اس کو دھو کر صاف کرو۔ میں ابھی آئی۔“ وہ عورت پلنگ پر سے اٹھی اور گراموفون کو دیکھنے لگی۔

سردار نے معذرت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ ”گوشت وغیرہ تو یہاں نہیں ملے گا۔“

اس عورت نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی۔ ”مل جائے گا۔ تم سے جو کہا ہے وہ کرو...... اور دیکھو آگ کافی ہو۔“

سردار یہ احکام لے کر چلی گئی۔ اب وہ خوش پوش عورت مسکرا کر نواب سے مخاطب ہوئی۔ ”نواب ہم تمہارے لیے سونے کے کپڑے لے آئے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا وینٹی بیگ کھولا اور اس میں سے باریک سرخ کاغذ میں لپٹے ہوئے کپڑے نکالے جو کافی وزنی اور خوبصورت تھے۔

نواب، اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش ہیبت خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کپڑوں کو ایک نظر دیکھا اور اس سے بڑی نرم و نازک مگر سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”خان، یہ کون ہے؟“

اس کا اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔

وہ عورت کڑوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''میں کون ہوں؟...... میں ہیبت خان کی بہن ہوں۔'' اور یہ کہہ کر اس نے ہیبت خان کی طرف دیکھا جو اس کے اس جواب پر سکڑ سا گیا تھا۔ پھر وہ نواب سے مخاطب ہوئی۔ ''میرا نام ہلاکت ہے۔''

نواب کچھ نہ سمجھی۔ مگر وہ اس عورت کی آنکھوں سے خوف کھا رہی تھی جو یقیناً خوبصورت تھیں۔ مگر بڑے خوفناک طور پر کھلی۔ ان میں سے جیسے آگ برس رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور اس نس سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی نواب کی کلائیاں پکڑیں اور ان میں کڑے ڈالنے لگی۔ لیکن اس نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں اور ہیبت خان سے مخاطب ہوئی۔ ''تم جاؤ ہیبت خان .... میں اسے اچھی طرح سجا بنا کر تمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔''

ہیبت خان مبہوت تھا۔ جب وہ نہ اٹھا تو وہ عورت جس نے اپنا نام ہلاکت بتایا تھا، ذرا تیزی سے بولی۔ ''جاؤ...... تم نے سنا نہیں؟''

ہیبت خان، نواب کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہاں جائے اور کیا کرے۔

مکان کے باہر جو برآمدہ سا تھا اس کے ایک کونے میں ٹاٹ لگا باورچی خانہ تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سردار آگ سلگا چکی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور سرکنڈوں کے اس پار سڑک پر چلا گیا...... اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔

جب اس کو دور سے ایک لاری آتی دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ وہ اسے

روک لے اور اس میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہو جائے۔ مگر جب وہ پاس آئی تو ایسی ڈھول اڑی کہ وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اس نے آوازیں دیں، مگر گرد کے باعث اس کا حلق اس قابل ہی نہیں تھا کہ بلند آواز نکال سکے۔

گرد و غبار کم ہوا تو ہیبت خان نیم مردہ تھا...... اس نے چاہا کہ سرکنڈوں کے پیچھے اس مکان میں جائے جہاں اس نے کئی دن اور کئی راتیں نواب کے اجڑا پہلو میں گزاری تھیں مگر وہ نہ جا سکا۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔

وہ بہت دیر تک کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے کافی پرانے تعلقات تھے۔ صرف اس بناء پر کہ بہت دیر ہوئی۔ وہ اس کے خاوند کی موت کا افسوس کرنے گیا تھا جو اس کا لنگوٹیا تھا۔ مگر اتفاق سے یہ ماتم پرسی ان دونوں کے باہمی تعلق میں تبدیل ہو گئی۔ خاوند کی موت کے دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر میں تھا۔ اور اس عورت نے اس کو ایسے تحکم سے اندر بلا کر اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہے۔

ہیبت خان عورت کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ جب شاہینہ نے اس کے آگے اپنے عجیب و غریب تحکم بھرے التفات کا اظہار کیا تو اس کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہینہ کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے مرحوم خاوند کی، مگر اسے اس دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کو شاہینہ سے صرف یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی زندگی کی سب سے پہلی عورت تھی۔ وہ اس کے تحکم کے نیچے شاید اس لیے دب کے رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اناڑی

تھا۔

بہت دیر تک وہ کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہ گیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے مکان کی طرف بڑھا تو اس نے برآمدے میں ٹاٹ لگے باورچی خانے میں سردار کو کچھ بھونتے ہوئے دیکھا اندر اس کمرے کی طرف گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا تو دروازہ بند پایا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ کچے فرش پر اس کو سب سے پہلے خون ہی خون نظر آیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ پھر اس نے شاہینہ کو دیکھا جو دروازہ کے پٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا۔ ''میں نے تمہاری نواب کو سجا بنا دیا ہے۔''

ہیبت خان نے اپنے خشک گلے کو تھوک سے کسی قدر تر کر کے اس سے پوچھا۔ ''کہاں ہے؟''

شاہینہ نے جواب دیا۔ ''کچھ تو اس پلنگ پر ہے ......لیکن اس کا بہترین حصہ باورچی خانے میں ہے۔''

ہیبت خان پر اس کا مطلب سمجھے بغیر ہیبت طاری ہوگئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ وہیں دہلیز کے پاس کھڑا رہا۔ مگر اس نے دیکھا کہ فرش پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ہیں اور......اور ایک تیز چھری بھی پڑی ہے اور نواڑی پلنگ پر کوئی لیٹا ہے جس پر خون آلود چادر پڑی ہے۔

شاہینہ نے مسکرا کر کہا۔ ''چادر اٹھا کر دکھاؤں ......تمہاری سجی بنی نواب ہے! میں نے اپنے ہاتھوں سے سنگھار کیا ہے......لیکن تم پہلے کھانا کھا لو۔ بہت بھوک لگی

ہو گئی تمہیں۔ سردار بڑا لذیذ گوشت بھون رہی ہے۔ اس کی بوٹیاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹی ہیں۔"

ہیبت خان کے پاؤں لڑکھڑائے...... زور سے چلایا۔ "شاہینہ تم نے یہ کیا کیا؟"

شاہینہ مسکرائی۔ "جان من یہ پہلی مرتبہ نہیں...... دوسری مرتبہ ہے۔ میرا خاوند اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا۔ میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوؤں کو کھلایا تھا...... تم سے مجھے پیار ہے، اس لیے میں نے تمہارے بجائے............"

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا اور پلنگ پر سے خون آلودہ چادر ہٹا دی...... ہیبت خان کی چیخ اس کے حلق کے اندر ہی پھنسی رہی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ شاہینہ کار چلا رہی ہے اور وہ غیر علاقے میں ہیں۔

سنترپنچ

میں لاہور کے ایک اسٹوڈیو میں ملازم ہوا...... جس کا مالک میرا بمبئی کا دوست تھا...... اس نے میرا استقبال کیا...... میں اس کی گاڑی میں اسٹوڈیو پہنچا تھا بغل گیر ہونے کے بعد اس نے اپنی شرافت بھری موچھوں کو جو غالباً کئی دنوں سے ناتراشیدہ تھیں...... تھرکا کر کہا۔

''کیوں خواجہ چھوڑ دی۔''

میں نے جواب دیا

''چھوڑنی پڑی۔''

اسٹوڈیو کا مالک جو اچھا فلم ڈائیکٹر بھی ہے (میں اسے سہولت کی خاطر گیانی کہوں گا) مجھے اپنے خاص کمرے میں لے گیا...... ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرنے کے بعد اس نے چائے منگوائی جو نہایت ذلیل تھی...... زبردستی پلائی...... کئی سگریٹ اس دوران خود پھونکے اور مجھ سے پھنکوائے۔

مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا...... چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

''یار چھوڑو اب چائے کی بکواس کو...... مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے آج اتنے برسوں کے بعد یاد کیسے کرلیا۔''

''بس ایک دن اچانک یاد آگئے...... بلا لیا...... بتاؤ اب صحت کیسی ہے۔''

''تمہاری دعا سے ٹھیک ہے۔'' میرے لہجے میں دوستانہ طنز تھا...... وہ ہنسا۔

''واہ میرے مولوی صاحب...... میرا خیال ہے کہ جب سے تم خشک خشک

ہوئے ہو...... تمہاری ہر وقت شگفتہ رہنے والی طبیعت ٹھہرے پانی کی طرح ٹھہر گئی ہے۔‘‘

’’ہو گا ایسا ہی۔‘‘

’’ہو گا کیا...... ہے ہی ایسا معاملہ...... لیکن خدا نہ کرے ایسا ذہانت جس کے سب معترف ہیں...... اس کا بھی یہی حشر ہو...... کیا تم اب بھی فلمی کہانی کا ڈھانچہ تیار کر سکتے ہو...... فرسٹ کلاس کہانی۔‘‘

میں نے اس سے کہا۔

’’فرسٹ، سیکنڈ، انٹر اور تھرڈ میں نہیں جانتا...... البتہ کہانی ضرور ہو گی...... تم سوچتے ہو فرسٹ کی کہانی وہ اسکرین پر آتے ہی تھرڈ بن جائے...... یا تھرڈ جس کو تم نے ڈبوں میں بند کر کے گودام میں رکھ چھوڑا تھا...... وہ گولڈن جبلی فلم ثابت ہوا...... کیا درست نہیں...... خیر ان باتوں کو چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو۔‘‘

اس نے مجھے ایک سگریٹ سلگا کر دیا اور سنجیدگی سے کہا۔

’’دیکھو منٹو...... میں ایک کہانی چاہتا ہوں...... بڑا دلچسپ رومان ہو اور تم مجھے اس کا مفصل اسکیچ ایک ہفتہ کے اندر اندر دے دو...... کیونکہ میں فلم ڈسٹری بیوٹر سے کنٹریکٹ کر چکا ہوں تم بتاؤ کتنی دیر میں لکھ لو گے......‘‘

اس نے مجھے ایک سگریٹ سلگا کر دیا اور سنجیدگی سے کہا۔

’’دیکھو منٹو...... میں ایک کہانی چاہتا ہوں...... بڑا دلچسپ رومان ہو اور تم مجھے اس کا مفصل اسکیچ ایک ہفتہ کے اندر اندر دے دو...... کیونکہ میں فلم ڈسٹری بیوٹر سے

کنٹریکٹ کر چکا ہوں تم بتاؤ کتنی دیر میں لکھ لو گے......''

''فراغت سے ایک مہینہ کے بعد۔''

سردیوں کا موسم تھا اس نے اپنے ہاتھ میں ایک دوسرے کے ساتھ بڑے زور کے ساتھ ملے......اس کے اس عمل سے دو چیزیں ظاہر ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ اس کے ہاتھ گرم ہو گئے ہیں......دوم یہ کہ اس کے سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے کہ اس کو کہانی وقت پر مل جائے گی اور وہ جو کہ میری طرح بڑی تیزی سے کام کرنے والا ہے اسے وقت مقررہ کے اندر اندر ڈائریکٹ کر کے اس کے پرنٹ ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کر دے گا اور کنٹریکٹ کی رو سے جو بقایا رقم اس کے نام نکلتی تھی اسی وقت میز پر دھروا لے گا۔

اس نے چند لمحات غور کیا۔

''کل ہی کام شروع کر دے گا۔''

میں نے جواب دیا۔

''کام تو میں شروع کر دوں......لیکن یہاں میرے لیے کوئی علیحدہ کمرہ ہونا چاہیے۔''

''ہو جائے گا۔''

''اور ایک اسسٹنٹ......''

''مل جائے گا......تو کل سے آنا شروع کر دو گے۔''

میں نے اس سے کہا۔

''دیکھو گیلانی......میرے گھر سے اور تمہارے اسٹوڈیو تک کا فاصلہ کافی ہے

......تانگے میں آؤں تو قریب قریب ڈیڑھ گھنٹہ......بس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اس نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"یعنی اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے......بس اسٹینڈ پر کھڑے رہو......خدا خدا کر کے پانچ نمبر کی بس آ گئی......مسافروں سے بھری ہوئی اور وہ بغیر ٹھہرے چل دی اور تم خود کو دنیا کا کم ترین انسان محسوس کرتے ہو......جی میں آتا ہے کہ خودکشی کر لو......یا پھر دنیا والوں کی بے رخی سے نجات حاصل کرنے کے لیے سنیاس دھار لو۔"

گیلانی نے اپنی شرارت بھری مونچھیں تھرکائیں۔

"میں شرط بدنے کے لیے تیار ہوں کہ تم کبھی دنیا تیاگ نہیں سکتے جس دنیا میں کہ ہر قسم کی شراب ملتی ہے......اور خوبصورت عورتیں بھی۔"

میں نے چڑ کر کہا۔

"عورتیں جائیں جہنم میں......تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بمبئی کے ہر اسٹوڈیو میں جہاں میں نے کام کیا۔ ان سے دور ہی رہا۔ تم تو خیر اپنے وقت کے ڈون جوان ہو (Don Jyan)۔"

"مذاق اڑاتے ہو تم خواجہ میرا۔"

میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے کہا۔

"نہیں گیلانی۔"

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا......

یا یوں کہہ لو

ایں	سعادت	بزور	بازو نیست
تا	نہ	بخشد	خدائے بخشندہ

گیلانی مسکرایا۔

"خدائے بخشندہ تو بڑے عرصے سے تمہیں مرحوم و مغفور کر چکا ہے...... تم بخشی ہوئی روح ہو۔"

میں نے کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے...... میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں۔"

"فلسفہ مت بگھارو یار...... یہ بتاؤ کیا ابھی تک تمہارے پاس وہ اردو ٹائپ رائٹر موجود ہے۔"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم وہ ایکٹریس جس سے تم نے کلکتے میں شادی کی تھی ابھی تک تمہارے پاس موجود ہے۔"

گیلانی نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"موجود کیوں نہیں ہوگی...... گویا تمہاری نظر میں ایکٹریس اور ٹائپ رائٹر میں کوئی فرق نہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔

"کیا فرق ہے...... ایک فلم پر ٹائپ کرتی ہے...... دوسری کاغذ پر...... دونوں کسی وقت بھی بگڑ سکتی ہیں۔"

گیلانی میری ان باتوں سے تنگ آ گیا تھا...... آخر میں نے اس کو دلاسہ دیا۔
"یار یہ سب مذاق تھا...... تو میں کل آ جاؤں...... میرا مطلب ہے تم گاڑی بھیج دو گے۔"

گیلانی صوفے پر سے اٹھا...... اس کے ساتھ میں بھی...... اس نے کہا۔
"ہاں...... ہاں بھئی...... کب چاہیے تمہیں گاڑی۔"
"کوئی بھی وقت مقرر کر لو...... ساڑھے نو بجے صبح۔"
"ٹھیک ہے۔"
"تم کاغذ وغیرہ آج ہی منگوا لینا...... تاکہ میں اسٹوڈیو پہنچتے ہی کام شروع کر دوں...... اور تم سے یہ الٹا نہ سنوں کہ دیکھو تم نے مجھے لیٹ ڈاؤن کر دیا۔ میرا اتنے ہزار روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔"
گیلانی نے بڑے پیار سے کہا۔
"کیا بکتے ہو یار...... میں تمہاری طبیعت سے کیا واقف نہیں...... کبھی کبھی تم ڈبکی لگا جایا کرتے ہو۔"
میں نے اس کو یقین دلایا۔
"نہیں ایسا نہیں ہو گا...... تم مطمئن رہو...... ہاں میرا ٹائپ رائٹر یہاں محفوظ تو رہے گا۔"
گیلانی کی عادت ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتا ہے۔
"محفوظ نہیں رہے گا تو کیا غنڈے اغوا کرنے آ جائیں گے۔ اپنے کسی عاشق کے ساتھ تمہاری مشین بھاگ نکلے گی۔"

میں بہت ہنسا۔

ہنستے ہنستاتے ہم دونوں نے اسٹوڈیو کا چکر لگایا...... اس کے بعد اس نے مجھے الوداع کہی اور میں اسی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا...... جہاں پہنچتے ہی میں نے اپنے ٹائپ رائٹر کی جھاڑ پونچھ کی...... اس لیے کہ ایک مدت سے میں نے اسے استعمال نہیں کیا تھا...... کیونکہ فلمی کہانی لکھنے کا اس دوران میں کوئی موقع ہی میسر نہ آیا۔

بگڑا ہو ملکینک یا مستری آرٹسٹ بن جاتا ہے یہ میرا اپنا ذاتی اختراع کردہ محاورہ ہے۔

گیانی شروع شروع میں ملکینک تھا...... بگڑ کر وہ آرٹسٹ بن گیا پر وہ محنتی تھا۔

جب وہ مستری تھا تو اسے زیادہ سہولتیں میسر نہیں تھی لیکن جب کیمرہ قلی سے ترقی کرتا کرتا کیمرہ مین بن گیا تو اس نے کیمرے کے ہر پیچ کے متعلق اپنی خداداد ذہانت اور جستجو طلب طبیعت کی بدولت یہ دریافت کرلیا کہ ان کا لوہے کے اس چوکھٹے میں اپنی اپنی جگہ کیا مصرف ہے۔

کیمرے کو وہ الٹا کرتا...... کبھی سیدھا...... کبھی اس کا گیٹ کھول کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اس سے اپنے مختلف سائز کے پیچ پرزوں کے ذریعہ سے بوس و کنار میں مشغول رہتا۔

فرصت کے اوقات...... یعنی جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی...... وہ اپنی سائیکل پر شہر پہنچتا اور سارا دن کباڑیوں کی دکانوں پر صرف کرتا...... اس کو دنیا کے تمام کباڑیوں سے محبت ہے اور ان کے کباڑ خانوں کو وہ بڑی مقدس جگہیں تصور کرتا

تھا۔

وہ ان دکانوں میں بیٹھ کر منصوبہ تیار کرتا رہتا کہ سامانی مشین کا ہینڈل جو بیکار پڑا ہے اگر لوہے کے فلاں ٹکڑے کے ساتھ ویلڈ کر دیا جائے اور اس کے فلاں کے اندر چھوٹے پنکھے جو نکڑ والی دکان میں موجود ہیں لگا دیئے جائیں تو فرسٹ کلاس دھونکنی بن سکتی ہے۔

حدا معلوم وہ کیا کیا سوچتا تھا...... ان دنوں دراصل ذہنی ورزش کر رہا تھا...... یہ وہ تیاری تھی جو وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ایڈیٹنگ بھی اسی طرح سیکھی...... آس پاس کی ہر ننھی سے ننھی شے کا مطالعہ کیا اور آخر ایک دن اس نے اسٹوڈیو کی ایک فلم کی ایسی عمدہ ایڈیٹنگ کی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔

سیٹھ نے سوچا...... کہ اچھے کیمرہ مین تو مل جائیں گے مگر ایسا باکمال ایڈیٹر جو سیلولائیڈ کے چھوٹے بڑے فیتے کے ٹکڑوں کو اس چابکدستی سے جوڑتا ہے کہ پھر اس میں مزید کتر بیونت ہو ہی نہیں سکتی...... چنانچہ ایڈیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بنا دیا۔ تنخواہ اس کی وہی رہی جو بحیثیت کیمرہ مین تھی۔

وہ اپنا کام بڑی محنت اور تندہی سے کرتا رہا...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں وہ لیبارٹری سے بھی دلچسپی لیتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس نے اس کے کل پرزوں میں چند اصلاحات اور ترکیبیں پیش کیں جو بڑی ردوکد کے بعد قبول کر لی گئیں...... نتیجہ دیکھا گیا تو بڑا حوصلہ افزا تھا۔

سیٹھ نے ایک دن سوچا۔

''کیوں نہ گیلانی کو ایک فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے۔''

جب اس سے پوچھا۔

''تم کوئی فلم ڈائریکٹ کرلوگے۔''

تو اس نے بڑی خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''ہاں سیٹھ...... پر اس میں کوئی دخل نہ دے۔''

کہانی آدھی گیلانی نے خود بنائی...... آدھی ادھر ادھر کے منشیوں سے لکھائی اور اللہ کا نام لے کر شوٹنگ شروع کردی...... یہ فلم ختم ہوا اور نمائش کے لیے مقامی سینما ہاؤس میں پیش کیا گیا تو اس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

اس کے بعد اس نے لاہور میں دو فلم بنائے...... یہ بھی سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئے...... ایک کلکتے جا کر پھر بنایا وہ بھی کامیاب تھا۔ یہاں سے وہ بمبئی پہنچا...... کیونکہ وہاں کے فلمسازوں نے بڑی تگڑی تگڑی آفریں بھیجی تھیں...... چنانچہ ایک جگہ اس نے آفر قبول کر کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور کہانی چن وے کا منظر نامہ خود لیا گیا...... فلم بن گیا...... اور اتنا بڑا باکس آفس ثابت نہ ہوا۔

شاید اس لیے کہ بٹوارے کے باعث دوسرے شہروں کے مانند بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ جس طرح دوسرے مسلمان ہجرت کر رہے تھے اس طرح گیلانی بھی بمبئی چھوڑ کر کراچی چلا گیا...... یہاں سے وہ لاہور پہنچا اور ایک اسٹوڈیو کی داغ بیل رکھی...... ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے لے کر کیلیں ٹھونکنے والے تک کو اس کی ذاتی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ قصہ مختصر کہ اسٹوڈیو تیار ہو گیا۔

لاہور کے مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

جب یہ اسٹوڈیو بنا تو ان کی جان میں جان آئی۔ چنانچہ یہاں شوٹنگ شروع ہو گئی...... اس کے بعد یہ چل نکلا...... گیلانی اس دوران میں اسٹیج اور ادھر ادھر کے متعلقہ سامان کو درست اور مرمت کرانے میں مشغول رہا اس کا دست راست لاہور ہی کا ایک نوجوان سراج دین تھا...... جو قریب قریب آٹھ برس سے اس کے ساتھ تھا...... نے کہا ٹائپ رائٹروں کی دال لے کر کھالو۔

اس کے بعد گیلانی نے خود میرے ٹائپ رائٹر کا معائنہ کیا اور فیصلہ صادر کر دیا کہ مشین میں کوئی نقص نہیں۔

مگر سراج اپنے تجربے کے بل بوتے پر مصر تھا۔

"نہیں حضور...... یہ اب مرمت طلب ہو چکی ہے...... بڑے اور چھوٹے رولر سب نئے لگوانے پڑیں گے...... او ور ہالنگ ہو گی...... اس کا کتا بھی ناقص ہو چکا ہے۔ وہ بھی پڑے گا۔"

"تمہاری ٹانگوں پر......"

"آپ میرا مذاق نہ اڑائیے...... اچھا...... خیر آپ ہی صحیح کہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے گنجے سر پر ٹوپی درست کرتا ہوا چلا گیا۔

گیلانی نے اپنا خاص ٹول بکس منگوایا اور مشین کے سب پرزے الگ الگ کر کے رکھ دیئے۔ کوئی پرزہ پتھر پر گھسایا...... کوئی ریگمار پر...... کسی کے سریش لگائی...... کسی کو تیل اور ان کو دوبارہ فٹ کر کے فتحمندانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کیوں صاحب ٹھیک ہوگئی یا نہیں۔"

میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔"

گیلانی نے اپنے پاس کھڑے اسسٹنٹ کو بلایا۔

"جاؤ اس الو کے پٹھے ایکسپرٹ سراج کو بلا کر لاؤ۔"

چند منٹ میں سراج حاضر ہوگیا۔

اس نے مشین چلائی تو دس پندرہ بار ٹپ ٹپ کرنے کے بعد ہی خاموش ہوگئی۔

سراج نے گیلانی سے کچھ نہ کہا۔

تھوڑے وقفہ کے بعد گیلانی بڑے تحکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

"اچھا تم اسے بناؤ دیکھیں تم کیا تیر مارتے ہو۔"

مجھے اپنی پندرہ سالہ عزیز مشین کی اس درگت پر ترس آ رہا تھا...... مگر اب کیا ہو سکتا ہے...... جب اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے پڑے تھے۔

دوسرے دن سراج نے اپنا ٹول بکس ریکارڈنگ میں سے منگوایا اور میری مشین پر اپنی ماہرانہ سرجری شروع کر دی۔

ضروری پرزے نکال کر اس نے علیحدہ رکھ لیے اور باقی حصے پٹرول میں ڈال دیئے۔

اب ان کی چتا جلانے کے لیے صرف ماچس کی ایک تیلی ہی کافی تھی۔

میں خاموش رہا۔

یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

کتے کے جبڑوں کو ایک پلاس کے ساتھ زور سے پکڑا اور میری طرف کرتے ہوئے بولا۔

"لو دیکھ لو........ میں نہ کہتا تھا........ کتا کام نہیں کر رہا........ اس کا تو سنتر پنچ ہی خراب ہے۔"

"سنتر پنچ........"

"ہاں........"

اور سراج ایک بار پھر اس کا سنتر پنچ ٹھیک کرنے لگا۔

سونے کی انگوٹھی

''چھتے کا چھتہ ہو گیا آپ کے سر پر...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بال نہ کٹوانا کہاں کا فیشن ہے؟''

''فیشن ویشن کچھ نہیں...... تمہیں اگر بال کٹوانے پڑیں تو قدر عافیت معلوم ہو جائے۔''

''میں کیوں بال کٹواؤں۔''

''کیا عورتیں کٹواتی نہیں...... ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسی موجود ہیں جو اپنے بال کٹواتی ہیں............ بلکہ اب تو یہ فیشن بھی چل نکلا ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح چھوٹے بال رکھتی ہیں۔''

''لعنت ہے ان پر............''

''کس کی؟''

''خدا کی اور کس کی............ بال تو عورت کی زینت ہیں...... سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورتیں کیوں اپنے بال مردوں کی مانند بنوا لیتی ہیں پھر پتلونیں پہنتی ہیں۔ نذر ہے ان کا وجود دنیا کے تختے پر............''

''وجود تو خیر آپ کی اس بد دعا سے ان نیک بخت عورتوں کا دنیا کے اس تختے سے کسی حالات میں بھی غائب نہیں ہو گا...... ویسے ایک چیز سے مجھے تم سے کلی اتفاق ہے کہ عورت کو پتلون جسے سلیکس کہتے ہیں...... نہیں پہننی چاہیے...... اور سگریٹ بھی نہیں پینے چاہئیں۔''

"اور آپ ہیں کہ دن میں پورا ایک ڈبہ پھونک ڈالتے ہیں۔"

"اس لیے کہ میں مرد ہوں...... مجھے اس کی اجازت ہے۔"

"کس نے دی تھی یہ اجازت آپ کو...... میں اب آئندہ سے ہر روز صرف ایک ڈبیا منگا کر دیا کروں گی۔"

"اور وہ جو تمہاری سہلیاں ہیں ان کو سگریٹ کہاں سے ملیں گے؟"

"وہ کب پیتی ہیں؟"

"اتنا سفید جھوٹ نہ بولا کرو...... ان میں سے جب بھی کوئی آتی ہے تم میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر اندر لے جاتی ہو...... ساتھ ہی ماچس بھی...... آخر مجھے آواز دے کر تمہیں بلانا پڑتا ہے اور میرا ڈبہ مجھے واپس مل جاتا ہے اس میں سے پانچ چھ سگریٹ غائب ہوتے ہیں۔"

"پانچ چھ سگریٹ......؟ جھوٹ تو آپ بول رہے ہیں...... وہ تو بے چاریاں مشکل سے ایک سگریٹ پیتی ہیں۔"

"ایک سگریٹ پینے میں انہیں مشکل کیا محسوس ہوتی ہے۔"

"میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتی...... آپ کو تو اور کوئی کام ہی نہیں سوائے بحث کرنے کے۔"

"ہزاروں کام ہیں...... تم کون سے ہل چلاتی ہو...... سارا دن پڑی سوئی رہتی ہو۔"

"جی ہاں...... آپ تو چوبیس گھنٹے جاگتے اور وظیفہ کرتے رہتے ہیں۔"

"وظیفے کی بات غلط ہے...... البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں صرف رات کو چھ

گھنٹے سوتا ہوں۔''

''اور دن کو۔''

''کبھی نہیں...... بس آنکھیں بند کر کے تین چار گھنٹے لیٹا رہتا ہوں کہ اس سے آدمی کو بہت آرام ملتا ہے...... ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔''

''یہ تھکن کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ کون سی مزدوری کرتے ہیں؟''

''مزدوری ہی تو کرتا ہوں...... صبح سویرے اٹھتا ہوں...... اخبار پڑھتا ہوں...... ایک نہیں سیر...... پھر ناشتہ کرتا ہوں...... نہاتا ہوں اور پھر تمہاری روزمرہ کی چخ چخ کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔''

''یہ مزدوری ہوئی؟ اور آپ یہ بتائیے کہ روزمرہ کی چخ چخ کا الزام کہاں تک درست ہے۔''

''جہاں تک اسے ہونا چاہیے...... شروع شروع میں...... میرا مطلب شادی کے بعد دو برس تک بڑے سکون میں زندگی گزرتی رہی تھی لیکن پھر ایک دم تم پر کوئی ایسا دورہ پڑا کہ تم نے ہر روز مجھ سے لڑنا جھگڑنا معمول بنا لیا...... پتہ نہیں اس کی وجہ کیا ہے؟''

''وجہ ہی تو مردوں کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے...... آپ لوگ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔''

''مگر تم سمجھنے کی مہلت بھی دو...... ہر روز کسی نہ کسی بات کا شوشہ چھوڑ دیتی ہو...... بھلا آج کیا بات تھی جس پر تم نے اتنا چیخنا چلانا شروع کر دیا۔''

''گویا یہ کوئی بات ہی نہیں کہ آپ نے پچھلے چھ مہینوں سے بال نہیں کٹوائے

اپنی اچکنوں کے کالر دیکھئے...... میلے چکٹ ہو رہے ہیں۔''

''ڈرائی کلین کرالوں۔''

''پہلے اپنا آپ ڈرائی کلین کرائیے...... وحشت ہوتی ہے اللہ قسم آپ کے بالوں کو دیکھ کر...... جی چاہتا ہے مٹی کا تیل ڈال کر ان کو آگ لگا دوں۔''

''تا کہ میرا خاتمہ ہی ہو جائے...... لیکن مجھے تمہاری اس خواہش پر کوئی بھی اعتراض نہیں...... لاؤ باورچی خانے سے مٹی کے تیل کی بوتل...... آہستہ آہستہ میرے سر میں ڈالو اور ماچس کی تیلی جلا کر اس کو آگ دکھا دو...... خس کم جہاں پاک۔''

''یہ کام آپ خود ہی کیجیے...... میں نے آگ لگائی تو آپ یقیناً کہیں گے کہ تمہیں کسی کام کا سلیقہ نہیں۔''

''یہ تو حقیقت ہے کہ تمہیں کسی بات کا سلیقہ نہیں...... کھانا پکانا نہیں جانتیں، سینا پرونا تمہیں نہیں آتا...... گھر کی صفائی بھی تم اچھی طرح نہیں کر سکتیں، بچوں کی پرورش ہے تو اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔''

''جی ہاں...... بچوں کی پرورش تو اب تک ماشاءاللہ آپ ہی کرتے آئے ہیں میں تو بالکل ہی نکمی ہوں۔''

''میں اس معاملے میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا...... تم خدا کے لیے اس بحث کو بند کرو۔''

''میں بحث کہاں کر رہی ہوں...... آپ تو معمولی باتوں کو بحث کا نام دے دیتے ہیں۔''

"تمہارے نزدیک یہ معمولی باتیں ہوں گی، مگر خدا کی قسم! تم نے میرا دماغ چاٹ لیا ہے...... میرے سر پر ہمیشہ اتنے ہی بال رہے ہیں...... اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اتنی فرصت نصیب نہیں ہوتی کہ حجام کے پاس جاؤں۔"

"جی ہاں...... آپ کو اپنی عیاشیوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔"

"کن عیاشیوں سے۔"

"آپ کام کیا کرتے ہیں ------ کہاں ملازم ہیں --- کیا تنخواہ پاتے ہیں"

"ملازمت کیا ضروری ہے میں تو اس کو بہت بڑی لعنت سمجھتا ہوں"

"آپ کو تو ہر وہ کام بہت بڑی لعنت معلوم ہوتا ہے جس میں آپ کو محنت مشقت کرنی پڑے۔"

"میں کیا محنت مشقت نہیں کرتا --- ابھی پچھلے دنوں اینٹیں سپلائی کرنے کا میں نے جو ٹھیکہ کیا تھا جانتی ہو میں نے دن رات ایک کر دیا تھا۔"

"گدھے کام کر رہے ہیں آپ تو سوتے رہے ہوں گے"

"گدھوں کا زمانہ گیا --- لاریاں کام کر رہی تھیں ---- اور مجھے ان کی نگرانی کرنا پڑتی تھی ------ دس کروڑ اینٹوں کا ٹھیکہ تھا ---- مجھے ساری رات جاگنا پڑتا تھا۔"

"میں مان ہی نہیں سکتی کہ آپ ایک رات بھی جاگ سکیں"

"اب اس کا کیا علاج ہے کہ تم نے میرے متعلق ایسی غلط رائے قائم کر لی ہے ---- اور میں جانتا ہوں کہ تم ہزار رشوت دینے پر بھی مجھ پر یقین نہیں کرو

گی۔''

''میرا یقین آپ پر سے عرصہ ہوا اٹھ گیا ہے آپ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔''

''بہتان تراشی میں تمہاری ہم پلہ اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا''

''ٹھہرئیے۔۔۔۔۔۔۔ پرسوں آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی دوست کے ہاں گئے تھے لیکن جب شام کو آپ نے تھوڑی سی پی۔۔۔۔۔۔۔ تو چہک چہک کر مجھے بتایا کہ آپ ایک ایکٹرس سے مل کر آئے ہیں''

''وہ ایکٹرس بھی تو اپنی دوست ہے۔۔۔ دشمن تو نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے اپنے ایک دوست کی بیوی ہے۔''

''آپ کے دوستوں کی بیویاں عموماً ایکٹریسیں ہوتی ہیں، یا طوائفیں''

''اس میں میرا کیا قصور۔۔۔۔''

''سارا قصور ہی آپ کا ہے''

''وہ کیسے؟''

''ایسے کہ میں نے آپ سے شادی کر لی۔۔۔ میں ایکٹرس ہوں نا طوائف''

''مجھے ایکٹریسوں اور طوائفوں سے سخت نفرت ہے۔۔۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ وہ عورتیں نہیں سلیٹیں ہیں جن پر کوئی بھی چند حروف یا لمبی چوڑی عبارت لکھ کر مٹا سکتا ہے۔''

''تو اس روز آپ کیوں اس ایکٹرس کے پاس گئے''

"میرے دوست نے بلایا۔۔۔۔۔۔میں چلا گیا۔۔۔اس نے ایک ایکٹریس سے جو پہلے چار شادیاں کر چکی تھیں نیا نیا بیاہ رچایا تھا مجھے اس سے متعارف کرایا گیا۔"

"کیسی تھی؟"

"چار شادیوں کے بعد بھی وہ خاصی جوان دکھائی دیتی تھی۔۔۔۔۔۔بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ عام کنواری جوان لڑکیوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے اچھی تھی۔"

"وہ ایکٹریسیں کس طرح خود کو چست اور جوان رکھتی ہیں"

"مجھے اس کے متعلق کوئی زیادہ علم نہیں۔۔۔۔۔۔بس اتنا سنا ہے کہ وہ اپنے جسم اور جان کی حفاظت کرتی ہیں۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ بڑی بدکردار ہوتی ہیں اول درجے کی فاحشہ۔۔۔۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔۔۔۔۔۔مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں"

"آپ ایسی باتوں کا جواب ہمیشہ گول کر جاتے ہیں"

"جب مجھے کسی خاص چیز کے متعلق کچھ علم ہی نہ ہو تو میں جواب کیا دوں۔۔۔۔۔۔میں تمہارے مزاج کے متعلق بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔۔۔"

"دیکھئے آپ میرے متعلق کچھ نہ کہا کیجئے۔۔۔آپ ہمیشہ میری بے عزتی کرتے رہتے ہیں میں یہ برداشت نہیں کر سکتی"

"میں نے تمہاری بے عزتی کب کی ہے"

''یہ بے عزتی نہیں کہ پندرہ برسوں میں آپ میرا مزاج نہیں جان سکے اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں مخبوط الحواس ہوں نیم پاگل ہوں، جاہل ہوں، اجڈ ہوں''

''یہ تو خیر تم نہیں ہو۔۔۔۔۔لیکن تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے میرے بالوں کی بات کس غرض سے شروع کی۔۔۔۔اس لیے کہ جب بھی تم کوئی بات شروع کرتی ہو تو اس کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے۔''

''خاص بات کیا ہوگی۔۔۔بس آپ سے صرف یہی کہنا تھا کہ بال اتنے بڑھ گئے ہیں کٹوا دیجیے۔۔۔۔۔حجام کی دکان یہاں سے کتنی دور ہے زیادہ سے زیادہ دو سو گز کے فاصلے پر ہوگی۔۔۔جائیے۔۔۔۔۔میں پانی گرم کراتی ہوں''

''جاتا ہوں۔۔۔۔۔میں ذرا ایک سگریٹ پی لوں''

سگریٹ وگریٹ آپ نہیں پئیں گے۔۔۔۔۔صبح سے اب تک۔۔۔۔۔ٹھہرئیے میں ڈبہ دیکھ لوں۔۔۔۔۔میرے اللہ۔۔۔۔بیس سگریٹ پھونک چکے ہیں آپ۔۔۔بیس۔۔۔

''یہ تو کچھ زیادہ نہ ہوئے۔۔۔۔بارہ بجنے والے ہیں''

'' زیادہ باتیں مت کیجیے۔۔۔۔سیدھے حجام کے پاس جائیے۔۔۔۔اور یہ اپنے سر کا بوجھ اتروائیے''

''جاتا ہوں۔۔۔۔۔کوئی اور کام ہو تو بتا دو''

''میرا کوئی کام نہیں۔۔۔آپ اس بہانے سے مجھے ٹالنا چاہتے ہیں''

"اچھا تو میں چلا"

"ٹھہریئے"

"ٹھہر گیا۔۔۔۔فرمایئے"

"آپ کے بٹوے میں کتنے روپے ہوں گے"

"پانچ سو کے قریب"

"تو یوں کیجئے۔۔۔۔۔بال کٹوانے سے پہلے انارکلی سے سونے کی ایک انگوٹھی لے آیئے۔۔۔آج میری ایک سہیلی کی سالگرہ ہے۔۔۔۔۔وہ ڈھائی سو روپے کی ہو"

"میری تو وہیں انارکلی ہی میں حجامت ہو جائے گی۔۔۔۔میں جاتا ہوں۔"

☆☆☆☆☆

سہائے

یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔۔۔یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔۔۔۔۔۔اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں، ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہو گا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔۔وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جا سکتے ہیں۔۔۔مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت۔۔۔۔۔یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے۔۔۔۔چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟

ممتاز اس روز بہت ہی پر جوش تھا ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔۔۔وہ ایک غیر متعین عرصے کے لئے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا۔۔۔۔پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے۔مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا، غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا، چنانچہ اسی

صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا ''میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے خطے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔''

ممتاز نے اس سے پوچھا ''کیا کرو گے؟''

جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا ''میں سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں گا۔''

یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے ''میں سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے، میں تمہیں مار ڈالوں'' غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ممتاز کو جو کہ اس کا جگری دوست تھا۔۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہو گیا تھا۔۔۔۔۔خاص طور پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے۔

صبح اٹھتے ہی اس نے پینا شروع کر دی اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لئے جا رہا ہے۔۔۔۔۔خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابل بیان مسرت محسوس کر رہا ہے لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے

جذبات چھپانے کے لیے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روانگی کے متعلق بات کروں اشارۃً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقع ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پیگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں لانڈری سے کپڑے لانے تھے۔۔۔۔۔۔ یہ سب کام اس نے ہنستے کھیلتے کیے، لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا "یاد ہے برج۔۔۔ آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا، گوبند نے ہمیں ایک روپیہ ادھار دیا تھا۔"

راستے میں ممتاز خاموش رہا، مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لا متناہی سلسلہ شروع کر دیا، ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر، لیکن وہ کچھ ایسی پر خلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے جب روانگی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہو گیا لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔

ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں، حتیٰ کہ ٹیکسی اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی بے حد بھیڑ تھی ہزار ہا ریفیوجی جا رہے تھے

خوشحال بہت کم اور بد حال بہت زیادہ۔۔۔۔۔بے پناہ ہجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کیبن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا۔۔۔۔اِدھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے ممتاز دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا" یہ محض فریب نظر ہے۔۔۔۔آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا۔۔۔لیکن یہ فریب نظر کس قدر دلکش ہے۔۔۔۔۔۔یہ ملاپ!"

جگل خاموش رہا غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چٹکیاں لے رہی تھی "میں سوچ رہا ہوں بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں"

ممتاز نے جہاز کی بار سے برانڈی منگوائی کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا۔۔۔۔ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے ریفیوجی دھڑا دھڑ جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے تھے۔

جگل نے دفعتاً ایک ہی جرعے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا" مجھے معاف کر دینا ممتاز۔۔۔۔میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا۔"

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا" جب تم نے کہا تھا میں

سوچ رہا ہوں۔۔۔بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔۔۔کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا۔۔۔نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔‘‘

جگل نے اثبات میں سر ہلایا ’’لیکن مجھے افسوس ہے‘‘

’’تم مجھے مار ڈالتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا‘‘ ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا ’’لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو۔۔۔ایک مسلمان کو۔۔۔ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔۔۔وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرامزدگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مار ڈالا ہے۔۔۔وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے۔۔۔اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا۔‘‘

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا ’’ہو سکتا ہے، میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا، مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں۔۔۔مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں۔۔۔لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا۔۔۔تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا۔۔۔بتاؤ تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟۔۔۔اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے۔۔۔میں تو یہ کہوں گا مرنے والے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار۔۔۔بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے۔۔۔‘‘

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت زیادہ جذباتی ہوگیا لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت ۔۔۔۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے جو چھرے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جا سکتا چنانچہ میں نے اس سے کہا ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو''

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بے چینی سے کہا ''نہیں بالکل ٹھیک نہیں ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا ۔۔۔۔ مذہب سے میری مراد یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں، جس میں ہم میں سے ننانوے فی صد مبتلا ہیں ۔۔۔۔ میری مراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت بخشتی ہے ۔۔۔ وہ ہر چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے ۔۔۔۔ لیکن یہ چیز کیا ہے؟ ۔۔۔ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھا سکتا'' یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا ''لیکن اس میں وہ کون سی خاص بات تھی ۔۔۔۔ کٹر ہندو تھا ۔۔۔ پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟''

میں نے پوچھا ''کس کی؟''

ایک بھڑوے کی

ہم تینوں چونک پڑے ممتاز کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، اس لیے میں نے

سنجیدگی سے پوچھا "ایک بھڑوے کی؟"

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا "مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرف عام میں ایک بھڑوا تھا۔۔۔عورتوں کا دلال۔۔۔لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔"

ممتاز تھوڑی دیر کے لیے رک گیا، جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے۔۔۔چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا "اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔۔۔کچھ سہائے تھا۔۔۔بنارس کا رہنے والا بہت ہی صفائی پسند وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔۔۔پردے کا معقول انتظام تھا چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے لیکن گدیلے اور گاؤ تکیے موجود تھے چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اجلے رہتے تھے نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔۔۔صرف صفائی ہی نہیں، ہر کام۔۔۔اور دوسرے بلا وجہ کبھی نہیں ٹالتا تھا دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔۔۔رات زیادہ گزر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجیے۔۔۔اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپاتا نہیں تھا۔۔۔اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے کما چکا ہے۔۔۔۔ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر۔۔۔اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے۔۔۔معلوم نہیں صرف دس ہزار کیوں، زیادہ کیوں نہیں۔۔۔اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور

بزازی کی دکان کھولے گا۔۔۔میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزو مند کیوں تھا۔"

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا "عجیب وغریب آدمی تھا"

ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی "میرا خیال تھا کہ وہ سرتاپا بناوٹ ہے۔۔۔۔ایک بہت بڑا افراڈ ہے کون یقین کرسکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جو اس کے دھندے میں شریک تھیں اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا یہ بھی اس وقت میرے لیے بعید از فہم تھا کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹس کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا اور یہ بات تو بالکل ناقابل یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔۔۔۔اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔۔۔ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا امینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں۔۔۔۔میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جاکر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں۔۔۔۔یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں۔۔۔۔۔میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرایا کہ مجھے بنا رہا ہے ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی لاہور سے خط لکھا ہے کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی اب اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جاکر بزازی کی دکان کھول سکے یہ سن کر تو میں ہنس پڑا میں نے سوچا چونکہ میں مسلمان ہوں اس

لیے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں نے ممتاز سے پوچھا "تمہارا خیال غلط تھا؟"

"بالکل ۔۔۔ اس کے قول و فعل میں کوئی بعد نہیں تھا ۔۔۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں ۔۔۔ مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا۔"

جگل نے سوال کیا "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اس کی موت پر" یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے "فسادات شروع ہو چکے تھے ۔۔۔ میں علی الصبح اٹھ کر بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا ۔۔۔ کرفیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی ۔۔۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے ٹوکرے کے پاس گٹھڑی سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پاٹی والا (مزدور) سو رہا ہے ۔۔۔ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھڑے دیکھے تو رک گیا ۔۔۔ واردات قتل کی تھی، میں نے سوچا اپنا راستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی ۔۔۔ میں پھر رک گیا آس پاس کوئی نہ تھا میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا مگر خون کے دھبوں سے بھرا ہوا میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا ۔۔۔ اس کی ٹول کی سفید قمیص جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا

اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے ایک دو بار میں نے اس کو نامکمل نام سے بھی پکارا۔۔۔۔میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔۔۔۔پھر ایک دم سارے بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا ''آپ۔۔آپ۔۔۔۔

میں نے اس سے تلے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دیں وہ کیسے ادھر آیا کس نے اس کو زخمی کیا کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔۔۔۔سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں۔

اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی جب میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے ''میرے دن پورے ہو چکے تھے۔۔۔۔۔بھگوان کو یہی منظور تھا۔''

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کو مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا۔۔۔۔میں ڈرپوک تو نہیں لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں، دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لیے دھر لیا جاؤں گا۔۔۔۔۔ایک بار یہ خیال آیا اگر میں اسے

ہسپتال لے گیا تو کیا پتا ہے اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے، سوچ، مرنا تو ہے کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔۔۔اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا۔۔۔بلکہ یوں کہیے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا۔۔۔میں ٹھہر گیا۔۔۔۔۔نہ ٹھہرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے۔۔۔۔میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے۔۔۔۔اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے، بڑی مشکلوں سے اپنی قمیص کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا۔۔۔۔۔"نیچے بنڈی ہے۔۔۔۔اُدھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں۔۔۔یہ۔۔۔یہ سلطانہ کا مال ہے۔۔۔۔میں نے۔۔۔میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔۔۔ آج اسے۔۔۔آج اسے بھیجنے والا تھا۔۔۔۔۔کیونکہ۔۔۔۔کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔۔آپ اسے دے دیجئے گا اور۔۔۔۔۔کہیے گا فوراً چلی جائے۔۔۔لیکن۔۔۔۔۔۔اپنا خیال رکھیے گا۔"

ممتاز خاموش ہو گیا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز سہائے کی آواز میں جو جے جے ہسپتال کے سامنے فٹ پاتھ پر ابھری تھی، دور، اُدھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے حل ہو رہی ہے۔

جہاز نے وسل دیا، ممتاز نے کہا "میں سلطانہ سے ملا۔۔۔اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا۔۔۔۔۔۔اس کا داہنا ہاتھ ہل رہا تھا۔۔میں جگل سے مخاطب ہوا" کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز سہائے کی روح کو بلا رہا ہے۔۔ہم سفر بنانے کے لیے؟"

جگل نے صرف اتنا کہا" کاش میں سہائے کی روح ہوتا"

☆☆☆☆☆☆

شاردا

نذیر بلیک مارکیٹ سے وسکی کی بوتل لانے گیا بڑے ڈاک خانے سے کچھ آگے بندرگاہ کے پھاٹک سے کچھ ادھر سگریٹ والے کی دکان سے اسکوچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا اس کا ارادہ تھا کہ بلوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا ایک پیگ اس میں بیٹھ کر پئے گا اور ہلکے ہلکے سرور میں گھر پہنچ جائے گا بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا "موسم دیکھو کتنا اچھا ہے" پھر وہ اسے وہ بھونڈا سا شعر سنائے گا۔

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور رنج کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کھانے پر قیمے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دکان سے وہ بیس پچیس گز دور گیا ہو گا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا نذیر کا حافظہ کمزور تھا اس نے سلام کرنے والے آدمی کو نہ پہچانا لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا، چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا "کیوں بھئی کہاں ہوتے ہو کبھی

نظر ہی نہیں آئے"

اس آدمی نے مسکرا کر کہا "حضور! میں تو یہیں ہوتا ہوں آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے؟"

نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا "میں اب جو تشریف لے آیا ہوں"

"تو چلیے میرے ساتھ"

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا "چلو"

اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکرایا "باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے"

یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلال ہے "تمہارا نام کیا ہے؟"

"کریم ۔۔۔ آپ بھول گئے تھے"

نذیر کو یاد آ گیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اس کے لیے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا بڑا ایماندار دلال تھا اس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے کریم سے اس نے معذرت چاہی "میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا میرا خیال ہے غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے"

"جی ہاں"

"تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کا ناکا ہوا کرتا تھا؟"

کریم نے بڑی سادگی اور ذرا فخر سے کہا "وہ میں نے چھوڑ دیا آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے۔"

نذیر نے اس کو داد دی ''یہ بہت اچھا کیا ہے تم نے؟''

کریم نے اور زیادہ فخریہ لہجے میں کہا ''دس چھوکریاں ہیں۔۔۔ایک بالکل نئی ہے''

نذیر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا ''تم لوگ یہی کہا کرتے ہو''

کریم کو برا لگا ''قسم قرآن کی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا سور کھاؤں اگر وہ چھوکری بالکل نئی نہ ہو'' پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا ''آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا پسنجر آیا تھا جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو''

نذیر نے پوچھا ''کنواری تھی؟''

''جی ہاں۔۔۔۔دوسو روپے لیے تھے اس پسنجر سے؟''

نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا ''لو۔۔۔۔یہیں بھاؤ پکا کرنے لگے''

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بری لگی ''قسم قرآن کی، سور ہو جو آپ سے بھاؤ کرے آپ تشریف لے چلیے آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہوگا کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے۔''

نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھے موسم اچھا تھا موڈ بھی اچھا تھا وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا بن پیے مسرور تھا ''چلو یار آج تمام عیاشیاں رہیں۔۔۔ایک بوتل کا اور بندوبست ہو جانا چاہیے۔''

کریم نے پوچھا ''آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟''

"پینتیس روپے میں"

"کون سا برانڈ ہے؟"

"جانی واکر"

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا "میں آپ کو تیس میں لا دوں گا"

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیئے "نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔۔۔۔۔ یہ لو مجھے وہاں بٹھا کر تم پہلا کام یہی کرنا تم جانتے ہو، میں ایسے معاملوں پر اکیلا نہیں پیا کرتا۔"

کریم مسکرایا "اور آپ کو یاد ہو گا میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا"

نذیر کو یاد آ گیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا تھا یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا "آج دور ہیں"

"جی نہیں۔۔۔۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں"

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر میرینا ہوٹل لکھا تھا نام تو خوبصورت تھا مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی سیڑھیاں شکستہ نیچے سود خور پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے پہلی منزل پر کرسچن آباد تھے دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی، تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی تھیں۔

کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ

کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی، تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور کچھ نہیں لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کرسی جو کہ بے حد میلی تھی، ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا "تشریف رکھیے لیکن میں یہ عرض کردوں اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہوگا"

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا "دس روپے زیادہ ہیں یار!"

کریم نے کہا "بہت زیادہ ہیں لیکن کیا کیا جائے سالا ہوٹل کا مالک ہی نیا ہے ایک پیسہ کم نہیں کرتا اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پروا نہیں کرتے۔"

نذیر نے کچھ سوچ کر کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ کرایہ پیشگی دے دوں؟"

"جی نہیں۔۔۔۔ آپ پہلے چھوکری تو دیکھئے" یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی خوش شکل تو نہیں تھی لیکن بھولی بھالی تھی۔

کریم نے اس سے کہا "بیٹھ جاؤ یہ صاحب میرے دوست ہیں بالکل اپنے آدمی ہیں"

لڑکی نظریں نیچی کیے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی کریم یہ کہہ کر چلا گیا "اپنا

اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب! میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں''

نذیر آرام کرسی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا ''آپ کا نام!''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا ''آپ کا نام کیا ہے جناب!''

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا ''شکنتلا''

اور نذیر کو شکنتلا یاد آ گئی جس پر راجہ وشنیت عاشق ہوا تھا ''میرا نام وشنیت ہے''

نذیر مکمل عیاشی پر تلا ہوا تھا لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی اتنے میں کریم آ گیا اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں ''مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں''

نذیر بہت خوش ہوا ''تم کمال کرتے ہو'' پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا ''جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟''

لڑکی نے کچھ نہ کہا کریم نے جواب دیا ''نذیر صاحب! یہ نہیں پیتی آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے''

یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا ''یہ تو بہت بری بات ہے''

کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لیے ایک بڑا پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا ''آپ راضی کر لیجئے اسے''

نذیر نے ایک ہی جرعے میں گلاس ختم کیا کریم نے آدھا پیگ پیا فوراً ہی اس کی آواز نشہ آلود ہو گئی ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا ''چھوکری پسند ہے نا آپ کو؟''

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا وہ شکنتلا جس پر راجہ دشینت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا بہت ہی خوبصورت تھی کم از کم کتابوں میں تو یہی درج تھا کہ وہ چندرے آفتاب چندرے ماہتاب تھی آہو چشم تھی نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بری نہیں تھیں آہو چشم تو نہیں تھی لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں کالی کالی اور بڑی بڑی اس نے اور کچھ نہ سوچا اور کریم سے کہا ''ٹھیک ہے یار۔۔۔۔۔بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟''

کریم نے آدھا پیگ اپنے لیے اور انڈیلا اور کہا ''سو روپے!''

نذیر نے سوچنا بند کر دیا ''ٹھیک ہے''

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا شکنتلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی لیکن اس نے پھر کوشش کی بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا زبردستی اس کو چوما بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا البتہ وسکی کا نشہ اچھا تھا وہ اب تک چھ پیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار ہو گئی ہے اس لیے کہ شکنتلا بالکل الہڑ تھی اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی

واقفیت ہی نہیں تھی نذیر اک اناڑی تیراک کے ساتھ ادھر ادھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا آخر اکتا گیا دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا آواز سن کر دوڑا آیا ''کیا بات ہے نذیر صاحب!''

نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا ''کچھ نہیں یار! یہ اپنے کام کی نہیں ہے؟''

کیوں؟

''کچھ سمجھتی ہی نہیں''

کریم نے شگفتہ کو الگ لے جا کر بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھ سکی، شرمائی، لجائی، دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی کریم نے اس پر کہا ''میں ابھی حاضر کرتا ہوں''

نذیر نے اسے روکا ''جانے دو۔۔۔۔کوئی اور لے آؤ'' لیکن اس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا ''وہ جو تمہیں روپے دیئے تھے، اس کی بوتل لے آؤ اور شگفتہ کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں انہیں یہاں بھیج دو۔۔۔۔میرا مطلب ہے جو بیٹھی ہیں آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!''

کریم، نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا، کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لیے گلاس منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دی دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا بڑی فضول قسم کی باتیں لیکن نذیر خوش تھا جو کوفت شگفتہ نے پیدا کی تھی دور ہو گئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی وہ ساتھ لے کر چلا گیا پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے سگریٹ والے کی دکان سے خریدنے کے بجائے اس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تیس میں لے دے گا چنانچہ وہ اس کے ہوٹل میں پہنچا اتفاق سے کریم مل گیا اس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا'' نذیر صاحب! شگفتا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے آج صبح کی گاڑی سے پہنچی ہے۔۔۔۔ بہت غصیلی ہے مگر آپ اس کو ضرور راضی کرلیں گے''

نذیر کچھ سوچ نہ سکا اس نے اپنے دل میں اتنا کہا ''چلو دیکھ لیتے ہیں'' لیکن اس نے کریم سے کہا ''تم پہلے یار وسکی لے آؤ'' یہ کہہ کر اس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیئے۔

کریم نے نوٹ لے کر نذیر سے کہا ''میں لے آتا ہوں آپ اندر کمرے میں بیٹھیے۔''

نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا اس نے سوچا تھا کہ وسکی کی بوتل لے کر ایک نظر شگفتا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا، جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھلے ہوئے ہوادار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور سامنے اپنی ٹانگیں پلنگ پر رکھ دیں تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی کریم داخل ہوا اس نے نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا ''نذیر صاحب آ رہی ہے لیکن آپ ہی رام کیجئے گا اسے''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل صورت قریب

قریب شگفتہ سے ملتی تھی تیوری چڑھائے شگفتہ کے سے انداز میں سفید دھوتی پہنے کمرے میں داخل ہوئی بڑی بے پروائی سے اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر ''آداب'' کہا اور ہولے سے پلنگ پر بیٹھ گئی نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اس سے لڑنے آئی ہے چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈبکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا ''آپ شگفتہ کی بہن ہیں''

اس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا ''جی ہاں''

نذیر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اس کے بعد اس لڑکی کو جس کی عمر شگفتہ سے غالباً تین برس بڑی تھی بڑے غور سے دیکھا نذیر کی یہ حرکت اس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی وہ بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئی ''آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں''

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی ''جناب آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟''

وہ برس پڑی ''میں ناراض کیوں نہ ہوں۔۔۔ یہ آپ کا کریم میری بہن کو بے پورے اڑا لایا ہے بتایئے آپ میرا خون نہیں کھولے گا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟''

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا کچھ دیر سوچ کر اس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا ''شگفتہ کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں بہت الہڑ ہے مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں آپ شاید برا مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی

ضروریات کو سمجھتی ہوں"

اس نے کچھ نہ کہا نذیر نے اس سے دریافت کیا "آپ کا نام"

شگفتہ کی بہن نے مختصراً کہا "شاردا"

نذیر نے پھر اس سے پوچھا "آپ کا وطن"

"جے پور" اس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفگی آلود تھا

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا "دیکھیے آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔۔۔۔ کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں لیکن میرا کوئی قصور نہیں" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا "یہ قصور البتہ میرا ہے اس کی سزا میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

لڑکی کے ماتھے پر بے شمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا غالباً گالیاں دینے والی تھی لیکن چپ ہوگئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے "بتائیے آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں"

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈربے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی لڑکی اٹھی

نذیر نے اسے روکا "کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

وہ ایک دم ماں بن گئی "منی رو رہی ہے، دودھ کے لیے" یہ کہہ کر وہ چلی گئی

نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا اتنے میں کریم وسکی کی بوتل اور سوڈا لے کر آگیا اس نے نذیر کے لیے چھوٹا ڈالا اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "کچھ باتیں ہوئیں شاردا

سے۔۔۔۔میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹا لیا ہوگا؟"

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا "بڑی غصیلی عورت ہے"

"جی ہاں۔۔۔۔صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی ہے آپ ذرا اس کو رام کریں۔۔۔۔شگفتا خود یہاں آئی تھی اس لیے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے اور اس شاروا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا تھا اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے۔۔۔۔آپ منا لیجئے نا اس کو؟"

نذیر نے اس سے کہا "منانے کی کیا بات ہے؟"

کریم نے اس کو آنکھ ماری "سالی مجھ سے تو مانتی نہیں جب سے آئی ہے ڈانت رہی ہے۔"

اتنے میں شاروا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی کریم کو اس نے غصے سے دیکھا اس نے آدھا پیگ پیا اور باہر چلا گیا۔

منی کو بہت زکام تھا ناک بہت بری طرح بہہ رہی تھی نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کا نوٹ دے کر کہا "جاؤ ایک وکس کی بوتل لے آؤ"

کریم نے پوچھا "وہ کیا ہوتی ہے؟"

نذیر نے اس سے کہا "زکام کی دوا ہے" یہ کہہ کر اس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا "کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی"

"جی اچھا" کہہ کر کریم چلا گیا نذیر منی کی طرف متوجہ ہوا اس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے منی خوش شکل نہیں تھی لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لیے دلکش تھی

اس نے اس کو گود میں لیا ماں سے سو نہیں رہی تھی سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سلا دیا اور شاردا سے کہا ''اس کی ماں تو میں ہوں''

شاردا مسکرائی ''لائیے میں اس کو اندر چھوڑ آؤں''

شاردا اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آ گئی اب اس کے چہرے پر غصے کے آثار نہیں تھے نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا تھوڑی دیر وہ خاموش رہا اس کے بعد اس نے شاردا سے پوچھا ''کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں'' اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا شاردا نے غصے کا اظہار کیا ''جواب دیجئے جناب!''

شاردا خاموش رہی نذیر نے اٹھ کر ایک پیگ پیا، تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اس سے کہا ''مجھے اس چیز سے نفرت ہے''

نذیر نے ایک پیگ گلاس میں ڈالا اس میں سوڈا حل کر کے اٹھایا اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا ''آپ کو اس سے نفرت ہے کیوں؟''

شاردا نے مختصر سا جواب دیا ''بس ہے''

''تو آج سے نہیں رہے گی ۔۔۔۔ یہ لیجئے'' یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

میں ہرگز نہیں پیوں گی

''میں کہتا ہوں تم ہرگز انکار نہیں کرو گی''

شاردا نے گلاس پکڑ لیا تھوڑی دیر تک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا

گلاس غٹا غٹ پی گئی قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی دھوتی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ کر اس نے نذیر سے کہا ''یہ پہلی اور آخری بار ہے لیکن میں نے کیوں پی؟''

نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا ''یہ مت پوچھو'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی کریم بہت خوش تھا اس نے نذیر سے کہا ''آپ نے کمال کر دیا آپ سے سو تو نہیں مانگتا، پچاس دے دیجیے۔''

نذیر شاردا سے بے حد مطمئن تھا اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فیصدی صحیح جواب تھی اس نے کریم سے کہا ''میں کل ادا کر دوں گا ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپے باقی تھے''

کریم نے کہا ''کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملہ طے کر لیا حضور! میری جان کھا گئی تھی اب شکنتلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

کریم چلا گیا شاردا آئی اس کی گود میں منی تھی نذیر نے اس کو پانچ روپے دیئے لیکن شاردا نے انکار کر دیا اس پر نذیر نے اس سے مسکرا کر کہا ''میں اس کا باپ ہوں تم یہ کیا کر رہی ہو''

شاردا نے روپے لے لیے بڑی خاموشی کے ساتھ شروع شروع میں وہ بہت

باتونی معلوم ہوتی تھی ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا دے گی مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی نذیر نے اس کی بچی کو گود میں لے کر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا "لو بھئی شاردا! میں چلا کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا"

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کیے ایک بوتل منگوائی اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا اس کو پینے کے لیے کہا تو وہ بولی "میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔"

نذیر اکیلا پیتا رہا صبح گیارہ بجے سے وہ شام کے سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا۔۔۔۔۔جب گھر لوٹا تو وہ بے حد مطمئن تھا پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن شاردا اپنی واجبی شکل و صورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی نذیر بار بار سوچتا تھا "یہ کیسی عورت ہے۔۔۔۔۔میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش مگر جسمانی طور پر ایسی پر گو عورت نہیں دیکھی۔"

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا اس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نذیر ساٹھ روپے کریم کو دیتا تھا دس روپے ہوٹل والا لے جاتا تھا باقی پچاس میں سے قریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن کے وضع کر لیتا تھا۔

مگر شاردا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے نذیر کے بجٹ نے جواب دے دیا اس کے علاوہ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ شاردا اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو

رہی ہے وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بجائے شاردا ہو یہ بہت بری بات تھی نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا اس لیے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے چنانچہ اس نے شاردا ہی سے کہا ''شاردا میں شادی شدہ آدمی ہوں میری جتنی جمع پونجی تھی ختم ہو گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا، حالانکہ چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کروں۔''

شاردا نے یہ سنا تو خاموش ہو گئی پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا ''جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجیے تاکہ میں شکنتلا کو لے کر واپس چلی جاؤں''

نذیر نے اس کا پیار لیا اور کہا ''بکواس نہ کرو تم میرا مطلب نہیں سمجھیں بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہو گیا ہے بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا ہے میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔''

شاردا نے کوئی جواب نہ دیا نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے نذیر نے اس کو بلایا مگر وہ نہ آئی کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا ''آپ یہ روپے لے لیجیے اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجیے''

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیے شاردا آئی گود میں منی تھی اس نے آداب عرض کیا اور کہا ''میں آج شام کو جے پور جا رہی ہوں''

نذیر نے پوچھا ''کیوں؟''

شاروا نے یہ مختصر جواب دیا ''مجھے معلوم نہیں'' اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے کریم سے کہا کہ اسے بلا کر لائے مگر وہ نہ آئی نذیر چلا گیا اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔

وہ چلی گئی، واقعی چلی گئی کریم کو اس کا بہت افسوس تھا اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا ''نذیر صاحب آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟''

نذیر نے اس سے کہا ''بھائی! میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے، تیس بوتل کے اور اوپر کا خرچ علیحدہ میرا تو دیوالہ پٹ گیا ہے۔۔۔۔خدا کی قسم مقروض ہو گیا ہوں۔''

یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا نذیر نے اس سے کہا ''بھئی میں مجبور تھا، کہاں تک یہ قصہ چلاتا''

کریم نے کہا ''نذیر صاحب اس کو آپ سے محبت تھی''

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاروا میں جسمانی خلوص ہے وہ اس کے مردانہ سوالات کا بالکل صحیح جواب ہے اس کے علاوہ وہ شاروا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا، البتہ اس نے مختصر الفاظ میں اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف اس لیے چھوڑ گیا تھا کہ دو برس تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی لیکن جب وہ اس سے علیحدہ ہوا تو نو مہینے کے بعد منی پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنتلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی اس کی خواہش تھی کہ

وہ شریفانہ زندگی بسر کرے کریم نے نذیر کو بتایا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتلا سے پیشہ کرائے کئی پینجر آتے تھے ایک رات کے دو دو سو روپے دینے کے لیے تیار تھے مگر شاردا نہیں مانتی تھی کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی کریم اس سے کہتا تھا ''تم کیا کر رہی ہو؟'' وہ جواب دیتی ''اگر تم بیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔''

شاردا نے نذیر سے ایک بار اس کا فوٹو مانگا تھا جو اس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا یہ وہ اپنے ساتھ جے پور لے گئی تھی اس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔۔ جب دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا جہاں تک اس بات کا تعلق تھا وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی نذیر کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا کیونکہ وہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا کچھ دن گزرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا شاردا کا جسمانی لمس اس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب کہ نذیر گھر میں بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا اس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لا کر اسے دی سارے خط وہی کھولا کرتی تھی ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا ''معلوم نہیں گجراتی ہے یا ہندی'' نذیر نے خط لے کر دیکھا اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا گجراتی الگ ٹرے میں رکھ دیا اور

اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اسے دیا "ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے تم تو ہندی اور گجراتی پڑھ سکتی ہو۔"

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا "ہندی ہے" اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا "جے پور۔۔۔۔ پریے نذیر صاحب!" اتنا پڑھ کر وہ رک گئی نذیر چونکا نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی "آداب! آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں" نعیمہ کا رنگ سرخ ہو گیا اس نے کاغذ کا دوسرا رخ دیکھا "کوئی شاردا ہے"

نذیر اٹھا جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا "خدا معلوم کون ہے۔۔۔۔ میں باہر جا رہا ہوں اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوا لاؤں گا" اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور چلا گیا ایک دوست کے پاس جا کر اس نے پہلے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا پہلے فقرے وہی لکھے مضمون یہ تھا کہ بمبئے سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی اس کو اتنے بڑے مصور سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

شام کو گھر آیا تو اس نے نیا خط اپنی بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنا دی بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا "عرصہ ہوا میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا شاردا کو یہ دوست جانتا تھا وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا مصوری کا اسے بھی شوق تھا۔"

بات آئی گئی ہو گئی لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا اس کو بھی نذیر

نے اسی طریقے سے گول کیا اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا تین خط اس نے اس طرح وصول کیے اس کے بعد شاردا اس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گو تھی لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن خط اس اظہار سے پر ہوتے تھے گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب میں کیا لکھے، اس لیے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا تھا اور نذیر کہہ دیتا تھا ''ٹھیک ہے''

شاردا بمبئی آنے کے لیے بے قرار تھی لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے اس نے ہوٹل کا سوچا مگر خیال آیا ایسا نہ ہو راز فاش ہو جائے، چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوایا کہ وہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے بٹوارے سے پہلے عجیب افراتفری تھی اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے ''میں کچھ دیر وہاں رہوں گی اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آ جاؤں گی، ورنہ آپ بھی وہیں چلے آیئے گا''

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لیے تیار ہوا تو

وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا اس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آ رہی ہے اس تار کے مضمون کے مطابق وہ بجے پور سے چل پڑی تھی نذیر بہت سٹپٹایا مگر اس کا جسم بہت خوش تھا وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا وہ دن بھر سے مانگتا تھا جب وہ شاردا کے ساتھ چمٹا ہوتا تھا صبح گیارہ بجے سے لے کر شام کے ساتھ بجے تک اب روپے کے خرچ کا سوال نہیں تھا کریم بھی نہیں تھا ہوٹل بھی نہیں تھا اس نے سوچا ''میں اپنے نوکر کو راز دار بنالوں گا سب ٹھیک ہو جائے گا دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا''

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا فرنٹیر میل آئی مگر شاردا تلاش کے باوجود اسے نہ ملی اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے دوسرا تار بھیجے گی

اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا وہ مہالکشمی اترتا تھا گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے اس نے زور سے پکارا ''شاردا!''

شاردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ''نذیر صاحب!''

''تم یہاں کہاں؟''

شاردا نے شکایتاً کہا ''آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی''

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا ''تم یہاں ٹھہرو میں دفتر سے چھٹی لے کر ابھی آتا ہوں''

شاردا کو بنچ پر بٹھا کر نذیر جلدی جلدی دفتر گیا ایک عرضی لکھ کر وہاں چپڑاسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی لیکن ان کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔

گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا ''تم نہا لو میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں''

شاردا نہانے لگی نذیر نے نوکر سے کہا ''کہ اس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے جلدی ناشتہ تیار کر دے'' اس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی ایک پیگ جو دو کے برابر تھا گلاس میں انڈیلا اور پانی ملا کر پی گیا وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہا دھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی اس نے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کیں نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے وہ پہلے بہت کم گو تھی اکثر خاموش رہتی تھی مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی نذیر نے سوچا ''یہ محبت کیا ہے۔۔۔۔ اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی اس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں مگر اب اس کو جانے کیا ہو گیا ہے باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنا رہی ہے۔''

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر، ناک بند کر کے وہ پیگ پی لیا برا سا منہ بنایا پانی لے کر کلی کی نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے

کیوں پی اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا مگر اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا ''تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے لو آ گئے ہیں پھر وہی دن بلکہ راتیں بھی ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں صرف دن ہوتے تھے ہوٹل کے میلے کچیلے دن یہاں ہر چیز اجلی ہے ہر چیز صاف ہے ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں کریم بھی نہیں یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔''

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول فضول باتیں، گلے، شکوے، آہیں، راتیں تارے گن گن کر کاٹنا نذیر نے ایک اور پیگ پیا اور سوچا کون تارے گنتا ہے گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو۔۔۔۔ بالکل فضول ہے، بے ہودہ بکواس ہے۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا لیا بستر صاف تھا شاردا صاف تھی وہ خود صاف تھا کمرے کی فضا بھی صاف تھی لیکن کیا وجہ تھی نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا شاید اس نے کم پی ہے اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی مرتبہ ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں وہی ہجر و فراق کی باتیں وہی گلے شکوے، نذیر اکتا گیا اور اس اکتاہٹ نے اس کے جسم کو کند کر دیا اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہو گئی ہے اس کے جسم کے جذبات اب وہ تیز نہیں کر سکتی لیکن وہ پھر بھی

اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے اپنی بیوی کے پاس مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے، اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے وہ دس روپے کرائے کے دے کریم کو پچاس روپے ادا کرے اور چلا جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا مگر وہ فضا نہیں تھی وہ سودے بازی نہیں تھی اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والی بات نہیں تھی ہوٹل کی وہ غلاظت نہیں تھی یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں وہ نہیں تھا نذیر اپنے گھر میں تھا اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی یہ احساس اس کے تحت الشعور میں تھا اسی لیے وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وسکی خراب ہے، کبھی یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا پھر وہ یہ سوچتا اتنی دیر کے بعد ملی ہے دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔

چند دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا، وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی اس کی بچی جے پور میں تھی ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی نذیر اس کے زکام کے لیے اس کی پھنسیوں کے لیے، اس کے گلے کے لیے دوائیں منگوایا کرتا تھا اب یہ چیز نہیں تھی وہ بالکل اکیلی تھی نذیر اس کی اور اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری ہوئی چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث

نذیر بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی اس نے سوچا تھا ماں بننا کتنا اچھا ہے۔۔۔۔اور یہ دودھ، مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔۔۔۔۔کسی کو پالنا اپنے بچے ہی کو ہی، کتنی شاندار چیز ہے۔

اب منی شاردا کے ساتھ نہیں تھی وہ نامکمل تھی اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں اب ان میں دودھ نہیں تھا وہ سفید سفید آب حیات، نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی شاردا اب وہ شاردا نہیں تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا وہی شاردا تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی سی کشش یا جو بھی کچھ تھا نہیں رہا۔

پندرہ دن لگاتار اس کے ساتھ گزارے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی بازار سے اون خرید کر ان کے لیے ایک سویٹر بن دیا شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لیے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے برف، تھرموس میں ڈالی ہوتی صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی پانی گرم کر کے اس کو دیتی وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کرتی گھر کی صفائی کرتی خود جھاڑو دیتی نذیر اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے

اس لیے اکیلا سونا چاہتا ہے شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی مگر یہ نذیر کے لیے ایک اور الجھن ہوگئی وہ گہری نیند سوئی ہوتی اور وہ جاگتا رہتا اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا یہ شاردا یہاں کیوں ہے؟ کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔۔۔۔۔محبت وغیرہ سب بکواس ہے جو ایک چھوٹی سی بات ہے وہ اب نہیں رہی اس کو واپس جے پور جانا چاہیے۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار گناہ کیے تھے مگر ان کا احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوط کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا شاردا اب اور بھی زیادہ بے کشش ہوگئی وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہے اسی لیے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔

پورا ایک مہینہ ہوگیا جب نذیر نے دن گنے تو اس کو بہت الجھن ہوئی "یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے۔۔۔میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں۔۔۔اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو خط لکھتا ہوں جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں۔۔۔۔جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے میں کتنا بڑا افراڈ ہوں ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں ادھر شاردا سے، میں کیوں اس سے

صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟''

وہ اس کے متعلق سوچتا مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی ''میں بہت ذلیل ہوں یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے مجھے اس کی کب ضرورت تھی یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی جب اس نے تار بھیجا تھا لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا''

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے، وہ اس کو بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی ہے اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہو گیا اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہو گئی اس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا لیکن نذیر کو اس کے رویئے سے بہت الجھن ہوئی وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا، اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا ''بکواس نہ کرو میں ٹھیک ہوں بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔''

دفتر کے پاس کی دکان سے اس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے

مگر ادھار مل گئے تھے اس لیے دو تین مجبوراً پینے پڑے شام کو گھر آیا تو دیکھا، تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے خیال کیا کہ خالی ہے پھر سوچا شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا شاردا سے پوچھا ''یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟''

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا ''اندر الماری میں پڑا تھا''

نذیر نے کچھ نہ کہا اس نے سوچا شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا ''اندر الماری میں پڑا تھا''

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا ''شاردا تم بکواس کرتی ہو تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لیے ہر روز سگریٹ خریدا کرو۔''

شاردا نے بڑے پیار سے کہا ''آپ بھول جاتے ہیں اسی لیے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔''

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا ''میرا دماغ خراب ہے لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں۔''

شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا ''میں آپ سے معافی مانگتی ہوں''

نذیر نے ایک لحظے کے لیے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہیے اس لیے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی مگر فوراً ہی

اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا تھا چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا ''بکواس نہ کرو میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں کل صبح تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے دے دوں گا'' لیکن یہ کہہ کر نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا کمینہ اور ذلیل ہے۔

شاردا نے کچھ نہ کہا رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی اس رات اس سے پیار کرتی رہی نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا صبح اٹھا تو ناشتے پر بے شار لذیذ چیزیں تھیں پھر بھی اس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی فارغ ہو کر وہ سیدھا بنک گیا جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا ''میں بنک جا رہا ہوں ابھی واپس آتا ہوں''

بنک کی وہ شاخ جس میں نذیر کا روپیہ جمع تھا بالکل نزدیک تھا وہ دو سو روپے نکلوا کر فوراً ہی واپس آ گیا اس کا ارادہ تھا کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا اور اس کو ٹکٹ وغیرہ لے کر رخصت کر دے گا مگر وہ جب گھر پہنچا تو اس کے نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے اس نے پوچھا ''کہاں؟''

نوکر نے بتایا ''جی مجھ سے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔۔۔اپنا ٹرنک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں۔''

نذیر اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگرٹوں کا ڈبہ پڑا ہے بھرا ہوا۔

31 جولائی 1950ء

اختتام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حصہ سوئم

منٹو کے سو بہترین افسانے

(افسانے)

حصہ چہارم

Presented by: S A M I

فہرست

شادی

شانتی

شغل

شکاری عورتیں

شوشو

شہ نشین پر

قاسم

قبض

کالی شلوار

کبوتروں والا سائیں

گرم سوٹ

گولی

گورمکھ سنگھ کی وصیت

لالٹین

لائسنس

ماتمی جلسہ

مجید کا ماضی

محمودہ

مسز ڈی کوسٹا

مسٹر حمیدہ

شادی

جمیل کو اپنا شیفر لائف ٹائم قلم مرمت کے لیے دینا تھا اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا فون کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کے ایجنٹ میسرز ڈی، جے، سیموئر ہیں جن کا دفتر گرین ہوٹل کے پاس واقع ہے۔

جمیل نے ٹیکسی لی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہوٹل پہنچ کر اسے میسرز ڈی، جے، سیموئر کا دفتر تلاش کرنے میں وقت نہ ہوئی بالکل پاس تھا مگر تیسری منزل پر۔

لفٹ کے ذریعے جمیل وہاں پہنچا کمرے میں داخل ہوتے ہی چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں جمیل نے قلم اس کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا لڑکی نے قلم اس کے ہاتھ سے لے لیا کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دی منہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔

جمیل نے چٹ دیکھی قلم کی رسید تھی چلنے ہی والا تھا کہ پلٹ کر اس نے لڑکی سے پوچھا "دس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا میرا خیال ہے"

لڑکی بڑے زور سے ہنسی جمیل کچھ کھسیانا سا ہو گیا "میں آپ کی اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا۔"

لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا "مسٹر ۔۔۔ آج کل وار ہے وار ۔۔۔ یہ قلم امریکہ جائے گا ۔۔۔ تم نو مہینے کے بعد پتا س کرنا"

جمیل بوکھلا گیا ''نو مہینے''

لڑکی نے اپنے بریدہ بالوں والا سر ہلایا۔۔۔جمیل نے لفٹ کا رخ کیا۔

یہ نو مہینے کا سلسلہ خوب تھا۔۔۔نو مہینے۔۔اتنی مدت کے بعد تو عورت گل گوتھنا بچہ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔۔۔نو مہینے۔۔۔نو مہینے تک اس چھوٹی سی چٹ کو سنبھالے رکھو۔۔اور یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو مہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اس نے ایک قلم مرمت کے لیے دیا تھا۔۔۔ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مر کھپ ہی جائے۔

جمیل نے سوچا، یہ سب ڈھکوسلا ہے۔۔۔۔قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ اس کا فیڈ ر ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا اس کے لیے اسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً چالبازی تھی۔۔۔۔مگر پھر اس نے سوچا، لعنت بھیجو جی اس قلم پر۔۔۔امریکہ جائے یا افریقہ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سو پچہتر روپے میں خریدا تھا۔۔۔۔مگر اس نے ایک برس اسے خوب استعمال بھی کیا تھا۔۔۔۔ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے۔۔۔۔ چنانچہ وہ قنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بے شمار دکانیں وسکی تو ظاہر ہے نہیں ملے گی لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی، چنانچہ اس نے قریب والی شراب کی دکان کا رخ کیا۔

برانڈی کی ایک بوتل خرید کر وہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آ کے رک گیا ہوٹل کے نیچے قد آدم شیشوں کا بنا ہوا قالینوں کا شوروم تھا یہ جمیل کے دوست

پیر صاحب کا تھا۔

اس نے سوچا چلو اندر چلیں چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔

برانڈی کی بوتل باریک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا ''یار اس دلہن کا گھونگھٹ تو کھولو۔۔۔ ذرا اس سے چھیڑ خانی تو کرو۔''

جمیل مطلب سمجھ گیا ''تو پیر صاحب گلاس اور سوڈے منگوایئے پھر دیکھئے کیا رنگ جمتا ہے۔''

فوراً گلاس اور یخ بستہ سوڈے آ گئے پہلا دور ہوا دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرا دو کے بجائے تین گلاس اٹھا لایا تھا پیر صاحب کے گجراتی دوست نے بڑی صاف اردو میں چند ادھر ادھر کی باتیں کیں اور گلاس میں یہ بڑا پیگ ڈال کر اس کو سوڈے سے لبالب بھر دیا تین چار لمبے لمبے گھونٹ لے کر انہوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا ''سگریٹ نکالو یار!''

پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے، مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا ساتھ ہی لائٹر۔۔۔۔

اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اس گجراتی کا تعارف کرایا ''مسٹر نٹور لال۔۔۔۔۔ آپ مورتیوں کی دلالی کرتے ہیں''

جمیل نے ایک لمحے کے لیے سوچا، کوئلوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا

ہے ۔۔۔ موتیوں کی دلالی میں ۔۔۔

پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مسٹر جمیل ۔۔۔ مشہور سونگ رائٹر ۔۔۔“

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دو شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل خالی ہوگئی۔

جمیل نے دل میں سوچا یہ کم بخت موتیوں کا دلال بلا کا پینے والا ہے ۔۔۔ میری پیاس اور سرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا خدا کرے اسے موتیا بند ہو ۔۔۔

مگر جونہی آخری دور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے، اس نے نتو ر الال کو معاف کر دیا آخر میں اس سے کہا ”مسٹر نتور، اٹھیے ایک بوتل اور ہو جائے“

نتور فوراً اٹھا اپنے سفید ڈگلے کی شکنیں درست کیں دھوتی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا ”چلیے!“

جمیل پیر صاحب سے مخاطب ہوا ”ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں“

جمیل اور نتور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچے جمیل نے ٹیکسی روکی مگر نتور نے کہا ”مسٹر جمیل ۔۔۔ یہ دکان ٹھیک نہیں ۔۔۔ ساری چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا ”دیکھو کولابہ چلو!“

کولابہ پہنچ کر نتور، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا جو برانڈ جمیل نے فورٹ سے لیا، وہ تو نہ مل سکا ایک دوسرا مل گیا جس کی نتور نے بہت

تعریف کی کہ نمبرون چیز ہے۔

یہ نمبرون چیز خرید کر دونوں باہر نکلے۔۔۔۔ساتھ ہی بار تھی نتو رک گیا ''مسٹر جمیل، کیا خیال ہے آپ کا ایک دو پیگ یہیں سے پی کر چلتے ہیں''

جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے کہ اس کا نشہ حالت نزع میں تھا چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے ''مسٹر نتو آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے''

نتو نے زور سے آنکھ ماری ''سب چلتا ہے''

اور یہ کہہ کر وہ ایک کیبن کے اندر گھس گیا جمیل بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔۔۔۔نتو نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی۔۔۔۔جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری'' دیکھو اور سوڈے روجرز۔۔۔۔ٹھنڈے۔۔۔اور دو گلاس ایک دم صاف''

بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیئے، اس پر نتو نے اسے دوسرا حکم دیا ''فسٹ کلاس چپس اور ٹومیٹو سوس اور فسٹ کلاس کٹلس!''

بیرا چلا گیا نتو جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا بوتل کا کارک نکالا اور جمیل کے گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔

جمیل پیاسا تھا ایک ہی جرعے میں اس نے آدھا گلاس ختم کر دیا سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لیے پھوں پھوں کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آ گئے۔۔۔۔۔جمیل صبح گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تھا لیکن برانڈی نے اسے بھوک لگا دی چپس گرم گرم تھے، کٹلس بھی وہ پل پڑا۔۔۔نتورنے اس کا ساتھ دیا چنانچہ دو منٹ میں دونوں پلیٹیں صاف!

دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں جمیل نے اپنے لیے چوپس بھی منگوائے دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے بوتل کی تین چوتھائی غائب ہو چکی تھی جمیل نے سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بیکار ہے۔

نشے خوب جم رہے تھے سرور خوب گھٹ رہے تھے نتور اور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی وادیوں میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، جہاں انہیں عریاں بدن حسین عورتیں ملیں وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھالیں اور یہ جا وہ جا!

جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی ہی وادی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اس کی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مڈبھیڑ ہو جائے جس کو وہ اپنے تپتے ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے، اس زور سے کہ اس کی ہڈیاں تک چیخ جائیں۔

جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے۔۔۔مطلب ہے ایسے علاقے میں ہے جو اپنے بروتھلز (قحبہ خانے) کی وجہ سے ساری بمبئی میں مشہور ہے جنہیں عیاشی کرنا ہوتی ہے وہ ادھر کا رخ کرتے ہیں شہر سے بھی جس لڑکی کو لک چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے یہیں آتی ہے ان معلومات کی بناء پر اس نے نتور سے کہا ”میں نے کہا۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔میرا مطلب ہے، ادھر کوئی چھوکری ووکری نہیں ملتی؟“

نور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیلا اور ہنسا ''مسٹر جمیل! ایک نہیں، ہزاروں۔۔۔۔۔ ہزاروں۔۔۔۔۔ ہزاروں۔۔۔۔''

یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کاٹی نہ ہوتی ''ان ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ نور بھائی نے مال کر دیا۔''

نور بھائی مزے میں تھے جھوم کر کہا'' جمیل بھائی۔۔۔ایک نہیں ہزاروں۔۔۔۔چلو اس کو ختم کرو''

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا آدھے گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا بل ادا کرنے اور بیرے کو تگڑی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے، اندر اندھیرا تھا، باہر دھوپ چمک رہی تھی جمیل کی آنکھیں چندھیا گئیں ایک لمحے کے لیے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نور سے کہا'' چلو بھئی!''

نور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا'' مال پانی ہے نا؟''

جمیل کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی نور کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دے کر اس نے کہا'' بہت۔۔۔۔نور بھائی، بہت'' اور اس نے جیب سے پانچ نوٹ سو سو کے نکالے'' کیا اتنے کافی نہیں؟''

نور کی باچھیں کھل گئیں'' کافی۔۔۔؟ بہت زیادہ ہیں۔۔۔۔چلو آؤ، پہلے ایک بوتل خرید لیں، وہاں ضرورت پڑے گی۔''

جمیل نے سوچا، بات بالکل ٹھیک ہے وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا کسی مسجد میں پڑے گی چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی ٹیکسی کھڑی تھی دونوں اس میں

بیٹھ گئے اور اس وادی کی سیاحی کرنے لگے۔

سینکڑوں بروتھلز تھے ان میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی سب میک اپ کی موٹی اور شوخ تہوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑوں پر بڑے اناڑی پن سے سرخی اور چونہ لگایا گیا ہے۔

نور رنگ آ گیا اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا "جمیل بھائی، چلے گی!"

مگر جمیل بھائی اٹھ کھڑا ہوتا "ہاں چلے گی۔۔۔۔۔۔۔۔اور ہم بھی چلیں گے!"

دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا وہ سوچتا تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے، جو سور کے سوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں اٹھنے بیٹھنے کا انداز کتنا فحش ہے اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں، یعنی ایسی عورتیں جو در پردہ پیشہ کراتی ہیں۔۔۔۔جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ ہے کہاں جس کے پیچھے یہ دھندا کرتی ہیں۔

جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہیے کہ نور نے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔

اب جمیل اکیلا تھا ٹیکسی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے۔۔۔۔اس نے ڈرائیور سے پوچھا "یہاں کوئی بھڑوا ملے گا؟"

ڈرائیور نے جواب دیا ''ملے گا جناب!''

''تو چلو اس کے پاس!''

ڈرائیور نے دو تین موڑ گھومے اور ایک پہاڑی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔

جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی۔۔۔اسے معلوم نہیں کیسے اور کس طرح، مگر جب اس نے ذرا دماغ کو جھٹکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے اور اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی جس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹی سی پھنسی تھی، اپنے بریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔

جمیل نے اس کو غور سے دیکھا سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے اس کا نشہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔

اٹھ کر وہ اس گیسو بریدہ لڑکی کے پاس گیا اور، اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا مسکرا کر اس سے کہا ''کہیے مزاج کیسا ہے؟''

اس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا ''کہیے، آپ کا کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہوں!'' یہ کہہ کر اس نے اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔۔۔ ''آپ کا نام؟''

"بتا تو چکی ایک دفعہ۔۔۔آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے۔۔جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہوں گے کہ بل اڑتیس روپے بنا جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص جس کا نام شاید نور تھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔"

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، میں بھول جایا کرتا ہوں۔۔۔یا یوں سمجھے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزہ آتا ہے۔۔۔وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اڑتیس روپے بنتا تھا ادا کیا تھا۔

لڑکی پلنگ پر بیٹھ گئی "میرا نام تارہ ہے!"

جمیل نے اس کو لٹا دیا اور اس سے مصنوعی قسم کا پیار کرنے لگا

تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس کی تو اس نے تارہ سے کہا "دو یخ بستہ سوڈے اور گلاس۔"

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں جمیل نے بوتل کھولی اپنے لیے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لیے ڈالا۔۔۔۔۔۔پھر دونوں پینے لگے۔

تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہوگئی ہے تارہ کو چومنے چاٹنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہیے "کپڑے اتار دو!"

"سارے؟"

''ہاں سارے!''

تارہ نے کپڑے اتار دیئے اور لیٹ گئی جمیل نے اس کے ننگے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہے اس کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا جمیل کا نکاح ہو چکا تھا اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

اس کا بدن کیسا ہو گا۔۔۔ کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ جائے گی؟

کیا وہ اس کے ساتھ برانڈی پئے گی؟

کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟

پھر فوراً اس کا ضمیر جاگا جس نے اس کو لعنت ملامت شروع کر دی نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی صرف ایک مرحلہ باقی تھا، کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے۔۔۔۔ کیا اس کے لیے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنے آغوش کی زینت بنائے۔۔۔۔ خم کے خم لنڈھاتا پھرے۔

جمیل بہت خفیف ہوا اور اسی خفت میں اس کی آنکھیں مندنا شروع ہو گئیں اور وہ سو گیا تارہ بھی تھوڑی دیر کے بعد خواب غفلت کے مزے لینے لگی۔

جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔۔۔۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا وہ ہڑ بڑا کے اٹھا جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ ایک الف ننگی لڑکی لیٹی ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اس کے

دماغ کی دھند چیر کر نمودار ہونے لگے۔

وہ خود بھی الف ننگا تھا بوکھلاہٹ میں اس نے الٹا پائجامہ پہن لیا، مگر اس کو اس کا احساس نہ ہوا، کرتہ پہن کر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں نوٹ سب کے سب موجود تھے اس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر پیا پھر اس نے تارہ کو ہولے سے جھنجھوڑا ''اٹھو!''

تارہ آنکھیں ملتی اٹھی جمیل نے اس سے کہا ''کپڑے پہن لو!''

تارہ نے کپڑے پہن لیے۔۔۔۔باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔جمیل نے سوچا اب کوچ کرنا چاہیے لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیونکہ بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں ''کیوں تارہ جب ہم لیٹے۔۔۔۔میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس کے بعد کیا ہوا؟''

تارہ نے جواب دیا ''کچھ نہیں۔۔۔۔آپ نے اپنے کپڑے اتارے اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے''

''بس؟''

''ہاں۔۔۔۔لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے اور کہا ''میں گنہگار ہوں۔۔۔۔میں گنہگار ہوں۔'' یہ کہہ کر تارہ اٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی''

جمیل بھی اٹھا گناہ کا احساس دبانے کے لیے اس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

تارہ نے پوچھا ''چلے؟''

''ہاں، پھر کبھی آؤں گا'' یہ کہہ کر وہ لوہے کی پیچ دار سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا بڑے بازار کی طرف اس کے قدم اٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی اس نے کہا چلو اچھا ہوا، یہیں مل گئی پیدل چلنے کی زحمت سے بچ گئے۔

اس نے ڈرائیور سے پوچھا ''کیوں بھائی خالی ہے؟''

ڈرائیور نے جواب دیا ''خالی ہے کا کیا مطلب۔۔۔۔۔لگی ہوئی ہے!''

''تو پھر۔۔۔'' یہ کہہ کر جمیل مڑا لیکن ڈرائیور نے اس کو پکارا ''کدھر جاتا ہے سیٹھ؟''

جمیل نے جواب دیا ''کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں''

ڈرائیور باہر نکل آیا ''مستک تو نہیں پھرے لا۔۔۔۔۔۔یہ ٹیکسی تمہیں نے تو لے رکھی ہے!''

جمیل بوکھلا گیا ''میں نے؟''

ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اس سے کہا ''ہاں تو نے۔۔۔۔۔۔سالا دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔''

اس پر تو تو میں میں شروع ہوئی ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا ''چلو!''

ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی ''کدھر؟''

جمیل نے کہا ''پولیس اسٹیشن!''

ڈرائیور نے اس پر جانے کیا واہی تباہی بکی۔۔۔جمیل سوچ میں پڑ گیا جو

ٹیکسی اس نے لی تھی اس کا بل جو کہ اڑتیں روپے کا تھا اس نے ادا کر دیا تھا اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن ٹپکی گو وہ نشے کی حالت میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور، جو اسے یہاں لایا تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے سب انسپکٹر جو کہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے، اس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا

ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سر تا پا غلط تھی جمیل یقیناً اس کی تردید کرتا مگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا قصہ ہے جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اس کا کرایہ میں نے اڑتیں روپے ادا کر دیا تھا اب معلوم نہیں یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے۔"

ڈرائیور نے کہا، "حضور انسپکٹر بہادر، یہ دارو پئے ہے" اور ثبوت کے طور پر اس نے جمیل کی برانڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔

جھنجھلا گیا "ارے بھئی کون سور کہتا ہے کہ اس نے نہیں پی۔۔۔۔۔۔سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے؟"

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا کرایہ ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا ڈرائیور بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلوا دیا پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی بلائے ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر

چھوڑ آئے جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا "جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟"

سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مسٹر، اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے۔۔۔۔یہ کولابہ پولیس اسٹیشن ہے۔۔۔۔۔جاؤ اب گھر جا کر سو جاؤ۔"

جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا۔۔۔۔برانڈی کی بوتل بھی اس کے ساتھ سوئی رہی۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اٹھا جوڑ جوڑ میں درد تھا سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے منہ کا ذائقہ خراب اس نے اٹھ کا دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پئے، چار پانچ پیالے چائے کے کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گزشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔

بہت لمبی زنجیر تھی ان میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں، مگر بعض غائب واقعات کا تسلسل شروع سے لے کر گرین ہوٹل اور وہاں سے کولابہ تک بالکل صاف تھا۔اس کے بعد جب نثور کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروع ہوئی تھی معاملہ گڈ مڈ ہو جاتا تھا چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں، بڑی واضح، مگر فوراً مبہم پرچھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہ کیسے اس لڑکی کے گھر پہنچا۔۔۔۔اس کا نام جمیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جا گرا تھا۔۔۔۔اس کی شکل و صورت اسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔

وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا؟۔۔۔۔۔۔ یہ جاننا بہت اہم تھا اگر جمیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں مگر بصد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اور یہ ٹیکسیوں کا کیا سلسلہ تھا اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا مگر دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟

سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر اس میں پڑے تھے، سب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر چور چور ہو گئے ہیں۔

رات کو اس نے برانڈی کے تین پیگ پیے تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گزشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔

وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے ان کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا من و عن اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائے اور یہ روز روز کی مغز پاشی دور ہو۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا وہ سوچتا تھا، یہ ادھورا گناہ جائے گا کس کھاتے میں وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تکمیل ہو جائے۔

مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا، کیا یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا۔

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔ اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

پیر صاحب سے اس نے نئور کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے غالباً موتیوں کے سلسلے میں جمیل نے اس پر ہزار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کردی۔

اس نے جب اپنے حافظے پر بتہ زور دیا تو بنگلے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی ۔۔۔ اس پر کچھ لکھا تھا۔۔۔ غالباً۔۔۔ ڈاکٹر ۔۔۔ ڈاکٹر بیرام جی ۔۔۔ آگے جانے کیا۔۔۔۔

ایک دن کولابہ کی گلیوں میں چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اس کو جانی پہچانی معلوم ہوئی ۔۔۔ دو رویہ اسی قسم کی بنگلہ نما عمارتیں تھیں ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔ کسی پر چار، کسی پر پانچ ۔۔۔ کسی پر تین۔

وہ ادھر ادھر غور سے دیکھتا چلا جارہا تھا، مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اس کی ساس کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہوگئی ہے میں نے تاریخ مقرر کردی ہے، آؤ اور اپنی دلہن کو لے جاؤ۔

اور وہ ادھر ایک نامکمل گناہ کو مکمل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جمیل نے کہا، ہٹاؤ جی اس وقت ۔۔۔ پھر نے دو مارا مارا ۔۔۔ ایک دم اس نے اپنے داہنے ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا ۔۔۔ اس پر لکھا تھا ۔۔۔ ڈاکٹر ایم بیرام جی ۔۔۔ ایم ڈی۔

جمیل کانپنے لگا یہ وہی بلڈنگ ۔۔۔ بالکل وہی ۔۔۔ وہی رنگ، وہی بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیاں جمیل بے دھڑک اوپر چلا گیا اس کے لیے اب ہر چیز

جانی پہچانی تھی کوری ڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔۔۔۔۔۔اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔ جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا ''بیٹا، بائی جی ہیں؟''

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا ''جی ہاں!''

''جاؤ، ان سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں'' جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے، مگر اب اس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی ''نمستے!''

''نمستے، کیسے مزاج کیسے ہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

جمیل نے جواب دیا ''اچھے ہیں۔۔۔۔میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لیے آ نہ سکا۔۔۔۔۔کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟''

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''معاف کیجئے میری شادی ہو چکی ہے''

جمیل بوکھلا گیا ''شادی؟۔۔۔۔۔۔کب؟''

تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا ''جی، آج صبح۔۔۔۔آئیے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں۔''

جمیل چکرا گیا اور کچھ کہے بغیر کھٹا کھٹ نیچے اتر گیا۔۔۔۔ سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔۔۔۔ جمیل کا دل ایک لمحے کے لیے ساکت سا ہو گیا تیز قدم اٹھاتا وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔

معاً جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا ''سیٹھ صاحب ٹیکسی!''

جمیل نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔۔۔۔ ''نہیں کمبخت، شادی!''

☆☆☆☆☆

شانتی

دونوں پیرے ٹرین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی اس لیے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے سامنے موٹی بھوؤں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول مٹول چہرہ تیکھی ناک موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ شام کو ہمیشہ درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلراج سے کہا ''بیٹھی ہے جال پھینکے''

بلراج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا'' پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی''

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی'' یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے کوئی دکان کھول کر بیٹھتی ہے کوئی چل پھر کے سودا بیچتی ہے۔ کوئی اس طرح ریستورانوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔۔۔جسم بیچنا بھی ایک آرٹ ہے اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے۔۔۔۔یہ موٹی بھوؤں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہو گی کہ وہ بکاؤ ہے۔''

بلراج مسکرایا'' کسی روز وقت نکال کر کچھ دیر یہاں بیٹھو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیونکر سودے ہوتے ہیں اس جنس کا بھاؤ کیسے چلتا ہے''

یہ کہہ کر اس نے ایک دم مقبول کا ہاتھ پکڑا'' ادھر دیکھو، ادھر''

مقبول نے موٹی یبودن کی طرف دیکھا بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا ''نہیں یار۔۔۔۔ادھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو''

مقبول نے ادھر دیکھا ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی بال کٹے ہوئے تھے ناک نقشہ ٹھیک تھا ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی مقبول نے بلراج سے پوچھا ''کون ہے یہ لڑکی؟''

بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ''ہاں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب وغریب ہے۔''

مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ''کون سی یار تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب وغریب ہی ہوتی ہے۔''

بلراج مسکرایا ''یہ بڑی خاص الخاص ہے۔۔۔۔ذرا غور سے دیکھو''

مقبول نے غور سے دیکھا بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاوز پتلی پتلی بہت ہی گوری بانہیں لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی ''میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب وغریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔۔۔۔اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑھی کی پہناوٹ میں بھی خامیاں نظر آئی ہیں۔بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں۔''

بلراج ہنسا ''تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی۔''

مقبول نے کہا ''جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرما دیجئے لیکن پہلے یہ بتا دیجئے

کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا۔۔۔۔''

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی مقبول رک گیا ''مجھے جواب مل گیا اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجیے''

''سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے کبھی جھوٹ نہیں بولتی جو اصول اس نے اپنے لیے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں اس معاملے میں دل اس کا برف ہے۔''

بلراج نے چائے کا آخری گھونٹ پیا ''کہیے کیا خیال ہے؟''

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا ''جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی۔۔۔۔۔خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔''

''یہی میں نے سوچا تھا۔۔۔۔میں تم سے کیا بیان کروں، روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں۔۔۔۔ایک گھنٹہ ہو گیا تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی۔۔۔۔۔میں چلی اور یہ جا وہ جا۔۔۔تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے، جاؤ چلے جاؤ۔۔۔۔ساڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ میلی ہو جائے گی'' یہ کہہ کر بلراج نے سگریٹ سلگایا ''عجیب وغریب لڑکی ہے پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں بائی گوڈ چکرا گیا چھوٹتے ہی مجھ سے کہا فقط ایک پیسہ کم نہیں ہو گا جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔''

مقبول نے پوچھا ''نام کیا ہے اس کا''

''شانتی بتایا اس نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔کشمیرن ہے''

مقبول کشمیری تھا چونک پڑا ''کشمیرن''

''تمہاری ہم وطن''

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا ''یہاں کیسے آئی ؟''

''معلوم نہیں''

''کوئی رشتے دار ہے اس کا؟'' مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا

''وہاں کشمیر میں کوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے''

بلراج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا ''بار بی روڈ پر ایک ہوٹ ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔۔۔یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہو گیا ورنہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتہ کسی کو نہیں دیتی جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں پیرے ژین وڈیری میں چلا آتا ہے شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں''

مقبول کچھ دیر خاموش رہا پھر بیرے کو اشارے سے بلایا اور اس سے بل لانے کے لیے کہا اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا دونوں باتیں کرنے لگے مقبول بلراج سے مخاطب ہوا ''اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیے۔''

بلراج مسکرایا ''ضرور ضرور۔۔۔لیکن اس وقت نہیں مصروف ہے کبھی آ جانا یہاں شام کو۔۔۔۔۔اور ساتھ بیٹھ جانا''

مقبول نے بل ادا کیا دونوں دوست اٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزری چال بھدی تھی جب وہ کچھ دور کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا "اس میں جنسی کشش تو نام کو بھی نہیں حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیونکر چلتا ہے۔۔۔۔لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے۔۔۔۔ساڑھی کی پہناوٹ آج بھی خامیوں سے بھری ہے۔"

پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے اس کی چائے میز پر آ چکی تھی ورنہ اٹھ کر وہ اس لڑکی کے پاس جا بیٹھتا اس نے چائے پینا شروع کر دی اس دوران اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا لڑکی نے دیکھا کچھ توقف کے بعد اٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر لڑکی سے مخاطب ہوا "چائے شوق فرمائیں گی آپ"

"نہیں"

اس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔مقبول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "کشمیریوں کو تو چائے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔"

لڑکی نے بڑے بے ہنگم انداز میں پوچھا "تم چلنا چاہتے ہو میرے ساتھ"

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا گھبراہٹ میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا "ہاں۔۔۔۔"

لڑکی نے کہا "ففٹی روپیز۔۔۔۔یس اور نو؟"

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جما لیے ''چلیے''

مقبول نے چائے کا بل ادا کیا دونوں اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی لڑکی بھی خاموش رہی ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا ''کہاں جائے گا تم؟''

مقبول نے جواب دیا ''جہاں تم لے جاؤ گی''

''ہم کچھ نہیں جانتا۔۔۔۔۔تم بولو کدھر جائے گا''

مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوجھا تو کہا ''ہم کچھ نہیں جانتا''

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ''تم کیسا آدمی ہے۔۔۔۔خالی پیلی جوک کرتا ہے۔''

مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ''میں مذاق نہیں کرتا۔۔۔۔مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں۔''

وہ بگڑ کر بولی ''کیا۔۔۔۔۔۔تم تو بولا تھا ففٹی روپیز لیں''

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے ''یہ لو گھبراتی کیوں ہو''

اس نے نوٹ لے لیے ''تم جائے گا کہاں؟''

مقبول نے کہا ''تمہارے گھر''

''نہیں''

''کیوں نہیں''

''تم کو بولا ہے نہیں۔۔۔۔ادھر ایسی بات نہیں ہو گی''

مقبول مسکرایا ''ٹھیک ہے ایسی بات ادھر نہیں ہو گی''

کچھ متحیر سی ہوئی ''تم کیسا آدمی ہے''

''جیسا میں ہوں تم نے بولا ففٹی روپیز لیں گے تو۔۔۔۔۔۔میں نے کہا لیں اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیئے تم نے بولا ادھر ایسی بات نہیں ہو گی میں نے کہا بالکل نہیں ہو گی۔۔۔اب اور کیا چاہتی ہو''

لڑکی سوچنے لگی مقبول مسکرایا ''دیکھو شانتی بات یہ ہے کل تم کو دیکھا ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں آج میں نے تمہیں پکڑ لیا اب تمہارے گھر چلتے ہیں وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔کیا تمہیں یہ منظور نہیں۔

''نہیں۔۔۔۔یہ لو اپنے ففٹی روپیز۔۔۔۔''لڑکی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔

''تمہیں بس ففٹی روپیز کی پڑی ہے۔۔۔۔۔۔روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔۔۔چلو، ڈرائیور کو اپنا ایڈریس بتاؤ۔۔۔۔میں شریف آدمی ہوں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا'' مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی لڑکی متاثر ہوئی اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ''چلو۔۔۔۔۔ڈرائیور، بار بی روڈ''

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیئے ''یہ میں نہیں لوں گی''

مقبول نے اصرار نہ کیا ''تمہاری مرضی''

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی بڑی تنگ وتار جگہ تھی چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا بہت مختصر سامان تھا لوہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی کونے میں ڈریسنگ ٹیبل ایک سٹول اس پر ٹیبل فین چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا ہر چیز صاف ستھری تھی تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا"نہیں ۔۔۔۔۔۔ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں۔۔۔۔۔ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا کرسی پر بیٹھو" یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔

شانتی نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا"بولو۔۔۔۔۔کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا"پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی"

شانتی نے برا نہ مانا صرف اتنا کہا"مجھے مالوم ہے"

"اٹھو۔۔۔۔۔۔مجھے لپ اسٹک دو میں تمہیں سکھاتا ہوں" یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔

شانتی نے اس سے کہا"ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھالو"

مقبول نے لپ اسٹک اٹھائی اسے کھول کر دیکھا "ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں"

"تمہارے رومال سے نہیں۔۔۔۔۔میرا لو" یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلا ہوا رومال مقبول کو دیا مقبول نے اس کے ہونٹ پونچھے بڑی نفاست سے نئی سرخی ان پر لگائی پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا "لو اب آئینہ دیکھو"

شانتی اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا پسندیدہ نظروں میں تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا "اب ٹھیک ہے" پھر پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا "تمہارا کوئی بیوی ہے؟"

مقبول نے جواب دیا "نہیں"

کچھ دیر خاموش رہی مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلہ کلام شروع کیا "اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو تمہارا نام شانتی ہے یہاں رہتی ہو۔۔۔۔یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟"

شانتی نے یہ بے تکلف جواب دیا "میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے۔۔۔۔میں وہاں ہوسپٹل میں نرس تھا ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا۔۔۔میں بھاگ کر ادھر کو آگئی یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا۔۔۔بولا ہمارے ساتھ چلو ہم گیا بس کام چالو ہوگیا۔۔۔ہم یہاں ہوٹل میں آگیا۔۔۔پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی۔۔۔سب رنڈی لوگ

ہے۔۔۔کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔"

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا "آئی ڈونٹ لائک ویٹ از بیڈ"

اس کے نزدیک ففٹی روپیز کا معاملہ کاروباری معاملہ تھا سرینگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے شانتی کو بہت غصہ آیا نوٹ پھاڑ دیا اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔۔۔چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔

ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی آئے ہوئے اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی "ہم اپنا لوس پورا کر لے گا۔"

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بنک میں جمع کرا دیئے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ نہیں کمانا چاہتی تھی اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا "اب تم جاؤ ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا" مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا "باتیں

کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے۔''

مقبول نے ''اچھا'' کہا اور چل دیا

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہنچا اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا اس دوران میں شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑھی پہننی سکھائی لڑکی ذہین تھی، جلدی سیکھ گئی۔

کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا شباب بھی نہیں تھا وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی، ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا وہ خوبصورت تھی۔ نہ بدصورت، عورت تھی نہ لڑکی، وہ پھول تھی نہ کلی، شاخ تھی نہ تنا اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے خلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔

شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لیے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرتی تھی لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شانتی نے اس سے کہا ''تم کوئی لڑکی مانگتا؟''

مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اٹھا ''کیا کہا؟''

شانتی نے کہا ''ہم پوچھتی تم کوئی لڑکی مانگتا تم ہم لا کر دیتا''

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا کیوں اس

نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول سے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جبکہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں۔ مقبول کو عورت کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔

مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی ''ہم کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم۔۔۔۔ جاؤ''

مقبول نے کچھ نہ کہا خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا

متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے ڑین ڈیری جاتا رہا مگر شانتی دکھائی نہ رہا آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی مقبول کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔ شانتی کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی پرانا تھا۔ ساڑھی کی پہناوٹ تو اور زیادہ بدزیب تھی مقبول اس سے مخاطب ہوا ''مجھ سے ناراض ہو تم؟''

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی مقبول نے تند لہجے میں پوچھا'' بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟''

شانتی خاموش رہی مقبول نے غصے میں کہا ''جواب دو ورنہ یاد رکھو ماروں گا''

شانتی نے صرف اتنا کہا ''مارو''

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا۔۔۔ شانتی بلبلا اٹھی

اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا غصے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا ”ساڑھی ٹھیک کروا ئی۔“

شانتی اٹھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا ”شانتی اٹھو۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں“

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلائی ”نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم نہیں جا سکتے“ اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان کھڑی ہوگئی ”تم گیا تو مار ڈالوں گی“

وہ ہانپ رہی تھی اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے مقبول نے اس کو پیار کیا رونا بند کرنے کے لیے کہا تو وہ آنسوؤں میں اٹک اٹک کر بولی ”ادھر سر ینگر میں۔۔۔ ایک

آدمی نے ـ ـ ـ ـ ہم کو مار دیا تھا ـ ـ ـ ـ ادھر ایک آدمی نے ـ ـ ـ ـ ـ ہم کو زندہ کر دیا۔"

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کر کہا "یہ لو اپنے ففٹی روپیز"

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیئے پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کا ایک دراز کھولا اور مقبول سے کہا "ادھر دیکھو ـ ـ ـ دیکھو یہ کیا ہے؟"

مقبول نے دیکھا دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے مٹھی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے "ہم اب یہ نہیں مانگتا"

مقبول مسکرایا ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا "اب تم کیا مانگتا ہے؟"

شانتی نے جواب دیا "تم کو" یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا "روؤ نہیں ـ ـ ـ ـ ـ تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔"

☆☆☆☆☆

شغل

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے جب ہم برسات میں سڑکیں صاف کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔

ہم میں سے کچھ کسان تھے اور کچھ مزدوری پیشہ، چونکہ پہاڑی دیہاتوں میں روپے کا منہ دیکھنا بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لیے ہم سب خوشی خوشی چھ آنے روز پر سارا دن پتھر ہٹاتے رہتے تھے جو بارشوں کے زور سے ساتھ والی پہاڑیوں سے لڑھک کر سڑک پر آ کر گرتے تھے۔ پتھروں کو سڑک پر سے ہٹانا تو خیر ایک معمولی بات تھی ہم تو اس اجرت پر ان پہاڑیوں کو ڈھانے پر بھی تیار تھے جو ہمارے گرد و پیش سیاہ اور ڈراونے دیوں کی طرح اکڑی کھڑی تھیں دراصل ہمارے بازو سخت سے سخت مشقت کے عادی تھے اس لیے یہ کام ہمارے لیے بالکل معمولی تھا البتہ جب کبھی ہمیں سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے پتھر کاٹنا ہوتے تو رات کو ہمیں بہت تکان محسوس ہوتی تھی پٹھے اکڑ جاتے اور صبح کو بیدار ہوتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ تمام پتھر جنہیں ہم گزشتہ روز کاٹتے اور پھوڑتے رہے ہیں ہمارے جسموں پر بوجھ ڈالے ہوئے ہیں مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔

ہمارا کام ہر روز صبح سات بجے شروع ہوتا تھا۔ جب طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طلائی کرنیں چیڑ کے دراز قد درختوں سے چھن چھن کر ہمارے پاس والے نالے کے خشم آلود پانی سے اٹکھیلیاں کر رہی ہوتیں اور آس پاس کی جھاڑیوں میں ننھے ننھے پرندے اپنے گلے پھلا پھلا کر چیخ رہے ہوتے یوں کہیے کہ

ہم قدرت کو اپنے خواب سے بیدار ہوتا دیکھتے تھے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا میں شبنم آلود سبز جھاڑیوں کی دلنواز سرسراہٹ، نالے میں سنگریزوں سے کھیلتے ہوئے کف آلود پانی کا شور اور برسات کے پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، چند ایسی چیزیں تھیں جو ہمارے سنگین سینوں میں ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتی تھیں جو زندگی کے اس دوزخ میں بھی بہشت کے خواب دکھانے لگتی۔

ہمیں ہر روز بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ یعنی سارا دن ہم سڑک کی موریوں اور پتھروں کو صاف کرتے رہتے تھے یہ کام دلچسپ نہ تھا مگر ہم نے اس کی ناخوشگوار یک آہنگی کو دور کرنے کے لیے ایک طریقہ ایجاد کر لیا تھا جب ہم سب اس پہاڑی کے نیچے جمع شدہ ملبے کو اپنے بیلچوں سے ہٹا رہے ہوتے جس کے سنگریزے ہر وقت سڑک پر گرتے رہتے تھے تو ہم ایک سر میں کوئی پہاڑی گیت شروع کر دیتے ملبے کے پتھروں سے ٹکرا کر ہمارے بیلچوں کی جھنکار اس گیت کی تال کا کام دیتی تھی یہ گیت اس افسردگی کو دور کر دیتا جو یہ غیر دلچسپ کام کرنے سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک اس کے سر ہماری چوڑی چھاتیوں میں سے نکلتے رہتے۔ ہم محسوس تک نہ کرتے کہ اس دوران میں ہم نے ملبے کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کر لیا ہے۔

موٹر لاریوں کی آمد و رفت سے بھی ہمارا دل بہلا رہتا تھا جو رنگ برنگ مسافروں کو کشمیر سے واپس یا کشمیر کی طرف لے جاتی رہتی تھیں جب کبھی کوئی لاری ہمارے پاس سے گزرتی تو ہم کچھ عرصہ کے لیے اپنی جھکی ہوئی کمریں سیدھی کر کے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور زمین پر اپنے بیلچے ٹیک کر اس کو سامنے

والے موڑ کے عقب میں گم ہوتے دیکھتے رہتے۔ ان لاریوں کو اتنی دور تک دیکھتے رہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تھوڑا سستا لیں مگر بعض اوقات ان لاریوں کی شاندار اسباب سے لدی ہوئی چھتیں اور ان کی کھڑکیوں سے مسافروں کے لہراتے ہوئے ریشمی کپڑوں کی جھلک ہمارے دلوں میں ایک ناقابل بیان تلخی پیدا کر دیتی تھی اور ہم اپنے آپ کو ان پتھروں کی طرح فضول اور ناکارہ تصور کرنے لگتے تھے جن کو ہمارے بیلچوں کے دھکے ادھر ادھر پٹکتے رہتے تھے ان مسافروں کے طرح طرح کے لباس دیکھ کر جن پر یقیناً بہت سے روپے صرف آئے ہوں گے ہم غیر ارادی طور پر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔

ہم میں سے اکثر کا لباس پٹو کے تنگ پائجامے، گاڑھے کی قمیص اور لدھیانے کی صدری پر مشتمل تھا سب کے پائجامے یا تو گھٹنوں پر سے گھس گھس کر اتنے باریک ہو گئے تھے کہ ان میں سے جسم کے بالوں کی پوری نمائش ہوتی تھی یا بالکل پھٹے ہوئے تھے۔

قمیصوں اور صدریوں کی بھی یہی حالت تھی ان پر جگہ جگہ مختلف رنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے قریب قریب ہم سب کی قمیصوں کے بٹن غائب تھے، اس لیے سینے عام طور پر کھلے رہتے تھے اور کام کرتے وقت ان پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آ سکتی تھیں۔

بارہ بجے کے قریب ہم کام چھوڑ کر کھانا کھانے کے لیے سڑک کے نیچے اتر کر پیڑ کے سائے تلے بیٹھ جاتے تھے یہ کھانا ہم صبح کپڑے میں باندھ کر اپنے ساتھ لاتے تھے تین ''ڈھوڈے'' (مکی کی موٹی روٹیاں) اور عام طور پر سرسوں کا ساگ

ہوتا تھا جس کو ہم اپنے بھوکے پیٹ میں ڈالتے تھے کھانے کے بعد ہم پانی عموماً نالے سے پیا کرتے اور جس روز بارش کی زیادتی کے باعث اس کا پانی زیادہ گدلا ہو جائے تو ہم دو سڑک کے اس پار چلے جایا کرتے تھے جہاں صاف پانی کا ایک چشمہ پھوٹتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم فوراً کام شروع کر دیا کرتے تھے گو ہمارا جی چاہتا تھا کہ نرم نرم گھاس پر لیٹ کر تھوڑی دیر سستا لیں اور پھر کام شروع کریں مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا جب کہ ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رہتا تھا کہ پورا کام کیے بغیر اجرت نہ ملے گی۔

ہمارا مطمح نظر کام کرنا اور اس حیلے سے اپنا پیٹ پالنا تھا اور چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہم میں سے کسی نے اگر اپنے کام میں ذرا سی سست رفتاری یا بے دلی کا اظہار کیا تو تاش کی گڈی سے ناکارہ جوکر کی طرح باہر نکال کر پھینک دیا جائے گا۔ اس لیے ہم دل لگا کر کام کیا کرتے تھے تاکہ ہمارے افسروں کو شکایت کا موقع نہ ملے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے افسر ہم پر بہت خوش تھے یہ کیونکر ہو سکتا ہے وہ بڑے آدمی ٹھہرے اس لیے ان کا جائز و ناجائز طور پر خفا ہونا بھی درست ہوتا ہے کبھی کبھی یہ لوگ ایسے ہی ہمارے کام کا معائنہ کرتے وقت اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے ہم پر برس پڑتے تھے لیکن ہم جو ان کی بڑائی کو بخوبی سمجھتے تھے مہاراج، مہاراج کہہ کر ان کا غصہ سرد کر دیا کرتے تھے ہم جانتے تھے کہ ان کا غصہ بالکل بے جا ہے لیکن یہ احساس ہمارے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا نہیں کرتا تھا شاید اس لیے کہ کورنشوں نے ہم کو بالکل مردہ بنا رکھا ہے یا پھر اس کی وجہ یہ بھی ہو

سکتی ہے کہ ہم کو یہ خوف دامنگیر رہتا تھا کہ اگر ہم اپنے موجودہ کام سے ہٹا دیئے گئے تو ہماری روزی بند ہو جائے گی۔

ہم اپنے کام سے مطمئن تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہم تھوڑی مزدوری اور زیادہ کام کے مسئلے پر بہت کم غور کیا کرتے تھے اس کی ضرورت بھی کیا ہے اس لیے کہ یہ کام پڑھے لکھے آدمیوں کا ہے اور ہم بالکل ان پڑھ اور جاہل تھے دراصل بات یہ ہے کہ ہماری دنیا بالکل الگ تھلگ تھی جس کی سرحدیں پتھر توڑنے یا ان کو ہٹانے، بارہ بجے روٹی کھانے اور پھر کام کرنے اور اس کے بعد اپنے اپنے ڈیروں میں سو جانے تک ختم ہو جاتی تھیں۔ ہمیں ان حدود کے باہر کسی شے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے کے دھندے میں ہم کچھ ایسی بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے کہ اس کے باہر نکل کر ہم کسی اور شے کی خواہش کرنا ہی بھول گئے تھے۔

ہمارے کام پر سڑکوں کے محکمے کی طرف سے ایک نگران مقرر تھا جو دن کا بیشتر حصہ سڑک کے ایک طرف چارپائی بچھا کر بیٹھے رہنے میں گزار دیتا یہ ذات کا پنڈت تھا اونچے طبقے کا امتیازی نشان سیندور کے تلک کی صورت میں ہر وقت اس کی سفید پیشانی پر چمکتا رہتا تھا ہم اپنے نگران کو احترام اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اول اس لیے کہ وہ برہمن تھا اور دوسرے اس لیے کہ ہم اس کے ماتحت تھے چنانچہ ادھر ادھر کے دوسرے کاموں کے علاوہ ہم باری باری دن میں کئی بار اس کے پینے کے لیے حقہ تازہ کیا کرتے تھے اور آگ بنا کر اس کی چلمیں بھرا کرتے تھے۔

پنڈت کا کام صرف یہ تھا کہ صبح چارپائی پر اپنے گیروے رنگ کی کلف لگی پگڑی اور ریشمی کوٹ اتار کر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری حاضری لگائے اور پھر ایک بڑے سے رجسٹر میں کچھ درج کرنے کے بعد ادھر ادھر ٹہلتا رہے یا حقہ پیتا رہے۔ وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا البتہ جب کبھی معائنے کے لیے کسی افسر کی موٹر ادھر سے گزرنا ہوتی تھی تو وہ اپنی چارپائی اٹھوا کر ہمارے پاس کھڑا ہو جایا کرتا تھا اس کی اس چالاکی پر ہم دل ہی دل میں بہت ہنسا کرتے تھے۔

ایک روز جبکہ صبح سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہم بارہ بجے کھانا کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول اپنے کام میں مشغول تھے موٹر کے ہارن نے ہمیں چونکا دیا لاریوں کی بہ نسبت ہم موٹروں کے دیکھنے کے بہت شائق تھے اس لیے کہ ان میں ہماری بھوکی نظروں کے دیکھنے کے لیے عجیب و غریب چیزیں نظر آتی تھیں ہم کمریں سیدھی کر کے کھڑے ہو گئے اتنے میں موڑ کے عقب سے سبز رنگ کی ایک چھوٹی موٹر نمودار ہوئی جب یہ ہمارے قریب پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ اس کی باڈی بارش کے ننھے ننھے قطروں کے نیچے چمک رہی ہے بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی شاید اس لیے کہ پچھلی سیٹ پر جو دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے ان میں ایک اپنی رانوں پر گراموفون رکھے بجا رہے تھے جب یہ موٹر ہمارے مقابل آئی تو ریکارڈ کی آواز سڑک کی ساتھ والی پہاڑی کے پتھروں سے ٹکرا کر فضا میں گونجی کوئی گا رہا تھا:

نہ میں کسی کا نہ کوئی میرا

چھایا چاروں اور اندھیرا

اب کچھ سوجھت ناہیں

موہے، اب کچھ۔۔۔۔۔

آواز میں بے حد درد تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ ہم شاید بحر ظلمات میں ڈوب گئے ہیں جب موٹر اپنی نیم وا کھڑکیوں سے اس گیت کے درد ناک سر بکھیرتی ہوئی ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ہم سب نے ایک آہ بھر کر اپنا کام شروع کر دیا۔

شام کے قریب جب سورج کی سرخ اور گرم ٹکیا پگھلے ہوئے تانبے کا رنگ اختیار کر کے ایک سیاہ پہاڑی کے پیچھے چھپ رہی تھی اور اس کی عنابی کرنیں دراز قد درختوں کی چوٹیوں سے کھیل رہی تھیں سبز رنگ کی وہی موٹر اس طرف سے واپس آتی دکھائی دی جدھر وہ دوپہر کو گئی تھی جب ہم نے اس کے ہارن کی آواز سنی تو کام چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ہمارے آگے سے گزر گئی اور پھر دفعتاً ہم سے آدھی جریب کے فاصلے پر کھڑی ہوگئی وہ باجا جو اس میں بج رہا تھا خاموش ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پچھلی سیٹ سے ایک نوجوان دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اپنی پتلون کو کمر پر سے درست کرتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا اور آہستہ آہستہ اس پل کی طرف روانہ ہوگیا جو سامنے نالے پر بندھا ہوا تھا یہ خیال کر کے کہ وہ نالے کے پانی کا نظارہ کرنے کے لیے گیا ہے جیسا کہ عام طور پر ادھر سے گزرنے والے مسافر کیا کرتے تھے ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

ابھی ہمیں اپنا کام شروع کیے پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ گزرا ہو گا کہ پل کی طرف سے تالی کی آواز بلند ہوئی ہم نے مڑ کر دیکھا پتلون پوش نوجوان پل پر سے سڑک کے ساتھ پتھروں سے چنی ہوئی دیو کے پاس کھڑا غالباً موٹر میں اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر رہا تھا سنگین منڈیر پر اس نوجوان سے کچھ دور ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم میں سے ایک نے اپنے بیلچے کو بڑے زور سے موری کی گیلی مٹی میں گاڑتے ہوئے کہا ''یہ رام وائی ہے''

کالو نے جو اس کے پاس کھڑا تھا دریافت کیا ''رام دئی؟''

''سنتو چمار کی لڑکی اور کون!'' اس کے لہجے میں بیلچے کے لوہے ایسی سختی تھی۔

ہم باقی چار حیران تھے کہ اس گفتگو کا مطلب کیا ہے۔ اگر وہ لڑکی جو منڈیر پر بیٹھی ہے سنتو چمار کی لڑکی ہے تو کون سی اہم بات ہے کہ ہمارا ساتھی اس قدر تیز بول رہا ہے ہم غور کر رہے تھے کہ فضل نے جو ہم سب سے عمر میں بڑا تھا اور نماز روزے کا بہت پابند تھا اپنی ڈاڑھی کو کھجلاتے ہوئے نہایت ہی متفکرانہ لہجے میں کہا:

''دنیا میں ایک اندھیر مچا ہے۔۔۔۔۔خدا معلوم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟''

یہ سن کر ہم باقی تین اصل معاملے سے آگاہ ہو کر سب کچھ سمجھ گئے اور اس احساس نے ہمارے دلوں پر غم اور غصے کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری کر دی۔

تالی کی آواز سن کر موٹر کی پچھلی نشست سے پتلون پوش کے ساتھی نے اپنا سر

باہر نکالا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا دوست اسے بلا رہا ہے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ہمارے قریب سے گزرتا ہوا پل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہم بیوقوف بکریوں کی طرح اسے اپنے دوست کے پاس جاتا دیکھتے رہے۔

جب پتلون پوش نوجوان کا دوست اس کے پاس پہنچ گیا تو وہ دونوں لڑکی کی طرف بڑھے اور اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں یہ دیکھ کر کالو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور خشم آلود لہجے میں بولا

"بدمعاش۔۔۔۔"

فضل نے سرد آہ بھری اور مغموم لہجے میں کہنے لگا "جب سے یہ سڑک بنی ہے ایسے بابوؤں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی ہے یہاں کے تمام علاقوں میں گندگی پھیل گئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ یہ سڑک بننے سے بہت آرام ہو گیا ہے ہو گا، مگر اس قسم کے بے شرمی کے نظارے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے خدا بچائے۔"

اس دوران میں پتلون پوش کے ساتھی نے لڑکی کو بازو سے پکڑ لیا اور غالباً اس کو اٹھ کر چلنے کے لیے کہا مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی یہ دیکھ کر کالو سے نہ رہا گیا اور اس نے رام پرشاد سے کہا "آؤ یہ لوگ تو اب دست درازی کر رہے ہیں۔"

کالو یہ کہہ کر اکیلا ہی اس جانب بڑھنے کو تھا کہ ہم نے اسے روک دیا اور یہ مشورہ دیا کہ تمام معاملہ پنڈت کے گوش گزار کر دیا جائے جو چارپائی پر سو رہا ہے اور پھر جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے اس تجویز کو معقول خیال کر کے ہم سب پنڈت کے پاس گئے اور اسے جگا کر سارا قصہ سنا دیا اس نے ہماری گفتگو کو بڑی بے پروائی سے سنا جیسے کوئی بات ہی نہیں اور ان دونوجوانوں کی طرف دیکھ کر جواب

رام وتی کو خدا معلوم کس طریقے سے منا کر اپنے ساتھ لا رہے تھے کہا ''جاؤ تم اپنا کام کرو میں ان سے خود دریافت کرلوں گا''

جب پنڈت رام وتی اور دو نوجوان ہمارے پاس سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ نوجوانوں کے چہروں پر ایک حیوانی جھلک ناچ رہی ہے اور پنڈت بڑے ادب سے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے رام وتی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

موٹر کے پاس پہنچ کر پنڈت نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا پہلے پتلون پوش پھر رام وتی اور اس کے بعد دوسرا نوجوان موٹر میں داخل ہو گئے ہمارے دیکھتے دیکھتے موٹر چلی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی اور ہم آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

''شیطان! مردود!'' کالو نے بڑے اضطراب سے یہ دو لفظ ادا کیے۔

اتنے میں پنڈت آ گیا اور ہم کو مضطرب دیکھ کر مصنوعی آواز میں کہنے لگا ''میں نے ان سے دریافت کیا ہے کوئی بات نہیں، وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں تھوڑی دور لے جا کر اسے چھوڑ دیں گے۔۔۔۔امیر آدمی ہیں ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔''

یہ کہہ کر پنڈت چلا گیا۔

ہم دیر تک خدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے کہ دفعتاً فضل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا دو مرتبہ زور سے تھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیے اور بیلچے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا ''اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے۔''

☆☆☆☆☆☆

شکاری عورتیں

میں آج آپ کو چند شکاری عورتوں کے قصے سناؤں گا میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی کبھی ان سے واسطہ پڑا ہوگا۔

میں بمبئی میں تھا فلمستان سے عام طور پر برقی ٹرین سے چھ بجے گھر پہنچ جایا کرتا تھا لیکن اس روز مجھے دیر ہوگئی اس لیے کہ "شکاری" کی کہانی پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔

میں جب بمبے سنٹرل کے اسٹیشن پر اترا، تو میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے باہر نکلی اس کا رنگ گہرا سانولا تھا ناک نقشہ ٹھیک تھا جوان تھی، اس کی چال بڑی انوکھی سی تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ فلم کا منظرنامہ لکھ رہی ہے۔

میں اسٹیشن سے باہر آیا اور پل پر وکٹوریا گاڑی کا انتظار کرنے لگا میں تیز چلنے کا عادی ہوں اس لیے میں دوسرے مسافروں سے بہت پہلے باہر نکل آیا تھا۔

وکٹوریا آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا میں نے کوچوان سے کہا کہ آہستہ آہستہ چلے اس لیے کہ فلمستان میں کہانی پر بحث کرتے کرتے میری طبیعت مکدر ہوگئی تھی موسم خوشگوار تھا وکٹوریا والا آہستہ آہستہ پل پر سے اترنے لگا۔

جب ہم سیدھی سڑک پر پہنچے تو ایک آدمی سر پر ٹاٹ سے ڈھکا ہوا مٹکا اٹھائے صدا لگا رہا تھا "قلفی ۔۔۔۔ قلفی!"

جانے کیوں میں نے کوچوان سے وکٹوریا روک لینے کے لیے کہا، اور اس قلفی بیچنے والے سے کہا کہ ایک قلفی دو ۔۔۔۔ میں اصل میں اپنی طبیعت کا تکدر کسی نہ

کسی طرح دور کرنا چاہتا تھا۔

اس نے مجھے ایک دونے میں قلفی دی میں کھانے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی دھم سے وکٹوریا میں آن گھسا کافی اندھیرا تھا میں نے دیکھا تو وہی گہرے رنگ کی سانولی لڑکی تھی۔

میں بہت گھبرایا۔۔۔وہ مسکرا رہی تھی دونے میں میری قلفی پگھلنا شروع ہو گئی

اس نے قلفی والے سے بڑے بے تکلف انداز میں کہا ''ایک مجھے بھی دو''

اس نے دے دی

گہرے سانولے رنگ کی لڑکی نے اسے ایک منٹ میں چٹ کر دیا اور وکٹوریا والے سے کہا ''چلو''

میں نے اس سے پوچھا ''کہاں؟''

''جہاں بھی تم چاہتے ہو''

''مجھے تو اپنے گھر جانا ہے''

''تو گھر ہی چلو''

''تم ہو کون؟''

''کتنے بھولے بنتے ہو''

میں سمجھ گیا کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا ''گھر جانا ٹھیک نہیں۔۔اور یہ وکٹوریا بھی غلط ہے۔۔۔کوئی ٹیکسی لے لیتے ہیں''

وہ میرے اس مشورے سے بہت خوش ہوئی۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ اس سے نجات کیسے حاصل کروں۔۔۔ اسے دھکا دے کر باہر نکالتا تو اودھم مچ جات اپھر میں نے یہ سوچا کہ عورت ذات ہے اس سے فائدہ اٹھا کر کہیں وہ یہ واویلا نہ مچا دے کہ میں نے اس سے ناشائستہ مذاق کیا ہے۔

وکٹوریا چلتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ یہ مصیبت کیسے ٹل سکتی ہے آخر ہم بے بی ہسپتال کے پاس پہنچ گئے وہاں ٹیکسیوں کا اڈہ تھا میں نے وکٹوریا والے کو اس کا کرایہ ادا کیا اور ایک ٹیکسی لے لی ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے

ڈرائیور نے پوچھا ''کدھر جانا ہے صاحب!''

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے اس سے زیر لب کہا ''مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔۔۔ یہ لو دس روپے۔۔۔ اس لڑکی کو تم جہاں بھی لے جانا چاہو لے جاؤ''

وہ بہت خوش ہوا۔

دوسرے موڑ پر اس نے گاڑی ٹھہرائی اور مجھ سے کہا ''صاحب آپ کو سگریٹ لینے تھے۔۔۔ اس ایرانی کے ہوٹل سے سستے مل جائیں گے''

میں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکلا گہرے رنگ کی لڑکی نے کہا ''دو پیکٹ لانا''

ڈرائیور اس سے مخاطب ہوا ''تین لے آئیں گے'' اور اس نے موٹر اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا

☆☆☆☆

بمبئی ہی کا واقعہ ہے میں اپنے فلیٹ میں اکیلا بیٹھا تھا میری بیوی شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹن جو بڑے تیکھے نقشوں والی تھی بے دھڑک اندر چلی

آئی میں نے سوچا شاید نوکری کی تلاش میں آئی ہے مگر وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر مسکرانے لگی

میں نے اس سے پوچھا ''کون ہو تم؟''

''تم پہچانتے نہیں''

''میں نے آج پہلی دفعہ تمہیں دیکھا ہے''

''سالا جھوٹ مت بول۔۔۔تو روز دیکھتا ہے''

میں بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔۔۔۔لیکن تھوڑی دیر کے بعد میرا نوکر فضل دین آ گیا۔۔۔اس نے اس تیکھے نقشوں والی گھاٹن کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

☆☆☆☆☆

یہ واقعہ لاہور کا ہے

میں اور میرا ایک دوست ریڈیو اسٹیشن جا رہے تھے جب ہمارا تانگہ اسمبلی ہال کے پاس پہنچا تو ایک تانگہ ہمارے عقب سے نکل کر آگے آ گیا اس میں ایک برقع پوش عورت تھی جس کے نقاب نیم وا تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی شرارت ناچنے لگی میں نے اپنے دوست سے جو پچھلی نشست پر بیٹھا تھا کہا ''یہ عورت بدچلن معلوم ہوتی ہے''

''تم ایسے فیصلے ایک دم مت دیا کرو''

''بہت اچھا جناب! میں آئندہ احتیاط سے کام لوں گا''

برقع پوش عورت کا تانگہ ہمارے تانگے کے آگے آگے تھا وہ ٹکٹکی لگائے ہمیں دیکھ رہی تھی میں بڑا بزدل ہوں، لیکن اس وقت مجھے شرارت سوجھی اور میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آداب عرض کر دیا۔

اس کے آدھ ڈھکے چہرے پر مجھے کوئی ردعمل نظر نہ آیا جس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی

میرا دوست کہنے لگا اس کو میری اس ناکامی سے بڑی مسرت ہوئی لیکن جب ہمارا تانگہ شملہ پہاڑی کے پاس پہنچ رہا تھا تو برقع پوش عورت اپنا تانگہ ٹھہرا لیا اور (میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا) وہ نیم اٹھی ہوئی نقاب کے اندر مسکراتی ہوئی آئی اور ہمارے تانگے میں بیٹھ گئی۔۔۔۔میرے دوست کے ساتھ

میری سمجھ میں نہ آیا کیا جائے میں نے اس برقع پوش عورت سے کوئی بات نہ کی، اور تانگے والے سے کہا کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کا رخ کرے۔

میں اسے اندر لے گیا۔۔۔۔۔ڈائریکٹر صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے میں نے ان سے کہا ''یہ خاتون ہمیں رستے میں پڑی ہوئی مل گئی آپ کے پاس لے آیا ہوں، اور درخواست کرتا ہوں کہ انہیں یہاں کوئی کام دلوا دیجئے''

انہوں نے اس کی آواز کا امتحان کرایا جو کافی اطمینان بخش تھا جب وہ آڈیشن دے کر آئی تو اس نے برقع اتارا ہوا تھا میں نے اسے غور سے دیکھا اس کی عمر پچیس کے قریب ہوگی رنگ گورا آنکھیں بڑی بڑی لیکن اس کا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے شکرقندی کی طرح بھوبل میں ڈال کر باہر نکالا گیا ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں چپڑاسی آیا اس نے کہا کہ باہر ایک تانگہ والا کھڑا ہے، وہ کرایہ مانگتا ہے میں نے سوچا شاید زیادہ عرصہ گزرنے پر وہ تنگ آ گیا ہے، چنانچہ میں باہر نکلا میں نے اپنے تانگے والے سے پوچھا ''بھئی کیا بات ہے ہم کہیں بھاگ تو نہیں گئے''

وہ بڑا حیران ہوا ''کیا بات ہے سرکار!''

''تم نے کہلا بھیجا ہے کہ میرا کرایہ ادا کرو''

''میں نے جناب کسی سے کچھ بھی نہیں کہا''

اس کے تانگے کے ساتھ ہی ایک دوسرا تانگہ کھڑا تھا اس کا کوچوان جو گھوڑے کو گھاس کھلا رہا تھا، میرے پاس آیا اور کہا ''وہ عورت جو آپ کے ساتھ گئی تھی، کہاں ہے؟''

''اندر ہے۔۔۔۔کیوں؟''

''جی اس نے دو گھنٹے مجھے خراب کیا ہے۔۔۔۔۔کبھی ادھر جاتی تھی، کبھی ادھر۔۔۔میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے''

''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''جی میں اپنا کرایہ چاہتا ہوں''

''میں اس سے لے کر آتا ہوں''

''میں اندر گیا۔۔۔اس برقع پوش عورت سے جو اپنا برقع اتار چکی تھی کہا'' تمہارا تانگے والا کرایہ مانگتا ہے

وہ مسکرائی ''میں دے دوں گی''

میں نے اس کا پرس جو صوفے پر پڑا تھا اٹھایا اس کو کھولا۔۔۔مگر اس میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا بس کے چند ٹکٹ تھے اور دو بالوں کی پنیں۔۔اور ایک واہیات قسم کی لپ اسٹک۔

میں نے وہاں ڈائریکٹر کے دفتر میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا ان سے رخصت طلب کی باہر آ کر اس کے تانگے والے کو دو گھنٹوں کا کرایہ ادا کیا، اور اس عورت کو اپنے دوست کی موجودگی میں کہا "تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے کہ تم نے تانگہ لے لیا ہے اور تمہارے پاس ایک کوڑی بھی نہیں۔"

وہ کھسیانی ہوگئی "میں۔۔۔میں۔۔۔آپ بڑے اچھے آدمی ہیں"

"میں بہت برا ہوں۔۔۔تم بڑی اچھی ہو۔۔۔۔کل سے ریڈیو اسٹیشن آنا شروع کر دو۔۔۔تمہاری آمدن کی صورت پیدا ہو جائے گی یہ بکواس جو تم نے شروع کر رکھی ہے اسے ترک کر دو۔"

میں نے اسے مزنگ کے پاس چھوڑ دیا۔۔میرا دوست واپس چلا گیا۔۔۔اتفاقاً مجھے ایک کام سے وہاں جانا پڑا۔

دیکھا کہ میرا دوست اور وہ عورت اکٹھے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆

یہ بھی لاہور ہی کا واقعہ ہے

چند روز ہوئے میں نے اپنے دوست کو مجبور کیا کہ وہ مجھے دس روپے دے اس دن بنک بند تھے اس نے معذوری کا اظہار کیا لیکن جب میں نے اس پر زور دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ دس روپے پیدا کرے اس لیے کہ مجھے اپنی ایک علت

پوری کرنا ہے، جس سے تم بخوبی واقف ہو،تو اس نے کہا ''اچھا'' میرا ایک دوست ہے وہ غالباً اس وقت کافی ہاؤس میں ہوگا وہاں چلتے ہیں امید ہے کام بن جائے گا۔

ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر کافی ہاؤس پہنچے مال روڈ پر بڑے ڈاک خانے کے قریب ایک تانگہ جارہا تھا اس میں نسواری رنگ کا برقع پہنے ایک عورت بیٹھی تھی اس کی نقاب پوری کی پوری اٹھی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔وہ تانگے والے سے بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کررہی تھی ہمیں اس کے الفاظ سنائی نہیں دئی لیکن اس کے ہونٹوں کی جنبش سے جو کچھ مجھے معلوم ہوتا تھا ہوگیا۔

ہم کافی ہاؤس پہنچے تو عورت کا تانگہ بھی وہیں رک گیا میرے دوست نے اندر جاکر دس روپوں کا بندوبست کیا اور باہر نکلا۔۔۔۔۔۔وہ عورت نسواری برقعے میں جانے کس کی منتظر تھی۔

ہم واپس گھر آنے لگے تو رستے میں خربوزوں کے ڈھیر نظر آگئے ہم دونوں تانگے سے اتر کر خربوزے پرکھنے لگے۔

ہم نے باہم فیصلہ کیا کہ اچھے نہیں نکلیں گے کیونکہ ان کی شکل وصورت بڑی بے ڈھنگی تھی ۔۔۔جب اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی نسوانی برقع تانگے میں بیٹھا خربوزے دیکھ رہا ہے۔

میں نے اپنے دوست سے کہا'' خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔۔۔۔آپ نے ابھی تک یہ نسواری رنگ نہیں پکڑا''

اس نے کہا'' ہٹاؤجی ۔۔۔یہ سب بکواس ہے''

ہم وہاں سے اٹھ کر تانگے میں بیٹھے میرے دوست کو قریب ہی ایک کیمسٹ کے ہاں جانا تھا وہاں دس منٹ لگے باہر نکلے تو دیکھا کہ نسواری برقع اسی تانگے میں بیٹھا جا رہا تھا۔

میرے دوست کو بڑی حیرت ہوئی "یہ کیا بات ہے؟ یہ عورت کیوں بیکار گھوم رہی ہے؟"

ہمارا تانگہ ہال روڈ کو مڑنے ہی والا تھا کہ وہ نسواری برقع پھر نظر آیا میرے دوست گو کنوارے ہیں لیکن بڑے زاہد ان کو جانے کیوں اکساہٹ پیدا ہوئی کہ اس نسوارے برقعے سے بڑی بلند آواز میں کہا "آپ کیوں آوارہ پھر رہی ہیں۔۔۔۔ آیئے ہمارے ساتھ"

اس کے تانگے نے فوراً رخ بدلا اور میرا دوست سخت پریشان ہو گیا جب وہ نسواری برقع ہم کلام ہوا تو اس نے اس سے کہا "آپ کو تانگے میں آوارہ گردی کرنے کی کیا ضرورت ہے میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں"

میرے دوست نے اس نسواری برقعے سے شادی کر لی۔

☆☆☆☆☆☆

شوشو

گھر میں بڑی چہل پہل تھی تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے کمرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لیے بے سری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی بس گائے جا رہی ہیں نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل کی شہ نشینیوں تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

کیوں نہ ہو ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔

رات کے 11 بجے کے لگ بھگ دونوں ڈولیاں آئیں اور گلی میں اس قدر شور برپا ہوا کہ الامان مگر وہ نظارہ بڑا روح افزا تھا جب گلی کی سب شوخ و شنگ لڑکیاں باہر نکل آئیں اور تیتریوں کی طرح ادھر ادھر پھڑ پھڑانے لگیں۔

ساڑھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں اونچی ایڑھی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر ان الہڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں۔۔۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا

ہے۔

عباس میرے پاس کھڑا تھا ہم دونوں عورتوں کے ہجوم میں گھرے تھے دفعتاً عباس نے گلی کے نکڑ پر نظریں گاڑ کر کہا ''شوشو کہاں ہے؟''

میں نے جواب دیا ''مجھے اس وقت تمہارے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں ہے''

میں اس ہجوم میں اس بھونرے کی مانند کھڑا تھا جو پھولوں بھری کیاری دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس پھول پر بیٹھے۔

عباس نے رونی آواز میں کہا ''وہ نہیں آئی''

''تو کیا ہوا۔۔۔باقی تو سب موجود ہیں۔۔۔۔۔ارے۔۔۔دیکھو تو وہ نیلی ساڑھی میں کون ہے؟۔۔۔۔۔شوشو'' میں نے عباس کا ہاتھ دبایا

عباس نے غور سے دیکھا ''نیلی ساڑھی میں۔۔۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''علاج کراؤ اپنی آنکھوں کا۔۔۔چغد کہیں کے، یہ شوشو ہے؟''

''کیوں وہ نہیں ہے کیا؟'' میں نے پھر نیلی ساڑھی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں کچھ اس طور پر کہ اس کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً ہی منہ سے لال جیب نکال کر میرا منہ چڑایا اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔

اس سہیلی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔میرے ماتھے پر پسینہ آگیا

عباس نے جو اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ رہا تھا بلند آواز میں کہا" بخدا تم اس کی توہین کر رہے ہو۔۔۔گدھے کہیں کے۔۔۔عورت کے معاملے میں نرے احمق ہو۔۔۔کاٹھ کی کوئی پتلی نیلے رنگ میں لپیٹ لپاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دی جائے تم اسی کی بلائیں لینا شروع کردو گے۔"

یہ الفاظ اتنی اونچی آواز میں ادا کیے گئے تھے کہ اس نیلی ساڑھی والی نے سن لیے جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو خود بخود ٹھٹک گئی ایک لحظے کے لیے اس کے قدم رکے گویا ہم میں سے کسی نے اس کو مخاطب کیا ہے پھر فوراً ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی خفت دور کرنے کے لیے اس نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا "ارے۔۔۔آمینہ تو کہاں اڑ گئی؟"

مجھے موقع ملا میں نے جھٹ سے عباس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اچھی طرح دبا کر اس سے کہا" آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی مگر میرا نام محمد امین ہے۔۔۔مجھے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں"

جل ہی تو گئی مگر ہم زیر لب مسکراتے آگے بڑھ گئے چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ عباس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا "شوشو ابھی تک نہیں آئی"

"تو میں کیا کروں۔۔۔میرے سر پر نمدہ باندھ دیجیے تو میں ابھی سرکار کے لیے اسے تلاش کرکے لے آتا ہوں۔۔۔آخر یہ کیا حماقت ہے بھئی تم تماشا بھی دیکھنے دو گے کہ نہیں؟ اور پھر جناب یہ تو بتایئے اگر وہ یہاں موجود بھی ہو تو آپ اس سے ملاقات کیونکر کر سکتے ہیں۔۔۔آپ کوئی امریکی ناول تو نہیں پڑھ رہے

کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔"

عباس میری بات فوراً سمجھ گیا وہ اتنا بیوقوف نہیں تھا چنانچہ ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے گلی سے نکل کر بازار میں چلے گئے موڑ پر رام بھروسے پنواڑی کی دکان کھلی تھی وہ بجلی کے قمقمے کے نیچے سر جھکائے اونگھ رہا تھا ہم نے اس سے دو پان بنوائے اور وہیں بازار میں کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے دیر تک ہم ہندوستان میں مرد عورت کے درمیان اجنبیت چلی آ رہی ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جب ایک بج گیا تو عباس جمائی لے کر اٹھا اور کہنے لگا "بھئی اب نیند آ رہی ہے۔۔۔۔اس حسرت کو ساتھ لیے جا رہا ہوں کہ شوشو کو نہ دیکھ سکا سچ کہتا ہوں امین وہ لڑکی۔۔۔۔۔میں اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہے؟"

عباس نے اپنے گھر کا رخ کیا اور میں نے اپنے گھر کا راستے میں سوچتا رہا کہ عباس نے شوشو جیسی معمولی لڑکی میں ایسی کون سی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جو ہر وقت اس کا ذکر کرتا رہتا ہے۔عباس کے مذاق کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بڑا اونچا ہے مگر یہاں اسے کیا ہو گیا تھا؟۔۔۔۔۔۔۔۔شوشو۔۔۔۔شو شو۔۔۔۔ارے یہ کیا ہے؟۔۔۔۔۔دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔۔۔۔شوشو۔۔۔۔ایک دو مرتبہ آپ بھی دہرائیے۔۔۔۔۔ذرا جلدی جلدی۔۔۔۔کیا آپ کو لذت محسوس ہوئی؟۔۔۔۔۔ضرور ہوئی ہو گی مگر کیوں؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں عباس کی محبوبہ شوشو کے بارے میں خواہ مخواہ کیوں غور کرنے لگا ہوں اس

میں کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں جو غور افروز ہو مگر۔۔۔مگر۔۔۔یہ شوشو نام میں دلچسپی ضرور تھی اور کیا کہا تھا میں نے ملذت بھی!

شوشو میں بانجو کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی تھی آپ یہ نام پکاریئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے۔

شوشو۔۔۔۔سوشیلا کا دوسرا نام ہے یعنی اس کی بگڑی ہوئی شکل مگر اس کے باوجود اس میں کتنی موسیقی ہے۔۔۔سوشیلا۔۔۔شوشو۔۔۔شوشو۔۔۔سوشیلا۔۔۔۔غلط۔۔۔سوشیلا میں شوشو کی سی موسیقیت ہرگز نہیں ہو سکتی۔

فرنگی شاعر بائرن شکیل تھا مگر اس میں وہ کون سی شے تھی جو عورتوں کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتی تھی؟ اس کا لنگڑا کر چلنا گریٹا گاربو قطعاً خوش شکل نہیں ہے مگر اس میں کون سی چیز ہے جو فلمی تماشائیوں پر جادو کا کام کرتی ہے؟۔۔۔اس کا ذرا بگڑے ہوئے انگریزی لہجے میں باتیں کرنا۔۔۔۔یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات اچھی بھلی شے کو بگاڑنے سے اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے؟

سوشیلا پندرہ سولہ برس کی ایک معمولی لڑکی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے اس عمر میں وہ ان تمام چیزوں کی مالک ہے جو عام نوجوانوں کے سینے میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں مگر عباس کی نظروں میں یہ کوئی خوبی نہ تھی عام نوجوانوں کی طرح عباس کا دل گھاس کی پتی کی مانند نہیں تھا جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی کانپنا شروع کر دیتی ہے۔۔۔۔خدا جانے وہ اس کی کس

ادا پر مرتا تھا جو میرے ذہن سے بالاتر تھی۔

میں نے سوشیلا کی شکل وصورت اور اس کی صناعانہ قدر و قیمت کے متعلق کبھی غور نہیں کیا تھا مگر نہ جانے میں اس روز اس کے متعلق کیوں سوچتا رہا بار بار وہ میرے ذہن میں آ رہی تھی اور ہر بار میں سوشیلا کو چھوڑ کر اس کے مختصر نام شوشو کی موسیقی میں گم ہو جاتا تھا انہی خیالات میں غرق گلی کے موڑ پر پہنچ گیا اور مجھے اس چیز کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے دفعتاً وہاں کی فضا کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا مکان میری نظروں کے سامنے تھا اس کے باہر گلی کی دیوار کے ساتھ ایک برقی قمقمہ لٹک رہا تھا جس کی چوندھیا دینے والی روشنی ساری گلی میں بکھری ہوئی تھی۔۔۔۔۔ مجھے اس قمقمے کے ''تجرد'' پر بڑا ترس آیا گلی بالکل سنسان تھی اور وہ قمقمہ متحیر سا معلوم ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو وہاں بھی خاموشی تھی البتہ کبھی کبھار کسی بچے کے رونے کی لرزاں صدا اور پھر ساتھ ہی اس کی ماں کی خواب آلود آواز سنائی دیتی تھی ڈیوڑھی کے ساتھ والا کمرہ کھول کر میں صوفے پر بیٹھ گیا پاس ہی تپائی پر ''رومان'' پڑا تھا اس کو اٹھا کر میں نے ورق گردانی شروع کر دی ورق الٹتے الٹتے اختر کی غزل پر نظریں جم گئیں مطلع کس قدر حسین تھا۔

نہ بھولے گا تیرا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

مجھے نیند آ گئی کلاک کی طرف دیکھا تو چھوٹی سوئی دو کے ہندسے کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس کا اعلان کرنے کے لیے ارتعاش پیدا ہو رہا تھا ٹن ٹن ٹن۔۔۔ ٹن

ٹن ٹن ۔۔۔۔ٹن

"دو بج گئے" میں اٹھا اور سونے کے ارادے سے سیڑھیاں طے کر کے اپنی خوابگاہ میں پہنچا بہار کے دن تھے اور موسم خنک میری خواب گاہ کی ایک کھڑکی باہر گلی کی طرف کھلتی ہے جس کے پیازی رنگ کے ریشمی پردے میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور سبز رنگ کا قمقمہ روشن کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں نیند اور بیداری کے درمیان صرف ایک لحظہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی گنگناہٹ آئی اس پر ملتی ہوئی پلکیں کھل گئیں اور میں نے غنودگی دور کرتے ہوئے غور سے سننا شروع کیا ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا یکا یک کسی کی دلکش ہنسی کی مترنم آواز بلند ہوئی اور پھلجھڑی کے نورانی تاروں کے مانند پرسکوت فضا میں بکھر گئی۔

میں بستر پر سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا

"دونوں دلہنیں ماشاءاللہ بڑی خوبصورت ہیں"

"چندے آفتاب، چندے ماہتاب"

غالباً دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں ان کے موضوع نے میری دلچسپی کو بڑھا دیا اور میں نے زیادہ غور سے سننا شروع کیا۔

"تلے والی ساڑھی میں نرگس کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی ۔۔۔۔۔ گورے گورے

گالوں پر بکھری ہوئی مقیش۔۔۔۔۔جی چاہتا تھا، بڑھ کر بلائیں لے لوں۔''

''بیچاری سمٹی جا رہی تھی''

''سر تو اٹھایا ہی نہیں اس نے۔۔۔۔۔پر۔۔''

''پر یہ شرم و حیا کب تک رہے گی۔۔۔آج رات۔۔۔''

''آج رات۔۔۔۔''

''اوئی اللہ۔۔۔۔۔تو کیسی باتیں کر رہی ہے شوشو'' اس کے ساتھ ہی کپڑے کی سرسراہٹ سنائی دی میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔۔۔شوشو۔۔۔تو ان میں سے ایک سوشیلا تھی میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی اور میں نے دروازے میں کوئی دراڑ تلاش کرنا شروع کر دی کہ ان کی گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ ان کو دیکھ بھی سکوں ایک کواڑ کے نچلے تختے سے چھوٹی سی گانٹھ نکل گئی تھی اور اس طرح چونی کے برابر سوراخ پیدا ہو گیا تھا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے آنکھ جما دی۔

شوشو قالین پر بیٹھی بسکٹی رنگ کی ساڑھی سے اپنی ننگی پنڈلی کو ڈھانک رہی تھی اس کے پاس ہی عفت شرمائی ہوئی سی گاؤ تکیے پر دونوں کہنیاں ٹیکے لیٹی تھی۔

''اس وقت ان گوری چٹی دلہنوں پر کیا بیت رہی ہو گی؟'' شوشو یہ کہہ کر رک گئی اور اپنی آواز دبا کر اس نے عفت کی چوڑیوں کو چھیڑ کر ان میں کھنکھناہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا ''ذرا سوچو تو؟''

عفت کے گال ایک لمحے کے لیے تھرتھرائے ''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شوشو''

''جی ہاں۔۔۔۔۔گویا ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں میری بنو کو بس میں ہو تو

ابھی سے اپنی شادی رچالو“

عفت نے سوشیلا کی بات کاٹ دی ”پر یہ دلہنوں کو کہاں لے گئے ہیں شوشو؟“

”کہاں لے گئے ہیں؟“ شوشو مسکرائی ”سمندر کی تہہ میں جہاں جل پریوں کا راج ہے۔۔۔کوہ قاف کے غاروں میں جہاں سینگوں والے جنگ رہتے ہیں“

چند لمحات کے لیے ایک پر اسرار سکوت طاری رہا اس کے بعد شوشو پھر بولی” کہاں لے گئے ہیں؟۔۔۔۔۔۔لے گئے ہوں گے اپنے اپنے کمروں میں“

”بے چاریوں کو نیند کیسے آئے گی؟“ ایک لڑکی جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اور جس کا نام میں نہیں جانتا تھا اپنا اندیشہ بیان کیا۔

شوشو کہنے لگی ”بے چاریاں۔۔۔۔۔کوئی ذرا ان کے دل سے جا کر پوچھے کہ ان کی آنکھیں اس رت جگے کے لیے کتنی بے قرار تھیں“

”تو بہت خوش ہوں گی؟“

”اور کیا؟“

”پر میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ بہت ستایا کرتے ہیں؟“ عفت سوشیلا کے پاس سرک آئی

”میں پوچھتی ہوں تمہیں اندیشہ کس بات کا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔جب تمہارے وہ ستانے لگیں گے تو نہ ستانے دینا انہیں۔۔۔۔ہاتھ پیر باندھ دینا ان کے۔۔۔۔ابھی سے فکر میں کیوں گھلی جا رہی ہو“

”ہائیں ہائیں“ عفت نے تیزی سے کہا ”تم کیسی باتیں کر رہی ہو شوشو، دیکھو میرا دل کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے؟“ عفت نے سوشیلا کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دل

کے مقام پر رکھ دیا۔ ''کیوں؟''

شوشو نے عفت کے دل کی دھڑکنیں غور سے سنیں اور بڑے پر اسرار لہجے میں کہا ''جانتی ہو کیا کہہ رہا ہے؟''

عفت نے جواب دیا ''نہیں تو؟''

''یہ کہتا ہے عفت بانو غزنوی دلہن بننا چاہتی ہے''

''ہٹاؤ جی۔۔۔اج تو نہیں آتی تمہیں'' عفت نے مسکرا کر کروٹ بدلی ''دل اپنا چاہتا ہے تمہارا اور خواہ مخواہ یہ سب کچھ میرے سر منڈھ رہی ہو'' پھر یکایک اٹھ کھڑی ہوئی اور سوشیلا سے پوچھنے لگی ''ہاں۔۔۔۔۔یہ تو بتاؤ شوشو! تم بھلا کیسے آدمی سے شادی کرنا پسند کرو گی؟ میرے سر کی قسم! سچ سچ بتاؤ، مجھی کو ہائے ہائے کرو اگر جھوٹ بولو''

''میں کیوں بتاؤں'' یہ کہہ کر سوشیلا نے تیزی سے اپنے سر کو حرکت دی اور اس کا چہرہ نگاہوں سے پوشیدہ تھا سامنے آ گیا، میں نے غور سے دیکھا وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوئی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے سر کے چند پریشان بال برقی روشنی سے منور فضا میں ناچ رہے تھے چہرے کا گندمی رنگ نکھرا ہوا تھا اور سینہ جس پر سے ساڑھی کا پلو نیچے ڈھلک رہا تھا ہولے ہولے دھڑک رہا تھا چوڑے ماتھے پر سرخ بندیا بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔

عفت نے اصرار کیا ''تمہیں میرے سر کی قسم بتاؤ''

شوشو نے کہا ''پہلے تم بتاؤ''

''تو سنو۔۔۔۔۔۔مگر کسی سے کہو گی تو نہیں'' یہ کہہ کر عفت کچھ شرما سی گئی''

میں چاہتی ہوں۔۔۔میں چاہتی ہوں کہ میری شادی ایک ایسے نوجوان سے ہو۔۔۔ایسے۔۔۔۔۔''

شوشو بولی ''تو یہ اب کہہ بھی دو''

عفت نے پیشانی پر سے بال ہٹائے اور کہا ''ہاں۔۔۔۔۔ایسے نوجوان سے ہو جس کا قد لمبا ہو جسم بڑے بھائی کی طرح سڈول ہو انگلینڈ ریٹرنڈ ہو انگریزی فر فر بولتا ہو۔۔۔۔رنگ گورا اور نقش تیکھے ہوں موٹر چلانا جانتا ہو اور بیڈ منٹن بھی کھیلتا ہو''

شوشو نے پوچھا ''بس کہہ چکیں؟''

''ہاں۔۔۔۔'' عفت نے نیم وا لبوں سے سوشیلا کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا

''میری دعا ہے کہ پرماتما تمہیں ایسا ہی پتی عطا فرمائیں'' سوشیلا کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا اور لہجہ ایسا تھا جیسے مندر میں کوئی مقدس منتر پڑھ رہی ہے۔

وہ لڑکی جو اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی تھی بولی ''عفت! اب شوشو کی باری ہے''

عفت جو شوشو کی ساڑھی کا ایک کنارہ پکڑ کر اپنی انگلی کے گرد لپیٹ رہی تھی کہنے لگی ''بھئی اب تم بتاؤ ہم نے تو اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی۔''

شوشو نے جواب دیا ''دن کے کیا کرو گی؟۔۔۔۔۔میرے خیالات تم سے بالکل مختلف ہیں۔''

''مختلف ہوں یا ملتے ہوں، پر ہم سنے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں ۔۔۔۔۔۔'' سوشیلا نے چھت کی طرف دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی ''میں ۔۔۔۔ پر تم مذاق اڑاؤ گی عفت!''

''ارے ۔۔۔۔۔ تم سناؤ تو؟''

سوشیلا نے ایک آہ بھری'' میرے سپنے عجیب و غریب ہیں عفت ۔۔۔۔۔۔ یہ میرے دماغ میں صابن کے رنگ برنگے بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے ناچ کر غائب ہو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ میں سوچتی ہوں ۔۔۔۔۔ اور پھر سوچتی ہوں کہ میں کیوں سوچا کرتی ہوں انسان جو کچھ چاہتا ہے اگر ہو جایا کرے تو کتنی اچھی بات ہے ۔۔۔۔ لیکن پھر زندگی میں کیا رہ جائے گی ۔۔۔۔۔۔ خواہشیں اور تمنائیں کہاں سے پیدا ہوں گی ۔۔۔۔ ہم جس طرح جی رہے ہیں ٹھیک ہے جانتی ہوں کہ جو کچھ مانگ رہی ہوں نہیں ملے گا مگر دل میں مانگ تو رہے گی کیا زندہ رہنے کے لیے یہی کافی نہیں؟''

عفت اور دوسری لڑکی خاموش بیٹھی تھیں

شوشو نے پھر کہنا شروع کیا'' میں اپنا جیون ساتھی ایک ایسے نوجوان کو بنانا چاہتی ہوں جو صرف عمر کے لحاظ سے ہی جوان نہ ہو بلکہ اس کا دل، اس کا دماغ ۔۔۔۔ اس کا رواں رواں جوان ہو ۔۔۔۔۔ وہ شاعر ہو ۔۔۔۔۔ میں شکل و صورت کی قائل نہیں ۔۔۔۔۔۔ مجھے شاعر چاہیے جو میری محبت میں گرفتار ہو کر سرتاپا محبت بن جائے جس کو میری ہر بات میں حسن نظر آئے ۔۔۔۔۔ جس

کے ہر شعر میں میری اور صرف میری تصویر ہو۔۔۔۔۔جو میری محبت کی گہرائیوں میں گم ہو جائے میں اسے ان تمام چیزوں کے بدلے میں اپنی نسوانیت کا وہ تحفہ دوں گی جو آج تک کوئی عورت نہ دے سکی۔''

وہ خاموش ہوگئی عفت حیرت کے مارے اس کا منہ تکنے لگی اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوشیا کی گفتگو کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی میں خود متحیر تھا کہ پندرہ سولہ برس کی اس دبلی پتلی لڑکی کے سینے میں کیسے کیسے خیالات کروٹیں لے رہے ہیں اس کا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔

''اگر وہ مجھے نظر آ جائے'' یہ کہہ کر سوشیا آگے بڑھی اور عفت کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی ''تو میں اس کے استقبال کے لیے بڑھوں اور اس کے ہونٹوں پر وہ بوسہ دوں جو ایک زمانے سے میرے ہونٹوں کے نیچے جل رہا ہے۔''

اور شو شو نے عفت کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں پر ہونٹ جما دیئے۔۔۔۔۔اور دیر تک ان کو جمائے رکھا تعجب ہے کہ عفت بالکل ساکت بیٹھی رہی اور معترض نہ ہوئی۔

جب دونوں کے لب ایک مدھم آواز کے ساتھ جدا ہوئے اور ان کے چہرے مجھے نظر آئے تو ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھنے میں آیا جس کو الفاظ بیان ہی نہیں کر سکتے عفت اس شہد کی مکھی کی طرح مسرور و متعجب معلوم ہوتی تھی جس نے پہلی مرتبہ پھول کی نازک پتیوں میں بیٹھ کر اس کا رس چوسنے کی لذت محسوس کی ہو۔۔۔۔اور سوشیا۔۔۔۔۔وہ اور زیادہ پراسرار ہوگئی تھی۔

”آؤ اب سوئیں“

یہ خواب آلود اور دھیمی آواز عفت کی تھی اس کے ساتھ ہی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دی اور میں خیالات کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا۔

گندمی رنگ کی ننھی سی گڑیا، اپنے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے انوکھے خیالات کی پرورش کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔اور وہ کون سا تحفہ اپنے دامن نسوانیت میں چھپائے بیٹھی تھی جو آج تک کوئی عورت مرد کو پیش نہیں کر سکی؟

میں نے سوراخ میں سے دیکھے شوشو اور عفت دونوں ایک دوسری کے گلے میں باہیں ڈالی سو رہی تھیں شوشو کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے سانس سے ان میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا وہ کس قدر تر و تازہ معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔واقعی وہ اس قابل تھی کہ اس پر شعر کہے جائیں۔۔۔۔۔۔لیکن عباس تو شاعر نہیں تھا؟ پھر۔۔۔۔۔۔پھر۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

شہ نشین پر

وہ سفید سلمہ لگی ساڑھی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے ساڑھی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جب جگہ جگہ سلمہ کا کام ٹمٹمانے لگتا تو مجھے اپنا جسم پر وہ ٹمٹماہٹیں گدگدی کرتی محسوس ہوتیں ۔۔۔۔۔۔وہ خود ایک عرصے میرے لیے گدگدی بنی ہوئی تھی۔

میں اس کو تقریباً دو سو مرتبہ دیکھ چکا ہوں اور ان تمام درشنوں کے نقوش علیحدہ علیحدہ میرے دل و دماغ میں مرتسم ہیں ایک بار میں نے اسے صحن میں تیتری کے پیچھے دوڑتے دیکھا تھا ایک لمحے کے لیے وہ میری نگاہوں کے سامنے آئی اور گزر گئی اور جب کبھی میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے دل میں ایک ایسے پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے جو ڈر کر ایکا ایکی اڑ جائے اسی طرح ایک روز میں نے اسے اسی شہ نشین پر دھوپ میں اپنے گیلے بال جھٹکتے دیکھا تھا اور اب میں جس وقت اس تصویر کو اپنے ذہن کے پردے پر کھینچتا ہوں تو مجھے کبھی سیاہی نظر آتی ہے اور کبھی اجالا۔

میں اس کو اتنا دیکھ چکا ہوں کہ اب میں اس کے سامنے آئے بغیر اسے جب چاہوں دیکھ سکتا ہوں پہلے پہل مجھے اس کام میں دقت محسوس ہوتی تھی مگر اب کوئی مشکل پیش نہیں آتی ابھی کل شام کو جب مجھے ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو میں نے آنکھیں بند کیے بغیر اسے اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔وہ ہو بہو ویسی تھی جیسی کہ وہ ہے اور اس بات کا نہ میرے دوست کو پتہ

چلا اور نہ اس کی بہن کو جو میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی میں نے ایک لمحے کے لیے اسے اپنے ذہن کی ڈبیا میں سے نکال کر دیکھا اور فوراً ہی وہیں بند کر دیا کسی کو معلوم تک نہ ہوا کہ میں نے کیا کر دیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد میں نے یوں سلسلہ کلام شروع کیا گویا میرا ذہن ایک لمحے کے لئے بھی غیر حاضر نہ ہوا تھا ''جی ہاں سوکھی ہوئی مچھلیوں سے سخت بو آتی ہے نہ جانے یہ لوگ انہیں کھاتے کس طرح ہیں میری تو ناک۔۔۔'' اور اس کے بعد مختلف قسم کی ناکوں پر گفتگو شروع ہو گئی تھی۔

اس کی ناک مجھے بہت پسند ہے میرے پاس ہلکے گلابی رنگ کا ٹی سیٹ ہے جو مجھے صرف اس لیے عزیز ہے کہ اس کی پیالیوں کی ڈنڈی اس کی ناک سے ملتی جلتی ہے آپ ہنسیں گے مگر ایک روز صبح کو جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو میرے دل میں عجیب وغریب خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی ناک پکڑ کر اس کے ہونٹوں کا رس پی لوں۔

اس کے ہونٹ مجھے پیارے لگتے تھے شاید اس لیے کہ وہ ہر وقت نم آلود رہتے تھے یہ نمی ان میں سنگترے کی لڑیوں کی مانند چمک پیدا کر دیتی تھی ان کے چومنے کی خواہش اگر میرے دل میں پیدا ہوئی تھی تو اس کا باعث یہ نہ تھا کہ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور لوگوں سے سنا تھا کہ عورتوں کے ہونٹ چومے جاتے ہیں، نہیں۔۔۔۔۔۔اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا تو بھی میرے دل میں ان کو چومنے کی خواہش پیدا ہوتی اس کے ہونٹ ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ وہ ایک نامکمل بوسہ معلوم ہوتے تھے۔

وہ میرے ہمسائے ڈاکٹر کی اکلوتی بیٹی تھی سارا دن وہ نیچے اپنے باپ کی

ڈسپنسری میں بیٹھی رہتی کبھی کبھی جب میں اسے بازار سے گزرتے ہوئے شیشوں میں دوائیوں کی الماری کے پاس کھڑی دیکھتا تو مجھے وہ ایک لمبی گردن والی بوتل دکھائی دیتی جس میں کوئی خوش رنگ سیال مادہ ابل رہا ہو ایک روز میں ڈسپنسری میں ڈاکٹر صاحب سے دوا لینے کے لیے گیا مجھے زکام کی شکایت تھی ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا "بیٹا ان کے رومال پر یوکلپٹس آئل کے چند قطرے ٹپکا دو۔"

اس نے میرا رومال لیا اور الماری میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر دوا کے قطرے ٹپکانے لگی۔ اس وقت میرے جی میں آئی کہ اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لوں اور کہوں اس شیشی کو بند کر دیجئے اگر آپ اپنی آنکھوں کا ایک آنسو مجھے عنایت فرما دیں تو میری بہت سی بیماریاں دور ہو جائیں لیکن میں خاموش بیٹھا دوا کے ان سفید قطروں کی طرف دیکھتا رہا جو میرے رومال میں جذب ہو رہے تھے۔

جب سے میں نے اسے دیکھنا شروع کیا ہے میری دلی خواہش رہی ہے کہ وہ روئے اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھوں۔ میں نے تصور میں کئی مرتبہ اس کی آنکھوں کو غمناک دیکھا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں اسے سچ مچ روتا دیکھنا چاہتا ہوں اس کی گھنی پلکوں میں پھنسے ہوئے آنسو بہت اچھے معلوم ہوں گے چھت پر سے جب بارش کے قطرے رک رک کر نیچے پھسل رہے ہوں تو کتنے دلفریب دکھائی دیا کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ عورت کی آنکھوں میں آپ آنسو ضروری خیال نہ کریں پر میں آنسوؤں کو ہٹا کر عورت کی آنکھوں کا تصور ہی نہیں کر سکتا آنسو آنکھوں کا پسینہ ہے مزدور کی پیشانی صرف اسی صورت میں مزدور کی پیشانی ہو سکتی ہے جب اس پر

پسینے کے قطرے چمک رہے ہوں اور عورت کی آنکھ صرف اسی صورت میں عورت کی آنکھیں ہوسکتی ہیں جب آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہوں۔

وہ سفید سلمہ لگی ساڑھی میں شہ نشین پر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نقرئی تاروں والا انار چھوڑ دیا ہے ساڑھی کے تھرکتے ہوئے ریشمی کپڑے پر جگہ جگہ سلمے کا کام ٹمٹمار ہا تھا اور مجھے اپنے جسم پر گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی اس نے ایکا ایکی پلٹ کر میری طرف دیکھا گویا اس کو فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے علاوہ رات کی خاموشی میں کوٹھے پر کوئی اور متنفس بھی ہے۔۔۔اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔اس کی آنکھیں دو موتی رول رہی تھیں۔۔۔۔۔وہ رو رہی تھی وہ۔۔۔۔وہ رو رہی تھی۔۔۔۔۔۔میرے دیکھتے ہی دیکھتے اور قبل اس کے کہ میں کچھ کر سکوں، اس کی آنکھوں سے اس کے شباب کے پہلے پسینے کے قطرے چھلکے اور سنگین فرش پر پھیل گئے وہ میری خلل انداز نگاہوں کی تاب نہ لا سکے وہ دراصل چپ چاپ دوسروں کو خبر کیے بغیر نوزائیدہ بچوں کی مانند تھوڑی دیر ان دو نرم و نازک پنگھوروں میں لیٹے رہنا چاہتے تھے، مگر میری نگاہوں کے شور سے وہ مچل گئے وہ رو رہی تھی پر میں خوش تھا اس کی نم آلود آنکھیں کہرے میں لپٹی ہوئی جھیلیں معلوم ہوتی تھیں بڑی پراسرار، بڑی فکر خیز، پانی کی پتلی سی تہہ کے نیچے اس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی، ان ننھی ننھی مچھلیوں کی مانند جھلملا رہی تھی جو پانی کے اوپر آنے سے ڈرتی ہوں۔

میں نے اس کو دیکھنا چھوڑ کر اس کی آنکھوں کو دیکھنا شروع کر دیا جس طرح دسمبر کی سرد اور گیلی رات میں کھلی فضا کے اندر دو دیئے جل رہے ہوں اس کی

آنکھیں دور سے بہت دور سے مجھے دیکھتی رہیں میں نے ان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔۔۔ دو آنسو بڑے گھنی پلکوں میں تھوڑی دیر پھنسے رہے پھر آہستہ آہستہ اس کے زرد گالوں پر ڈھلک گئے داہنی آنکھ میں ایک آنسو بنا۔ باہر نکلا۔۔۔ گال کی ہڈی پر تھوڑی دیر کے لیے اس مسافر کی طرح جس کی منزل بالکل قریب ہو ایک لمحلے کے لیے ستایا اور پھسل کر تیزی سے اس کے لبوں کے ایک گوشے کے قریب سے ہو کر آگے دوڑنے والا ہی تھا کہ ہونٹوں کی نمی نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ ایک پتلی سی دھار بن کر پھیل گیا ڈھلی ہوئی آنکھوں سے اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ جانتی تھی کہ میں کون ہوں اور یہ پوچھتے ہوئے کہ میں کون ہوں وہ میرے بارے میں کچھ دریافت نہ کر رہی تھی بلکہ وہ پوچھ رہی تھی کہ وہ خود کون ہے میں نے جواب دیا "تم شیلا ہو؟"

اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ ایک خفیف ارتعاش کے ساتھ کھلے اور سسکیوں میں کہنے لگی "شیلا۔۔۔۔ شیلا۔۔۔۔ شی" وہ شہ نشین پر بیٹھ گئی وہ تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن ایکا ایکی اسے کچھ خیال آیا اور جو خواب وہ دیکھ رہی تھی اسے اپنے دماغ سے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔۔۔" میں۔۔۔ میں کیا کہہ رہی تھی؟۔۔۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ میں اچھی ہوں۔۔۔۔۔ اور میں یہاں کیسے چلی آئی؟"

میں نے اسے بڑے تسلی آمیز لہجے میں کہا "گھبراؤ نہیں شیلا۔۔۔۔ تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔۔۔۔ ایسی باتیں نہ کہی جاتی ہیں اور نہ سنی جاتی ہیں"

شیلا نے اس انداز سے میری جانب دیکھا گویا میں نے اس کو کوئی چوری پکڑ لی ہے ''کیسی باتیں؟۔۔۔۔کیسی باتیں؟۔۔۔کوئی بات بھی تو ہو''

میں نے اس سے کہا ''پرسوں جب تم نیچے ڈسپنسری میں لال لال جیب نکال کر طوطے سے کھیل رہی تھیں اور تمہاری بلوریں انگلیاں بوتلوں سے ٹکرا کر ایک عجیب قسم کی جھنکار پیدا کر رہی تھی اس وقت تم ایک نامکمل عورت تھیں، پر آج جب کہ تمہاری آنکھیں رو رہی ہیں تم مکمل عورت بن گئی ہو کیا تمہیں یہ فرق محسوس نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے، وہ چیز جو کل تھی آج تم میں نہیں ہے اور جو آج ہے کل نہ رہے گی پر وہ داغ جو مسرت کا گرم لوہا تمہارے دل پر لگا گیا ہے ہمیشہ ویسے کا ویسا رہے گا۔۔۔۔یہ کتنی اچھی بات ہے۔۔۔۔تمہاری زندگی میں ایک ایسی چیز تو ہوگی جو ساری کی ساری تمہاری ہوگی۔۔۔۔ایک ایسی چیز جس کی ملکیت پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا کاش میرا دل تمہارا دل ہوتا۔۔۔۔کسی عورت کا دل ہوتا۔۔۔۔جو ایک ہی داغ کو کافی سمجھتا ہے۔۔۔۔عورت کے دل کی آبادی میں کئی ویرانے سما سکتے ہیں۔۔۔۔۔ویرانوں کا یہ ہجوم بجائے خود ایک آبادی ہے۔۔۔تم خوش قسمت ہو۔۔۔۔۔وہ دن جس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑتا تم نے بہت جلد دیکھ لیا۔۔۔۔تم خوش قسمت ہو۔''

وہ میری طرف اس مرغی کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی جس نے پہلی بار انڈا دیا ہو وہ اپنے کو ٹٹولنے لگی ''خوش قسمت!۔۔۔۔میں خوش قسمت۔۔۔۔۔وہ کیسے؟۔۔۔۔آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

میں نے جواب دیا ''جب پتنگ کٹ جائے اور کوٹھوں پر چڑھے ہوئے

لونڈے ڈور لوٹنے کے لئے شور مچانا شروع کر دیں تو کسی کے بتانے کی حاجت نہیں رہتی۔۔۔۔کہ پتنگ کٹ گیا ہے۔۔۔۔۔۔جو پتنگ تم نے ہوا کی بلندیوں میں اڑایا تھا کہاں ہے؟۔۔۔کل تک اس کی ڈور تمہارے ہاتھ میں تھی، پر آج نظر نہیں آتی۔"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے

"میں خوش قسمت ہوں" آنسوؤں میں بھیگے ہوئے لفظ اس کے منہ سے نکلے"میں خوش قسمت ہوں۔۔۔۔۔آپ ان لونڈوں سے جو ڈور لوٹنے کے لئے کوٹھوں پر چڑھے رہتے ہیں کم شور نہیں مچا رہے۔"

آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے اس نے میری طرف اس بارش میں سے دیکھا اور کہا" میری آنکھوں سے آنسو نکال کر آپ کس کا حلق تر کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔میں سب جانتی ہوں یہ سوئیاں آپ مجھے کیوں چبھو رہے ہیں۔"

اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اس کی عقل اس وقت اس چاقو کے پھل کی مانند تھی جسے ضرورت سے زیادہ سان پر لگایا گیا ہو۔

میں نے اس سے بڑے اطمینان سے کہا"جو کچھ ہو چکا ہے اس کا مجھے علم ہے اور اگر اس وقت میں تم سے یہ سب کچھ بھول جانے کے لیے کہتا تم سے مصنوعی الفاظ میں ہمدردی کرتا مداریوں کے مانند ایک ہاتھ میں تمہارا سارا غم لے کر چھو منتر کے ذریعے سے غائب کر دیتا تو تم یقیناً مجھے اپنا دوست مانتیں، پر میں ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔دل تمہارا ہے اور جو اس پر گزرا ہے وہ بھی تمہارا ہے، میں کیوں تمہارے دل کو دولت سے محروم کروں، کیوں تمہیں اس درد کو بھول جانے کے لئے

کہوں جو تمہارا سرمایہ حیات ہے۔ اس درد پر، اسی دکھ دینے والے واقعہ پر جو بیت چکا ہے تمہیں اپنی زندگی کے آنے والے دنوں کی بنیادیں استوار کرنا ہوں گی۔۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا شیلا، پر اگر تم چاہتی ہو تو تمہاری تسکین کے لیے میں یہ بھی کر سکتا ہوں بولو میں کیا کہوں؟''

یہ سن کر اس نے تیزی سے کہا ''مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں؟''

''میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ ایسے حالات میں کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔۔۔۔ آگ کے اندر کودنے والے کھیل میں ہدایت دینے والے کی کیا ضرورت؟۔۔۔ پریم کی ارتھی کو دوسرے کے کاندھوں سے کیا سروکار، یہ لاش تو زندگی بھر ہمیں اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے پھرنا ہوگی۔۔۔''

وہ بیچ میں بول اٹھی'' اٹھاؤں گی۔۔۔۔۔۔ آپ کو اس بات سے کیا۔۔۔ ایسی ایسی بھیانک باتیں سنا کر آپ مجھے کس لیے ڈرانا چاہتے ہیں۔۔۔ میں نے اس سے محبت کی۔۔۔ اور کیا میں اب بھی اس سے محبت نہیں کرتی۔۔۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرے ساتھ فریب کیا ہے پر یہ فریب، یہ دھوکا بھی تو اسی نے دیا ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں۔۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے مجھے کہیں کا نہیں رکھا لیکن پھر کیا ہوا۔۔۔ میں ایک بازی کھیلی اور ہار گئی۔۔۔۔ آپ مجھے ڈرانا چاہتے ہیں مجھے طعنے دینا چاہتے ہیں۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔۔ جسے اب موت تک کی پروا نہیں رہی۔۔۔۔ میں نے موت کا نام لیا ہے اور۔۔۔۔۔۔ اور دیکھئے آپ کے بدن پر کپکپی دوڑ گئی ہے، آپ موت سے ڈرتے ہیں مگر میری

طرف دیکھیے، میں موت سے نہیں ڈرتی۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے لبوں پر ایک زبردستی کی مسکراہٹ ناچ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی پتلی تہہ کے نیچے ایک عجیب قسم کی روشنی جھلملا رہی تھی اور وہ خود کانپ رہی تھی ہولے ہولے۔

میں نے اس کو دوبارہ غور سے دیکھا اور کہا ''میں موت سے ڈرتا ہوں اس لیے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تم موت سے نہیں ڈرتی، اس لیے کہ تمہیں زندہ رہنا نہیں آتا جو شخص زندہ رہنے کا سلیقہ نہیں جانتا اس کے لیے زندہ رہنا بھی موت کے برابر ہے۔۔۔۔اگر تم مرنا چاہتی ہو تو بڑے شوق سے مر جاؤ''

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی میں نے کہنا شروع کیا ''تم مرنا چاہتی ہو اس لیے کہ تم سمجھتی ہو کہ دکھ کے اس پہاڑ کا بوجھ جو ایکا ایکی تم پر ٹوٹ پڑا ہے تم سے نہ اٹھایا جائے گا۔۔۔۔یہ غلط ہے۔۔۔۔جب تم محبت کرنے کی طاقت رکھتی ہو، تو اس کی شکست کے صدمے برداشت کرنے کی بھی قوت رکھتی ہو۔۔۔۔۔۔وہ لذت، وہ حظ، وہ مسرت جو تم نے اس سے محبت کر کے حاصل کی، تمہاری زندگی کا عرق ہے اسے سنبھال کر رکھو اور باقی تمام عمر ان چند گھنٹوں پر بسر کرو۔۔۔۔۔وہ مرد جس سے تم نے محبت کی، اتنا ضروری، اتنا اہم نہیں ہے، جتنی کہ تمہاری محبت ہے، جو اس سے تم کو ہے۔۔۔۔اس مرد کو بھول جاؤ لیکن اپنی محبت کو یاد رکھو اس کی یاد پر جیو۔۔۔ان لمحات کی یاد پر جن کو حاصل کرنے کے لیے تم نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے توڑ ڈالی۔۔۔۔کیا تم ان لمحات کو بھول سکتی ہو، جس کی قیمت میں تم نے ایک بیش بہا موتی دیا ہے۔۔۔۔۔ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔مرد

ایسے لمحات کو بھول سکتا ہے بھول جاتا ہے اس لیے کہ اسے کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی۔۔۔۔۔۔ پر عورتیں نہیں بھول سکتیں، جنہیں چند گھڑیوں کی فرصت کے لیے اپنی ساری زندگی چکنا چور کر دینا پڑتی ہے۔۔۔۔ تم مرنا چاہتی ہو۔۔۔۔ کیا تم اس سرائے میں اتنے مہنگے داموں پر کمرہ اٹھا کر بھی اس کو چھوڑ دینا چاہتی ہو۔۔۔۔ زندہ رہو نہیں نہیں اس زندگی کو استعمال کرو ہمیں مرنا ضرور ہے اسی لیے تو زندہ رہنا بھی ضروری ہے۔''

میری باتوں نے اس پر تکان سی طاری کر دی وہ نڈھال ہو کر شہ نشین پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی ''میں تھک گئی ہوں۔۔۔۔''

''جاؤ، سو جاؤ۔۔۔۔۔۔ آرام کرو اور دوسری مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود میں ہمت پیدا کرو۔۔۔۔'' یہ کہہ کر میں چلنے ہی کو تھا کہ مجھے دفعتاً ایک خیال آیا اور اس خیال کے آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میں نے سوچا اگر اس نے اپنے آپ کو مار لیا تو۔۔۔۔ اور یہ سوچتے ہوئے مجھے یہ خدشہ پیدا ہوا کہ مجھ میں ایک چیز کی کمی ہو جائے گی چنانچہ میں پلٹا اور اس کے قریب جا کر اس سے التجائیہ لہجے میں کہا ''شیلا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔''

شیلا نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا

''دیکھو شیلا! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ خودکشی کے خیال سے باز آ جاؤ۔۔۔۔۔ تم زندہ رہو ضرور زندہ رہو''

اس نے میری بات سنی اور پوچھا ''کیوں؟''

''کیوں؟۔۔۔۔۔ یہ تم مجھ سے کیوں پوچھتی ہو شیلا! تمہارا دل اچھی طرح

جانتا ہے کہ میں تم سے یہ التجا کیوں کر رہا ہوں۔۔۔چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ مجھے اپنے آپ سے کوئی شکایت ہے۔۔۔۔بات یہ ہے کہ میں نے جو چیز شروع کی تھی اب اسے اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔میں خودغرض کیوں۔۔۔۔ہر انسان خودغرض ہے۔۔۔۔ میں تم سے التجا کر رہا ہوں کہ تم نہ مرو، جیو۔۔۔۔۔یہ خودغرضی ہے۔۔۔۔تم زندہ رہو گی تو میری محبت جوان رہے گی۔۔۔۔۔تمہاری زندگی کے ہر دور کے ساتھ میں اپنی محبت کو وابستہ دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔پر تمہاری اجازت سے“

وہ دیر تک سوچتی رہی وہ اب زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا ”مجھے زندہ رہنا ہوگا“

اس کے دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے اس تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں نیچے اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

قاسم

باورچی خانہ کی مٹ میلی فضا میں بجلی کا اندھا سا بلب کمزور روشنی پھیلا رہا تھا سٹوو پر پانی سے بھری ہوئی کیتلی دھری تھی پانی کا کھولاؤ اور سٹوو کے حلق سے نکلتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں راکھ میں سوگئی تھیں دور کونے میں قاسم گیارہ برس کا لڑکا برتن مانجھنے میں مصروف تھا یہ ریلوے انسپکٹر صاحب کا بوائے تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکلے رہے تھے

"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!"

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام۔۔۔۔یہ کیوں کر ممکن تھا۔

سٹوو بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک جنبش دی اور "جی آیا صاحب!" گنگناتا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے پانی کے نل سے پانی کی بوندیں نیچے میلی سل پر لٹک رہی تھیں اور اداس آواز پیدا کر رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا

تھا کہ فضا پر غنودگی سی طاری ہے دفعتاً آواز بلند ہوئی

''قاسم۔۔۔قاسم!''

''جی آیا صاحب!'' لڑکا جوانہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا بھاگا بھاگا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا ''بیوقوف کے بچے آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔''

''ابھی لایا صاحب۔۔۔ابھی لایا صاحب!''

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اسی کمرے سے آواز آئی

''قاسم۔۔۔قاسم!''

''جی آیا صاحب!'' قاسم بھاگتا ہوا پھر اپنے آقا کے پاس گیا

''بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ بس بھاگے جاؤ سخت پیاس لگ رہی ہے''

''بہت اچھا صاحب!''

قاسم بھاگا بھاگا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

''اب تم جاؤ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟''

''ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!''

''برتن صاف کرنے کے بعد میرے دونوں کالے شو پالش کر دینا مگر دیکھنا

احتیاط رہے چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے ورنہ۔۔۔''

''قاسم کو''ورنہ'' کا جملہ بخوبی معلوم تھا''بہت اچھا صاحب کہہ کر وہ باورچی خانے میں چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیئے۔

اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں سر میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا تھا یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا

''جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!''

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا اب اسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غلبہ پا کے رہے گی پر ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں آیا''بھاڑ میں جائیں برتن اور چولہے میں جائیں شو۔۔۔کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں اور پھر چند لمحے آرام کرنے کے بعد۔۔۔''

اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آئی کہ ابلتا ہوا پانی سر پر انڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پا جائے۔۔۔مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے بھیجے تک کو پگھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے باقی ماندہ برتن

صاف کیے یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا اب وہ آرام سے سو سکتا تھا اور نیند۔۔۔۔۔ وہ نیند جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھا لیا اور لیٹ گیا اس سے پہلے کہ نیند اسے اپنے نرم نرم بازوؤں میں تھام لے اس کے کان "شوشو" کی آواز سے گونج اٹھے

"بہت اچھا صاحب! ابھی پالش کرتا ہوں" قاسم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا

ابھی قاسم شو کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اسے وہیں سلا دیا۔

سورج کی لال لال کرنیں مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں مگر قاسم سویا رہا جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جوتوں کے پاس سویا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کے جگاتے ہوئے کہا "یہ سور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے شو صاف کر لیے ہوں گے۔۔۔۔۔ نمک حرام!۔۔۔۔ اے قاسم"

"جی آیا صاحب!"

قاسم فوراً اٹھ بیٹھا ہاتھ میں جب اس نے پالش کرنے کا برش دیکھا اور رات کے اندھیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی تو اس کی جان خطا ہو گئی۔

"میں سو گیا تھا صاحب! مگر۔۔۔۔ مگر شو ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب!"

یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی پالش کرنا شروع کر دیا۔

پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر بند کیا اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

"قاسم!"

"جی آیا صاحب!"

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے اس لیے باورچی خانہ کے تمام برتن اچھی طرح صاف رکھنا فرش بھی دھلا ہوا ہونا چاہیے اس کے علاوہ تمہیں ڈرائنگ روم کی تصویریں، میزیں اور کرسیاں بھی صاف کرنا ہوں گی۔۔۔۔۔۔سمجھے خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار والا چاقو ہے، اسے مت چھیڑنا میں اب دفتر جا رہا ہوں مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے پہلے ہو جائے۔"

"بہت بہتر صاحب!"

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانہ کا سارا کام ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے وہ راکھ

اڑ اڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے یکا یک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں سرخ برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں زمین خون سے شرابور ہوگئی۔

قاسم دہشت زدہ ہو گیا اور اس وحشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر" جی آیا صاحب! جی آیا صاحب!" کہتا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے تصور میں ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے دفعتاً آندھی چلنے لگی جس کے ساتھ ہی ایک بد نما اور بھیانک دیو نمودار ہوا یہ دیوان سب لڑکوں کو نگل گیا قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا گو کہ قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔۔۔قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیا کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز صاف کرنے کے لیے بڑھا تو اسے خیال آیا" آج مہمان آرہے ہیں خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنا پڑیں گے نیند کمبخت پھر ستائے گی مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔"

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا اچانک اسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔۔۔۔وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا بہت تیز ہے، چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو

گئے ''چاقو تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم کر سکتا ہے۔''

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔۔۔۔اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور نیند۔۔۔۔۔پیاری نینداسے باآسانی نصیب ہوسکتی تھی۔

انگلی سے خون کی سرخ دھار بہہ رہی تھی سامنے والی دوات کے سامنے روشنائی سے کہیں چمکیلی قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ میں گنگنا رہا تھا ''نیند۔۔۔۔نیند۔۔۔۔۔۔پیاری نیند۔۔۔''

تھوڑی دیر بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنانخانہ میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی اور اپنی انگلی دکھا کر کہنے لگی ''دیکھئے بی بی جی!''

''ارے قاسم! یہ تو نے کیا کیا؟ کمبخت، صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہوگا تو نے؟''

قاسم مسکرا دیا ''بی بی جی! بس میز صاف کر رہا تھا کہ اس نے کاٹ کھایا''

''سو اب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں پر اب یہ تو بتا کہ آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟''

قاسم اپنی فتح پر جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا میز پر سے خون کے دھبے صاف کرنے کے بعد اس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا سامنے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا اس کی طرف دیکھ کر قاسم نے مسرت بھرے لہجہ میں کہا ''اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے اور ضرور صاف کرنے ہوں گے کیوں

میاں مٹھو؟''

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا انسپکٹر صاحب قاسم کی انگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر اسے گالیاں دیں مگر اسے مجبور نہ کر سکے۔۔۔شاید اس وجہ سے کہ ایک بار ان کی اپنی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے پر بہت درد ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرت نے بھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا اپنے بستر پر جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا۔۔۔اب وہی مصیبت پھر نمودار ہوگئی۔

''قاسم۔۔۔۔۔۔صاحب کی جرابیں اور قمیض دھو ڈالو''

''بہت اچھا بی بی جی!''

''قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے پانی لا کر ابھی صاف کرو دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے۔''

''بہت اچھا صاحب!''

''قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں انہیں نمک سے ابھی ابھی صاف کرو۔''

''ابھی کرتا ہوں بی بی جی!''

''قاسم! ابھی بھنگن آرہی ہے تم پانی ڈالتے جانا وہ سیڑھیاں دھو ڈالے گی''

''بہت اچھا صاحب!''

''قاسم ذرا بھاگ کر ایک آنہ کا دہی تو لے آنا''

’’ابھی چلا بی بی جی!‘‘

پانچ چھ روز اس قسم کے احکام سننے میں گزر گئے قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا پھر بھی علی الصبح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کا ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھا اور ایک لمحہ کے بعد اس کی انگلی سے خون بہنے لگا انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی اس حرکت پر سخت خفا ہوئے چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا مگر قاسم خوش تھا ’’ایک وقت روٹی نہ ملی انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مل گئی یہ سودا کیا برا ہے۔‘‘

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا اب پھر کام کی وہی بھر مار تھی پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے اس عرصہ میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا تھا اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانے میں رہنا پڑا کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی کوئلے سلگاتا، غرض صبح سے لے کر شام تک اس کے کانوں میں ’’اے قاسم یہ کر! اے قاسم وہ کر!‘‘ کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا۔۔۔۔ قاسم کی ننھی سی جان اور ہمت جواب دے گئی مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی تھیں الماری صاف کرتے وقت اسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا بلیڈ پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا دھار تھی بہت تیز انگلی میں دور تک چلی گئی جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا بھاگا ہوا انسپکٹر صاحب کی بیوی کے پاس گیا

''بی بی جی! میری انگلی میں صاحب کا استرا لگ گیا ہے''

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً معاملے کو سمجھ گئی چپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا'' قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں بی بی جی!''

''یہ صاحب سے پوچھنا''

''صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔''

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے لوٹے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

''کیوں میاں یہ انگلی ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی؟''

قاسم خاموش کھڑا رہا

''تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکا دیا جا سکتا ہے

اپنا بوریا بستر دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ ہمیں تم جیسے نوکروں کی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔"

"مگر۔۔۔۔۔مگر صاحب!"

"صاحب کا بچہ۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا"

قاسم کا افسوس نہ ہوا بلکہ اسے خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لیے چھٹی مل گئی گھر سے نکل کر وہ اپنی زخمی انگلی سے بے پروا سیدھا چوپاٹی پہنچا، اور وہاں ساحل کے پاس ایک بینچ پر لیٹ گیا اور خوب سویا۔

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم بد احتیاطی کے باعث سیپٹک ہو گیا سارا ہاتھ سوج گیا جس دوست کے پاس وہ ٹھہرا تھا اس نے اپنی دانست کے مطابق اس کا بہتیرا علاج کیا مگر تکلیف بڑھتی گئی آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہو گیا جہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹنڈ منڈ ہاتھ بڑھا کر فلورا فاؤنٹن کے پاس لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اسے وہ بلیڈ یاد آ جاتا ہے جس نے اسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے اس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا بھبھکا ہے جس کو کبھی نہیں مانجھتا اس لیے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آ جاتے تھے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

قبض

نئے لکھے ہوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا ایکٹر اور ڈائریکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لیے کہ اسٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا کیونکہ شوٹنگ کے دوران جب ایکا ایکی اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی تو کئی کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور میں ستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگوں سمیت بیٹھا تھا وہ یوں کہ میری دونوں ٹانگیں کرسی کی نشست پر تھیں اور میرا بوجھ نشست کی بجائے ان پر تھا میری اس عادت پر بہت لوگوں کو اعتراض ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

مینا جس کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں ڈائریکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا

”صاحب! وہ بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے پھر شور بند ہو جائے گا“

یہ روز مرہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور ان پر ٹھپے لگتے رہیں گے چنانچہ ڈائریکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔

سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑی تھیں ان کا درمیانی

فاصلہ اصلی فاصلے سے کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا اور گیروے رنگ کے تھری پلائی وڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے پست قد دکھائی دیتے تھے میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی ''السلام علیکم'' میں نے جواب دیا ''وعلیکم السلام'' اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی میری آنکھوں میں ''تم کون ہو؟'' کا سوال تیرنے لگا آدمی ہوشیار تھا، فوراً کہنے لگا ''جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں۔۔۔۔ میرا نام عبدالرحمٰن ہے خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں۔۔۔۔ آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے۔''

میں نے کہا ''جی نہیں۔۔۔۔۔ میں پنجاب کا باشندہ ہوں''

عبدالرحمٰن نے جیب سے عینک نکالی'' معاف فرمائیے گا، چونکہ ڈائریکٹر صاحب نے عینک اتار دینے کا حکم دیا تھا اس لیے۔۔۔''

اس دوران میں نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا ''واللہ! میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں، یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں۔۔۔۔ ماشاء اللہ کیا مکالمہ لکھا ہے۔۔۔۔ قلم توڑ دیا ہے واللہ۔۔۔۔ یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے؟''

عبدالرحمٰن نے جب یہ باتیں کیں تو اس کا قد بھی میری نظر میں تھری پلائی وڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا میں نے روکھے پن کے ساتھ کہا ''جی نہیں''

وہ اور زیادہ چپکیا ہو گیا ''عجیب زمانہ ہے صاحب، جو اہلیتوں کے مالک ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔۔۔۔ یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا عجب اوٹ پٹانگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ، پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہو گئے

ہیں مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں ۔۔۔۔۔آج آپ سے ملاقات ہو گئی ۔۔۔۔‘‘اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ سے مل کر اس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں جو چہرے پر لگاتے وقت اس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف ’’جی ہاں‘‘ کر دیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور روا روی میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظر ثانی شروع کر دی چند غلطیاں تھیں جن کو درست کرنے کے لیے میں نے اپنا قلم نکالا عبدالرحمن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا مجھے اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے چنانچہ میں نے پوچھا ’’فرمائیے‘‘

اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا ’’میں ایک بات عرض کروں‘‘

’’بڑے شوق سے‘‘

’’آپ اس طرح ٹانگیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں‘‘

’’کیوں؟‘‘

اس نے جھک کر کہا ’’بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے‘‘

’’قبض؟‘‘

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ’’قبض کیسے ہو سکتا ہے‘‘ یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اس سے کہوں ’’میاں ہوش کی دوا کرو۔۔۔۔۔۔گھاس تو نہیں کھا گئے ۔۔۔مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے۔۔۔۔آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا‘‘ مگر میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائے گی اور مجھے بیکار کی مغز دردی کرنا پڑے گی۔

وہ مسکرایا عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ گیا'' آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔۔۔۔میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے مانیں نہ مانیں یہ آپ کو اختیار ہے۔''

میں عجب مشکل میں پھنس گیا اس کو اب میں کیا جواب دیتا قبض۔۔۔۔۔یعنی قبض ہو جائے گا، بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا لیکن آج اس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں اس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے۔اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے سات لگا کر دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑا رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دور کرتے ہیں مگر میں تو اسی طریقے سے دور کرتا ہوں کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے۔یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا اندازہ میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں اکثر لوگوں کو میرے اس طرح بیٹھنے کے انداز پر اعتراض رہا ہے اس اعتراض کی وجہ نہ میں نے ان لوگوں سے کبھی پوچھی ہے اور نہ انہوں نے کبھی خود بتائی ہے اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو

میں اس معاملے میں اچھی سے اچھی وکیل سننے کے لیے بھی تیار نہیں کوئی آدمی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں بھنا گیا اور ان کا یوں شکریہ ادا کیا جیسے کوئی یہ کہے "لعنت ہو تم پر"

اس شکریئے کی رسید کے طور پر اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا اتنے میں ڈائریکٹر ہیرو اور ہیروئن آ گئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے سے عبدالرحمن کے قبض سے نجات حاصل ہوئی۔

اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں

1 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغد ہے۔

2 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

3 یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجے کا مغز چاٹ ہے۔

4 یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بے حد نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کچھ عرصے کے لیے زیادہ متحرک ہو جائے گی میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں آپ پوچھیں گے بھلا نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے، لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ ہر کام کرنے کے لیے ایک خاص سلیقے

کی ضرورت ہوتی ہے اور نفرت میں چونکہ شدت زیادہ ہے اس لیے اس کے حامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے محبت ایک عام چیز ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے اور جنہوں نے کی ہے ان میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے محبت میں مٹھاس ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام درست رکھتی ہے۔

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا چاہیے کہ اس میں محبت کرنے کا مزہ ملے شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سو فیصدی اتفاق ہے یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہو گی اور سچ پوچھیے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے اگر ہمیں اس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمٰن سے نفرت کرنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اس سے میری ملاقات ہوتی میں اس کی خیریت دریافت کرتا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمٰن کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا جب وہ نیکر پہن کر آتا ہے تو اس کے بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کور کے چمڑے کی طرح چمکتا ہے ناک موٹی جس کی کوٹھی ابھری ہوئی ہے چہرے کے خطوط منگولی ہیں ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شیطان لڑکے نے اپنے ڈیسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے پیٹ سخت اور ابھرا ہوا حافظ قرآن ہے چنانچہ بات بات میں آیتوں کے حوالے دیتا ہے کمپنی کے دوسرے ایکٹر اس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے اس لیے کہ انہیں احترام کے باعث چپ ہو جانا پڑتا ہے۔

ڈائریکٹر صاحب کو جب میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انہوں نے اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا ایک ہی فلم میں اس سے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا سفید پوشاک پہنا کر اسے ہوٹل میں بیرا بنا کر کھڑا کر دیا گیا سر پر لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اس کو سادھو بنایا گیا پھر اسی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے چہرے پر گوند سے لمبی ڈاڑھی چپکا دی گئی ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی مونچھیں لگا کر اس کو ٹکٹ چیکر بنا دیا گیا۔۔۔۔۔۔ یہ سب میری بدولت ہوا اس لیے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

عبدالرحمٰن خوش تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اتنا مقبول ہو گیا اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکٹر اس سے حسد کرنے لگے ہیں میں نے موقع دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی چنانچہ تیسرے مہینے اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا اس کا

یہ نتیجہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکسٹراؤں کی آنکھوں میں وہ خار بن کے کھٹکنے لگا لطف یہ ہے کہ عبدالرحمن کو اس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی کے دوسرے ڈائریکٹر اس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو بھی ایڈیٹ کرتا ہوں ایک روز میں نے اپنا اخبار عبدالرحمن کے ہاتھ میں دیکھا جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی "منشی صاحب۔۔۔۔۔۔یہ رسالہ آپ ہی۔۔۔۔"

میں نے فوراً ہی جواب دیا "جی ہاں"

ماشاءاللہ، کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آ گیا۔۔۔۔بہت دلچسپ ہے، اب میں ہر ہفتے خرید اکروں گا۔

یہ اس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے میں نے اس کا شکریہ ادا کر دیا، چنانچہ بات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جبکہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا اپنے اخبار کے لیے ایک کالم لکھ رہا تھا عبدالرحمن آیا اور بڑے ادب کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا فرمائیے

"آپ فارغ ہو جائیں تو میں۔۔۔۔"

"میں فارغ ہوں۔۔۔۔۔۔فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے؟"

اس کے جواب میں اس نے ایک رنگین لفافے کو کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھا دی تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی اس لیے میں اسے روک نہ سکا بعد میں جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمٰن کو یہ ناگوار معلوم ہوئی ہو گی تو میں نے کہا "عبدالرحمٰن صاحب اتفاق دیکھئے میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائٹل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پر ہو گا دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے مگر ایک کی کمی تھی۔۔۔اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھا دیا۔۔۔بہت اچھا فوٹو ہے بلاک بھی اس کا خوب بنے گا۔"

عبدالرحمٰن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لیے "آپ کی بڑی عنایت ہے۔۔۔تو۔۔۔تو کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟"

میں نے تصویر کو ایک نظر او ر دیکھا اور مسکرا کر کہا "کیوں نہیں۔۔۔اس ہفتے ہی کے لیے تو میں یہ کہہ رہا تھا"

اس پر عبدالرحمٰن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا "پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا۔۔۔جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔معاف کیجئے۔ میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں بمبئی کی بھاری بھر کم ڈائریکٹری تھی جس پر چھپے ہوئے حروف بتا رہے تھے کہ سن

سولہ کی یہ کتاب فوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لیے ایک یا دو آنے میں خریدی ہو گی دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کو اٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پائپ تھا اس پائپ کی ٹونٹی عبدالرحمٰن نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا چائے کا پیالہ پکڑے ہے۔ لبوں پر چائے کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھل گئی تھیں، ناک کے نتھنے تھوڑے پھول گئے تھے سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رایگاں نہیں گئی تھی کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمٰن انگریزی لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ پرچے میں چھپوا دیا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے غلیظ ریستوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمٰن تازہ پرچہ جس میں اس کی تصویر چھپی تھی ہاتھ میں لیے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میری کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا اس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے، آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے بغل میں پرچہ دبا کر اس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے شکریئے کے کئی فقرے اس نے دل ہی دل میں بنائے ہوں گے مگر ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہو گا جب میں نے اسے اس ادھیڑ بن میں دیکھا تو ماتم پرسی کے انداز میں اس سے کہا" تصویر چھپ گئی آپ

کی۔۔۔۔۔؟'' نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے۔۔۔۔؟

''جی ہاں۔۔۔۔آپ کی بڑی نوازش ہے۔''

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی میرا رنگ پیلا پڑ گیا یہ درد بہت پرانا ہے جس کے دورے مجھے اکثر پڑتے رہتے ہیں میں اس کے دفیعے کے لیے سینکڑوں علاج کر چکا تھا مگر لا حاصل چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا عبدالرحمٰن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا'' آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔''

میں اس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موذی مرض کا شکار ہوتے نہ دیکھ سکتا، چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہا'' کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں''

''جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے۔۔۔'' وہ سخت گھبرا گیا'' میں۔۔۔۔ میں۔۔۔میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

'' میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں۔۔سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

'' سینے میں درد ہے۔۔۔'' یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا'' سینے میں درد ہے تو۔۔۔۔۔تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض۔۔۔۔''

قریب تھا کہ میں بھنا کر اس کو دو تین گالیاں سنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔'' آپ۔۔۔۔۔حد کرتے ہیں آپ۔۔۔۔۔سینے کے درد سے قبض کو کیا

تعلق؟''

''جی نہیں۔۔۔قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہے۔۔۔آپ کی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو پرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو، جی نہیں، آپ جس کو بافراغت اجابت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو۔۔۔سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔۔۔میرا خیال ہے کہ آپ۔۔۔۔دراصل آپ کی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔''

عبدالرحمٰن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے لہجے میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا ''آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہو گا۔۔۔ایک معمولی سا علاج میرا بھی کر دیکھئے۔۔۔۔خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دور ہو جائے گا۔''

میں نے پوچھا ''کون سا مرض؟''

عبدالرحمٰن نے زور زور سے ہاتھ ملے ''یہی۔۔۔۔۔۔یہی قبض''

لاحول ولا، اس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے قبض ہے، صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے مگر یہ نیم حکیم خطرہ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے، قبض ہے، قبض ہے، کہیں ایسا نہ ہو میں اس کے سر پر غصے میں آ کر چائے کا پیالہ دے ماروں عجب نامعقول آدمی ہے، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور

کسی کو سنتا ہی نہیں۔

غصے کے باعث میں بالکل خاموش ہو گیا اس خاموشی کا عبدالرحمن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا خدا معلوم اس نے کیا کیا کچھ کہا۔۔۔۔

"بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سدے پڑ گئے ہیں آپ کو روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر یہ سدے باہر نہیں نکلتے معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا اس لیے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ رطوبت یعنی وہ لیس دار مادہ جو فضلے کو نیچے پھسلنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہو گیا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہو گا قبض کھولنے کے لیے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں اس لیے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لیے آپ کو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے۔۔۔ یونانی دوائیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہیں دوسرے۔۔۔۔"

میں نے تنگ آ کر اس سے کہا "آپ چائے پئیں گے؟" اور اس کا جواب سنے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا "گلاب، ان کے لیے ایک ڈبل چائے لاؤ"

چائے فوراً ہی آ گئی، عبدالرحمن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا "معاف کیجئے گا، مجھے ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ ایک سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے۔۔۔۔ پھر کبھی گفتگو ہو گی۔"

یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمن کی زبانی پر

منجمد ہوگئی اور میں ریستوران سے باہر نکل گیا درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہوگئی تھی، اس کی باتوں نے اس تکدر میں اور بھی اضافہ کر دیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیوں اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ میں مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سل ہے میری انتڑیوں میں ورم ہے، میرے معدے میں رسولی ہے، میرے دانت خراب ہیں مجھے گنٹھیا ہے مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے یعنی اگر مجھے واقعی قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہیے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمٰن کو؟۔۔۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو، ولن اور تین چار ایکسٹراؤں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی اس لیے سب کو چھٹی تھی مجھے جب ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گزر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمٰن کی باتیں ہو رہی ہیں میں ہمہ تن گوش ہوگیا ایک ایکسٹرا نے اس کے خلاف کافی زہر اگلا دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا تیسرے نے اس کے مکالمہ ادا کرنے کی نقل اتاری ہیرو کو حافظ عبدالرحمٰن کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے ولن نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا ”بڑا واہیات آدمی ہے صاحب، کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا ایکٹنگ بالکل فضول ہے آپ اس کو ایک بار ڈراؤنٹ بتا دیجیے۔“

ڈائریکٹر صاحب مسکرا کر کہنے لگے "تم سب کو اس کے خلاف شکایت ہے مگر اسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے"

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا "وہ کیا؟"

ڈائریکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا "وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا میں اس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے لیکن وہ مانتا نہیں ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے کئی علاج مجھے بتا چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے"

میں نے پوچھا "وہ کیسے"

"یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور پھر اس کا علاج بتانے سے۔۔۔وہ مجھے ممنون ہی تو کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔۔۔؟ بات دراصل یہ ہے کہ اسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں جن سے قبض دور ہو سکتا ہے چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لیے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جونہی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے۔۔۔آدمی دلچسپ ہے۔"

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔"

ڈائریکٹر صاحب۔۔۔آپ کے علاوہ وہ حافظ صاحب کی نظر عنایت خاکسار پر بھی ہے۔۔۔میں نے کل ان کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش

کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے۔۔۔۔خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے اس حملے سے بچ گیا اس لیے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔''

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا، یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں میں کئی پیٹنٹ دوائیں استعمال کر چکا ہوں مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوئی اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمٰن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے ہی دوں کیا حرج ہے۔۔۔۔۔مجھے اس سے محبت تو ہے نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا" دس لیف ۔۔۔۔۔ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کرلیا کرتی تھی یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی " صاحب! ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی وہ حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی " صاحب! تم ایک دم الو کا پٹھا ہے حرامزادہ ہے۔۔۔۔سمجھا" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے تین روپے سے زیادہ کوئی مانتا ہی نہیں تھا سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا ''بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے'' نہ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا ''دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی اس سے ایک ادھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ'' چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا ''لائیے ایک روپیہ دودھ کا'' اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلیمہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ـــــــ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا اس فلیٹ میں اپنا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا شروع شروع میں تو اس شور نے

اسے بہت ڈرایا تھا پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانہ میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کیے گئے ہیں، یہ زنجیر اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائی ڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا ''کیا ہوا؟۔۔۔۔۔۔یہ چیخ تمہاری تھی؟''

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا اس نے کہا ''یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔۔۔۔بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے میری کمر میں درد تھا میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھما کا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں''

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے خدا بخش راولپنڈی کا تھا انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار

برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہوگئی اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالے میں ہے وہ اس کی تلاش میں انبالے آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کو سمبندھ ہوگیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہوگئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی

آمدنی پہلے سے دوگنی ہوگئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کرلیں گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کرلیا بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ چلی گئی تھی میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تا کہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی ''یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے'' یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کرلیا کرتی تھی اسی طرح

اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں ''کوئلوں کی دکان'' لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی جہاں ''شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے'' لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اس کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی چونکہ سیٹھ صاب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں، چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی اس نے خدا بخش سے کہا ''کیا بات ہے خدا بخش! دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔۔۔۔مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے'' خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصے سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا ''میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ، دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا راستہ بھول گئے ہیں۔۔۔۔یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔'' وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا ایک آدمی اندر داخل ہوا یہ پہلا

گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے سلطانہ پریشان ہوگئی ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں یہاں کیا دھرا ہے۔۔۔؟ بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا چلو، وہیں چلتے ہیں جو نقصان ہوا اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں آج رات کی گاڑی یہاں سے چل دیں گے۔"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جان من! انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کارساز ہے یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوا تھا پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم

رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی بالکونی میں آ کر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، کبھی ادھر کبھی ادھر، ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے تھے اور

آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہوا کیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔۔۔۔ نہ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب

اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا خدا بخش سے اس نے بارہا کہا ''دیکھو، میرے حال پر رحم کرو یہاں گھر میں رہا کرو میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں'' مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہا کہ اس کی تشفی کردی ''جان من ۔۔۔ میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔''

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آرہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے گھر بالکل خالی تھا خدا بخش حسب معمول باہر تھا دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی

رہی، پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تا کہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا شام کا وقت تھا چھڑکاؤ ہو چکا تھا اس لیے گرد وغبار دب گیا تھا بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب وغریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا ''آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے'' وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا ''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟'' اس پر سلطانہ نے کہا ''یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے'' وہ یہ سن کر پھر مسکرایا ''تمہیں غلط فہمی ہوئی میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف

دیکھ رہا تھا وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی مجھے یہ منظر پسند آیا پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا سبز روشنی مجھے پسند ہے آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا سلطانہ نے پوچھا "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا "نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھائے اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا چنانچہ اس نے شنکر سے کہا "فرمایئے ـ ـ ـ ـ"

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ، بلایا تمہیں نے ہے مجھے" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا "میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے

ہیں ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔''

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی ''آپ کام کیا کرتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا ''یہی جو تم لوگ کرتے ہو''

''کیا؟''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''میں۔۔۔۔میں۔۔۔۔میں کچھ بھی نہیں کرتی''

''میں بھی کچھ نہیں کرتا''

سلطانہ نے بھنا کر کہا ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔۔۔آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔''

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ''تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی''

''جھک مارتی ہوں''

''میں بھی جھک مارتا ہوں''

''تو آؤ دونوں جھک ماریں''

''میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا''

''ہوش کی دوا کرو۔۔۔یہ لنگر خانہ نہیں''

''اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں''

سلطانہ یہاں رک گئی اس نے پوچھا ''یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں''

شنکر نے جواب دیا ''الو کے پٹھے''

''میں بھی الو کی پٹھی نہیں''

''مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے''

یہ کہہ کر شنکر ہنسا

اس پر سلطانہ نے کہا ''تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو''

شنکر مسکرایا ''ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے، پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں''

''جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔۔۔ بولو رہو گے؟''

''اسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں''

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی ''تو جاؤ رستہ پکڑو''

شنکر آرام سے اٹھا پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا ''میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔۔۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں''

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا

جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا ''تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟''

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا، کہنے لگا ''پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔۔۔۔''

''کچھ انہوں نے تم سے کہا؟''

''نہیں ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔۔۔۔۔ پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی، اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا، خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی ''سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو۔۔۔۔۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں، نہ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں محرم سر پر آ گیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟۔۔۔۔ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو کچھ تو

سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا" پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔۔۔۔۔۔خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے، کیا پتا ہے کہ کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم۔۔۔۔"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا" تم خدا کے لیے کچھ کرو چوری کرو یا ڈاکہ مارو، پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو میرے پاس سفید بوسکی کی ایک قمیص پڑی ہے، اس کو میں کالا رنگوالوں گی سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا، یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی کالا رنگوالیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔۔۔۔۔دیکھو تمہیں میری جان کی قسم، کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو۔۔۔۔۔۔میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ"

خدا بخش اٹھ بیٹھا" اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو۔۔۔۔۔میں کہاں سے لاؤں گا۔۔۔۔۔افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس پیسہ نہیں"

" کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو"

" دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے"

" لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔۔۔۔تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی اب سوا روپے گز کے حساب

سے ملتی ہے ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں"

ہوٹل سے کھانا آیا دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے صبح ہوئی خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی، دوپہر کا کھانا کھایا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے کئی دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی، جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں موری کے پاس پہنچ چکی تھی نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی اب شام ہو گئی تھی بتیاں روشن ہو رہی تھیں نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے تھے سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی دفعتاً اسے شنکر نظر آیا مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے دراصل

اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔۔۔۔ میں ایسی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرتا"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہوگئی، کہنے لگی "نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے"

شنکر اس پر مسکرا دیا "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہے"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟۔۔۔۔۔ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔۔۔ چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کروں"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو۔۔۔۔۔ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی کہنے لگی "صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"جو دوسرے چاہتے ہیں" شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق

ہے ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا "میں سمجھ گئی ہوں"

"تم کہو، کیا ارادہ ہے؟"

"تم جیتے، میں ہاری، پر میں کہتی ہوں آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہو گی۔"

"تم غلط کہتی ہو۔۔۔اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔۔۔۔۔تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہے"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا "میرا نام شنکر ہے۔۔۔۔۔یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہے، چلو آؤ اندر چلیں"

☆☆☆☆☆

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے نہ جانے کس بات پر جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا "شنکر میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا "پہلے بات بتاؤ"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر"

"کہو، کہو۔۔۔رک کیوں گئی ہو"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا ''بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔۔۔۔یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔''

شنکر نے یہ سن کر کہا ''تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔''

سلطانہ نے فوراً ہی کہا ''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔''

شنکر مسکرایا ''میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی اے بس اب خوش ہو گئیں'' سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا ''کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟''

سلطانہ نے ہنس کر کہا ''تم انہیں کیا کرو گے چاندی کے معمولی بندے ہیں زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔''

اس پر شنکر نے کہا ''میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی بولو دیتی ہو۔''

''لے لو'' یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے اس کو بعد میں افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا "ساٹن کی کالی شلوار ہے۔۔۔۔۔ دیکھ لینا شاید لمبی ہو۔۔۔ اب میں چلتا ہوں"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں بال بکھرے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا ساٹن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی سلطانہ بہت خوش ہوئی بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی قمیص اور دوپٹہ لے کر آئی تینوں کالے کپڑے اس نے جب پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے۔۔۔۔۔ کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں "یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟"

انوری نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

☆☆☆☆☆

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سردیہات کے تکیے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اپلوں سے آگ سلگا رہی ہے صبح کے سرد اور مٹیالے دھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دوہرا کر کے منہ قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آ گئی ہے۔

اپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سلگا چکی ہے یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے ان کے قبضہ میں تھی گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی اس تکیے کی مجاور تھی، گاما سائیں سارے گاؤں میں ہر دلعزیز تھا ذات کا وہ کمہار تھا مگر چونکہ اسے تکیے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے اس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے، لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں بھنگ گھوٹنے کے لیے وہ سال بھر میں چھ کونڈیاں

بنایا کرتا تھا جن کے متعلق بڑے فخر سے وہ یہ کہا کرتا تھا "چودھری لوہا ہے لوہا۔۔۔فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اس کا پوتا بھی اسی میں بھنگ گھوٹ کر پئے۔"

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکیے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے گھوٹنے کے لیے گاما سائیں نہیں تھا پر اس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اب سر بھویں منڈا کر سائیں بن گئے تھے، اس کے بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سلگائی ہوئی آگ سلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام کو تو خیر کافی رونق رہتی تھی مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے ادھر ادھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی کابک تھے جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پرانے دوست ابو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے تکیے کی دھوئیں بھری فضا میں ان سفید اور چتکبرے کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی جس طرح تکیے میں آنے والے لوگ شکل وصورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیوں کے بڑے لڑکے نے جھانجھ پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا اس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کے موقع دیکھنے کے لئے گاؤں

میں آیا کرتا تھا اور گاما سائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اس کے نام میں تھانیداری کی بو سونگھ سکتی تھی مگر جب اس نے بارھویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی خاصا تگڑا جوان تھا پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برسوں میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی سے چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو نام ہی لے گا نامانا وہ مانا گیا تھا عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے کبوتروں والا سائیں اسے اس لیے کہا جاتا تھا کہ اسے کبوتروں سے بہت پیار تھا تکیے میں جتنے کبوتر تھے ان کی دیکھ بھال ابو پہلو ان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا باہر اس کی ماں آگ سلگا رہی تھی ۔۔۔۔

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں اس لیے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں

میں مصروف تھے مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا ابھی تک آباد نہ ہوا تھا، البتہ دور کونے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سلگا کر بکری کے لیے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی مڑ کر دیکھا تو اسے ایک اجنبی سر پر ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا جب اس نے موٹی آواز میں "مائی جیواں السلام علیکم" کہا تو پگڑی کا کھردرا کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کیے بغیر کہا "وعلیکم السلام! آؤ بھائی بیٹھو آگ تاپو"

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی رہتی تھی اجنبی اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا "ماں! اللہ بخشے گاما سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے بہت صدمہ ہوا مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ، گاما سائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دور ہو گئی۔"

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا اس نے ادھر ادھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا "میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں ایک خاص بات کہنے کے لئے" اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا "میں سندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں پرسوں

رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے والے ہیں خون خرابہ ضرور ہوگا، اس لیے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دور ہی رکھنا میں نے سنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مار اٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔۔۔۔ تم ان کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو ٹھیک رہے گا۔۔۔۔ بس مجھے یہی کہنا تھا میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔۔۔۔ السلام علیکم!''

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اٹھا اور جس راستے سے آیا تھا اسی راستے باہر چلا گیا۔

سندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا اس کی وحشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں بے شمار گیت اس کی بہادری اور بے باکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے اس کا نام سن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے سندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے، بڑی بڑی موچھوں والا ان موچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں انکی مدد سے اٹھا سکتا ہے بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا بہر حال سب متفقہ طور پر اس کی طاقت اور بے باکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سنا کہ سندر جاٹ ان کے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آ رہا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکی مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سندر جاٹ کا ڈاکہ کیا معنی رکھتا ہے پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی لالہ مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سندر اور چنچل چھوکری بھی ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا یہ بلا اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں میں کسی اور کو نہ تھا مائی جیواں نے سوچ کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے۔۔۔۔چودھری کے گھر خبر کر دے۔۔۔۔۔لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ ان سے مانگا تھا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا گھسیٹا رام حلوائی کو متنبہ کر دے۔۔۔نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا اس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اس نے کسی سے ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمن کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھری کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اسے عبدالغفار یعنی

کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا اس کی یہ ہنسی آج خلاف معمول معنی خیز تھی مائی جیواں کو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کی نشانی ہے۔

جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا ''ماں، یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟''

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا، اس لیے اس کی ماں جواب دیئے بغیر اندر چلی گئے اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی ''ارے رحمٰن، ارے رحمٰن اٹھ، اٹھ''

بازو جھنجھوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش میں آ گیا تو اس کی ماں نے اس کو ساری بات سنا دی رحمٰن کے تو اوسان خطا ہو گئے وہ بہت ڈرپوک تھا گو اس کی عمر اس وقت بائیس برس کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی سندر جاٹ!۔۔۔ اتنا بڑا ڈاکو، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لیے آ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا بلکہ یوں کہیے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمٰن کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بے باک شوخ اور چنچل لڑکی تھی گاؤں کے سب جوان لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی بڑے بڑے

ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی۔ چودھری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دور دور سے اس کو نیچا دکھانے کے لیے آئے تھے مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اس کی یہ ساری اکڑفوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا "فجے! گنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلے میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا۔۔۔۔۔ آ، میرے سامنے بیٹھ، میری کلائی پکڑ، ان دو انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نیتی نام نہیں۔۔۔۔۔"

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی طاقت اور شہزوری کے رعب اور دبدبے میں آ کر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے اور اگر وہ اس کی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے عورت ذات سے مقابلہ کرتے شرم تو نہیں آئی مردود کو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کرے چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔۔۔۔ اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں، تو اس نیتی سے رحمن کو محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا اسی طرح اس

کا پریم بھی ڈرپوک تھا دور سے دیکھ رک وہ اپنے دل کی ہوش پوری کرتا تھا اور جب کبھی وہ اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ حرف مدعا زبان پر لائے مگر نیتی سب کچھ جانتی تھی وہ کیا کچھ نہیں جانتی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہے اس کے عشق میں کون گرفتار نہیں تھا؟۔۔۔۔۔۔سب اس سے محبت کرتے تھے اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں اس قدر موجود تھی کہ وہ بالکل اس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا۔۔۔۔۔۔۔وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان کی چوٹی پر پہنچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی۔۔۔۔

رحمٰن کو بھی اس افتاد کا یقین تھا مگر اس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔

جب رحمٰن دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کے لیے تیار ہو کر تکیے سے باہر نکلا تو اسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار و محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا

تو ایکا ایکی اس نے سوچا کہ نیتی کو تو بتا دینا چاہیے تھا کہ سندر جاٹ آ رہا ہے لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں تکیے سے باہر نکلا اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا تکیے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گزار دیتا تھا۔شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آ جاتی تھی گاؤں اس کو پسند نہیں تھا اجاڑ اور سنسان جگہوں سے اسے غیر محسوس طور پر محبت تھی یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کے لیے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، نوجوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے ''ماہیا'' کا دل کیسا ہے عبدالغفار ان سوالیوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا اس لیے کہ اسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اس کے پاس سوال لے کر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

عبدالغفار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اس کنویں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا اس کنویں کی حالت بہت ابتر تھی اس بوڑھے برگد کے

پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر اس میں جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی مکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بن دیا ہے اس کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر عبدالغفار بیٹھ گیا اور دوپہر کی اداس فضا میں اس نے اپنے وجود سے اور بھی اداسی پیدا کر دی۔

دفعتاً اڑتی ہوئی چیلوں کو اداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی نیتی گا رہی تھی۔

ماہیا مرے نے باگ لوایا

چمپا، مہ دا خواب کھلایا

اسی تو لوایاں کھٹیاں وے

راتی سونڑ نہیں دیندیاں اکھیاں دے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی میرے چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اس میں ہر طرح کے پھول اگائے ہیں، چمپا، مہ دا وغیرہ کھلائے ہیں، اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں۔۔۔۔ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں۔۔۔۔۔۔ کتنی انکساری برتی گئی ہے معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے، لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں، اور پھر شب خوابی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں نازک جذبات بالکل نہیں تھے لیکن پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اس کو چونکا دیا اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اس نے پہچان لیا تھا کہ یہ آواز

نمتی کی ہے۔

گاتی گاتی نمتی کنویں کی طرف آ نکلی غفار کو دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی" اوہ غفار سائیں۔۔۔۔تم۔۔۔۔اوہ، مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں۔۔۔اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور۔۔۔۔لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو۔۔۔اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے۔"

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

خلاف معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نمتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا" غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں۔۔۔۔میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے۔۔۔۔اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی۔کیوں غفار سائیں۔۔۔۔ارے تم بولتے کیوں نہیں کچھ بولو۔۔۔۔کچھ کہو۔۔۔۔اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی۔۔۔تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں۔۔۔۔تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی۔۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھنے لگی اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکا ایکی عبدالغفار سے پوچھا"

سائیں۔۔۔۔۔میں کب تھکوں گی؟''

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا اس نے کنویں کے اندر جھک کر دیکھتے ہوئے جواب دیا ''بہت جلد''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اس پر نیتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا ''کب؟۔۔۔۔۔کب؟۔۔۔۔۔سائیں کب؟''

عبدالغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ببول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا نیتی کچھ دیر کنویں کے پاس سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا ادھر چل دی۔

☆☆☆☆☆

وہ رات جس میں سندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آ رہا تھا مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی وہ بالکل اکیلی تھی رحمٰن کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا ابو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا، چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہ دی جب رات گزر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سندر جاٹ کی بات سوچتی سوچتی سو گئی۔

چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی اس لیے صبح بہت دیر کے بعد جاگی کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ ابو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیے پر پھیلی ہوئی ہے اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا'' ساری رات مجھے نیند نہیں آئی یہ موا بڑھاپا تنگ کر رہا ہے صبح سوئی ہوں اور اب اٹھی ہوں۔۔۔۔۔۔ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے؟''

ابو نے جواب دیا'' گاؤں میں''

اس پر مائی جیواں نے کہا'' کوئی تازہ خبر سناؤ''

ابو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا'' آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام چمارہ کی وہ لونڈیا۔۔۔۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔۔؟ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے۔۔۔میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا۔۔۔حرامزادی نے سارا گاؤں سر پر اٹھا رکھا تھا۔''

''کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟''

''جانے میری بلا۔۔۔۔۔۔لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا سندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا پر ایک چھوکری تو غائب ہوگئی تھی اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سندر جاٹ سے متعلق ہو جائے چنانچہ وہ ان تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تکیے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ ابو نے بتایا تھا اس سے

زیادہ اسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رحمٰن لوٹ آیا اس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکہ کے متعلق پوچھا اس پر مائی جیواں نے کہا "سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا پر نیتی غائب ہو گئی ہے۔۔۔ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔"

رحمٰن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں دس کوس او چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔

ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجے میں اس سے پوچھا "کیا ہوا بیٹا!"

رحمٰن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا "کچھ نہیں ماں۔۔۔۔۔تھک گیا ہوں۔"

"اور نیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟"

رحمٰن نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا رحمٰن نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا "کیا کہا تھا اس نے تجھ سے؟"

عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا "کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں۔۔۔۔۔پر اب وہ تھک جائے گی۔"

رحمان نے تیزی سے پوچھا "کیسے؟"

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی "مجھے کیا معلوم۔۔۔۔۔؟ سندر جاٹ جانے اور وہ جانے"

یہ سن کر رحمٰن کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی اور مائی جیواں کی جھریاں زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

گرم سوٹ

گنڈا سنگھ نے چونکہ ایک زمانے سے اپنے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے اس لیے پسینے کے باعث ان میں ایک عجیب قسم کی بو پیدا ہو گئی تھی جو زیادہ شدت اختیار کرنے پر اب گنڈا سنگھ کو کبھی کبھی اداس کر دیتی تھی اس کو اس بدبو نے کبھی اتنا تنگ نہیں کیا تھا جتنا کہ اب اس کے گرم سوٹ نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔

اپنے کسی دوست کے کہنے پر وہ امرتسر چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا جب اس نے امرتسر کو خیر باد کہا تو گرمیوں کا آغاز تھا لیکن اب کہ گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی، گنڈا سنگھ کو یہ گرم سوٹ بہت ستا رہا تھا۔

اس کے پاس صرف چار کپڑے تھے۔ گرم پتلون، گرم کوٹ، گرم واسکٹ اور ایک سوتی قمیض، یہ گرم سوٹ اسے اس لیے دہلی کی شدید گرمیوں میں پہننا پڑتا تھا کہ اس کے پاس کوئی اور کپڑا ہی نہیں تھا اور سوٹ کے ساتھ کی واسکٹ اسے اس لیے پہننا پڑتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اسے احتیاط یا بد احتیاطی سے رکھ سکتا یوں تو وہ اس واسکٹ کو یا کوٹ ہی کو دریبہ کلاں میں اپنے دوست کی دکان میں رکھ دیتا مگر وہاں اسنے پہلے روز ہی کئی چوہے دیکھے تھے دہلی آنے کے دوسرے روز چاندنی چوک میں اس نے رس گلے کھائے تھے ان کا شیرہ جا بجا کوٹ اور واسکٹ پر گر پڑا تھا۔ اگر وہ یہ دونوں چیزیں اس دکان میں رکھ دیتا تو ظاہر ہے کہ جہاں جہاں شیرہ گرا تھا چوہے کپڑا کتر جاتے اور گنڈا سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سوٹ جو اسے 3 ستمبر 1939ء یعنی اس جنگ کے ابتدائی روز ملا تھا یوں

بیکار چوہوں کی نذر ہو جائے اس سوٹ کے ساتھ اتفاقیہ طور پر ایک ایسا دن منسوب ہو گیا تھا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

گنڈا سنگھ کو چنانچہ اس لیے بھی اپنا سوٹ عزیز تھا امرتسر میں جب اس نے اپنا یہ تاریخی سوٹ پہنا تھا تو دربار صاحب کے آس پاس اس کے جتنے ہاتھی دانت کا کام کرنے والے دوست رہتے تھے متحیر ہو گئے تھے بلبیر نے جب اسے بازار میں دیکھا تو متحرک خراد کو روک کر زور سے آواز دی تھی "گنڈا سیاں ۔۔۔۔۔ گنڈا سیاں ذرا ادھر تو آ ۔۔۔ یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

گنڈا سنگھ لباس کے معاملے میں از حد بے پروا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اپنے لباس کی طرف اس نے کبھی توجہ ہی نہ دی تھی وہ پتلون اسی طرح پہنا کرتا تھا جس طرح کچھ پہنی جاتی ہے یعنی بغیر کسی تکلف کے اس کے متعلق اس کے دوستوں میں یہ بات عام مشہور تھی کہ اگر تن ڈھکنا ضروری نہ ہوتا تو گنڈا سنگھ بالکل ننگا رہتا۔

چھ چھ مہینے تک وہ نہاتا نہیں تھا بعض اوقات اس کے پیروں پر اس قدر میل جم جاتا تھا کہ اور میل جمنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی دور سے اگر آپ اس کے میلے پیروں کو دیکھتے تو یہی معلوم ہوتا کہ گنڈا سنگھ نے موزے پہن رکھے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی غلاظت پسندی کی انتہا یہ تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کرتا تھا اور سردیوں میں ایک ایسا لحاف اوڑھ کر سوتا تھا کہ اگر کوئی اسے گھورے پر پھینک دیتا تو صبح جب بھنگی کوڑا کرکٹ اٹھانے آتا تو یہ لحاف دیکھ کر اس کو بھی گھن آ جاتی، پر لطف یہ ہے کہ اس کی ان تمام غلاظتوں کے باوجود لوگ اسے پسند کرتے تھے اور امرتسر میں تو آپ کو ایسے کئی آدمی مل جائیں گے جو اس کو محبت کی حد تک

پسند کرتے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس ہے ڈاڑھی اور مونچھوں کے بھوسلے بال اس کے چہرے کے دو تہائی حصے پر موبل آئل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے کی طرح پھیلے رہتے ہیں پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں کی بھی یہی حالت رہتی ہے کبھی کبھی جب اس کی پنڈلیاں کپڑا اٹھ جانے کے باعث ننگی ہو جاتی ہیں تو اس پر میل کھرنڈوں کی شکل میں جابجا نظر آتا ہے مگر لوگ اب تمام میلی اور گندی حقیقتوں سے باخبر ہونے پر بھی گنڈا سنگھ کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں اور اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے ہیں۔

امرتسر چھوڑ کر جب گنڈا سنگھ اپنے گرم سوٹ سمیت دہلی آیا تو اسے غیر شعوری طور پر معلوم تھا کہ یہاں بھی خود بخود اس کے دوست پیدا ہو جائیں گے اگر اس کو اپنی غلاظت پسندیوں کا احساس ہوتا تو بہت ممکن ہے یہ احساس رکاوٹ بن جاتا اور دہلی میں اس کا کوئی دوست نہ بنتا۔

چند ہی دنوں میں بظاہر کسی وجہ کے بغیر آٹھ دس آدمی گنڈا سنگھ کے دوست بن گئے اور گنڈا سنگھ کو اس بات کا مطلق احساس نہ ہوا کہ اگر یہ آٹھ دس آدمی اس کے دوست نہ بنتے تو دہلی شہر میں وہ بھوکوں مرتا روٹی کے مسئلے پر دراصل گنڈا سنگھ نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا اور نہ اس نے کبھی یہ جاننے کی تکلیف کی تھی کہ دوسرے اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں کھانا، پینا اور سونا، یہ تین چیزیں ایسی تھیں جو گنڈا سنگھ کو چلتے پھرتے کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی تھیں اور ایک زمانے سے چونکہ یہ چیزیں اسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھیں اس لیے ان کے متعلق وہ کبھی

سوچتا ہی نہیں تھا۔

چاوڑی میں ہربنس سے ملنے گیا تو وہاں صبح کا ناشتہ مل گیا ہربنس کے یہاں سے آیا تو راستے میں احمد علی نے اپنی دکان پر ٹھہرالیا اور کہا گنڈا سنگھ، بھئی تم خوب وقت پر آئے، میں نے دھنا مل سے کچھ چاٹ منگوائی ہے کھا کے جانا احمد علی کی دکان پر چاٹ کھانے کے بعد گنڈا سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ چلو ہیم چندر سے ملنے چلیں ہیم چندر بہت اچھا افسانہ نگار ہے اور گنڈا سنگھ کے دل میں اس کی بہت عزت ہے، چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا دعوت دینے اور دعوت قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا کھانا آیا اور دونوں نے مل کر کھالیا یہاں سے جب گنڈا سنگھ تمار پور کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں باغ آ گیا دھوپ چونکہ بہت کراری تھی، اس لیے گنڈا سنگھ جب کچھ دیر ستانے کے لیے نکلسن باغ کے ایک بنچ پر لیٹا تو پانچ بجے وہیں وہیں سویا رہا آنکھیں مل کر اٹھا اور آہستہ آہستہ تمار پور کا رخ کیا جہاں اس کا دوست عبدالمجید رہتا تھا چھ بجے کے قریب گنڈا سنگھ عبدالمجید کے گھر پہنچا وہاں جنگ کی باتیں شروع ہوئیں چنانچہ آٹھ بج گئے عبدالمجید بہت ہوشیار آدمی تھا ہندوستان کے ترقی پسند لٹریچر کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھیں مگر جنگ کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں تھا کوشش کرنے کے باوجود وہ چین اور جاپان، جاپان اور روس، روس اور جرمنی اور فرانس کے جغرافیائی رشتے کو نہ سمجھ سکا تھا جب کبھی وہ دنیا کا نقشہ کھول کر اپنے سامنے رکھتا تو اس کی نگاہوں میں نقشے پر پھیلے ہوئے شہر اور ملک ایک ایسے الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے جو اکثر اوقات پتنگ اڑانے کے

دوران میں اس کی ڈور میں پیدا ہو جایا کرتے تھے مگر گنڈا سنگھ کو دنیا کے جغرافیہ پر کافی عبور حاصل تھا ایک بار اخبار پڑھ لینے کے بعد جنگ کا صحیح نقشہ اس کے ذہن میں آجاتا تھا اور وہ بڑے سہل انداز میں لوگوں کو سمجھا سکتا تھا کہ جنگ کے میدان میں کیا ہو رہا ہے۔

عبدالمجید طبعاً نفاست پسند تھا، اس کو گنڈا سنگھ کی غلاظتیں بہت کھلتی تھیں مگر وہ مجبور تھا اس لیے کہ گنڈا سنگھ ہی ایک ایسا آدمی تھا جو اسے جنگ کے تازہ حالات سمجھا سکتا تھا اگر عبدالمجید کو جنگی خبریں سننے اور ان پر تفصیلی بحث کرنے کی عادت نہ ہوتی جو ایک بہت بڑی کمزوری کی شکل اختیار کر چکی تھی تو وہ یقیناً اس آدمی سے کبھی ملنا پسند نہ کرتا جو کھانا کھانے کے بعد سالن سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کے کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں سے صاف کرتا تھا ایک دفعہ عبدالمجید نے پردوں کو اس کے حملے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنا تولیہ آگے بڑھا دیا اور کہا ''لو گنڈا سنگھ، اس سے ہاتھ صاف کر لو کچھ دیر اگر ٹھہر سکو تو پانی اور صابن آ رہا ہے''

گنڈا سنگھ نے اس انداز سے تولیہ عبدالمجید سے لیا جیسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اور ایک منٹ میں اپنا ہاتھ صاف کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا ''پانی وانی کی کوئی ضرورت نہیں، ہاتھ صاف ہی تھے''

عبدالمجید نے جب زہر کے گھونٹ پی کر اپنے تولیے کی طرف دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ منہ ہاتھ صاف کرنے کے بجائے کسی نے اس کے ساتھ سائیکل کی چین صاف کی ہے۔

عبدالمجید کی بیوی کو گنڈا سنگھ کی یہ مکروہ عادات سخت ناپسند تھیں مگر وہ بھی مجبور

تھی اس لیے کہ جس روز گنڈا سنگھ نہیں آتا تھا عبدالمجید اسے اپنے پاس بٹھا کر جنگ کے تازہ حالات پر ایک طویل لیکچر دینا شروع کر دیتا تھا جو اس امن پسند عورت کو طوعاً و کرہاً سارے کا سارا سننا ہی پڑتا تھا۔

گنڈا سنگھ ذہین آدمی تھا ادب اور سیاست کے بارے میں اس کی معلومات اوسط آدمی سے بہت زیادہ تھیں امرتسر میں اس کے اس گرم سوٹ کا سودا بھی ان معلومات کے ذریعے ہی سے ہوا تھا محمد عمر ٹیلر ماسٹر کو جنگی خبریں سننے کا خبط تھا، چنانچہ گنڈا سنگھ نے جنگ کے ابتدائی حالات سنا سنا کر محمد عمر کو اس قدر مرعوب کیا کہ اس نے یہ گرم سوٹ (جو کہ کسی گاہک نے 37ء میں تیار کرایا تھا اور دو برس سے اس کے پاس بیکار پڑا تھا چونکہ اس گاہک نے پھر کبھی شکل ہی نہیں دکھائی تھی) گنڈا سنگھ کے جسم پر فٹ کر دیا اور اس کے ساتھ پانچ روپے ماہوار کی چھ قسطیں مقرر کر لیں۔

ان چھ قسطوں میں سے صرف تین قسطیں گنڈا سنگھ نے ادا کی تھیں باقی تین قسطوں کے لئے محمد عمر کئی بار تقاضا کر چکا تھا مگر ان رسمی تقاضوں کے علاوہ محمد عمر نے گنڈا سنگھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا اس لیے کہ جنگ کے حالات دن بدن دلچسپ ہوتے جا رہے تھے۔

گنڈا سنگھ نے امرتسر کیوں چھوڑا یہ ایک لمبی کہانی ہے دہلی میں جو اس کے نئے دوست بنے تھے ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ امرت سر میں ایک پرانے دوست کے کہنے پر وہ یہاں چلا آیا تھا کہ ملازمت تلاش کرے۔

دہلی آ کر گنڈا سنگھ ملازمت کی جستجو کرتا مگر یہ کم بخت گرم سوٹ اسے چین نہیں

لینے دیتا تھا اس قدر گرمی پڑ رہی تھی کہ چیل انڈا چھوڑ دے کچھ دنوں سے تو گرمی کی انتہا ہوگئی تھی لوگ سن سٹروک سے مر رہے تھے گنڈا سنگھ کو موت کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا کہ اسے اس تکلیف کا خیال تھا جو گرمی کی شدت کے باعث اسے اٹھانا پڑ رہی تھی بازاروں میں دھوپ پگھلی ہوئی آگ کی طرح پھیلی رہتی تھی لو اس غضب سے چلتی تھی کہ منہ پر آگ کے چانٹے سے پڑتے تھے لک پھری سڑکیں توے کے مانند تپتی رہتی تھیں ان سب کے اوپر فضا کی وہ گرم گرم اداسی تھی جو گنڈا سنگھ کو بہت پریشان کرتی تھی۔

اگر اس کے پاس یہ گرم سوٹ نہ ہوتا تو الگ بات تھی، شدید گرمیوں کا یہ موسم کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا پر اس سوٹ کی موجودگی میں جس کا رنگ اس کی بھورلی ڈاڑھی سے بھی زیادہ گہرا تھا اب ایک دن بھی دہلی میں رہنا اسے دشوار معلوم ہوتا تھا اس سوٹ کا رنگ سردیوں میں بہت خوشگوار معلوم ہوتا تھا پر اب گنڈا سنگھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔

سوٹ کا کپڑا بہت کھردرا تھا، کوٹ کا کالر گھسنے کے باعث بالکل ریگ مال کی صورت اختیار کر گیا تھا اس سے گنڈا سنگھ کو بہت تکلیف ہوتی تھی، یہ گھسا ہوا کالر ہر وقت اوپر نیچے ہو کر اس کی گردن کے بال مونڈتا رہتا تھا۔

ایک دو دفعہ جب غضب کی گرمی پڑی تو گنڈا سنگھ کے جی میں آئی کہ یہ گرم سوٹ اتار کر کسی ایسی جگہ پھینک دے کہ پھر اسے نظر نہ آئے مگر یہ سوٹ اگر وہ اتار دیتا تو اس کی جگہ پہنتا کیا اس کے پاس تو اس سوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا یہ مجبوری گرمی کے احساس میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی تھی اور بے چارہ گنڈا سنگھ تلملا

کے رہ جاتا تھا۔

دہلی میں اس کے چند دوستوں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''بھئی گنڈا سنگھ! تم یہ گرم سوٹ کیوں نہیں اتارتے کیا تمہیں گرمی نہیں لگتی؟'' گنڈا سنگھ چونکہ ذہین آدمی تھا اس لیے اس نے یوں جواب دیا تھا۔ گرم کپڑا گرمی کی شدت کو روکتا ہے اسی لیے یہ گرم سوٹ پہنتا ہوں۔ سن اسٹروک کا اثر ہمیشہ گردن کے نچلے حصے پر پڑتا ہے جہاں حرام مغز ہوتا ہے۔ اگر جسم کے اس حصے پر گرم کپڑے کی ایک موٹی سی تہہ جمی رہے تو سورج کے اس حملے کا بالکل خدشہ نہیں رہتا۔ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں انگریز وغیرہ سولر ہیٹ کے پچھلے حصے کے ساتھ ایک کپڑا لٹکا دیتے ہیں کہ لو سے بچے رہیں۔ عرب میں سر کے لیے ایک خاص پہناوا مروج ہے۔ ایک بڑا سا رومال ہوتا ہے جو گردن کو ڈھانپے رہتا ہے۔ ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے پگڑی کا استعمال اب تک چلا آ رہا ہے۔ شملہ چھوڑنے کا اصل مطلب یہی تھا کہ گردن لو سے محفوظ رہے۔ مگر اب لوگوں نے شملہ چھوڑنا قریب قریب ترک کر دیا ہے اس لیے کہ اسے فضول سمجھا گیا ہے اور بغیر شملہ چھوڑے پگڑی باندھنا جدید فیشن بن گیا ہے۔ میں خود اس فیشن کا شکار ہوں''۔

یہ فاضلانہ جواب سن کر اس کے دوست بہت مرعوب ہوئے تھے، چنانچہ پھر کبھی انہوں نے گنڈا سنگھ سے اس کے سوٹ کے بارے میں استفسار نہ کیا تھا۔ گنڈا سنگھ جس کو اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنے کا شوق تھا اس وقت یہ جواب دے کر بہت مسرور ہوا تھا مگر یہ مسرت فوراً ہی ایک سوٹ کی تکلیف وہ گرمی نے غائب کر دی

تھی۔

عبدالمجید تمار پور یعنی شہر کے مضافات میں رہتا تھا جہاں کھلی فضا میسر آ سکتی ہے۔ ایک رات جب تازہ جنگی حالات پر تبصرہ کرتے کرتے دیر ہو گئی تو عبدالمجید نے گنڈا سنگھ کے لیے برآمدے کے باہر ایک چارپائی بچھوا دی کوٹ اور واسکٹ اتار کر وہ پتلون سمیت اس چارپائی پر صبح چھ بجے تک سویا رہا۔ رات بڑے آرام میں کٹی۔ کھلی فضا تھی اس لیے ساری رات خنک ہوا کے جھونکے آتے رہے۔ گنڈا سنگھ کو یہ جگہ پسند آئی چنانچہ اس نے شام کو دیر سے آنا شروع کر دیا۔

عبدالمجید کی بیوی نے دس بارہ روز تک گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برداشت کیا لیکن اس کے بعد اس سے رہا نہ گیا۔ عبدالمجید سے اس نے صاف صاف کہہ دیا ''اصغر کے ابا اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اس موئے گنڈا سنگھ کا یہاں آنا بالکل پسند نہیں کرتی۔ مکان ہے یا سرائے ہے؟............ یعنی وہ عین کھانے کے وقت آ جاتا ہے ادھر ادھر کی باتیں آپ سے کرتا ہے اور چارپائی بچھوا کر سو جاتا ہے۔ میں اس کی غلاظتیں برداشت کر سکتی ہوں مگر اس کا یہاں سونا بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔

سنا

عبدالمجید کو خود گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ اس کی بیوی پرلی طرف آنگن میں اکیلی پڑی رہتی تھی مگر وہ کیا کرتا جبکہ جنگ کی دلچسپ باتیں کرتے کرتے دیر ہو جاتی تھی اور گنڈا سنگھ بغیر کسی تکلف کے جیسے کہ اس کا روزانہ کا معمول ہو۔ اس سے کہہ دیتا تھا بھائی عبدالمجید اب تم سو جاؤ...... صبح اٹھ کر تازہ اخبار دیکھیں گے تو نئے حالات کا کچھ پتہ چلیگا''۔ یہ کہہ کر وہ برآمدے میں سے

چارپائی نکالتا اور باہر بچھا کر سو جاتا۔

جب عبدالمجید کی بیوی اس پر بہت برسی تو اس نے کہا ''جانِ من! میں خود حیران ہوں کہ اس کو کس طرح منع کروں۔ یہاں دہلی میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مجھے تو اب اس بات کا خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرے مکان کو اپنا اڈا بنا لے گا۔ آدمی بے حد اچھا ہے' ذہین ہے پر...... کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''۔

یہ سن کر عبدالمجید کی بیوی نے کہا ''تو یہ ترکیب تم ہی سوچو...... میں تو صاف گو ہوں اور اگر مجھے کہو گے تو میں کھلے لفظوں میں اس سے کہہ دوں گی کہ تمہارا یہاں رہنا مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے''۔

عبدالمجید نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ وہ گنڈا سنگھ سے اپنی مشکلات اور مجبوریاں صاف لفظوں میں بیان کر دیگا چنانچہ جب شام کو گنڈا سنگھ آیا تو جنگ کے تازہ حالات پر بحث شروع کرنے کے بجائے عبدالمجید نے اس سے کہا ''گنڈا سنگھ! میں تم سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے''۔

گنڈا سنگھ نے ہمہ تن گوش ہو کر جواب دیا ''برا ماننے کی بات ہی کیا ہے۔ آپ کہیئے''۔

اس پر عبدالمجید نے ایک مختصر سی رسمی تمہید شروع کی پھر اسکے آخر میں کہا ''بات یہ ہے کہ سردیوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس موسم میں گنجائش نکل آتی ہے مگر ان گرمیوں میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مردوں کو اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ مستورات کو ہو جاتی ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو''۔

گنڈا سنگھ مطلب سمجھ گیا چنانچہ اس نے پہلی مرتبہ اپنی تکلیفیں بیان کرنا شروع کیں۔ ''بھائی عبدالمجید میں تمہاری مہربانیوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ رات کاٹنے کے لیے یوں تو مجھے بہت جگہیں مل سکتی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ایسی کھلی ہوا کہیں نہیں ملتی۔ سارا دن اس گرم سوٹ میں پگھلتا رہتا ہوں۔ چند راتیں جو میں نے تمہارے یہاں بسر کی ہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے تمہاری مجبوریوں اور تکلیفوں کا احساس اب ہوا ہے۔ اس لیے جو آرام مجھے یہاں رات کو ملتا تھا اس قدر خوشگوار تھا کہ میں نے دوسرے پہلو پر کبھی غور ہی نہ کیا...... تم میرے دوست ہو کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ اس گرم سوٹ سے مجھے نجات مل جائے' اس طور پر کہ یہ گرم سوٹ بھی میرے پاس رہے اور گرمیوں کا موسم بھی کٹ جائے کیونکہ دو تین مہینے کے بعد پھر سردیاں آنے والی ہیں اور مجھے پھر اس سوٹ کی ضرورت ہوگی ...... سچ پوچھو تو اب میں دیوانگی کی حد تک اس سوٹ کی گرمی سے بیزار آ گیا ہوں...... تم خود سمجھتے ہو''۔

عبدالمجید سب سمجھ گیا' جب گنڈا سنگھ رخصت ہوا تو عبدالمجید نے اپنی بیوی سے بات چیت کی۔ دونوں دیر تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں اس کی بیوی نے کہا' صرف ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ گنڈا سنگھ کو کسی ایسی جگہ بھیج دیا جائے جہاں گرمی نہ ہو''۔

یہ سن کر عبدالمجید نے کہا ''ٹھیک ہے پر اس کے لیے رقم کی ضرورت ہے' اگر میرے پاس فالتو روپے ہوتے تو کیا میں نے اسے ٹھنڈے کپڑے نہ بنوا دیے ہوتے''۔

اس پر عبدالمجید کی بیوی نے کہا ''تم پوری بات تو سن لیا کرو۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اسے شملہ بھیج دیا جائے میرا بھائی نصیر کل آنے والا ہے۔ اس سے کہہ دیں گے وہ گنڈا سنگھ کو بغیر ٹکٹ کے وہاں پہنچا دے گا...... ایک دو بار وہ تمہیں بھی تو شملہ لے گیا تھا''۔

عبدالمجید یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی بیوی کا منہ چوم لیا۔

''بھئی کیا ترکیب سوچی ہے...... یعنی سوٹ گنڈا سنگ کے جسم پر ہی رہے گا اور وہ شملے پہنچ جائے گا...... اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے''۔

دوسرے روز شام کو گنڈا سنگھ آیا تو عبدالمجید نے شملہ جانے کی رائے پیش کی۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے قطعاً نہ سوچا کہ شملے جا کر وہ بغیر روپے پیسے کے کس طرح گزارہ کرے گا۔ دراصل ایسی باتوں پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

تیسرے دن نصیر نے گنڈا سنگھ کو گاڑی پر سوار کرا دیا اور گارڈ نے جو کہ اس کا دوست تھا کہہ دیا تھا کہ وہ اسے بحفاظت تمام شملے پہنچا دے۔

گولی

شفقت دوپہر کو دفتر سے آیا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عورتیں تھیں جو بڑے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ شفقت کی بیوی عائشہ ان کی مہمان نوازی میں مصروف تھی۔ جب شفقت صحن میں داخل ہوا تو اس کی بیوی باہر نکلی اور کہنے لگی ''عزیز صاحب کی بیوی اور ان کی لڑکیاں آئی ہیں''۔

شفقت نے ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا ''کون عزیز صاحب''۔

عائشہ نے آواز دبا کر جواب دیا ''ہائے آپ کے ابا جی کے دوست!''

''اوہ...... عزیز چچا''۔

''ہاں...... ہاں وہی''۔

شفقت نے ذرا حیرت سے کہا ''مگر وہ تو افریقہ میں تھے''۔

عائشہ نے منہ پر انگلی رکھی ''ذرا آہستہ بات کیجیے۔ آپ تو چلانا شروع کر دیتے ہیں...... وہ افریقہ میں تھے لیکن جو افریقہ میں ہو کیا واپس نہیں آ سکتا''۔

''لو...... اب تم لگیں مین میخ کرنے''۔

''آپ تو لڑنے لگے''۔ عائشہ نے ایک نظر اندر کمرے میں ڈالی ''عزیز صاحب افریقہ ہی میں ہیں لیکن ان کی بیوی اپنی لڑکی شادی کرنے آئی ہیں۔ کوئی اچھا بر ڈھونڈ رہی ہیں''

اندر سے عزیز کی بیوی کی آواز آئی ''عائشہ تم نے روک کیوں لیا شفقت کو...... آنے دو...... آؤ شفقت بیٹا آؤ...... تمہیں دیکھے اتنی مدت ہو گئی ہے''۔

''آیا چچی جان! شفقت نے ہیٹ اسٹینڈ کی کھونٹی پر رکھا اور اندر کمرے میں داخل ہوا۔ ''آداب عرض چچی جان!''۔

عزیز کی بیوی نے اٹھ کر اس کو دعائیں دیں۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور بیٹھ گئی شفقت بیٹھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر دو گوری گوری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک چھوٹی تھی' دوسری بڑی۔ دونوں کی شکل آپس میں ملتی تھی۔ عزیز صاحب بڑے وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی یہ وجاہت لڑکیوں میں بڑے دلکش طور پر تقسیم ہوئی تھی۔ آنکھیں ماں کی تھیں۔ نیلی ...... بال بھورے اور کافی لمبے۔ دونوں کی دو چوٹیاں تھیں چھوٹی کا چہرہ بڑی کے مقابلے میں زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ بڑی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ ان کی ماں ان سے مخاطب ہوئی ''بیٹا سلام کرو بھائی کو''۔

چھوٹی نے اٹھ کر شفقت کو آداب عرض کیا۔ بڑی نے بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر کہا ''تسلیمات''۔

شفقت نے مناسب و موزوں جواب دیا۔ اس کے بعد عزیز صاحب اور افریقہ کے متعلق باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ نیروبی' تانگانیکا' دارالسلام' کراچینیا' یوگنڈا ان سب کی باتیں ہوئی۔ کہاں کا موسم اچھا ہے؟ کہاں کا خراب ہے پھل کہاں اچھے ہوتے ہیں...... پھلوں کا ذکر چھڑا تو چھوٹی نے کہا ''یہاں ہندوستان میں تو نہایت ہی ذلیل پھل ملتے ہیں''۔

''جی نہیں ...... بڑے اچھے پھل ملتے ہیں۔ بشرطیکہ موسم ہو''۔ شفقت نے اپنے ہندوستان کی آبرو بچانا چاہی۔

"غلط ہے" چھوٹی نے ناک چڑھائی۔ "امی جان! یہ جو کل آپ نے مارکیٹ سے مالٹے لیے تھے کیا وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں"۔

لڑکیوں کی ماں بولی "شفقت بیٹا یہ صحیح کہتی ہے یہاں کے مالٹے وہاں کے مچنگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔

عائشہ نے چھوٹی سے پوچھا "طاعت! یہ مچنگا کیا ہوتا ہے...... نام تو بڑا عجیب وغریب ہے"۔

طاعت مسکرائی "آپا ایک پھل ہے۔ مالٹے اور میٹھے کی طرح...... اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی...... رس...... ایک نچوڑیے...... یہ گلاس جو تپائی پر پڑا ہے لبالب بھر جائے"۔

شفقت نے گلاس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ پھل کتنا بڑا ہوگا۔ "ایک مچنگے سے اتنا بڑا گلاس بھر جاتا ہے"۔

طاعت نے بڑے فخریہ انداز میں کہا "جی ہاں"۔

شفقت نے یہ سن کر کہا "تو پھل یقیناً بہت بڑا ہوگا"۔

طاعت نے سر ہلایا "جی نہیں...... بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا...... بس آپ کے یہاں کے بڑے مالٹے کے برابر ہوتا ہے۔ یہی تو اس کی خوبی ہے کہ رس ہی رس ہوتا ہے اس میں...... اور اماں جان وہاں کا اناس...... بڑی روٹی کے برابر اس کی ایک قاش ہوتی ہے"۔

دیر تک اناس کی باتیں ہوتی رہیں۔ طاعت بہت باتونی تھی۔ افریقہ سے اس کو عشق تھا۔ وہاں کی ہر چیز اس کو پسند تھی۔ بڑی جس کا نام نگہت تھا بالکل خاموش

بیٹھی رہی۔ اس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ شفقت کو جب محسوس ہوا کہ وہ خاموش بیٹھی ہوئی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہوا ''آپ غالباً ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں''۔

نگہت نے اپنے ہونٹ کھولے ''جی نہیں ...... سنتی رہی ہوں بڑی دلچسپی ہے''۔

شفقت نے کہا ''لیکن آپ بولیں نہیں''۔

عزیز کی بیوی نے جواب دیا ''شفقت بیٹا اس کی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے''۔

شفقت نے ذرا بے تکلفی سے کہا ''چچی جان ...... اس عمر میں لڑکیوں کو خاموش پسند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہو۔'' پھر وہ نگہت سے مخاطب ہوا ''جناب آپ کو بولنا پڑے گا''۔

نگہت کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پیدا ہوئی ''بول تو رہی ہوں بھائی جان!''

شفقت مسکرایا ''تصویروں میں دلچسپی ہے آپ کو''۔

نگہت نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا ''جی ہے''۔

''تو اٹھیے میں آپ کو البم دکھاؤں ...... دوسرے کمرے میں ہے''۔ یہ کہہ کر شفقت اٹھا ''چلیے''۔

عائشہ نے شفقت کا ہاتھ دبایا۔ پلٹ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا جسے شفقت نہ سمجھ سکا۔ وہ متحیر تھا کہ خدا معلوم کیا بات تھی کہ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ دبایا اور اشارہ

بھی کیا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ طلعت کھٹ سے اٹھی۔ ''چلیے بھائی جان ...... مجھے دوسروں کے البم دیکھنے کا بہت شوق ہے ...... میرے پاس بھی ایک کولیکشن ہے''۔

شفقت طلعت کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نگہت خاموش بیٹھی رہی۔ شفقت طلعت کو تصویریں دکھاتا رہا حسب عادت طلعت بولتی رہی۔ شفقت کا دماغ کسی اور طرف تھا۔ وہ نگہت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ اس قدر خاموش کیوں ہے۔ تصویریں دیکھنے اس کے ساتھ کیوں نہ آئی۔ جب اس نے اس کو چلنے کے لیے کہا تو عائشہ نے اس کا ہاتھ کیوں دبایا۔ اس اشارے کا کیا مطلب تھا جو اس نے آنکھوں کے ذریعے کیا تھا۔

تصویریں ختم ہو گئیں۔ طلعت نے البم اٹھایا اور شفقت سے کہا۔ ''باجی کو دکھاتی ہوں۔ ان کو بہت شوق ہے تصویریں جمع کرنے کا''۔

شفقت پوچھنے ہی والا تھا کہ اگر ان کو شوق ہے تو وہ اس کے ساتھ کیوں نہ آئیں مگر طلعت البم اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ شفقت بڑے کمرے میں داخل ہوا تو نگہت بڑی دلچسپی سے البم کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ہر تصویر اس کو مسرت پہنچاتی تھی۔

عائشہ لڑکیوں کی ماں سے باتیں کرنے میں مشغول رہی تھی۔ شفقت کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی دھند میں لپٹا تھا۔ اب بشاش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تصویریں جو آرٹ کا بہترین نمونہ تھیں اس کو راحت بخش رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اب چمک تھی۔ لیکن جب ایک گھوڑے اور صحت مند عورت کی تصویر آئی تو یہ چمک ماند پڑ گئی۔ ایک ہلکی سی آہ اس کے سینے

میں لرزی اور وہیں دب گئی۔

تصویریں ختم ہوئیں تو نگہت نے شفقت کی طرف دیکھا اور بڑے پیارے انداز میں کہا ”بھائی جان شکریہ“۔

شفقت نے البم نگہت کے ہاتھ سے لیا اور مینٹل پیس پر رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں کھد بد ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑا اسرار اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ ہے۔ اس نے سوچا شاید کوئی نامکمل رومان ہو یا کوئی نفسیاتی حادثہ۔

چائے آئی تو شفقت نگہت سے مخاطب ہوا۔ ”اٹھیے...... چائے بنائیے...... یہ پرولج لیڈیز کا ہے“۔

نگہت خاموش رہی لیکن طاعت پھدک کر اٹھی ”بھائی جان میں بناتی ہوں“۔

نگہت کا چہرہ پھر دھند میں ملفوف ہو گیا۔ شفقت کا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک بار جب اس نے غیر ارادی طور پر نگہت کو گھور کے دیکھا تو وہ سٹپٹا سی گئی۔ شفقت کو دل ہی دل میں اس بات کا افسوس ہوا کہ اس نے کیوں ایسی نازیبا حرکت کی۔

چائے پر ادھر ادھر کی بے شمار باتیں ہوئی۔ طاعت نے ان میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ ٹینس کا ذکر آیا تو اس نے شفقت کو بڑے فخریہ انداز میں جو شیخی کی حد تک جا پہنچا تھا' بتایا کہ وہ نیروبی میں نمبر ون ٹینس پلیئر تھی اور پندرہ بیس کپ جیت چکی تھی۔ نگہت بالکل خاموش رہی اس کی خاموشی بڑی اداس تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ خاموش ہے۔

ایک بات جو شفقت نے خاص طور پر نوٹ کی یہ تھی کہ عزیز کی بیوی کی ممتا کا رخ زیادہ تر نگہت کی طرف تھا۔ اس نے خود اٹھ کر بڑے پیار محبت سے اس کو کریم

رول دیے۔ منہ پونچھنے کے لیے رومال دیا۔ اس سے کوئی بات کرتی تھی تو اس میں پیار بھی ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ باتوں کے ذریعے بھی اس کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیر رہی ہے یا اس کو چمکار رہی ہے۔

رخصت کا وقت آیا تو عزیز کی بیوی اٹھی برقع اٹھایا عائشہ سے گلے ملی۔ شفقت کو دعائیں دیں اور نگہت کے پاس جا کر آنکھوں میں آنسو دلا دینے والے پیار سے کہا "چلو بیٹا چلیں"۔

طلعت پھدک کر اٹھی۔ عزیز کی بیوی نے نگہت کا ایک بازو تھاما دوسرا بازو طلعت نے پکڑا۔ اس کو اٹھایا گیا۔ شفقت نے دیکھا کہ اس کا نچلا دھڑ بالکل بیجان ہے۔ ایک لمحے کے لیے شفقت کا دل و دماغ ساکت ہو گیا جب وہ سنبھلا تو اسے اپنے اندر ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔

لڑکھڑاتی ٹانگوں ماں اور بہن کا سہارا لیے نگہت غیر یقینی قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر شفقت اور عائشہ کو آداب عرض کیا۔ کتنا پیارا انداز تھا۔ مگر اس کے ہاتھ نے شفقت کے دل پر جیسے گھونسہ مارا...... سارا اسرار اس پر واضح ہو گیا تھا۔ سب سے پہلا خیال اس کے دماغ میں یہ آیا "قدرت کیوں اتنی بے رحم ہے...... ایسی پیاری لڑکی اور اس کے ساتھ یہ ظالمانہ اور بہیمانہ سلوک...... اس معصوم کا آخر گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا اتنی کڑی دی گئی؟"

سب چلے گئے۔ عائشہ ان کو باہر تک چھوڑنے گئی۔ شفقت ایک فلسفی بن کر سوچتا رہ گیا۔ اتنے میں شفقت کے دوست آ گئے اور وہ بھی اپنی بیوی سے نگہت کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکا...... اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں ایسا

مشغول ہوا کہ نگہت اور اس کے روگ کو بھول گیا۔ جب رات ہو گئی اور عائشہ نے اسے نوکر کے ذریعے سے کھانے پر بلوایا تو اسے افسوس ہوا کہ اس نے محض کھیل کی خاطر نگہت کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ اس کا ذکر اس نے عائشہ سے بھی کیا' لیکن اس نے کہا ''آپ کھانا کھائیے مفصل باتیں پھر ہو جائیں گی''۔

میاں بیوی دونوں اکٹھے سوتے تھے۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی رات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اور ان کی شادی کو قریب قریب چھ برس ہو گئے تھے۔ مگر اس دوران میں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ عائشہ میں کچھ قصور ہے جو اپریشن سے دور ہو سکتا ہے مگر وہ اس سے بہت خائف تھی ۔میاں بیوی بہت پیار محبت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انکے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔

رات کو وہ اکٹھے لیٹتے ۔حسب معمول جب ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے تو شفقت کو نگہت کی یاد آئی۔ اس نے ایک آہ بھر کر اپنی بیوی سے پوچھا ''عائشہ نگہت بے چاری کو کیا روگ ہے؟''

عائشہ نے بھی آہ بھری اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہا ''تین برس کی ننھی منی بچی تھی کہ تپ محرقہ ہوا۔ نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا''۔

شفقت کے دل میں نگہت کے لیے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا۔

اس نے اپنی بیوی کی پیٹھ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا ''عائشہ کیوں خدا اتنا ظالم ہے؟''

عائشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شفقت کو دن بھر کے واقعات یاد آنے لگے

"جب میں نے اس سے کہا تھا کہ چلو میں تمہیں البم دکھاتا ہوں تو تم نے میرا ہاتھ اسی لیے دبایا تھا کہ......"

"ہاں......ہاں......اور کیا؟ آپ تو بار بار......"

"خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں تھا"۔

"اس کو اس کا بہت احساس ہے کہ وہ اپاہج ہے"۔

"تم نے یہ کہا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے سینے میں کسی نے تیر مارا ہے"۔

"جب وہ آئی تو خدا کی قسم مجھے بہت دکھ ہوا...... بے چاری کو پیشاب کرنا تھا ۔ماں اور چھوٹی بہن ساتھ گئیں ۔ازار بند کھولا......پھر بند کیا......

"کتنی خوبصورت ہے......بیٹھی......ہو تو خدا کی قسم بالکل پتہ نہیں چلتا کہ فالج زدہ ہے"۔

"بڑی ذہین لڑکی ہے"۔

"اچھا؟"

"ماں کہتی تھی کہ اس نے کہا تھا کہ امی جان میں شادی نہیں کروں گی۔ کنواری رہوں گی"۔

شفقت تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔اس کے بعد اس نے انتہائی دکھ محسوس کرتے ہوئے کہا "تو اس کو اس بات کا احساس ہے کہ اس سے شادی کرنے کے لیے کوئی رضامند نہیں ہو گا"۔

عائشہ نے شفقت کی چھاتی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا

......''شفقت صاحب کون شادی کرے گا ایک اپاہج سے''۔

''نہیں نہیں ایسا نہ کہو عائشہ''۔

''اتنی بڑی قربانی کون کر سکتا ہے شفقت صاحب؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو''۔

''خوبصورت ہے' اچھے کھاتے پیتے ماں باپ کی لڑکی ہے......سب ٹھیک ہے مگر......''

''میں سمجھتا ہوں......لیکن......''

''مردوں کے دل میں رحم کہاں؟''

شفقت نے کروٹ بدلی ''ایسا نہ کہو عائشہ''۔

عائشہ نے بھی کروٹ بدلی۔ دونوں روبرو ہو گئے۔ ''میں سب جانتی ہوں کوئی ایسا مرد ڈھونڈیے جو اس بے چاری سے شادی کرنے پر آمادہ ہو''۔

''مجھے معلوم نہیں لیکن......''

''بڑی بہن ہے غریب کو کتنا دکھ ہوتا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے''۔

''صحیح کہتی ہو تم''۔

عائشہ نے ایک لمبی آہ بھری ''کیا بے چاری اسی طرح ساری عمر کڑھتی رہے گی''۔

''نہیں'' یہ کہہ کر شفقت اٹھ کر بیٹھ گیا۔

عائشہ نے پوچھا ''کیا مطلب؟''

”تمہیں اس سے ہمدردی ہے؟“

”کیوں نہیں؟“

”خدا کی قسم کھا کر کہو“۔

”ہائے...... یہ بھی کوئی قسم کھلوانے کی بات ہے ہر انسان کو اس سے ہمدردی ہونی چاہیے“۔

شفقت نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا ”تو میں نے ایک بات سوچی ہے“۔

عائشہ نے خوش ہو کر کہا ”کیا؟“

”مجھے ہمیشہ اس بات کا خیال رہا ہے تم بہت بلند خیال عورت ہو۔ آج تم نے میرے اس خیال کو ثابت کر دیا ہے...... میں نے...... خدا میرے اس ارادے کو استقامت بخشے...... میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں نگہت سے شادی کر لوں گا...... سارا ثواب تمہیں ملے گا......“

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر ایک دم جیسے گولہ پھٹا......

”شفقت صاحب میں آپ کو گولی مار دوں گی اگر آپ نے اس سے شادی کی......“

شفقت نے ایسا محسوس کیا کہ اسے زبردست گولی لگی ہے اور وہ مر کر اپنی بیوی کی آغوش میں دفن ہو گیا ہے......

۲۳ جولائی ۱۹۵۰

☆☆☆

گورمکھ سنگھ کی وصیت

پہلے چھرا بھونکنے کی اکا دکا واردات ہوتی تھی۔ اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگی تھیں جن میں چاقو چھروں کے علاوہ کرپانیں تلواریں اور بندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں کبھی کبھی دیسی ساخت کے بم پھٹنے کی اطلاع بھی ملتی تھی۔

امرتسر میں قریب قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے جونہی ٹھنڈا ہوا فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آ جائے گی۔ اس سے پہلے ایسی کئی فساد امرتسر میں ہو چکے تھے جو دیرپا نہیں تھے۔ دس پندرہ روز تک مارکٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پرانے تجربے کی بنا پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ تھوڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا...... بلووں کا زور روز بدن بڑھتا ہی گیا۔

ہندوؤں کے محلے میں جو مسلمان رہتے تھے بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مسلمانوں کے محلے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رخ کرنے لگے۔ مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا۔ اس وقت تک کے لیے جب فضا فسادات کے تکدر سے پاک ہو جانے والی تھی۔

میاں عبدالحیٔ ریٹائرڈ سب جج کو تو سو فیصدی یقین تھا کہ صورت حال بہت جلد درست ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا۔ ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پرانا ملازم تھا جس کی عمر ستر کے

لگ بھگ تھی مختصر سا خاندان تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو میاں صاحب نے بطور حفظ ماتقدم کافی راشن گھر میں جمع کر لیا تھا۔ اس طرف سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خدانخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دکانیں وغیرہ بند ہو گئیں تو انہیں کھانے پینے کے معاملے میں تردد نہیں کرنا پڑے گا لیکن ان کی جوان لڑکی صغریٰ بہت متردد تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اونچا۔ اس کی ممٹی سے شہر کا تین چوتھائی حصہ بخوبی نظر آتا تھا۔ صغریٰ اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہو گئی تھی اس لیے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔

رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھتے جیسے دیو ہیں جو اپنے منہ سے آگ کے فوارے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہر ہر مہا دیو اور اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔

صغریٰ باپ سے اپنے خوف و ہراس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی باتیں اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ صغریٰ کو اس سے ایک گونہ اطمینان تھا۔ مگر جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں کا پانی آنا بند ہو گیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی کہ چند روز کے لیے شریف پورے اٹھ جائیں جہاں اڑوس پڑوس کے سارے

مسلمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا "بیکار گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں حالات بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے"۔

مگر حالات بہت جلدی ٹھیک نہ ہوئے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلّہ جس میں میاں عبدالحیٔ کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز اچانک فالج گرا جس کے باعث وہ صاحب فراش ہو گئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے گھر میں اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا اب باپ کی چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے لگا۔

وہ بازار جو ان کے مکان کیساتھ ملحق تھا سنسان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی ڈسپنسری مدت سے بند پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر ڈاکٹر گوراند تامل تھے۔ صغریٰ نے شہ نشین سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت ہی مخدوش تھی۔ صغریٰ اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لے جا کر اس نے کہا "خدا کے لیے تم ہی کچھ کرو میں جانتی ہوں کہ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں مگر تم جاؤ...... کسی کو بھی بلا لاؤ اباجی کی حالت بہت خطرناک ہے"۔

بشارت گیا مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں اس نے ایک لاش دیکھی تھی۔ خون سے تر بتر...... اور پاس ہی بہت سے آدمی ٹھاٹے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغریٰ نے اپنے خوفزدہ بھائی کو اپنے سینے سے لگایا اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی۔ مگر اس سے اپنے باپ کی حالت دیکھی نہیں

جاتی تھی۔ میاں صاحب کے جسم کا داہنا حصہ بالکل سن ہو گیا تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ گویائی میں بھی فرق پڑ گیا تھا اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغریٰ گھبرانے کی کوئی بات نہیں خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے۔ صرف دو رہ گئے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضا بالکل صاف ہو جائے گی مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روز قیامت ہو کیونکہ ممٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصے سے دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغریٰ اور بشارت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکتے تھے۔ صغریٰ کو تو یوں بھی باپ کی تیمارداری کے لیے جاگنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ دھماکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر ہو رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلوج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف...... ستر برس کا ایک بڈھا ملازم اکبر تھا جس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات پڑا اپنی کوٹھڑی میں کھانستا کھنکھارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔ ایک روز تنگ آ کر صغریٰ اس پر برس پڑی ”تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پرلے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا موقع آیا ہے تو دمے کا بہانہ کر کے یہاں پڑے رہتے ہو...... وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے“۔

صغریٰ اپنا جی ہلکا کر کے چلی گئی۔ بعد میں افسوس ہوا کہ ناحق اس غریب کو اتنی

لعنت ملامت کی۔ رات کا کھانا تھال میں لگا کر اس کی کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا خالی ہے بشارت نے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ میاں صاحب کے لیے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغریٰ نے بہت دعائیں مانگیں کہ خدا اسے کامیاب کرے لیکن دو دن گزر گئے اور وہ نہ آیا۔

شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغریٰ اور بشارت دیکھ چکے تھے جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے۔ جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لیے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دوسرے روز عید تھی۔ صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونوں اس اعلان کے لیے کتنے بےتاب ہوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی مٹیلا ٹکڑا جم جاتا تو کتنی کوفت ہوتی تھی انہیں مگر اب چاروں طرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغریٰ اور بشارت دونوں ممٹی پر چڑھے۔ دور کہیں کہیں کوٹھوں پر لوگوں کے سائے دھبوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے۔ مگر معلوم نہیں یہ چاند کو دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔

چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آ گیا۔ صغریٰ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدا اپنا فضل کرے اور اس کے باپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گڑبڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید غارت ہو گئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھلا نہیں تھا۔ یعنی شام کی سیاہی ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کی چارپائی چھڑکاؤ کیے ہوئے صحن میں بچھی تھی۔ وہ اس پر بےحس

وحرکت لیٹے تھے اور دور آسمان پر نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغریٰ نے پاس آ کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغریٰ نے سر جھکایا تو انہوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں مگر انہوں نے تسلی دینے کی خاطر بمشکل اپنی نیم مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے "اللہ تبارک وتعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا"۔

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میاں صاحب صغریٰ سے مخاطب ہوئے "دیکھو کون ہے"۔

صغریٰ نے سوچا شاید بڈھا اکبر ہو۔ اسی خیال میں اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ بشارت کا بازو پکڑ کر اس نے کہا "جاؤ دیکھو...... شاید اکبر آیا ہے"۔

یہ سن کر میاں صاحب نے نفی میں یوں سر ہلایا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں "نہیں یہ اکبر نہیں ہے"۔

صغریٰ نے کہا "تو اور کون ہو سکتا ہے ابا جی!"

میاں عبدالحئی نے اپنی قوت گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ بشارت آ گیا وہ سخت خوفزدہ تھا۔ ایک سانس اوپر ایک نیچے صغریٰ کو میاں صاحب کی چارپائی سے ایک طرف ہٹا کر اس نے ہولے سے کہا "ایک سکھ ہے"۔

صغریٰ کی چیخ نکل گئی "سکھ؟...... کیا کہتا ہے؟"

بشارت نے جواب دیا ''کہتا ہے دروازہ کھولو''۔

صغریٰ نے کانپتے ہوئے بشارت کو کھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور باپ کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظروں سے دیکھنے لگی۔

میاں عبدالحئی کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ''جاؤ گورمکھ سنگھ ہے''۔

بشارت نے نفی میں سر ہلا دیا ''نہیں کوئی اور ہے''۔

میاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا ''جاؤ صغریٰ وہی ہے''۔

صغریٰ اٹھی۔ وہ گورمکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ دیر پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغریٰ کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومالی سویوں کا ایک تھیلا لے کر آیا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا۔ ''سردار جی آپ تکلف نہ کیا کریں''۔ مگر وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیا کرتا تھا ''میاں صاحب واہگورو جی کی کرپا سے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ یہ تو ایک تحفہ ہے جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا اس کا بدلہ تو میری سو پشت بھی نہیں چکا سکتی...... خدا آپ کو خوش رکھے''۔

سردار گورمکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ صغریٰ کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہو گا، مگر بشارت بھی تو اس کو سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا، پھر اس نے کیوں کہا کوئی

اور ہے......اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتی صغریٰ ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازہ کھولے یا اندر ہی سے پوچھے' اس کے متعلق ابھی وہ فیصلہ ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے حلق سے آواز نکالی ''کون ہے؟''

بشارت پاس کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا۔ اور صغریٰ سے کہا ''اس میں سے دیکھو''۔

صغریٰ نے درز میں سے دیکھا۔ گورمکھ سنگھ نہیں تھا وہ تو بہت بوڑھا تھا لیکن یہ جو باہر تھڑے پر کھڑا تھا جوان تھا۔ صغریٰ ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغریٰ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک تھیلا ہے ویسا ہی جیسا گورمکھ سنگھ لایا کرتا تھا۔

صغریٰ نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بلند آواز میں دستک والے سے پوچھا ''کون ہیں آپ؟''

باہر سے آواز آئی ''جی...... جی میں...... میں سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا ہوں...... سنتوکھ''۔

صغریٰ کا خوف بہت حد تک دور ہو گیا۔ بڑی شائستگی سے اس نے پوچھا ''فرمائیے...... آپ کیسے آئے ہیں''۔

باہر سے آواز آئی ''جی...... جج صاحب کہاں ہیں''۔

صغریٰ نے جواب دیا ''بیمار ہیں''

سردار سنتوکھ سنگھ نے افسوس آمیز لہجے میں کہا ''اوہ...... پھر اس نے کاغذ کا

تھیلا کھڑکھڑایا ''جی یہ سویاں ہیں...... سردار جی کا دیہانت ہو گیا ہے...... وہ مر گئے ہیں''۔

صغریٰ نے جلدی سے پوچھا ''مر گئے ہیں''۔

باہر سے آواز آئی ''جی ہاں...... ایک مہینہ ہو گیا ہے...... مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹا! میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس برس سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں...... یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہوگا...... میں نے انہیں وچن دیا تھا۔ جو میں پورا کر رہا ہوں...... لے لیجیے سویاں''۔

صغریٰ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گورمکھ سنگھ کے لڑکے نے سویوں کا تھیلا آگے بڑھا دیا جو صغریٰ نے پکڑ لیا اور کہا ''خدا سردار جی کو جنت نصیب کرے''۔

گورمکھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا ''جج صاحب بیمار ہیں''۔

صغریٰ نے جواب دیا ''جی ہاں''۔

''کیا بیماری ہے؟''

''فالج''۔

''اوہ سردار جی زندہ ہوتے تو انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوتا...... مرتے دم تک انہیں جج صاحب کا احسان یاد تھا۔ کہتے تھے وہ انسان نہیں دیوتا ہیں...... اللہ میاں انہیں زندہ رکھے...... انہیں میرا سلام کہنا''۔

اور یہ کہہ کر وہ تھڑے سے اتر گیا...... صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھہرائے

اور کہے کہ جج صاحب کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر دے۔

سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتوکھ جج صاحب کے مکان کے تھڑے سے اتر کر چند گز آگے بڑھا تو چار ٹھاٹا باندھے ہوئے آدمی اس کے پاس آئے دو کے پاس جلتی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر اور کچھ دوسری آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتوکھ سے پوچھا ''کیوں سردار جی اپنا کام کر آئے؟''

سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا ''ہاں کر آیا''۔

اس آدمی نے ٹھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا ''تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا''۔

''ہاں...... جیسے تمہاری مرضی''۔ یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء

☆☆☆

لالٹین

میرا قیام "بٹوت" میں گو مختصر تھا لیکن گونا گوں روحانی مسرتوں سے پر۔ میں نے اس کی صحت افزا فضا میں جتنے دن گزارے ہیں ان یکھ ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جزو بن کے رہ گئی ہے۔ جو بھلائے نہ بھولے گی .... کیا دن تھے بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے اور میں کئی کئی گھنٹے اس کے زیر اثر بے خود و مدہوش رہتا ہوں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہیکہ انسان اپنی گزشتہ زندگی کے کھنڈروں پر مستقبل کی دیواریں استوار کرتا ہے۔ ان دنوں میں بھی یہی کر رہا ہوں یعنی بیتے ہوئے ایام کی یاد کو اپنی مضمحل رگوں میں زندگی بخش انجکشن کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

جو کل ہوا تھا اسے اگر آج دیکھا جائے تو اس کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ نظر آئے گا اور جو کل ہونا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ آج سے پورے چار مہینے کی طرف دیکھا جائے تو بٹوت میں میری زندگی ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا افسانہ جس کا مسودہ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنا دوسرے انسانوں کی طرح میرے بس میں بھی نہیں۔ جب میں استقبال کے آئینہ میں اپنی آنے والی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتا ہوں تو اس میں مجھے حال ہی کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی کبھی اس تصویر کے پس منظر میں ماضی یکھ دھندلے نقوش نظر آجاتے ہیں۔ ان میں بعض نقش اس قدر تیکھے اور شوخ رنگ ہیں کہ شاید ہی انہیں زمانہ کا ہاتھ مکمل طور پر مٹا سکے۔

زندگی کے اس کھوئے ہوئے ٹکڑے کو میں اس وقت زمانہ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں جو شریر بچے کی طرح مجھے بار بار اس کی جھلک دکھا کر اپنی پیٹھ پیچھے چھپالیتا ہے......اور میں اس کھیل ہی سے خوش ہوں۔اس کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

ایسے واقعات کو جن کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے میں عام طور پر دہراتا رہتا ہوں تاکہ ان کی تمام شدت برقرار رہے اور اس غرض کے لیے میں کئی طریقے استعمال کرتا ہوں۔بعض اوقات میں یہ بیتے ہوئے واقعات اپنے دوستوں کو سنا کر اپنا مطلب حل کر لیتا ہوں۔اگر آپ کو میرے ان دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آپ سے یقیناً یہی کہیں گے کہ میں قصہ گوئی اور آپ بیتیاں سنانے کا بالکل سلیقہ نہیں رکھتا۔یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ داستان سنانے کے دوران مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میرا بیان غیر مربوط ہے اور میں جانتا ہوں کہ چونکہ میری داستان ہمواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں اس لیے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ میں منتقل نہیں کر سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں ایسا ہی کر سکوں۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی داستان سناتے سناتے جب ایسے مقام پر پہنچتا ہوں جس کی یاد میرے ذہن میں موجود نہ تھی اور وہ خیالات کی رو میں خود بخود بہہ کر چلی آئی تھی تو میں غیر ارادی طور پر اس نئی یاد کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل یک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرائیوں سے نکل کر داستان کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو عجلت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا۔

کبھی کبھی میں یہ داستانیں رات کو سوتے وقت اپنے ذہن میں زبانی خود سنتا ہوں لیکن اس دوران میں مجھے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اس کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اتنی تفصیل کے ساتھ خود بخود بیان ہونا شروع ہو جاتے ہیں کہ طبیعت اکتا جاتی ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کسی دوسرے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور اس کا احساس کسی دوسرے احساس کو اپنے ساتھ لے آتا ہے اور پھر احساسات و افکار کی بارش زوروں پر شروع ہو جاتی ہے اور اتنا شور مچتا ہے کہ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جس روز صبح کو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آئیں آپ سمجھ لیا کریں کہ ساری رات میں اپنے ذہن کی قصہ گوئی کا شکار رہا ہوں۔

جب مجھے کسی بیتے ہوئے واقعہ کو اس کی تمام شدتوں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے تو میں قلم اٹھاتا ہوں اور کسی گوشے میں بیٹھ کر کاغذ پر اپنی زندگی کی اس ٹکڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں یہ تصویر بھدی ہوتی ہے یا خوبصورت اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ادبی نقاد میری ان قلمی تصویروں کے متعلق کیا رائے مرتب کرتے ہیں۔ دراصل مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اگر میری تصویر کشی سقیم اور خام ہے تو ہوا کرے مجھے اس سے کیا اور اگر یہ ان کے مقرر کردہ معیار پر پوری اترتی ہے تو بھی مجھے اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ میں یہ کہانیاں صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ جس طرح عادی شراب خور دن ڈھلے شراب خانہ کا رخ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح میری

انگلیاں بے اختیار قلم کی جانب بڑھتی ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میرا روئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا ہے یا ان چند افراد کی طرف جو میری تحریروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ادب سے دور اور زندگی سے نزدیک تر ہوں۔

زندگی......زندگی!......آہ زندگی!!

میں زندگی زندگی پکارتا ہوں مگر مجھ میں زندگی کہاں؟ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پونچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اس آدمی کی طرح جس کے گھر میں تھوڑا سامان ہو ان کی نمائش کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے اپنا یہ فعل برا معلوم ہوتا ہے لیکن میں کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر مجھ میں سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ دنیا میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔

گو میرا شباب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دنوں کی یاد پر جی رہا ہوں جب میں جوان تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سہارا بھی کسی روز جواب دے جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا میں بتا نہیں سکتا لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انجام چشم فلک کو بھی نمناک کر دے گا۔ آہ! خرابۂ فکر کا انجام۔

وہ شخص جسے انجام کار اپنے وزنی افکار کے نیچے پس جانا ہے یہ سطور لکھ رہا ہے

اور مزے کی بات ہے کہ وہ ایسی اور بہت سی سطریں لکھنے کی تمنا اپنے دل میں رکھتا ہے۔

میں ہمیشہ مغموم وملول رہا ہوں لیکن شبیر جانتا ہے کہ ہٹوت میں میری آہوں کی زردی اور تپش کے ساتھ ساتھ ایک خوش گوار مسرت کی سرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے اس کی نگاہوں میں میرے وجود کو ایک معمہ بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کوشش میں وہ میرے قریب بھی آ جاتا تھا۔ مگر دفعتاً کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوتا جس کے باعث اسے پھر پرے ہٹنا پڑتا تھا اور اس طرح وہ نئی شدت سے مجھے پراسرار اور کبھی پر تصنع انسان سمجھنے لگتا۔

اکرم صاحب حیران تھے کہ ہٹوت جیسی غیر آباد اور غیر دلچسپ دیہات میں پڑے رہنے سے میرا کیا مقصد ہے۔ وہ ایسا کیوں سوچتے تھے؟ اس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسی مسئلے پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔

وزیر کا گھر ان کے بنگلے کے سامنے بلند پہاڑی پر تھا اور جب انہوں نے اپنے نوکر کی زبانی یہ سنا کہ میں اس پہاڑی لڑکی کے ساتھ پہروں باتیں کرتا رہتا ہوں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ میری دکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ آ گئی ہے اور انہوں نے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جس کے افشا پر تمام دنیا کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ لوگوں سے وہ جب اس مسئلے پر باتیں کرتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے کہ میں تعیش پسند ہوں اور ایک بھولی بھالی لڑکی کو پھانس رہا ہوں اور ایک بار جب

انہوں نے مجھ سے بات کی تو کہا۔ دیکھیے یہ پہاڑی لونڈیا بڑی خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو آپ اس کے جال میں پھنس جائیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں یا کسی اور کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وزیر کا کریکٹر بہت خراب تھا اور میرا کریکٹر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ کیوں میری فکر میں مبتلا تھے اور پھر جو ان کے من میں تھا صاف صاف کیوں نہیں کہتے تھے۔ وزیر پر میرا کوئی حق نہیں تھا اور نہ وہ میرے دباؤ میں تھی۔ اکرام صاحب یا کوئی اور صاحب اگر اس سے دوستانہ ماحول پیدا کرنا چاہتے تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دراصل ہماری تہذیب و معاشرت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ عام طور پر صاف گوئی کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ کھل کر بات ہی نہیں کی جاتی اور کسی کے متعلق اگر اظہار خیال کیا بھی جاتا ہے تو غلاف چڑھا کر۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور اس پہاڑی لونڈیا سے جسے بڑا خطرناک کہا جاتا تھا اپنی دلچسپی کا اعتراف کیا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے دل کی آواز کو دل ہی میں دبا کر رکھنے کے عادی تھے اس لیے میری سچی باتیں ان کو بالکل جھوٹی معلوم ہوئیں اور ان کا شک بدستور قائم رہا۔

میں انہیں کیسے یقین دلاتا کہ میں اگر وزیر میں دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی و حال تاریک ہے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ اسی لیے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا۔ وزیر سے میری دلچسپی اس محبت کا ریہرسل تھی جو میرے دل میں اس عورت کے لیے موجود ہے جو ابھی میری زندگی میں نہیں آئی۔ میری

زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک چھوٹا سا نگینہ تھی لیکن یہ نگینہ مجھے بڑا عزیز تھا اس لیے اس کی تراش خراش اس کا ماپ بالکل اس اصلی نگینہ کے مطابق تھا جس کی تلاش میں میں ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔

وزیر سے میری دل بستگی بے غرض نہیں تھی اس لیے میں غرض مند تھا وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق بخشنا چاہتا ہو اس سے زیادہ خودغرض اور کون ہو سکتا ہے؟ اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا...... اپنے ماضی حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس...... مگر بٹوت میں اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی وزیر کی لال ٹین!

بھٹیارے کے ہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور شبیر ٹہلتے ٹہلتے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ بنگلہ ہوٹل سے قریباً تین جریب کے فاصلے پر تھا۔ رات کی خنک اور نیم مرطوب ہوا میں اس چہل قدمی کا بہت لطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر مکئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے اور جب ہوا کے جھونکے مکئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اتر آئی ہیں اور ہولے ہولے ناچ رہی ہیں۔

آدھا راستہ طے کرنے پر جب ہم سڑک کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹے سے دو منزلہ چوبی مکان کے قریب پہنچتے تو شبیر اپنے مخصوص دھن میں یہ شعر گاتا:

ہر قدم فتنہ ہے قیامت ہے
آسمان تیری چال کیا جانے

یہ شعر گانے کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس چوبی مکان کے رہنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میرے اور روزیر کے تعلقات اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ٹھیک نہیں تھے حالانکہ وہ اخلاق کے معانی سے بالکل نا آشنا تھے۔ یہ لوگ مجھ سے اور شبیر سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور میری نقل و حرکت پر خاص طور پر نگرانی کرتے تھے، وہ تفریح کی غرض سے بھوت آئے ہوئے تھے اور انہیں تفریح کا کافی سامان مل گیا تھا۔ شبیر اوپر والا شعر گا کر ان کی تفریح میں مزید اضافہ کیا کرتا تھا۔ اس کو چھیڑ چھاڑ میں خاص لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی رہائش گاہ کے عین سامنے پہنچ کر اس کو یہ شعر یاد آجاتا تھا اور وہ فوراً اسے بلند آواز میں گایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔

یہ شعر کسی خاص واقعے یا تاثر کے متعلق نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے صرف یہی شعر یاد تھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اسی شعر کو گا سکتا تھا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بار بار یہی شعر دہراتا۔

شروع شروع میں اندھیری راتوں میں سنسان سڑک پر ہماری چہل قدمی چوبی مکان کے چوبی ساکنوں پر (وہ غیر معمولی طور پر اجڈ اور گنوار واقع ہوئے تھے) کوئی اثر پیدا نہ کر سکی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ان کے بالائی کمرے میں روشنی نظر آنے لگی اور وہ ہماری آمد کے منتظر رہنے لگے اور جب ایک روز ان میں سے ایک نے اندھیرے میں ہمارا رخ معلوم کرنے کے لیے بیٹری روشن کی تو میں نے

شبیر سے کہا ''آج ہمارا رومان مکمل ہوگیا ہے''۔ مگر میں نے دل میں ان لوگوں کی قابل رحم حالت پر بہت افسوس کیا' کیونکہ وہ بیکار دو دو تین تین گھنٹے جاگتے رہتے تھے۔

حسب معمول ایک رات شبیر نے اس مکان کے پاس پہنچ کر شعر گایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بیٹری کی روشنی حسب معمول چمکی اور ہم باتیں کرتے ہوئے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے ہو کا عالم تھا ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی آسمان ہم پر مرتبان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم کسی بوتل میں چل پھر رہے ہیں۔ سکوت اپنی آخری حد تک پہنچ کر متکلم ہوگیا تھا۔

بنگلے کے باہر برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز پر لیمپ جل رہا تھا اور پاس ہی پلنگ پر اکرام صاحب لیٹے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شبیر نے دور سے ان کی طرف دیکھا اور دفعتاً سادھوؤں کا مخصوص نعرہ مستانہ ''الکھ نرنجن'' بلند کیا۔ اس غیر متوقع شور نے مجھے اور اکرام صاحب دونوں کو چونکا دیا۔ شبیر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر ہم دونوں برآمدے میں داخل ہوکر اکرام صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ میرا منہ سڑک کی جانب تھا۔ عین اس وقت جب میں نے حقہ کی نے منہ میں دبائی مجھے سامنے سڑک کے اوپر تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر ایک متحرک سایہ نظر آیا اور اس کے بعد روشنی ایک جگہ ساکن ہوگئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وزیر کا بھائی اپنے کتے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ ادھر دیکھنا چھوڑ کر میں شبیر اور اکرام صاحب کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول ہوگیا۔

دوسرے روز شبیر کے نعرہ بلند کرنے کے بعد پھر اخروٹ کے درخت کے عقب میں روشنی نمودار ہوئی اور سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ تیسرے روز بھی ایسا ہوا۔ چوتھے روز صبح کو میں اور شبیر چشمے پر غسل کو جا رہے تھے کہ اوپر سے ایک کنکر گرا میں نے اور شبیر نے بیک وقت سڑک کے اوپر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ وزیر سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور شبیر سے کہنے لگی ''کیوں جناب آپ نے کیا وتیرہ اختیار کیا ہے کہ ہر روز ہماری نیند خراب کریں''۔

شبیر حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں وزیر کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

شبیر نے اس سے کہا ''آج آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں''۔

وزیر نے سر پر گھڑے کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''میں اتنی اتنی دیر تک لالٹین جلا کر اخروٹ کے نیچے بیٹھی رہتی ہوں اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ چھوٹے منہ سے شکریہ ہی ادا کر دیں۔ بھلا آپ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے...... یہ چوکیداری تو میرے ہی ذمے ہے...... آپ ٹہلنے کو نکلیں اور اکرام صاحب کے بنگلے میں گھنٹوں باتیں کرتے رہیں اور میں لالٹین لیے اونگھتی رہوں''۔

شبیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھئی میں تو کچھ نہ سمجھا' یہ کس دھن میں الاپ رہی ہیں؟''

میں نے شبیر کو جواب نہ دیا اور وزیر سے کہا 'ہم کئی دنوں سے رات گئے اکرام صاحب کے یہاں آتے ہیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اخروٹ کے پیچھے تمہارے

لال ٹین دیکھی، پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم خاص ہمارے لیے آتی ہو...... اس کی کیا ضرورت ہے...... تم ناحق اپنی نیند کیوں خراب کرتی ہو؟"

وزیر نے شبیر کو مخاطب کر کے کہا "آپ کے دوست بڑے ہی ناشکرے ہیں ایک تو میں ان کی حفاظت کروں اور اوپر سے یہی مجھ پر اپنا احسان جتائیں۔ان کو اپنی جان پیاری نہ ہو......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بات کا رخ یوں بدل دیا "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔پھر آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ رات کو باہر نہ نکلا کریں"۔

وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی۔بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی تھی جیسے وہ خود محفوظ و مامون ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔میں نے اسے کبھی نہ ٹوکا تھا اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اسے اس شغل سے باز رکھوں جس سے وہ لطف اٹھاتی ہے اس کی اور میری حالت ایک جیسی تھی ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی۔تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے میرا اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ہم ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے۔شبیر چوبی مکان کے پاس پہنچ کر شعر گاتا' پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ دور کھڑے ہو کر نعرہ بلند کرتا' وزیر لال ٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔شبیر اور اکرام صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے اور میں لال ٹین کی

روشنی میں اس روشنی کے ذرے ڈھونڈتا رہتا جس سے میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔

وزیر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہتی؟

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All Rights Reserved
©2003-2006

لائسنس

ابو کوچوان بڑا چھیل چھبیلا تھا۔ اس کا تانگہ گھوڑا بھی شہر میں نمبر ون تھا۔ کبھی معمولی سواری نہیں بٹھاتا تھا۔ اس کے لگے بندھے گاہک تھے جن سے اس کو روزانہ دس پندرہ روپے وصول ہو جاتے تھے جو ابو کے لیے کافی تھے۔ دوسرے کوچوانوں کی طرح نشہ پانی کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیکن صاف ستھرے کپڑے پہننے اور ہر وقت بانکا بنے رہنے کا اسے بے حد شوق تھا۔

جب اس کا تانگہ کسی سڑک پر سے گھنگھرو بجاتا گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں خود بخود اس کی طرف اٹھ جاتیں...... "وہ بانکا ابو جا رہا ہے...... دیکھو تو کس ٹھاٹ سے بیٹھا ہے۔ ذرا پگڑی تو دیکھو کسی ترچھی بندھی ہے"۔

ابو لوگوں کی نگاہوں سے یہ باتیں سنتا تو اس کی گردن میں ایک بڑا بانکا خم پیدا ہو جاتا اور اس کے گھوڑے کی چال اور زیادہ پرکشش ہو جاتی۔ ابو کے ہاتھوں نے گھوڑے کی باگیں کچھ اس انداز سے پکڑی ہوتی تھیں جیسے ان کو اسے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گھوڑا اشاروں کے بغیر چلا جا رہا ہے۔ اس کو اپنے مالک کے حکم کی ضرورت نہیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابو اور اس کا گھوڑا چنی دونوں ایک ہیں۔ بلکہ سارا تانگہ ایک ہستی ہے اور وہ ہستی ابو کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔

وہ سواریاں جن کو ابو قبول نہیں کرتا تھا دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیتی تھیں۔ بعض بد دعا بھی دیتی تھیں۔ "خدا کرے اس کا گھمنڈ ٹوٹے...... اس کا تانگہ گھوڑا

کسی دریا میں جا گرے''۔

ابو کے ہونٹوں پر جو ہلکی ہلکی مونچھوں کی چھاؤں میں رہتے تھے خود اعتمادی مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی کوچوان جل بھن جاتے تھے۔ ابو کی دیکھا دیکھی چند کوچوانوں نے ادھر ادھر سے قرض لے کر تانگے بنوائے۔ ان کو پیتل کے سازو سامان سے سجایا مگر پھر بھی ابو کی سی شان پیدا نہ ہو سکی۔ ان کو وہ گاہک نصیب نہ ہو سکے جو ابو اور اس کے تانگے گھوڑے کے شیدا تھے۔

ایک دن دوپہر کو ابو درخت کی چھاؤں میں تانگے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک آواز اس کے کانوں میں بھنبھنائی۔ ابو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک عورت تانگے کے بمپ کے پاس کھڑی تھی۔ ابو نے اسے بمشکل ایک نظر دیکھا مگر اس کی تیکھی جوانی ایک دم اس کے دل میں کھب گئی۔ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی۔ سولہ سترہ برس کی۔ دبلی پتلی لیکن مضبوط' رنگ سانولا مگر چمکیلا۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں سیدھی مانگ ستواں ناک اس کی پھننگ پر ایک چھوٹا سا چمکیلا تل...... لمبا کرتا اور نیلا اچا سر پر چدریا۔

لڑکی نے کنواری آواز میں ابو سے پوچھا ''ویراٹیشن کا کیا لوگے؟''

ابو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ شرارت اختیار کر گئی ''کچھ نہیں''۔

لڑکی کے چہرے کی سنولاہٹ سرخی مائل ہو گئی ''کیا لوگے ٹیشن کا''۔

ابو نے اس کو اپنی نظروں میں سموتے ہوئے کہا ''تجھ سے کیا لینا ہے بھاگ بھریے...... چل آ بیٹھ تانگے میں''۔

لڑکی نے گھبرائے ہوئے ہاتھوں سے اپنے مضبوط سینے کو ڈھانکا حالانکہ وہ

ڈھکا ہوا تھا ''کیسی باتیں کرتے ہو تم''۔

ابو مسکرایا ''چل آ....... اب بیٹھ بھی جا....... لے لیں گے جو تو دے دے گی''۔

لڑکی نے کچھ دیر سوچا پھر پائیدان پر پاؤں رکھ کر تانگے میں بیٹھ گئی ''جلدی لے چل ٹیشن''۔

ابو نے پیچھے مڑ کر دیکھا ''بڑی جلدی ہے تجھے سوہنیے''۔

''ہائے ہائے تو تو.......''لڑکی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

تانگہ چل پڑا....... اور چلتا رہا....... کئی سڑکیں گھوڑے کے سموں کے نیچے سے نکل گئیں۔لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ابو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔جب بہت دیر ہو گئی تو لڑکی نے ڈرتی ہوئی آواز میں پوچھا ''ٹیشن نہیں آیا ابھی تک''۔

ابو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا ''آ جائے گا....... تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے''۔

''کیا مطلب؟''

ابو نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا ''الھڑ ے....... کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتی۔تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔اسی وقت ایک ہو گیا تھا جب ابو نے تیری طرف دیکھا تھا....... تیری جان کی قسم تیرا غلام جھوٹ نہیں بولتا''۔

لڑکی نے سر پر پلو ٹھیک کیا۔اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں وہ ابو کا مطلب سمجھ چکی ہے۔اس کے چہرے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا تھا کہ اس نے ابو کی بات کا برا نہیں مانا لیکن وہ اس کشمکش میں تھی کہ دونوں کا ٹیشن ایک ہو یا نہ ہو۔ابو

بانکا سجیلا تو ہے لیکن کیا وفادار بھی ہے۔ کیا وہ اپنا ٹیشن چھوڑ دے جہاں اس کی گاڑی پتا نہیں کب کی جا چکی ہے۔

ابو کی آواز نے اسے چونکا دیا ''کیا سوچ رہی ہے بھاگ بھریے؟''

گھوڑا مست خرامی سے دلکی چال رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ سڑک کے دورویہ اگے ہوئے درخت بھاگ رہے تھے۔ ان کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ گھنگھروؤں کی یک آہنگ جھنجھناہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ ابو گردن موڑے لڑکی کے سانولے حسن کو دل ہی دل میں چوم رہا تھا...... کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کی باگیں جنگلے کی سلاخ کے ساتھ باندھ دیں اور اچک کر پچھلی سیٹ پر لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ابو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ''دے دے اپنی باگیں میرے ہاتھ میں''۔

لڑکی نے صرف اتنا کہا ''چھوڑ بھی دے'' لیکن وہ فوراً ہی ابو کے بازوؤں میں تھی۔ اس کے بعد اس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کا دل البتہ زور زور سے پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے خود کو چھڑا کر اڑ جانا چاہتا ہو۔

ابو ہولے ہولے پیار بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا ''یہ تانگہ گھوڑا مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا لیکن قسم گیارہویں والے پیر کی یہ بیچ دوں گا اور تیرے لیے سونے کے کڑے بنواؤں گا...... آپ پھٹے پرانے کپڑے پہنوں گا لیکن تجھے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ قسم وحدہ لاشریک کی زندگی میں یہ میرا پہلا پیار ہے...... تم میری نہ بنیں تو میں تیرے سامنے اپنا گلا کاٹ لوں گا''۔ پھر اس نے لڑکی کو اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ ''جانے کیا ہو گیا ہے مجھے...... چلو تمہیں ٹیشن چھوڑ آؤں''۔

لڑکی نے ہولے سے کہا ''نہیں......اب تم مجھے ہاتھ لگا چکے ہو''۔
ابو کی گردن جھک گئی ''مجھے معاف کردو مجھ سے غلطی ہوگئی''۔
''نبھالوگے اس غلطی کو؟''
لڑکی کے لہجے میں چیلنج تھا۔جیسے کسی نے ابو سے کہا ہو''لے جاؤ گے اپنا تانگہ اس کے تانگے سے آگے نکال کے''اس کا جھکا ہوا سر اٹھا۔آنکھیں چمک اٹھیں۔
......''بھاگ بھریے......''یہ کہہ کراس نے اپنے مضبوط سینے پر ہاتھ رکھا''ابو اپنی جان دے دے گا''۔
لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھایا''تو یہ ہے میرا ہاتھ''۔
ابو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا۔''قسم اپنی جوانی کی ابو تیرا غلام ہے''۔
دوسرے روز ابو اوراس لڑکی کا نکاح ہوگیا وہ ضلع گجرات کی موچن تھی نام اس کا عنایت یعنی نیتی تھا۔اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آئی تھی وہ اسٹیشن پر اسکا انتظار کررہے تھے کہ ابو اوراس کی مڈبھیڑ ہوگئی جو فوراً ہی محبت کی ساری منزلیں طے کرگئی۔دونوں بہت خوش تھے۔ابو نے تانگہ گھوڑا بیچ کر تو نیتی کے لیے سونے کے کڑے نہیں بنوائے تھے لیکن اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے اس کو سونے کی بالیاں خرید دی تھیں۔کئی ریشمی کپڑے بھی بنوادیے تھے۔
لس لس کرتے ہوئے ریشمی لاچے میں جب نیتی ابو کے سامنے آتے تو اس کا دل ناچنے لگتا''قسم پنج تن پاک کی دنیا میں تجھ جیسا سندر اور کوئی نہیں''۔اور یہ کہہ کروہ اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگالیتا''تو میرے دل کی رانی ہے''۔
دونوں جوانی کی مستیوں میں غرق تھے۔گاتے تھے ہنستے تھے سیریں کرتے

تھے ایک دوسرے کی بلائیں لیتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا کہ دفعتاً ایک روز پولیس نے ابو کو گرفتار کر لیا نیتی بھی پکڑی گئی۔ ابو پر اغوا کا مقدمہ چلا۔ نیتی ثابت قدم رہی لیکن پھر بھی ابو کو دس برس کی سزا ہو گئی۔ جب عدالت نے حکم سنایا تو نیتی ابو کے ساتھ لپٹ گئی۔ روتے روتے اس نے صرف اتنا کہا ''میں اپنے ماں باپ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی...... گھر بیٹھ کر تیرا انتظار کروں گی''۔

ابو نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی ''جیتی رہ...... تانگہ گھوڑا میں نے دینے کے سپرد کیا ہوا ہے...... اس سے کرایہ وصول کرتی رہنا''۔

نیتی کے ماں باپ نے بہت زور لگایا مگر وہ ان کے ساتھ نہ گئی۔ تھک ہار کر انہوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ نیتی اکیلی رہنے لگی۔ دینا اسے شام کو پانچ روپے دے جاتا تھا جو اس کے خرچ کے لیے کافی تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں روزانہ پانچ روپے کے حساب سے جو کچھ جمع ہوا تھا وہ بھی اس کے پاس تھا۔

ہفتے میں ایک بار نیتی اور ابو کی ملاقات جیل میں ہوتی تھی جو کہ ان دونوں کے لیے بہت ہی مختصر تھی۔ نیتی کے پاس جتنی جمع پونجی تھی وہ ابو کو آسائشیں پہنچانے میں صرف ہو گئی۔ ایک ملاقات میں ابو نے نیتی کے بُچے کانوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''بالیاں کہاں گئیں نیتی''؟

نیتی مسکرا دی اور سنتری کی طرف دیکھ کر ابو سے کہا ''گم ہو گئیں کہیں''۔

ابو نے قدرے غصے ہو کر کہا ''تم میرا اتنا خیال نہ رکھا کرو...... جیسا بھی ہوں

ٹھیک ہوں"۔

نیتی نے کچھ نہ کہا۔ وقت پورا ہو چکا تھا۔ مسکراتی ہوئی وہاں سے چل دی مگر گھر جا کر بہت روئی ۔ گھنٹوں آنسو بہائے کیونکہ ابو کی صحت بہت گر رہی تھی اس ملاقات میں تو وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی ۔ گرانڈیل ابو اب گھل گھل کر آدھا ہو گیا تھا ۔ نیتی سوچتی کہ اس کو اس کا غم کھا رہا ہے ۔ اس کی جدائی نے ابو کی یہ حالت کر دی ہے لیکن اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دق کا مریض ہے اور یہ مرض اسے ورثے میں ملا ہے ۔ ابو کا باپ ابو سے کہیں زیادہ گرانڈیل تھا۔ لیکن دق نے چند ہی دنوں میں اسے قبر کے اندر پہنچا دیا۔ ابو کا بڑا بھائی کڑیل جوان تھا مگر عین جوانی میں اس مرض نے اسے دبوچ لیا تھا۔ خود ابو اس حقیقت سے غافل تھا چنانچہ جیل کے ہسپتال میں جب کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا اس نے افسوس بھرے لہجے میں نیتی سے کہا "مجھے معلوم ہوتا کہ میں اتنی جلدی مر جاؤں گا تو قسم وحدہ لاشریک کی تجھے کبھی اپنی بیوی نہ بناتا...... میں نے تیرے ساتھ بہت ظلم کیا...... مجھے معاف کر دے...... اور دیکھ میری ایک نشانی ہے میرا تانگہ گھوڑا...... اس کا خیال رکھنا...... اور چنی بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنا ابو نے تجھے پیار بھیجا ہے"۔

ابو مر گیا...... نیتی کا سب کچھ مر گیا۔ مگر وہ حوصلے والی عورت تھی ۔ اس صدمے کو اس نے برداشت کر ہی لیا۔ گھر میں تن تنہا پڑی رہتی تھی ۔ شام کو دینا آتا تھا اور اسے دم دلاسا دیتا تھا اور کہتا تھا "کچھ فکر نہ کرو بھابھی! اللہ میاں کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی ...... ابو میرا بھائی تھا...... مجھ سے جو ہو سکتا ہے خدا کے حکم سے کروں گا"۔

شروع شروع میں تو نیتی نہ سمجھی پر جب اس کے عدت کے دن پورے ہوئے تو دینے نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ یہ سن کر نیتی کے جی میں آئی کہ وہ اس کو دھکا دے کر باہر نکال دے مگر اس نے صرف اتنا کہا "بھائی مجھے شادی نہیں کرنی"۔

اس دن سے دینے کے رویے میں فرق آ گیا۔ پہلے شام کو بلا ناغہ پانچ روپے ادا کرتا تھا۔ اب کبھی چار دینے لگا کبھی تین بہانہ یہ کہ بہت مندا ہے۔ پھر دو دو تین تین دن غائب رہنے لگا۔ بہانہ تھا کہ بیمار تھا یا تانگے کا کوئی کل پرزہ خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے جونہ سکا۔ جب پانی سر سے نکل گیا تو نیتی نے دینے سے کہا "بھائی دینے اب تم تکلیف نہ کرو۔ تانگہ گھوڑا میرے حوالے کر دو"۔

بڑی لیت و لعل کے بعد بالآخر دینے نے بادل نا خواستہ تانگہ گھوڑا نیتی کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے ماجھے کے سپرد کر دیا جو ابو کا دوست تھا اُسنے بھی کچھ دنوں کے بعد شادی کی درخواست کی۔ نیتی نے انکار کر دیا تو اس کی آنکھیں بدل گئیں۔ ہمدردی وغیرہ سب ہوا ہو گئی۔ نیتی نے اس سے تانگہ گھوڑا واپس لے لیا اور ایک انجانے کوچوان کے حوالے کر دیا۔ اُسنے تو حد ہی کر دی ایک شام پیسے دینے آیا تو شراب میں دھت تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی نیتی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ نیتی نے اس کو خوب سنائیں اور کام سے ہٹا دیا۔

آٹھ دس روز تانگہ گھوڑا بیکار طویلے میں پڑا رہا۔ گھاس دانے کا خرچ علیحدہ طویلے کا کرایہ علیحدہ۔ نیتی عجیب الجھن میں گرفتار تھی۔ کوئی شادی کی درخواست کرتا تھا۔ کوئی اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا کوئی پیسے مار لیتا تھا۔

باہر نکلتی تھی تو لوگ بری نگاہوں سے گھورتے تھے۔ ایک رات اس کا ہمسایہ دیوار پھاند کے آ گیا اور دراز دستی کرنے لگا۔ نیتی سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی کہ کیا کرے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا ''کیوں نہ تانگہ میں آپ ہی جوتوں۔ آپ ہی چلاؤں''۔ ابو کے ساتھ جب وہ سیر کو جایا کرتی تھی تو تانگہ خود ہی چلاتی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی واقف تھی لیکن پھر اس نے سوچا ''لوگ کیا کہیں گے؟......'' اس کے جواب میں اس کے دماغ نے کئی دلیلیں دیں۔ ''کیا حرج ہے...... کیا عورتیں محنت مزدوری نہیں کرتیں...... یہ کوئلے والیاں...... یہ دفتروں میں جانے والی عورتیں...... گھر میں بیٹھ کر کام کرنے والیاں تو ہزاروں ہوں گی...... پیٹ کسی حیلے سے پالنا ہی ہے''۔

نیتی نے کچھ دن سوچ بچار کیا۔ آخر میں فیصلہ کر لیا کہ وہ تانگہ خود ہی چلائے گی اس کو خود پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر وہ طویلے پہنچ گئی...... تانگہ جوتنے لگی تو سارے کوچوان ہکا بکا رہ گئے۔ بعض مذاق سمجھ کر ہنسے۔ جو بزرگ تھے انہوں نے نیتی کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو۔ یہ مناسب نہیں مگر نیتی نہ مانی۔ تانگہ ٹھیک ٹھاک کیا۔ پیتل کا سارا سامان اچھی طرح چمکایا۔ گھوڑے کو خوب پیار کیا اور ابو سے دل ہی دل میں پیار کی باتیں کرتی طویلے سے باہر نکل گئی۔ کوچوان حیرت زدہ تھے کیونکہ نیتی کے ہاتھ رواں تھے جیسے وہ تانگہ چلانے کے فن پر حاوی ہے۔

شہر میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا کہ ایک خوبصورت عورت تانگہ چلا رہی ہے۔ ہر جگہ اسی بات کا چرچا تھا لوگ سنتے تھے تو اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب وہ ان

کی سڑک پر سے گزرے گا۔

شروع شروع میں تو مرد سواریاں جھجکتی تھیں مگر یہ جھجک تھوڑی دیر میں دور ہوگئی اور خوب آمدن ہونے لگی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نیتی کا تانگہ بیکار نہ رہتا تھا۔ ادھر سواری اتری ادھر بیٹھی۔ آپس میں سواریوں کی کبھی کبھی لڑائی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر کہ نیتی کو پہلے کس نے بلایا تھا۔

جب کام زیادہ ہو گیا تو نیتی نے تانگہ جوتنے کے اوقات مقرر کر دیے صبح سات بجے سے بارہ بجے تک۔ دوپہر دو بجے سے چھ بجے تک...... یہ سلسلہ بڑا آرام دہ ثابت ہوا۔ چنی بھی خوش تھا مگر نیتی محسوس کر رہی تھی کہ اکثر لوگ صرف اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے اس کے تانگے بیٹھے بے مطلب بے مقصد اسے ادھر ادھر پھراتے تھے۔ آپس میں گندے گندے مذاق بھی کرتے تھے۔ صرف اس کے سنانے کے لیے آپس میں باتیں کرتے تھے۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو نہیں بیچتی لیکن لوگ چپکے چپکے اسے خرید رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ شہر کے سارے کوچوان اس کو برا سمجھتے ہیں۔ ان تمام احساسات کے باوجود مضطرب نہیں تھی۔ اپنی خود اعتمادی کے باعث وہ پرسکون تھی۔

ایک دن کمیٹی والوں نے نیتی کو بلایا اور اس کا لائسنس ضبط کر لیا۔ وجہ یہ بتائی کہ عورت تانگہ نہیں چلا سکتی۔ نیتی نے پوچھا "جناب عورت تانگہ کیوں نہیں چلا سکتی؟"

جواب ملا "بس...... نہیں چلا سکتی۔ تمہارا لائسنس ضبط ہے"۔

نیتی نے کہا ''حضور! آپ گھوڑا تانگہ بھی ضبط کرلیں مجھے یہ تو بتائیں کہ عورت تانگہ کیوں نہیں جوت سکتی عورتیں چرخہ چلا کر اپنا پیٹ پال سکتی ہیں۔ عورتیں ٹوکری ڈھو کر روزی کما سکتی ہیں عورتیں لینوں پر کوئلے چن چن کر اپنی روٹی پیدا کرسکتی ہیں ...... میں تانگہ کیوں نہیں چلا سکتی ...... مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں ...... تانگہ گھوڑا میرے خاوند کا ہے ...... میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟ ...... حضور آپ رحم کریں ...... محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟ ...... میں کیا کروں بتائیے نا مجھے''۔

افسر نے جواب دیا ''جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو وہاں زیادہ کمائی ہے''۔

یہ سن کر نیتی کے اندر جو اصل نیتی تھی جل کر راکھ ہوگئی ...... ہولے سے ''اچھا جی'' کہہ کر وہ چلی گئی۔ اونے پونے داموں تانگہ گھوڑا بیچا اور سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ ایک لمحے کے لیے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ جیسے بارش کے بعد چلچلاتی دھوپ نے زمین کی ساری نمی چوس لی تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ وا ہوئے اور وہ قبر سے مخاطب ہوئی ''ابو ...... تیری نیتی آج کمیٹی کے دفتر میں مرگئی''۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ دوسرے دن عرضی دی ...... اس کو اپنا جسم بیچنے کا لائسنس مل گیا۔

☆☆☆

ماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے اس کونے سے اس کونے تک پھیل گئی کہ اتاتورک کمال مر گیا ہے۔ ریڈیو کی تھرتھراتی ہوئی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں سٹے بازوں نے سنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہو گئے۔

ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سن کر لرزاں آواز میں کہا "مصطفیٰ کمال مر گیا ہے"۔

اسکے ساتھی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی "کیا کہا مصطفیٰ کمال مر گیا ہے"۔

اس کے بعد دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے اب ہندوستان کا کیا ہو گا؟ میں نے سنا تھا یہ مصطفیٰ کمال یہاں حملہ کرنے والا ہے...... ہم آزاد ہو جاتے مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی...... افسوس تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی!"

دوسرے نے جب یہ بات سنی تو اس کے روئیں بدن پر چیونٹیوں کے مانند سرکنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا یہ تھا "مجھے کل جمعہ سے نماز شروع کر دینی چاہیے......"

اس خیال کو بعد میں اس نے مصطفیٰ کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور اس کی

بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پان کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا "میں مانتا ہوں مصطفیٰ کمال بہت بڑا آدمی تھا لیکن محمد بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بمبئی میں تین چار ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے"۔

دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا "محمد علی کی موت پر تو بڑی شاندار ہڑتال ہوئی تھی......"

ہاں بھئی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا؟" تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اس نے جواب دیا "کیوں نہ ہو گی......ارے اتنا بڑا مسلمان مر جائے اور ہڑتال نہ ہو"۔

یہ بات ایک راہ گزر نے سن لی اس نے دوسرے چوک میں اپنے ساتھیوں سے کی اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔

ابو قصائی رات کے دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی طاق میں سے بہت سی چیزوں کو ادھر ادھر پلٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اس کو اس میں گھولنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی ماندی ایک کونے میں ٹاٹ پر سو رہی تھی۔ برتن کی رگڑ سن کر جاگ پڑی۔ اس نے لیٹے لیٹے کہا "آ گئے ہو؟"

"ہاں آ گیا ہوں" یہ کہہ کر ابو نے قمیص اتار کر دیگچی میں ڈال دی اور اسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔

اس کی بیوی نے پوچھا "پر یہ تم کر کیا رہے ہو؟" "مصطفیٰ کمال مر گیا ہے کل ہڑتال ہو رہی ہے"۔ اس کی بیوی یہ سن کر گھبراہٹ کے مارے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کیا مارا ماری ہوگی...... میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے بڑی تنگ آ گئی ہوں"۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سنے گا"۔

ابو جواب میں ہنسنے لگا "اری پگلی...... یہ ہندو مسلمانوں کا فساد نہیں ہے۔ مصطفیٰ کمال مر گیا ہے...... وہی جو بہت بڑا آدمی تھا...... کل اس کے سوگ میں ہڑتال ہوگی"۔

"جانے میری بلا یہ بڑا آدمی کون ہے...... پر تو یہ کر کیا رہا ہے؟" بیوی نے پوچھا "سوتا کیوں نہیں ہے"۔

"قمیص کو کالا رنگ دے رہا ہوں۔ صبح ہمیں ہڑتال کرانے جانا ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے قمیص کو نچوڑ کر دو کیلوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لیے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دکانداروں کی دکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرے لگا رہے تھے "انقلاب زندہ آباد انقلاب زندہ باد"۔

ایک ہندو نے جو اپنی دکان کھولنے کے لیے جا رہا تھا یہ نعرے سنے اور نعرے لگانے والوں کو دیکھا تو چپ چاپ ٹرام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے

ہندو اور پارسی دکانداروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انہوں نے جھٹ پٹ اپنی دکانیں بند کر دیں۔

دس پندرہ سیاہ پوش گپیں ہانکتے ایک بازار سے گزر رہے تھے۔ایک نے اپنے ساتھی سے کہا ''دوست ہڑتال ہوئی تو خوب ہے پر ویسی نہیں ہوئی جیسی محمد علی کے ٹیم پر ہوئی تھی......ٹرامیں تو اسی طرح چل رہی ہیں''۔

اس ٹولی میں جو سب سے زیادہ جوشیلا تھا اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا تنک کر بولا۔ ''آج بھی نہیں چلیں گی''۔ یہ کہہ کر وہ ٹرام کی طرف بڑھا جو لکڑی کے ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اتار رہی تھی۔ٹولی کے باقی آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سرخ گاڑی کے اردگرد تھے۔ سب مسافر زبردستی اتار دیے گئے۔

شام کو ایک وسیع میدان میں ماتمی جلسہ ہوا۔شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے۔ خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے باہر عارضی دکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا۔چاٹ کے چنوں اور ابلے ہوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔

جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ تھی۔کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔اس ہجوم میں کئی آدمی ایسے بھی چل رہے تھے جو یہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ایک صاحب گلے میں دوربین لٹکائے ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔دور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے۔وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دوربین لے کر دوڑے دوڑے آ رہے

تھے اور اس کا امتحان لینے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ میدان کے آہنی جنگلے کے پاس دو آدمی کھڑے تھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا "بھئی یہ مصطفیٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے...... میں جو صابن بنانے والا ہوں اس کا نام کمال سوپ رکھوں گا...... کیوں کیسا رہے گا؟"

دوسرے نے جواب دیا "وہ بھی برا نہیں تھا جو تم نے پہلے سوچا تھا جناح سوپ...... یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے"۔

"نہیں نہیں کمال سوپ اچھا رہے گا بھائی مصطفیٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے"۔ وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیے۔

جلسہ شروع ہوا۔

آغاز میں نظمیں گائی گئیں جن میں مصطفیٰ کمال کی بڑائی کا ذکر تھا۔ پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے۔ آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کی۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجتے "مصطفیٰ کمال نے درہ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کے باہر نکال دیا"۔ یا "کمال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا" تو "اسلام زندہ باد" کے نعروں سے میدان کانپ کانپ اٹھتا۔

یہ نعرے مقرر کی قوت گویائی اور تیز کر دیتے اور وہ زیادہ جوش سے اتاترک کمال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔

مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش و خروش پیدا کر رہا تھا۔

''جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقع موجود ہے۔برطانیہ کی گردن ترکی کے سامنے خم رہے گی۔صرف ترکی ہی ایک ایسا **ملک** ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا اور صرف مصطفیٰ کمال ہی ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی۔اس نے بہ نوک شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ٹرکی کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا۔مگر کمال نے اسے صحت اور قوت بخش کر مرد آہن بنادیا''۔

جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوئے تو انقلاب زندہ باد انقلاب زندہ باد کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے۔

اس سے مقرر کا جوش بہت بڑھ گیا۔اس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا''کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔اس نے اپنے **ملک** کے لیے وہ وہ خدمات انجام دی ہیں جس کو بیان کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔اس نے ٹرکی میں جہالت کا دیوالہ نکال دیا۔تعلیم عام کر دی۔نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔یہ سب کچھ اس نے تلوار کے زور سے کیا۔اس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اس کی مخالفت کی مگر وہ سر بازار پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔اس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا چاہی مگر یہ آواز ان کے گلے ہی میں دبا دی گئی۔اس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان

میں ہو تو بہت سے ملاؤں نے حکم عدولی کی مگر وہ قتل کر دیے گئے‘‘۔

’’یہ کفر بکتا ہے‘‘ جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب ہو گئے۔

’’یہ کافر جھوٹ بولتا ہے‘‘۔ کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہو گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا...... جلسے میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔

اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اس کے ماتھے پر سے خون پونچھ رہا تھا اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی ’’مصطفیٰ کمال زندہ باد، مصطفیٰ کمال زندہ باد‘‘۔

☆☆☆

مجید کا ماضی

مجید کی ماہانہ آمدن ڈھائی ہزار روپے تھی۔ موٹر تھی ایک عالیشان کوٹھی تھی۔ بیوی تھی۔ اس کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے میل جول تھا۔ مگر جب کبھی وہ وسکی کے تین چار پیگ پی لیتا تو اسے اپنا ماضی یاد آ جاتا۔ وہ سوچتا کہ اب وہ اتنا خوش نہیں جتنا کہ پندرہ برس پہلے تھا۔ جب اس کے پاس رہنے کو کوٹھی تھی نہ سواری کے لیے موٹر۔ بیوی تھی نہ کسی عورت سے اس کی شناسائی تھی۔ ڈھائی ہزار روپے تو ایک اچھی خاصی رقم ہے۔ ان دنوں اس کی آمدن صرف ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ساٹھ روپے جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ اس کی زندگی افتان وخیزان حالات کے ہوتے ہوئے بھی ہموار تھی۔

اب اسے بے شمار تفکرات سامنے تھے۔ کوٹھی کے بیوی کے بچوں کے ان عورتوں کے جن سے اس کا میل جول تھا۔ انکم ٹیکس کا ٹنٹا الگ تھا۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا جدا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی الجھنیں تھیں جن سے مجید کو کبھی نجات ہی نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس زمانے کو اکثر یاد کیا کرتا تھا جب اس کی زندگی ایسے تفکرات اور ایسی الجھنوں سے آزاد تھی۔ وہ ایک بڑی غریبی کی لیکن بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا تھا۔

انکم ٹیکس زیادہ لگ گیا ہے۔ ماہروں سے مشورہ کرو۔ آفیسروں سے ملو۔ ان کو رشوت دو۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا چکاؤ۔ بلیک مارکیٹ کرو۔ یہاں سے جو ماؤ اس کو وائٹ کرو۔ جھوٹی رسیدیں بناؤ۔ مقدموں کی تاریخیں بھگتو۔ بیوی کی فرمائشیں

پوری کرو۔ بچوں کی نگہداشت کرو۔ یوں تو مجید کا کام بڑی مستعدی سے کرتا تھا اور وہ اپنی اس نئی ہنگامہ خیز زندگی میں رچ مچ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ناخوش تھا۔ یہ ناخوشی اسے کاروباری اوقات میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ فرصت کے اوقات میں آرام سے بیٹھ کر وسکی کے تین چار پیگ پیتا تھا۔ اس وقت بیتا ہوا زمانہ اس کے دل و دماغ میں ایک دم انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہو جاتا اور وہ بڑا سکون محسوس کرتا لیکن جب اس بیتے ہوئے زمانے کی تصویر اس کے دل و دماغ میں محو ہو جاتی تو وہ بہت مضطرب ہو جاتا۔ پر یہ اضطراب دیرپا نہیں ہوتا تھا کیونکہ فوراً ہی اپنی کاروباری الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا تھا۔

مجید نے جو کچھ کمایا تھا اپنی محنت و مشقت سے بنایا تھا۔ کوٹھی اس کا سازوسامان موٹر غرضیکہ ہر چیز اسکے گاڑھے پسینے کی کمائی تھی۔ اس کو اس بات کا بہت مان تھا کہ آسائش کے جتنے سامان ہیں سب اس نے خود بنائے ہیں۔ اس نے کسی سے مدد نہیں لی لیکن تفکرات اب زیادہ ہو گئے تھے۔

وہ جو دس پندرہ عورتیں تھیں اس کے لیے وبال جان بن گئی تھیں۔ ایک سے ملو تو دوسری ناراض ہو جاتی تھی۔ ٹیلی فون پہ ٹیلی فون آ رہے ہیں۔ بیوی کا ڈر الگ کاروبار کی فکر جدا عجب جھنجھٹ تھا۔ مگر وہ دن بھی تھے جب مجید کو صرف دو روپے روزانہ ملتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے مگر دن عجیب انداز میں گزرتے تھے۔ بڑے دلچسپ تھے وہ دن۔ بڑی دلچسپ تھیں وہ راتیں جو لکڑی کے ایک بنچ پر گزرتی تھیں جس میں ہزار ہا کھٹمل تھے خدا معلوم کتنے

عمر رسیدہ کیونکہ وہ بنچ بہت پرانی تھی۔ اس کے مالک نے دس برس پہلے اس کو ایک دکاندار سے لیا تھا جو اپنا کاروبار سمیٹ رہا تھا۔ اس دکاندار نے گیارہ برس پہلے اس کا سودا ایک کباڑی سے کیا تھا۔

مجید کو جو مزا جو لطف اس کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے میں آتا تھا اب اسے اپنے پرتکلف سپرنگوں والے پلنگ پر سونے میں نہیں آتا تھا۔ اب اسے ہزاروں کی فکر ہوتی تھی۔ اس وقت صرف دو روپے روزانہ کی۔ ان دنوں اس کے پاس کینوس کے دو بوٹ تھے اب سینکڑوں تھے۔ مگر وہ بات نہیں تھی۔ ہر روز دن کے کام سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے دفتر کی بنچ پر سونے لگتا تو بوٹ اتار کر اس پر بلینکو ملتا۔ صبح اٹھ کر حمام میں اکنی دے کر نہاتا۔ شیو کرتا۔ سامنے ہوٹل میں باہر والے سے کہتا کہ اس کا ناشتہ لے آئے۔ ایک مکھن لگا براؤن ایک پیالی چائے لطف آ جاتا۔ ناشتہ کر کے وہ پاسنگ شو کا سگریٹ پیتا۔ ایک پان کھاتا اور کام شروع کر دیتا۔

دوپہر کا کھانا وہ بھنڈی بازار میں حاجی کے ہوٹل میں کھاتا۔ یہ ہوٹل اتنا اچھا تھا۔ کھڑی دال گھی میں بگھاری ہوئی کتنی مزیدار ہوتی تھی۔ کھارا گوشت تو بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ پھر برف کا ٹھنڈا پانی۔ پاسنگ شو کا ایک سگریٹ اس کا سارا وجود ہشاش بشاش ہو جاتا۔

کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کیا۔ پھر کام شروع کیا۔ شام کو چھ بجے فارغ ہوئے۔ ایک آنہ ٹریم پر خرچا اور سیدھے اپالو بندر پہنچ گئے۔ ٹھنڈی ہوا۔ بھانت بھانت کے آدمی۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں۔ وسیع و

عریض سمندر اونچی اونچی لہریں۔ کشتیاں موٹریں سائکلیں خوبصورت عورتیں' گجراتی عورتیں' مرہٹی عورتیں تیکھی تیکھی ناک والی۔ اینگلوانڈین اور یورپین عورتیں۔ یہ سب اس کے پاس سے گزرتیں۔ وہ ان کو دیکھتا تو اس کے دل و دماغ کو فرحت پہنچتی۔ اس کو کبھی یہ خواہش نہ ہوتی کہ ان سے کوئی اس کی ہو جائے گی لیکن اس بیوی کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے اس کا جنسی میل جول تھا۔ اب وہ ہر خوبصورت عورت کو شہوانی نظروں سے دیکھتا تھا ترکیبیں سوچتا تھا کہ کس طرح ان کو حاصل کیا جائے۔

اب بھی وہ سیر کرتا تھا۔ باغوں میں گھومتا تھا مگر پھول اتنے خوبصورت دکھائی نہیں دیتے تھے جتنے کہ اس زمانے میں دکھائی دیتے تھے۔ اب سینکڑوں پھول اس کے گلدانوں میں پڑے رہتے تھے جو مرجھا جانے پر پھینک دیے جاتے تھے۔ اس کی نگاہ ان پر پڑتی ہی نہیں تھی۔ پڑتی بھی ہوگی تو وہ ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک دن اپالو بندر گئے دوسرے دن چوپاٹی چلے گئے۔ وہی بڑے اور چاٹ کھائی۔ گیلی ریت پر بیٹھے سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔ دور حد نگاہ تک پھیلا سمندر دھوپ میں چاندنی کی طرح چمکتی ہوئی لہریں۔ کشتیوں کے سفید سفید بادبان یا اس سے جی اکتایا تو مالا بار ہل چلے گئے۔ ہینگنگ گارڈنز۔ کیا فرحت بخش مقام تھا۔

اس زمانے میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اس کو ساری دنیا دوست نظر آتی تھی۔ ٹریم اس کی دوست تھی۔ کھلا آسمان اس کا دوست تھا۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ اس

کے دوست تھے۔ کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے سے پہلے وہ فٹ پاتھوں پر سویا کرتا تھا...... ہر چیز اس کو اپنی محسوس ہوتی تھی مگر اب اپنے بھی پرائے لگتے تھے ۔سینکڑوں حریف تھے کاروبار میں عشق بازیوں میں ہر جگہ ہر مقام پر اس کا کوئی نہ کوئی حریف موجود ہوتا تھا۔

وہ زندگی عجیب وغریب تھی۔ یہ زندگی بھی عجیب وغریب تھی مگر دونوں میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔وہ تفکر سے آزاد تھی۔یہ تفکر سے پر۔چھوٹی سے چھوٹی خوشی اس کے دل و دماغ میں ایک عرصے تک موجود رہتی۔ایک عرصے تک اس کو شاداں وفرحاں رکھتی۔چھ آنے دے کر ایک میل ٹیکسی میں بیٹھے تو یہ ایک بہت بڑی عیاشی تھی۔بھکاری کو ایک پیسہ دیا تو بڑی روحانی مسرت محسوس کی۔اب وہ سینکڑوں کی خیرات کرتا تھا اور کوئی روحانی مسرت محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے کہ یہ محض نمائش کی خاطر ہوتی تھی۔

اس زمانے میں اس کی عیاشیاں بڑی چھوٹی چھوٹی مگر بڑی دلچسپ ہوتی تھیں خود کو خوش کرنے کے لیے وہ بڑے نرالے طریقے ایجاد کرلیتا تھا۔

الیکٹرک ٹرین میں بیٹھے اور کسی گاؤں میں جا کر تاڑی پینے لگے۔

پتنگ لیا اور چوپائی پر بچوں کے ساتھ اڑانے لگے۔

دادر اسٹیشن پر صبح سویرے چلے گئے اور سکول جانے والی لڑکیاں تاڑتے رہے...... پل کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اینگلو انڈین لڑکیاں اسکرٹ پہنے اوپر چڑھتیں تو ان کی ننگی ٹانگیں نظر آتیں۔اس نظارے سے اس کو بڑی طفلانہ مسرت محسوس ہوتی۔

کبھی کبھی طویل فاصلے پیدل طے کرتا۔ گھر پہنچتا تو اسے خوشی ہوتی کہ اس نے اکنی یا دونی بچالی ہے۔ یہ اکنی یا دونی کسی ایسی چیز پر خرچ کرتا جو اس کے روزانہ پروگرام میں نہیں ہوتی تھی۔

کسی لڑکی کو محبت بھرا خط لکھا اور جو پتا دماغ میں آیا لکھ کر پوسٹ کر دیا اور اس حماقت پر دل ہی دل میں خوب ہنسے۔

ایک انگلی کا ناخن بڑھا لیا اور کسی دکان سے ٹسٹ کرنے کے بہانے اس پر کیوٹکس لگالیا۔

ایک دن صرف دوسروں سے مانگ مانگ کے سگریٹ پئے اور بے حد شرارت بھری خوشی محسوس کی۔

دفتر میں بنچ کے کھٹملوں نے زیادہ تنگ کیا تو ساری رات بازاروں میں گھومتے رہے اور بجائے کوفت کے راحت محسوس کی۔

جیب میں پیسے کم ہوئے تو دوپہر کا کھانا گول کر دیا اور یہ محسوس کیا کہ وہ کھا چکا ہے۔

اب یہ باتیں نہیں تھیں۔ دفتر سے اس نے روپے کمانے کے ڈھنگ سیکھے۔ دولت آنے لگی تو یہ سب باتیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ اس کی یہ ننھی ننھی مسرتیں سب سونے اور چاندی کے نیچے دب گئیں۔

اب رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔ مگر ان سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔ جو پل کے نیچے کھڑے ہو کر ایک خاص زاویے سے ننگی متحرک ٹانگیں دیکھنے سے محسوس ہوتا تھا۔ اس کی راتیں بالکل تنہا گزرتی تھیں۔ اب کوئی نہ کوئی عورت اس

کے آغوش میں ہوتی مگر وہ سکون غائب تھا۔ وہ کنوارا سکون جس میں وہ رات بھر ملفوف رہتا تھا۔ اب اسے یہ فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ کہیں اس کی بیوی کو پتہ نہ چل جائے کہیں یہ عورت حاملہ نہ ہو جائے۔ کہیں اس کو بیماری نہ لگ جائے۔ کہیں اس عورت کا خاوند نہ آن دھمکے۔ پہلے ایسے تفکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب اس کے پاس ہر قسم کی شراب موجود رہتی تھی مگر وہ مزہ وہ سرور جو اسے پہلے ہر روز شام کو جاپان کی بنی ہوئی اب ہی بیئر پینے کا آتا تھا بالکل غائب ہی ہو گیا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر چوپاٹی یا اپالو بندر کی سیر کرے۔ خوب گھومے پھرے۔ نظاروں کا مزہ لیا آٹھ بجے تو گھر کا رخ کیا۔ کسی نل سے منہ دھویا اور بائی کھلہ پل کے پاس والی بار میں داخل ہو گئے۔ پارسی سیٹھ کو جو بہت ہی موٹا اور اس کی ناک بڑی بے ہنگم تھی۔ صاحب جی کہا ''کہم سیٹھ سوں حال چھے؟''

اس کو بس صرف اتنی گجراتی آتی تھی مگر جب وہ کہتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی کہ وہ اتنے الفاظ بول سکتا ہے۔ سیٹھ مسکراتا اور کہتا ''سارو چے سارو چھے''۔

پھر وہ پارسی سیٹھ کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر جنگ کی باتیں چھیڑ دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یہاں سے ہٹ کر وہ کونے والی میز کے پاس بیٹھ جاتا۔ یہ اس کی محبوب میز تھی۔ اس کے اوپر کا حصہ سنگ مرمر کا تھا۔ بیرا اسے گیلے کپڑے سے صاف کرتا اور مجید سے کہتا ''بولو سیٹھ''۔

یہ سن کر مجید خود کو واقعی سیٹھ سمجھتا۔ اس وقت اس کی جیب میں ایک روپے چار

آنے ہوتے۔ وہ بیرے کی طرف دیکھ کر بڑی شان سے مسکراتا اور کہتا ''ہر روز تم مجھ سے پوچھتے ہو سب جانتے ہو...... لے آؤ جو پیا کرتا ہوں''۔

بیرا اپنی عادت کے مطابق جانے سے پہلے گیلے کپڑے سے میز صاف کرتا۔ پونچھ کر ایک گلاس رکھتا۔ ایک پلیٹ میں کابلی چنے دوسری میں کھاری سینگ یعنی نمک لگی مونگ پھلی لاتا۔ مجید اس سے کہتا ''یار بڑا لا نا تم ہمیشہ بھول جاتے ہو''۔

یہ چیزیں گزک کے طور پر بیئر کے ساتھ مفت ملی تھیں۔ مجید نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا کہ بیرے سے کابلی چنوں کی ایک اور پلیٹ منگوا لیتا تھا۔ چنے کافی بڑے بڑے ہوتے تھے نمک اور کالی مرچ سے بہت مزیدار بن جاتے تھے۔ مونگ پھلی کی پلیٹ ہوتی تھی۔ یہ سب ملا کر مجید کا رات کا کھانا بن جاتا تھا۔

بیئر آتی تو وہ بڑے پرسکون انداز میں اس کو گلاس میں انڈیلتا۔ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتا۔ ٹھنڈی یخ بیئر اس کے حلق کے نیچے اترتی تو ایک بڑی عجیب فرحت اس کو محسوس ہوتی۔ اس کو ایسا لگتا کہ ساری دنیا کی ٹھنڈک اس کے دل و دماغ میں جمع ہو گئی ہے...... موٹے پارسی کی طرف دیکھتا اور سوچتا۔ یہ پارسیوں کی ناک کیوں اتنی موٹی ہوتی ہے۔ اس قوم نے کیا قصور کیا ہے کہ خدا ان کی ناکوں سے بالکل غافل ہے...... پرسوں ٹرین میں جو پارسن بیٹھی تھی بڑا سڈول بدن' خوبصورت آنکھیں ابھرا ہوا سینہ بے داغ سفید رنگ۔ ماتھا کشادہ پتلے پتلے ہونٹ لیکن یہ بری طوطے ایسی ناک اس کو دیکھ کر مجید کو بہت ترس آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آیا ایسی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ اس کی ناک ٹھیک ہو جائے...... پھر اس کے دماغ میں مختلف اوقات پر دیکھی ہوئی خوبصورت اور جوان لڑکیاں تیرنے لگتی

تھیں۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کا شباب بیئر میں گھول کر پی رہا ہے۔

دیر تک وہاں بیٹھا وہ اپنی زندگی کے حسین لمحات کو دہراتا رہتا۔

پندرہ دن ہوئے اپالو بندر پر جب تیز ہوا میں ایک یہودن لڑکی کا ریشمی سکرٹ اٹھا تھا تو کتنی متناسب اور حسین ٹانگوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔

پچھلے اتوار ایرانی کے ہوٹل کے پائے کا شوربہ کتنا لذیذ تھا۔ کیسے چٹخارے لے لے کر اس نے اس میں گرم گرم نان بھگو کر کھایا تھا۔

رنگین فلم کتنا اچھا تھا۔ رقص کتنا دلفریب تھا ان عورتوں کا۔

آج صبح ناشتے کے بعد سگریٹ پی کر لطف آ گیا۔ ایسا لطف ہر روز آیا کرے تو مزے آ جائیں۔

وہ میاں بیوی جو اس نے دادر اسٹیشن پر دیکھے تھے آپ میں کتنے خوش تھے۔ کبوتر اور کبوتری کی طرح گنگ رہے تھے۔

کیکی مستری بڑا اچھا آدمی تھا۔ کل میں نے اسپرو مانگی تو اس نے مفت دے دی کہنے لگا ''اس کے دام کیا لوں گا آپ سے''۔ پچھلے ماہ اس نے وقت پر میری مدد بھی کی تھی پانچ روپے ادھار مانگے فوراً دے دیئے اور کبھی تقاضا نہ کیا۔

ٹریم میں جب میں نے اس روز مرہٹی لڑکی کو اپنی سیٹ دی تو اس نے کتنی پیاری شکر گزاری سے کہا تھا ''تھینک یو''۔

پھر وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے پر یہ بڑی ناک اس کو نظر آتی۔ مجید پھر سوچتا ''یہ کیا بات ہے ان پارسیوں کی ناکوں کے ساتھ اتنا برا سلوک کیوں کیا گیا ہے...... کتنی کوفت ہو رہی ہے اس ناک سے فوراً ہی یہ خیال آتا کہ یہ

پارسی بڑا نیک آدمی ہے کیونکہ وہ اس کو ادھار دے دیتا تھا۔ جب اس کی جیب میں پیسے نہ ہوتے تو وہ کاؤنٹر کے پاس جاتا اور اس سے کہتا ''سیٹھ آج مال پانی نہیں ......کل''۔

بیئر کی بوتل چودہ آنے میں آتی تھی۔ اس کو خالی کر کے اور پلیٹیں صاف کر کے وہ ہاتھ کے بڑے خوبصورت اشارے سے بیرے سے کہتا ''باقی دو آنے تم اپنے پاس رکھو''۔

بیرا اسلام کرتا۔ مجید بے حد مسرور اور شادماں اٹھتا اور پارسی سیٹھ کو ''صاحب جی'' کہہ کر دفتر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے قدم رک جاتے۔ پڑوس کی گلی میں ایک چھوٹی سی تاریک کھولی میں مس لینا رہتی تھی۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور ڈانسر تھی مگر اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ یہودن تھی۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایستھر اور ہیلن ایستھر سولہ برس کی تھی اور ہیلن تیرہ برس کی۔ دونوں رات کو اپنی ماں کے پاس ایک لمبا کرتہ پہنے لیٹی ہوتی تھیں۔ صرف ایک پلنگ تھا۔ مس لینا فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔

رات کو بیئر پی کر مس لینا کے ہاں جانا مجید کا معمول بن گیا تھا۔ وہ باہر ہوٹل والے کو تین چائے کا آرڈر دے کر گلی میں داخل ہوتا اور مس لینا کی کھولی میں پہنچ جاتا۔ اندر ٹین کی کپی جل رہی ہوتی۔ ایستھر اور ہیلن قریب قریب نیم برہنہ ہوتیں۔ مجید پہنچتا تو زور سے پکارتا ''السلام علیکم''۔

ماں بیٹیاں ٹھیٹ عربی لہجے میں وعلیکم السلام کہتیں اور وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا اور مس لینا سے کہتا ''چائے کا آرڈر دے آیا ہوں''۔

ایلتھر باریک آواز میں کہتی ''تھینک یو''۔ چھوٹی بستر پر لوٹیں لگانا شروع کر دیتی ۔مجید کو اس کی آڑو آڑو جتنی چھاتیوں اور ننگی ٹانگوں کی کئی جھلکیاں دکھائی دیتیں جو اس کے مسرور و مخمور دماغ کو بڑی فرحت بخشتیں۔

باہر والا چائے لے کر آتا تو ماں بیٹیاں پینا شروع کر دیتیں۔مجید خاموش بیٹھا رہتا۔اس تنگ و تار ماحول میں ایک عجیب و غریب سکون اس کو محسوس ہوتا۔وہ چاہتا کہ ان تینوں کا شکریہ ادا کرے۔اس دھواں دینے والی کپی کا بھی شکریہ ادا کرے جو دھیمی دھیمی روشنی پھیلا رہی ہے۔وہ لوہے کی اس کرسی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔جس نے اس کو نشست پیش کی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماں بیٹیاں کے پاس بیٹھتا۔دونوں لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ان کی خوبصورتی مجید کی آنکھوں میں بڑی پیاری نیند لے آتی۔رخصت لے کر وہ اٹھتا اور جھومتا جھامتا اپنے دفتر پہنچ جاتا اور کپڑے بدل کر بنچ پر لیٹتا اور لیٹتے ہی خوشگوار اور پر سکون نیند کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔

فرصت کے اوقات میں وسکی کے تین چار پیگ پی کر جب مجید اس زمانے کو یاد کرتا تو کچھ عرصے کے لیے یہ سب کچھ بھول کر اس میں محو ہو جاتا۔نشہ کم ہوتا تو وہ بلیک مارکیٹ کے متعلق سوچنے لگتا۔روپیہ کمانے کے نئے ڈھنگ تخلیق کرتا۔ان عورتوں کے متعلق غور کرتا جن سے وہ جنسی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

مجید کا ماضی جنگ سے پہلے کی فضل میں گم ہو چکا تھا......ایک مدھم سی لکیر رہ گئی تھی جس کو مجید اب دولت سے پیٹ رہا تھا۔

☆☆☆

محمودہ

مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اچانک اس کو دو بڑی بڑی ...... غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیں ...... یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں۔

مستقیم عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا...... محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً محسوس نہیں ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ اس کی دلہن کیسی تھی۔ یہ بتانے کے لیے اس کو موقع دیا گیا۔ مگر محمودہ کی آنکھیں اس کی دلہن اور اس کے درمیان ایک سیاہ مخملیں پردے کے مانند حائل ہو گئیں۔

اس نے چوری چوری کئی مرتبہ محمودہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سب چہچہا رہی تھیں۔ مستقیم سے بڑے زوروں کی چھیڑ خانی ہو رہی تھی۔ مگر وہ الگ تھلگ کھڑکی کے پاس گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گورا تھا۔ بال تختیوں پر لکھنے والی سیاہی کے مانند کالے اور چمکیلے تھے۔ اس نے سیدھی مانگ نکال رکھی تھی جو اس کے بیضوی چہرے پر بہت جمتی تھی۔ مستقیم کا اندازہ یہ تھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کی تصدیق ہو گئی۔

لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔ دوپٹہ جب اس کے سر سے ڈھلکا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط ہے۔ بھرا بھرا جسم تیکھی

ناک چوڑی پیشانی چھوٹا سا لب دہان...... اور آنکھیں...... جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھیں۔

مستقیم اپنی دلہن گھر لے آیا...... دو تین مہینے گزر گئے۔ وہ خوش تھا اس لیے کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت اور باسلیقہ تھی...... لیکن وہ محمودہ کی آنکھیں نہیں بھول سکا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے دل و دماغ پر مرتسم ہو گئی ہیں۔

مستقیم کو محمودہ کا نام نہیں معلوم تھا...... ایک دن اس نے اپنی بیوی کلثوم سے برسبیل تذکرہ پوچھا "وہ...... وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر...... جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہو رہی تھی وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی"۔

کلثوم نے جواب دیا "میں کیا کہہ سکتی ہوں...... اس وقت کئی لڑکیاں تھیں۔ معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں"۔

مستقیم نے کہا "وہ...... وہ جس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں"۔

کلثوم سمجھ گئی۔ "اوہ...... آپ کا مطلب محمودہ سے ہے...... ہاں واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں، لیکن بری نہیں لگتیں...... غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ بہت کم گو اور شریف ہے...... کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے"۔

مستقیم کو غیر ارادی طور پر ایک دھچکا سا لگا "اس کی شادی ہو گئی کل؟"

"ہاں...... میں کل وہیں تو گئی تھی...... میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ میں نے اس کو ایک انگوٹھی دی ہے"۔

"ہاں ہاں...... مجھے یاد آ گیا...... لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جس سہیلی کی شادی پر جا رہی ہو وہی لڑکی ہے بڑی بڑی آنکھوں والی...... کہاں شادی ہوئی ہے

اس کی؟"

کلثوم نے گلوری بنا کر اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا "اپنے عزیزوں میں...... خاوند اس کا ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے...... سنا ہے بے حد شریف آدمی ہے"۔

مستقیم نے گوری کلے کے نیچے دبائی "چلو اچھا ہو گیا...... لڑکی بھی جیسا کہ تم کہتی ہو شریف ہے"۔

کلثوم سے رہا نہ گیا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کا خاوند محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے "حیرت ہے آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا"۔

مستقیم نے کہا "اس کی آنکھیں ہی کچھ ایسی ہیں کہ آدمی بھول نہیں سکتا...... کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

کلثوم دوسرا پان بنا رہی تھی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ اپنے خاوند سے مخاطب ہوئی "میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی...... مرد جانے کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں"۔

مستقیم نے مناسب خیال کیا کہ اس موضوع پر اب مزید گفتگو نہیں ہونی چاہیے چنانچہ جواب میں مسکرا کر وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا...... اتوار کی چھٹی تھی حسب معمول اسے اپنی بیوی کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے جانا چاہیے تھا مگر محمودہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے اپنی طبیعت مکدر کر لی تھی۔

اس نے آرام دہ کرسی میں لیٹ کر تپائی پر سے ایک کتاب اٹھائی جسے وہ دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ پہلا ورق نکالا اور پڑھنے لگا۔ مگر حروف گڈمڈ ہو کر محمودہ کی

آنکھیں بن جاتے۔ مستقیم نے سوچا ''شاید کلثوم ٹھیک کہتی تھی کہ اسے محمودہ کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی ...... ہو سکتا ہے کسی اور مرد کو بھی نظر نہ آئے...... ایک صرف میں ہوں جسے دکھائی دی ہے...... پر کیوں؟...... میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا...... میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میرے لیے پرکشش بن جائیں...... ایک لمحے کی تو بات تھی۔ بس میں نے ایک نظر دیکھا اور وہ میرے دماغ پر چھا گئیں۔ اس میں نہ ان آنکھوں کا قصور ہے نہ میری آنکھوں کا جن سے میں نے انہیں دیکھا''۔

اس کے بعد مستقیم نے محمودہ کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا ''تو ہو گئی اس کی شادی...... چلو اچھا ہوا...... لیکن دوست کیا بات ہے کہ تمہارے دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے...... کیا تم چاہتے ہو کہ اس کی شادی نہ ہو...... سدا کنواری رہے کیونکہ تمہارے دل میں اس سے شادی کرنے کی خواہش تو کبھی پیدا نہیں ہوئی تم نے اس کے متعلق کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا پھر یہ جلن کیسی؟...... اتنی دیر تمہیں اسے دیکھنے کا بھی خیال نہ آیا پر اب تم کیوں اسے دیکھنا چاہتے ہو...... بفرض محال دیکھ بھی لو تو کیا کرلو گے۔ اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لو گے...... اس کی بڑی بڑی آنکھیں نوچ کر اپنے بٹوے میں ڈال لو گے...... بولو نا کیا کرو گے؟''

مستقیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر کچھ چاہتا بھی ہے تو کیوں چاہتا ہے۔

محمودہ کی شادی ہو چکی تھی اور وہ بھی صرف ایک روز پہلے۔ یعنی اس وقت

جب کہ مستقیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا محمودہ یقیناً دلہنوں کے لباس میں یا تو اپنے میکے یا اپنی سسرال میں شرمائی لجائی بیٹھی تھی ...... وہ خود شریف تھی اس کا شوہر بھی شریف تھا ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا ...... بڑی خوشی کی بات تھی۔ مستقیم کی دلی خواہش تھی کہ وہ خوش رہے ...... ساری عمر خوش رہے ...... لیکن اس کے دل میں نہ جانے کیوں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی اور اسے بے قرار بنا جاتی تھی۔

مستقیم آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اسے محمودہ کے متعلق قطعاً سوچنا نہیں چاہیے ...... دو برس گزر گئے۔ اس دوران میں اسے محمودہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ اور اس کا خاوند بمبئی میں ڈونگری کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ مستقیم گو ڈونگری سے بہت دور ماہم میں رہتا تھا لیکن اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے محمودہ کو دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا ''آپ کی اس بڑی بڑی آنکھوں والی محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے''۔

چونک کر مستقیم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ''کیوں ...... ؟ کیا ہوا؟''

کلثوم نے گلوری بناتے ہوئے کہا ''اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو گیا ہے''۔

''تو اس سے کیا ہوا؟''

''آپ سن تو لیجیے ...... ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے ...... لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی۔ وظیفے کرتا ہے چلے کاٹتا ہے اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے گھر بار سے بالکل غافل ہو

گیا ہے...... ڈاڑھی بڑھالی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے کام پر کبھی جاتا ہے کبھی نہیں جاتا...... کئی کئی دن غائب رہتا ہے...... وہ بے چاری کڑھتی رہتی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں اس لیے فاقے کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے جواب یہ ملتا ہے...... فاقہ کشی اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت پیاری ہے"۔ کلثوم نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہا۔

مستقیم نے پیندانیا سے تھوڑی سی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی "کہیں دماغ تو نہیں چل گیا اس کا؟"

کلثوم نے کہا "محمودہ کا تو یہی خیال ہے...... خیال کا اس کا یقین ہے...... گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے کبھی کبھی سفید رنگ کا چولا بھی پہنتا ہے"۔

مستقیم گلوری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگا "یہ کیا ہوا...... ایسا شوہر تو وبال جان ہوتا ہے...... غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاگل پن کے جراثیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے موجود ہوں گے جو یہ اب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں...... لیکن سوال یہ ہے کہ اب محمودہ کیا کرے گی۔ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔ کچھ شادی کرنے لاہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے...... کیا محمودہ نے اپنے والدین کو لکھا ہو گا؟...... نہیں نہیں اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے ایک مرتبہ کہا تھا اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ شادی اسکے چچا نے کی تھی...... ڈونگری...... ڈونگری میں شاید اس کی جان پہچان کا کوئی ہو...... نہیں جان پہچان کا کوئی ہوتا تو وہ فاقے

کیوں کرتی...... کلثوم کیوں نہ اسے اپنے یہاں لے آئے ...... پاگل ہوئے ہو مستقیم...... ہوش کے ناخن لو"۔

مستقیم نے ایک بار پھر ارادہ کرلیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا۔ اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بیکار کی مغز پاشی تھی۔

بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام جمیل تھا قریب قریب پاگل ہوگیا ہے"۔

مستقیم نے پوچھا "کیا مطلب؟"

کلثوم نے جواب دیا "مطلب یہ کہ رات کو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوتا۔ جہاں کھڑا ہے بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے...... محمودہ غریب روتی رہتی ہے۔ میں کل اس کے پاس گئی تھی...... بے چاری کو کئی دن کا فاقہ تھا میں بیس روپے دے آئی تھی کیونکہ میرے پاس اتنے ہی تھے"۔

مستقیم نے کہا "اچھا کیا تم نے...... جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہو جاتا کچھ نہ کچھ دے آیا کروتا کہ غریب کو فاقوں کی نوبت تو نہ آئے"۔

کلثوم نے تھوڑے توقف کے بعد عجیب وغریب لہجے میں کہا "اصل میں بات کچھ اور ہے"۔

"کیا مطلب"

"محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وہ پاگل واگل ہرگز نہیں...... بات یہ ہے کہ وہ......"

"وہ کیا؟"

"وہ...... عورت کے قابل نہیں...... یہ نقص دور کرنے کے لیے وہ فقیروں اور سنیاسیوں سے ٹونے ٹوٹکے لیتا رہتا ہے"۔

مستقیم نے کہا "یہ بات تو پاگل ہونے سے زیادہ افسوسناک ہے...... محمودہ کے لیے تو یہ سمجھو کہ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کر رہ گئی ہے!

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیٹھ کر محمودہ کی حالت زار کے متعلق سوچنے لگا۔ ایسی عورت کی زندگی کیا ہو گی جس کا شوہر بالکل صفر ہو...... کتنے ارمان ہوں گے اس کے سینے میں۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے ہوں گے...... اس نے اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنا ہو گا...... کتنی ناامیدی ملی ہو گی غریب کو جب اسے چاروں طرف خلا ہی خلا نظر آیا ہو گا...... اس نے اپنی گود ہری ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہو گا...... جب ڈونگری میں کسی کے ہاں...... بچہ پیدا ہونے کی اطلاع اسے ملتی ہو گی تو بیچاری کے دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہو گا...... اب کیا کرے گی...... ایسا نہ ہو خودکشی کر لے...... دو برس تک اس نے کسی کو یہ راز نہ بتایا مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا خدا اس کے حال پر رحم کرے"۔

بہت دن گزر گئے۔ مستقیم اور کلثوم چھٹیوں میں پنچ گنی چلے گئے۔ دونوں ڈھائی مہینے رہے واپس آئے تو ایک مہینے کے بعد کلثوم کے ہاں لڑکا پیدا ہوا...... وہ محمودہ کے ہاں نہ جا سکی...... لیکن ایک دن اس کی ایک سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی اس کو مبارکباد دینے کے لیے آئی...... اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا "کچھ سنا تم نے...... وہ محمودہ ہے نا بڑی بڑی آنکھوں والی"۔

کلثوم نے کہا "ہاں ہاں...... ڈونگری میں رہتی ہے"۔

"خاوند کی بے پروائی نے غریب کو بری باتوں پر مجبور کر دیا" کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا۔

کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا "کیسی بری باتوں پر؟"

"اب اس کے یہاں غیر مردوں کا آنا جانا شروع ہو گیا ہے"۔

"جھوٹ" کلثوم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

کلثوم کی سہیلی نے کہا "نہیں کلثوم میں جھوٹ نہیں بولتی ...... میں پرسوں اس سے ملنے گئی تھی دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو میمن معلوم ہوتا تھا باہر نکلا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی"۔

"یہ تم نے بہت بری خبر سنائی ...... خدا اس کو گناہ کے راستے سے بچائے رکھے ...... ہو سکتا ہے وہ میمن اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو"۔ کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔

اس کی سہیلی مسکرائی "دوست چوروں کی طرف دروازہ کھول کر بھاگا نہیں کرتے"۔

کلثوم نے اپنے خاوند سے بات کی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ کبھی نہیں رویا تھا پر جب کلثوم نے یہ اندوہناک بات بتائی کہ محمودہ نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ محمودہ ان کے یہاں رہے گی چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا "یہ بڑی خوفناک بات ہے ...... تم ایسا کرو ابھی جاؤ اور محمودہ کو یہاں لے آؤ"۔

کلثوم نے بڑے روکھے پن سے کہا ''میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی''۔

''کیوں؟'' مستقیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

''بس میری مرضی...... وہ میرے گھر میں کیوں رہے...... لیے کہ آپ کو اس کی آنکھیں پسند ہیں؟'' کلثوم کے بولنے کا انداز بہت زہریلا اور طنزیہ تھا۔

مستقیم کو بہت غصہ آیا مگر پی گیا۔ کلثوم سے بحث کرنا فضول تھا۔ ایک صرف یہی ہوسکتا تھا کہ وہ کلثوم کو نکال کر محمودہ کو لے آئے...... مگر وہ ایسے اقدام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مستقیم کی نیت قطعاً نیک تھی۔ اس کو خود اس کا احساس تھا۔ دراصل اس نے کسی گندے زاویہ نگاہ سے محمودہ کو دیکھا ہی نہیں تھا...... البتہ اس کی آنکھیں واقعی اس کو پسند تھیں اتنی کہ وہ بیان نہیں کرسکتا تھا۔

وہ گناہ کا راستہ اختیار کرچکی تھی۔ ابھی اس نے صرف چند قدم اٹھائے تھے۔ اس کو تباہی کے غار سے بچایا جاسکتا تھا...... مستقیم نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی کبھی روزہ نہیں رکھا تھا کبھی خیرات نہیں دی تھی...... خدا نے اس کو کتنا اچھا موقع دیا تھا کہ وہ محمودہ کو گناہ کے رستے پر سے گھسیٹ کر لے آئے اور طلاق وغیرہ دلوا کر اس کی کسی اور سے شادی کرادے...... مگر وہ یہ ثواب کا کام نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بیوی کا ذلیل تھا۔

بہت دن تک مستقیم کا ضمیر اس کو سرزنش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کوشش کی کہ اس کی بیوی رضامند ہوجائے۔ مگر جیسا کہ مستقیم کو معلوم تھا ایسی کوشش لاحاصل تھی۔

مستقیم کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو کلثوم محمودہ سے ملنے ضرور جائے گی۔ مگر اس کو ناامیدی ہوئی۔ کلثوم نے اس روز سے محمودہ کا نام تک نہ لیا۔

اب کیا ہو سکتا ہے...... مستقیم خاموش ہو رہا۔

قریب قریب دو برس گزر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریحاً فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی کھولی کے باہر تھڑے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ مستقیم دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ فوراً مڑ کر اس نے غور سے دیکھا...... محمودہ ہی تھی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ ایک یہودنی کے ساتھ جو اس کھولی میں رہتی تھی باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

اس یہودن کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش مردوں کے لیے جوان لڑکیاں مہیا کرنا تھا۔ اس کی اپنی دو جوان بیٹیاں تھیں جن سے وہ پیشہ کراتی تھی۔ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بے ہودہ میک اپ کیا ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ اندوہناک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی...... وہاں سے فوراً چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے کلثوم سے اس واقعے کا ذکر نہ کیا...... کیونکہ اس کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ محمودہ اب مکمل عصمت فروش عورت بن چکی تھی...... مستقیم کے سامنے جب بھی اس کا بے ہودہ اور فحش طور پر میک اپ کیا ہوا چہرہ آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اس کا ضمیر اس سے کہتا ''مستقیم جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس کے باعث تم ہو...... کیا ہوا تھا اگر تم اپنی بیوی کی چند روز کی ناراضگی اور خفگی برداشت کر لیتے۔ زیادہ سے زیادہ جس میں وہ اس وقت دھنسی ہوئی ہے...... کیا تمہاری نیت نیک نہیں تھی...... اگر تم سچائی پر رہتے تو کلثوم ایک نہ

ایک دن اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی...... تم نے بڑا ظلم کیا...... بہت بڑا گناہ کیا‘‘۔

مستقیم اب کیا کر سکتا تھا...... کچھ بھی نہیں...... پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چڑیاں سارا کھیت چگ گئی تھیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے مریض کو دم آخریں او کسیجن سنگھانے والی بات تھی۔

تھوڑے دنوں بعد بمبئی کی فضا فرقہ ورانہ فسادات کے باعث بڑی خطرناک ہو گئی۔ بٹوارے کے باعث ملک کے طول و عرض میں تباہی اور غارتگری کا بازار گرم تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔ کلثوم نے مستقیم کو مجبور کیا کہ وہ بھی بمبئی چھوڑ دے...... چنانچہ جو پہلا جہاز ملا اس کی سیٹیں بک کرا کے میاں بیوی کراچی پہنچ گئے اور چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔

ڈھائی برس بعد یہ کاروبار ترقی کر گیا‘ اس لیے مستقیم نے ملازمت کا خیال ترک کر دیا...... ایک روز شام کو دکان سے اٹھ کر وہ ٹہلتا ٹہلتا صدر جا نکلا...... جی چاہا کہ ایک پان کھائے۔ بیس تیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی جس پر کافی بھیڑ تھی۔ آگے بڑھ کر وہ دکان کے پاس پہنچا...... کیا دیکھتا ہے کہ محمودہ بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ جھلسے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا فحش میک اپ ہے۔ لوگ اسے گندے گندے مذاق کر رہے ہیں اور وہ ہنس رہی ہے...... مستقیم کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ قریب تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کہ محمودہ نے اسے پکارا ’’ادھر آؤ دولہا میاں...... تمہیں ایک فسٹ کلاس پان کھلائیں...... ہم تمہاری شادی میں شریک تھے‘‘۔

مستقیم بالکل پتھرا گیا۔

☆☆☆

مسز ڈی کوسٹا

نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔

میرے پیٹ میں اب پہلی سی گڑ گڑ نہیں تھی۔ پر مسز ڈی کوسٹا کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھی۔ چنانچہ آنے والی حادثے کی تمام انجانی تکلیفیں بھول گئی تھی اور مسز ڈی کوسٹا کی حالت پر رحم کھانے لگی تھی۔

مسز ڈی کوسٹا میری پڑوسن تھی۔ ہمارے فلیٹ کی بالکونی اور اس کے فلیٹ کی بالکنی میں صرف ایک چوبی تختہ حائل تھا جس میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں میں سے میں اور اللہ بخشے میری ساس ڈی کوسٹا کے سارے خاندان کو کھانا کھاتے دیکھا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کے ہاں سکھائی ہوئی جھینگا مچھلی پکتی اور اس کی ناقابل برداشت بو ان سوراخوں میں سے چھن چھن کر ہم تک پہنچ جاتی تو میں اور میری ساس بالکنی کا رخ نہ کرتے تھے۔ میں اب بھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنی بدبودار چیز کھائی کیونکر جا سکتی ہے۔ پر بابا کیا کہا جائے انسان بری چیزیں کھا جاتا ہے۔ کون جانے انہیں ناقابل برداشت بو ہی میں لطف آتا ہو۔

مسز ڈی کوسٹا کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے کٹے ہوئے بال جو اپنی سیاہی کھو چکے تھے اور جن میں بے شمار سفید دھاریاں پڑ چکی تھیں۔ اس کے چھوٹے سے سر پر گھسے ہوئے نمدے کی ٹوپی کی صورت میں پریشان رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ نیا بھڑکیلے رنگ کا بہت بھونڈے طریقے سے سلا ہوا فراک پہنتی تھی تو سر پر لال لال بندکیوں والا جال بھی لگا لیتی تھی۔ جس سے اس کے

چھدرے بال اس کے سر کے ساتھ چپک جاتے تھے۔ اس حالت میں وہ درزیوں کا ایسا ماڈل دکھائی دیتی تھی جو نیلام گھر میں پڑا ہو۔

میں نے کئی بار اسے اپنے انہیں بالوں میں لہریں پیدا کرنے کی کوشش میں بھی مصروف دیکھا ہے۔ اپنے چار بیٹوں کو جن میں سے ایک تازہ تازہ فوج میں بھرتی ہوا تھا اور اپنے آپ کو ہندوستان کے حکمرانوں کی فہرست میں شامل سمجھتا تھا اور دوسرا جو ہر روز اپنی کلف لگی پتلون استری کر کے پہنتا تھا اور نیچے آکر چھوٹی چھوٹی کرسچین لڑکیوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا...... ناشتہ کرا دیا کرتی تھی اور اپنے بڈھے خاوند کو جو ریلوے میں ملازم تھا بالکنی سے نکل کر ہاتھ کے اشارے سے بائے بائے کرنے کے بعد فارغ ہو جاتی تھی تو اپنے سر کے ناقابل گرفت بالوں میں لہریں پیدا کرنے والے کلپ اٹکا دیا کرتی تھی اور ان کلپوں سمیت سوچا کرتی تھی کہ میرے یہاں بچہ کب پیدا ہو گا۔

وہ خود آدھے درجن بچے پیدا کر چکی تھی جن میں سے پانچ زندہ تھے۔ ان کی پیدائش پر بھی وہ یونہی دن گنا کرتی تھی یا چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی اور بچے خود بخود پیدا ہونے کے لیے چھوڑ دیتی تھی۔ اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں لیکن مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ضرور ہے کہ جو کچھ میرے پیٹ میں تھا۔ اس سے مسز ڈی کوسٹا کو جس کا داہنا پیر اور اس کے اوپر کا حصہ کسی بیماری کے باعث ہمیشہ سوجھا رہتا تھا۔ بہت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ دن میں کئی مرتبہ بالکنی سے جھانک کر وہ مجھے آواز دیا کرتی تھی اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں جس کا نہ بولنا اس کے نزدیک شاید ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کی ہتک تھی۔ مجھ سے کہا کرتی تھی ''میں بولی آج

تم کدھر گیا تھا......''

جب میں اسے بتاتی تھی کہ میں اپنے خاوند کیساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی تو اس کے چہرے پاناامیدی کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ انگریزی بھول کر بمبئی کی اردو میں گفتگو کرنا شروع کر دیتی۔ جس کا مقصد مجھ سے صرف اس کا پتہ لینا ہوتا تھا کہ میرے خیال کے مطابق بچے کی پیدائش میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں یقیناً اسے بتا دیتی۔ اس میں حرج ہی کیا تھا۔ اس بے چاری کو خواہ مخواہ کی الجھن سے نجات مل جاتی اور مجھے بھی ہر روز اس کے نت نئے سوالوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش اور اس کے متعلقات کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ نو مہینے ہو جانے کے بعد بچہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

مسز ڈی کوسٹا کے حساب کے مطابق نو مہینے ہو چکے تھے۔ میری ساس کا خیال تھا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں لیکن یہ نو مہینے کہاں سے شروع کر کے پورے کر دیے گئے تھے میں نے بہتیرا اپنے ذہن پر زور دیا پر سمجھ نہ سکی۔

بچہ میرے پیدا ہونے والا تھا شادی میری ہوئی تھی۔ لیکن سارا ہی کھاتہ مسز ڈی کوسٹا کے پاس تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ یہ میری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے اگر میں نے کسی چھوٹی سی نوٹ بک میں چھوٹی سی نوٹ بک میں نہ سہی اس کاپی ہی میں جو دھوبی کے حساب کے لیے مخصوص تھی۔ سب تاریخیں لکھ چھوڑی ہوتیں تو کتنا اچھا تھا۔

اتنا تو مجھے یاد تھا کہ میری شادی ۲۶ اپریل کو ہوئی یونی ۲۶ کی رات کو میں اپنے

گھر کے بجائے اپنے خاوند کے گھر میں تھی لیکن اس کے بعد کے واقعات کچھ اس قدر غلط ملط ہو گئے تھے کہ اس بات کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا اور مجھے تعجب ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نو مہینے پورے ہو چکے ہیں اور بچہ لیٹ ہو گیا تھا۔

ایک روز اس نے میری ساس سے اضطراب بھرے لہجے میں کہا ''تمہارے ڈاٹر ان لا کا بچہ لیٹ ہو گیا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے میں پیدا ہونا مانگتا تھا''۔

می اندر صوفے پر لیٹی تھی اور آنے والے حادثے کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ مسز ڈی کوسٹا کی یہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی اور ایسا لگا کہ مسز ڈی کوسٹا اور میری ساس دونوں پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں اور جس گاڑی کا انہیں انتظار تھا لیٹ ہو گئی ہے۔

اللہ بخشے میری ساس کو اتنی شدت کا انتظار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کئی مرتبہ مسز ڈی کوسٹا سے کہہ چکی تھیں ''کوئی فکر کی بات نہیں خدا اپنا فضل کرے گا۔ کچھ دن اوپر ہو جایا کرتے ہیں''۔ مگر ڈی کوسٹا نہیں مانتی تھی جو حساب وہ لگا چکی تھی غلط کیسے ہو سکتا تھا۔ جب مسز ڈی سلوا کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے دور ہی سے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ چنانچہ چوتھے ہی روز مسز ڈی سلوا ہسپتال جاتی نظر آئی اور خود اس نے چھ بچے جنے تھے جن میں سے ایک بھی لیٹ نہ ہوا تھا اور پھر وہ نرس تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس نے کسی ہسپتال میں دایہ گیری کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر سب لوگ اسے نرس کہتے تھے۔ چنانچہ ان کے فلیٹ کے باہر چھوٹی سی چوبی تختی پر ''نرس ڈی کوسٹا'' لکھا رہتا تھا۔ اسے بچوں کی

پیدائش کے اوقات معلوم نہ ہوتے تو اور کس کو ہوتے۔

جب کمرہ نمبر ۷ کے رہنے والے مسٹر نذیر کی ناک سوجھ گئی تھی تو مسز ڈی کوسٹا نے بازار سے روئی کا بنڈل منگوا کر اور پانی گرم کر کے ٹکور کی تھی۔ بار بار وہ اس واقعے کو سند کے طور پر پیش کیا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے بار بار کہنا پڑتا تھا ''ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایسی عورت رہتی ہے جو خوش خلق ہونے کے علاوہ اعلیٰ نرس بھی ہے''۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوتی تھی اور اس کو یوں خوش کرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جب صاحب کو تیز بخار چڑھتا تھا تو مسز ڈی کوسٹا نے برف لگانے والی ربڑ کی تھیلی فوراً مجھے لا دی تھی۔ یہ تھیلی ایک ہفتہ ہمارے یہاں پڑی رہی اور ملیریا کے مختلف شکاروں کے استعمال میں آتی رہی۔ یوں بھی مسز ڈی کوسٹا بڑی خدمت گزار تھی لیکن اس کی اس رضا کاری میں اس کی متجسس طبیعت کو کافی دخل تھا۔ دراصل وہ اپنے تمام پڑوسیوں کے ان رازوں سے بھی واقف ہونے کی آرزومند تھی جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔

مسز ڈی سلوا چونکہ مسز ڈی کوسٹا کی ہم مذہب تھی۔ اس لیے اس کی بہت سی کمزوریاں اس کو معلوم تھیں۔ مثلاً وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی کرسمس پر ہوئی اور بچہ جولائی میں پیدا ہوا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کی اصلی شادی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا ناچ گھروں میں جاتی ہے اور یوں بہت سا روپیہ کماتی ہے اور اب وہ اتنی خوبصورت نہیں رہی تھی جتنی پہلے تھی۔ چنانچہ اس کی آمدنی بھی پہلے کی نسبت کم ہو گئی ہے۔

ہمارے سامنے جو یہودی رہتے تھے۔ ان کے متعلق مسز ڈی سلوا کے مختلف

بیان تھے۔ کبھی وہ کہتی تھی کہ موٹی موڈیل جورات کو دیر سے گھر آتی ہے۔ سٹہ کھیلتی ہے اور وہ صبح ٹھگنا سا بڈھا جو اپنی پتلون کے گیسوں میں انگوٹھے اٹکائے اور کوٹ کاندھے پر رکھے صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کو لوٹتا ہے موڈیل کا پرانا دوست ہے۔ اس بڈھے کے متعلق اس نے یہ کھوج لگا کر معلوم کیا تھا کہ صابن بناتا ہے جس میں تیجی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک دن اس نے ہمیں بتایا کہ موڈیل نے اپنی لڑکی کی جو بہت خوبصورت ہے اور ہر روز نیلے رنگ کا جمپر پہن کر سکول جاتی ہے اس آدمی سے منگنی کر رکھی ہے جو ہر روز ایک پارسی کو موٹر میں لیکر آتا ہے۔ اسی پارسی کے متعلق میں اتنا جانتی ہوں کہ اس کی موٹر ہمیشہ نیچے کھڑی رہتی تھی اور وہ موڈیل کی لڑکی کے منگیتر سمیت رات وہیں بسر کرتا تھا۔ مسز ڈی کوسٹا کا بیان یہ تھا کہ موڈیل کی لڑکی فلوری کا منگیتر پارسی کا موٹر ڈرائیور ہے اور یہ پارسی اپنے موٹر ڈرائیور کی بہن للّی کا عاشق ہے جو اپنی چھوٹی بہن وائلٹ سمیت اسی فلیٹ میں رہتی تھی۔ وائلٹ کے متعلق مسز ڈی کوسٹا کی رائے بہت خراب تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ لونڈیا جو ہر وقت ایک ننھے بچے کو اٹھائے رہتی ہے۔ بہت برے کریکٹر کی ہے اور اس ننھے بچے کے متعلق اس نے ایک دن ہمیں یہ خبر سنائی تھی کہ جیسا مشہور کیا گیا ہے وہ کسی پارسن کا لاوارث بچہ نہیں بلکہ خود وائلٹ کی بہن للّی کا ہے اور جو للّی ہے بس مجھے اتنا ہی یاد رہا ہے کیونکہ جو شجرہ مسز ڈی کوسٹا نے تیار کیا تھا اتنا لمبا تھا کہ شاید ہی کسی کو دوبارہ یاد رہ سکے۔

صرف آس پاس کی عورتوں اور پڑوس کے مردوں تک مسز ڈی کوسٹا کی معلومات محدود نہیں تھیں۔ اسے دوسرے محلے کے لوگوں کے متعلق بھی بہت سی

باتیں معلوم تھیں چنانچہ جب وہ اپنے سوجھے ہوئے پیر کا علاج کرانے کی غرض سے باہر جاتی تو گھر لوٹتے ہوئے دوسرے محلوں کی بہت سی خبریں لاتی تھی۔

ایک روز جب مسز ڈی کوسٹا میرے بچے کی پیدائش کا انتظار کرکے تھک ہار چکی تھی۔ میں نے اسے باہر پھاٹک کے قریب دو بڑے لڑکوں ایک لڑکی اور پڑوس کی دو عورتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھا۔ یہی خیال کرکے جی ہی جی میں بہت کڑھی کہ میرے بچے کے لیٹ ہوجانے کے متعلق باتیں ہو رہی ہوں گی۔ چنانچہ جب اس نے گھر کا رخ کیا تو میں جنگلے سے پرے ہٹ گئی مگر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ سیدھی اوپر چلی آئی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے باہر بالکنی ہی میں مونڈھے پر بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھتے ہی اس نے بمبئی کی اردو اور گرامر سے بے نیاز انگریزی میں کہنا شروع کیا وہ تم نے کچھ سنا؟...... مہاتما گاندھی نے کیا کیا...... الی کانگرس ایک نیا قانون پاس کرنا مانگتی ہے۔ میرا فریڈرک خبر لایا ہے کہ بمبئی میں پروہشین ہوجائے گی۔ تم سمجھتا ہے پروہشین کیا ہوتی ہے؟

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا کیونکہ جتنی انگریزی مجھے آتی تھی اس میں پروہشین کا لفظ نہیں تھا۔ اس پر مسز ڈی کوسٹا نے کہا ''پروہشین شراب بند کردینے کو کہتے ہیں ہم پوچھتا ہے کہ اس کانگرس کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ شراب بند کرکے ہم کو تنگ کرنا مانگتی ہے۔ یہ کیسی گورنمنٹ ہے۔ ہم کو ایسی بات ایک دم اچھی نہیں لگتی۔ ہمارا تہوار کیسے چلے گا۔ ہم کیا کریں گے۔ وسکی ہمارے تہواروں میں ہونا ہی مانگتا ہے۔ تم سمجھتی ہونا؟ کرسمس کیسے ہوگا؟...... کرسچین لوگ تو اس لاء کو نہیں مانے گا۔ کیسے مان سکتا ہے۔ میرے گھر میں چوبیس کلاک (گھنٹے) برانڈی کی ضرورت

رہتی ہے۔ یہ لاء پاس ہو گیا تو کام کیسے چلے گا...... ب کچھ گاندھی کر رہا ہے......

گاندھی جو محمڈن لوگ کا ایک دم بیری ہے...... سالا آپ تو پیتا نہیں اور دوسروں کو پینے سے روکتا ہے اور تمہیں مالوم ہے یہ ہم لوگوں کا میرا مطلب ہے گورنمنٹ کا بہت بڑا اینی می (دشمن) ہے"۔

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان کا سارا تپو مسز ڈی کوسٹا کے اندر سما گیا ہے۔ وہ گوآ کی رہنے والی کالے رنگ کی کرچین عورت تھی مگر جب اس نے یہ باتیں کیں تو میرے تصور نے اس پر سفید چمڑی منڈھ دی۔ چند لمحات کے لیے وہ یورپ سے آئی ہوئی تازہ تازہ انگریز عورت دکھائی دی جسے ہندوستان اور اس کے مہاتما گاندھی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

سمندر کے پانی سے نمک بنانے کی تحریک مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی۔ چونکہ چرخہ چلانا اور کھل کر پہننا بھی اسی نے لوگوں کو سکھایا تھا۔ اس قسم کی اور بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں وہ کر چکا تھا۔ شاید اسی لیے مسز دی کوسٹا نے یہ سمجھا تھا کہ بمبئی میں شراب صرف اس لیے بند کی جا رہی ہے کہ انگریز لوگوں کو تکلیف ہو۔ وہ کانگرس اور مہاتما گاندھی کو ایک ہی چیز سمجھتی تھی یعنی لنگوٹی۔

مہاتما گاندھی اور اس کی ہشت پشت پر لعنتیں بھیج کر مسز ڈی کوسٹا اصل بات کی طرف متوجہ ہوئی "اور ہاں یہ تمہارا بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ چلو میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں"۔

میں نے اس وقت بات ٹال دی۔ مگر مسز ڈی کوسٹا گھر جاتے ہوئے پھر مجھ سے کہا "دیکھو تم کو کچھ ایسا ویسا بات ہو گیا تو پھر ہم کو نہ بولنا"۔

اس سے دوسرے روز کا واقعہ ہے کہ صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کئی دنوں سے میں نے مسز کاظمی کو ٹیلیفون نہیں کیا۔ اس کو بھی بچے کی پیدائش کا بہت خیال ہے۔ اس وقت فرصت ہے اور نذیر صاحب کا دفتر جوان کے گھر کے ساتھ ہی ملحق ہے بالکل خالی ہوگا کیونکہ چھ بج چکے تھے۔ اٹھ کر ٹیلی فون کر دینا چاہیے۔ یوں سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے سے ڈاکٹر صاحب اور تجربہ کار عورتوں کے مشورہ پر عمل بھی ہو جائے گا۔ جو یہ تھا کہ چلنے پھرنے سے بچہ آسانی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے سمیت اٹھی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب پہلی منزل پر پہنچی تو مجھے نرس ڈی کوسٹا کا بورڈ نظر آیا اور بیشتر اس کے کہ میں اس کے فلیٹ کے دروازے سے گزر کر دوسری منزل کے پہلے زینے پر قدم رکھوں۔ مسز ڈیکوسٹا باہر نکل آئی اور مجھے گھر لے گئی۔

میرا دم پھولا ہوا تھا اور پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ربڑ کی گیند ہے جو کہیں اٹک گئی ہے۔ اس سے بڑی الجھن پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار اس تکلیف کا ذکر اپنی ساس سے کیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ بچے کی ٹانگ ادھر ادھر پھنس جایا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ ٹانگ وانگ ہی ہلنے سے کہیں پھنس گئی تھی۔ جس کے باعث مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے مسز ڈی کوسٹا سے کہا مجھے ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے۔ اسی لیے میں آپ کے یہاں نہیں بیٹھ سکتی اور بہت سے چھوٹے بہانے میں نے پیش کیے۔ مگر وہ نہ مانی اور میرا بازو پکڑ کر اس نے زبردستی مجھے اس صوفے پر بٹھا دیا جس کا کپڑا بہت میلا ہو رہا تھا۔

مجھے صوفے پر بٹھا کر جلدی جلدی اس نے دوسرے کمرے سے اپنے دو چھوٹے لڑکوں کو باہر نکالا۔ اپنی کنواری جوان لڑکی کو جو مہاتما گاندھی کی لنگوٹی سے کچھ بڑی نیکر پہنتی تھی۔ اس نے باہر بھیج دیا اور مجھے خالی کمرے میں لے گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے اس نے میری طرف افریقی جادوگر کی طرح دیکھا جس نے الہ دین کا چچا بن کر اسے غار میں بند کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ اس نے اتنی پھرتی سے کیا کہ مجھے وہ بہت پراسرار دکھائی دے رہی تھی۔ سوجے ہوئے پیر کے باعث اس کی چال میں خفیف سا لنگڑا پن پیدا ہو گیا تھا جو مجھے اس وقت بہت بھیانک دکھائی دیا۔

میری طرف گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے ادھر دیوار کی تینوں کھڑکیاں بند کر دیں۔ ہر کھڑکی کی چٹخنی چڑھا کر اس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا اسے اس بات کا ڈر ہے کہ میں اٹھ کر بھاگوں گی۔

ایمان کی کہوں اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر بھاگ جاؤں اس کی خاموشی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند کرنے سے میں بہت پریشان ہو گئی تھی آخر اس کا مطلب کیا تھا؟...... وہ چاہتی کیا تھی؟ اتنے زبردست تخلیے کی کیا ضرورت تھی؟...... اور پھر...... وہ لاکھ پڑوسن تھی اس کے ہم پر کئی احسان تھے لیکن آخر وہ تھی تو ایک غیر عورت اور اس کے بیٹے...... وہ موا فوجی اور وہ کلف لگی پتلون والا جو چھوٹی چھوٹی کرچین لڑکیوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا...... اپنے اپنے ہوتے ہیں اور پرائے پرائے۔ میں کئی عشقیہ ناولوں میں کٹنیوں کا حال پڑھ چکی تھی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ نرس ورس بالکل نہیں ہے۔ بلکہ بہت

بڑی گھٹی ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باعث کمرے میں جس کے اندر لوہے کے چار پلنگ پڑے تھے کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ جس سے مجھے اور بھی وحشت ہوئی۔ مگر اس نے فوراً ہی بٹن دبا کر روشنی کر دی۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گی۔ پر اسرار طریقے سے اس نے آتشدان سے ایک بوتل اٹھائی جس میں سفید رنگ کا سیال مادہ تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "اپنا بلاؤز اتارو...... میں کچھ دیکھنا چاہتی ہوں"۔

میں گھبرا گئی "کیا دیکھنا چاہتی ہو؟"

اوپر سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ پھر بلاؤز اتروانے کا کیا مطلب تھا اور اسے کیا حق حاصل تھا کہ وہ دوسری عورتوں کو یوں گھر کے اندر بلا کر بلاؤز اتروانے پر مجبور کرے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا "مسز ڈی کوسٹا میں بلاؤز ہرگز نہیں اتاروں گی" میرے لہجے میں گھبراہٹ کے علاوہ تیزی بھی تھی۔

مسز ڈی کوسٹا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "تو...... تو...... ہم کو معلوم کیسے ہو گا کہ تمہارے گھر میں بچہ کب ہو گا...... اس بوتل میں کھوپرے کا تیل ہے۔ یہ ہم تمہارے پیٹ پر گرا کر دیکھے گا...... اس سے ایک دم معلوم ہو جائے گا کہ بچہ کب ہو گا...... لڑکی ہو گی یا لڑکا"۔

میری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ مسز ڈی کوسٹا مجھے مسز ڈی کوسٹا نظر آنے لگیں۔

کھوپری کا تیل بڑی بے ضرر چیز ہے۔ پیٹ پر اگر اس کی پوری بوتل بھی انڈیل دی جاتی تو کیا حرج تھا اور پھر ترکیب کتنی دلچسپ تھی۔ اس کے علاوہ اگر میں نہ مانتی تو مسز ڈی کوسٹا کو کتنی بڑی ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا مجھے ویسے بھی کسی

کی دل شکنی منظور نہیں ہوتی چنانچہ میں مان گئی۔ بلاؤز اور قمیص اتارنے میں مجھے کافی کوفت ہوئی۔ مگر میں نے برداشت کر لی غیر عورت کی موجودگی میں جب میں نے اپنا پھولا ہوا پیٹ دیکھا جس کے نچلے حصے پر اس طرح کے لال لال نشان بنے ہوئے تھے جیسے ریشمی کپڑے میں چرسیں پڑ پڑ جائیں تو مجھے ایک عجیب قسم کا حجاب محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ فوراً کپڑے پہن لوں اور وہاں سے چل دوں لیکن مسز ڈی کوسٹا کا وہ ہاتھ جس میں کھوپرے کے تیل کی بوتل تھی اٹھ چکا تھا۔

میرے پیٹ پر ٹھنڈے تیل کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ مسز ڈی کوسٹا خوش ہو گئی۔ میں نے جب کپڑے پہن لیے تو اس نے مطمئن لہجہ میں کہا ''آج کیا ڈیٹ ہے؟ گیارہ گیارہ بس پندرہ کو بچہ ہو جائے گا اور لڑکا ہو گا''۔

بچہ ۲۵ تاریخ کو ہوا لیکن تھا لڑکا اب جب کبھی وہ میرے پیٹ پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے کھوپرے کے تیل کی ساری بوتل انڈیل دی ہے۔

☆☆☆

مسٹر حمیدہ

رشید نے پہلی مرتبہ اسے بس اسٹینڈ پر دیکھا..... جہاں وہ شیڈ کے نیچے کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی..... رشید نے جب اسے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے حیرت میں گم ہو گیا.....اس سے قبل اس نے کوئی ایسی لڑکی نہیں دیکھی تھی جس کے چہرے پر مردوں کی مانند ڈاڑھی اور مونچھیں ہوں۔

پہلے رشید نے سوچا کہ شاید اس کی نگاہوں نے غلطی کی ہے۔عورت کے چہرے پر بال کیسے اگ سکتے ہیں..... پر جب اس نے غور سے دیکھا تو اس لڑکی نے باقاعدہ شیو کر رکھی تھی اور سرمئی غبار اس کے گالوں اور ہونٹوں پر موجود تھا۔

رشید سمجھا کہ شاید ہیجڑہ ہو مگر نہیں..... وہ ہیجڑہ نہیں تھی..... اس لیے کہ اس میں ہیجڑوں کی سی مصنوعی نسوانیت کے کوئی آثار نہیں تھے..... وہ مکمل عورت تھی..... ناک نقشہ بہت اچھا تھا..... کولہے چوڑے چکلے..... کمر پتلی سینہ جوانی سے بھرپور..... بازو سڈول..... غرضیکہ اس کے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر نسوانیت کا عمدہ نمونہ تھا۔

ایک صرف اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں نے سب کچھ غارت کر دیا تھا..... رشید سوچنے لگا..... قدرت کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک اچھی بھلی نوجوان خوبصورت لڑکی کو بدنما بنا دیا۔

رشید کے دماغ میں کئی خیال اوپر تلے آئے اور وہ بوکھلا گیا۔

وہ سوچتا تھا۔

''کیا اس لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کے نہیں رہ گئی''۔

''صبح اٹھ کر جب اسے استرا پکڑ کر شیو کرنا پڑتی ہو گی تو اسے کیا محسوس ہوتا ہو گا...... کیا اس وقت اس کے جی میں جھنجھلا کر انتقامی خواہش پیدا نہ ہوتی ہو گی کہ وہ گھس کھدے کی طرح اپنے گال اور ہونٹ چھیل ڈالے''۔

ایک عورت کے لیے یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خار پشت کی مانند اس کے گالوں پر دوسرے روز نوکیلے بال اگ آئیں۔

اگر مردوں کی مانند عورتوں کے بھی ڈاڑھی مونچھ آ گئی تو کوئی حرج نہیں تھا پر یہاں ازل سے عورتیں ان بالوں سے بے نیاز ہی رہی ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں...... عورتوں کے چہرے پر بالوں کا ہونا کوئی معیوب چیز نہیں...... لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم لوگ دیکھنے کے عادی نہیں۔

صنف نازک آخر صنف نازک ہے...... اس میں کوئی شک نہیں...... اس لڑکی میں نسوانیت کے تمام جوہر موجود ہیں۔ پھر یہ ڈاڑھی مونچھ کس لیے اگ آئی ہے...... نظر بٹو کے طور پر...... اس کی کوئی تشریح و توضیح تو ہونی چاہیے بیکار میں ایک خوبصورت شے کو بھونڈا بنا دیا...... یہ کہاں کی شرافت ہے۔

اب ایسی لڑکی سے شادی کون کرے گا۔ جو ہر روز صبح سویرے اٹھ کر استرا ہاتھ میں پکڑ کر شیو کر رہی ہو۔

اگر یہ لڑکی مونچھیں نہ مونڈے اور انہیں بڑھا لے...... سے خوف نہیں آئے گا ...... آپ بے ہوش نہ ہوں لیکن چند لمحات کے لیے آپ کے ہوش و حواس ضرور جواب دے جائیں گے...... آپ اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں گے جہاں

مونچھیں منڈی ہوں گی......مگر آپ کی صنف مقابل اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہی ہو گی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ لڑکی وک ایک نظر دیکھنے کیلیے پلٹا تو وہ موجود نہیں تھی۔

اس کا ذہن اس قدر مضطرب تھا کہ اس نے اپنا کام ملتوی کر دیا اور گھر چلا آیا اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر اس نے مزید سوچ وچار شروع کر دی۔

اس کو اس لڑکی پر بہت ترس آ رہا تھا......بار بار وہ قدرت کی بے رحمی پر لعنتیں بھیجتا تھا کہ اس نے کیوں نسوانیت کے اتنے اچھے اور خوبصورت نمونے کو خود ہی بنا کر اس پر سیاہی کا لیپ کر دیا......آخر اس میں کیا مصلحت تھی......اب اس شکل میں اس سے شادی کون کرے گا......قدرت نے کیا کوئی ایسا مرد پیدا کر رکھا ہے جو اسے قبول کر لے گا......لیکن وہ سوچتا کہ قدرت اتنی دور اندیش نہیں ہو سکتی۔

اس کی بہن آئی......دوپہر ہو چکی تھی......اس نے رشید سے کہا۔

''بھائی جان......چلیے کھانا کھا لیجئے''۔

رشید نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور یوں محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر بھی بال ہیں۔

''سلیمہ......''

''جی......''

''کچھ نہیں......لیکن نہیں ٹھہرو......کیا تمہاری مونچھیں ہیں''۔

سلیمہ جھینپ گئی۔

''جی ہاں......بال اگتے ہیں''۔

رشید نے اس سے پوچھا ''تو......میرا مطلب ہے تمہیں الجھن نہیں ہوتی ان بالوں سے''۔

سلیمہ نے اور زیادہ جھینپ کر جواب دیا ''ہوتی ہے بھائی جان''۔

''تو انہیں تم صاف کیسے کرتی ہو......بلیڈ سے''۔

''جی نہیں......ایک چیز ہے جسے پی پچ کہتے ہیں......اس کو تھوڑی دیر ہونٹوں پر گھسانا پڑتا ہے''۔

''تو بال اڑ جاتے ہیں''۔

''اڑتے وڑتے خاک بھی نہیں......دوسرے تیسرے روز پھر نمودار ہو جاتے ہیں بڑی مصیبت ہے......بعض اوقات آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں''۔

رشید نے پوچھا۔

''وہ کیوں؟''

سلیمہ نے دردناک لہجے میں جواب دیا۔

''تکلیف ہوتی ہے بہت......جب بال اکھڑتے ہیں تو چھینکیں آتی ہیں...... اور چھینکوں کے ساتھ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے......معلوم نہیں اللہ میاں مجھ سے کن گناہوں کی سزا لے رہا ہے''۔

رشید نے تھوڑے توقف کے بعد اپنی بہن سے پوچھا ''تمہاری کسی اور سہیلی کی بھی ڈاڑھی اور مونچھیں ہیں''۔

"مونچھیں تو کئی لڑکیوں کی دیکھی ہیں پر ڈاڑھی میں کبھی کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھی...... ایک دو بال ٹھوڑی پر دیکھنے میں آئے ہیں جو وہ موچنے یا ہاتھ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں...... یہ آپ نے کیسی گفتگو شروع کر دی...... چلیے کھانا کھا لیجیے"۔

رشید نے کچھ دیر سوچا۔

"نہیں...... میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا...... میرا معدہ ٹھیک نہیں ہے"۔

رشید کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بالوں کی پڈنگ کھائی ہے جو ہضم ہونے میں ہی نہیں آتی...... اس کے سارے جسم پر تیز تیز نوکیلے بال یوں رینگ رہے تھے جیسے خاردار چیونٹیاں۔

جب سلیمہ چلی گئی تو رشید نے پھر سوچنا شروع کر دیا...... لیکن سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا...... اس لڑکی کے چہرے کے بال تو دور نہیں ہو سکتے تھے اس امر کا رشید کو کامل یقین تھا لیکن پھر بھی وہ سوچے چلا جا رہا تھا...... جیسے وہ کوئی بہت بڑا معمہ حل کر رہا ہو۔

رشید کو داخلے کی درخواست دینا تھی...... اس نے بی کا امتحان راولپنڈی سے پاس کیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لاہور کے کسی کالج میں داخل ہو جائے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلا جائے جہاں اس کے والد پرائمری کونسل میں پریکٹس کرتے ہیں۔

اس روز مونچھوں اور ڈاڑھی والی لڑکی کے باعث نہ جا سکا۔ دوسرے روز وہ بس سٹینڈ کے بجائے تانگے میں گیا...... اس نے چونکہ بی اے کا امتحان اچھے

نمبروں سے پاس کیا تھا اس لیے اسے داخلے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

وہ ڈاڑھی مونچھوں والی لڑکی اب رشید کے دل و دماغ سے قریب قریب محو ہو چکی تھی...... لیکن ایک دن اس نے اس کو کالج میں دیکھا...... لڑکے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

ایک نے آوازہ کسا۔

''مسٹر حمیدہ......''

دوسرے نے کہا۔

''ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں...... عورت کی عورت اور مرد کا مرد......''

تیسرے نے قہقہہ لگایا۔

''عجائب گھر میں رہنا چاہیے تھا ایسی شخصیت کو......''

اور وہ بیچاری خفیف ہو رہی تھی...... اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی...... رشید کو اس پر بہت ترس آیا...... اس کے جی میں آئی کہ آگے بڑھ کر ان تمام لڑکوں کا سر پھوڑ دے جو اس کا مذاق اڑا رہے تھے مگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہا۔

جب لڑکے چلے گئے اور اس لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسو خشک کیے تو وہ جرات سے کام لے کر اس کے پاس گیا اور بڑے ملائم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ یہاں کس کلاس میں پڑھتی ہیں''۔

اس نے تنگ آ کر کہا۔

''کیا آپ بھی میرا مذاق اڑانے آئے ہیں''۔

رشید نے اپنا لہجہ اور ملائم کر دیا...... ''جی نہیں...... آپ مجھے اپنا دوست سمجھ کر یقین کیجیے''۔

اس نے جس کا نام حمیدہ تھا...... نفرت کی نگاہوں سے رشید کو دیکھا۔

''مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں''۔

''یہ آپ کی زیادتی ہے...... ہر شخص کو دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے...... میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ کے مضطرب دماغ کو اپنی باتوں سے اور زیادہ مضطرب کر دوں...... ویسے میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنا دوست سمجھ کر یقین کیجیے''۔

یہ کہہ کر رشید چلا گیا۔

اس کے بعد متعدد مرتبہ اس نے حمیدہ کو دیکھا۔ جو بی اے میں پڑھتی تھی سارے کالج میں اس کی ڈاڑھی مونچھوں کے چرچے تھے...... لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لڑکوں کی آوازہ بازی کی عادی ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی بال نہیں ہے۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شدید طور پر بیمار ہو گئی دس پندرہ دن تک بستر پر لیٹنا پڑا...... رشید نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس کی بیمار پرسی کے لیے جائے مگر اس کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ مشتعل ہو جائے گی کیونکہ اسے کسی کی ہمدردی پسند نہ تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ اس کی کشتی ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ہے اسے اس کے سوا اور کوئی کھینے والا نہ ہو...... لیکن ایک دن مجبور ہو کر اس نے چپڑاسی کے ہاتھ ایک رقعہ رشید

کے نام بھیجا...... جس میں چند یہ الفاظ مرقوم تھے۔

"رشید صاحب!

میں بیمار ہوں...... کیا آپ چند لمحات کے لیے میرے کمرے میں تشریف لا سکتے ہیں۔ ممنون و متشکر ہوں گی......"

حمیدہ رشید یہ رقعہ ملتے ہی ہوسٹل چلا گیا...... بڑی مشکل سے حمیدہ کا کمرہ تلاش کیا۔

اندر داخل ہوا تو اس نے پہلے یہ سمجھا کہ کوئی مرد جس نے کئی دنوں سے شیو نہیں کی...... کمبل اوڑھے لیٹا ہے...... مگر اس نے اپنا ردعمل ظاہر نہ ہونے دیا۔

چارپائی کے ساتھ ہی کرسی پڑی تھی۔ رشید اس پر بیٹھ گیا۔

حمیدہ مسکرائی۔

"میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ مجھے بخار کے باعث نقاہت ہو گئی ہے اور شیو نہیں کر سکی...... کیا آپ میرے لیے یہ زحمت برداشت کریں گے"۔

رشید نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا...... شیو کا سامان کھڑکی کی سل پر موجود تھا۔

کینٹین سے گرم پانی لا کر اس نے حمیدہ کے چہرے کے بال نرم کیے صابن ملا...... اچھی طرح جھاگ پیدا کیے اور پھر پانچ منٹ کے اندر اندر شیو بنا ڈالی۔

پھر تولیے سے اس کا چہرہ خشک کیا اور شیو کا سامان صاف کرنے کے بعد وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔

حمیدہ نے اپنا نحیف ہاتھ گالوں پر پھیرا……اور پھر رشید سے کہا۔

''شکریہ……''

اب دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔

رشید نے ایم اے اور حمیدہ نے بی اے پاس کر لیا……رشید کو فوراً بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔

اب وہ ایک نہیں روزانہ دو شیو بناتا تھا۔

☆☆☆

اختتام-------------حصہ چہارم

منٹو کے سو بہترین افسانے

(افسانے)

حصہ پنجم

Presented by: S A M I

فہرست

مصری کی ڈلی

ممد بھائی

ممی

منتر

موم بتی کے آنسو

موچنا

موسم کی شرارت

میرا اور اس کا انتقام

میرا ہم سفر

میرٹھ کی قینچی

نا مکمل تحریر

نعرہ

نکی

ننگی آوازیں

نیا سال

نیا قانون

وہ لڑکی

وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے

ہتک

یزید

مصری کی ڈلی

پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ روح اس لیے کہ میں نے دفعتاً اپنے ماحول میں خوفناک ویرانی کو محسوس کیا تھا اور جسم اس لیے کہ میرے تمام پٹھے سردی لگ جانے کے باعث چوبی تختے کے مانند اکڑ گئے تھے۔ دس دن تک میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا رہا...... پلنگ...... اس چیز کو پلنگ ہی کہہ لیجیے جو لکڑی کے چار بڑے بڑے پایوں پندرہ بیس چوبی ڈنڈوں اور ڈیڑھ من وزنی مستطیل آہنی چادر پر مشتمل ہے۔ لوہے کی بھاری بھرکم چادر نواڑ اور سوتلی کا کام دیتی ہے۔ اس پلنگ کا فائدہ یہ ہے کہ کھٹمل دور رہتے ہیں اور یوں بھی کافی مضبوط ہے یعنی صدیوں تک قائم رہ سکتا ہے۔

یہ پلنگ میرے پڑوسی سلیم صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ میں زمین پر سوتا تھا چنانچہ انہوں نے مجھے یہ پلنگ جو انہیں کمرے کے ساتھ ہی ملا تھا مجھے دے دیا تاکہ میں سخت فرش پر سونے کے بجائے لوہے کی چادر پر آرام کروں۔ سلیم صاحب اور ان کی بیوی کو میرا بہت خیال ہے اور میں انکا بہت ممنون ہوں۔ اگر میں معمولی سے معمولی چارپائی بھی بازار سے لیتا تو کم از کم چار پانچ روپے خرچ ہو جاتے۔

خیر چھوڑیے! اس قصے کو۔ میں یہ بات کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ دس دن اور دس راتیں میں نے جیسے خلا میں بسر کیں۔ جس کی تفصیل میں بیان ہی نہیں کرسکتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہونے اور نہ

ہونے کے بیچ میں کہیں لٹکا ہوا ہوں۔ لوہے کے پلنگ پر لیٹے لیٹے یوں بھی میرا جسم بالکل شل ہو گیا تھا۔ دماغ ویسے ہی منجمد تھا جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں۔ میں کیا عرض کروں میری کیا حالت تھی۔

دس دن اس ہیبت ناک خلا میں رہنے کے بعد میرے جسم کی علالت دور ہو گئی۔

دن کا عمل تھا۔ دھوپ سامنے کارخانے کی بلند چمنی سے پہلو بچاتی کمرے کے فرش پر لیٹ رہی تھی۔ میں لوہے کے پلنگ پر سے اٹھا۔ تھکے ہوئے جسم میں انگڑائی سے حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی بعد جب میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرہ وہ نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دائیں ہاتھ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا میز ہمارے کمرے میں ہوا کرتا تھا مگر اس کا پالش اتنا چمکیلا کبھی نہیں تھا اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی اس میں اتنی خوبیاں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں پڑا میز رہتا تھا۔ وہ بھی مجھے نامانوس معلوم ہوا۔ اس کا بالائی ہشت پہلو تختہ چمک رہا تھا۔ دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

ان میں سے ایک تصویر پر میری نگاہیں جم گئیں۔ میں بڑھا اور اسکے قریب سے دیکھا۔ جدید فوٹوگرافی کا بہت عمدہ نمونہ تھا۔ بال کٹے ہوئے تھے اور کانوں پر سے ادھر کو اڑ رہے تھے۔ سینہ سامنے ناف کے ننھے سے دباؤ تک ننگا تھا۔ اس نرم و نازک عریانی کو اس کی گوری بانہیں جو اس کے چہرے تک اٹھی ہوئی تھیں چھپانے

کی دلچسپ کوشش کر رہی تھیں۔ پتلی پتلی لمبے ناخنوں والی انگلیوں میں سے چہرے کی حیا چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ کہنیوں نے نخنے سے پیٹ کے اختتامی خط آپس میں جڑ کر ایک دل کش تکون بنا دی تھی جس میں سے ناف کا گدگدا گدا جھانک رہا تھا۔ اگر اس چھوٹے سے گڑھے میں ڈنڈی گاڑی دی جاتی تو اس کا پیٹ سیب کا بالائی حصہ بن جاتا۔

میں دیر تک اس نیم عریاں و نیم مستور شباب کو دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ تصویر کہاں سے آ گئی۔ اسی حیرت میں غرق غسل خانے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے چوتھے کونے میں نل کے نیچے فرش کی سل لگی ہوئی تھی اس کے ایک طرف چھوٹی سی منڈیر بنا دی گئی ہے۔ یہ جگہ جہاں جست کی ایک بالٹی صابن دانی، دانتوں کے دو برش، ڈاڑھی مونڈنے کے دو استرے، صابن لگانے کی دو کوچیاں، منجن کی بوتل اور پانچ چھ استعمال شدہ اور زنگ آلود بلیڈ پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا غسل خانہ ہے۔ نذیر صاحب جن کا یہ کمرہ ہے علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ چنانچہ ڈاڑھی مونڈ کر وہ فوراً ہی غسل سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ میں سویا رہتا ہوں اور وہ مزے سے ننگے نہاتے رہتے ہیں۔

اس غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تمام چیزوں پر نگاہ دوڑائی۔ اب مجھے وہ کسی قدر مانوس معلوم ہوئیں۔ منڈیر پر میرا استرا گھسا ہوا برش اسی طرح پڑا تھا جس طرح میں روز دیکھتا تھا۔ بالٹی بھی بلاشک وشبہ وہی تھی جو ہر روز نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ اس میں ڈونگا بھی وہی تھا جس میں جابجا گڑھوں میں میل جما رہتا تھا۔

منڈیر پر بیٹھ کر جب میں نے برش سے دانت گھسنے شروع کیے تو میں نے سوچا کمرہ وہی ہے جس میں ایک سو بیس راتیں گزار چکا ہوں ...... راتیں میں نے غور کیا...... معاملہ صاف ہو گیا۔ کمرے اور اس کی اشیاء کے نامانوس ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس میں صرف ایک سو بیس راتیں گزاری تھیں۔ صبح سات یا آٹھ بجے جلدی جلدی کپڑے بدل کر جو میں ایک دفعہ باہر نکل جاتا تو پھر رات کو گیارہ بارہ بجے کے قریب ہی لوٹنا ہوتا تھا۔ اس صورت میں یہ کیوں ممکن تھا کہ مجھے کمرے کی ساخت اور اس میں پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملتا اور پھر نہ کمرہ میرا ہے اور نہ اس کی کوئی چیز میری ملکیت ہے اور یہ بھی تو سچی بات ہے کہ بڑے شہر انسانیت کے مرقد و مدفن ہوتے ہیں۔

میں جس ماحول میں چار مہینے سے زندگی بسر کر رہا ہوں اس قدر یکساں اور یک آہنگ ہے کہ طبیعت بار بار اکتا گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں۔ صبح جلدی جلدی نہانا۔ پھر عجلت میں کپڑے پہن کر دفتر میں کاغذ کالے کرتے رہنا وہاں سے شام کو فارغ ہو کر ایک اور دفتر میں چھ سات گھنٹے اسی اکتا دینے والے کام میں مصروف رہنا اور رات کے گیارہ بجے اندھیرے ہی میں کپڑے اتار کر سلیم کے دیے ہوئے آہنی پلنگ پر سونے کی کوشش کرنا...... کیا یہ زندگی ہے؟

زندگی کیا ہے؟...... یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں۔ جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا

ہمارے ہاتھ میں آجائے تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا۔

جب زندگی کے لمحات محسوس ہوں اور حافظے کی تختی پر کچھ نقش چھوڑ جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی زندہ ہے اور اگر مہینوں یہ محسوس تک نہ ہو کہ مہینے گزر گئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ انسان کی حسیات مردہ ہوگئی ہیں۔ زندگی کی کتاب میں اگر اوپر تلے خالی اوراق ہی شامل ہوتے چلے جائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی اس کا احساس ہوتا ہے یا کہ نہیں اس کی بابت کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن میں تو اس معاملے میں بہت حساس ہوں۔ زندگی کا یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھ میں تھمائی گئی ہے آخر اسی لیے تو ہے کہ اس کے ہر ورق کو ہم استعمال کریں۔ اس پر کچھ لکھیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جس کے متعلق کچھ لکھوں۔ لے دے کے میری اس کاپی میں صرف دو تین ورق ایسے ہیں جس پر نقش ونگار بنے دیکھتا ہوں ...... یہ ورق مجھے کتنے عزیز ہیں۔ اگر آپ ان کو نوچ کر باہر نکال دیں تو میری زندگی ایک بیابان بن جائے گی۔ آپ یقین کیجیے میری زندگی واقعی ایک چٹیل میدان کی طرح ہے۔ جس میں ان بیتے دنوں کی یاد ایک خوبصورت قبر کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔ چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اچھے دنوں کی یہ سہانی یاد مٹ جائے اس لیے میں اس قبر پر ہر وقت مٹی کا لیپ کرتا رہتا ہوں۔

میرے سامنے دیوار پر ایک پرانا کلنڈر لٹک رہا ہے جس کے میلے کاغذ پر چیڑ کے لانبے لانبے درختوں کی تصویر چھپی ہے۔ میں اسے ایک عرصے سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے پیچھے دور بہت دور مجھے اپنی زندگی کے اس کھوئے ہوئے ٹکڑے کی جھلک نظر آرہی ہے۔

میں ایک پہاڑی کے دامن میں پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ بیگو بڑے بھولے پن سے گھٹنے ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لاتی ہے اور کہتی ہے ''آپ مانتے ہی نہیں ...... سچ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اب بھی یقین نہ آئے گا یہ لیجیے میرے سر میں سفید بال دیکھ لیجیے''۔

چودہ برس کی دیہاتی فضا میں پلی ہوئی جوان لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ معلوم نہیں وہ کیوں اس بات پر زور دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ مجھ سے یہی بات کہہ چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جوان آدمیوں کو شباب کے دائرے سے نکل کر بڑھاپے کے دائرے میں داخل ہونے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اس قسم کی خواہش کئی بار پیدا ہو چکی ہے۔ میں نے متعدد بار سوچا ہے کہ میری کنپٹیوں پر اگر سفید بال نمودار ہو جائیں تو چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کنپٹیوں پر اگر سفید بال نمودار ہو جائیں تو چاندی کے مہین مہین تاروں کی طرح چمکتے ہیں اور دوسرے سیاہ بالوں کے درمیان بہت بھلے دکھائی دیتے ہیں ممکن ہے بیگو کو یہی چاؤ ہو کہ اس کے بال سفید ہو جائیں اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود بڈھی دکھائی دے۔

میں نے اس کے خشک مگر نرم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی اور کہا ''تم کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتیں''۔

اس نے سر اٹھا کر مجھ سے پوچھا ''کیوں؟...... میں کیوں بوڑھی نہیں ہو سکتی''۔

''اس لیے کہ تم آس پاس کے درختوں پہاڑوں اور ان میں بہتے ہوئے نالوں کی ساری جوانی جذب ہوگئی ہے''۔

وہ قریب سرک آئی اور کہنے لگی ''جانے آپ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں...... بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا...... درختوں اور پہاڑوں کی بھی کبھی جوانی ہوتی ہے''۔

''تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے میں نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا''۔

''بہت اچھا کیا آپ نے...... پر آپ میرے بالوں میں اس طرح کرتے رہیں''۔

بیگو نے ہاتھ سے سر کو کھجاتے ہوئے کہا ''مجھے بڑا مزہ آتا ہے''۔

''بہت اچھا جناب!'' کہہ کر میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کو تو مزہ آ ہی رہا تھا مجھے خود مزہ آنے لگا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے الجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔

دیر تک میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا وہ خاموشی سے سر جھکائے مزہ لیتی رہی پھر اس نے اپنی خمار آلود نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور نیند میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا ''میں اگر سو گئی تو؟''

''میں جاگتا رہوں گا''۔

نیم خوابیدہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی اور وہ زمین پر وہیں میرے سامنے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

بیگو سو رہی تھی مگر اس کی جوانی جاگ رہی تھی۔ جس طرح سمندر کی پرسکون سطح کے نیچے گرم لہریں دوڑتی رہتی ہیں اسی طرح اس کے محو خواب جسم کی رگوں میں اس کی گرم گرم جوانی دوڑ رہی تھی۔ بائیں بازو کو سر کے نیچے رکھے اور ٹانگوں کو اکٹھا کیے وہ سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو میری جانب سرکا ہوا تھا۔ میں اس کی پتلی انگلیوں کی مخروطی تراش دیکھ رہا تھا کہ ان میں خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی جیسے مٹر کی پھلیاں ارتعاش پذیر ہو جائیں۔ یہ ارتعاش اس کی انگلیوں سے شروع ہوا اور اس کے سارے جسم میں پھیل گیا۔ جس طرح تالاب میں پھینکی ہوئی کنکری اس کی آبی سطح پر چھوٹا سا بھنور پیدا کرتی ہے اور یہ بھنور دائرے بناتا ہوا پھیلتا جاتا ہے اسی طرح وہ کپکپاہٹ اس کی انگلیوں سے شروع ہو کر اس کے سارے جسم پر پھیل گئی۔ نہ جانے اس کی جوانی کیسے ارتعاش پیدا کرنے والے خواب دیکھ رہی تھی۔

اس کے نچلے ہونٹ کے کونوں میں خفیف سی تھرتھراہٹ کتنی بھلی معلوم ہوئی تھی۔ اس کے سینے کے ابھار میں دل کی دھڑکنیں زندگی پیدا کر رہی تھیں۔ گریبان کے نیچے دو بٹن کھلے تھے اس طرح جسم سے تھوڑی سی نقاب اٹھ گئی تھی اور دو نہایت ہی پیاری قوسیں باہر جھانک رہی تھیں۔ سینے کی ننھی سی وادی میں دونوں طرف کے ابھار بڑی خوبصورتی سے آپس میں مل گئے تھے۔

میری نگاہ اس کے سینے پر کرتے کی ایک طرف بنی ہوئی جیب پر رک گئی۔ اس میں خدا معلوم کیا کیا بیگو نے ٹھونس رکھا تھا کہ وہ ایک گیند سی بن گئی تھی۔ میرے دل میں دفعتاً یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آہستہ سے اس کی جیب کی تلاشی لینے کا ارادہ جب میں نے کیا تو وہ جاگ پڑی۔

سیدھی لیٹ کر اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں۔ لمبی لمبی پلکیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں تھرتھرائیں۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم نے انگڑائی لی اور کہا ''آپ بڑے وہ ہیں''۔

''کیوں؟...... میں نے کیا کیا ہے؟''

وہ اٹھ بیٹھی ''ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں سچ مچ سوگئی اور آپ نے مجھے جگانے تک کی تکلیف نہ کی۔ میں اگر ایسے ہی شام تک سوئی رہتی تو؟......'' اس نے آنکھوں کی پتلیاں نچائیں اور دفعتاً کچھ یاد کر کے کہا ''ہائے میرے اللہ...... میں اپنی جان ہیر کو بھول ہی گئی''۔

سامنے پہاڑی پر اگی ہوئی سبز جھاڑیوں کی طرف جب اس نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی ''کتنی اچھی ہے میری ہیر''۔

اس کو اپنی بھینس کی فکر تھی جو ہمارے سامنے پہاڑی پر گھاس چر رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا ''تمہاری ہیر تو موجود ہے پر رانجھا کہاں ہے''۔

''رانجھا؟'' اس کے لب مسکراہٹ کے ساتھ کھلے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی ''رانجھا...... رانجھا...... رانجھا......'' اس نے یہ لفظ کئی مرتبہ دہرایا۔ ''میری ہیر کا رانجھا...... مجھے کیا معلوم نگوڑا کہاں ہے؟''

میں نے کہا ''تمہاری ہیر کا کوئی نہ کوئی رانجھا تو ضرور ہوگا۔ مجھ سے چھپانا چاہتی ہو تو الگ بات ہے''۔

اس میں چھپانے کی بات ہی کیا ہے' بیگو نے آنکھیں مٹکا کر کہا'' اور اگر کوئی ہے بھی تو ہیر کو معلوم ہو گا...... جائیے اس سے پوچھ لیجیے۔ پر کان میں کہیے گا۔ آہستہ سے کہیے گا۔ بتاؤ تو تمہارا رانجھا کہاں ہے؟''

''میں نے پوچھ لیا''۔

''کیا جواب ملا؟''

''بولی بیگو سے پوچھو وہی سب کچھ جانتی ہے''۔

''جھوٹ...... جھوٹ اس کا اول جھوٹ اور اس کا آخر جھوٹ'' بیگو بچوں کی طرح اچھل اچھل کر کہنے لگی ''میری ہیر تو بڑی شرمیلی ہے۔ ایسے سوالوں کا وہ کبھی جواب دے ہی نہیں سکتی...... آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس نے تو آپ کو غصے میں یہ کہا تھا چلو ہٹو کنواریوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی''۔

''یہی کہا تھا اور اس کا جواب اس کو یوں ملا تھا یہ تمہارا اتنا بڑا بچھڑا کہاں سے آ گیا ہے کیا آسمان سے ٹپک پڑا تھا''۔

بیگو یہ بچھڑے والی دلیل سن کر لاجواب ہو گئی۔ مگر چونکہ وہ لاجواب ہونا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے بیکار چلانا شروع کر دیا ''جی ہاں آسمان سے ٹپکا تھا اور سب چیزیں آسمان ہی سے تو آتی ہیں...... نہیں میں بھولی...... اس بچھڑے کو تو میری ہیر نے گود لیا ہے یہ اس کا بچہ نہیں کسی اور کا ہے...... اب بتائیے آپ کے پاس کیا جواب ہے؟''

میں نے ہار مان لی اس لیے کہ میری نگاہیں پھر اس کی ابھری ہوئی جیب پر پڑیں جس میں خدا معلوم کیا کیا پھنسا ہوا تھا ''میں ہار گیا...... آپ کی ہیر کنواری

ہے دنیا کی سب بھینسیں اور گائیں کنواریاں میں کنوارا ہوں آپ کنواری ہیں لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کی اس کنواری جیب کو کیا ہوا ہے؟"

اس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دیکھی تو دانتوں میں انگلی دبا کر میری طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا "آپ کو شرم نہیں آتی ...... کیا ہوا ہے میری جیب کو میری چیزیں پڑی ہیں اس میں"۔

"چیزیں ...... اس سے تمہارا کیا مطلب"۔

"آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چیزیں پڑی ہیں میرے کام کی اور کیا میں نے پتھر ڈال رکھے ہیں"۔

"تو جیب میں تمہارے کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں یہ کام کی چیزیں کیا ہیں؟"

"آپ ہرگز نہیں پوچھ سکتے۔ اور اگر آپ پوچھیں گے بھی تو میں نہیں بتاؤں گی اس واسطے کہ آپ نے مجھے اپنے چمڑے کے تھیلے کی چیزیں کب دکھائی ہیں۔ میں اگر آپ سے کہوں بھی تو آپ کبھی نہ دکھائیں گے"۔

"میں ایک ایک چیز دکھانے کے لیے تیار ہوں ...... یہ رہا تھیلا"۔ میں نے اپنا چرمی تھیلا اس کے سامنے کر دیا۔ "خود کھول کر دیکھ لو پر یاد رہے مجھے اپنی جیب کی چیزیں تمہیں دکھانا پڑیں گی"۔

"پہلے میں اس تھیلے کی تلاشی تو لے لوں" یہ کہہ کر اس نے میرا تھیلا کھولا اور اس کی سب چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کیں۔ انگریزی کا ایک ناول' کاغذوں کا پیڈ' دو پنسلیں' ایک ربڑ' دس بارہ لفافے' آٹھ ایک ایک آنے والے

اسٹامپ، دس بارہ خالی لفافے اور لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ...... یہ میری چیزیں تھیں۔

جب وہ ایک ایک چیز اچھی طرح دیکھ چکی تو میں نے اس سے کہا "اب اپنی جیب کا منہ ادھر کرو"۔

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ تھیلے میں تمام چیزیں رکھنے کے بعد اس نے مجھ سے تحکمانہ لہجے میں کہا "اب اپنی جیب دکھائیے"۔

میں نے اپنی جیب کا منہ کھول دیا اور اس نے ہاتھ ڈال کر اس میں جو کچھ بھی تھا باہر نکال لیا۔ ایک بٹوہ اور چابیوں کا گچھا تھا جس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی شامل تھا۔ یہ چاقو اس نے گچھے سے نکال کر زمین پر رکھ دیا اور باقی چیزیں مجھے واپس دے دیں۔ "یہ چاقو میں نے لے لیا ہے کھیرے کاٹنے کے کام آئے گا"۔

"لے لو پر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو...... میں جب تک تمہاری جیب کی ایک ایک چیز نہ دیکھ لوں چھوڑوں گا نہیں"۔

"اگر میں نہ دکھاؤں تو؟"

"لڑائی ہو جائے گی"۔

"ہو جائے...... میں ڈر تھوڑی جاؤں گی"۔ یہ کہہ کر وہ فوراً ہی اپنے دوپٹے کا تنبو بنا کر اس میں چھپ گئی اور جیب سے کچھ نکالنے لگی۔ اس پر میں نے رعب دار آواز میں کہا "دیکھو یہ ٹھیک بات نہیں تم کچھ چھپا رہی ہو"۔

"آپ مان لیجیے میں سب کچھ دکھا دوں گی...... اللہ کی قسم سب چیزیں ایک ایک کر کے دکھا دوں گی...... یہ تو میں اپنے من سمجھوتے کے لیے کچھ کر رہی

ہوں''۔

میں نے پھر رعب دار آواز میں کہا ''کیا کر رہی ہو میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتا ہوں۔ سیدھے من سے تمام چیزیں دکھا دو ورنہ میں زبردستی سب کچھ دیکھ لوں گا''۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوپٹے سے باہر نکل آئی اور آگے بڑھ کر کہنے لگی ''دیکھ لیجیے''۔

میں اس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ اس کے تنے ہوئے سینے کو دیکھ کر رک گیا...... ''تم خود ہی ایک ایک چیز نکال کر مجھے دکھاتی جاؤ......لو اتنا لحاظ میں تمہارا کیے دیتا ہوں۔ یوں تمہاری ایمانداری بھی معلوم ہو جائے گی''۔

''نہیں...... آپ خود نکالتے جایئے بعد میں آپ کہیں گے کہ میں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں''۔

''میں دیکھ جو رہا ہوں تم نکالتی جاؤ''۔

''جیسے آپ کی مرضی'' یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے اپنی جیب میں دو انگلیاں ڈالیں اور سرخ رنگ کے ریشمیں کپڑے کا ایک ٹکڑا باہر نکالا۔ اس پر میں نے پوچھا ''کپڑے کا یہ بیکار سا ٹکڑا تم ساتھ ساتھ کیوں لیے پھرتی ہو؟''

''اجی آپ کو کیا معلوم یہ بہت بڑھیا کپڑا ہے میں اس کا رومال بناؤں گی۔ جب بن جائے گا تو پھر آپ دیکھیے گا جی ہاں......'' یہ کہہ کر اس نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ پھر جیب سے کچھ نکالا اور بند مٹھی میرے قریب لا کر کھول دی۔ سلولائیڈ کے تین مستعمل کلپ ایک چابی اور سیپ کے دو بٹن اس کی ہتھیلی پر

مجھے نظر آئے۔

میں نے اس سے کہا ''یہ اب اپنی جھولی میں رکھ لو اور باقی چیزیں جلدی جلدی نکالو''۔

اس نے جیب میں جلدی جلدی ہاتھ ڈال کر باری باری یہ چیزیں نکالیں۔ سفید دھاگے کی گولی۔ اس میں پھنسی ہوئی زنگ آلود سوئی لکڑی کی میلی کچیلی کنگھی چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ اور ایک پیسہ۔

میں نے اس سے پوچھا ''کوئی اور چیز باقی تو نہیں رہی؟''

''جی نہیں'' اس نے اپنے سر کو جنبش دی میں نے سب چیزیں آپ کے سامنے رکھ دی ہیں اب کوئی باقی نہیں رہی''۔

''غلط'' میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا ''تم جھوٹ بولتی ہو اور جھوٹ بھی ایسا بولتی ہو جو بالکل کچا ہو ابھی ایک چیز باقی ہے'' جونہی یہ لفظ میرے منہ سے نکلے غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں یک لخت اپنے دوپٹے کی طرف مڑیں۔ میں نے تاڑ لیا کہ اس نے کچھ چھپایا ہوا ہے۔ ''بیگو سیدھے من سے یہ چیز دکھا دو جو تم نے چھپائی ہے ورنہ یاد رکھو وہ تنگ کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گی گدگدی ایسی چیز ہے کہ......''

گدگدی کے تصور ہی نے اس کے جسم کو اکٹھا کر دیا۔ وہ سکڑ سی گئی۔ اس پر میں نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں۔ ''یہ انگلیاں ایسی گدگدی کر سکتی ہیں کہ جناب کو پہروں ہوش نہ آئے گا''۔

وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے ''نہیں نہیں...... خدا کے لیے ایسا کبھی نہ کیجیے گا...... میں مر

جاؤں گی"۔

جب میں سچ مچ اپنے ہاتھ اس کے کندھوں تک لے گیا تو وہ بے تحاشا چیختی ہنستی اور سمٹتی سمٹاتی اٹھی اور بھاگ گئی...... دوپٹے میں سے کوئی چیز گری جو میں نے دوڑ کر اٹھا لی...... مصری کی ایک ڈلی تھی جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی...... جانے کیوں؟

☆☆☆

ممد بھائی

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہوٹل ملیں گے۔ یوں تو بمبئی میں قدم قدم پر ہوٹل اور ریستوراں ہوتے ہیں مگر یہ ریستوران اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی رنڈیاں بستی ہیں۔

ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بس آپ یہی سمجھیے بیس برس کے قریب جب میں ان ریستورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی کے آگے نکل کر پلے ہاؤس آتا ہے ادھر دن بھر ہاؤ ہو رہتی ہے۔ سینما کے شو دن بھر چلتے تھے چمپیاں ہوتی تھیں سینما گھر غالباً چار تھے۔ ان کے باہر گھنٹیاں بجا بجا کر بڑے سامعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے تھے۔

"آؤ آؤ..... دو آنے میں..... فسٹ کلاس کھیل..... دو آنے میں"۔

بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجانے والے زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیتے تھے کرسیوں پر چمپی کرانے والے بیٹھے ہوتے تھے جن کی کھوپڑیوں کی مرمت بڑے سائنٹفک طریقے سے کی جاتی تھی۔ مالش اچھی چیز ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بمبئی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔ دن کو اور رات کو ہر وقت انہیں تیل مالش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو رات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل مالشیا بلا سکتے ہیں۔ یوں بھی ساری رات خواہ آپ بمبئی کے کسی کونے میں ہوں یہ آواز آپ یقیناً سنتے رہیں گے

"پی......پی......پی"

یہ پی تھپی کا مخفف ہے۔

فارس روڈ یوں تو ایک سڑک کا نام ہے لیکن دراصل یہ اس پورے علاقے سے منسوب ہے جہاں بیسوائیں بستی ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس میں کئی گلیاں ہیں جن کے مختلف نام ہیں لیکن سہولت کے طور پر اس کی ہر گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں جنگلا لگی دکانیں ہیں جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مختلف داموں پر آٹھ آنے سے آٹھ روپے تک آٹھ سو روپے سے سو روپے تک...... ہر دام کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔

یہودی پنجابی مرہٹی کشمیری گجراتی بنگالی اینگلو انڈین فرانسیسی چینی جاپانی غرضیکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں دستیاب ہو سکتی ہے...... یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں...... معاف کیجیے گا اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیے...... بس عورتیں ہوتی ہیں...... اور ان کو گاہک بھی مل ہی جاتے ہیں۔

اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں۔ معلوم نہیں کیا کاروبار کرتے ہیں مگر رہتے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض تو ریستوران چلاتے ہیں جن کے باہر بورڈوں پر اوپر نیچے کیڑے مکوڑوں کی شکل میں کچھ لکھا ہوتا ہے...... معلوم نہیں کیا......

اس علاقے میں بزنس مین اور ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے جس کا نام عرب لین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس

کی میں بات کر رہا ہوں اس گلی میں غالباً پچیس عرب رہتے تھے جو خود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں...... اور رام پوریوں پر مشتمل تھی۔

اس گلی میں مجھے ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں سورج کی روشنی کا داخلہ بند تھا ہر وقت بجلی کا بلب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نو روپے ماہوار تھا۔

آپ کا اگر بمبئی میں قیام نہیں رہا تو شاید آپ مشکل سے یقین کریں کہ وہاں کسی کو کسی سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مر رہے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے پڑوس میں قتل ہو جائے مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جائے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اس کا نام ممد بھائی تھا۔

ممد بھائی رام پور کا رہنے والا تھا۔ اول درجے کا پھکیت، گتکے اور بنوٹ کے فن میں یکتا۔ میں جب عرب گلی آیا تو ہوٹلوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں صبح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹتا تھا لیکن ممد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ کیونکہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں۔ کہ بیس پچیس آدمی اگر لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتا بھی نہیں چلتا۔ سو قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

اس کے ہاتھ کی یہ صفائی دیکھنے کا مجھے اشتیاق نہیں تھا لیکن یوں اس کے متعلق اور باتیں سن سن کر میرے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ میں اسے دیکھوں۔ اس سے باتیں نہ کروں لیکن قریب سے دیکھ لوں کہ وہ کیسا ہے۔ اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے تھے کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔ غریبوں کے دکھ درد کا شریک ہے۔ عرب گلی ...... صرف عرب گلی ہی نہیں آس پاس جتنی گلیاں تھیں ان میں جتنی نادار عورتیں تھیں سب ممد بھائی کو جانتی تھیں۔ کیونکہ وہ اکثر ان کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا اور ان کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں اس کی آمدنی کے ذرائع کیا تھے۔ اچھا کھاتا تھا اچھا پیتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا تانگہ بھی تھا جس میں بڑا تندرست ٹٹو جتا ہوتا تھا اس کو وہ خود چلاتا تھا۔ ساتھ دو یا تین شاگرد ہوتے تھے بڑے باادب ...... بھنڈی بازار کا ایک چکر لگا کر یا کسی درگاہ میں ہو کر وہ اس تانگے میں واپس عرب گلی میں آ جاتا تھا اور کسی ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ گتکے اور بنوٹ کی باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میری کھولی کے ساتھ ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑ کا ایک مسلمان رقاص رہتا تھا۔ اس نے مجھے ممد بھائی کی سینکڑوں کہانیاں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ ممد بھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ ممد بھائی کو

پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیے اور ان سے کہا ''دیکھو اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا''۔ عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا ''منٹو صاحب! ممد بھائی فرشتہ ہے...... فرشتہ...... جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کانپنے لگے۔ ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں دو دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا''۔

ممد بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور واہیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص جو غالباً اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھکیت سمجھتا تھا مجھ سے یہ کہا تھا کہ ممد دادا اپنے نیفے میں ایک ایسا آبدار خنجر ہمیشہ اڑس کے رکھتا ہے جو استرے کی طرح شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا۔ کھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر باتیں کرتے ہوئے جھکتے ہوئے اس سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو ممد بھائی کا ایک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا اشتیاق دن بدن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصور میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا۔ بہرحال اتنی مدت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی ہیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام ممد بھائی تھا اس قسم کا آدمی جو ہرکولیس سائیکلوں پر اشتہار کے لیے دیا جاتا ہے۔

میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے وانے سے فارغ ہو کر واپس آ کر فوراً سو جاتا۔ اس دوران میں ممد بھائی سے کیسے

ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں اور سارا دن عرب گلی میں گزار کر ممد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لیے کہ میری ملازمت ہی بڑی واہیات قسم کی تھی۔

ممد بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلوئنزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیونکہ عرب گلی کے ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تن تنہا تھا۔ میرے ساتھ ایک آدمی رہتا تھا جس کو پونہ میں نوکری مل گئی تھی اس لیے اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس قدر پیاس تھی کہ جو پانی کھولی میں رکھا تھا وہ میرے لیے ناکافی تھا اور دوست یار کوئی پاس نہیں تھا جو میری دیکھ بھال کرتا۔

میں بہت سخت جان ہوں دیکھ بھال کی مجھے عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کا بخار تھا انفلوئنزا تھا ملیریا تھا یا اور کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو جو مجھے دلاسہ دے۔ دلاسہ نہ دے تو کم از کم ایک سیکنڈ کے لیے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے۔ تاکہ مجھے یہ احساس ہو کہ مجھے پوچھنے والا بھی کوئی ہے۔

دو دن تک میں بستر میں پڑا تکلیف بھری کروٹیں بدلتا رہا مگر کوئی نہ آیا...... آتا بھی کسے تھا...... میری جان پہچان کے آدمی ہی کتنے تھے...... دو تین چار...... اور وہ اتنی دور رہتے تھے کہ ان کو میری موت کا علم بھی نہیں ہو سکتا تھا...... اور پھر وہاں بمبئی

میں کون کس کو پوچھتا ہے...... کوئی جئے یا مرے...... ان کی بلا سے......

میری بہت بری حالت تھی۔ عاشق حسین ڈانسر کی بیوی بیمار تھی اس لیے وہ اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو بلاتا......

بڑی نڈھال حالت میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود نیچے اتروں اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکرا جسے بمبئی کی زبان میں باہروالا کہتے ہیں ہوگا بڑی مریل آواز میں کہا آجاؤ۔

دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی جس کی مونچھیں مجھے سب سے پہلے دکھائی دیں اندر داخل ہوا۔

اس کی مونچھیں ہی سب کچھ تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر اس کی مونچھیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے وہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی مونچھوں ہی نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سارے وجود کو زندگی بخش رکھی تھی۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے میری کھاٹ کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی تھے عجیب وغریب وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔

قیصر ولیم جیسی مونچھوں اور چھریرے بدن والے آدمی نے مجھ سے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا ''وٹو صاحب! آپ نے حد کر دی۔ سالا مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟'' منٹو کا وٹو بن جانا میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی...... اس کے علاوہ میں اس موڈ میں بھی تھا کہ میں اس کی اصلاح کرتا میں نے اپنی نحیف آواز میں اس کی

مونچھوں سے صرف اتنا کہا ”آپ کون ہیں؟“

اس نے مختصر سا جواب دیا ”ممد بھائی“۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا ”ممد بھائی......تو......تو آپ ممد بھائی ہیں......مشہور دادا“

میں نے یہ کہہ تو دیا لیکن فوراً مجھے اپنے بینڈے پن کا احساس ہوا اور رک گیا......ممد بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی مونچھوں کے کرخت بال ذرا اوپر کیے اور مسکرایا ”ہاں وِمٹو بھائی......میں ممد ہوں......یہاں کا مشہور دادا......مجھے باہر والے سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو......سالا یہ بھی کوئی بات ہے تم نے مجھے خبر نہ کی......ممد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے“۔

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا ”ارے کیا نام ہے تیرا......جا بھاگ کے جا اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا......سمجھ گئے نا اس سے کہہ کہ ممد بھائی تجھے بلاتا ہے......ایک دم جلدی آ......ایک دم......سب کام چھوڑ دے اور جلدی......اور دیکھ سالے سے کہنا سب دوائیں لیتا آئے“۔

ممد بھائی نے جس کو حکم دیا تھا وہ ایک دم چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا......وہ تمام داستانیں میرے بخار آلودہ دماغ میں چل پھر رہی تھیں جو میں اسکے متعلق لوگوں سے سن چکا تھا......لیکن گڈمڈ صورت میں کیونکہ بار بار اسکو دیکھنے کی وجہ سے اس کی مونچھیں سب پر چھا جاتی تھیں......بڑی خوف ناک مگر بڑی خوبصورت مونچھیں تھیں لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کو جس کے خدوخال بڑے ملائم اور نرم و نازک ہیں صرف خوفناک بنانے کے لیے یہ مونچھیں

رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بخار آلود دماغ میں سوچا کہ یہ شخص درحقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا کہ اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔

کھولی میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ میں نے ممد بھائی سے کہا کہ وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے...... ہم کھڑے رہیں گے......“

پھر اس نے ٹہلتے ہوئے...... حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی کرتے کا دامن اٹھا کر پائجامے کے نیفے سے ایک خنجر نکالا...... میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر لشک رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں یہ خنجر نکال کر پہلے اس نے اپنی کلائی پر پھیرا۔ جو بال اسکی زد میں آئے سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔

اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اتر آیا تھا۔ میں اب کسی قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا ”ممد بھائی...... یہ چھری تم اس طرح اپنے...... نیفے میں...... یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو...... اتنی تیز ہے کیا تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟“

ممد نے خنجر سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے جواب دیا ”منٹو بھائی...... یہ چھری دوسروں کے لیے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے سالی اپنی چیز ہے مجھے نقصان کیسے پہنچائے گی؟“

چھری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماں یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے یا بیٹی ہے اس کا ہاتھ مجھ پر کیسے اٹھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر آ گیا...... اس کا نام پٹھو تھا اور میں وٹھو...... اس نے ممد بھائی کو اپنے کر سچین انداز میں سلام کیا اور پوچھا معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ تھا وہ ممد بھائی نے بیان کر دیا۔ مختصر لیکن کڑے الفاظ میں جن میں تحکم تھا کہ دیکھو اگر تم نے وٹھو بھائی کا علاج اچھی طرح نہ کیا تو تمہاری خیر نہیں۔

ڈاکٹر پٹھو نے فرماں بردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض دیکھی...... سٹیتھوسکوپ لگا کر میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا اور مجھ سے میری بیماری کی تمام تفصیل پوچھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے نہیں ممد بھائی سے کہا ''کوئی فکر کی بات نہیں...... ملیریا ہے...... میں انجکشن لگا دیتا ہوں''۔

ممد بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پٹھو کی بات سنی اور خنجر سے اپنی کلائی سے بال اڑاتے ہوئے کہا ''میں کچھ نہیں جانتا انجکشن دینا ہے تو دے دو لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو......''

ڈاکٹر پٹھو کانپ گیا ''نہیں ممد بھائی...... سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

ممد بھائی نے خنجر اپنے نیفے میں اڑس لیا ''تو ٹھیک ہے''۔

''تو میں انجکشن لگاتا ہوں'' ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی......

''ٹھہرو...... ٹھہرو......''

ممد بھائی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج فوراً بیگ میں واپس رکھ دی اور ممیاتے ہوئے ممد بھائی سے مخاطب ہوا ''کیوں؟''

''بس...... میں کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا''۔ یہ کہہ کر وہ کھولی سے باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔

ڈاکٹر پٹھو نے میرے کونین کا انجکشن لگایا۔ بڑے سلیقے سے ورنہ ملیریا کا یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے فیس پوچھی...... اس نے کہا دس روپے میں تکیے کے نیچے سے اپنا بٹوہ نکال رہا تھا کہ ممد بھائی اندر آ گیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پٹھو کو دے رہا تھا۔

ممد بھائی نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر کہا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے کہا ''فیس دے رہا ہوں''۔

ممد بھائی ڈاکٹر پٹھو سے مخاطب ہوا ''سالے فیس کیسی لے رہے ہو''۔

ڈاکٹر پٹھو بوکھلا گیا ''میں کب لے رہا ہو...... یہ دے رہے تھے''۔

''سالا...... ہم سے فیس لیتے ہو...... واپس کرو یہ نوٹ''۔ ممد بھائی کے لہجے میں خنجر ایسی تیزی تھی۔

ڈاکٹر پٹھو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے ممد بھائی سے معذرت طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔

ممد بھائی نے ایک انگلی سے اپنی کانٹوں ایسی مونچھوں کو تاؤ دیا اور مسکرایا ''منٹو بھائی...... یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیس لے...... تمہاری قسم اپنی مونچھیں منڈوا دیتا اگر اس سالے نے فیس لی ہوتی...... یہاں سب تمہارے غلام ہیں''۔

تھوڑے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا ''ممد بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟''

ممد بھائی کی مونچھیں تھرتھرائیں 'ممد بھائی کے نہیں جانتا......ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے......اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی آئی ڈی ہے وہ ہمیں بتاتی رہتی ہے......کون آیا ہے کون گیا ہے کون اچھی حالت میں ہے کون بری حالت میں......تمہارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں''۔

میں نے ازراہ تفنن پوچھا ''کیا جانتے ہیں آپ''؟

''سالا ہم کیا نہیں جانتے......تم امرتسر کا رہنے والا ہے......کشمیری ہے......یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے......تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں۔ اسی لیے تم ادھر سے نہیں گزرتے......بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمہاری جان کو روتا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو''۔

میں پانی پانی ہو گیا۔

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا ''منٹو بھائی! کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارے سب قرض چکا دیے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار اگر منٹو بھائی کو تم نے تنگ کیا......اور ممد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا''۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں بیمار تھا' کونین کا ٹیکہ لگ چکا تھا ۔جس کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر مجھے کوئی نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے بہت

محنت کرنی پڑتی ...... میں صرف اتنا کہہ سکا ''ممد بھائی! خدا تمہیں زندہ رکھے...... تم خوش رہو''۔

ممد بھائی نے اپنی مونچھوں کے بال ذرا اوپر کیے اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

ڈاکٹر پنٹو ہر روز صبح شام آتا تھا۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ''نہیں مسٹر منٹو! ممد بھائی کا معاملہ ہے۔ ایک ڈیڑھ پیا بھی نہیں لے سکتا''۔

میں نے سوچا یہ ممد بھائی بہت بڑا آدمی ہے یعنی خوفناک قسم کا جس سے ڈاکٹر پنٹو جو بڑا خسیس قسم کا آدمی ہے ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے کی جرات نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنی جیب سے انجکشنوں پر خرچ کر رہا ہے۔

بیماری کے دوران میں ممد بھائی بھی بلا ناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا کبھی شام کو۔ اپنے چھ سات شاگردوں کے ساتھ اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس دیتا رہا کہ معمولی ملیریا ہے۔ تم ڈاکٹر پنٹو کے علاج سے انشاءاللہ بہت جلد ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گے۔

چند روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوران میں ممد بھائی کے ہر خدوخال کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں وہ چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر یہی پچیس تیس کے درمیان ہوگی۔ پتلی پتلی باہیں، ٹانگیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا کے پھرتیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا سا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا تو وہ سیدھا اس کے دل میں کھبتا تھا یہ مجھے عرب گلی کے لوگوں نے بتایا تھا۔

اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ اس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چھری مار وہ اول درجے کا تھا۔ بنوٹ اور گتکے کا ماہر یوں سب کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے مگر میں یہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔

لیکن جب میں اس کے خنجر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن میں جھرجھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسے رہتا ہے؟......

میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی وہی خوف ناک خنجر نکال کر اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''ممد بھائی...... آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے...... تم یہ خنجر کیوں لیے پھرتے ہو؟''

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا ''منٹو بھائی بندوق پستول میں کوئی مزہ نہیں۔ انہیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔ گھوڑا دبایا اور ٹھاہ...... اس میں کیا مزہ ہے......؟ یہ چیز...... یہ خنجر...... یہ چھری...... یہ چاقو...... مزہ آتا ہے نا خدا کی قسم...... یہ وہ ہے...... تم کیا کہا کرتے ہو؟...... ہاں...... آرٹ...... اس میں آرٹ ہوتا ہے میری جان...... جس کو چاقو یا چھری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کنڈم ہے۔ پستول کیا ہے...... کھلونا ہے...... جو نقصان پہنچا سکتا ہے...... پر اس میں کیا لطف آتا ہے...... کچھ بھی نہیں...... تم یہ خنجر دیکھو...... اس کی تیز دھار دیکھو''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پر پھیرا

''اس سے کوئی دھما کہ نہیں ہوتا...... بس یوں پیٹ کے اندر داخل کرو...... اس صفائی سے کہ سالے کو معلوم تک نہ ہو...... بندوق پستول سب بکواس ہے''۔

ممد بھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی وقت ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ممنون احسان تھا...... لیکن جب میں اس کا ذکر کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم تھا۔ ایسا حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی کے کوئی تکلیف ہو، ممد بھائی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا اور یہ اس کی سی آئی ڈی کا کام تھا جو اس کو ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔

وہ دادا تھا یعنی ایک خطرناک غنڈہ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو ہیبت ناک بنائے رکھتی تھیں۔ لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی ہر طرح پرورش کرتا تھا جس طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔

اس کی مونچھوں کا ایک ایک بال کھڑا تھا جیسے خار پشت کا...... مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ممد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب کھانا کھالیتا ہے تو سالن بھری انگلیوں سے اپنی مونچھیں ضرور مروڑتا ہے کہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔

میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک

تھیں۔ دراصل مونچھوں کا نام ہی ممد بھائی تھا…… یا اس خنجر کا جو اس کی تنگ گھیرے کی شلوار کے نیفے میں ہر وقت موجود رہتا تھا…… مجھے ان دونوں چیزوں سے ڈر لگتا تھا نہ معلوم کیوں……

ممد بھائی یوں تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا لیکن وہ سب کا ہمدرد تھا۔ معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے پر وہ ہر حاجت مند کی بروقت مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رنڈیاں اس کو اپنا پیر مانتی تھیں۔ چونکہ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا اس لیے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے ہوتا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔

میری اس کی بڑی دوستی ہو گئی۔ ان پڑھ تھا لیکن جانے کیوں وہ میری اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کھاتے تھے۔ ایک دن صبح سویرے دفتر جاتے وقت میں نے چینی ہوٹل سے سنا کہ ممد بھائی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے بہت تعجب ہوا اس لیے کہ تمام تھانے والے اس کے دوست تھے۔ کیا وجہ ہو سکتی تھی؟…… میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو ممد بھائی گرفتار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اسی عرب گلی میں ایک عورت رہتی ہے جس کا نام شیریں بائی ہے۔ اس کی ایک جوان لڑکی ہے۔ اس کو کل ایک آدمی نے خراب کیا۔ یعنی اس کی عصمت دری کر دی۔ شیریں بائی روتی ہوئی ممد بھائی کے پاس آئی اور اس سے کہا ”تم یہاں کے دادا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے یہ برا کیا ہے…… لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو“۔ ممد بھائی نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا ”تم چاہتی کیا ہو؟“ اس نے کہا ”میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس حرام زادے کا پیٹ چاک

کردو‘‘۔

ممد بھائی اس وقت ہوٹل میں سیس پاؤں کے ساتھ قیمہ کھا رہا تھا۔ یہ سن کر اس نے اپنے نیفے سے خنجر نکالا۔ اس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی۔ اور بڑھیا سے کہا ’’جا...... تیرا کام ہو جائے گا‘‘۔

اور اس کا کام ہو گیا...... دوسرے معنوں میں جس آدمی نے اس بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔

ممد بھائی گرفتار تو ہو گیا تھا۔ مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چابکدستی سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ کبھی عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

دو دن حوالات میں رہا مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس کے سپاہی انسپکٹر سب اس کو جانتے تھے لیکن جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی مونچھیں جو خوفناک طور پر اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اب کسی قدر جھکی ہوئی تھیں۔

چینی ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے کپڑے جو ہمیشہ اجلے ہوتے تھے میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی لیکن اس نے خود کہا ’’منٹو صاحب مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ سالا دیر سے مرا...... چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہاتھ ٹیڑھا پڑا...... لیکن وہ بھی اس سالے کا قصور تھا...... ایک دم مڑ گیا۔ اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا...... لیکن مر گیا...... ذرا

تکلیف کے ساتھ جس کا مجھے افسوس ہے"۔

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ سن کر میرا ردعمل کیا ہوگا۔ یعنی اس کو افسوس تھا کہ وہ اسے بطریق احسن قتل نہ کر سکا۔ اور یہ کہ مرنے میں اسے ذرا تکلیف ہوئی ہے۔

مقدمہ چلنا تھا...... اور ممد بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عدالت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اس سے پہلے بھی قتل کیے تھے کہ نہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ مجسٹریٹ وکیل اور گواہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے کہ اس کا سابقہ ان لوگوں سے کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔

وہ بہت فکر مند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ مقرر ہو گئی تو ممد بھائی بہت پریشان ہو گیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے کیسے حاضر ہوا جاتا ہے اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی کرخت مونچھوں پر انگلیاں پھیرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا "منٹو صاحب میں مر جاؤں گا پر کورٹ نہیں جاؤں گا...... سالی معلوم نہیں کیسی جگہ ہے"۔

عرب گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انہوں نے اس کو ڈھارس دی کہ معاملہ سنگین نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں ایک صرف اس کی مونچھیں ہیں جو مجسٹریٹ کے دل میں اس کے خلاف کوئی مخالف جذبہ پیدا کر سکتی ہیں۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں کہ اس کی صرف مونچھیں ہی تھیں جو اس کو خوفناک بناتی تھیں...... اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ ہرگز ہرگز دادا دکھائی نہ دیتا۔

اس نے بہت غور کیا۔ اس کی ضمانت تھانے ہی میں ہو گئی تھی۔ اب اسے

عدالت میں پیش ہوتا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی ہوٹل میں جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے اس کو اپنی مونچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ اگر وہ عدالت میں پیش ہوا تو بہت ممکن ہے اسکو سزا ہو جائے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے مگر واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے تمام شاگرد حیران تھے۔ اس لیے کہ وہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کو مونچھوں کی فکر تھی۔ کیونکہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا ''ممد بھائی ...... کورٹ میں جانا ہے تو ان مونچھوں کیساتھ کبھی نہ جانا ...... مجسٹریٹ تم کو اندر کر دے گا''۔

اور وہ سوچتا تھا ...... ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی مونچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے ...... لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خنجر معلوم نہیں جو پہلی مرتبہ خون آشنا ہوا تھا یا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا اپنے نیفے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا ''ممد بھائی ...... یہ کیا؟''

''کچھ نہیں منٹو بھائی ...... بہت گھوٹالہ ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے ...... یار دوست کہتے ہیں کہ تمہاری مونچھیں دیکھ کر وہ ضرور تم کو سزا دے گا ...... اب بولو میں کیا کروں؟''

میں کیا بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی مونچھوں کی طرف دیکھا جو واقعی بڑی خوفناک تھیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا ''ممد بھائی! بات تو ٹھیک ہے

......تمہاری مونچھیں مجسٹریٹ کے فیصلے پر ضرور اثر انداز ہوں گی...... سچ پوچھو تو جو کچھ ہوگا تمہارے خلاف نہیں......مونچھوں کے خلاف ہوگا''۔

''تو میں منڈوا دوں؟'' ممد بھائی نے اپنی چہیتی مونچھوں پر بڑے پیار سے انگلی پھیری......

میں نے اس سے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال کچھ بھی ہے وہ تم نہ پوچھو......لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انہیں منڈوا دوں تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوا دوں منٹو بھائی......؟''

میں نے کچھ توقف کے بعد اس سے کہا ''ہاں اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو منڈوا دو......عدالت کا سوال ہے اور تمہاری مونچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں''۔

دوسرے دن ممد بھائی نے اپنی مونچھیں......اپنی جان سے عزیز مونچھیں منڈوا ڈالیں۔ کیونکہ اس کی عزت خطرے میں تھی......لیکن صرف دوسروں کے مشورے پر......

مسٹر ایف ایچ ٹیل کی عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ مونچھوں کے بغیر ممد بھائی پیش ہوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی۔ لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑی پار یعنی صوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اسے اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔

عدالت سے باہر نکل کر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی

انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں...... مگر وہاں کوئی بال ہی نہیں تھا۔

شام کو جب اسے بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا میری اس سے ملاقات ایرانی کے ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد آس پاس کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی...... مونچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا وہ بہت مغموم ہے۔

اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا ''کیا بات ہے ممد بھائی؟''

اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خدا معلوم کس کو دی اور کہا ''میں اب ممد بھائی ہی نہیں رہا''۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ صوبہ بدر کیا جا چکا ہے ''کوئی بات نہیں ممد بھائی...... یہاں نہیں تو کسی اور جگہ ہی......''

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں ''حالانکہ...... اپن کو یہ غم نہیں...... یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں...... یہ سالا مونچھیں کیوں منڈوائیں؟''

پھر اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو مونچھیں منڈوانے کا مشورہ دیا تھا ایک کروڑ گالیاں دیں اور کہا ''سالا اگر مجھے تڑی پار ہی ہونا تھا تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا......''

مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا ''سالا تم کیسا آدمی ہے منٹو...... ہم سچ کہتا ہے خدا کی قسم...... ہمیں پھانسی لگا دیتے...... پر...... یہ بے وقوفی تو ہم نے خود کی...... آج تک کسی نے نہ ڈرا تھا...... سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا''۔ یہ کہہ کر اس

نے دو ہتڑ اپنے منہ پر مارا۔ ''محمد بھائی لعنت ہے تجھ پر...... سالا...... اپنی مونچھوں سے ڈر گیا...... اب جا اپنی ماں کے......''

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس کے مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب دکھائی دیتے تھے۔

☆☆☆

ممی

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ پونہ کیسے آئی۔ کب سے وہاں تھی۔ اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ وہ پونہ کے ہر ذرے سے وابستہ تھی۔ ہوسکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو۔ مگر پونہ میرے لیے وہی پونہ ہے۔ اور اس کے وہی ذرے اس کے تمام ذرے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں ......اور ممی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری ملاقات پونے ہی میں ہوئی...... میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھے گا کہ میں عنقریب کنچن چنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لیے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کرکے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

جب پونے گیا تو میری بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں...... ٹھہریے حساب لگا لوں...... آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لیے پونہ ہو آؤں۔ وہ بھی اس لیے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا جہاں میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر مجھے معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم تانگہ لے چکے تھے۔ سست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے مجھے پربھات نگر پہنچنے میں کوئی عجلت نہیں تھی۔ تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو گردے اٹے ہوئے بازار افتاں و خیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہو گا جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا...... دھوپ واقعی تیز

تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہو گا کہ پاس سے اسی ہونق ٹائپ کا تانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا ''اوئے منٹو کے گھوڑے!''

میں چونک پڑا۔ چڈھ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردعمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ ''اوئے منٹو کے گھوڑے'' کے جواب میں یقیناً میں نے پچھا اسی قسم کا نعرہ بلند کیا ہوتا مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہو گئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوالیا۔ چڈے نے بھی کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائے۔ پھر اسنے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا ''ممی جسٹ اے منٹ'' تانگے سے کود کر وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا ''تم؟..... تم یہاں کیسے آئے؟'' پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری پر تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا ''بھابی جان..... آپ نے کمال کر دیا..... اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں''۔

میں نے اس سے پوچھا ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

چڈے نے اونچے سروں میں کہا ''ایک کام سے جا رہا ہوں...... تم ایسا کرو سیدھے......'' وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا ''دیکھو صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ...... کرایہ ورایہ مت لینا ان سے'' ادھر سے فوراً ہی فارغ ہوکر اس نے نبٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا ''تم جاؤ...... نوکر وہاں ہوگا...... باقی تم دیکھ لینا''۔

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جسکو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہوگیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا ''چلیے صاحب......''

میں نے پوچھا ''کہاں؟''

اس نے جواب دیا ''چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے''۔

''اوہ'' میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ پونہ کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ تکدر دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے اس لیے دن رات اڑے گی...... میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا ''چلو!''

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے حیل وحجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہوسکتا ہے جو فلموں کا ہیرو ہو اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو میری بیوی ہے ایسے گنجے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی۔ مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ چڈہ آجائے تو اس کے ساتھ ہی بھات نگر چلیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قہر درویش بر جان درویش دو تین دن گزر سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب لاابالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس سے

نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف چڈہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس سے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا مگ الماری سے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا ''رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے معلوم نہیں کدھر گئے''۔

میں نے اس کے ہاتھ میں پڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا ''کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں؟''

تیل لینے جانا۔ بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا۔ ''نہیں صاحب...... میں ...... تپاس کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں؟''

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا کہ جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام دہ کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈہ آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم مہمان ہیں اور اس لحاظ سے ہماری خاطر داری اس پر

لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا ''ویٹ از ویٹ...... تو تم آ گئے اولڈ بوائے...... چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی...... آج شام کو......'' میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا ''بھابی جان کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا'' پھر اور زور سے ہنسا ''مولویوں کی ایسی تیسی اٹھو منٹو بھابی جان یہاں بیٹھی ہیں ہم ابھی آ جائیں گے!''

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی اب تو بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈہ کیساتھ ہو لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کر چڈے نے مبلغ دو سو روپے وصول کیے اور ہم پون گھنٹے بعد جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز طریقے سے ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالمگی اختیار کر گئی تھیں۔

ہر شے گرد آلود تھی اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا۔ جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بوہیمی فضا کی تکمیل کے لیے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا ''چین کے شہزادے...... دو بوتلیں تھرڈ کلاس رم کی لے آؤ...... میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی اور نصف درجن گلاس''۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین کا ہی نہیں دنیا کے ہر بڑے

ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس ملک کا نام آتا وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا...... اس وقت چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے سپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس رم کے استقبال میں پچکارتے ہوئے کہا "دیٹ از دیٹ...... تو آفٹر آل تم ادھر آ ہی نکلے......" لیکن ایک دم متفکر ہو گیا "یار بھابی کا کیا ہو...... وہ تو گھبرا جائے گی"۔

چڈہ بغیر بیوی کے تھا مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کولڈ سٹوریج میں ڈال دیتا ہوں"۔

رم فوراً ہی آ گئی۔ اور گلاس بھی۔ چڈے نے چھ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ بقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چڈے نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا "تمہارے پونے آنے کی خوشی میں"۔

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیے۔

دوسرا دور شروع کر کے چڈہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ آیا میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا "میں شور کرتا ہوں ان کی نیند کھل جائے گی...... پھر ایسا کریں گے...... ٹھہرو...... پہلے میں چائے منگواتا

ہوں''۔ یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی ''جمیکا کے شہزادے''۔

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آ گیا۔ چڑے نے اس سے کہا ''دیکھو ممی سے کہو ایک دم فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے...... ایک دم!''

نوکر چلا گیا۔ چڑے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیگ ڈال کر کہا ''میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھائی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے''۔

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آ گئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڑے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرت کا اظہار کیا ''ممی ازا جیول......!'' پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا ''آؤ''۔

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڑے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مودبانہ کہا ''چائے حاضر ہے بیگم صاحب''۔

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہیں آیا لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا اس لیے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا ''آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں!''

میں نے جواب نہ دیا مگر چڑے نے جھک کر بڑے ایماندارانہ طور پر کہا ''جی

ہاں یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی''۔

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھلکھلا کے ہنسا ''ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سور ہیں...... جن پر حرام شے حلال ہے!...... چلیے اب ہم آپ کو مسجد چھوڑ آئیں!''

میری بیوی کو پھر چڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڈے ہی سے نفرت نہ تھی بلکہ یوں کہیے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چڈہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود بھی پھاند جاتا تھا مگر چڈے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی انڈور گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کئی گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی ''کبابستان کے شہزادے...... ایک عدد تانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا''۔

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ غالباً دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آ ہی جایا کرتے ہیں۔ جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کنفیوشسانہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا تانگہ لے کر آ گیا۔ ہم پربھات نگر روانہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا فلموں کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا "خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے بیوی بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے۔ یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے"۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "چلو منٹو! اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑیں"۔

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو سمجھے سوچنے کا موقع کم ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا میری بیوی سوچتی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا "یہ تو ہو گیا...... اب کیا پروگرام ہے" پھر کھلکھلا کر ہنسا "ممی...... گریٹ ممی!"

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا یہ ممی کس توتخ ماموں کی اولاد ہے کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی موت مر گیا۔

تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا۔ مگر چڈہ اس کا کبیدہ کاٹیج کہتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنی کے ملازم تھے جو مہینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد ہی دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتا چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر کوئی اس کا نائب کوئی نائب در نائب ہر دوسرا کسی پہلے کا

اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا۔ مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے پکچر ضرور دیکھتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ جیتتے شاذو نادر تھے مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لیے موٹر گراج بھی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید محض یکسانیت توڑنے کے لے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں وہ کب آتا تھا اور کب جاتا تھا کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔۔۔۔۔۔ شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے رہتے تھے۔ شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کاٹیج کا معزز حصہ چڈے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ایکٹر تھے مگر ہیرو نہیں تھے۔ ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رنجیت کمار تھا۔۔۔۔۔ چڈہ کہا کرتا تھا ''سعیدہ کاٹیج اسی خر ذات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا''۔ خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڈہ کبھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا اس لیے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کا شوق میں یہاں چلا آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لیے تھے وہ بھی چڑھ کے لیے کہ اس پر ایک بڑے خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ ''ادب لطیف'' قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا شغل تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور برعکس نام نہند نام زنگی با کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

بڑے تین یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں جب کاٹیج کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کبھی بازار سے اس کو سودا سلف لا دیا۔ کبھی لانڈری میں اس کے کپڑے دھلنے دے آئے اور کبھی اس کے روتے بچے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا۔ سب کے سب مسرور تھے۔ شاید اپنی

کبیدگی پر وہ اپنے حالات کی نامساعدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحان انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کاٹیج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آ رہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیے اور کہا ''چار بوتلیں اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجیے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے''۔

غریب نواز کے حیدر آبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا ''یہ مسٹر ون ٹو ہیں...... لیکن ان سے مفصل ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رم پیے ہیں۔ شام کو اسکاچ آ جائے تو...... لیکن آپ جائیے''۔

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک زور کی جمائی لی اور رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ اس نے روشنی میں مقدار کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی ''قبرستان کے شہزادے''۔ جب وہ نمودار نہ ہوا تو اس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا ''زیادہ پی گیا ہے کم بخت!''

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا ''یار بھابی کو تم خواہ مخواہ یہاں لائے...... خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے''۔ پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو تسکین دی ''لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوں گی وہاں؟''

میں نے کہا ''ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی''۔ اور میں

نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ لیے ہوئے گڑ کی طرح تھا۔

جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا غیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ ادھر کسی نے باآواز بلند چڈھہ کا نام لے کر پکارا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹر ون کترے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے حبشی ہے آریہ ہے یا کیا بلا ہے۔ کبھی کبھی اس کے خدوخال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آ جاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا۔ ویسے وہ مرہٹہ تھا مگر شیوا جی کی تیکھی ناک کے بجائے اس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک تھی جو اس کے خیال کے مطابق ان سروں کے لیے بہت ضروری تھی۔ جن کا تعلق براہ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلایا ''منٹو...... منٹو سیٹھ''۔

چڈھے نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا ''سیٹھ کی ایسی کی تیسی ...... چل اندر آ''۔

وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپائی پر رکھ دی ''میں سالا ادھر ممی کے پاس گیا وہ بولا تمہارا فرینڈ آئے لا...... میں بولا سالا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے ...... سالا مالوم نہ تھا سالا منٹو ہے''۔

چڈھے نے ون کترے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی ''اب چپ کر سالے کے ...... تو رم لے آیا ...... بس ٹھیک ہے'' ون کترے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے لیے پیگ تیار کیا۔ ''منٹو ...... یہ سالا آج ملتے ہی کہنے

لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے..... میں ایک دم کڑ کا.... سوچا کیا کروں......''

چڑے نے ایک اور دھپا اس کے سر پر جمایا ''بیٹھ بے جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہو گا''۔

''سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی باٹلی کہاں سے آیا..... تیرے باپ نے دیا مجھ کو''۔

ون کترے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڑے نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اس سے پوچھا ''تو یہ تو بتا کہ ممی کیا بولی..... بولی تھی؟..... موذیل کب آئے گی؟..... ارے ہاں..... وہ پلیٹنم بلونڈ!''

ون کترے نے جوب میں کچھ کہنا چاہا مگر چڑے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا ''منٹو..... خدا کی قسم کیا چیز ہے..... سنا کرتے تھے کہ ایک شے پلیٹنم بلونڈ بھی ہوتی ہے مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا..... بال ہیں جیسے چاندی کے مہین مہین تار..... گریٹ..... خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ..... ممی زندہ باد!'' پھر اس نے قہر آلود نگاہوں سے ون کترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا۔ ''ون کترے کے بچے..... نعرہ کیوں نہیں لگاتا..... ممی زندہ باد!''

چڑے اور ون کترے دونوں نے مل کر ''ممی زندہ باد'' کے کئی نعرے لگائے اس کے بعد ون کترے نے چڑے کے سوالوں کا جواب دینا چاہا مگر اس نے اسے خاموش کر دیا ''چھوڑو یار..... میں جذباتی ہو گیا ہوں..... اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں جنہیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی ہے مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے......'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ''منٹو

۔۔۔۔۔۔ بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے اس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں ۔۔۔۔۔۔ چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔۔۔۔۔۔ معلوم نہیں پلیٹنم کا رنگ کیسا ہوتا ہے کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی ۔۔۔۔۔۔ کچھ عجیب سا ہی رنگ ہے ۔۔۔۔۔۔ فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے ۔۔۔۔۔۔"

ون کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا اور اس میں تھوڑی سی ایکس رم مکس کر دی جائے"۔

چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی "۔۔۔۔۔۔ بکواس نہ کر" پھر اس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا "یار ۔۔۔۔۔۔ میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں ۔۔۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔۔۔ وہ رنگ ۔۔۔۔۔۔ خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے ۔۔۔۔۔۔ وہ تم نے دیکھا ہے ۔۔۔۔۔۔ وہ جو مچھلیوں کے پیٹ پر ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ پومفریٹ مچھلی ۔۔۔۔۔۔ اس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟ نہیں نہیں ۔۔۔۔۔۔ سانپوں کے وہ ننھے ننھے کھپرے ۔۔۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔۔۔ کھپرے ۔۔۔۔۔۔ بس ان کا رنگ ۔۔ کھپرے ۔۔۔۔۔۔ یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا ۔۔۔۔۔۔ اتنی خوبصورت چیز اور ایسا واہیات نام ۔۔۔۔۔۔ پنجابی میں ہم انہیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چنچناہٹ ہے ۔۔۔۔۔۔ وہی بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے ۔۔۔۔۔۔ لٹیں ننھی ننھی سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں ۔۔۔۔۔۔" وہ ایک دم اٹھا "سنپولیوں کی ایسی تیسی' میں جذباتی ہو گیا ہوں"۔

ون کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

چڈے نے جواب دیا "سنٹی منٹل ۔۔۔۔۔۔ لیکن تو کیا سمجھے گا بالاجی باجی راؤ اور رانا

فرنولیس کی اولاد......"

ون کترے نے اپنے لیے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ سالا چڈہ سمجھتا ہے میں انگلش نہیں سمجھتا۔ میٹری کولیٹ ہوں...... سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا...... اس نے......"

چڈے نے چڑ کر کہا "اس نے تجھے تان سین بنا دیا...... تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں...... بچپن ہی میں اس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا۔ اور دودھ پینے تو میاں کی ٹوڈی میں رویا کرتا تھا اور پیشاب کرتے وقت اڑانہ میں...... اور تو نے پہلی بات پٹ دیپکی میں کی تھی۔ اور تیرا باپ جگت استاد تھا۔ بجو باؤرے کے بھی کان کاٹتا تھا...... اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے۔ اسی لیے تیرا نام کن کترے ہے!" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "منٹو...... یہ سالا جب بھی پیتا ہے اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے...... وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اس نے کیا احسان کیا اور اس نے اسے میٹریکولیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی اے کی ڈگری پھاڑ کے پھینک دوں۔

ون کترے نے اس بوچھاڑ کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڈے نے اس کو وہیں دبا دیا "چپ رہ...... میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی منٹل ہو گیا ہوں...... ہاں وہ رنگ...... پومفریٹ مچھلی کے...... نہیں نہیں...... سانپ کے ننھے ننھے کھپرے...... بس انہی کا رنگ...... ممی نے خدا معلوم اپنی بین پر کون سا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا؟"

ون کترے سوچنے لگا "بین منگاؤ میں بجاتا ہوں"۔

چڈہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا ''بیٹھ بے مسٹری کو لیٹ کے چا کو لیٹ......'' اس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا ''منٹو اگر یہ پلیٹنم بلونڈ نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی مار کر بیٹھ جائے گا......'' اور اس نے گلاس خالی کر دیا۔

ون کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی ''منٹو ملگی ایک دم جانگلی ہے......''

میں نے کہا ''دیکھ لیں گے''۔

''آج ہی...... آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور شری ایک سو آٹھ مہتا جی نے تمہاری وجہ سے مجھے وہ ایڈوانس دے دیا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی...... آج کی رات...... آج کی رات......'' چڈے نے بڑے بھونڈے سروں میں گانا شروع کر دیا۔

آج کی رات ساز دردنہ چھیڑ!

ون کترے بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔ دونوں کے پاس سکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انہوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے خاصے اچھے مراسم تھے مگر بے تکلف نہیں۔ اس لیے ہم دونوں نے تھوڑی سی آپ کب آئے آج ہی آیا ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اس پلیٹنم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے سکاچ کے

تین پیگ پیے تھے۔ نشے کے معاملے میں اب ان سب کی سطح ایک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لیے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت فریفتہ تھے۔ جو ممی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام فی لس تھا۔ پونے میں کوئی ہیئر ڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اس پر گرم تھا کہ وہ حیدرآباد میں اپنے حصے کی جائیداد بیچ کر بھی اس داؤں پر لگانے کے لیے تیار تھا۔ چڈے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتا تھا اپنا قبول صورت ہونا۔ ون کترے کا بزعم خود یہ خیال تھا کہ اس کی پیٹی سن کر وہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارہانہ اقدام کو ہی کارگر سمجھتا تھا...... لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھیے ممی کس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹنم بلونڈی فی لس کو وہ عورت جسے میں نے چڈے کے ساتھ تانگے میں دیکھا تھا کسی کے بھی حوالے کرسکتی تھی۔

فی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا ’’جہنم میں جائے یہ لونڈیا...... چلو یار...... بھائی وہاں کباب ہورہی ہوگی...... لیکن مصیبت ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سینٹی منٹل نہ ہو جاؤں...... خیر تم سنبھال لینا......‘‘ اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اس نے نوکر کو آواز دی ’’ممیوں کے ملک مصر کے شہزادے‘‘۔

ممیوں کے ملک کا شہزادہ آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا جیسے کسی نے اسے صدیوں

کے بعد کھود کھاد کر نکالا ہے۔ چڈے نے اس کے چہرے پر رم کے چھینٹے مارے اور کہا ''دو عدد تانگے لاؤ...... جو مصری رتھ معلوم ہوں''۔

تانگے آ گئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہو گئے...... میرا پرانا فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اور دور دراز جگہ پر بھی اس نے میری بیوی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چڈے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا۔ چنانچہ یہ بہت کار آمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیض وغضب کا اظہار نہ کیا۔ اس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تھا۔ بڑی پرلطف باتیں کیں اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا ''کوئی گانا فلما رہے ہیں آپ؟''

ہریش نے جواب دیا ''جی نہیں...... وہ کل کا پروگرام ہے...... میرا خیال ہے آپ کل چلیے گا''۔

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دکھا دکھا کر عاجز آئی ہوئی تھی اس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا ''ہاں کل ٹھیک رہے گا...... آج تو انہیں سفر کی تھکن بھی ہے''۔

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پرلطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا ''چلو یار...... تم میرے ساتھ چلو''۔ اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا ''ان کو چھوڑو...... سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں''۔

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا ''ان سے اجازت لے لو''۔

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا ''میں نے بمبئی سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکیومنٹ کیس ساتھ لے چلیے پر انہوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں...... اب یہ کہانی کیا سنائیں گے''۔

ہریش نے کہا ''زبانی سنا دے گا'' پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ ہاں کہو جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا ''ہاں ایسا ہو سکتا ہے!''۔

چڈے نے اس ڈرامے میں تکمیلی ٹچ دیا ''تو بھئی ہم چلتے ہیں''۔ اور وہ تینوں اٹھ کر سلام نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے...... پربھات نگر کے باہر تانگے کھڑے تھے۔ چڈے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا ''راجہ ہریش چندر زندہ باد......''

ہریش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی ایک سہیلی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک کاٹیج تھی شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی ...... مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتا چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں سجی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کہ کوئی قحبہ خانہ ہو گا مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے لیکن ممی

کی عمر کے مقابلے میں وہ جان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی تو میں نے سوچا کہ گردوپیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہوگئی ہے۔ اور وہ ویسی کی ویسی ہی پڑی رہی ہیں...... ان کی جو عمر تھی وہ وہیں کی وہیں رہی ہے...... لیکن جب میں نے اس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گردوپیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ و متین طور پر جوان بن جائے۔

چڈے نے میرا تعارف کروایا جو بہت مختصر تھا۔ اور اختصار ہی کے ساتھ اس نے ممی کے متعلق مجھ سے یہ کہا ''یہ ممی ہے...... دی گریٹ ممی......''

ممی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی اور میری طرف دیکھ کر اس نے چڈے سے انگریزی میں کہا ''تم نے چائے منگوائی تھی حسب معمول نہایت افراتفری میں...... معلوم نہیں پسند بھی آئی ہو گی یا نہیں''۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی ''مسٹر منٹو میں بہت شرمندہ ہوں...... اصل میں سارا قصور تمہارے دوست چڈے کا ہے...... جو میرا نا قابل اصلاح لڑکا ہے''۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا ''رات کا کھانا تیار ہے...... یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پر سوار ہو

جاؤ گے......"

چڑے نے ممی کو گلے سے لگا لیا "یو آر اے جیول ممی...... یہ کھانا اب ہم کھائیں گے"۔

ممی نے چونک کر پوچھا "کیا؟...... نہیں ہرگز نہیں"۔

چڑے نے اسے بتایا "مسز منٹو کو ہم پر بھات نگر چھوڑ آئے ہیں"۔

ممی چلائی "خدا تمہیں غارت کرے...... یہ تم نے کیا کیا......"

چڑہ کھلکھلا کر ہنسا "آج پارٹی جو ہونے والی تھی"۔

وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی" ممی نے اپنا سگریٹ سلگایا۔

چڑے کا دل ڈوب گیا "خدا اب تمہیں غارت کرے...... اور یہ سب پلان ہم نے صرف اس پارٹی کے لیے بنایا تھا"۔ وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے میں ہر ذرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "لو سارے خواب ملیا میٹ ہو گئے...... پلیٹی نم بلونڈ...... اوندھے سانپ کے ننھے ننھے کھپروں جیسے رنگ والے بال......"

ایک دم اس نے اٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا "کینسل کی تھی...... اپنے دل میں کینسل کی تھی نا...... لو اس پر صاد بنا دیتا ہوں"۔ اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے ایک بہت بڑا صاد بنا دیا اور با آواز بلند پکارا "ہرے......"

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڑے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی شفقت سے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا "تم فکر نہ کرو...... میں ابھی انتظام کرتی ہوں"۔

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔چڈے نے خوشی کا نعرہ بلند کیا اور ون کترے سے کہا "جنرل ون کترے...... جاؤ ہیڈ کوارٹر سے ساری توپیں لے آؤ"۔

ون کترے نے سلیوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔سعیدہ کاٹیج بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس پہنچا۔ساتھ اس چڈے کا نوکر تھا۔چڈے نے اس کو دیکھا تو اس کا استقبال کیا "آؤ آؤ...... میرے کوہ قاف کے شہزادے...... وہ...... وہ سانپ کے کھپروں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آ رہی ہے تم بھی قسمت آزمائی کر لینا"۔

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں چڈے کی یہ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔دونوں نے مجھ سے کہا یہ چڈے کی بہت بے ہودگی ہے۔اس بے ہودگی کو انہوں نے محسوس کیا تھا۔چڈہ حسب عادت اپنی ہانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ممی کے متعلق سوچتا رہا۔ڈرائنگ روم میں غریب نواز رنجیت کمار اور چڈہ بیٹھے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ان کی ماں باہر کھلونا لینے گئی ہے۔یہ سب منتظر ہیں۔چڈہ مطمئن تھا کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اسے ملے گا۔اس لیے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا۔اس لیے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے...... شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹنم بلونڈ...... اس کا تصور ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا...... ہر فضا ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے...... اس وقت جو موسیقی

میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی اس میں کوئی سر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابل فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تانگے میں چڑے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوا لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھریوں کی توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڑے غریب نواز اور رون کترے کے لیے موجود ہے......اور خدا معلوم کس کس کے لیے......

باتوں باتوں میں چڑے سے میں نے پوچھا "یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟"

"اس لیے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے......تمہارے اور میرے جیسے الو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں۔ جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور......اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے......ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں الو کے پٹھے ہیں......میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں......بیساکھی کا میلہ تھا......تمہارے امرتسر میں......رام باغ کے اس بازار میں جہاں ٹکھیائیاں رہتی ہیں......جاٹ گزر رہے تھے......ایک صحت مند جوان نے......خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے جس کی نئی جوتی اس کی لاٹھی پر بازی گری کر رہی تھی اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا اور نہایت واہیات رنگوں میں لپی تپی ایک سیاہ فام ٹکھیائی کی طرف دیکھا جس کی

تیل میں چپڑی ہوئی بیریاں اس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں پر ٹھوکا دے کر کہا...... اوئے لہنا سیان...... ویخ اوئے اوپر ویخ...... اسی تے پنڈ وچ مجھاں ای......'' آخر لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا'' اس جاٹ کے لیے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ کاف کی پری تھی...... اور اس کے گاؤں کی حسین وجمیل مٹیاریں بے ڈول بھینسیں...... ہم سب چغد ہیں...... درمیانے درجے کے...... اس لیے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اول درجے کی نہیں...... تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی...... لیکن...... لیکن فی لس...... خاص الخاص درجے کی چیز ہے...... وہ سانپ کے کھپروں......''

ون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا'' کھپرے...... کھپرے...... تمہارا مستک بھر گیا ہے''۔

چڈے نے ماتھے سے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیے اور ون کترے سے کہا'' لے اب سنا...... تیرا باپ سالا تجھ سے کتنی محبت کرتا تھا...... میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے''۔

ون کترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا'' بائی گاڈ...... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا...... میں ففتھین ائر کا تھا کہ اس نے میری شادی بنا دی''۔

چڈہ زور سے ہنسا'' تمہیں کارٹون بنا دیا اس سالے نے...... بھگوان اسے سورگ میں کیریل کی مٹی دے کر وہاں بھی اسے بجا بجا کر تمہاری شادی کے لیے کوئی خوبصورت حور ڈھونڈتا رہے''۔

ون کترے اور بھی سنجیدہ ہو گیا "منٹو...... میں جھوٹ نہیں کہتا...... میری وائف ایک دم بیوٹی فل ہے...... ہماری فیملی میں......"

"تمہاری فیملی کی ایسی کی تیسی...... فی لس کی بات کرو...... اس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہوسکتا" چڈے نے غریب نواز اور رنجیت مار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے "گن پاؤڈر پلوٹ کے بانیو...... سن لو تمہاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی...... میدان چڈے کے ہاتھ میں رہے گا...... کیوں ویلز کے شہزادے؟"

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کا ادھا گلاس بھر کر دے دیا۔

غریب نواز اور رنجیت مار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کے باتیں تو کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف سکیمیں علیحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرز گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں بجلی کے بلب روشن تھے۔ کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ مجھ سے بمبے کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت مار کی طرف اور رنجیت مار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

ممی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں

تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط اوزان کی۔ پولی ڈولی کٹی ایلما اور تھیلما...... اور وہ ہیجڑہ نما لڑکا...... اس کو چڑہ سی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڑے کے ساتھ۔ اس کا ایک بازو اس پلیٹم بلونڈ کی پتلی کمر میں حائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیت کمار کا ردعمل نوٹ کیا۔ ان کو چڑے کی یہ نمائشی فتح مندانہ حرکت پسند نہیں آئی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہوگیا۔ ایک دم اتنی انگریزی رہی کہ ون کترے میٹری کولیشن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ ادھر دھانی ناکت اور تاتھئی تھئی کی ون ٹو تھری بنا بنا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا ادھر چڑہ باقی لڑکیوں کے جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے ننگے لمرک سنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے...... ممی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی۔ رنجیت کمار سگریٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز ممی سے بار بار کہتا کہ روپے کم ہوں تو وہ اس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو اس نے اپنی پلیٹنم بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیکر انکار کر دیا اور وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ چڑے نے بددلی کا اظہار کیا تو ممی نے فی لس کے لیے ہلکا سا شروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ

لگا کر بڑے پیار سے کہا ''بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ''۔

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہو گیا اور اس نے خوشی میں بیس پچیس اور لمرگ سنائے۔ سب مزے لیتے رہے...... میں نے سوچا عریانی سے تنگ آ کر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہو گی یہی وجہ ہے کہ وہ اب ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردعمل یقیناً نا شائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکشا پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل یک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لیے نجات مل جاتی ہے......

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھلی ملی چڈے کے ننگے ننگے لمرگ سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی...... اس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں...... میں نے سوچا آخر لوگ کیوں فرار کو برا سمجھتے ہیں...... وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے اس کا ظاہر گو بدنما تھا لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا۔ اس پر کوئی بناؤ سنگھار کوئی غازہ کوئی ابٹنا نہیں تھا۔

پولی تھی وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں ایسی عمدہ چیز تیار کرا لی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بے کار معلوم ہوتے تھے مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے تھے...... اور رنجیت کمار بڑے خلوص سے اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے فلم کمپنی سے اتنے روپے یک مشت ملنے کی ہرگز ہرگز امید

نہ تھی ۔ڈولی تھی وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔غریب نواز قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسب معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اسکے وعدے پر اعتبار کیے جا رہا تھا۔تھیلما ون کترے سے ٹانڈیو ناچ کیسے بڑے مشکل توڑ سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ون کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اس کے پیر کبھی ان کے بول ادا نہیں کر سکیں گے مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی ۔ایلما اور رٹی دونوں پئے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آنوی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں ان دونوں کو خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ دی تھی۔اور چڈہ فی لس کے سانپ کے کھپرے ایسے رنگ کے بالوں کو پگھلے ہوئے سونے کے رنگ کی سکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔فی لی کا ہیجڑہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ممی کبھی اس سے بات کرتی کبھی اس سے کبھی سوڈا کھلواتی تھی ۔کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی ...... اس کی نگاہ سب پر تھی اس بلی کی طرح جو بظاہر آنکھیں بند کیے سستاتی ہے مگر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ کون سا خط غلط تھا؟...... ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غالب کہتا ہے:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

قید حیات و بند غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے......اس نجات کے لیے کون ملک الموت کا انتظار کرے......کیوں آدمی چند لمحات کے لیے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریب میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا۔ جس میں ان سب سب کے لیے ممتا تھی......میں نے سوچا شاید اس لیے اس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو......اس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی......اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لیے چند آدمی چن لیے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا۔ چڈہ ایک تگڑا پیگ فی لس کو پلا چکا تھا......چوری چھپے نہیں سب کے سامنے مگر ممی اس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی......فی لس نشے میں تھی ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اس کے پالش کیے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے اس طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وِن کترے تھیما کو توڑے سکھا سکھا کر اب اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ سالا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چائلڈ ہڈ ہی میں اس نے اس کی شادی بنا دی تھی۔ اس کی وائف بہت بیوٹی فل ہے......اور غریب نواز ڈولی کو قرض دیکر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا

تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہاں بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں ...... تپائی کے ارد گرد فی لس کا ہیجڑا نما ساتھی اور ممی بیٹھے تھے۔ چڈہ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا ...... اس کو حاصل کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد فی لس کا ہیجڑہ نما دوست اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا ...... غریب نواز اور ریلما اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی آپس میں کسی مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں ...... ون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر تھیلما جو اس کے پاس بیٹھی تھی اس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لیے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا ...... فی لس دونوں میں مصالحت کی مہین مہین کوشش کر رہی تھی مگر چڈہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آئے مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی سے کہہ رہا تھا "تم دیوانی ہو گئی ہو ...... بوڑھی دلالہ ...... فی لس میری ہے ...... پوچھ لو اس سے"۔

ممی نے بہت دیر تک اس کی گالیاں سنیں آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز

میں اس سے کہا ''جیڑہ مائی سن......تم کیوں نہیں سمجھتے......شی از ینگ......شی از ویری ینگ!''

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی ایک سرزنش تھی۔ ایک بڑی بھیانک تصویر تھی۔ مگر جیڑہ بالکل نہ سمجھا۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف فی لس اور اس کا حصول تھا۔ میں نے فی لس کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی بمشکل پندرہ برس کی......اس کا سفید چہرہ نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے پہلے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔

جیڑے نے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا......ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی ''جیڑہ چھوڑ دو......فو گاڈ سیک......چھوڑ دو اسے''۔

جب جیڑے نے فی لی کو اپنے چوڑے سینے سے جدا نہ کیا تو ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا ''گٹ آؤٹ......گٹ آؤٹ!''

جیڑہ بھونچکا رہ گیا۔ فی لس کو جدا کر کے اس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور جیڑے کے پیچھے چلا گیا۔

سعیدہ کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون قمیص اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑے میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ جیڑہ صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا

گیا تھا۔ کہاں یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی جو گراج کے باہر سے آ رہی تھی۔ میں رک گیا وہ کسی سے کہہ رہا تھا ''وہ لاجواب عورت ہے...... خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے...... دعا کرو کہ اس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ''۔

اس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی...... معلوم نہیں اس کا رخ اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی جانب جس سے وہ مخاطب تھا...... میں نے زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا...... ہریش گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونے میں کافی تفریح ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دیجیے۔ رسماً اس نے ہمیں روکنا چاہا لیکن میں نے سعیدہ کاٹیج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لیے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے......

ہم چل دیے...... راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کو من و عن سنا دیا۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ فی الحال اس کی کوئی رشتہ دار ہو گی۔ یا وہ اسے کسی اچھی آسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی جبھی اس نے چڈے سے لڑائی لی...... میں خاموش ہو گیا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گزرنے پر چڈے کا خط آیا جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا۔ اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا ''میں اس روز حیوان بن گیا تھا...... لعنت

ہو مجھ پر!"

تین مہینے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڑہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت میری ملاقات ہوئی۔ جب ہو گراج سے نکل کر شیریں کے شیر خوار بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر بعد رنجیت کمار آ گیا کچھوے کی چال چلتا اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڑہ اس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی لس کو اس نے دوسرے ہی روز اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا تھا۔ وہ اس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی...... رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونے میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا۔ اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڑے کے متعلق یہ پتا چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے...... بخار رہتا ہے مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا...... سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی سے دیکھا اس کا رخ گیراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لیے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ ون کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چڑے کو سخت بخار ہے۔ وہ اسے تانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بے ہوش ہو گیا...... میں اور غریب نواز باہر دوڑے تانگے والے نے بے ہوش چڑے

کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہوگا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔ اس نے ون کترے سے مشورہ کیا۔ وہ ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا ''کیا ہوا میرے بیٹے کو؟''

ون کترے نے جب اسے بتایا کہ چڈہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصے کے ساتھ کہا ''تم کیسے لوگ ہو...... مجھے اطلاع کیوں نہ دی''۔ پھر اس نے غریب نواز مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈے کے پاؤں سہلانے کی دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر بلانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گراج میں کیسے پتا چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بے ہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔ یہ سن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے جیسے چڈے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڈے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگا دی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے...... میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ممی آئی۔ غریب نواز ون کترے اور رنجیت کمار سے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ ممی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا "ممی یو آر گریٹ!"

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا "میرے بیٹے...... میرے غریب بیٹے"

چڈے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا "نہیں...... تمہارا بیٹا اول درجے کا سکاؤنڈرل ہے...... جاؤ اپنے مرحوم خاوند کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو"۔

ممی نے چڈے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا "فضول بکواس نہ کرو" پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھی اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا "لڑکو...... چڈہ بیمار

ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے...... سمجھے؟''

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کون سی آفت آ گئی ہے کہ جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا...... ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے یعنی پلیگ...... یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممی بھی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ۔ مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہیں ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ روز کے بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈے کا ایک خط دیا۔ جس میں صرف یہ لکھا تھا ''عظیم المرتبت

ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچالیا ہے"۔

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا "ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوا کرتی ہیں"۔

میں نے چڈے کو دو تین خط لکھے جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناولہ بھجوا دیا تھا۔ چڈہ وہاں بمشکل ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونے پہنچا اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر اس کی غوغا پسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب جبکہ وہ جانبر ہو گیا تھا۔ اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ایل برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لیے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائریکٹر آ گیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر لوناولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز

اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ دیا جائے۔ سیمین کے کمرے میں کیونکہ خالی جگہ رہتی تھی اس لیے اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کی نئی فلم میں ہیرو منتخب کرلیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوئی تو اس کو دوسری فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے صرف ڈیڑھ ہزار روپیہ یک مشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا۔ میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیگ میں مبتلا ہو جاؤ...... ہیرو اور ڈائریکٹر بننے سے تو میرا خیال ہے یہی بہتر ہے''۔

غریب نواز تازہ تازہ حیدر آباد سے واپس آیا تھا۔ اس لیے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفع الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج سے باہر ایسی قمیصیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونے میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کو ساتھی اب نئی فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا مشٹنڈا تھا۔ چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ کچھ پروا نہ کرو اس سالے کی...... جس پنجابی ایکٹرلیس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرتا ہے...... بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بیس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص

مشکلوں میں کام آیا کریں گی۔

ہریش نے ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب و لہجے میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممی کے گھر حسبِ معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی ڈولی ایلما تھیلما وغیرہ سب آتی تھیں۔ ون کترے بدستور تھیلما کو کتھا کلی اور تانڈیو ناچ کی تاتھئی اور روحانی ناکت کی ون ٹوتھری بنا بنا کر بتاتا تھا۔ اور وہ اسے سیکھنے کی پرخلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسبِ توفیق قرض دے رہا تھا اور رنجیت مار جس کو اب کمپنی کی نئی فلم کے ہیرو کا چانس مل رہا تھا ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا..... چڈے کے ننگے ننگے لمرک سن کر اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے..... ایک صرف وہ نہیں تھی..... وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لیے صحیح تشبیہ ڈھونڈنے میں چڈے کا کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڈے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی چڈے کی نظریں جب ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اسی قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ''چڈہ..... یو آر اے ڈیمڈ بروٹ''۔

یہ سن کر ممی زیرِ لب مسکرا دیتی تھی جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہو ''ڈونٹ ٹوک روٹ''۔

ون کترے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی۔ سرور میں آکر جب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گنڈاسے سے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا اور اپنا میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔

ممی وہی ممی تھی پولی کی ممی' ڈولی کی ممی' چڈے کی ممی' رنجیت کمار کی ممی......

سوڈے کی بوتلوں گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے سازوسامان کے انتظام مین وہ ایسی پر شفقت انہاک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی واہیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلیگ کے کیڑے ان تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ ڈر کر سمٹ کر وہ دوڑ گئے تھے...... چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ ان پر ان جھریوں کا سایہ تھا...... ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھیں۔

ون کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا اور اس کو جہنم سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو

اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کٹی کو ایک معما حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس نے کٹی سے کہا "تم اس وقت اسے دے دو...... بعد میں لیتی رہنا"۔ اور مجھ سے اس نے پندرہ روز قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں۔ دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔ رنجیت مار سے زیادہ رغبت سے بات نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی "ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو" چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتی "مجھے یہ آدمی اوپرا اوپرا سا معلوم ہوتا ہے ...... فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں" یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پرخلوص گرمی لیے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی بلا نوشی تھی جنسیاتی رنگ تھا مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ بظاہر اسی طرح کڈھب بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں مین یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی ڈائریکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس

کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً اونے فون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثۂ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے۔ خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش و حواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے پر رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آ گئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اسکے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا اور اس کے زخموں کے متعلق پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا۔ مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا ''بھاپا جی...... مر گیا؟''

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا ''مجھے چھوڑ دیجیے میں بھاگوں گا نہیں''۔

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ پولیس سٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ اور بیانات پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا ممی نے اس سے کہا تھا "بیٹا گھبراؤ نہیں جو کچھ ہوا ہے سچ سچ بتادو......" اور اس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیے تھے۔ کہ ہیمن نے اسکو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا اور ہیمن بہت اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آ کر اس کی شہوانی خواہشات پوری کرتا رہا۔ مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے ہیمن سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا تھا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے مگر ایک بڑی نجس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی بڑے بھولے پن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان کیے۔ مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا "اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے...... اور اس کا سہرہ میری بڈھی ممی کے سر ہے!"

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل

برادر زشکل اور عقیل دونوں واپس سعیدہ کاٹیج آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لیے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس سرمایے میں سے چند سو باقی بچے تھے جو انہوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انہوں نے سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا ''اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمہاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے''۔

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں ون کترے نے شراب پی کر اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کٹی کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیے اور رنجیت کمار سے اس نے کہا تھا ''تم ان بیچاری لڑکیوں کو یونہی جھانسے نہ دیا کرو...... ہوسکتا ہے کہ تمہاری نیت صاف ہو مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی...... کچھ نہ کچھ دے دیا کرو!''

ممی نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لیے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا...... شریں نے سفر کے لیے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ اسٹیشن پر سب چھوڑنے گئے۔ ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی

تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل وصورت ہزار ہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسا جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پر کر دیتی تھی۔ میں جس روز سے وہاں پہنچا شیرینی بٹ رہی تھی۔ شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ ون کترے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لیے کہیں سے دو پیدا کیے تھے۔ ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لیے آیا تھا۔ چڑے نے آخری دو لڈو اس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا "تو یہ گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے...... بڑا کمال کیا ہے تو نے...... اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا ہرگز کوئی بات نہ کرنا"۔

ون کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا "سالے میں اب کوئی اپنی لا ہوں...... وہ تو دارو پولا کرتی ہے...... ویسے بائی گاڈ...... میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے......"

چڑے نے اس قدر بے تحاشا قہقہہ لگایا کہ ون کترے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڑہ غریب نواز اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعے سے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لیے لکھ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڑے کو پسند نہ آئے آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹیج کی رعایت سے لڑکا مولود مسعود ہے۔ اس لیے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڑے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڈہ غریب نواز اور رنجیت مار تینوں کی طبیعت کسی قدر بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ سے ہے۔ جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحال کا باعث ہو سکتا تھا لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کے قتل کی ٹریجڈی؟...... معلوم نہیں کیا وجہ تھی...... لیکن میں نے قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے بظاہر ہنستے تھے بولتے تھے مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلمی ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا تھا یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا کہ اس دوران میں چڈے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ ون کترے بھی کہیں غائب تھا۔ رنجیت مارے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس اتنی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا کہ شاید حیدرآباد چلا گیا ہو اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں اس بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا "اس بکواس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے"۔

اس کا اشارہ میری اس کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی...... "ہاں...... دوسرا ہزار پرسوں لیا ہے"۔

"کہاں ہے یہ ہزار؟" یہ کہتا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

"میری جیب میں"۔

جڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا "آج شام کو ممی کے ہاں پہنچ جانا...... ایک پارٹی ہے!"

میں اس پارٹی کے متعلق کچھ دریافت کرنے ہی والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے محسوس کی تھی بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا...... میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ گراج کے باہر الگنی پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے۔ اورنل کے پاس ایل براوران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے جڈے کے متعلق پوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ ممی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ رنجیت سمارٹی اور ایلما کے ساتھ اور ون کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ جڈہ ممی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کود رہا تھا...... سب نشے میں تھے...... ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے جڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور بدیشی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس

کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی...... ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا ''کس می ڈیئر!''۔

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈھا ایک دم پکارا ''بند کرو...... اب شراب کا دور چلے گا''۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی ''اسکاٹ لینڈ کے شہزادے...... وسکی کی نئی بوتل لاؤ''۔ اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہوگئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا ''ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی...... جانے دو یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں''۔

محفل ایک دم سونی ہوگئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی...... ہر گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربط سی تقریر شروع کر دی ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین...... آپ سب جہنم میں جائیں...... منٹو ہمارے درمیان موجود ہے بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے...... مگر میں کہتا ہوں کہ سب بکواس ہے...... کنویں میں اترنے والے...... کنویں میں اترنے والے'' اس نے ادھر ادھر دیکھا ''افسوس یہاں کوئی ہندستوڑ نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو قاف کو خاف کہتا ہے اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی تو کہے گا۔ پرسوں آپ سے ملا تھا...... لعنت ہو اس نظام حیدر آباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑہا جواہرات ہیں۔ لیکن ایک ممی نہیں...... ہاں...... وہ

کنویں میں اترنے والے...... میں نے کیا کہا تھا کہ سب بکواس ہے...... پنجابی میں جنہیں ٹوبے کہتے ہیں...... وہ غوطہ لگانے والے۔ وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیایت کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں...... اس لیے میں کہتا ہوں......''

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈہ چیخا یہ سب سازش ہے...... منٹو کی سازش ہے ورنہ میں نے ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا۔ تم سب مردہ باد...... لیکن پہلے میں...... میں...... وہ جذباتی ہوگیا''میں جس نے اس رات اس...... سانپ کے پیٹ کے کھپروں ایسے رنگ کے بالوں والی ایک لڑکی کے لیے اپنی ممی کو ناراض کر دیا...... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوآن سمجھتا تھا...... لیکن نہیں...... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم۔ ایک ہی بوسے میں اس پلیٹنم بلونڈ کے کنوارپنے کا سارا عرق اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا...... لیکن یہ ایک...... یہ ایک نامناسب حرکت تھی...... وہ کم عمر تھی...... اتنی کم عمر اتنی کمزور اور اتنی کریکٹر لیس اتنی...... اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا بتاؤ یار اسے اردو فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے...... کریکٹر لیس...... لیڈیز اینڈ جنٹلمین...... وہ اتنی چھوٹی اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی یا اسے قطعاً بھول جاتی...... ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا...... مجھ اس کا دکھ ہوتا...... اچھا ہوا کہ ممی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا...... میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا......

میں ایک پیگ اور پیتا ہوں''۔

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور وفکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چڈھ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا جیسے کوئی چیز کھونے کے لیے ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے میں نے اس سے ایک بار پوچھا ''کیا بات ہے چڈے؟''

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ''کچھ نہیں ...... بات یہ ہے کہ آج وسکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی''۔

اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔

ون کترے نے تھیلما کو اٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود رہ جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چھین کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین کی بات نکلی تو اس نے کہا ''مسٹر منٹو ...... وہ ایک دم بلاٹ آدمی تھا ...... کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں ...... جھوٹ بالکل جھوٹ ...... وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا ......''

گھڑی نے دو بجائے چڈے نے جھر بگ بند کیا۔ کٹی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا بڑھ کر ون کترے کے سر پر دھپا مار کر بولا ''بکواس بند کر بے ...... اٹھ

.......اور کچھ گا........لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا راگ گایا"۔

ون کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی مرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی لیکن جو کچھ گاتا تھا۔ پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اس نے اوپر تلے دو فلمی گانے گائے جن سے فضا بہت اداس ہو گئی........ ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے........ غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا "حیدر آباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے........ موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے"۔

غریب نواز نے آنسو پونچھے اور ایلما نے ناچنا شروع کر دیا۔ ون کترے نے گراموفون کے توے پر رکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممی کو پھر گود میں اٹھا لیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا۔ ان میراثیوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقع پر اونچے سروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتے ہیں۔

اس اچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا "بس اب ختم!"

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا "چلو منٹو چلیں!"

میں نے اٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا "آج کوئی الوداع نہیں کہے گا"۔

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڑے سے کہا "ٹھہرو دیکھیں کیا بات ہے"۔ مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا "اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے"۔

ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڑے نے کوئی بات نہ کی سونے سے پہلے میں نے اس عجیب وغریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا "مجھے سخت نیند آ رہی ہے اور بستر پر لیٹ گیا"۔

صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ غریب نواز گراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس کے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "ممی چلی گئی"۔

"کہاں؟"

"معلوم نہیں" یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رخ کیا۔

چڑہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا "چلی گئی...... صبح کی گاڑی سے اسے پونہ چھوڑنا تھا"۔

میں نے پوچھا "مگر کیوں؟"

چڑے کے لہجے میں تلخی آ گئی "حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں...... اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل اعتراض تھیں۔ اس لیے کہ پولیس اس کی محبت اور شفقت بطور یرغمال کے لینا چاہتی

تھی...... وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے...... ایک عرصے سے اس کا کیس زیرِ تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو تڑی پار کر دیا...... شہر بدر کر دیا...... وہ اگر قحبہ تھی دلالہ تھی...... اس کا وجود سوسائٹی کے لیے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا...... پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو''۔ چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا ''مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا...... لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیے...... وہ پونے سے چلی گئی ہے...... مجھ ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی...... میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں...... زندہ باد ممی...... زندہ باد...... چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہو گی...... ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے...... وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے''۔

میں نے دیکھا چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔

☆☆☆

منٹو

ننھا رام۔ ننھا تو تھا لیکن شرارتوں کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ چہرے پر بے حد بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا کوئی خط نقش ایسا نہیں تھا جو شوخی کا پتا دے اس کے جسم کا ہر عضو بھدے پن کی حد تک موٹا تھا۔ جب چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فٹ بال لڑھک رہا ہے۔ عمر بمشکل آٹھ برس کی ہو گی مگر بلا کا ذہین اور چالاک تھا لیکن اس کی ذہانت اور چالاکی کا پتا اس کے سراپا سے لگانا بہت مشکل تھا مسٹر راما شنکر اچاریہ ایم اے، ایل ایل بی، رام کے پتا کہا کرتے تھے کہ ''منہ میں رام رام اور بغل میں چھری'' والی مثال اسی رام کے لیے بنائی گئی ہے۔

رام کے منہ سے رام رام تو کسی نے سنا ہی نہیں تھا مگر اس کی بغل میں چھری کے بجائے ایک چھوٹی سی چھڑی ضرور رہا کرتی تھی جس سے وہ کبھی کبھی ڈگلس فیر بینکس یعنی بغدادی چور کی تیغ زنی کی نقل کیا کرتا تھا۔

جب رام کی ماں یعنی مسز راما شنکر اچاریہ اس کو کان سے پکڑ کر اس کے باپ کے سامنے لائیں تو وہ بالکل خاموش تھا آنکھیں خشک تھیں۔ اس کا ایک کان جو اس کی ماں کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے کان سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر اس مسکراہٹ میں بلا کا بھولا پن تھا۔ اس کی ماں کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔ مگر اس کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی ماں سے کھیل رہا ہے اور اپنے کان کو ماں کے ہاتھ میں دے کر ایک خاص قسم کا لطف اٹھا رہا ہے جس کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔

جب رام مسٹر شنکر اچاریہ کے سامنے لایا گیا تو وہ آرام کرسی پر جم کر بیٹھ گئے کہ اس نالائق کے کان کھینچیں حالانکہ وہ اس کے کان کھینچ کھینچ کر کافی زیادہ لمبے کر چکے تھے اور اس کی شرارتوں میں کوئی فرق نہ آنے پایا تھا۔ وہ عدالت میں قانون کے زور پر بہت کچھ کر لیتے تھے مگر یہاں اس چھوٹے سے لونڈے کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔

ایک مرتبہ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے کسی شرارت پر اس کو پرمیشور کے نام سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا ''دیکھ رام تو اچھا لڑکا بن جا ورنہ مجھے ڈر ہے پرمیشور تجھ سے خفا ہو جائیں گے''۔

رام نے جواب دیا ''آپ بھی تو خفا ہو جایا کرتے ہیں اور میں آپ کو منالیتا ہوں''۔ اور پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے یہ پوچھا ''باپو جی یہ پرمیشور کون ہیں؟''

مسٹر شنکر اچاریہ نے اسے سمجھانے کے لیے جواب دیا تھا ''بھگوان اور کون اور ہم سب سے بڑے''۔

''اس مکان جتنے''

''اس سے بھی بڑے دیکھو اب تو کوئی شرارت نہ کیجیو۔ ورنہ وہ تمہیں مار ڈالیں گے''۔ مسٹر شنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے پر ہیبت طاری کرنے کے لیے پرمیشور کو اس سے زیادہ ڈراؤنی شکل میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال کیا تھا کہ اب رام سدھر جائے گا اور کوئی شرارت نہ کرے گا مگر رام جو اس وقت خاموش بیٹھا تھا۔ اپنے ذہن کے ترازو میں پرمیشور کو تول رہا تھا کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے بڑے

بھولپن سے کہا تھا ''باپو جی! آپ مجھے پرمیشور دکھا دیجیے''۔ تو مسٹر راما شنکر اچاریہ کی ساری قانون دانی اور وکالت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

کسی مقدمے کا حوالہ دینا ہوتا تو وہ اس کو فائل نکال کر دکھا دیتے یا اگر کوئی تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کے متعلق سوال کرتا تو وہ اپنی میز پر سے وہ موٹی کتاب اٹھا کر کھولنا شروع کر دیتے۔ جس کی جلد پر ان کے اس لڑکے نے چاقو سے بیل بوٹے بنا رکھے تھے۔ مگر وہ پرمیشور کو پکڑ کر کہاں سے لاتے جس کے متعلق انہیں خود اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا ہے کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

جس طرح ان کو یہ معلوم تھا کہ دفعہ ۳۷۹ چوری کے فعل پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ مارنے اور پیدا کرنے والے کو پرمیشور کہتے ہیں اور جس طرح ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کے قانون سے بنے ہوئے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے ٹھیک اسی طرح ان کو ایشور کی اصلیت معلوم نہ تھی۔ وہ ایم اے ایل ایل بی تھے مگر یہ ڈگری انہوں نے ایسی الجھنوں میں پھنسنے کے لیے نہیں بلکہ دولت کمانے کے لیے حاصل کی تھی۔

وہ رام کو پرمیشور نہ دکھا سکے اور نہ ہی اس کو کوئی معقول جواب دے سکے۔ اس لیے کہ یہ سوال ہی کچھ اس طرح اچانک طور پر کیا گیا تھا کہ ان کا دماغ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے تھے کہ ''جا رام...... جا میرا دماغ نہ چاٹ مجھے بہت کام کرنا ہے''۔

اس وقت انہیں کام واقعی بہت کرنا تھا مگر وہ پرانی شکستوں کو بھول کر فوراً ہی اس نئے مقدمے کا فیصلہ کر دینا چاہتے تھے۔

انہوں نے رام کی طرف خشم آلود نگاہوں سے دیکھ کر اپنی دھرم پتنی سے کہا ''آج اسنے کون سی نئی شرارت کی ہے مجھے جلدی بتاؤ میں آج اسے ڈبل سزا دوں گا''۔

مسز اچاریہ نے رام کا کان چھوڑ دیا اور کہا ''اس موٹے نے تو زندگی وبال کر رکھی ہے جب دیکھو ناچنا تھرکنا کودنا نہ آئے کہ شرم نہ گئے کا لحاظ۔ صبح سے مجھے ستار ہا ہے۔ کئی بار پیٹ چکی ہوں مگر یہ اپنی شرارتوں سے باز ہی نہیں آتا۔ نعمت خانے میں سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کھا گیا ہے۔ اب میں سلاد میں اس کا سر ڈالوں''۔

یہ سن کر مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ رام کے خلاف کوئی سنگین الزام ہوگا۔ مگر یہ سن کر کہ اس نے نعمت خانے سے صرف دو کچے ٹماٹر نکال کر کھائے ہیں۔ انہیں سخت نا امیدی ہوئی۔ رام کو جھڑکنے اور کوسنے کے لیے ان کی سب تیاری ایکا ایکی سرد پڑ گئی۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کا سینہ ایک دم خالی ہو گیا ہے جیسے ایک دفعہ ان کے موٹر کے پہیے کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔

ٹماٹر کھانا کوئی جرم تو نہیں۔ اس کے علاوہ ابھی کل ہی مسٹر راما شنکر اچاریہ کے ایک دوست نے جو جرمنی سے طب کی اعلیٰ سند لے کر آئے تھے ان سے کہا تھا کہ اپنے بچوں کو کھانے کے ساتھ کچے ٹماٹر ضرور دیا کیجیے۔ کیونکہ اس میں کثرت سے وٹامنز ہوتے ہیں۔ مگر اب چونکہ وہ رام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور ان کی بیوی کی بھی یہی خواہش تھی اس لیے انہوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ایک قانونی نکتہ سوچا اور اس انکشاف پر دل ہی دل میں خوش ہو کر اپنے بیٹے سے کہا ''میرے نزدیک آ اور جو کچھ میں تجھ سے پوچھوں سچ سچ بتا''۔

مسز راما شنکر اچاریہ چلی گئیں اور رام خاموشی سے اپنے باپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے پوچھا "تو نے نعمت خانے سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کیوں کھائے"؟

رام نے جواب دیا "دو کہاں تھے ماتا جی جھوٹ بولتی ہیں"۔

"تو ہی بتا کتنے تھے؟"

"ڈیڑھ ایک اور آدھا" رام نے یہ الفاظ انگلیوں سے آدھے کا نشان بنا کر ادا کیے "دوسرے آدھے سے ماتا جی نے دوپہر کو چٹنی بنائی تھی"۔

"چلو ڈیڑھ ہی سہی پر تو نے یہ وہاں سے اٹھائے کیوں؟"

رام نے یہ جواب دیا "کھانے کے لیے"۔

"ٹھیک ہے مگر تو نے چوری کی" مسٹر راما شنکر اچاریہ نے قانونی نکتے کو پیش کیا۔

"چوری باپو جی میں نے چوری نہیں کی ٹماٹر کھائے ہیں مگر چوری کیسے ہوئی؟"

یہ کہتا ہوا وہ فرش پر بیٹھ گیا اور غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

یہ چوری تھی دوسرے کی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر اٹھا لینا چوری ہوتی ہے "۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اپنے بچے کو یوں سمجھایا اور خیال کیا کہ اس کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ رام نے فوراً ہی کہا "مگر ٹماٹر تو ہمارے تھے میری ماتا جی کے"۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ سٹپٹا کر رہ گئے۔ مگر روراً ہی اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی۔ "تیری ماتا جی کے تھے ٹھیک ہے پر وہ تیرے تو نہیں ہوئے۔ جو چیز ان کی ہے وہ تیری کیسے ہو سکتی ہے۔ دیکھ سامنے میز پر تیرا کھلونا پڑا ہے۔ اٹھا لا میں

تجھے اچھی طرح سمجھاتا ہوں''۔ رام اٹھا اور دوڑ کر لکڑی کا گھوڑا اٹھا لایا اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دیدیا۔

''یہ لیجیے''۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ بولے''ہاں تو دیکھ یہ گھوڑا تیرا ہے نا؟''

''جی ہاں''۔

''اب اگر میں اسے تیری اجازت کے بغیر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لوں تو یہ چوری ہوگی''۔ پھر مسٹر راماشنکر نے مزید وضاحت سے کام لیتے ہوئے کہا''اور میں چور''۔

''نہیں پتا جی...... آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو چور نہیں کہوں گا۔ میرے پاس کھیلنے کیلیے ہاتھی جو ہے۔ کیا آپ نے ابھی تک دیکھا نہیں۔ کل ہی منشی دادا نے لاکر دیا ہے۔ ٹھہریے میں آپ کو دکھاتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ تالیاں بجاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا اور مسٹر راماشنکر اچاریہ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

دوسرے روز مسٹر راماشنکر اچاریہ کو ایک خاص کام سے پونا جانا پڑا۔ ان کی بڑی بہن وہیں رہتی تھی۔ ایک عرصے سے وہ چھوٹے رام کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ چنانچہ ایک پنتھ دو کاج کے پیش نظر راماشنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے۔ مگر اس شرط پر کہ وہ راستے میں کوئی شرارت نہیں کرے گا۔ ننھا رام اس شرط پر بوری بندر اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک قائم رہ سکا۔ ادھر دکن کوئین چلی اور ادھر رام کے ننھے سے سینے میں شرارتیں مچانا شروع ہوگئیں۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ سیکنڈ کلاس اپارٹمنٹ کی چوڑی سیٹ پر بیٹھے اپنے ساتھ والے مسافر کا اخبار پڑھ رہے تھے اور سیٹ کے آخری حصے پر رام کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا اور ہوا کا دباؤ دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسے لے اڑے تو کتنا مزہ آئے۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اپنی عینک کے گوشوں سے رام کی طرف دیکھا اور اس کو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا۔ ''تو چین بھی لینے دے گا یا نہیں آرام سے بیٹھ جا''۔ یہ کہتے ہوئے ان کی نظر رام کی نئی ٹوپی پر پڑی جو اس کے سر پر چمک رہی تھی ''اسے اتار کر رکھنالائق ہوا اسے لے کر اڑ جائے گی''۔

انہوں نے رام کے سر پر سے ٹوپی اتار کر اس کی گود میں رکھ دی۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد ٹوپی پھر رام کے سر پر تھی اور وہ کھڑکی کے باہر سر نکالے روڑتے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی بھاگ دوڑ رام کے ذہن میں آنکھ مچولی کے دلچسپ کھیل کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔

ہوا کے جھونکے سے اخبار دوہرا ہو گیا اور مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے کے سر کو پھر کھڑکی کے باہر پایا۔ غصے میں انہوں نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا۔ ''اگر تو یہاں سے ایک انچ بھی ہلا تو تیری خیر نہیں''۔ یہ کہہ کر انہوں نے ٹوپی اتار کر اس کی ٹانگوں پر رکھ دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اخبار اٹھایا اور وہ ابھی اس میں وہ سطر ہی ڈھونڈ رہے تھے جہاں سے انہوں سے پڑھنا چھوڑا تھا کہ رام نے کھڑکی کے پاس سرک کر باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ یہ دیکھ کر مسٹر راما شنکر

اچاریہ کو سخت غصہ آیا۔ ان کا ہاتھ بھوکی چیل کی طرح ٹوپی کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں وہ ان کی سیٹ کے نیچے تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ رام کو سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مڑ کر اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا مگر ان کے ہاتھ خالی نظر آئے۔ اسی پریشانی میں اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے ریل کی پٹڑی پر بہت پیچھے ایک خاکی کاغذ کا ٹکڑا اڑتا نظر آیا۔ اس نے خیال کیا کہ یہ میری ٹوپی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ باپ کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اسنے کہا "باپو جی میری ٹوپی!" مسٹر راما شنکر اچاریہ خاموش رہے۔

"ہائے میری ٹوپی" رام کی آواز بلند ہوئی۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ کچھ نہ بولے۔

رام نے روتی ہوئی آواز میں کہا "میری ٹوپی" اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا "گرا دی ہو گی تو نے اب روتا کیوں ہے؟" اس پر رام کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

"پر دھکا تو آپ ہی نے دیا تھا" اس نے اتنا کہا اور رونے لگا۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے ذرا ڈانٹ بتائی تو رام نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ انہوں نے اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ رام کا رونا صرف ٹوپی ہی بند کرا سکتی تھی۔ چنانچہ راما شنکر اچاریہ نے تھک ہار کر اس سے کہا "ٹوپی واپس آجائے گی مگر شرط یہ ہے کہ تو اسے پہنے گا نہیں"۔

رام کی آنکھوں میں سے آنسو فوراً خشک ہو گئے جیسے تپی ہوئی ریت میں بارش کے قطرے جذب ہو جائیں۔ سرک کر آگے بڑھ آیا "اسے واپس لائیے"۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے کہا "ایسے تھوڑی واپس آ جائے گی منتر پڑھنا پڑے گا"۔

کمپارٹمنٹ میں سب مسافر باپ بیٹے کی گفتگو سن رہے تھے۔

"منتر" یہ کہتے ہوئے رام کو فوراً ہی وہ قصہ یاد آ گیا جس میں ایک لڑکے نے منتر کے ذریعے سے دوسروں کی چیزیں غائب کرنا شروع کر دی تھیں "پڑھیے پتا جی"۔

یہ کہہ کر وہ خوب غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا منتر پڑھتے وقت راما شنکر اچاریہ کے گنجے سر پر سینگ اگ آئیں گے۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اس منتر کے بول یاد کرتے ہوئے جو انہوں نے بچپن میں "اندر جال مکمل" سے زبانی یاد کیا تھا "تو پھر شرارت تو نہ کرے گا؟"

"نہیں باپو جی" رام نے جو منتر کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ اپنے باپ سے شرارت نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ کو منتر کے بول یاد آ گئے اور انہوں نے دل ہی دل میں اپنے حافظے کی داد دے کر اپنے لڑکے سے کہا "لے اب تو آنکھیں بند کر لے"۔

رام نے آنکھیں بند کر لیں اور مسٹر راما شنکر اچاریہ نے منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

"اوم نما کامیشری مدمدیش اوتماد ے بھرینگ پر اسواہ" مسٹر راما شنکر اچاریہ کا ایک ہاتھ سیٹ کے نیچے گیا اور "سواہ" کے ساتھ ہی رام کی ٹوپی اس کی گدگدی رانوں پر آ گری۔

رام نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹوپی اسکی چپٹی ناک کے نیچے پڑی تھی اور مسٹر راما شنکر اچاریہ کی نکیلی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے تھرتھرا رہا تھا۔ عدالت میں مقدمہ جیتنے کے بعد ان پر یہی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی۔

"ٹوپی آ گئی" رام نے صرف اتنا کہا اور چپ ہو رہا اور مسٹر راما شنکر اچاریہ رام کو خاموش بیٹھنے کا حکم دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک خبر کافی دلچسپ اور اخباری زبان میں بے حد سنسنی تھی۔ چنانچہ وہ منتر وغیرہ سب کچھ بھول کر اس میں کھو گئے۔ دکن کوئین بجلی کے پروں پر پوری تیزی سے اڑ رہی تھی۔ اس کے آہنی پہیوں کی یک آہنگ گڑگڑاہٹ اخبار کی سنسنی پیدا کرنے والی خبر کی ہر سطر کو صوتی مدد بخش رہی تھی۔ مسٹر شنکر اچاریہ یہ خبر پڑھ رہے تھے۔

عدالت پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک سنائی دیتی تھی۔ ملزم ایکا ایکی چلایا "باپو جی"۔

عین اس وقت رام نے اپنے باپ کو زور سے آواز دی "باپو جی" اور مسٹر راما شنکر اچاریہ کو یوں معلوم ہوا کہ زیرِ نظر سطر کے آخری الفاظ کاغذ پر اچھل پڑے ہیں۔

رام کے تھرتھراتے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے ذرا تیزی سے کہا "کیا ہے؟" اور عینک کے ایک گوشے میں سے ٹوپی کو سیٹ پر پڑا دیکھ کر اطمینان کر لیا۔

رام آگے سرک آیا اور کہنے لگا "باپو جی وہی منتر پڑھیے"۔

"کیوں؟" یہ کہتے ہوئے مسٹر راما شنکر اچاریہ نے رام کی ٹوپی کی طرف غور سے دیکھا جو سیٹ کے کونے میں پڑی تھی۔

آپ کے کاغذ جو یہاں پڑے تھے میں نے باہر پھینک دیے ہیں''۔

رام نے اس کے آگے کچھ اور بھی کہا مگر مسٹر راما شنکر اچاریہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اٹھ کر انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ مگر ریل کی پٹڑی کے ساتھ تتلیوں کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے کاغذ کے پرزوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

''تو نے وہ کاغذات پھینک دیے ہیں جو یہاں پڑے تھے؟'' انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ سے سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رام نے اثبات میں سر ہلا دیا ''آپ وہی منتر پڑھیے نا''۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایسا کوئی منتر یاد نہ تھا جو سچ مچ کی کھوئی ہوئی چیزوں کو واپس لا سکے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ وہ کاغذات جو ان کے بیٹے نے پھینک دیے تھے ایک نئے مقدمے کی مثل تھی جس میں چالیس ہزار کی مالیت کے قانونی کاغذ پڑے تھے۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ ایم اے ایل ایل بی کی بازی ان کی اپنی چال ہی سے مات ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر ان کے قانونی دماغ میں کاغذات کے بارے میں سینکڑوں خیالات آئے۔ ظاہر ہے مسٹر راما شنکر اچاریہ کے موکل کا نقصان ان کا اپنا نقصان تھا۔ مگر اب وہ کیا کر سکتے تھے۔ صرف یہ کہ اگلے اسٹیشن پر اتر کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں اور دس پندرہ میل تک ان کاغذوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ ملیں نہ ملیں تو ان کی قسمت۔

ایک لمحے کے اندر سینکڑوں باتیں سوچنے کے بعد آخر میں انہوں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر تلاش پر کاغذ نہ ملے تو موکل کے سامنے سرے سے ہی انکار کر

دیں گے کہ اسنے ان کو بھی کاغذات دیے تھے۔ اخلاقی اور قانونی طور پر سراسر ناجائز تھا مگر اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

اس تسلی بخش خیال کے باوجود مسٹر راما شنکر اچاریہ کے حلق میں تلخی سی پیدا ہو رہی تھی۔ ایکا ایکی ان کے دل میں آئی کہ کاغذوں کی طرح وہ رام کو بھی اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیں مگر اس خواہش کو سینے میں ہی دبا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

رام کے ہونٹوں پر ایک عجیب وغریب سا تبسم منجمد ہو رہا تھا۔

اس نے ہولے سے کہا "باپو جی! منتر پڑھیے"۔

"آرام سے بیٹھا رہ ورنہ یاد رکھ گلا گھونٹ دوں گا"۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ بھنا گئے۔ اس مسافر کے لبوں پر جو غور سے باپ بیٹے کی گفتگو سن رہا تھا ایک معنی خیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

رام آگے سرک آیا "باپو جی آپ آنکھیں بند کر لیجیے میں منتر پڑھتا ہوں"۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے آنکھیں بند نہ کیں لیکن رام نے منتر پڑھنا شروع کر دیا "اونگ میانگ شیانگ لدمداگا...... فرووما...... سواہا"۔ اور سواہا کے ساتھ ہی مسٹر راما شنکر اچاریہ کی گوشت بھری رانوں پر کاغذوں کا ایک پلندا آگرا۔

ان کی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے سے زور سے کانپا۔

رام کی چپٹی ناک کے گول اور لال لال نتھنے بھی کانپ رہے تھے۔

☆☆☆

موم بتی کے آنسو

غلیظ طاق پر جو شکستہ دیوار میں بنا تھا موم بتی ساری رات روتی رہی تھی۔

موم پگھل پگھل کر کمرے کے گیلے فرش پر اوس کے ٹھٹھرے ہوئے دھندلے قطروں کی مانند بکھر رہا تھا۔ ننھی لاجو موتیوں کا ہار لینے پر ضد کرنے اور رونے لگی تو اس کی ماں نے موم بتی کے ان جمے ہوئے آنسوؤں کو ایک کچے دھاگے میں پرو کر اس کو ہار بنا دیا۔ ننھی لاجو اس ہار کو پہن کر خوش ہو گئی اور تالیاں بجاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

رات آئی...... میل بھرے طاقچے میں نئی موم بتی روشن ہوئی اور اس کی کانی آنکھ اس کمرے کی تاریکی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے حیرت سے چمک اٹھی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ماحول کی عادی ہو گئی تو اس نے خاموشی سے ٹکٹکی باندھ کر اپنے گرد و پیش کو دیکھنا شروع کر دیا۔

ننھی لاجو ایک چھوٹی سی کھٹیا پر سو رہی تھی اور خواب میں اپنی سہیلی بندو سے لڑ رہی تھی کہ وہ اپنی گڑیا کا بیاہ اس کے گڈے سے کبھی نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ وہ بہت بدصورت ہے۔

لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کیچڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے اس طرف لوہے کے کھمبے پر ایک لالٹین دسمبر کی سردی میں مجبور سنتری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ سامنے بھٹیارے کی بند دوکان کے باہر چبوترے پر انگیٹھی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں ضدی

بچوں کی طرح مچل مچل کر نیچے گر رہی تھیں۔ گھنٹہ گھر نے غنودگی میں بارہ بجائے بارہ کی آخری پکار دسمبر کی سرد رات میں تھوڑی دیر کانپتی رہی اور پھر خاموشی کا ایک لحاف اوڑھ کر سو گئی لاجو کی ماں کے کانوں میں نیند کا بڑا سہانا پیغام گنگنایا مگر اس کی انتڑیاں اس کے دماغ تک کوئی اور ہی بات پہنچا چکی تھیں۔

دفعتاً سرد ہوا کے جھونکے سے گھنگھروؤں کی مدھم جھنجھناہٹ اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے یہ آواز اچھی طرح سننے کے لیے کانوں میں اپنی بصارت کی طاقت بھرنا شروع کر دی۔

گھنگھرو رات کی خاموشی میں مرتے ہوئے آدمی کے حلق میں اٹکے سانس کی طرح بجنا شروع ہو گئے۔ لاجو کی ماں اطمینان سے بیٹھ گئی۔ گھوڑے کی تھکی ہوئی ہنہناہٹ نے رات کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا اور ایک تانگہ لالٹین کے کھمبے کی بغل میں آ کھڑا ہوا۔ تانگے والا نیچے اترا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا...... چق اٹھی ہوئی تھی اور تخت پر ایک دھندلا سا سایہ بھی نظر آ رہا تھا۔

اپنے کھردرے کمبل کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر تانگے والے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ساڑھے تین روپے کا کریانہ تھا اس میں سے اس نے ایک روپیہ چار آنے اپنے پاس رکھ لیے اور باقی پیسے تانگے کی اگلی نشست کا گدا اٹھا کر اس کے نیچے چھپا دیے۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ کوٹھے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

لاجو کی ماں چند ہوشیاری اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔

مادھو تانگے والا اندر داخل ہو گیا اور دروازے کی زنجیر چڑھا کر اس نے چندو

سنیاری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

بھگوان جانتا ہے مجھے تم سے کتنا پریم ہے......اگر جوانی میں تجھ سے ملاقات ہو تو یاروں کا تانگہ گھوڑا ضرور بکتا یہ کہہ کر اس نے ایک روپیہ اس کی ہتھیلی میں دبا دیا۔

چندرو سنیاری نے پوچھا ''بس؟''

''یہ لے......اور'' مادھو نے چاندی کی چونی اس کی دوسری ہتھیلی پر جما دی۔ تیری جان کی قسم بس یہی کچھ تھا میرے پاس''۔

رات کی سردی میں گھوڑا بازار میں کھڑا ہنہناتا رہا۔ لالٹین کا کھمبا ویسے ہی اونگھتا رہا۔

سامنے ٹوٹے ہوئے پلنگ پر مادھو بے ہوش لیٹا تھا۔ اس کی بغل میں چندرو سنیاری آنکھیں کھولے پڑی تھی اور پگھلے ہوئے موم کے ان قطروں کو دیکھ رہی تھی جو گیلے فرش پر گر کر چھوٹے چھوٹے دانوں کی صورت میں جم رہے تھے۔ وہ ایکا ایکی دیوانہ وار اٹھی اور لاجو کی کھٹیا کے پاس بیٹھ گئی۔ ننھی لاجو کے سینے پر موم کے دانے دھڑک رہے تھے۔

چندرو سنیاری کی دھندلی آنکھوں کو ایسا معلوم ہوا کہ موم بتی کے ان جمے ہوئے قطروں میں اس کی ننھی لاجو کی جوانی کے آنسو کہیں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اس کا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا اور لاجو کے گلے سے وہ ہار جدا ہو گیا۔

پگھلے ہوئے موم پر سے موم بتی کا جلتا ہوا دھاگا پھسل کر نیچے فرش پر گرا اور اس کی آغوش میں سو گیا......کمرے میں خاموشی کے علاوہ اندھیرا بھی چھا گیا۔

☆☆☆

موچنا

نام اس کا مایا تھا۔ ناٹے قد کی عورت تھی۔ چہرہ بالوں سے بھرا ہوا تھا بالائی لب پر تو بال ایسے تھے کہ جیسے آپ کی اور میری مونچھوں کے۔ ماتھا بہت تنگ تھا وہ بھی بالوں سے بھرا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو موچنے کی ضرورت اکثر پیش آتی تھی۔

وہ راولپنڈی کیا یک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس سے قطع تعلق کیے اسے ایک زمانہ گزر چکا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہیں اس کی شادی ہوئی۔ جب اس کی عمر سولہ برس کے قریب تھی۔ دو برس ہونے کو آئے تو اس کے خاوند کو اس پر شک گزرا کہ مایا کا چال چلن خراب ہے۔ محلے کے وہ ایک نہیں تین آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھی۔

اس تگڈے عشق کے دوران مین مایا کو احساس ہوا کہ اس کا ماتھا تنگ ہے۔ اس کے بالائی لب اور تھوڑی پر بال ہیں جو بڑے بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ چناچنہ اس نے ایک موچنا خرید لیا اور ان غیر ضروری بدنما بالوں کا صفایا کر دیا۔ لیکن وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دفعہ بال نوچنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ان سے نجات حاصل کر لے گی۔ اس کو موچنے سے ماتھے ٹھوڑی اور بالائی لب کے بال اکھیڑنے میں بڑی محنت کرنا پڑتی تھی۔ ایک ایک کر کے ہر بال کو موچنے کی گرفت میں لینا اور پھر اسے ایک ہی جھٹکے سے باہر نکالنا بہت مشکل کرم تھا۔ مگر مایا دھن کی پکی تھی۔ یہ کام گو خود اس کے اپنے ہاتھ کر رہے تھے لیکن

اس کے باوجود وہ درد کے مارے بلبلا اٹھتی تھی۔

جب سارا میدان صاف ہو گیا تو اس نے اطمینان کا بہت لمبا سانس لیا...... مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ کمبخت دوسرے ہی روز پھر نمودار ہو جائیں گے...... چنانچہ جب انہوں نے اس کے چہرے کی جلد سے اپنا سر نکالا تو ماما سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہر چوتھے پانچویں روز اپنے غیر ضروری بالوں کا صفائی کیا کرے...... آہستہ آہستہ موچنا اس کی زندگی کا اہم ترین جزو بن گیا۔ وہ جہاں بھی جاتی موچنا اس کے ساتھ ہوتا...... لیکن اس کے استعمال میں اسے ان دنوں سخت دقت محسوس ہوتی جب کہ وہ کسی دوسرے کے گھر پر ہوتی۔ اپنے گھر پر بھی اسے سب سے نظریں بچا کر کسی ایسی جگہ بال نوچنے پڑتے تھے جہاں کسی کے گزر کا امکان نہ ہو۔ پھر بھی کوئی پتا کھڑکتا تھا تو وہ بھڑک اٹھتی تھی جیسے کوئی بہت بڑا گناہ کر رہی ہے۔

"منٹو صاحب میں اب سوچتا ہوں کہ اس سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا تھا جو خدا نے اس کے مونچھیں اور ڈاڑھی اگا دی تھی۔ اس کا ماتھا اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ اس کی گھنی بھوؤں کے ساتھ آگے مل گیا تھا۔ اس کے سارے بدن پر بھی بال ہی بال تھے۔ معلوم نہیں کیوں...... بال...... روئیں نہیں...... اچھے تگڑے بال...... سیاہ۔ آپ یقیناً کہیے گا کہ پھر اس میں ایسی کون سی جاذبیت تھی کہ تم اس پر لٹو ہو گئے اور بہت دیر تک لٹو رہے۔ سو عرض ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا"۔

میں نے شکیل کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"آپ اتنے بڑے شاعر ہیں جب وہ آپ کے پاس تھی تو آپ نے بڑی

خوبصورت غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ جن مایا کا پرتو لفظ لفظ میں ملتا ہے۔ جب وہ چلی گئی تو آپ نے پھر بڑی زہریلی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ ان میں بھی مایا کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ آپ کا اس پر لٹو ہونے کا باعث کیا تھا؟"

شکیل نے ماتھے کا پسینہ پنسل سے ایک طرف ہٹا کر صاف کیا۔

"مایا ......صرف مایا......اور...... مایا کیا تھی...... یہ خدا کی قسم میں نہیں جان سکا۔ میری شاعری پر لعنت بھیجیے کیونکہ وہ محض جذباتی تھی...... اس میں بھی وہی مایا کارفرما تھی۔ جس پر میں بظاہر بے وجہ لٹو ہوا تھا...... لیکن......" شکیل ایک لمحے کے لیے مناسب و موزوں الفاظ تلاش کرنے کے لیے رک گیا۔

"وہ بستر کی بہترین رفیق تھی"۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شکیل کا یہ بیان بہت حد تک درست تھا۔ مایا ایک پنچی ہوئی مرغی تھی۔ اس کے مقابلے میں شکیل کی سہرے جلووں کی بیاہی ہوئی عورت پٹھانی حسن کا بہترین نمونہ تھی...... گو وہ بچوں کی ماں مگر شاید وہ بستر کی اچھی رفیق نہیں تھی۔

مایا شادی شدہ تھی مگر اولاد سے محروم۔ اس کے راولپنڈی میں کئی سلسلے ہو چکے تھے۔ مگر ان سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا...... اس کے ماتھے اس کے بالائی لب اور اس کی ٹھوڈی کے بال بڑھتے جا رہے تھے اور موچنے کے کام میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ راولپنڈی میں جب اس نے کھیل کھیلنا شروع کیا تو اس کا خاوند جو کہ ایک شریف آدمی تھا متوسط درجے کا دکاندار غربت کا

مالک اور رہٹ کا پکا تو اس نے ایک دن مایا کو گھر سے باہر نکال دیا۔ مایا نے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ البتہ دوسرے دن میکے سے اپنے شوہر کو خط لکھا کہ وہ مہربانی کر کے اس کا موچنا بھیج دے۔

اس کے شوہر گنڈا سنگھ نے بصد مشکل موچنا تلاش کیا اور آئینہ سمیت مایا کو بھجوایا۔ مایا کے زیور وغیرہ جو اس کے پاس رہتے تھے اسی کے پاس رہے۔ مایا نے ان کا مطالبہ بھی نہ کیا۔

اس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ ایک مسلمان گھڑی ساز کیساتھ رہنے لگی۔ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ ایک برس کے اندر اندر اس نے مایا کو کئی زیور بنوا دیے۔ ایک گھڑی جو کسی گاہک کی تھی اس کی کلائی پر باندھ دی۔ یہ بیش قیمت گھڑی تھی۔ جب گاہک نے اس کا مطالبہ کیا تو صاف مکر گیا...... اس نے یہ کہا آپ کو صریحاً غلطی ہوئی ہے یہ شہاب الدین کی دکان ہے۔

وہ عورت جس کی یہ گھڑی تھی کوئی شریف عورت تھی۔ یہ سن کر خاموش ہو کر چلی گئی۔ شہاب الدین باوجود اس کے کہ اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا زبردستی خوش ہونے کی کوشش کرتا۔ جب گھر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مایا دیوی جس کا اسلامی نام اس نے حسب توفیق اور بقدر جذبات صغریٰ رکھا ہوا تھا پڑوس کے گھر میں ہے جو شہر کا چھٹا ہوا بد معاش تھا۔

اب شہاب الدین گھڑی ساز کے گھر سے مایا کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ پڑوس میں امین پڑنگ کے یہاں چلی گئی معمولی سا جھگڑا ہوا۔ مایا کے سارے کپڑے وہیں

پڑے رہے لیکن وہ اپنا موچنا ساتھ لیتی گئی۔

امین پڑنگ بڑا نہنگ قسم کا آدمی تھا۔ اس نے مایا سے صاف صاف کہہ دیا ''دیکھو اگر تم نے پھر کوئی ایسا ویسا معاملہ کیا تو یاد رکھو تمہاری گردن چاقو سے کاٹ ڈالوں گا۔

وہ ہر وقت اپنی جیب میں ایک بڑا خوفناک کمانی والا چاقو رکھتا تھا۔ مگر مایا اس سے بالکل خائف نہ ہوتی۔ امین پڑنگ کا ایک نوجوان لڑکا یوسف تھا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے اس نوجوان کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ امین کام پر جاتا تو یوسف کالج سے غیر حاضر ہو کر وہاں پہنچ جاتا...... آخر ایک روز بھانڈا پھوٹ گیا۔ باپ بیٹے کی مڈبھیڑ ہوئی۔ قریب تھا کہ وہ اس کے پیٹ میں اپنی کمانی والا چاقو بھونک کر اس کا خاتمہ کر دے کہ مایا نے حکمت عملی سے کام لے کر بیچ بچاؤ کرا دیا اور تین کپڑوں میں وہاں سے نکل گئی۔

سنا ہے کہ امین پڑنگ اس کے جانے کے بعد بہت دیر مغموم رہا...... دو ہفتوں میں وہ ہر وقت اس کی باتیں کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مایا سے اس کی اتفاقی ملاقات ہو جاتی تو اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ کپڑے رنگنے چھوڑ کر وہ سارا دن وارث شاہ کی ''ہیر'' سنا کرتا تھا۔

مجھے صرف یہاں تک مایا کے متعلق معلوم تھا۔ چنانچہ مزید معلومات کے لیے میں نے شکیل سے جو کہ اپنی داستان بیان کر رہا تھا پوچھا۔

''امین پڑنگ کے بعد وہ کس کے پاس گئی؟''

شکیل نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا ''ہزاروں کے پاس...... لاری

ڈرائیور ہربنس سنگھ کے پاس سینما اپریٹر مکندلال کے پاس...... دیال سنگھ کالج کے ایک پروفیسر کے پاس...... سٹار بیکری کے مالک حسین بخش کے پاس...... ایکسٹرا سپلائر غلام محمد کے پاس‘‘۔

شکیل کے ہونٹوں پر ابھی تک وہ زہر موجود تھا ’’ایک برس میں...... جو کہ اس نیک بخت کے لیے بہت بڑا عرصہ تھا...... اور‘‘ اس نے میری طرف بری معنی خیز نظروں سے دیکھا جو کہ زخم خوردہ تھیں ’’آپ کو معلوم ہے کہ ہر مرتبہ اپنے نئے یار سے جدا ہونے کے بعد اس نے ایک رقعہ لکھا جس میں یہ درخواست تھی کہ اس کا موچنا اس کو بھیج دیا جائے‘‘۔

میں کباب ہو گیا...... موچنے میں آخر ایسی کون سی بات تھی کہ مایا اور تمام چیزیں چھوڑ کر صرف اسی کی واپسی کی درخواست کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے شکیل سے پوچھا۔

’’یہ موچنا سونے کا تھا...... جڑاؤ تھا؟‘‘

شکیل مسکرایا ’’جی نہیں...... معمولی لوہے کا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی قیمت چار آنے ہو گی۔ مگر وہ اس کا دائمی رفیق بن گیا تھا۔ کم بخت نے کسی مرد کو دائمی رفیق نہیں بنایا تھا۔ مگر یہ موچنا اس کا جیون ساتھی تھا‘‘۔

امین پڑنگ کو معلوم تھا کہ موچنا کہاں پڑا ہے۔ اس نے پہلے سوچا کہ گول کر دے اور لڑکے کے ایک دھول رسید کر کے رخصت کر دے...... یا اس کے سر پر استرا پھروا کر واپس بھیج دے کہ موچنے نے اتنا کام کیا ہے کہ وہ اب کسی کے کام کا نہیں رہا...... مگر پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے کارنس پر سے موچنا

اٹھایا……اس کے دانتوں سے مایا کی بھوؤں کے چند بال نکالے اور ایک طرف پھینک دیے۔امین پڑنگ باوجود اس کے بہت بڑا غنڈہ تھا موچنے کو دیکھ کر موم ہو گیا۔اور اس نے قاصد لڑکے کے سر منڈوانے کا خیال ترک کر دیا۔

مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ وہ امین پڑنگ کے بعد کس کے پاس گئی۔ لیکن شکیل نے مجھے فوراً ہی بتا دیا ''منٹو صاحب وہ ایک مرد کی عورت نہ تھی لیکن شاید یہ کہنا بھی درست نہیں۔وہ ایسی میل تھی جو ہر اسٹیشن پر کوئلہ پانی چاہتی ہے…… امین کے بعد وہ اسسٹنٹ فلم ڈائریکٹر ہربنس سنگھ کے پاس تین مہینے رہی۔پھر ساؤنڈ ریکارڈسٹ پی این آہوجہ کے پاس ایک ماہ اور چند دن……ایک کے بعد ……اس کے بعد''۔

میں نے پوچھا ''کس کے پاس''؟

شکیل نے شرما کر جواب دیا ''آپ کے اس خاکسار کے پاس جسے دارا شکوہ المعروف شکیل کہتے ہیں……لعنت ہو اس پر ہزار بار''۔

میں نے دریافت کیا ''آپ اس لعنت میں کیسے گرفتار ہوئے؟''

شکیل نے ٹھیٹ پشاوری لہجے میں کہا ''منٹو صاحب……وہ لعنت ایسی ہے کہ اس میں گرفتار ہوئے بنا کوئی نہیں رہ سکتا……آپ بڑے آہنی قسم کے مرد بنے پھرتے ہیں۔لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اسے دیکھتے تو یقیناً اپنی ساری افسانہ نگاری بھول جاتے……اگر نہ بھولتے تو قلم کے بجائے موچنے سے افسانے لکھتے۔یوں کہیے کہ آپ ادب کی مونچھوں کے بال اکھیڑنے میں ساری عمر صرف کر دیتے''۔

ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوتا کیونکہ میں بھی امین شکیل اور گنڈا سنگھ کی طرح ایک انسان ہوں لیکن میں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مونچھ میں کیا خصوصیت تھی کہ وہ مایا کی زندگی کے ساتھ ایسی بری طرح چپک گیا تھا۔

میں نے شکیل سے کہا ''تمارا اس کا سلسلہ کتنی دیر تک قائم رہا؟''

شکیل نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ سلگایا ''قریب قریب دو برس تک'' اور ...... وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا ''منٹو صاحب آپ یقین مانیے دنیا و مافیہا کو بھول گیا''۔

میں نے سوال کیا ''کیوں؟''

شکیل سوچنے لگا ...... ''کچھ کہہ نہیں سکتا شاید ...... شاید اس کی مونچھوں کے بال ...... جو مونچنے کے استعمال سے بڑے کھردرے ہو گئے تھے ...... وہ ...... وہ ...... بڑی حرارت پیدا کرتے تھے ...... اور اس کا جسم جو سر سے پیر تک بالوں سے بھرا ہوا تھا منٹو صاحب میں شاعر ہوں۔ میں نے ہمیشہ نرم اور چکنے بدن کی تعریف کی ہے جس پر سے آدمی پھسل پھسل جائے۔ مگر مایا کی دوستی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سب بکواس ہے سارا مزا اٹک اٹک جانے میں ہے ...... بس میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں''۔

میں سوچنے لگا۔ پھسل پھسل جانے اور اٹک اٹک جانے میں واقعی بہت بڑا نفسیاتی فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسے خود سمجھ سکتے ہیں ...... اگر نہیں سمجھ سکتے تو اس بکھیڑے میں نہ پڑیے۔

شکیل صاحب کی گفتگو کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مایا کو قریب قریب

بھول چکے ہیں مگر پھر بھی اس کی یاد تازہ رکھنا چاہتے ہیں میں نے ان سے کہا۔

''شکیل صاحب......دو برس تک آپ کا اور مایا کا سلسلہ رہا......''

شکیل نے میری بات کاٹ کر کہا ''جی ہاں......دو برس تک......''میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا......اپنے بچوں سے منہ موڑ لیا اور مایا کو سینے سے لگا لیا......لیکن دو برس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ بے وفا ہے......ریا کار ہے''۔

میں نے پوچھا ''یہ آپ نے کیسے جانا؟''

شکیل نے زہر آلود لہجے سے کہا ''جناب......وہ میرے ہمسایے شیخ اسماعیل گورنمنٹ کنٹریکٹر سے اپنا نیا سلسلہ قائم کر رہی تھی۔ مجھے اور کسی بات پر غصہ نہیں تھا منٹو صاحب لیکن وہ سالا پچاس برس کا بڈھا......سات جوان لڑکیوں کا باپ۔ دو بیویوں کا خاوند......لیکن حیرت اس سالی پر بھی ہے کہ اسے کیا سوجھی؟''

شکیل نے یہ کہہ کر سگریٹ سلگانے کی کوشش کی مگر اس سے سلگ نہ سکا۔ اس لیے کہ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لیا اور سلگا کر اس کو دیا ''وہ چلی گئی''۔

''جی ہاں میں نے اسے دھکے مار کر باہر نکال دیا''شکیل نے زور کا ایک کش لیا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے پنسل پکڑ کر ایک نئی نظم لکھنے کے لیے تیار ہونے لگا جو غالباً مایا کی یاد کے بارے میں ہونے والی تھی۔

''جی ہاں وہ چلی گئی......وہ اپنا سوچنا چھوڑ گئی''۔

میں نے پوچھا ''اس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا؟''

شکیل نے ایک اور کش لیا ''ایک نہیں سینکڑوں مرتبہ......لیکن میں نے اسے

واپس نہیں کیا...... اس لیے کہ ایک صرف یہی چیز ہے جو اس کے اور میرے درمیان رہ گئی ہے۔ جب تک یہ موچنا میرے پاس ہے وہ ہمیشہ مجھ سے خط و کتابت کرتی رہے گی''۔

☆☆☆

موسم کی شرارت

شام کو سیر کے لیے نکلا اور ٹہلتا ٹہلتا اس سڑک پر ہولیا جو کشمیر کی طرف جاتی ہے۔

سڑک کے چاروں طرف چیڑ اور دیودار کے درخت اونچی اونچی پہاڑیوں کے دامن میں کالے فیتے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے اس فیتے میں ایک کپکپاہٹ سی پیدا کر دیتے میرے دائیں ہاتھ کو ایک اونچا ٹیلا تھا۔ جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے نہایت ہی مدھم سرسراہٹ دے رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کر لوں تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ تصور کے گدگدے قالینوں پر کئی کنواریاں ریشمی ساڑھی پہنے چل رہی ہوں۔ ان ڈھلوانوں کے بہت اوپر چیڑ کے اونچے اونچے درختوں کا ایک ہجوم تھا۔ بائیں طرف سڑک کے نیچے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کو جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر پست قد جھونپڑے تھے جیسے کسی حسین چہرے پر تل۔

ہوا گیلی اور پہاڑی گھاس کی بھینی بھینی باس سے لدی ہوئی تھی۔ مجھے اس سیر میں ایک ناقابل بیان لذت محسوس ہو رہی تھی۔

سامنے ٹیلے پر دو بکریاں بڑے پیار سے ایک دوسری کو اپنے ننھے ننھے سینگوں سے ریل رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر کتے کا ایک پلا جو کہ جسامت میں میرے بوٹ کے برابر تھا۔ ایک بھاری بھرکم بھینس کی ٹانگ سے لپٹ لپٹ کر

اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شاید بھونکتا بھی تھا۔ کیونکہ اس کا منہ بار بار کھلتا تھا۔ مگر اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔

میں یہ تماشا دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ کتے کا پلا دیر تک بھینس کی ٹانگوں پر اپنے پنجے مارتا رہا۔ مگر اس کی ان دھمکیوں کا اثر نہ ہوا۔ جواب میں بھینس نے دو مرتبہ اپنی دم ہلا دی اور بس ...... لیکن ایکا ایکی جب کہ پلا حملے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا بھینس نے زور سے اپنی دم ہلائی۔ کسی سیاہ سی چیز کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ اس انداز سے اچھلا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

میں ان کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔

آسمان پر بادل کے سفید ٹکڑے پھیلے ہوئے بادبان معلوم ہوتے تھے۔ جن کو ہوا ادھر سے ادھر دھکیل رہی تھی۔ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قد آور درخت بڑے باوقار انداز میں سنتری کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے بادل کا ایک ٹکڑا جھوم رہا تھا۔ بادل یہ دراز قد درخت اور پہاڑی ...... تینوں مل کر بہت بڑے جہاز کا منظر پیش کر رہے تھے۔

میں نیچے کی تصویر کشی کو بے خود ہو کر دیکھ رہا تھا۔ کہ دفعتاً لاری کے ہارن نے مجھے چونکا دیا۔ خیالوں کی دنیا سے اتر کر میں آوازوں کی دنیا میں آ گیا۔ من کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مساموں کے کان کھل گئے۔ میں فوراً سڑک کے ایک طرف ہٹ گیا۔

لاری پرکار کی طرح بڑی تیزی سے موڑ کے نصف دائرے پر گھومی اور ہانپتی ہوئی میرے پاس سے گزر گئی۔

ایک اور لاری گزرنے پر موڑ کے عقب سے پانچ چھ کاریں نمودار ہوئیں جو سر لٹکائے ہولے ہولے چل رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جب یہ میرے آگے سے گزر گئیں تو میں نے قدم اٹھایا اور موڑ کی جانب بڑھا۔

چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر جب میں سڑک کے بائیں ہاتھ والے ٹیلے کے ایک بہت بڑے پتھر سے آگے نکل گیا۔ جو موڑ سنگین پردے کا کام دے کر سڑک کے دوسرے حصے کو بالکل اوجھل کیے ہوئے تھا تو میری نظریں ایک خود رو پودے سے دوچار ہوئیں۔

وہ جوان تھی اس گائے کی طرح جوان جس کے پٹھے جوانی کے جوش سے پھڑک رہے تھے اور جو اس کے پاس اپنے اندر ہزاروں کپکپاہٹیں لیکر گزر رہی تھی...... میں ٹھہر گیا۔

وہ ایک ننھے سے بچھڑے کو ہانک رہی تھی۔ دو تین قدم چل کر بچھڑا ٹھہر گیا اور ایسا جما کہ ہلنے کا نام نہ لیا۔ لڑکی نے بہتیرا زور لگایا لاکھ جتن کیے وہ ایک قدم آگے نہ بڑھا اور کان سمیٹ کر ایسا خاموش ہوا۔ گویا وہ کسی کی آواز ہی نہیں سنتا یہ تیور دیکھ کر لڑکی نے اپنی چھڑی سے کام لینا چاہا۔ مگر چیڑ کی پتلی سی ٹہنی کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ تھک ہار کر اس نے بڑی مایوسی اور انتہائی غصے کی ملی جلی حالت میں اپنے دونوں پاؤں زمین پر زور سے مارے اور کاندھوں کو جنبش دے کر اس انداز سے کھڑی ہوگئی گویا اس حیوان سے کہنا چاہتی ہو "لو اب ہم یہاں سے ایک انچ نہ ہلیں گے"۔

میں ابھی لڑکی کی اس پیاری حرکت کو مزا لینے کی خاطر اپنے ذہن میں دہرانے

ہی والا تھا کہ دفعتاً بچھڑا خود بخود اٹھ بھاگا۔ وہ اس تیزی سے دوڑ رہا تھا اس کی کمزور ٹانگیں میز کے ڈھیلے پایوں کی طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔

لڑکی بچھڑے کی اس شرارت پر بہت خشم ناک ہوئی۔ نہ جانے میں کیوں خوش ہوا کہ اسی اثنا میں اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اسکی طرف۔ ہم دونوں بیک وقت ہنس پڑے۔ فضا پر تاروں کا چھڑکاؤ سا ہو گیا۔

یہ سب کچھ ایک لمحے کے اندر اندر ہوا۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ مگر اس دفعہ سوال کرنے والی لال بھری آنکھوں سے...... شاید اس کو اب اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کسی غیر مرد کے تبسم سے جا ٹکرائی ہے۔

وہ گہرے سبز رنگ کا ڈوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کی ہریاول نے اپنی سبزی اسی سے مستعار لی ہے۔ اس کی شلوار بھی اسی رنگ کی تھی۔ اگر وہ کرتہ بھی اسی قسم کا پہنے ہوتی تو دور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ سڑک کے درمیان ایک چھوٹا سا درخت اگ رہا ہے۔

ہوا کے ملائم جھونکے اس کے سبز ڈوپٹے میں بڑی پیاری پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے خود کو بیکار کھڑی دیکھ کر اور مجھ کو اپنی طرف گھورتے پا کر وہ بے چین سی ہو گئی اور ادھر ادھر یونہی دیکھا کہ جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ پھر اپنے ڈوپٹے کو سنوار کر اس نے اس طرف کا رخ کیا جدھر گائیں آہستہ آہستہ جا رہی تھیں۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ پتھروں کے پاس کھڑا تھا۔ جو سڑک کے کنارے دیوار کی شکل میں چنے ہوئے تھے۔

جب وہ میرے قریب آئی تو غیر ارادی طور پر اس نے میری طرف نگاہیں

اٹھائیں لیکن فوراً سر کو جھٹک کر نیچے جھکا لیں۔ کولہے مٹکاتی اور چھڑی ہلاتی میرے پاس سے یوں گزری جیسے کبھی کبھی میرا خیال میرے ذہن سے اپنا کاندھا رگڑ کر گزر جایا کرتا ہے۔

اس کے سلیپر جو نا لباًاس کے پاؤں میں کھلے تھے۔ سڑک پر گھسٹنے سے شور پیدا کر رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر اس نے اپنے قدم تیز کیے اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ بیس پچیس گز کے فاصلے پر وہ پتھروں سے چنی ہوئی دیوار پر پھرتی سے چڑھی اور مجھے ایک نظر دیکھ کر دوسری طرف کود گئی۔ پھر دوڑ کر ایک جھونپڑے کی چھت پر چڑھ کر منڈیر پر بیٹھ گئی۔

اس کی یہ حرکات ......یعنی ......یعنی ......میری طرف اس کا تین بار مڑ مڑ کر دیکھنا......کیا اس کی مسکراہٹ کے ساتھ میرے تبسم کے کچھ ذرے تو چمٹ کر نہیں رہ گئے تھے؟‘‘

اس خیال نے میری نبض کی دھڑکن تیز کر دی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میرے پیچھے جھاڑیوں میں جنگل کے پنچھی گیت برسا رہے تھے......ہوا میں گھلی ہوئی موسیقی مجھے کس قدر پیاری معلوم ہوئی۔ نہ جانے میں کتنے گھونٹ اس راگ ملی ہوا کے غٹاغٹ پی گیا۔

جھونپڑے سے کچھ دور جھاڑیوں کے پاس لڑکی کی گائیں گھاس چر رہی تھیں۔ ان سے پرے پتھریلی پگڈنڈی پر ایک کشمیری مزدور گھاس کا گٹھا کمر پر لادے اوپر چڑھ رہا تھا دور......بہت دور ایک ٹیلے سے دھواں بل کھاتا ہوا آسمان کی نیلاہٹ میں گھل مل گیا رہا تھا۔ میرے گردوپیش پہاڑیوں کی بلندیوں پر بڑے بڑے

چیڑوں اور سانولے پتھروں کے چوڑے چکلے سینوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی زریں کرنیں سیاہ اور انھیرے رنگ کے مخلوط سایے بکھیر رہی تھیں۔ کتنا سندر سہانا سماں تھا۔

میں نے اپنے آپ کو ایک عظیم الشان محبت میں گھرا ہوا پایا۔

وہ جوان تھی۔ اس کی ناک اس پنسل کی طرح سیدھی اور ستواں تھی۔ جس سے میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ اس کی آنکھیں...... میں نے اس جیسی آنکھیں بہت کم دیکھی ہیں۔ اس پہاڑی علاقے کی ساری گہرائیاں ان میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزر رہی تھی تو دھوپ کی ایک لرزاں شعاع اس کی پلکوں میں الجھ گئی تھی۔

اس کا سینہ مضبوط اور کشادہ تھا۔ اس میں جوانی سانس لیتی تھی۔ کاندھے چوڑے باہیں گول اور گدراہٹ سے بھرپور کانوں میں چاندی کے لمبے لمبے بندے تھے۔ بال دیہاتیوں کی طرح سیدھی مانگ نکال کر گندھے ہوئے تھے جس سے اس کے چہرے پر وقار پیدا ہو گیا تھا۔

وہ جھونپڑے کی مٹیالی چھت پر بیٹھی اپنی چھڑی سے منڈیر کو کوٹ رہی تھی اور میں سڑک پر کھڑا تھا۔

''کس قدر بیوقوف ہوں'' دفعتاً میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے دل میں کہا ''اگر کوئی مجھے اس کو گھورتا ہوا دیکھ لے تو کیا کہے...... اس کے علاوہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟''

''یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟'' جب میں نے ان الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں

کسی اور ہی خیال میں تھا۔ اس احساس پر مجھے ہنسی آ گئی اور یونہی ایک بار اس کو اور دیکھ کر سڑک پر چلنے کے قصد سے آگے بڑھا۔ دو ہی قدم چل کر مجھے خیال آیا کہ یہاں بھوت میں مجھے صرف چند روز قیام کرنا ہے کیوں نہ رخصت ہوتے وقت اس کو سلام کرلوں۔ اس میں ہرج ہی کیا شاید میرے سلام کا ایک آدھ ذرہ اس کے حافظے پر ہمیشہ کے لیے جم جائے۔

میں ٹھہر گیا اور کچھ دیر منتظر رہنے کے بعد میں نے سچ مچ اس کو سلام کرنے کے لیے اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف بڑھا دیا۔ مگر فوراً ہی احمقانہ حرکت سے باخبر ہو کر ہاتھ کو یونہی ہوا میں ہلا دیا اور سیٹی بجاتے ہوئے قدم تیز کر دیے۔

مئی کا گرم دن شام کی خنکی میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔

سامنے پہاڑیوں پر ہلکا سا دھواں چھا گیا تھا۔ جیسے خوشی کے آنسو آنکھوں کے آگے ایک چادر سی تان دیتے ہیں۔ اس دھندلکے میں چیڑ کے درخت تحت شعور میں چھپے ہوئے خیالات معلوم ہوئے۔ یہ ایک ہی قطار میں پھیلتے چلے گئے تھے۔

میرے پاس ہی ایک جھاڑی پر موٹا سا کوا اپنے سیاہ اور چمکیلے پر پھیلائے سستا رہا تھا۔ ہوا کا ہر جھونکا میرے جسم کے ان حصوں کے ساتھ چھو کر جو کپڑوں سے آزاد تھے ایک ایسی محبت کا پیغام دے رہا تھا جس سے میرا دل اس سے قبل بالکل ناآشنا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر یہ کہنا چاہتا ہے ''سوچتے کیا ہو...... جاؤ محبت کرو''۔

میں سڑک کے کنارے پتھروں کی دیوار پر بیٹھ گیا اور اس...... اس کی طرف

ڈرتے ڈرتے دیکھا کہ مبادا کوئی رہگزر سارا معاملہ تاڑ جائے۔ وہ اسی طرح سر جھکائے اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔ اسے اس کھیل میں کیا لطف آتا ہے؟ وہ ابھی تھکی نہیں؟ کیا اس نے واقعی دوبار میری طرف مڑ کر دیکھا؟ کیا وہ جانتی ہے کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوں؟...... آخری سوال کس قدر مضحکہ خیز تھا...... میں جھینپ گیا لیکن اس کے باوجود اس کو دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔

ایک مرتبہ جب میں نے اس کو دیکھنے کے لیے گردن موڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا منہ میری طرف ہے اور وہ مجھے دیکھ رہی ہے...... میں مخمور ہو گیا۔

میرے اس کے درمیان گو فاصلہ کافی تھا مگر میری آنکھیں جن میں میرے دل کی بصارت بھی چلی آئی تھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ سپنوں کا گھونگھٹ کاڑھے میری طرف دیکھ رہی ہے...... میری طرف...... میری طرف۔

میرے سینے سے بے اختیار آہ نکل گئی...... عجیب بات ہے کہ سکھ اور چین کا ہاتھ بھی درد بھرے تاروں ہی پر پڑتا ہے...... اس آہ میں کتنی راحت تھی...... کتنا سکون تھا۔ اس لڑکی نے جو میرے سامنے جھونپڑے کی چھت پر بیٹھی تھی۔ میرے شباب کے ہر رنگ کو شوخ کر دیا تھا۔ میرے روئیں روئیں سے محبت پھوٹ رہی تھی۔ شعریت جو میرے سینے کے کسی نامعلوم کونے میں سوئی پڑی تھی اب بیدار ہو چکی تھی...... کیا دوشیزگی اور شعریت توام بہنیں ہیں؟

اگر اس وقت وہ مجھ سے ہم کلام ہوتی تو میں ایک لفظ تک اپنی زبان سے نہ نکالتا خاموشی میری ترجمان ہوتی...... میری گونگی زبان کتنی باتیں اس تک پہنچا دیتی۔ میں اس کو اپنی خاموشی میں لپیٹ لیتا...... وہ ضرور متحیر ہوتی اور اس حالت

میں بڑی پیاری معلوم ہوتی۔

اس خیال سے کہ راستے میں یوں بے کار کھڑے رہنا ٹھیک نہیں میں دیوار پر سے اٹھا...... میرے سامنے ٹیلے پر جانے کے لیے ایک پگڈنڈی تھی۔ اوپر ٹیلے کے کسی پتھر پر بیٹھ کر میں اس کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ درختوں کی جڑوں اور جھاڑیوں کا سہارا لے کر میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ راستے میں دو تین بار میرا پاؤں پھسلا اور نوکیلے پتھروں پر گرتے گرتے بچا۔

ٹیلے پر جہاں پتھر نہیں تھے کہیں کہیں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں آلو بوئے ہوئے تھے۔ اسی قسم کے ایک ننھے سے کھیت کو طے کر کے میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ میرے دائیں ہاتھ کو زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ جس میں گندم اگ رہی تھی۔

چڑھائی کی وجہ سے میرا دم پھول گیا۔ مگر شام کی ٹھنڈی ہوا نے یہ تکان فوراً ہی دور کر دی اور میں جس کام کے لیے آیا تھا مشغول ہو گیا۔

اب وہ جھونپڑے کی چھت پر کھڑی تھی اور خدا معلوم کیسی کیسی آوازیں نکال رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان دونوں بکریوں کو سڑک پر چڑھنے سے روک رہی تھی جو گھاس چرتی ہوئی آہستہ آہستہ اوپر کا رخ کر رہی تھیں۔

ہوا تیز تھی۔ گندم کے پکے ہوئے خوشے خر خر کرتی ہوئی بلی کی مونچھوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ہوا کی سیٹیاں شام کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

مٹی لے ڈھیلوں کے ساتھ کھیلتا ہوا میں اس کی طرف بہت دیر تک دیکھتا رہا

وہ اب جھونپڑے کی چھت پر بڑے عجیب انداز سے ٹہل رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے سر کو جنبش دی تو میں سمجھا کہ وہ میری موجودگی سے باخبر ہے...... مجھے دیکھ رہی ہے...... میری ہستی کے سارے دروازے کھل گئے۔

جانے کتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا...... ایکا ایکی بدلیاں گھر آئیں اور بارش شروع ہو گئی۔ میرے کپڑے بھیگ رہے تھے۔ لیکن میں وہاں سے کیونکہ جا سکتا تھا جبکہ وہ...... وہیں چھت پر کھڑی تھی۔ اس خیال سے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ وہ صرف میری خاطر بارش میں بھیگ رہی ہے۔

یکا یک بارش تیز ہو گئی وہ اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر...... ہاں میری طرف نگاہ اٹھائے بغیر چھت پر سے نیچے اتری اور دوسرے جھونپڑے میں داخل ہو گئی...... مجھے ایسا افسوس ہوا کہ بارش کی بوندیں میری ہڈیوں تک پہنچ گئیں۔

پانی سے بچاؤ کے لیے میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ مگر پتھر اور جھاڑیاں پناہ کا کام نہیں دے سکتی تھیں۔

ڈاک بنگلے تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے اور خیالات سب بھیگ گئے......

جب وہاں سے سیر کو نکلا تو ایک خشک آدمی تھا۔ راستے میں موسم نے شاعر بنا دیا واپس آیا تو بھیگا ہوا آدمی...... صرف بھیگا ہوا آدمی...... بارش ساری شاعری بہا کر لے گئی تھی۔

☆☆☆

میرا اور اس کا انتقام

گھر میں میرے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا پتا جی کچہری میں تھے اور شام سے پہلے کبھی گھر آنے کے عادی نہ تھے۔ ماتا جی لاہور میں تھیں اور بملا میری بہن اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب لیے اونگھ رہا تھا کہ صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ پاربتی ہے۔

دروازے کی دلہیز پر کھڑے کھڑے اس نے مجھ سے پوچھا ''موہن صاحب! بملا اندر ہے کیا؟''

جواب دینے سے بیشتر ایک لمحے کے لیے پاربتی کی تمام شوخیاں میری نگاہوں میں پھر گئیں اور جب میں نے سوچا کہ گھر میں کوئی متنفس موجود نہیں ہے تو مجھے ایک شرارت سوجھی میں نے جھوٹ بولتے ہوئے بڑی بے پروائی کے انداز سے کہا۔

''اپنے کمرے میں بلاؤز ٹانک رہی ہے''۔

یہ کہہ کر میں دروازے سے باہر گلی میں نکل آیا۔ بملا کا کمرہ بالائی منزل پر تھا جب میں نے گلی کے روشندان سے پاربتی کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو جھٹ سے دروازے میں داخل ہو کر اس کو بند کر دیا اور کنڈی چڑھا کر وہ قفل لگا دیا جو پاس ہی دیوار پر ایک کیل سے لٹک رہا تھا۔ دروازے پر تالا لگانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور صوفے پر لیٹ کر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا رہا۔

پاربتی کے کردار کا ہلکا سا نقشہ یوں کھینچا جا سکتا ہے۔

وہ بیک وقت ایک شوخ چنچل اور شرمیلی لڑکی تھی۔ اگر اس گھڑی آپ سے بڑی بے تکلفی سے بات کر رہی ہے تو تھوڑے ہی عرصے میں آپ اسے بہت مختلف پائیں گے۔ شرارت اس کی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن بعض اوقات اتنی سنجیدہ اور متین ہو جاتی ہے کہ اس سے بات کرنے کی جرات نہیں ہو سکتی۔ محلے بھر میں وہ اپنی قسم کی واحد دلڑکی ہے۔ لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں اسے خاص لطف آتا ہے اگر کوئی لڑکا جواب میں معمولی سا بھی مذاق کر دے تو اسے سخت ناگوار گزرتا ہے۔ گلی کے نوجوان کے نازک جذبات سے کھیلنے میں اسے خاص لطف آتا ہے۔ بلی کی طرح وہ چاہتی ہے کہ چوہا اس کے پنجوں کے نیچے دبکا رہے اور وہ اس کو ادھر ادھر پٹخ کر کھیلتی رہے۔ جب اکتا جائے تو چھوڑ کر چلی جائے۔ کوٹھے پر چڑھ کر محلے کے لڑکوں کے پتنگ توڑنے میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔

ہمارے گھر میں اکثر آتا جاتا تھا۔ اس لیے میں اس کی شوخ طبیعت سے ایک حد تک واقف تھا۔ میرے ساتھ وہ کئی مرتبہ نوک جھونک کر چکی تھی مگر میں دوسروں کی موجودگی میں جھینپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت نہ تھی۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شے بھی ایسی نہ تھی جس سے نفرت کی جا سکے۔ البتہ اس کی طبیعت کسی قدر الجھی ہوئی تھی اور اس کی حد سے زیادہ شوخی بعض اوقات میرے جذبات پر بہت گراں گزرتی تھی۔ اگر میں سب کے سامنے اس کی پھلجھڑی ایسی زبان کو جس سے کبھی تیز و تند اور کبھی نرم و نازک شرارے نکلتے تھے اپنی گویائی کی قوت پر زور دے کر بند کر سکتا تو مجھے یہ شکایت ہرگز نہ ہوتی بلکہ اس میں خاص لطف بھی حاصل ہوتا

مگر یہاں موجودہ نظام کی موجودگی میں اس قسم کے خواب کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔

پاربتی کے متناسب جسم میں جملہ خوبیاں بھری پڑی تھیں۔دوشیزگی اس کے ہر عضو میں سانس لیتی تھی۔آنکھوں میں دھوپ اور بارش کے تصادم ایسی چمک گدرائے ہوئے جوبن کا دلکش ابھار آواز میں صبح کی خاموش فضا میں مندر کی گھنٹیوں کی صدا ایسی حلاوت اور چال ...... ایسے الفاظ نہیں کہ ان کے خرام کا نقشہ پیش کیا جا سکے۔

گھر خالی تھا دوسرے لفظوں میں میدان صاف تھا۔اس لیے میں نے موقع بہت مناسب خیال کیا اور اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔میری عرصے کی خواہش تھی کہ اس پھسل جانے والی مچھلی کو ایک بار پکڑ کر اتنا ستاؤں اتنا ستاؤں کہ رو دے اور کچھ عرصے کے لیے اپنی تمام شوخیاں بھول جائے۔

میں کمرے میں بیٹھا ہوا تھا وہ حسب توقع گھبرائی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔

''دروازے میں تالا لگا ہوا ہے''۔

میں بناوٹی حیرت سے مضطرب ہو کر یکا یک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا کہا؟''

''صدر دروازے پر تالا لگا ہوا ہے''۔

''باہر گلی سے ان گندے لونڈوں نے تالا لگا دیا ہو گا''۔

یہ کہتا ہوا میں اسکے پاس آ گیا۔

اس پر پاربتی نے کہا ''نہیں نہیں تالا تو اندر سے لگا ہوا ہے''۔

''اندر سے؟ اور بملا کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں تو نہیں ہے کونے کونے میں دیکھ آئی ہوں۔ کہیں بھی نہیں ملی''۔

''تو پھر اسی نے یہ شرارت کی ہے۔ جاؤ دیکھو باورچی خانے غسل خانے میں یا ادھر ادھر کہیں بھی چھپی ہوگی تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا''۔

یہ کہہ کر میں واپس مڑ کر صوفے پر لیٹ گیا اور وہ بملا کو ڈھونڈنے چلی گئی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد پھر آئی اور کہنے لگی۔

''میں نے تمام گھر چھان مارا ہے پر ماتما جانے کہاں چھپی ہے آج میرے ساتھ اس نے اس قسم کی شرارت نہیں کی لیکن آج جانے اسے کیا سوجھی ہے؟''

پاربتی صوفے کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی بات سنی اور پاس پڑے ہوئے اخبار کے اوراق کھولتے ہوئے کہا۔

''مجھے خود تعجب ہو رہا ہے۔ صحن کے ساتھ والے کمرے میں جا کر تلاش کرو۔ وہیں کسی پلنگ کے نیچے چھپی بیٹھی ہوگی''۔

یہ سن کر پاربتی یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

''اسے میری شرارتوں کا علم نہیں خیر سو سنار کی ایک لوہار کی''۔

اس کو مضطرب دیکھ کر میرا جی باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس تیتری کو اپنی ہوشیاری پر کتنا ناز تھا میں ہنسا اس لیے کہ اس کے پھڑپھڑانے والے پر میری گرفت میں تھے اور میں بڑے مزے سے اس اضطراب کا تماشا کر سکتا تھا۔

میں اپنے ذہن میں اس ہونے والے ڈرامے کا تمام پلاٹ تیار کر چکا تھا اور

اس پر عمل کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئی۔ اس مرتبہ سخت جھلائی ہوئی تھی داہنے کان سے بہت نیچے بالوں کا ایک گچھا کلپ کی گرفت سے آزاد ہو کر ڈھلک آیا تھا۔ ساڑھی سر پر سے اتر گئی تھی اور وہ بار بار اپنے گرد بھرے ہاتھوں کو ایک ننھے رومال سے پونچھ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے اس سے لیٹے لیٹے دریافت کیا ''کیوں کامیابی ہوئی کیا!''

اس نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا ''نہیں میں اب یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی ہوں''۔

''ہاں بیٹھو میں ذرا اوپر ہو آؤں''۔

یہ کہہ کر میں اٹھا اور اوپر چلا آیا۔

بالائی منزل کی چھت پر میں پندرہ بیس منٹ تک ٹہلتا رہا۔ چابی میری جیب میں تھی۔ اس لیے مجھے معلوم تھا کہ پاربتی کسی صورت میں بھی گھر سے باہر نہیں جا سکتی اور یہ احساس میرے دل میں ایک ناقابل بیان مسرت پیدا کر رہا تھا۔ میدان بالکل صاف تھا اور میں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ پاربتی کی دوسروں پر ہنسنے والی آنکھوں کی چمک ایک لمحے کے لیے ماند پڑ جائے اور اس کو معلوم ہو جائے کہ مرد کے پاس نسوانی شرارتوں کا بہت کڑا جواب موجود ہے۔

یہ کھیل بہت خطرناک تھا کیونکہ اس بات کا ڈر تھا کہ وہ پتا جی ماتا جی یا بملا کو تمام بیتے ہوئے واقعات سنا دے گی۔ اس صورت میں گھر والوں کی نگاہوں میں میرے وقار کی تذلیل یقینی تھی۔ مگر چونکہ میرے سر پر اس دلچسپ انتقام کا بھوت

سوار تھا جو میں نے اس شوخ لڑکی کے لیے تجویز کیا تھا۔ اس لیے کچھ عرصے کے لیے یہ تمام چیزیں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں اپنے دل سے سوال کرتا تھا کہ کیا نتیجہ ہوگا لیکن اس کا جواب میری پوزیشن کی صحیح تصویر دکھانے کی بجائے شکست خوردہ پاربتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا تھا۔ میں بے حد مسرور تھا۔

کچھ عرصہ بالائی منزل پر ٹہلنے کے بعد میں نیچے آیا۔ پاربتی کرسی پر بیٹھی سخت اضطراب کی حالت میں اپنی خوبصورت ٹانگ ہلا رہی تھی جس پر ریشمی ساڑھی کا کپڑا ادھر ادھر تھرک رہا تھا۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس سے پوچھا ''کیوں بملا ملی''۔

''نہیں'' میں نے ایک بار پھر سب کمروں کو چھان مارا ہے لیکن وہ ایسی غائب ہوئی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ''۔

میں مسکرایا ''چلو ہم دونوں مل کر اس کو ڈھونڈیں تم اس گھبرا گئی ہو تم تو بڑی نڈر اور بے باک لڑکی ہو''۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں لیکن مجھے بہت جلد گھر واپس جانا تھا'' پاربتی کے لبوں پر ایک نہایت ہی پیارا تبسم پیدا ہوا۔

ہم دونوں ایک عرصے تک نیچے صحن میں پلنگوں کے نیچے چارپائیوں کے پیچھے میزوں کے ادھر ادھر پردوں وہٹا ہٹا کر بملا کر تلاش کرتے رہے مگر وہ گھر پر ہوتی تو ملتی۔ آخر کار میں نے خود کو سخت متعجب ظاہر کرتے ہوئے پاربتی سے کہا ''خیریت ہے تم ہی بتاؤ آخر بملا گئی کہاں؟''

پاربتی جو بار بار جھکنے اٹھنے اور بیٹھنے سے بہت تھک گئی تھی اپنی پیشانی سے پسینہ کے ننھے ننھے قطروں کو پونچھتی ہوئی بولی!

''میں کیا جانوں زمین کھا گئی یا بھوت پریت اٹھا کر لے گئے۔ یہ آپ ہی کی بہن کی کارستانی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں بھی ایسا ستاؤں گی کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔ بملا ہزار ہو مجھ سے اڑ کر کہاں جائے گی''۔

میں خاموش رہا اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت ہم ماتا جی کے کمرے میں تھے۔ پاربتی میرے سامنے ٹائیلٹ میز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ قطعی طور پر خالی الذہن ہے۔ غیر ارادی طور پر وہ بار بار میز کے گول آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی اور ہاتھوں سے اپنی ساڑھی کی شکنیں درست کر رہی تھی۔ دفعتاً کمرے میں مکمل سکوت سے باخبر ہو کر وہ سخت مضطرب ہو گئی اور کہنے لگی۔

''موہن صاحب! مجھے گھر جانا ہے جتنا جلد جانا چاہتی ہوں اتنی دیر ہوتی جاتی ہے۔ بملا کے اب پر لگ گئے ہیں۔ شاید میرے ہاتھوں اس کی شامت آئی ہے''۔

''ہاں...... ہاں...... مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ جانیں اور وہ اس میں میرا کیا قصور ہے اور اگر آپ کو سچ مچ جلدی جانا ہے تو کہیے میں آپ کی کمر میں رسی باندھ کر چھت سے لٹکا دوں کہیے تو تالا توڑ دوں؟ اب آپ کی جو رائے ہو؟''

ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا اور جواب دیا ''مجبوری ہے تالہ توڑنا ہی پڑے گا''۔

لیکن میں نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا "تالا بہت بڑا ہے اور اس کو توڑنے کے لیے بہت سی دقتیں پیش آئیں گی۔ اس کے علاوہ ہتھوڑے کی چوٹوں کی آواز سن کر لوگ کیا کہیں گے؟"

یہ سن کر وہ سنجیدہ ہوگئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "لیکن مجھے گھر تو جانا ہی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ ہم کسی غیر کے گھر سیندھ تھوڑی لگا رہے ہیں۔ اپنے گھر کا تالا توڑ رہے ہیں۔ ہے ہے آج میں کس ساعت سے آئی تھی۔ اب کیا ہوگا میں کس طرح گھر جاؤں ہائے رام کس بلا میں پھنس گئی"۔

میر اوار خالی گیا۔ دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اس ماحول کی نزاکت سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے جس میں کہ وہ اس وقت موجود تھی۔ چنانچہ میں نے بات کو ذرا وضاحت سے بیان کیا "ماتا جی لاہور گئی ہیں اور پتا جی باہر ہیں اور بملا غائب ہے اس صورت میں......" میں یہ کہتے کہتے رک گیا اور پھر اس فقرے کو یوں پورا کر دیا "تالا توڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا"۔

اب کی دفعہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ پاربتی کے سپید چہرے پر ہلکی سی سرخی چھا گئی اور ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے گالوں پر گلاب کی پتیاں بکھر گئی ہیں ۔وہ اپنی ریشمی ساڑھی میں سمٹی کانپی اور تھرائی پارے کی طرح تڑپی اور کچھ کہتی کہتی خاموش ہوگئی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"تم خود سوچ سکتی ہو ویسے مجھے کوئی عذر نہیں"۔

وہ پیچ وتاب کھا کر رہ گئی۔ میں اس کو مضطرب دیکھ کر بہت مسرور ہو رہا تھا۔ کل کی چلبلی شوخ وشنگ اور طرار لڑکی جو بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی بجلی کی طرح

چمکا کرتی تھی آج دیے کی لو بن کر رہ گئی تھی جو میری پھونک کے رحم پر تھی۔

ساحل کے پتھروں سے ٹکرا کر پلٹتی ہوئی لہر کی طرح اس نے اپنے آپ میں نئی تازگی پیدا کر کے کہا۔

''میری تو جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ چبا چبا کر باتیں کیے جا رہے ہیں''۔

''کون سی بات؟''

''یہی یہی کہ لوگ کیا کہیں گے؟'' اس نے اپنے شرمیلے جذبات پر پوری قوت سے قابو پاتے ہوئے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور زیر لب گنگنانے لگا۔

''ماتا جی لاہور گئی ہیں۔ پتا جی گھر سے باہر ہیں اور بملا گم ہے''۔

''آپ کون سی نئی بات بتا رہے ہیں۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ بملا کہاں ہے؟''

''اوپر ہو گی اور کہاں''۔

''اوپر؟ اوپر کی خوب کہی میں اوپر چپہ چپہ ڈھونڈ آئی ہوں''۔

''تم اسے نیچے ڈھونڈتی ہو گی تو وہ دوسری سیڑھیوں سے اوپر چلی جاتی ہو گی جب تم اوپر جاتی ہو گی تو وہ نیچے آ جاتی ہو گی۔ یہ بات میرے ذہن میں آئی ہے اور''۔

''اس کا ایک علاج ہو سکتا ہے'' پاربتی نے داہنے گال پر انگلی سے ایک نہایت دلکش گڑھا بناتے ہوئے کہا ''میں اوپر جاتی ہوں اور آپ ایسا کیجیے کہ دوسری سیڑھیوں میں کھڑے ہو جائیے اور جونہی وہ نیچے اترے اسے پکڑ لیجیے''۔

میں نے اس تجویز کو سنا اور کہا ''لیکن شاید وہ اصل میں یہاں موجود ہی نہ ہو''۔

''ہاں ہو سکتا ہے......اس لیے اگر ہوتی تو مل نہ جاتی؟''

''کیا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں موجود نہ ہو تو پھر دروازے کو تالا کس نے لگایا ہے۔ یہ کہیں آپ کی شرارت تو نہیں سچ کہیے؟''

''مجھے کیا معلوم میرا خیال ہے کہ بھلا اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہو گی یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ صبح وہ اپنی ساڑھی استری کر رہی تھی''۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' پاربتی کی حیرت ہر لحظہ بڑھ رہی تھی ''اگر وہ کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے تو پھر تالا کس نے لگایا ہے یہ کیا شرارت ہے؟''

حیران ہونے کی کوئی بات نہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنی سہیلی ہی کے ہاں گئی ہے۔ اس لیے کہ جاتے وقت وہ سنتو کو ہمراہ لیتی گئی تھی۔ اب مجھے یاد آیا۔ باقی رہا میں تو آپ ہی بتائیے میں آپ کو کیوں قید کرنے لگا۔ پر اتنا ضرور کہوں گا بڑی دلچسپ مچھلی جال میں پھنسی ہے''۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں......تو پھر......تو پھر......یہ شرارت......'' وہ اپنے فقرے کو پورا نہ کر سکی۔

''ہاں یہ شرارت میں بھی تو کر سکتا ہوں'' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''یا آپ کا خیال ہے کہ میں اس کا اہل نہیں؟ شاید میں نے آپ سے کسی وقت کا بدلہ لیا ہو؟''

پاربتی کی حالت عجیب و غریب تھی بند بھاپ کی طرح وہ باہر نکلنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے میرے سینے پر

اصرار کرنا چاہتی ہے لیکن میں ایک کامیاب ایکٹر کی طرح اپنا پارٹ نبھا رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو نچاتے ہوئے دریافت کیا "لیکن شرارت کی وجہ؟"

"مجھے معلوم نہیں"۔

وہ خاموش ہو گئی پھر یکا یک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا کہنے لگی۔

"موہن صاحب! مجھے گھر جانا ہے"۔

"مجھے معلوم ہے پر یہ تو بتائیے کیا کسی نے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے؟"

"تو دروازہ کھول دیجیے"۔ یہ کہنے کے بعد اس نے کچھ سوچا اور کہا "لیکن آپ کس طرح کہہ رہے ہیں کہ تالا آپ نے لگایا ہے کیا بملا واقعی یہاں نہیں ہے"؟

"مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے اس لیے کہ میں خود اسے رام گلی میں چھوڑ کر آیا ہوں اور میں نے ان ہاتھوں سے قفل لگایا ہے" میری گفتگو کا انداز نہایت متین اور سنجیدہ تھا۔

"آپ نے قفل کیوں لگایا؟" پاربتی نے نہایت تیزی سے دریافت کیا "دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ یہ آپ کی کارستانی ہے"۔

"کیوں لگایا اس لیے کہ میں نے لگا دیا اور میں نے نہیں لگایا میرے ہاتھوں نے لگایا ہے"۔

"یہ بھی کوئی بات ہے؟"

میں کرسی پر سے اٹھا اور جمائی لے کر کہا "رات کو دیر تک باہر رہنے سے پوری نیند نہیں کر سکا میرا خیال ہے اب سونا چاہیے"۔

"چابی دے دیجیے پھر آپ سو سکتے ہیں ورنہ میں قیامت برپا کردوں گی"۔

پاربتی نے سخت اضطراب کی حالت میں اپنا ہاتھ چابی کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔

"چابی...... چابی"۔ میں نے اپنی قمیص میں ہاتھ ڈال کر کہا "مگر وہ تو گم ہوگئی نہ معلوم کینے اڑن چھو کر ڈالی اب کیا ہوگا"۔

یہ سن کر پاربتی خشم آلود ہو کر بولی "گم ہوگئی ہوگی یعنی آپ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ گم ہو جائے گی۔ موہن صاحب! دائیے ہاتھ سے چابی نکال دیجیے یہ شرارتیں جوان لڑکیوں سے اچھی معلوم نہیں ہوتیں ورنہ میرا نام پاربتی ہے پاربتی مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھیے گا"۔

"چابی واقعی گم ہے"۔ میں نے پہلی سی متانت کے ساتھ جواب دیا "اور تمہیں اس قدر تیز ہونے کی ضرورت نہیں بیکار تم مجھ پر اس قدر گرم ہو رہی ہو"۔

"چابی گم کہاں ہوئی مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو"۔ پاربتی اب ہوا سے لڑنا چاہتی تھی "آخر آپ کی جیب سے کوئی جنات لے گیا"۔

اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو کیا کرلوگی دروازہ بند ہے اور میں نے اسے گلی میں پھینک دیا ہے۔ لو اب صاف سنو میں نے دروازے کی دراز سے دیکھا کہ جب میں نے چابی گلی میں پھینکی تو کتے نے ہڈی سمجھ کر منہ میں دبوچ لی اور نگل گیا۔ اب وہ کتا ڈھونڈا جائے اس کا پیٹ چیرا جائے تب کہیں ملے"۔

یہ سن کر وہ جھلا گئی اور زیادہ تیز آواز میں کہا "آپ کو اس شرارت کا جواب دینا ہوگا"۔

''کیسے؟''

''یہ بعد میں معلوم ہوگا''۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا ''تو پھر یہ بعد کی بات ہے اس وقت دیکھا جائے گا۔اب ہمیں حال پر غور کرنا ہے اور کتے کے پیٹ میں کہیں کنجی گھل نہ گئی ہو''۔

وہ خاموش ہوگئی اور میں بھی چپ ہوگیا۔اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا ''دیکھیے مجھے نہ ستائیے ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا''۔

''میرے پاس چابی نہیں اس لیے مجبور ہوں ہاں البتہ شام کو دروازہ کھولا جا سکتا ہے اس لیے کہ شاید اس وقت تلاش کرنے پر مل جائے''۔

''اور میں اس وقت تک یہیں قید رہوں گی''۔

''نہیں تم بڑی خوشی سے صحن میں کمروں میں کوٹھوں پر جہاں چاہو کود سکتی ہو گا سکتی ہو مجھے کوئی عذر نہیں''۔

''پرماتما جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے''۔وہ میری گفتگو کے انداز پر سخت حیرت زدہ تھی۔

''میں اچھا بھلا ہوں لیکن کبھی کبھی تفریح بھی تو ہونی چاہیے۔کیا تم اس کی قائل نہیں ہو کیا تم کبھی ایسا تفریح مذاق نہیں کرتیں''۔

''مجھے گھر جانا چاہیے موہن صاحب'' اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔

''تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو تمہیں گھر جانا چاہیے۔گھر گیا پانی سے بھر اور اس میں بڑے بڑے کچھوؤں کا ڈر؟ لیکن بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''چابی دے دیجیے بہت ستا چکے اب نہ ستایئے''۔

''دیوی جی مجھے افسوس ہے کہ وہ کمبخت ناشدنی گم ہوگئی ہے''۔

''گم ہوگئی ہے گم ہوگئی ہے آپ نے یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے آپ چابی کیوں نہیں دیتے؟''

''میرے پاس نہیں ہے سرکار کتے کے پیٹ میں ہے''۔

''موہن صاحب لڑکیوں سے اس طرح کا مذاق روا نہیں ہے کتے کا پیٹ آپ کی جیب میں ہے''۔

''اچھا تو یونہی ہوگا''۔

''یونہی کیا ہوگا چابی لائیے میں جانا چاہتی ہوں''۔

''میں ایک بار نہیں سو بار کہہ چکا ہوں کہ چابی میرے پاس نہیں ہے نہیں ہے نہیں ہے''۔

''چابی آپ کے پاس ہے آپ کے پاس ہے''۔

''میرے پاس نہیں نہیں نہیں ہے''۔

''نہیں آپ ہی کے پاس ہے ہے اس نے ہے کو سو مرتبہ دہراتے ہوئے کہا''۔

''اچھا نہیں تھی تو ہے''۔

''تو لایئے جیب سے نکالیے''۔

''میں نہیں دوں گا''۔

''آپ کو دینا پڑے گی''۔

''کوئی زور ہے؟''

''میں چلانا شروع کر دوں گی'' اس نے مجھ پر رعب گانٹھا۔

''بصد شوق!'' میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ''مگر تم کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ناحق اپنا گلا پھاڑو حلق تھکاؤ گی کچھ بھی نہ ہوگا روپیٹ کے دیکھ لو۔ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ اس کمرے میں کوئی روشن دان نہیں ہے۔ دروازوں پر جتنے پردے لٹک رہے ہیں۔ سب کے سب دبیز ہیں مجھے بچپن ہی میں اس کا کئی مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے کہ یہاں سے بلند آواز بھی باہر نہیں جا سکتی۔ میں اس مار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے زور زور سے چلایا کرتا تھا کہ پتا جی میری آواز سن لیں گے مگر بے سود تم بیکار چلاؤ گی''۔

پاربتی میری بات سن کر ہارے ہوئے انسان کی طرح کہا ''لیکن آپ چابی نہیں دیں گے؟''

''مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نہیں''۔

''کیوں؟ اس کا سبب؟''

''پھر وہی مہمل سوال''

''آپ کا مذاق حد سے زیادہ بڑھ رہا ہے''۔ اس نے اپنی ساڑھی کے گرتے ہوئے پلو کو سنبھالتے ہوئے کہا ''میں یہ سب معاملہ حرف بحرف جیسے کا تیسا بملا کو سنا دوں گی''۔

''بڑے شوق سے میں آج شام کو دہلی جا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بملا بے چاری بھی کیا کر سکے گی؟''

''وہ آپ کے پتا جی سے شکایت کرے گی''۔

''میری ایک خشم آلود جھڑکی اس کی زبان بند کرنے کے لیے کافی ہو گی''۔

''تو میں خود ان سے سب کچھ کہہ دوں گی''۔

''جو دل میں آئے کہہ لینا اس وقت اس کے اظہار کی ضرورت نہیں''۔

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر دل میں بہت ڈرا پتا جی گو نرم دل تھے مگر اس قسم کی شرارت کا حال سن کر ان کا رنجیدہ ہونا لازم تھا۔ بہر حال میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس پارجتی نے ان سے کہہ دیا تو میں سر جھکا کر ان کی لعن طعن سن لوں گا۔ دراصل میں کسی قیمت پر بھی اس ادھر ادھر کی چیزیں کتر کر جھٹ سے اپنے بل میں گھس جانے والی چوہیا کو اپنے دام انتقام سے باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ میرے فرض سے آگاہ کرنے کی خاطر بولی ''آپ کو معلوم ہونا چاہیے مجھے گھر جانا ہے۔ بس دل لگی ہو چکی۔ آپ کنجی سیدھے من سے نکالیے''۔

''تم نہیں جا سکتی ہو''۔

''یہ بھی عجیب سکھا شاہی ہے''۔

''ہاں اس مکان میں میرا راج ہے اور سامنے والے مکان پر تمہارا۔ اپنے مکان کی چھت پر تم سیوا جی ہو اور ہم تمہاری حکومت تسلیم کرتے رہے ہیں۔ تم نے ہزاروں مرتبہ چڑھتے ہوئے پتنگوں کو کئی کئی ریل ڈور سمیت توڑ لیا ہے اور ہم خاموش رہے۔ آج تم ہماری بادشاہت میں ہو۔ اس لیے تمہیں دم مارنے کی مجال نہیں ہونی چاہیے''۔

"میں نے آپ کے پتنگ کبھی نہیں توڑے آپ غلط کہہ رہے ہیں"۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو پاربتی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت میرے ہاتھ بڑے بڑے اختیارات کی باگ ڈور ہے مردوں سے بات بات پر نوک جھونک کرنا تمہاری فطرت میں داخل ہے مگر شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ بہت سخت گیر ہوتے ہیں بری طرح بدلہ لیتے ہیں سمجھیں"۔

یہ سن کر وہ اور بھی گھبرا گئی "میں جاتی ہوں"۔

وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ میں نے دوڑ کر دہلیز میں اس کا راستہ روک لیا "تم کمرے یہ میں رہو گی"۔

"ہٹیے! مجھے جانے دیجیے" اس نے میرے بازو کو جھٹکا۔

میں وہیں جما رہا۔ یہ دیکھ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور سخت غصے کی حالت میں کہا "آپ زبردستی کر رہے ہیں"۔

"ابھی تم نے اس زبردستی کا نصف بھی نہیں دیکھا"۔

"آپ مجھے نہیں جانے دیں گے"۔

"نہیں"۔

"میں رو دوں گی موہن صاحب میں سر پیٹ لوں گی اپنا" اور اس کی آنکھوں سے واقعی آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اسی حالت میں روتی ہوئی آواز میں دھمکیاں دیتی ہوئی آگے بڑھی مجھے دھکا دے کر اس نے دروازے سے باہر نکلنا چاہا۔ اس کشمکش اور پریشانی میں مضطرب دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ گیا اور جب وہ تازہ حملے کے لیے آگے بڑھی تو میں نے بڑے آرام سے اس کے گیلے ہونٹوں کو

اپنے لبوں سے چھولیا۔

میرے لبوں کا اس کے ہونٹوں کو چھونا تھا کہ آفت برپا ہوگئی۔ یہ مجھیے کہ کسی نے آتش بازی کی چھچھوندر کو آگ دکھادی ہے۔ اس نے مجھے وہ موٹی موٹی گالیاں دیں کہ توبہ بھلی اور میرے سینے کو دھڑا دھڑ اپنے ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔لطف یہ ہے کہ آپ روتی جاتی تھی۔ آخر کار جب مجھے مار مار کر تھک گئی تو زمین پر بیٹھ کر اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا کر اور بھی زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔

نصف گھنٹے کی منت سماجت کے بعد اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو بہانے بند کیے اس کے بعد میں نے جیب سے چابی نکالی اور صدر دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا "دروازہ کھلا ہے اب آپ جا سکتی ہیں"۔

اس روز شام کو میں دہلی چلا گیا اور پندرہ روز کے بعد واپس آیا۔ چونکہ گھر میں کسی نے شرارت کے متعلق مجھ سے استفسار نہ کیا۔ اس لیے معلوم ہوا کہ پاربتی نے میرا چیلنج قبول کرلیا ہے ظاہر تھا کہ وہ انتقام ضرور لے گی۔

ایک روز میں نے میز کا دراز کھول کر اپنی بڑی تصویر نکالی۔ اس لیے کہ مجھے اس کا فریم بنوانا تھا۔ یہ فوٹو خاکستری رنگ کے بڑے لفافے میں بند تھا۔ چنانچہ میں اس کو کھول کر دیکھے بغیر فریم ساز کے ہاں لے گیا۔ اس کی دکان پر میں نے ڈیڑھ گھنٹے کے غور و فکر کے بعد فریم کے لیے ایک لکڑی انتخاب کی اور کچھ ہدایات دینے کے بغیر تصویر والا لفافہ دکاندار کو دیدیا۔ اس نے جب اس کو کھول کر دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ناک پر ایک سیاہ گولا سا رکھا ہے اور چشمے کے شیشے بالکل سیاہ

کر دیے گئے ہیں۔ یہ تصویر میری شبیہہ تھی مگر اس مسخ حالت میں اس کو پہچاننا بہت دشوار تھا۔ پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا سیواجی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپہ مار گئے تھے۔

☆☆☆

میرا اہم سفر

پلیٹ فارم پر شہاب سعید اور عباس نے ایک شور مچا رکھا تھا۔ یہ سب دوست مجھے اسٹیشن چھوڑنے کے لیے آئے تھے گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ شہاب نے بڑھ کر پائے دان پر چڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''عباس کہتا ہے کہ گھر جا کر اپنی ''ان'' کی خدمت میں سلام ضرور کہنا''۔

''وہ تو پاگل ہے...... اچھا خدا حافظ''۔ میں نے ان علیگی دوستوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے یہ الفاظ جلدی میں ادا کیے اور شہاب سے ہاتھ ملا کر دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

علی گڑھ اور اس کی حسین علمی فضا جس میں میں اس سے کچھ عرصے پہلے سانس لے رہا تھا۔ اب مجھ سے ایک طویل عرصہ کے لیے دور ہو رہی تھی۔ میرا دل سخت مغموم تھا۔ شہاب اگرچہ کالج میں بہت تنگ کرتا تھا مگر اس کے جدا ہونے کا مجھے اب احساس ہوا۔ جب میں نے دفعتاً خیال کیا کہ امرتسر میں مجھے اس ایسا دوست میسر نہ آ سکے گا۔ اسی خیال کے غم افزا اثر کے تحت میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اور اس عمل سے گویا اپنے ذہن سے اس تاریکی کو جھٹکتے ہوئے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اس کو سلگایا اور اطمینان نشست پر ٹھکانے سے بیٹھ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا اور پھر اپنے ساتھی کی طرف جو سیٹ کے آخری حصے پر بیٹھا تھا پیٹھ کر کے سگریٹ سے دھوئیں کے چھلے بنانے کی بے سود کوشش میں مصروف ہو گیا۔

میں بالکل خالی الذہن تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ سگریٹ کا دھواں جس کو میں اپنے منہ سے چھلوں کی صورت میں نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہوا کے تند جھونکوں کی تاب نہ لا کر کھڑکی کے راستے کسی تھرکتی ہوئی رقاصہ کی طرح تڑپ کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بہت عرصہ تک سگریٹ کے اس دھوئیں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا...... یہ رقص کی ایک تکمیل تھی۔

''رقص کی تکمیل'' یہ الفاظ دفعتاً میرے دماغ میں پیدا ہوئے اور میں اپنے اس اچھوتے خیال پر بہت مسرور ہوا۔

''کیا میں پاگل ہوں؟''

گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ آہنی پٹڑیوں کا بچھا ہوا جال بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پتھریلی روش کے آس پاس اگے ہوئے درخت ایک دوسرے کا تعاقب کرتے محسوس ہوتے تھے۔ ''رقص کی تکمیل'' اور ان درختوں کی بھاگ دوڑ کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ ان حیران کن الفاظ نے مجھے چونکا دیا جو غالباً میرے اس ہم سفر نے ادا کیے تھے جو سیٹ کے آخری کونے میں بیٹھا تھا۔ اس نے یقیناً یہ عجیب سا سوال مجھ سے ہی پوچھا تھا۔

''کیا آپ مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں؟''

''جی ہاں...... کیا میں پاگل ہوں؟'' اس نے ایک بار پھر مجھ سے دریافت کیا۔

ٹرین کی روانگی پر جب میں نے شباب سے یہ کہا تھا ''وہ تو پاگل ہے...... اچھا خدا حافظ!'' تو شاید اس شریف آدمی نے یہ خیال کر لیا تھا کہ میں نے اسی کو پاگل کہا

ہے...... میں کھل کھلا کر ہنس پڑا اور نہایت مودبانہ لہجہ میں کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے حضرت! گاڑی چلتے وقت شاید میں نے اپنے کسی دوست کو پاگل کے نام سے پکارا تھا...... وہ تو ہے ہی پاگل! میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی"۔

یہ معقول دلیل سن کر میرا ہم سفر جو غالباً کچھ اور کہنے کے لیے ذرا آگے سرک رہا تھا خاموش ہو گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ معاملہ نہیں بڑھا۔ اتفاق سے میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ عموماً مجھے نکمی سے نکمی باتوں پر طیش آ جایا کرتا ہے۔ چونکہ اس سے قبل میری کئی مرتبہ دوران سفر میں میرا مسافروں سے جھگڑا ہو چکا تھا اور میں اس کے تلخ نتائج سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے لازمی طور پر اس معاملہ کو اتنی جلدی بخیر و خوبی انجام پاتے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا چنانچہ میں نے اس مسافر سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لیے اس سے ایسے ہی گفتگو شروع کی...... رسمی گفتگو جو عام طور پر گاڑیوں میں مسافروں سے کی جاتی ہے۔

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں"؟ میں نے اس سے دریافت کیا۔

"میں......" یہ کہتے ہوئے وہ کونے سے سرکتا ہوا اٹھ کر میرے مقابل والی سیٹ پر بیٹھ گیا "میں دہلی جا رہا ہوں...... آپ کہاں اتریں گے؟"

"مجھے کافی طویل سفر کرنا ہے...... امرتسر جا رہا ہوں"۔

"امرتسر......"

"جی ہاں......"

"مجھے یہ شہر دیکھنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ اچھی بارونق جگہ ہے۔ کپڑے کی تجارت کا مرکز ہے۔ کیا آپ وہاں کسی کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"جی ہاں!" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس کا سوال میرے نزدیک بہت غیر دلچسپ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اپنے ہم سفر سے یہ کہا ہوتا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں تو وہ کالج کی دلچسپیوں اس کی عمارت اور اس کے خدا معلوم کن کن حصوں اور شعبوں کے متعلق مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ اس سے قبل میرے ساتھ اس قسم کا واقع پیش آ چکا تھا جب میرے ایک رفیق سفر نے سوال پوچھتے پوچھتے رات کی نیند مجھ پر حرام کر دی تھی۔

"کون سے کالج میں...... میرے خیال میں وہاں کئی کالج ہیں" اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا "خالصہ کالج میں"۔

"اچھا...... وہی جو اینڈرسن نے تعمیر کرایا ہے"۔

"اینڈرسن نے...... مگر وہ سکھوں کا کالج ہے حضرت" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مسٹر! یہ اینڈرسن سکھ ہو گیا تھا نا...... آپ نے غالباً سکھ ہسٹری کا مطالعہ نہیں کیا"۔

"شاید"۔

یہ کہہ کر میں نے گفتگو کو دلچسپ نہ پاتے ہوئے منہ موڑ لیا اور کھڑکی سے باہر کی

طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی اب یو پی کے وسیع میدانوں میں دندناتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ لوہے کے پہیوں کی وزنی چھنکار اور چوبی شہتیروں کی کھٹا کھٹ فضا میں ایک عجیب یک آہنگ شور برپا کر رہی تھی۔ اس شور کی صدائے بازگشت نے آس پاس کے دوڑتے ہوئے کھمبوں اور درختوں سے ٹکرا کر شام کی خنک ہوا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ میں نے ایسے ہی کھڑکی میں سے اپنا بازو باہر نکالا۔ منہ زور گاڑی کی تیز رفتاری کی وجہ سے ہوا کے زبردست دھکے نے میرے بازو کو ریلا دے کر پیچھے دبا دیا...... میں نے ٹھنڈی ہوا کے اس دباؤ کو بہت پیارا محسوس کیا۔ چنانچہ میں کھیل میں مصروف ہو گیا اور اپنے ہم سفر اور اس کی گفتگو کو بالکل بھول گیا...... ہوا کے دباؤ کی دلنوازی بہت مسرور کن تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے اس کھیل سے اکتا گیا۔ دراصل بار بار ہوا کو چیرنے سے میرا بازو تھک گیا تھا۔ اب میں نے مڑ کر میدانوں کی وسعت کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ...... آتشیں سرخ کرنیں میدان کے گڑھوں میں بارش کے جمع شدہ پانیوں پر زرنگاری کا کام کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری زمین کے سینے پر کسی نے بڑے بڑے آئینے آویزاں کر دیے ہیں۔ بجلی کے تاروں اور کھمبوں پر نیل کنٹھ اور ابابیلیں پھدک رہی تھیں...... یہ منظر بہت سہانا تھا۔

"کیا میں پاگل ہوں؟"

ان الفاظ نے ایک بار پھر ان رنگوں کو منتشر کر دیا جو میرے دل و دماغ پر ایک نہایت ہی پیاری تصویر کھینچ رہے تھے۔ میں چونک پڑا۔ میرے اسی ہم سفر نے مجھ

سے یہ سوال دریافت کیا تھا۔ میں مڑا۔ وہ میری طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے میں نے کہا۔

''کیا ارشاد فرمایا آپ نے؟''

وہ ایک لمحہ خاموش رہا پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا'' کچھ بھی نہیں شاید آپ بتا نہ سکیں گے''۔

اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر غالباً بیس بائیس برس کے قریب ہوگی۔ ڈاڑھی کمال صفائی سے مونڈی ہوئی تھی اس کے گال گوشت سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کی موٹائی میں بہت خفیف سا فرق تھا۔ جو صرف مجھ ایسا باریک بین ہی دیکھ سکتا ہے۔ بال جن میں سے کسی اچھے اور بڑھیا تیل کی خوشبو آ رہی تھی پیچھے کی طرف کنگھی کیے گئے تھے۔ جس سے اس کی پیشانی بہت کشادہ ہو گئی تھی۔ وہ معمولی قسم کے کشمیرے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کلف شدہ کالر قمیص کے ساتھ لگا ہوا تھا مگر ٹائی موجود نہ تھی...... یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بولا!

''میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں''۔

میں اس کے رازدارانہ لہجہ سے بہت متحیر ہوا۔ آخر وہ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتا ہے؟ یہ خیال کرتے ہوئے میں نے جھک کر گویا اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو کر کہا''بصد شوق......فرمائیے''۔

''کیا میں پاگل ہوں؟''

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ کیا جواب دوں۔ آپ ہی

فرمائیے میں اس شخص کو کیا جواب دے سکتا تھا جو بظاہر نہایت ہی ہوشمند انسان معلوم ہوتا تھا...... بالکل میری اور آپ کی طرح۔

"آپ...... آپ" میں نے تتلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں میں آپ فرمائیے نا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے دریافت کیا۔

"مگر کیوں؟ آپ بڑے ہوشمند انسان ہیں"۔

"آپ اپنی رائے مرتب کرنے میں جلدی سے کام نہ لیجیے پھر غور فرما کر جواب دیجیے کیا میں واقعی پاگل ہوں؟"

اس میں غور کرنے والی بات ہی کوئی نہ تھی لیکن پھر بھی میں نے اپنے ہم سفر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دراصل میں دو چیزیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اولاً یہ کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا۔ ثانیاً یہ کہ شاید اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ ظاہر کر دے کہ وہ سچ مچ پاگل ہی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے سنا تھا کہ عام طور پر پاگلوں کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھرے ہوتے ہیں۔ مگر وہ آنکھیں جو میری طرف دیکھ رہی تھیں غیر معمولی طور پر سفید تھیں ۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سفید چینی کی بنی ہوئی ہیں۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

"آپ کو کسی نے بہت غلط طور پر شک میں ڈال دیا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی ڈاکٹر نے اس کو وہم میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آج کل کے سستے اور جاہل ڈاکٹر بغیر سوچے سمجھے نبض پر ہاتھ رکھ کر کسی کو دیوانہ کسی کو مدقوق اور کسی کو ضعف اعصاب کا مریض ٹھہرا دیتے ہیں۔

”میرا بھی یہی خیال ہے...... مگر آپ کو قطعی طور پر یقین ہے کہ میں واقعی پاگل نہیں ہوں“۔ اس نے کہا۔

”قطعی طور پر...... جس شخص نے آپ کو اس وہم میں مبتلا کیا ہے میرے خیال میں وہ خود پاگل ہے“۔

”خیر وہ تو پاگل نہیں اچھا بھلا ہے“۔

”وہ کون بزرگ ہیں؟“

”میرا اپنا باپ“۔

”آپ کا باپ“!

”جی ہاں...... وہ کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں حالانکہ میں خود میں اس قسم کی کوئی علامت نہیں پاتا۔ آج سے ایک سال قبل اس کی نظروں میں میں پاگل نہ تھا۔ لیکن جونہی میری شادی ہوئی میرے باپ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ موہن دیوانہ ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سسرال والوں نے ڈر کے مارے اپنی لڑکی کو گھر بلوا لیا۔ اب وہ اس کو میرے حوالے نہیں کرتے۔ یہ کس قدر رنج افزا بات ہے کہ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ دس پندرہ دن بھی بسر کرنے میسر نہیں ہوئے“۔

یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقعی بہت مغموم ہے۔ میں بھی متاثر ہوا لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے باپ نے اسے خواہ مخواہ پاگل بنا کر اس کی زندگی کیوں تلخ کر دی ہے۔

”مگر آپ کے والد صاحب نے یہ حرکت کیا کی؟“ میں نے اس کی داستان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''مسٹر! وہ یہودی ہے...... پکا یہودی۔ اس کو صرف اپنے طلائی سکوں سے غرض ہے اور بس...... میں اس کے خون کا ایک حصہ ہوں مگر یہ چیز اس کے دل پر اثر نہیں کر سکتی ہے۔ اگر اس نے مجھے پاگل بنایا ہے تو اس میں بھی کوئی بڑا راز مضمر ہے۔ وہ اس قدر نفس پرست ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جائیداد اس کے اپنے لڑکے کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ دیکھیے میں نے تین سال ہوئے بی اے پاس کیا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نوکری حاصل نہیں کر سکا ہوں مگر میرے باپ کو یہ چاہیے کہ وہ مجھے اچھا خرچ دے''۔

''یقیناً'' میں نے پرزور تائید کی۔

''لیکن وہ مجھے صرف پانچ روپے ماہوار دیتا ہے...... حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے میرے شباب کی تمام رنگینیوں پر اپنی ہوس پرستیوں کی سیاہی الٹ دی ہے میں آگرہ میں پڑھتا ہوں میری بیوی دہلی میں ہے۔ میرے اس یہودی باپ نے میرے اور اس کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ وہ خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے مگر وہ مجبور ہے...... ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔ اب میں اس کا فیصلہ کر دینا چاہتا ہوں میں نے اپنی تین پتلونیں اور تین کوٹ بیچ دیے ہیں اب میں دہلی جا رہا ہوں دیکھا جائے گا جو ہو گا''۔

''آپ اپنی بیوی کے پاس جا رہے ہیں'' میں نے دریافت کیا۔

''جی ہاں...... میں گھر میں بغیر اجازت لیے داخل ہو جاؤں گا اور وہاں سے اپنی بیوی کو لیے بغیر ہرگز نہ ٹلوں گا''۔

"اگر میں پاگل ہوں تو ہوں...... مگر مجھے یقین ہے کہ سوشیا (یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا جھینپ گیا) میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گی۔ میں نے اس کے لیے نمائش میں سے ایک اونی سوئٹر خریدا ہے۔ وہ اس کو یقیناً پسند کرے گی۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟"

"اگر آپ کو ٹرنک وغیرہ کھولنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے" میں نے جواب دیا۔

"نہیں صاحب یہ تو میں نے قمیص کے اندر خود پہن رکھا ہے" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کوٹ اتار دیا پھر قمیص کو پتلون کی گرفت سے آزاد کر کے اس نے اسے بھی اتار دیا...... وہ واقعی ایک رنگ برنگی فیتوں والا زنانہ سوئٹر پہنے ہوئے تھا۔

"کیا آپ کو پسند ہے؟ میں نے یہ اس لیے پہن لیا ہے کہ اگر سوشیا نے اسے لینے سے انکار کر دیا تو میں اسے پہنے ہی رہوں گا"۔

اس زنانہ سوئٹر میں وہ کس قدر عجیب معلوم ہوتا تھا۔

☆☆☆

میرٹھ کی قینچی

''چل چل رے نوجوان'' کی ناکامی کا صدمہ ہمارے دل و دماغ سے قریب قریب مندمل ہو چکا تھا۔ گیان مکرجی فلمستان کے لیے ایک پراپیگنڈہ کہانی لکھنے میں ایک عرصے سے مصروف تھے۔

کہانی لکھنے اور اسے پاس کرنے سے بیشتر نلنی جیونت اور اس کے شوہر ویرندر ڈیسائی (جس سے وہ اب طلاق لے چکی ہے) میں کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ غالباً پچیس ہزار روپے میں۔ ایک سال اس معاہدے کی معیاد تھی۔ مسٹر ششودھر مکرجی 'پروڈکشن کنٹرولر' حسب عادت سوچ بچار میں دس مہینے گزار چکے تھے۔ کہانی کا ڈھانچہ تھا کہ تیار ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بصد مشکل جوں توں کر کے ایک خاکہ معرض وجود میں آیا جسے گیان مکرجی اپنے چرمی تھیلے میں ڈال کر دہلی روانہ ہو گئے تاکہ زبانی طور پر اس میں کچھ اور باتیں ڈال کر حکومت سے پاس کرالیں۔

خاکہ پاس ہو گیا جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو ویرندر ڈیسائی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھ ایک برس کا اور کنٹریکٹ کیا جائے اس لیے کہ پہلے معاہدے کی معیاد ختم ہو رہی تھی۔ رائے بہادر چونی لال مینجنگ ڈائریکٹر بڑے اکھڑ قسم کے آدمی تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمے بازی ہوئی۔ فیصلہ ویرندر ڈیسائی اس کی خوبرو بیوی نلنی کے حق میں ہوا۔ اس طرح پراپیگنڈہ فلم جس کی کہانی کا ابھی صرف غیر مکمل خاکہ ہی بنا تھا۔ پچیس ہزار روپے کے بوجھ تلے آ گئی۔

رائے بہادر کو بہت عجلت تھی کہ فلم جلد تیار ہو۔ کیونکہ بہت وقت ضائع ہو چکا تھا

جلدی جلدی وصی صاحب کو بلا کر ان کی بیوی ممتاز شانتی سے کنٹریکٹ کیا گیا اور اس کو چودہ ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیے گئے۔ بلینک یعنی رسید کے بغیر۔

دو دن شوٹنگ ہوئی۔ ممتاز شانتی اور اشوک کمار کے درمیان مختصر سا مکالمہ تھا جو بڑی مین میخ کے بعد فلمایا گیا۔ مگر جب پردے کے ٹکڑے پر اس کو دیکھا تو سب نے ممتاز شانتی کو ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ ممتاز شانتی برقع پہن کر آتی تھی اور ولی صاحب نے صاف الفاظ میں مکرجی سے کہہ دیا تھا کہ اس کے جسم کو کوئی ہاتھ وا تھ نہ لگائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ممتاز شانتی کو فلم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس بہانے سے کہ جو کردار اسے ادا کرنا ہے اس کے لیے وہ مناسب و موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے کئی مقام آئیں گے جہاں ہیروئن کو اپنے جسم کے بعض حصوں کی نمائش کرنا پڑے گی...... قصہ مختصر یہ کہ چودہ ہزار بھی گئے۔

اب کہانی کا نامکمل ڈھانچہ انتالیس ہزار روپے کے نیچے دبا پڑا تھا۔ رائے بہادر چونی لال پیلے ہو رہے تھے۔ ''چل چل رے نوجوان'' کی ناکامی نے کمپنی کی حالت بہت پتلی کر دی تھی۔ مارواڑیوں سے قرض لے لے کر گزارہ بڑی مشکل سے ہو رہا تھا۔ رائے بہادر کی خفگی اور پریشانی بجا تھی۔

ایک دن میں ''واچا'' پائی اور اشوک اسٹوڈیو کے باہر کرسیوں پر بیٹھے کمپنی کی ان ہی حماقتوں کا ذکر کر رہے تھے جن کے باعث اتنا وقت اور اتنا روپیہ ضائع ہوا کہ اشوک نے یہ انکشاف کیا کہ جو چودہ ہزار روپے رائے بہادر نے ممتاز شانتی کو دیے تھے وہ انہوں نے اس سے قرض لیے تھے۔ اشوک نے یہ انکشاف اپنی کالی

پنڈلی کھجاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کیا کہ ہم سب بے اختیار ہنس پڑے لیکن فوراً چپ ہو گئے۔

سامنے بجری بچھی ہوئی روش پر ایک اجنبی عورت ہماری بھاری بھرکم ہیئر ڈریسر کے ساتھ میک اپ روم کی طرف جا رہی تھی۔

دتا رام پانی نے اپنے کالے موٹے اور بدشکل ہونٹ کھولے اور خوفناک طور پر آگے بڑھے ہوئے اوندھے سیدھے میلے دانتوں کی نمائش کی اور واچا کو کہنی کا ٹھوکا دے کر اشوک سے مخاطب ہوا "یہ...... یہ کون ہے؟"

واچا نے پانی کے سر پر ایک دھول جمائی "سالے تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا؟"

پانی بدلہ لینے کے لیے اٹھا تو واچا نے اس کی کلائی پکڑلی "بیٹھ جا سالے مت جا ادھر تیری شکل دیکھتے ہی بھاگ جائے گی"۔

پانی اپنے اوندھے سیدھے دانت پیستا رہ گیا۔ اشوک جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا بولا "گڈ لکنگ ہے"۔

میں نے ایک لحظہ کے لیے غور سے اس عورت کو دیکھا اور کہا "ہاں نظروں پر گراں نہیں گزرتی"۔

اشوک میرا مطلب نہ سمجھا "کہاں سے نہیں گزرتی؟"

میں ہنسا "میرا مطلب تھا کہ جو عورت یہاں سے گزر کر گئی ہے اسے دیکھ کر آنکھوں پر بوجھ نہیں پڑتا۔ بڑی صاف ستھری...... لیکن قد کی ذرا چھوٹی ہے"۔

پانی نے پھر اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی "ارے! چلے گی...... کیوں واچا؟"

واچا پائی کے بجائے اشوک سے مخاطب ہوا ”واوا منی تم جانتے ہو یہ کون ہے؟“

اشوک نے جواب دیا ”زیادہ نہیں جانتا مکرجی سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ ایک عوامی ٹیسٹ کے لیے آج آنے والی ہے“۔

کیمرہ اور ساؤنڈ ٹیسٹ کیا گیا۔ جسے ہم نے پردے پر دیکھا اور سنا اور اپنی اپنی رائے دی۔ مجھے اشوک اور واچا کو وہ بالکل پسند نہ آئی۔ اس لیے کہ اس کی جسمانی حرکات چوبی تھیں۔ اس کے اعضاء کی ہر جنبش میں تصنع تھا۔ مکالمہ ادا کرتے وقت اس کے ابرو پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح ناچتے تھے۔ مسکراہٹ بھی غیر دلکش تھی۔ لیکن پائی اس پر لٹو ہو گیا۔ چنانچہ اس نے کئی مرتبہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کی اور مکرجی سے کہا ”ونڈر فل اسکرین فیس“ ہے۔

دتا رام پائی فلم ایڈیٹر تھا۔ اپنے کام کا ماہر۔ فلمستان چونکہ ایسا ادارہ ہے جہاں ہر شعبے کے آدمی کو اظہار رائے کی آزادی تھی۔ اس لیے دتا رام پائی وقت بے وقت اپنی رائے سے ہم لوگوں کو مستفید کرتا رہتا تھا اور خاص طور پر میرے تمسخر سے دوچار ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا لیکن ایس مکرجی نے اس عورت کو جس کا نام پارو تھا پراپیگنڈہ فلم کے ایک رول کے لیے منتخب کر لیا چنانچہ رائے بہادر چونی لال نے فوراً اس سے ایک فلم کنٹریکٹ معمولی سی ماہانہ تنخواہ پر کر لیا۔

اب پارو ہر روز اسٹوڈیو آنے لگی۔ بہت ہنس مکھ اور گھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ میرٹھ اس کا وطن تھا جہاں وہ شہر کے قریب قریب ہر رنگین مزاج رئیس

کی منظورِ نظر تھی۔ اس کو یہ لوگ میرٹھ کی قینچی کہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ کاٹتی تھی اور بڑا مہین کاٹتی تھی۔

ہزاروں میں کھیلتی تھی۔ پر اسے فلموں میں آنے کا شوق تھا جو اسے فلمستان لے آیا۔

جب اس سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ حضرت جوش ملیح آبادی اور مسٹر ساغر نظامی بھی اکثر اس کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور اس کا مجرا سنتے تھے۔

اس کی زبان بہت صاف تھی۔ اور جلد بھی جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ چھوٹی آستینوں والے چھنسے چھنسے بلاؤز میں اس کی ننگی بانہیں ہاتھی دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں...... سفید سڈول اور متناسب اور خوبصورت۔ جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو لولکڑی پر رندہ پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

صبح سٹوڈیو آتی۔ نہائی دھوئی۔ صاف ستھری اجلی سفید یا ہلکے رنگ کی ساری میں ملبوس۔ کسی صابن کا اشتہار معلوم ہوتی۔ شام کو گھر روانہ ہوتی تو دن گزرنے کے باوجود گرد و غبار کا ایک ذرہ تک اس پر نظر نہ آتا۔ ویسی ہی ترو تازہ ہوتی۔ جیسی صبح کو ہوتی۔

دتا رام پائی اس پر اور زیادہ لٹو ہو گیا۔ شوٹنگ شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے اسے فراغت ہی فراغت تھی۔ چنانچہ اکثر پارو کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول رہتا...... معلوم نہیں وہ اس بھونڈے اور کرخت لہجے اور اس کے اوندھے سیدھے دانتوں اور اس کے ان کٹے میل بھرے ناخنوں کو کیسے برداشت کرتی تھی......

صرف ایک ہی بات سمجھ آتی ہے کہ طوائف اگر برداشت کرنا چاہے تو بہت کچھ برداشت کرسکتی ہے۔

پراپیگنڈہ فلم کی کہانی کا ڈھانچہ میرے حوالے کیا گیا کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کروں اور جو ترمیم و تنسیخ میری سمجھ میں آئے بیان کردوں۔ میں نے اس ڈھانچے کے تمام جوڑ دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا بے جوڑ ڈھانچہ شاید ہی کسی سے تیار ہوسکے۔ کوئی سر تھا نہ پیر۔ چونکہ میری قابلیت کا امتحان تھا اس لیے میں نے ایک اور ڈھانچہ تیار کیا بڑے خلوص اور بڑی محنت سے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈائریکشن کے فرائض میرے کہنے پر ساوک واچا کو سونپے جانے والے تھے جو میرا عزیز دوست تھا۔

نیا ڈھانچہ جب فلمستان کی ''فل بنچ'' کے سامنے پیش ہوا تو میری وہ حالت تھی جو کسی مجرم کی ہوسکتی ہے۔

ایس مکرجی نے اپنا فیصلہ ان چند الفاظ میں دیا ''ٹھیک ہے مگر اس میں ابھی کافی اصلاح کی گنجائش ہے''۔

گیان مکرجی سے پوچھا گیا تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق منہ سکوڑ کے صرف اتنا کہا ''آل موسٹ ٹھیک'' ہے یہ وہ حضرت تھے جو ایک مکرجی کی ڈائریکٹ کی ہوئی تمام فلموں کے ڈائریکٹر کہلاتے تھے حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں ایک فٹ فلم بھی ڈائریکٹ نہیں کی تھی۔

اصل میں فلمستان میں کام کرنے کا ڈھب ہی نرالا تھا۔ ساری فلم آپ نے ڈائریکٹ کی ہے لیکن پردے پر میرا نام دیا جارہا ہے۔ کہانی میری ہے لیکن اس کا

مصنف آپ کو بنا دیا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ دتا رام جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ فلمی کہانی کیا ہوتی ہے مجھے مشورے دیا کرتا تھا۔

پراپیگنڈہ فلم کی کہانی لکھنے کی دشواریاں وہی سمجھ سکتا ہے جس نے کبھی ایسی کہانی لکھی ہو سب سے زیادہ مشکل میرے لیے یہ تھی کہ مجھے پارو کو اس کی شکل و صورت اس کے قد اور اس کی فنی کمزوریوں کے پیش نظر اس کہانی میں داخل کرنا تھا۔ بہر حال بڑی مغز پاشیوں کے بعد تمام مراحل طے ہو گئے۔ کہانی کی نوک پلک نکل آئی اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ہم نے باہم مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ جن مناظر میں پارو کا کام ہے وہ سب سے آخر میں فلمائے جائیں تاکہ پارو فلمی فضا سے اور زیادہ مانوس ہو جائے اور اس کے دل و دماغ سے کیمرے کی جھجک نکل جائے۔

کسی منظر کی بھی شوٹنگ ہو وہ برابر ہمارے درمیان ہوتی۔ دتا رام پائی اب اس سے اتنا کھل گیا تھا کہ باہم مذاق بھی ہونے لگے تھے۔ پائی کی یہ چھیڑ چھاڑ مجھے بہت بھونڈی معلوم ہوتی تھی۔ میں پارو کی عدم موجودگی میں اس کا تمسخر اڑاتا ۔کم بخت بڑی ڈھٹائی سے کہتا ''سالے تو کیوں جلتا ہے؟''

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں پارو بہت ہنس مکھ اور کھلو مٹھو ہو جانے والی طوائف تھی۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن کے لیے وہ اونچ نیچ سے بے پروا بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تھوڑے عرصے میں مقبول ہو گئی۔ نچلے طبقے نے اسے احتراماً پارو دیوی کہنا شروع کر دیا۔ یہ اتنا عام ہوا کہ فلم کے عنوانات

میں پارو کی بجائے پارو دیوی لکھا گیا۔

دتا رام پائی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا کچھ ایسی ٹپس لڑائی کہ ایک دن اس کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ پارو سے اپنی خاطر مدارت کرائی اور چلا آیا۔ اسکے بعد اس نے ہفتے میں ایک دو مرتبہ باقاعدگی سے وہاں جا دھمکنا شروع کر دیا۔

پارو اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا مرد رہتا تھا۔ قد و قامت میں اس سے دو گنا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پارو کے ساتھ دیکھا..... وہ اس کا پتی دیو کم تھا اور تھامو زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

پائی ایسے فخر و ابتہاج سے کینٹین میں پارو سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر نیم عاشقانہ انداز میں کرتا کہ ہنسی آ جاتی۔ میں اور ساوک واچا اسکا خوب مذاق اڑاتے مگر وہ کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی پارو بھی موجود ہوتی۔ میں اس کی موجودگی میں بھی پائی کے خام اور بھونڈے عشق کا مذاق اڑاتا۔ پارو برا نہ مانتی اور مسکراتی رہتی۔ اس مسکراہٹ سے اس نے میرٹھ میں جانے کتنے دلوں کو اپنی قینچی سے کترا ہو گا۔

پارو میں عام طوائفوں ایسا بھڑکیلا اور چھچھورا پن نہیں تھا۔ وہ مہذب محفلوں میں بیٹھ کر بڑی شائستگی سے گفتگو کر سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ میرٹھ میں اس کے یہاں آنے جانے والے ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہوتے تھے۔ ان کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقہ سے تھا جو نا شائستگی کی طرف محض تفریح کی خاطر مائل ہو تا ہے۔

پارو اب سٹوڈیو کی فضا میں اچھی طرح گھل مل گئی تھی۔ فلمی دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت یا لڑکی نئی ایکٹریس بنتی ہے تو اس کو کوئی نہ کوئی فوراً دبوچ لیتا ہے جیسے کہ وہ گیند ہے جسے بلے کے ساتھ کسی نے ہٹ لگائی ہے اور فیلڈ میں کھڑے کھلاڑی اس تاک میں ہیں کہ وہ ان کے ہاتھوں میں چلی آئے۔

لیکن پارو کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ فلمستان دوسرے نگار خانوں کے مقابلے میں بہت حد تک پاکباز تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پارو کو کوئی اتنی زیادہ جلدی نہیں تھی۔

محسن عبداللہ (پر اسرار نینا کا سابق خاوند) اپنی یک آہنگ خشک مجرد زندگی سے اکتا کر پارسی لڑکی ویرا کو جس کی زندگی اسی کی زندگی کی مانند سپاٹ تھی شریک حیات بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اسی غرض کے لیے اسے ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ ویرا فرسٹ کلاس میں سفر کرتی تھی۔ اس کے بعد اس کو ایٹی کیٹ کے مطابق آتے جاتے اس کی کتیا کی زنجیر تھامنا پڑتی...... عاشقوں کے امام میاں مجنوں کو بھی تو لیلیٰ کی کتیا عزیز تھی۔

واچا کا اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں کے بعد تازہ تازہ اپنی بدکار فرانسیسی بیوی سے نجات حاصل کی تھی۔ ایس مکر جی پری چہرہ نسیم بانو کے عشق کے چکر میں تھا۔ گیان مکر جی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک عورت سے شادی کر کے ہی بھر پایا تھا...... اپنے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے پارو کی جلد بہت پسند تھی۔ ایک دن شاہد لطیف (جواب ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہے) سے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”جلد بہت پسند ہے ٹھیک ہے لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اندر کتاب کیسی ہے مضمون کیسا ہے؟“

پائی کی حالت اب بہت زیادہ مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔ اس لیے کہ پارو نے ایک روز اسے گھر مدعو کیا تھا اور اپنے ہاتھ سے اسے دو پیگ جانی واکر وسکی کے پلائے تھے۔ جب اس کو زیادہ نشہ ہوگیا تھا تو پارو نے اس کو بڑے پیار سے صوفے پر لٹا دیا تھا...... اب اس کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس پر مرتی ہے اور ہم لوگ چونکہ ناکام رہے ہیں اس لیے حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ اس بارے میں پارو کا رد عمل کیا تھا مجھے معلوم نہیں۔

شوٹنگ جاری تھی ویرا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ سائیڈ ہیروئن کا رول پارو کو ادا کرنا تھا۔ اسے برما کے کسی آزاد قبیلے کی ایک شوخ و شنگ تیز طرار لڑکی کا روپ دھارنا تھا۔ جوں جوں اس کے مناظر فلمائے جانے کا وقت آتا گیا میرے اندیشے بڑھتے گئے مجھے ڈر تھا کہ وہ امتحان میں پوری نہ اترے گی ہم سب کی کوفت کا موجب ہو گی۔

آخر وہ دن آگیا جب اس کا پہلا شوٹنگ ڈے تھا۔ میک اپ اور کسٹیوم سے مزین ہو کر اسے کیمرے کے سامنے لایا گیا۔ عجیب و غریب تراش کی بھڑکیلے رنگوں والی پھنسی پھنسی چولی ناف سے اوپر پیٹ کی ہلکی سی جھلک گھٹنوں سے بالشت بھر اوپر لہنگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیمرے مائیک اور خیرہ کن روشنیوں سے قطعاً مرعوب یا خائف نہیں۔ مکالمہ اس کو اچھی طرح یاد کروا دیا گیا تھا۔ امید تھی کہ بول جائے گی

۔مگر جب ٹیک کا وقت آیا تو اس سارا وجود لکڑی ہو گیا۔منہ کھول تو مکالمہ سپاٹ۔

کئی ریہرسلیں کرائی گئیں مگر اس لکڑی میں جان کے آثار پیدا نہ ہوئے۔پیشہ ور رقاصاؤں کی طرح اپنے ابرو نچاتی جیسے بھاؤ بتا رہی ہے۔تین چار ری ٹیک ہوئے تو میں بالکل مایوس ہو گیا۔واچا طبعاً بہت جلد گھبرا جانے والا ہے۔اس نے دیکھا کہ اونٹنی کی کوئی کل سیدھی نہیں تو ایس مکر جی سے کہا کہ وہ اسے ٹھیک کرے۔

مکر جی اسے کیا ٹھیک کرتے۔وہ بنی ہی کچھ ایسے آب و گل کی تھی جس میں بناؤ بھاؤ اور نزت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔چنانچہ ایک ٹیک میں اس نے کسی قدر گوارا ایکٹنگ کیا تو مکر جی نے غنیمت سمجھ کر صاد کر دیا۔

ہم سب نے بڑی کوشش کی کہ اس کا تصنع اور چوبلی پن کسی نہ کسی طریقے سے دور ہو جائے مگر ناکام رہے۔شوٹنگ جاری رہی اور وہ بالکل نہ سدھری۔اس کو کیمرے اور مائیک کا کوئی خوف نہیں تھا۔مگر سیٹ پر وہ حسب منشاء اداکاری کے جوہر دکھانے سے قاصر تھی......اس کی وجہ میرٹھ کے مجروں کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔بہر حال اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کسی نہ کسی روز سمجھ جائے گی۔

چونکہ مجھے اس کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی تھی اس لیے میں نے اس کے رول میں کتر بیونت شروع کر دی تھی۔میری اس چالاکی کا علم اس کو پائی کے ذریعے سے ہو گیا۔چنانچہ اس نے خالی اوقات میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔گھنٹوں بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔بڑے شائستہ انداز میں مناسب و موزوں الفاظ میں جن میں چاپلوسی کا رنگ بظاہر ظاہر نہ ہوتا میری تعریف کرتی۔

ایک دو مرتبہ اس نے مجھے گھر پر مدعو کیا۔میں شاید چلا جاتا لیکن ان دنوں بہت

مصروف تھا۔ ہر وقت اعصاب پر پراپیگنڈہ فلم کا منظر نامہ سوار رہتا تھا۔ یوں تو میرا ہاتھ بٹانے کے لیے تین آدمی موجود تھے۔ راجہ مہدی علی خاں، محسن عبداللہ اور ڈکشٹ۔

راجہ مہدی علی خاں نے تعاون سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ ہر وقت اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو خط لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ محسن عبداللہ ویرا سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے میں مصروف تھے اور مسٹر ڈکشٹ پارو کو مکالمے یاد کراتے رہتے تھے۔

میں کچھ عرصے سے نوٹ کر رہا تھا کہ پارو اور اشوک سیٹ پر جب آمنے سامنے آتے ہیں تو اشوک سے پارو کو اپنے جارحانہ عشق کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں اشوک کی آنکھوں میں گڑ جانا چاہتی ہیں۔ جیسے اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ دیکھو یہ جو کچھ ہو رہا ہے جھوٹ نہیں سچ ہے۔

اشوک طبعاً بہت جھینپو قسم کا آدمی ہے۔ وہ کسی عورت سے کھلم کھلا اظہار عشق نہیں کر سکتا...... یہ مجھے معلوم تھا کہ اشوک کو پارو پسند ہے لیکن اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اس سے جسمانی تعلق پیدا کر لیتا۔

اس کی زندگی میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لڑکیاں آئیں۔ وہ لارڈ بائرن بن سکتا تھا۔ مگر شرمیلی طبیعت کے باعث ان آسانی سے پھنس جانے والی تتلیوں کو نا امید کرتا رہا۔

اشوک کمار کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی بھی ایکٹرس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ بڑی آسانی سے کئی ایکٹرس اپنا دل اس کے قدموں میں پا انداز کی طرح بچھانے کے

لیے تیار تھیں۔ میں نے سوچا' اگر پارو کے دل میں بھی کھد بد ہو رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ...... پھر پارو نووارد تھی۔ خود اشوک کے ساتھ منسلک کر کے وہ بام شہرت پر بڑی جلدی پہنچ سکتی تھی۔

فلم میں پارو کا رول ایک آزاد قبیلے کی نیم جنگلی خودسر اور جارحانہ قسم کا عشق کرنے والی لڑکی کا تھا۔ وہ اشوک سے محبت کرتی تھی مگر وہ ویرا کے عشق میں گرفتار تھا۔ یہ فلمی تثلیث پارو کے اندرونی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے کافی سامان بہم پہنچا رہی تھی۔

شوٹنگ جاری تھی ...... ان ڈور آؤٹ ڈور۔ ایک دن کشتیوں کا سین فلمایا جانے والا تھا۔ اس کے لیے بہت دور ایک کھاڑی منتخب کی گئی۔ دو کشتیاں تھیں۔ ایک میں اشوک کمار کو سوار ہونا تھا دوسری میں پارو کو۔ اسے یہ ہدایت تھی کہ جب اس کی کشتی اشوک کی کشتی کے پاس پہنچے تو وہ اس میں کود جائے۔

پانی بہت گہرا تھا۔ حسب ہدایت اشوک کمار کی کشتی میں کودی مگر ایسا کرتے وقت دونوں کشتیوں کا فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا اور وہ پانی میں گر پڑی۔ واچا مدد کے لیے چلایا۔ فوراً ساحل پر سیدو تین مچھیرے پانی کے اندر گھسے اور پارو کو گھسیٹتے ہوئے پانی سے باہر لے آئے۔

عورت زاد! مگر حیرت ہے کہ اس حادثے نے اسے بالکل خوفزدہ نہ کیا۔ کپڑے خشک ہوئے تو وہ دوسرے ٹیک کے لیے تیار تھی۔

جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ رہی تھی تو میں نے اور اشوک نے اس کی ایک ٹانگ کی جھلک دیکھی تھی جو کافی دلچسپ اور شریر تھی۔

جب ہم لوکیشن سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں اشوک نے مجھ سے کہا "منٹو...... پارو کی ٹانگ بڑی اچھی تھی...... جی چاہتا تھا روسٹ بنا کے کھا جاؤں"۔

عجیب بات ہیکہ اشوک ایسا ڈرپوک اور جھینپو اندرونی طور پر سادیت پسند تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ چونکہ اپنے خیالات دبا دینے کا عادی تھا اس لیے رد عمل کی صورت میں یہ سادگی پیدا ہو گئی تھی۔

تو سٹا ایم جی کار میں اشوک اور میں دونوں اسٹوڈیو سے گھر واپس جایا کرتے تھے اور راستے میں ادھر ادھر کی مختلف باتیں کیا کرتے تھے۔ موٹر اس سڑک پر سے بھی گزرتی تھی جس سے ملحقہ گلی میں پارو کا فلیٹ تھا۔ ایک شام جب ہم وہاں سے گزرے تو تھوڑی دور آگے نکل کر اشوک نے موٹر روک لی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

مڑ کر اشوک نے اس گلی کی طرف دیکھا اور کہا "آج ہولی کی خوشی میں پارو نے دعوت دی ہے جاؤں یا نہ جاؤں"؟

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے جاؤ"۔

"تو چلو تم بھی چلو"۔

میں نے کہا "میں کیوں چلوں مجھے اس نے مدعو نہیں کیا"۔

"کوئی بات نہیں" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے موٹر گھمائی اور پارو کے فلیٹ کے پاس بریک لگائی۔ ہارن بجایا تو بالکنی میں واچا اور پائی نمودار ہوئے۔

پائی نے مجھے دیکھا تو اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا "ارے تم بھی آ

گئے''۔

واچا نے اشوک سے کہا ''آؤ واوا منی آؤ تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا''۔

پارو خلاف معمول بنارسی ساڑھی میں ملبوس دلہن سی بنی بیٹھی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اٹھ کر استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بڑے مناسب وموزوں الفاظ میں معذرت کی کہ مجھے مدعو کرنا بھول گئی''۔

فوراً شراب کا دور شروع ہو گیا۔ پہلا پیگ ختم ہوا تو پانی جھومنے لگا۔ واچا نے فرمائش کی ایک آدھ گانا ہو جائے۔ پارو نے کھانے والی نگاہوں سے اشوک کی طرف دیکھا اور کہا ''کیوں اشوک صاحب آپ کچھ سنیں گے؟''

اشوک جھینپ گیا اور اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں صرف اتنا کہہ سکا ''آپ گائیں گی تو میں سنوں گا''۔

گانا شروع ہوا بازاری قسم کی ٹھمری تھی۔ اس کے بعد ایک غزل شروع ہوئی۔ پھر کوئی فلمی گیت۔ اس دوران میں پارو کا شوہر یا جو کوئی بھی وہ تھا گلاسوں میں شراب اور سوڈا انڈیلتا رہا۔ دوسرے پیگ کے بعد پانی کی آنکھیں مندنے لگیں۔ اشوک زیادہ پینے کا عادی نہیں اس لیے وہ ڈیڑھ پیگ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ واچا نے تیسرے کے بعد اپنے گلاس کا منہ بند کر دیا۔

ٹھمریاں غزلیں گیت بہت دیر تک ہوتی رہیں۔ آخر میں جب اس نے بھجن سنایا تو اس نے میری موجودگی کا احساس کرتے ہوئے ایک نعت شروع کی۔ لیکن میں نے فوراً اس کو روک دیا ''پارو دیوی! یہ محفل نشاط ہے...... شراب کے دور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے''۔

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور معافی کی طالب گار ہوئی۔

کھانا بہت اچھا تھا...... اشوک جلدی سے فارغ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ دھلوانے کے لیے پارو اٹھی...... جب اشوک واپس آیا تو گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی رخصت چاہی اور مجھے ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا۔

راستے میں کوئی بات نہ ہوئی اس نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شوٹنگ باقاعدگی سے ہو رہی تھی۔ ایک شام جب میں اور اشوک واپس جا رہے تھے تو شیواجی پارک کے پاس جہاں پارو کا فلیٹ تھا اشوک نے موٹر کی رفتار کم کی اور مجھ سے مخاطب ہوا ''منٹو! تمہیں ایک بات بتاؤں'' اس کے لہجے میں کسی قدر کپکپاہٹ تھی۔

میں نے ایک لحظہ کے لیے سوچا کہ یہ دلچسپ بات کیا ہو سکتی ہے ''بتاؤ''۔

اشوک ہنسنے لگا کہ ''تمہیں یاد ہے اس روز جب ہم پارو کے ہاں کھانا کھا رہے تھے تو وہ میرے ہاتھ دھلوانے کے لیے اٹھی تھی''۔

اشوک نے یہ کہا تو مجھے اس کی گھبراہٹ یاد آ گئی ''ہاں...... ہاں......''

''جب غسل خانے میں مجھے اس نے تولیہ دیا تو آہستہ سے کہا کل آپ اکیلے آیئے...... شام کو ساڑھے چھ بجے...... میں گھبرا گیا اور تولیہ پھینک کر باہر نکل آیا''۔

اس نے موٹر سڑک کے کنارے ٹھہرا لی۔ میں نے اس سے پوچھا ''تم گئے''

''ہاں......'' اشوک نے اسٹیرنگ وہیل سے ہاتھ اٹھائے اور انہیں زور زور سے ملنے لگا ''لیکن بھاگ گیا''۔

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا ''ہوا کیا...... پورا سینر یو بتاؤ''۔

''میں بڑا ڈرپوک ہوں...... جانے مجھے ایسے موقعوں پر کیا ہو جاتا ہے...... اس نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور آپ قالین پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ دو پیگ مجھے پلائے۔ خود بھی تھوڑی سی پی اور پھر...... وہ لگی اپنی محبت جتانے...... میں سنتا رہا اور کانپتا رہا۔ جب اس نے میرا ہاتھ دبایا تو میں نے اسے بڑے زور سے جھٹک دیا...... اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن فوراً کہیں غائب ہو گئے...... وہ مسکرانے لگی...... بھیا اشوک! میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی...... میں نے یہ سنا تو چکرا گیا۔ اٹھا تو اس نے پھر کہا۔ اشوک صاحب! میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں نے کچھ نہ کہا اور نیچے اتر گیا...... کار میں بیٹھا...... گھر پہنچ کر میں نے آدھا پیگ پی کر سوچا تو مجھے گزرے ہوئے واقع پر بڑا افسوس ہوا۔ کیا حرج تھا اگر میں......؟''

اشوک کے لہجے میں تاسف تھا۔

میں نے کہا ''ہاں کوئی حرج نہیں تھا''۔

اشوک کے لہجے میں تاسف اور زیادہ ہو گیا۔

یہ سن کر میرے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس وقوع کے روز رات کے نو بجے اسٹوڈیو سے باہر سخت سردی میں فلمایا جا رہا تھا۔ جشن مسرت میں لوگ ناچ رہے تھے...... اشوک اپنی ہیروئن ویرا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے محو رقص تھا اور پارو ایک طرف مجسمہ افسردگی بنی اکیلی کھڑی تھی۔

☆☆☆

نامکمل تحریر

میں جب کبھی ذیل کا واقعہ یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں پر سوئیاں چبھنے لگتی ہیں۔

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے باعث موسم خنک ہو گیا تھا۔ جب میں صبح سویرے غسل کے لیے ہوٹل سے باہر نکلا تو دھلی ہوئی پہاڑیوں اور نہائے ہوئے ہرے بھرے پیڑوں کی تازگی دیکھ کر طبیعت پر وہی کیفیت پیدا ہوئی جو خوبصورت کنواریوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بارش بند تھی البتہ ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے اونچے اونچے درختوں پر آوارہ بدلیاں اونگھ رہی تھیں گویا رات بھر برسنے کے بعد تھک کر چور ہو گئی ہوں۔

میں چشمے کی طرف روانہ ہوا۔ کاندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں صابن دانی تھی۔ دوسرے میں نیکر۔ جب سڑک کا موڑ طے کرنے لگا تو آنکھوں کے سامنے دھندلی دھند نظر آئی۔ بادل کا ایک بھولا بھٹکا ٹکڑا جو شاید آسمانی فضا سے اکتا کر ادھر آ نکلا تھا۔ اس بادل نے سڑک کے دوسرے حصے کو آنکھوں سے بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سپیدی ہی سپیدی نظر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کوئی دھنکی ہوئی روئی بکھیر رہا ہے۔

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں نے اس سپیدی میں ارتعاش پیدا کیا اور اس دھند میں سے دو دمثال بخارات علیحدہ ہونے لگے اور میری ننگی بانہوں سے مس ہوئے۔ برف سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی سردی کے احساس سے وہی کیفیت پیدا

ہوتی ہے جوان بخارات نے پیدا کی۔

اس بادل میں سے گزرتے وقت کے سانس کے ذریعے یہ سپید سپید بخارات میرے اندر داخل ہو گئے جس سے پھیپھڑوں کو بڑی راحت محسوس ہوئی۔ میں نے جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا۔ جب بادل کے اس ٹکڑے کو طے کر کے میں باہر آیا تو آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ میرے چشمے کے شیشے کاغذ کے مانند سفید ہو گئے تھے۔ پھر ایکا ایکی مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ اور جب میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو وہ شبنم آلود تکیے کی طرح گیلے ہو رہے تھے۔

میں غسل کے معاملے میں بے حد سست ہوں اور سردیوں کے موسم میں تو روزانہ غسل کا میں بالکل قائل نہیں۔ دراصل نہانے دھونے کا فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر رہا ہے۔ غسل کا مطلب ہے کہ غلاظت دور کی جائے اور روز نہانے کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی رات...... میں غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ منہ دھو لیا جائے پیر صاف کر لیے جائیں سر کے بال دھو لیے جائیں اس لیے کہ یہ سب چیزیں جلدی میلی ہو سکتی ہیں مگر ہر روز بدن کیوں صاف کیا جائے جب کہ یہ بہت دیر کے بعد میلا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو خیر نہانے کا مطلب میں سمجھ سکتا ہوں مگر سردیوں میں اس کا کوئی مصرف مجھے نظر نہیں آتا۔ آخر کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہر روز صبح سویرے انسان غسل خانے میں جائے۔ سردی کے مارے پورے دو گھنٹوں تک دانت بجتے رہیں۔ انگلیاں سن ہو جائیں ناک برف کی ڈلی بن جائے...... غسل نہ ہوا اچھی خاصی مصیبت ہوئی۔

غسل کے بارے میں میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ لیکن جس پہاڑی گاؤں کا

میں ذکر کر رہا ہوں وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ جو چیزیں مجھے اب مہمل نظر آتی ہیں یا اس سے پہلے نظر آیا کرتی تھیں وہاں بامعنی دکھائی دیتی تھیں...... اس غسل ہی کو لیجیے اس پہاڑی گاؤں میں جتنا عرصہ میں رہا ہر روز میرا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ نہاؤں اور دیر تک نہاتا رہوں۔

چشمے پر پہنچ کر میں نے کپڑے اتارے۔ نیکر پہنی اور جب پانی کی اس گرتی ہوئی دھار کے پاس گیا جو پتھروں پر گر کر ننھے ننھے چھینٹے اڑا رہی تھی تو پانی کی ایک سرد بوند میری پیٹھ پر آ گری۔ میں تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ جہاں بوند گری تھی اس جگہ گدگدی پرکاری کی نوک کی طرح چبھی اور سارے جسم پر پھیل گئی۔ میں سمٹا' کانپا اور سوچنے لگا مجھے واقعی نہانا چاہیے یا نہیں۔ قریب تھا کہ میں باغی ہو جاؤں لیکن آس پاس نگاہ دوڑائی تو ہر شے نہائی ہوئی نظر آئی چنانچہ جو باغیانہ خیال میرے دماغ میں اس شریر بوند نے پیدا کیے تھے ٹھنڈے ہو گئے۔

سرد پانی کی گدگدیاں شروع ہوئیں تو مجھے بہت ناگوار گزریں مگر جب میں جی کڑا کر کے دھار کے نیچے بیٹھ گیا تو وہ لطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ زور زور سے پانی کے چھینٹے اڑانے سے سردی کی شدت کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب میں نے یہ گر معلوم کر لیا تو پھر اس لطف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

سرپا پانی کی موٹی دھار نے عجب کیفیت پیدا کر دی۔ پھر جب پانی کے دباؤ سے بال پیشانی پر نیچے لٹک آئے اور انہوں نے آنکھوں اور منہ میں گھسنا شروع کر دیا تو زور زور سے پھونکیں مار کر ان کو ہٹانے کی ناکام سعی نے مزہ اور بھی دوبالا کر

دیا۔ کبھی کبھی ڈوب کر ابھرتے ہوئے آدمی کا احساس مجھے بھی ہوا اور میں نے سوچا کہ جو لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں ان کو ایسی موت میں بے حد لطف آتا ہو گا۔ چشمے کا پانی آنسوؤں کی طرف شفاف تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اردگرد بلبلوں اور پانی کے چھینٹوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

غسل سے فارغ ہو کر میں نے تولیے سے بدن پونچھا اور سردی کا احساس کم کرنے کے لیے دھیمے دھیمے سروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یہ سریلی گنگناہٹ ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو جاتی اور میں یہ سمجھتا کہ میرے بجائے کوئی اور آدمی بہت دور گا رہا ہے اس پر میں تولیے کو زیادہ زور کے ساتھ بدن پر ملنے لگتا۔

بدن خشک ہو گیا تو میں نے کپڑے پہنے اس اثنا میں بوندا باندی شروع ہو گئی...... میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے عین اوپر بادل کا ایک اسفنج نما ٹکڑا چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پہاڑی پر سے نیچے اترنا شروع کیا اور فوراً ہی کودتا پھاندتا سڑک میں اتر آیا۔ متوقع بارش سے بچنے کے لیے میں نے قدم تیز کر دیے لیکن ابھی سڑک پر بمشکل ایک جریب کا فاصلہ طے کرنے پایا تھا کہ ''اے بکری بکری'' کی آواز بلند ہوئی پھر اس کے ساتھ ہی دور پہاڑیوں نے اس آواز کو دبوچ کر دوبارہ ہوا میں اچھال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بھی اس آواز کو گیند کی طرح دبوچ لوں مگر ہمیشہ کے لیے اپنی جیب میں ڈال لوں۔

میں ٹھہر گیا۔ وہی مانوس صدا تھی جو اس سے قبل میں کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ بظاہر

''اے بکری بکری'' تین معمولی لفظ ہیں اور کاغذ پر کوئی ایسا تصور پیش نہیں کرتے جو انوکھا اور حسین ہو مگر واقعہ ہے کہ میرے لیے ان میں وہ سب کچھ تھا جو روح کو مسرور کر سکتا ہے۔ جونہی یہ آواز میری سماعت سے مس ہوئی مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے صدیوں کی رکی ہوئی یہ آواز نکلی ہے اور سیدھی آسمان تک پہنچ گئی ہے۔

''اے'' بالکل دھیمی آواز میں اور '' بکری بکری'' بلند اور فلک رس سروں میں۔ ایک لمحہ کے لیے یہ نعرہ شباب پہاڑیوں کی سنگین دیواروں میں گونجتا ڈوبتا ابھرتا تھرتھراتا اور رباب کے تاروں کی آخری لرزش کی طرح کانپتا فضا میں گھل مل جاتا۔

کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں۔ فضا نم آلود تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں اس نمی نے غنودگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں نے اوپر پہاڑی پر اگی ہوئی ہری ہری جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور ان کے عقب میں مجھے دو تین سفید بکریاں نظر آئیں...... میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ایک منہ زور بکری وزیر کو گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ اور وہ اس کو ڈانٹ بتانے کے لیے ''اے بکری بکری'' پکار رہی تھی۔ اس کا منہ غصہ اور زور لگانے کے باعث پگھلے ہوئے تانبے کی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسی کو پوری طاقت سے کھینچنے میں اس کا سینہ غیر معمولی طور پر تن گیا تھا۔ سر پیچھے جھکا تھا۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے سر پر سے ڈوپٹہ اتر کر بانہوں میں چلا آیا تھا۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کی لٹیں بل کھاتی ہوئی سنپولیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

ایک سبز جھاڑی کے پاس پہنچ کر بکری دفعتاً ٹھہر گئی اور اس کے نرم نرم پتوں کو

اپنی تھوتھنی سے سونگھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر وزیر نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا اترا ہوا ڈوپٹہ ایک بڑے سے پتھر پر رکھ کر اس نے پاس والے درخت کے تنے سے بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسی باندھی اور دوسرے پیڑ کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ کر جھولا جھولنے لگی۔

میں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ بازو اوپر اٹھانے کے باعث اس کی کھلی آستینیں نیچے ڈھلک آئیں۔ کپڑے کے یہ چھلکے جب اترے تو اس کے بازو کندھوں تک عریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت بانہیں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کے دو بڑے دانت اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں بے داغ ہموار اور زندگی سے بھرپور۔

وہ جھولا جھول رہی تھی اور اس کے دونوں بازو کچھ اس انداز سے اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر جائے گی۔ جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر میں اس کے سامنے آ گیا۔ دفعتاً اس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ سٹ پٹائی ٹہنی کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ گری سنبھلی اور حلق میں سے ایک مدھم چیخ نکالتی دوڑ کر ڈوپٹہ لینے کے لیے پتھر کی طرف بڑھی...... مگر ڈوپٹہ میری بغل میں تھا۔

اس نے ڈوپٹہ کی تلاش میں یہ جانتے بوجھتے کہ وہ میری بغل میں ہے ادھر ادھر دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے ابھر آئے۔ گال اور سرخ ہو گئے اور سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں بازوؤں کی مدد سے اس نے اپنے سینے کی شوخیوں کو چھپا لیا اور انہیں اور زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی وہ پتھر پر

بیٹھ گئی۔ اس پر بھی جب اسے اطمینان نہ ہوا تو اس نے گھٹنے اوپر کر لیے اور بگڑ کر مجھ سے کہنے لگی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں میرا دوپٹہ لائیے"۔

میں بڑھا اور بغل میں سے دوپٹہ نکال کر اسکے گھٹنے پر رکھ دیا۔ مجھے اس کے بیٹھنے کا انداز بہت ہی پسند آیا چنانچہ میں بھی اسی طرح اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وزیر جوان آوازوں کا ایک بہت بڑا انبار ہے اور میں...... اور میں خدا معلوم کیا ہوں۔ اس کو ہاتھ لگاؤں تو وہ باجے کی طرح بجنا شروع ہو جائے گی۔ ایسے سر اس میں سے نکلیں گے جو مجھے اوپر بہت اوپر لے جائیں گے اور زمین اور آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق کر دیں گے جہاں میں کوئی آواز نہ سن سکوں گا۔

وزیر نے مجھے جنگلی بلی کی طرح گھور کر دیکھا گویا کہنا چاہتی ہے اب جاؤ یہاں دھرنا دیکر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ میں نے اس کے خاموش حکم کی کوئی پروا نہ کی اور کہا۔

"چشمے سے واپس آ رہا تھا کہ تمہاری آواز سنی۔ بے اختیار کھنچا چلا آیا۔ وزیر...... تمہاری یہ آواز مجھے یقیناً پاگل بنا دے گی...... جانتی ہو پاگل آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں"۔

میری بات سن کر اس کو حیرت ہوئی "یہ کیا پاگل پن ہے...... میری آواز کسی کو کیوں پاگل بنانے لگی"۔

میں نے کہا "جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو...... دنیا میں یہ راگ راگنیاں کہاں سے آئی ہیں...... لیکن چھوڑو اس قصے کو یہ بتاؤ میری ایک بات مانو گی؟"

''مان لوں گی پر آپ یہ تو کہیے بات کیا ہے؟''

''ایک دفعہ میری خاطر بکری بکری کا نعرہ بلند کرو''۔

مجھے ہاتھ سے دھکا دے کر اس نے تیز لہجے میں کہا ''یہ کیا پاگل پن ہے۔بنانے کے لیے ایک صرف میں ہی رہ گئی ہوں''۔

''وزیر بخدا میں تمہیں بنا نہیں رہا۔ مجھے تمہاری یہ آواز پسند ہے...... جھوٹ کہوں تو...... لے اب مان بھی جاؤ...... بس ایک بار''۔

''جی نہیں''۔

''میں تم سے التجا کرتا ہوں''۔

''میں نے یہ آواز نہ کبھی نکالی ہے نہ اب نکالوں گی''۔

''میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں''۔

''یا اللہ...... یہ کیا مصیبت ہے''۔ وزیر نے اپنا بدن سکیڑ لیا ''اور اگر میں نہ مانوں تو...... یعنی یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میں اسی وقت آپ کے کہنے پر بیکار چلانا شروع کر دوں...... آپ تو خواہ مخواہ چھیڑ خانی کر رہے ہیں اور میں نگوڑی جانے کیا سمجھ رہی ہوں...... بھئی ہوگا ہمیں یہ مذاق اچھا نہیں لگتا''۔

''وزیر! میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا ''میری طرف دیکھو...... میرے چہرے سے تم اس بات کا اطمینان کر سکتی ہو کہ میں ہنسی مذاق نہیں کر رہا''۔

اس نے میرے چہرے کی طرف مصنوعی غور سے دیکھا اور میری ناک پر انگلی رکھ کر کہا ''آپ کی ناک پر یہ ننھا سا تل کتنا بھلا دکھائی دیتا ہے''۔

اس وقت میرے جی میں آئی کہ میں اس پتھر پر جس پر وہ بیٹھی ہوئی ہے میں

اپنی ناک گھسنا شروع کر دوں تا کہ وہ ننھا سا تل ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ وزیر نے میری طرف دیکھا تو وہ یہ سمجھی کہ میں روٹھنے کا ارادہ کر رہا ہوں چنانچہ اس نے فوراً اپنی بکریوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا "بابا آپ خفا نہ ہوجیے"۔

قریب تھا کہ وہ اپنی مخصوص آواز بلند کرے کہ ایکا ایکی جھجک اس پر غالب آ گئی۔ بہت زیادہ شرما کر اس نے اپنی گردن جھکالی "پر میں پوچھتی ہوں اس میں خاص بات ہی کیا ہے"۔

میں نے بگڑ کر کہا "وزیر تم اب باتیں نہ بناؤ"۔

دوسری طرف منہ کر کے اس نے ایکا ایکی بلند آواز میں "اے بکری بکری" پکارا اس کے بعد شرمیلی ہنسی کا ایک فوارہ سا اس کے منہ سے چھوٹ پڑا۔ میں بلندیوں میں پرواز کر گیا...... کتنی صاف اور شفاف آواز تھی۔ ڈھلی ہوئی فضا میں اس کی گونج دیر تک دور نظر سے اوجھل ہو جانے والے پرندوں کے پروں کی طرح چمکتی رہی پھر جذب ہو گئی۔

وزیر کی طرف میں نے دیکھا۔ اب وہ خاموش تھی۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر صاف تھا۔ آنکھیں نہاتی ہوئی چڑیوں کی طرح بے قرار تھیں ہنسنے کے باعث ان میں آنسو بھر آئے تھے۔ ہونٹ اس انداز سے کھلے ہوئے تھے کہ میرے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا ہو گئی...... خدا معلوم کیا ہوا...... میں نے وزیر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کا سر میری گود میں ڈھلک آیا...... لیکن ایکا ایکی زور سے وہ اپنا بازو میرے جھکے ہوئے سر اور اپنے متحیر چہرے کے درمیان لے آئی اور دھڑکتے ہوئے لہجہ میں کہنے لگی "آہ...... ہٹائیے...... ہٹائیے ان ہونٹوں کو"۔

میری گود سے نکل کر وہ بھاگ گئی اور میرے ہونٹوں کی تحریر نامکمل رہ گئی۔

اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں...... یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں میں اٹکا رہے گا۔

☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net All Rights Reserved ©2003-2006

نعرہ

اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اترا اور ان تمام منزلوں کا بوجھ اس کے چوڑے مگر دبلے کاندھوں پر سوار ہو گیا۔ جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لیے اوپر چڑھ رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور کچھ ہلکا ہو جائیگا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے دل میں سوچا تھا۔ مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پکارتے ہیں اس کی بپتا ضرور سنے گا اور کرایہ چکانے کے لیے اسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا...... بخش دیگا...... یہ سوچتے ہوئے اس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی لیکن فوراً ہی اس کو اصلیت معلوم ہو گئی تھی...... وہ بھیک مانگنے تو جا رہا تھا اور بھیک ہاتھ پھیلا کر آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے دکھ درد سنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے......

اس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اس نے اپنے غرور کو اس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کیا کرتی ہے۔ نکال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دیا بجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہو گیا جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کرتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں۔

اس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں نے اس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدی سی آواز گونجی۔

"کیشو لال...... کھولی پانچویں دوسرا مالا...... دو مہینوں کا کرایہ...... لے آئے ہو کیا؟"

یہ سن کر اس نے اپنا دل جس کے سارے پرانے اور نئے گھاؤ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کرید کرید کر ہرے کر چکا تھا۔ سیٹھ کر دکھانا چاہا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی پر...... سیٹھ جی نے کچھ سننا نہ چاہا اور اس کے سینے میں ایک بلا سا مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنے وہ تمام دکھ جو بیت چکے تھے گئے گزرے دنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اس نے اپنے دل میں بھر لیے تھے اور ان تمام زخموں کی جلن جو مدت ہوئی مٹ چکے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اکٹھی کر کے اپنی چھاتی پر جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو کیسے سنبھالے؟

اس کے گھر میں بن بلائے مہمان آ گئے ہوتے تو وہ ان سے بڑے روکھے پن سے کہہ سکتا تھا "جاؤ بھئی جاؤ میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارت کر سکوں" لیکن یہاں تو قصہ ہی دوسرا تھا۔ اس نے تو اپنے بھولے بھٹکے دکھوں کو ادھر ادھر سے پکڑ کر اپنے سینے میں جمع کیا تھا۔ اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟

افراتفری میں اسے کچھ پتا نہ چلا تھا کہ اس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی

ہیں۔ پر جوں جوں اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ پہچاننے لگا کہ فلاں دکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اسے فلاں وقت پر ہوا تھا اور جب یہ سوچ بچار شروع ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر دور دھند ہٹا دی جو ان پر لپٹی ہوئی تھی اور کل کے تمام درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اس نے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔

اس نے سوچا تھوڑے سے وقت میں اس نے بہت کچھ سوچا۔ اس کے گھر کا اوندھا لیمپ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اس کے میلے بدن سے چمٹ گئے جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اسے ان داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دور جانے کہاں بیٹھا تھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی ایک جنبش کچھ کا کچھ کر سکتی تھی وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اسے خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا خیال آیا تھا مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کر سکا۔ وہ سخت گھبرا گیا۔ اس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصے میں آ کر اسے گالی دی۔ گالی...... یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا۔ اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ جس طرح کسی گرما گرم جلسے میں کسی شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس نے بہت جتن کیے کہ اس کے وہ دکھ درد جو سیٹھ کو دکھانے کے لیے اکٹھے کیے تھے چپ چاپ

رہیں۔ پر کچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے منہ سے نکلنا تھا کہ تمام بے چین ہو گئے اور اندھا دھند ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ اب تو وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہہ سکا اور اس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی سے تپ رہی تھیں۔ آنسو آ گئے جس سے ان کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دھواں نکلنے لگا۔

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا۔ سیٹھ کے جھریاں پڑے ہوئے چہرے پر قے کر دی مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور...... اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور ان کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر رکھے کے باعث گیلے ہو رہے تھے ناچنے لگے۔

اس کی آنکھیں ہنسیں اس کا دل بھی ہنسا یہ سب کچھ ہوا پر وہ کڑواہٹ دور نہ ہوئی جو اس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وہ اسے تھوک دیتا مگر وہ تو بہت بری طرح اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔ اور نکالے نہ نکلتی تھی اور پھر ایک عجیب قسم کا دکھ جو اس گالی نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا فضول سمجھتی تھیں۔ اس کے سینے کے اندر اتر کر آنسو بہا رہی ہیں۔ جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اس کا

ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف حفاظت کے لیے بڑھا پر اس گالی کی ساری گرد اس پر پھیل چکی تھی ...... اسے کچھ خبر نہ تھی ...... وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہا کرتی۔

وہ جب نیچے اترا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھری رہ گئی ہیں۔

ایک نہیں دو گالیاں ...... بار بار دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کے پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا وہ کیسے اس ...... اس ...... اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گڑبڑ کا نام کیا رکھے جو اس کے دل اور دماغ میں ان گالیوں نے مچا رکھی تھی۔ وہ کیسے اس تپ کو دور کر سکتا تھا جس میں وہ پھنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟ ...... پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑہ بنا ہوا تھا جس میں بہت سے پہلوان کشتی لڑ رہے ہوں جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا کسی دوسرے خیال سے جو پہلے ہی وہاں موجود ہوتا بھڑ جاتا اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔

چلتے چلتے جب ایکا ایکی اس کے دکھ تے کی صورت میں باہر نکلنے کو تھے۔ اس کے جی میں آئی جی میں کیا آئی مجبوری کی حالت میں وہ اس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ کہنے ہی والا تھا۔ ”بھیا میں رو گی ہوں“ مگر جب اس نے اس راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وہ کھمبا جو اس کے پاس ہی زمین میں گڑھا تھا۔ اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا اور جو

کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نگل گیا۔

فٹ پاتھ پر چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ ان پتھروں پر چل رہا تھا آج تک کبھی اس نے ان کی سختی محسوس نہ کی تھی مگر آج ان کی سختی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اس کے قدم پڑ رہے تھے۔ اس کے دل کے ساتھ ٹکرا رہا تھا...... سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اس کا بند ڈھیلا ہو گیا۔

چلتے چلتے ایک لڑکی سے ٹکر ہوئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے جھٹ اس آدمی کی طرح جس کی جھولی سے بیر گر رہے ہوں۔ ادھر ادھر اپنے ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے چلنا شروع کر دیا۔

اس کا دماغ اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ سارے کا سارا بہت پیچھے رہ گیا ہے اور دماغ بہت آگے نکل گیا۔ کئی بار اسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔

وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ جس کے ایک طرف سڑک پر پوں پوں کرتی موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے گاڑیاں ٹرامیں بھاری بھر کم ٹرک لاریاں یہ سب سڑک کی کالی چھاتی پر دندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہوا تھا۔ پر اسکے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے جیسے ریل گاڑی کا انجن زائد بھاپ باہر نکال رہا ہے۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے۔ "چاؤں" کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے.....گالی.....گالی ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھاڑی کے کانٹوں سے کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا۔ اتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

اسے اس نمک لگی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا۔ جو اسکے گھر میں پڑے رکھا کے باعث گیلی ہو رہی تھی اور نہ اسے روٹی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور ان تیس برسوں میں جن پر ماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے۔ اس بکرے جیسی ڈاڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام دے۔ شام کو تاڑی کی ایک بوتل کے لیے دونی پیدا کرے یا اس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے۔ مکان اور کرایوں کا فلسفہ اس کی سمجھ سے سدا اونچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تھا تو سمجھتا کہ زبردستی اس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چکتا نہ کر سکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہو گیا کہ وہ اسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہی تھی جو اسے کھائے جا رہی تھی۔ اسے ان بیس روپوں کی پروا نہ تھی جو اسے آج نہیں کل ادا کر دینے تھے وہ ان دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا جو ان بیس روپے کے بیچ میں سے نکلی تھیں۔ نہ وہ بیس روپے کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھالی جیسے منہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔

مان لیا وہ دھنوان تھا۔ اس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں جن سے ایک سو چوبیس کمروں کا کرایہ اس کے پاس آتا تھا۔ پر ان ایک سو چوبیس کمروں میں جتنے لوگ رہتے ہیں اس کے غلام تو نہیں اور اگر غلام بھی ہیں تو وہ انہیں گالی کیسے دے سکتا ہے؟

ٹھیک ہے اسے کرایہ چاہیے پر میں کہاں سے لاؤں؟ پانچ برس تک اس کو دیتا ہی رہا ہوں۔ جب ہو گا دے دوں گا۔ پچھلے برس برسات کا سارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا۔ پر میں نے اسے کبھی گالی نہ دی۔ حالانکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں۔ میں نے سیٹھ سے ہزار بار کہا کہ سیڑھی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے۔ اسے بنوا دیجیے۔ پر میری ایک نہ سنی گئی۔ میری پھول سی بچی گری۔ اس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لیے بے کار ہو گیا۔ میں گالیوں کے بجائے اسے بددعا دے سکتا تھا پر مجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا...... دو مہینے کا کرایہ نہ چلانے پر میں گالیوں کے قابل ہو گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے بچے اپولو بندر پر میرے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر کر مونگ پھلی کھاتے ہیں۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے پاس تھی اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہو گی پر وہ غریب کیسے ہو گیا؟...... اسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی دی گئی تھی۔ ورنہ اس گنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ کرسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اسے دو گالیاں سنا دیتا۔ گویا کسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا بہت بری بات ہے۔ اب یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ سچ پوچھیے تو اس نے

کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ پر پچھلے مہینے ایکا ایکی اس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اس کے دوا دارو پر وہ تمام روپے خرچ ہو گئے جو کرائے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا۔ لیکن یہاں اس کے ہونے والے بچے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اس کو اولاد بہت پیاری تھی جو پیدا ہو چکی تھی۔ اور جو پیدا ہونے والی تھی۔ سب کی سب اسے عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟ کیا وہ اس بچے کا باپ نہ تھا؟ باپ تھا...... وہ تو صرف دو مہینے کے کرایے کی بات تھی۔ اگر اسے اپنے بچے کے لیے چوری کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا......

چوری نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا...... یوں سمجھیے کہ وہ اپنے بچے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر وہ چور کبھی نہ بنتا...... وہ اپنی چھنی ہوئی چیز واپس لینے کے لیے لڑنے مرنے کو تیار تھا۔ پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اس وقت جب سیٹھ نے اسے گالی دی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیتا اور اس تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز رنگ کے نوٹ نکال کر بھاگ جاتا۔ جن کو وہ آج تک الاجونتی کے پتے سمجھا کرتا تھا...... نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہیں کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اسے گالی کیوں دی؟...... پچھلے برس چوپاٹی پر ایک گاہک نے اسے گالی دی تھی۔ اس لیے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی پر چار دانے کڑوے چلے گئے تھے اور اس کے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دھول جمائی تھی کہ دور بنچ پر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سن لی تھی۔ مگر سیٹھ نے اسے

دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا...... کیشو لال کھاری سینگ والا جس کی بابت مشہور تھا کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا...... سیٹھ نے ایک گالی دی وہ کچھ نہ بولا اور دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے مٹی کا پتلا ہے...... پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر خاموش رہا اس لیے کہ وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا...... مگر اس نے اپنا غرور اپنے سے کیوں الگ کیا؟ سیٹھ سے گالیاں لینے کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایکا ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اسے نہیں کسی اور کو گالیاں دی تھیں...... نہیں نہیں گالیاں اسے ہی دی گئی تھیں۔ کسی اور کو دی گئی ہوتیں تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو اس کے سینے میں بلڈ سا مچ رہا تھا کیا بغیر کسی وجہ کے اسے دکھ دے رہا تھا؟ اس کو دو گالیاں دی گئی تھیں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں......

گالیاں...... گالیاں...... وہ جھنجھلا گیا...... وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ ان گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اسے ان کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اسے بہت چڑچڑا بنا رہی تھی۔ چنانچہ اس چڑچڑے پن میں اس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے دل ہی دل میں گالیاں دیں۔ ''یوں اکڑ کے چل رہے تھے۔ جیسے ان کے باوا کا راج ہے''۔

اگر اس کا راج ہوتا تو وہ سیٹھ کو مزہ چکھا دیتا جو اسے اوپر تلے دو گالیاں سنا کر

اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیے ہیں...... سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچوں بیچ کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ بلبلا اٹھتا پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو جی بھر کر ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دکھنے لگتا...... پر اس وقت اسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی...... کیوں؟...... وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپا مار سکتا تھا۔ اسے کس بات کی رکاوٹ تھی...... رکاوٹ تھی...... رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش ہو رہا۔

اس کے قدم رک گئے اس کا دماغ بھی ایک دو پل کے لیے ستایا اور اس نے سوچا کہ چلو ابھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ کر ہی دوں...... بھاگا ہوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اس کی تجوری پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگرمچھ کے منہ کی طرح کھلتا ہے...... لیکن وہ کھمبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا؟ سیٹھ کے گھر کی طرف پلٹا کیوں نہیں تھا؟...... کیا اس میں جرات نہ تھی؟

اس میں جرات نہ تھی...... کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس کی ساری طاقت سرد پڑ رہی تھی...... یہ گالیاں...... وہ ان گالیوں کو کیا کہتا...... ان گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر رولا سا پھیر دیا تھا...... صرف دو گالیوں نے...... حالانکہ پچھلے ہندو مسلم فسادات میں ایک ہندو نے اسے مسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور ادھ موا کر دیا تھا اور اسے اتنی محسوس نہ ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی...... کیشو لال کھاری سینگ والا جو اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی

بیمار نہیں ہوا۔ آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے......اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؟......دو گالیوں نے!

گالیاں......گالیاں......کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے۔ باہر نکال دے جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے پر یہ کیسے ہو سکتا تھا......اس کا سینہ مربے کا مرتبان تھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے۔ جس سے یہ گالیاں دور دفع ہوں......کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اسے دکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؟......ہوگا پر کسی کو اس کے دل کے حال کا کیا پتا تھا۔ وہ کھلی کتاب تھوڑی تھا اور نہ اس نے اپنا دل باہر لٹکا رکھا تھا۔ اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟

نہ معلوم ہو!......پرماتما کرے کسی کو معلوم نہ ہو......اگر کسی کو اندر کی بات کا پتہ چل گیا تو کیشو لال کھاری سینگ والے کے لیے ڈوب مرنے کی بات تھی گالیاں سن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟

معمولی بات نہیں بری بات تھی......ہمالہ پہاڑ جتنی بڑی ہے......اس سے بھی بڑی بات ہے۔ اس کا غرور مٹی میں مل گیا تھا۔ اس کی ذلت ہوئی ہے......اس کی ناک کٹ گئی ہے......اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ چلو بھئی چھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اس کا پیچھا چھوڑ دیں......وہ کمینہ تھا۔ ذلیل تھا۔ نچ تھا۔ گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا۔ کتا تھا۔ اس کو گالیاں ملنا ہی چاہیے تھیں......نہیں نہیں کسی کو کیا

مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور بغیر کسی قصور کے۔ وہ اسے چانٹہ چبا جاتا...... اماں ہٹاؤ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں...... تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔ بڑے مزیدار گھونٹ تھے چلو یہی سہی...... اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ سچ کہتا ہوں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر ادھر چل رہے ہیں۔ میں ان سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم مجھے اب زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا...... مر جاؤں سچ کہتا ہوں مر جاؤں گا اور میری رادھا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے...... یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ میں نے سیٹھ سے دو گالیاں سنیں اور خاموش رہا جیسے میرے منہ پر تالا لگا ہوا ہے۔ میں لولا لنگڑا اپاہج تھا...... پرماتما کرے میری ٹانگیں اس موٹر کے نیچے آ کر ٹوٹ جائیں میرے ہاتھ کٹ جائیں۔ میں مر جاؤں تاکہ یہ بک بک تو ختم ہو...... توبہ...... کوئی ٹھکانہ ہے اس دکھ کا۔ کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کر دوں...... اس ٹرام کے نیچے سر دے دوں زور زور سے چلانا شروع کر دوں...... کیا کروں کیا نہ کروں؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایکا ایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ کھڑا ہو جائے اور سب ٹریفک کو روک کر جو اس کی زبان پر آئے بکتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کا سینہ سارے کا سارا خالی ہو جائے یا پھر اس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلانا شروع کر دے ''مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ''۔

اتنے میں ایک آگ بجھانے والا انجن سڑک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور ادھر اس موڑ میں گم ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ اونچی آواز میں کہنے ہی والا تھا "ٹھہرو...... میری آگ بجھاتے جاؤ"۔ مگر نہ جانے کیوں رک گیا۔

ایکا ایکی اس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے۔ لیکن جونہی اس کی رفتار بڑھی۔ اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے...... دو مہینے کا کرایہ اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا...... سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے سیٹھ کی بھدی آواز اس کے گنجے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور...... یہ موٹی گالی...... پھر دوسری...... اور اس کی خاموشی...... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑتڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے قدم اور تیز کیے اور آگ کا یہ چکر اتنی تیزی سے گھومنا شروع ہوا کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی جو اس کے آگے آگے زمین پر اچھلنے کودنے لگی۔ وہ اب دوڑنے لگا لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں چلایا "تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کس سے بھاگ رہے ہو؟ تم بزدل ہو؟"

اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ بریک سی لگ گئی اور وہ ہولے ہولے چلنے لگا...... وہ سچ مچ بزدل تھا...... بھاگ کیوں رہا تھا؟...... اسے تو انتقام لینا

تھا۔۔۔۔۔۔انتقام۔۔۔۔۔۔یہ سوچتے ہوئے اسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔۔۔۔۔لہو۔۔۔۔۔لہو۔۔۔۔۔اسے آسمان زمین سب لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے۔۔۔۔۔لہو۔۔۔۔۔اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں بھی لہو نچوڑ سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں لال ڈورے ابھر آئے۔ مٹھیاں بھینچ گئیں اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہوگئی۔۔۔۔۔اب وہ انتقام پر تل گیا تھا۔

وہ بڑھا۔

آنے جانے والے لوگوں میں سے تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔ آگے۔۔۔۔۔آگے۔

جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی ہے اسی طرح وہ بجلی کے کھمبوں دکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے۔۔۔۔۔آگے۔۔۔۔۔بہت آگے۔

راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی۔ اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس کے پاس سے بے پرواہوا کے مانند بڑھ گیا۔

وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو ایک بم بنا لیا تھا تاکہ وقت پر کام آئے۔

مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتا ہوا وہ اپولو بندر پر پہنچا۔۔۔۔۔

اپولو۔۔۔۔۔گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ پر جوڑے کسی لاش کے ارد

گر دبیٹھے ہیں۔ جب اس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا تو اسے یہ لمبی چوڑی لاش معلوم ہوئی...... اس سمندر کے اس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالی شان ہوٹل کی پیشانی کا برقی نام تھا۔ جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گدگدی پیدا کر رہی تھی۔

کیشو لال کھاری سینگ والا اس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اس نے اوپر دیکھا...... سنگین عمارت کی ذطرت جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور...... اس کے حلق سے ایک نعرہ...... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کی مانند نکلا...... ''ہت تیری......!''

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑ پھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑ اڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی کہا ''پگلا ہے''۔

☆☆☆

نکی

طلاق لینے کے بعد وہ بالکل نچنت ہو گئی تھی۔ اب وہ ہر روز کی دانتا کل کل اور مار کٹائی نہیں تھی۔ نکی بڑے آرام و اطمینان سے اپنا گزراوقات کر رہی تھی۔

یہ طلاق پورے دس برس کے بعد ہوئی تھی۔ نکی کا شوہر بہت ظالم تھا۔ پرلے درجے کا نکھٹو اور شرابی کبابی۔ بھنگ چرس کی بھی لت تھی۔ کئی کئی دن بھنگڑ خانوں اور تکیوں میں پڑا رہتا تھا۔ ایک لڑکا ہوا تھا۔ وہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ برس کے بعد ایک لڑکی ہوئی جو زندہ تھی اور اب نو برس کی تھی۔

نکی سے اس کے شوہر گام کو اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی کہ وہ اس کو مار پیٹ سکتا تھا۔ جی بھر کے گالیاں دے سکتا تھا۔ طبیعت میں آئے تو کچھ عرصے کے لیے گھر سے نکال دیتا تھا۔ اس کے علاوہ نکی سے اس کو اور کوئی سروکار نہیں تھا۔ نہیں محنت مزدوری کی جب تھوڑی سی رقم نکی کے پاس جمع ہوتی تھی تو وہ اسے زبردستی چھین لیتا تھا۔

طلاق بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔ اس لیے کہ میاں بیوی کے نباہ کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ یہ صرف گام کی ضد تھی کہ معاملہ اتنی دیر لٹکا رہا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ تھی کہ نکی کے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا۔ ماں باپ نے اس کو ڈولی میں ڈال کر گام کے سپرد کر دیا اور دو مہینے کے اندر اندر راہی ملک بقا ہوئے جیسے انہوں نے صرف اسی غرض کے لیے موت کو روک رکھا تھا۔ انہیں اپنی بیٹی کو ایک لمبی موت کے لیے گام کے حوالے کرنا تھا۔ بہت دور کے دو ایک رشتہ دار ہوں گے۔ مگر نکی

سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انہوں نے خود کو اور زیادہ دور کر لیا تھا۔

گام کیسا ہے یہ نکی کے ماں باپ اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی بیٹی ساری عمر روتی رہے گی۔ یہ بھی ان کو اچھی طرح معلوم تھا۔ مگر انہیں تو اپنی زندگی میں ایک فرض سبکدوش ہونا تھا اور وہ ایسے سبکدوش ہوئے کہ سارا بوجھ نکی کے ناتواں کاندھوں پر ڈال گئے۔

طلاق لینے کے لیے نکی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ کسی شریف سے نکاح کرنا چاہتی تھی دوسری شادی کا اس کو کبھی خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ طلاق ہونے کے بعد وہ کیا کرے گی۔ کیا نہیں کرے گی اس کے متعلق نکی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ اصل میں وہ ہر روز کی بک بک اور جھک جھک سے صرف ایک اطمینان کا سانس لینا چاہتی تھی۔ اس کے بعد جو ہونے والا تھا اس کو نکی بخوشی برداشت کرنے کے لیے تیار تھی۔

لڑائی جھگڑے کا آغاز تو پہلے ہی روز سے ہو گیا تھا۔ جب نکی دلہن بن کر گام کے گھر گئی تھی لیکن طلاق کا سوال اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب وہ گام کے سدھار کے لیے دعائیں مانگ مانگ کر عاجز آ گئی تھی اور اس کے ہاتھ اپنی یا اس کی موت کے لیے اٹھنے لگے تھے۔ جب یہ حیلہ بھی بے اثر ثابت ہوا تو اس نے اپنے شوہر کی منت سماجت کی کہ وہ اسے بخش دے اور علیحدہ کر دے مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ دس برس کے بعد تکیے میں ایک ادھیڑ عمر کی میراثن سے گام کی آنکھ لڑی اور ایک دن اس کے کہنے پر اس نے نکی کو طلاق دے دی اور بیٹی پر بھی اپنا کوئی حق نہ جتایا۔ حالانکہ نکی کو اس بات کا ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر اس کا شوہر طلاق پر راضی بھی ہو گیا تو وہ بیٹی کبھی اس کے حوالے نہیں کرے گا...... بہر حال نکی نچنت ہو

گئی اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرائے پر لے کر چین سے دن گزارنے لگی۔

اس کے دس برس اداس خاموشی میں گزر گئے تھے۔ دل میں ہر روز اس کے بڑے بڑے طوفان جمع ہوتے تھے مگر وہ خاوند کے سامنے اف تک نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ اسے بچپن ہی سے یہ تعلیم ملی تھی کہ شوہر کے سامنے بولنا ایسا گناہ ہے جو کبھی بخشا ہی نہیں جاتا۔ اب وہ آزاد تھی اس لیے وہ چاہتی تھی کہ اپنے دس برس کی بھڑاس کسی نہ کسی طرح نکالے۔ چنانچہ ہمسایوں سے اکثر اس کی لڑائی بھڑائی ہونے لگی۔ معمولی توں توں میں میں ہوتی جو گالیوں کی جنگ میں تبدیل ہو جاتی۔ نکی پہلے جس قدر خاموش تھی۔ اب اسی قدر ہی اس کی زبان چلتی تھی۔ منٹوں میں وہ اپنے مقابل کی ساتوں پیڑھیاں پن کر رکھ دیتی۔ ایسی ایسی گالیاں اور سٹھنیاں دیتی کہ حریف کے چھکے چھوٹ جاتے۔

آہستہ آہستہ سارے محلے پر نکی کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہاں کاروباری قسم کے مرد رہتے تھے۔ جو صبح سویرے اٹھ کر کام پر نکل جاتے تھے اور رات دیر سے گھر لوٹتے۔ سارے دن میں عورتوں میں جو لڑائی جھگڑا ہوتا۔ اس سے وہ مرد بالکل الگ تھلگ رہتے تھے ان میں سے شاید کسی کو پتا بھی نہیں تھا کہ نکی کون ہے اور محلے کی ساری عورتیں اس سے کیوں دبتی ہیں۔

چرخہ کات کر بچوں کے لیے گڈے گڑیاں بنا کر اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کام کر کے وہ گزر اوقات کے لیے کچھ نہ کچھ پیدا کر لیتی تھی۔ طلاق لیے اسے قریب قریب ایک برس ہو چلا تھا۔ اس کی بیٹی بھولی اب گیارہ کے لگ بھگ تھی اور بڑی سرعت سے جوان ہو رہی تھی نکی کو اس کے شادی بیاہ کی بڑی فکر تھی۔

اس کے اپنے زیور تھے۔ جو ایک ایک کر کے گام نے چٹ کر لیے تھے۔ ایک صرف ناک کی کیل باقی رہ گئی تھی۔ وہ بھی گھس گھسا کر آدھی رہ گئی تھی۔ اسے بھولی کا پورا جہیز بنانا تھا۔ اور اسکے لیے کافی روپیہ درکار تھا۔ تعلیم تھی وہ اس نے اپنی طرف سے ٹھیک دی تھی۔ قرآن ختم کرادیا تھا۔ معمولی حرف شناسی بھی کر لیتی تھی کھانا پکانا خوب آتا تھا۔ گھر کے دوسرے کام کاج بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ چونکہ نکی کو اپنی زندگی میں بہت تلخ تجربہ ہوا تھا اس لیے اس نے بھولی کو خاوند کا اطاعت گزار ہونے کے لیے کبھی اشارۃً بھی نہیں کہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی سسرال میں چھپر کھٹ پر بیٹھی راج کرے۔

ماں کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا اس بپتا کا حال بھولی کو معلوم تھا۔ مگر ہمسایوں کے ساتھ جب نکی کی لڑائی ہوتی تھی۔ تو وہ پانی پی پی کر اسے کوستی تھیں اور یہ طعنہ دیتی تھیں کہ وہ مطلقہ ہے جس کو خاوند نے صرف اس لیے علیحدہ کر دیا تھا کہ اس غریب کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اور بہت سی باتیں اپنی ماں کے کردار کے طور و اطوار کے متعلق اس کی سماعت میں آئی تھیں۔ مگر وہ خاموش رہتی تھی۔ بڑے بڑے معرکے کی لڑائیاں ہوتیں مگر وہ کان سمیٹے اپنے کام میں لگی رہتی......

جب سارے محلے پر نکی کی دھاک بیٹھ گئی تو عورتوں نے مرعوب ہو کر اسکے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ کئی اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ جب ان کی اپنی کسی پڑوسن سے لڑائی ہوتی تو نکی ساتھ دیتی اور ہر ممکن مدد کرتی۔ اس کے بدلے میں اس کو کبھی قمیص کے لیے کپڑا مل جاتا تھا۔ کبھی پھل کبھی مٹھائی اور کبھی کبھی کوئی بھولی کے لیے سوٹ بھی سلوا دیتا تھا۔ لیکن جب نکی نے دیکھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن

اسے محلے کی کسی نہ کسی عورت کی لڑائی میں شریک ہونا پڑتا ہے اور اسکے کام کاج کا ہرج ہوتا ہے۔ تو اس نے پہلے دبی زبان سے پھر کھلے لفظوں میں اپنا معاوضہ مانگنا شروع کردیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی فیس بھی مقرر کرلی۔ معرکے کی جنگ ہو تو پچیس روپے۔ دن زیادہ لگیں تو چالیس۔ معمولی چخ کے صرف چار روپے اور دو وقت کا کھانا۔ درمیانے درجے کی لڑائی کے پندرہ روپے...... کسی کی سفارش ہو تو وہ کچھ رعایت بھی کردیتی تھی۔

اب چونکہ اس نے دوسروں کے لیے لڑنا اپنا پیشہ بنالیا تھا اس لیے اس محلے کی تمام عورتوں اور ان کی بہو بیٹیوں کے تمام فضیحتے یاد رکھنے پڑتے تھے۔ ان کا تمام حسب و نسب معلوم کرکے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا پڑتا تھا مثال کے طور پر اس کو معلوم تھا کہ اونچی حویلی والی سوداگر کی بیوی جو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ایک موچی کی بیٹی ہے اس کا باپ شہر میں لوگوں کے جوتے گانٹھتا پھرتا ہے۔ اور اس کا خاوند جو جناب شیخ صاحب کہلاتا تھا معمولی قصائی ہے اس کے باپ پر ایک رنڈی مہربان ہوگئی تھی۔ وہ اسی کے بطن سے تھا۔ اور یہ اونچی حویلی اس طوائف نے اپنے یار کو بنا کردی تھی۔

کس لڑکی کا کس کے ساتھ معاشقہ ہے۔ کون کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کون کتنے حمل گرا کی ہے۔ اس کا حساب سب نکی کو معلوم تھا۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے میں وہ کافی محنت کرتی تھی۔ کچھ مصالحہ اس کو اپنے موکلوں سے مل جاتا تھا۔ اسے اپنی معلومات کے ساتھ ملا کر وہ ایسے ایسے بم بناتی کہ مدمقابل کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ہوشیار وکیلوں کی طرح وہ سب سے وزنی ضرب صرف

اسی وقت استعمال کیا کرتی تھی جب لوہا پوری طرح سرخ ہو جاتا۔ چنانچہ یہ ضرب سولہ آنے فیصلہ کن ثابت ہوتی۔

جب وہ اپنے موکل کے ساتھ کسی محاذ پر جاتی تھی تو گھر سے پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر جاتی تھی۔ طعنے مہنوں اور گالیوں اور سٹھنیوں کو مصور بنانے کے لیے مختلف اشیا بھی استعمال کرتی تھی۔ مثال کے طور پر گھسا ہوا جوتا پھٹی ہوئی قمیص، چمٹا، چھلنی وغیرہ وغیرہ کوئی خاص تشبیہ دینی ہو یا کوئی خاص الخاص اشارہ یا کنایہ مطلوب ہو تو وہ اس غرض کے لیے کار آمد شے گھر ہی سے لے کر چلتی تھی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آج وہ جتنے کے لیے خیراں سے لڑی ہے۔ تو وہ ڈھائی مہینے کے بعد اسی خیراں سے ڈبل فیس لے کر اسے جتنے سے لڑنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ گھبراتی نہیں تھی۔ اس اپنے فن میں اس قدر مہارت ہو گئی تھی اور اس کی پریکٹس میں وہ اتنی مخلص تھی کہ اگر کوئی فیس دیتا تو وہ اپنی بھی دھجیاں بکھیر دیتی۔

نکی اب فارغ البال تھی۔ ہر مہینے اسے اب اتنی آمدن ہونے لگی تھی کہ اس نے پس انداز کر کے اپنی بھولی بھالی بیٹی کا جہیز بنانا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اتنے گہنے پاتے اور کپڑے لتے ہو گئے تھے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی بیٹی کو ڈولی میں ڈال سکتی تھی۔

اپنے ملنے والیوں سے وہ بھولی کے لیے کوئی اچھا سا بر تلاش کرنے کی بات کئی مرتبہ کر چکی تھی۔ شروع شروع میں تو اس کی کوئی اتنی جلدی نہیں تھی۔ مگر جب بھولی سولہ برس کی ہو گئی تو لوٹھا کی لوٹھا۔ قد کاٹھ کی چونکہ ایسی تھی۔ اس لیے چودھویں

برس ہی میں پوری جوان عورت بن گئی تھی۔ سترہویں میں تو ایسے لگتا تھا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ چنانچہ اب نکی کو دن رات اس کے بیاہ کی فکر ستانے لگی۔

نکی نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ کوئی صاف انکار نہیں کرتا تھا۔ مگر دل سے ہامی بھی نہیں بھرتا تھا۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ ہو نہ ہو لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کی یہ صفت کہ لڑنے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ دراصل اس کے آڑے آ رہی تھی۔ بعض گھروں میں تو وہ خود ہی سلسلہ جنبانی نہ کرتی۔ کہ اسکی کسی عورت کا اس نے ناطقہ بند کیا تھا۔ دن پر دن چڑھتے جا رہے تھے اور گھر میں پہاڑ سی جوان بیٹی کنواری بیٹھی تھی۔

نکی کو اپنے پیشے سے اب گھن آنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ ایسا ذلیل کام کیوں اس نے اختیار کیا۔ مگر وہ کیا کرتی محلے میں آرام چین کی جگہ پیدا کرنے کے لیے اسے پڑوسیوں کا مقابلہ کرنا ہی تھا۔ اگر وہ نہ کرتی تو اسے دب کے رہنا پڑتا۔ پہلے خاوند کے جوتے کھاتی تھی پھر ان کے پیر ازکی غلامی کرنی پڑتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ برسوں ذلیل رہنے کے بعد جب اسنے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دی۔ یہ قوتیں جھک کر اس کی امداد کی طالب ہوئیں۔ کہ دوسری قوتوں کو شکست دیں اور اس کو اس امداد پر کچھ اس طرح راغب کیا گیا کہ اس کو چسکہ ہی پڑ گیا۔

اس کے متعلق وہ سوچتی تو اس کا دل نہ مانتا تھا۔ کیونکہ اس نے صرف بھولی کی خاطر اس پیشے کو جسے اب لوگ ذلیل سمجھنے لگے تھے اختیار کیا تھا۔ یہ بھی کم عجیب چیز نہیں تھی۔ نکی کو روپے دے کر کسی عورت پر انگلی رکھ دی جاتی تھی اور اس سے کہا جاتا

تھا کہ وہ اس کی ساتوں پیڑھیاں پن ڈالے...... اس کے آباؤ اجداد کی ساری کمزوریاں ماضی کے ملبے سے کرید کرید کر نکالے اور اس کے وجود پر ڈھیر کر دے۔ نکی یہ کام بڑی ایمانداری سے کرتی وہ گالیاں جو ان کے منہ پر ٹھیک نہیں بیٹھتی تھیں اپنے منہ میں بٹھاتی۔ ان کی بہو بیٹیوں کے عیوب پر پردے ڈال کر وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں میں کیڑے نکالتی۔ غلیظ سے غلیظ گالیاں اپنے ان موکلوں کی خاطر خود بھی کھاتی...... پر اب کہ اس کی بیٹی کے بیاہ کا سوال آیا تھا۔ وہ کمینی نیچ اور ذلیل بن گئی تھی۔

ایک مرتبہ تو اس کے جی میں آئی کہ محلے کی ان تمام عورتوں کو جنہوں نے اس کی بیٹی کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا بیچ چوراہے میں جمع کرے اور ایسی گالیاں دے کہ ان کے دل کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں مگر وہ سوچتی کہ اگر اس نے یہ غلطی کر دی تو غریب بھولی کا مستقبل بالکل تیرہ و تار ہو جائے گا۔

جب چاروں طرف سے مایوسی ہوئی تو نکی نے شہر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا صرف یہی راستہ تھا۔ جس سے بھولی کی شادی کا کٹھن مرحلہ طے ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک روز بھولی سے کہا ''بیٹا! میں نے یہ سوچا ہے کہ اب کسی اور شہر میں جا کر رہیں''۔

بھولی نے چونک کر پوچھا ''کیوں ماں!''

''بس اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا'' نکی نے اس کی طرف ممتا بھری نظروں سے دیکھا اور کہا ''تیرے بیاہ کی فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔ یہاں بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ تیری ماں کو سب رذیل سمجھتے ہیں''۔

بھولی کافی سیانی ہوگئی تھی فوراً نکی کا مطلب سمجھ گئی اس نے صرف اتنا کہا "ہاں ماں!"

نکی کو ان دولفظوں سے سخت صدمہ پہنچا بڑے دکھی لہجے میں اس نے بھولی سے سوال کیا "کیا تو بھی مجھے رذیل سمجھتی ہے"۔

بھولی نے جواب نہ دیا اور آٹا گوندھنے میں مصروف ہوگئی۔

اس دن نکی نے عجیب عجیب باتیں سوچیں۔ اس کے سوال کرنے پر بھولی خاموش کیوں ہوگئی تھی۔ کیا وہ اسے واقعی رذیل سمجھتی تھی کیا وہ اتنا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ نہیں ماں کیا یہ باپ کے خون کا اثر تھا؟ بات میں سے بات نکل آتی اور وہ بری طرح ان میں الجھ جاتی۔ اسے بیتے ہوئے دس برس یاد آتے۔ بیاہی زندگی کے دس برس جس کا ایک ایک دن مارپیٹ اور گالی گلوچ سے بھرا تھا۔ پھر وہ اپنی نظروں کے سامنے مطلقہ زندگی کے دن لاتی...... ان میں بھی گالیاں ہی گالیاں تھیں جو وہ پیسے کی خاطر دوسروں کو دیتی رہی تھی تھک ہار کر وہ بعض اوقات کوئی سہارا ٹٹولنے لگتی اور سوچتی کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ طلاق نہ لیتی...... آج بیٹی کا بوجھ گاما کے کندھوں پر ہوتا۔ نکھٹو تھا۔ پرلے درجے کا ظالم تھا۔ عیبی تھا مگر بیٹی کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔ یہ اس کے عجز کی انتہا تھی۔

پرانی ماریں اور ان کے دیے ہوئے درد اب آہستہ آہستہ نکی کے جوڑوں میں ابھرنے لگے۔ پہلے اس نے کبھی اف تک نہیں کی تھی۔ پر اب اٹھتے بیٹھتے ہائے ہائے کرنے لگی۔ اس کے کانوں میں ہر وقت ایک شور سا برپا ہونے لگا۔ جیسے ان کے پردوں پر وہ تمام گالیاں اور سٹھنیاں ٹکرا رہی ہیں جو ان گنت لڑائیوں میں اس

نے استعمال کی تھیں۔

عمر اس کی زیادہ نہیں تھی۔ چالیس کے لگ بھگ تھی۔ مگر اب نکی کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس کی کمر جواب دے چکی ہے اس کی زبان جو قینچی کی طرح چلتی تھی اب کند ہوگئی ہے بھولی سے گھر کے کام کاج کے متعلق معمولی سی بات کرتے ہوئے اس کو مشقت کرنی پڑتی تھی۔

نکی بیمار پڑ گئی اور چارپائی کے ساتھ لگ گئی۔ شروع شروع میں تو وہ اس بیماری کا مقابلہ کرتی رہی۔ بھولی کو بھی اس نے خبر نہ ہونے دی کہ اندر ہی اندر کون سی دیمک اسے چاٹ رہی ہے۔ لیکن ایک دم وہ ایسی نڈھال ہوئی کہ اس سے اٹھا تک نہ گیا۔ بھولی کو بہت تشویش ہوئی۔ اس نے حکیم بلایا۔ جس نے نبض دیکھ کر بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں پرانا بکار ہے۔ علاج سے دور ہو جائے گا علاج باقاعدہ ہوتا رہا۔ بھولی سعادت مند بیٹیوں کی طرح ماں کی ہر ممکن خدمت بجا لا رہی تھی۔ اس سے نکی کے دکھی دل کو کافی تسکین ہوتی تھی۔ مگر مرض دور نہ ہوا۔ بخار پہلے سے تیز ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ نکی کی بھوک غائب ہوگئی۔ جس کے باعث وہ بہت ہی لاغر اور نحیف ہوگئی۔

عورتوں میں ایک خداداد وصف ہوتا ہے کہ مریض کی شکل دیکھ کر ہی پہچان لیتی ہیں کہ وہ کتنے دن کا مہمان ہے۔ ایک دو عورتیں جب بیمار پرسی کے لیے نکی کے پاس آئیں تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بمشکل دس روز نکالے گی چنانچہ یہ بات سارے محلے کو معلوم ہوگئی۔

کوئی بیمار ہو مرنے کے قریب ہو تو عورتوں کے لیے ایک اچھی خاصی تفریح کا

بہانہ نکل آتا ہے۔ گھر سے بن سنور کر نکلتی ہیں اور مریض کے سرہانے بیٹھ کر اپنے تمام مرحوم عزیزوں کو یاد کرتی ہیں ان کی بیماریوں کا ذکر ہوتا ہے وہ تمام علاج بیان کیے جاتے ہیں جو لاعلاج ثابت ہوئے تھے۔ پھر گفتگو کا رخ پلٹ کر قیصوں کے ڈیزائنوں کی طرف آ جاتا ہے۔

نکی ایسی باتوں سے بہت گھبراتی تھی۔ لیکن وہ خود چونکہ مریضوں کے سرہانے ایسی ہی باتیں کرتی رہی تھی اس لیے مجبوراً اسے یہ خرافات سننی پڑتی تھی...... ایک روز جب محلے کی بہت سی عورتیں اس کے گھر میں جمع ہو گئیں تو اس احساس نے اس کو بہت مضطرب کیا کہ اس کے جانے کا وقت آ چکا ہے ان میں سے ہر ایک کے چہرے پر یہ فیصلہ مرقوم تھا کہ نکی کے دروزے پر موت دستک دے رہی ہے۔ جو عورت آتی۔ اپنے ساتھ یہ کھٹ کھٹ لاتی۔ تنگ آ کر کئی دفعہ نکی کے جی میں آئی کہ کنڈی کھول دے اور دستک دینے والے فرشتے کو اندر بلا لے۔

ان بیمار پرس عورتوں کو سب سے بڑا افسوس بھولی کا تھا۔ نکی سے وہ بار بار اس کا ذکر کرتیں کہ ہائے اس بیچاری کا کیا ہوگا۔ دنیا میں اس غریب کی صرف ایک ماں ہے۔ وہ بھی چلی گئی تو اس کا کیا ہوگا۔ پھر وہ اللہ میاں سے دعا کرتیں کہ وہ نکی کی زندگی میں چند دنوں کا اضافہ کر دے۔ تاکہ وہ بھولی کی طرف سے مطمئن ہو کر مرے۔

نکی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دعا بالکل جھوٹی ہے۔ انہیں بھولی کا اتنا خیال ہوتا تو وہ اس کے رشتے سے انکار کیوں کرتیں۔ صاف انکار نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ یہ دنیا داری کے اصول کے خلاف تھا مگر کسی نے ہامی نہیں بھری تھی۔

وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں نکی کی چارپائی پڑتی تھی۔ بیار پرس عورتوں سے بھرا ہوا تھا...... بھولی نے انکے بیٹھنے کا انتظام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ پیڑھیاں کم تھیں اس لیے اس نے کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھا دی تھی۔ بھولی اس اہتمام و انتظام سے نکی کو بڑا صدمہ پہنچا تھا گویا وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح اس کی موت کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

بخار تیز تھا دماغ تپا ہوا تھا۔ نکی نے اوپر تلے بہت سی تکلیف دہ باتیں سوچیں تو بخار اور زیادہ تیز ہو گیا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ جلی جلدی اس نے بے جوڑ باتیں کرنے لگی۔ بیار پرس عورتوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ جو اٹھ کر جانے والی تھیں نکی کا وقت قریب دیکھ کر بیٹھ گئیں۔

نکی بکے جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سے لڑ رہی ہے۔ میں تیری ہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں...... جو کچھ تو نے میرے ساتھ کیا ہے وہ کوئی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ میں نے اپنے خاوند کی دس برس غلامی کی۔ اس نے مار مار کر میری کھال ادھیڑ دی۔ پر میں نے اف تک نہ کی...... اب تو نے...... اب تو نے مجھ پر یہ ظلم شروع کیے ہیں...... پھر وہ کمرے میں جمع شدہ عورتوں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی "تم...... تم یہاں کیا کرنے آئی ہو...... نہیں نہیں...... میں کسی فیس پر بھی لڑنے کے لیے تیار نہیں...... تم میں سے ہر ایک کے عیب وہی ہیں۔ ...... پرانے...... صدیوں کے پرانے جو کیڑے...... جو کیرے پھاماں می ہیں وہی تم سب میں ہیں...... تم میں سے قریب قریب ہر ایک کا خصم رنڈی باز ہے...... جو بری بیماری پھاتو کے خاوند کو لگی ہے وہی جنتے کے گھر والے کو چمٹی ہوئی ہے...... تم

سب کوڑھی ہو......اور یہ کوڑھ تم نے مجھے بھی دے دیا ہے......لعنت ہو تم سب پر خدا کی......خدا کی......خدا......'' اور وہ ہنسنے لگی۔ ''میں اس خدا کو بھی جانتی ہوں......اس کی ہشت پشت کو اچھی طرح جانتی ہوں......یہ کیا دنیا بنائی ہے تو نے......یہ دنیا جس میں گام ہیں۔ جس میں پھاماں ہے جو اپنے خاوند کو چھوڑ کے دوسروں کے بستر گرم کرتی ہے......اور مجھے فیس دیتی ہے......بیس روپے گن کر میرے ہاتھ پر رکھتی ہے کہ میں نورفشاں کے پرانے یارانوں کا پول کھولوں......اور نورفشاں میرے پاس آتی ہے کہ نکی یہ پانچ زیادہ لو اور جاؤ امینہ سے لڑو وہ مجھے ستاتی ہے......یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے تو نے اپنی دنیا میں......میرے سامنے آ......ذرا میرے سامنے آ......''

آواز نکی کے حلق میں رکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد گھنگھرو بجنے لگا تشنج سے وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی اور ہذیانی کیفیت میں چلا رہی تھی'' گام مجھے نہ مار......او گام او خدا مجھے نہ مار......او خدا......او گام''!

او خدا او گام بڑبڑاتی آخر نکی بیمار پرس عورتوں کے اندازے کے عین مطابق مر گئی۔ بھولی جوان عورتوں کی خاطر دار میں مصروف تھی۔ پانی کا گلاس ہاتھ سے گرا کر دھڑ ادھڑ اپنا سر پیٹنے لگی۔

☆☆☆

ننگی آوازیں

بھولو اور گاما دو بھائی تھے بے حد محنتی بھولو قلعی گر تھا۔صبح دھونکنی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں بھانڈے قلعی کرا لو۔کی صدائیں لگاتا رہتا۔شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔

گاما خوانچہ فروش تھا۔اسکو بھی دن بھر چھابڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا تین چار روپے یہ بھی کما لیتا تھا۔مگر اس کو شراب کی لت تھی۔شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیے تھی۔پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی سہارے جیتا ہے۔

بھولو اور گاما سے جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لت بہت بری ہے۔شادی شدہ ہو۔بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھابی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ننگی بچی اچھی لگتی ہے تجھے اپنی گھر والی۔گاما نے اس کان سے سنا اور اس کان سے نکال دیا۔بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے۔ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا۔وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر جو کہ دوسری منزل پر تھا اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

سردیاں آرام سے گزر گئیں۔گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔

بھولو تو اوپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی اور اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلن کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے اردگرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہو گیا۔ کلن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند ہی دنوں میں بانس وغیرہ گاڑ کر ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کر دیا۔ یوں ہوا تو رک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس سے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا نا بھائی میں اپنے زور پنڈے پر جونکیں نہیں لگوانا چاہتا لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھاٹ بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ روز ہی میں اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے بھائی سے کہا ''میری شادی کر دو نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا''۔

گاما نے جب یہ سنا تو اس نے کہا ''یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں''۔

بھولو بہت سنجیدہ ہو گیا ''تمہیں نہیں معلوم...... پندرہ راتیں ہو گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے''۔

گاما نے پوچھا ''کیوں کیا ہوا؟''

"کچھ نہیں یار...... دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے...... عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں نیند کیا آئے گی خاک؟"

گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا "وہ جو کلن ہے اسنے تو حد ہی کر دی...... سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی...... بچے پڑے رو رہے ہوتے ہیں مگر وہ......"

گاما حسب معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کے بل پڑ گئے۔ جب یہ لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا "ہاں بھئی کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے؟" کوئی کہتا "میاں مفت میں مزے لیتے ہو...... ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو...... سو فیصدی گاتی بولتی"۔

بعضوں نے گندے گندے مذاق کیے بھولو چڑ گیا۔ گاما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا "تم نے تو میرا مذاق بنا دیا ہے...... دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے جھوٹ نہیں ہے۔ میں انسان ہوں خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے...... تم میری شادی کا بندوبست کرو ورنہ قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا...... بھابی کے پاس میرا پانچ سو روپیہ جمع ہے...... جلدی کر دو بندوبست"۔

گاما نے اپنی مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا پھر کہا "اچھا ہو جائے گا بندوبست

تمہاری بھابی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے''۔

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہوگئی۔صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔خوبصورت تھی۔گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ویسے صمد شریف تھا محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔بھولو تختی تھا۔تندرست تھا۔جون کے وسط میں شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو اپنی دلہن کے لیے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ٹاٹ خوب کس کر لگایا۔چارپائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کیا۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کا عجیب سا لگا۔وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔یہی وجہ تھی کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا تھا۔پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تر بتر ہوگیا۔اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا...... کیا آس پاس کے لوگ ی آوازیں سنیں گے۔کیا وہ بھی اسی کے مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں گے۔کسی

نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہوگیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے۔ پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے...... لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں...... ایک کوٹھا ہے اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے۔ اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے۔ سینکڑوں آنکھیں سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آجاتی ہے...... یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ سامنے کلن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گاما لیٹا ہے۔ تہہ بند کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عیدو حلوائی کی کنواری بیٹی شاداں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک کر دیکھ رہا ہے۔

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو ضرور خودکشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی جو طوفان مچتا وہ الگ۔

''اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو...... میرے ساتھی اور بھی تو ہیں آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی مجھے بھی''۔ بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دلہن کی ڈولی گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہوگئی۔ لوگوں نے بھولا اور گاما کو خوب

مبارکبادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے۔ انہوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لیے کئی کامیاب گر بتائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا تھا۔ گاما نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیے۔ ایک دوست اس کے لیے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے گھونگھٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کرتہ اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا۔ مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا نیچے کوارٹر ہی میں ساری رات کاٹے گا مگر جب گرمی انتہا کر پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دلہن سے چلنے کو کہا۔

رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اسکو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دلہن سمیت داخل ہو جائے گا۔ اور صبح منہ اندھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہنچا تو بالکل خاموشی تھی۔ دلہن نے شرمائے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ گئی ہے۔ چارپائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے۔ کھانسنے کھنکھارنے کی آوازیں ادھر ادھر ابھریں۔ دبی دبی سرگوشیاں اس تپی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا

اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی تو پاس ہی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی وہاں پر چارپائی پر چرچوں چرچوں ہونے لگی۔ یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی...... عیدو حلوائی کی کنواری بیٹی نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولو اپنی دلہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات سن لیں گے اور ساری چارپائیاں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھڑی سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی پھر سو گئی۔

بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیند نہیں آتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں...... آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا جس اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ نا آشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش

کی مگر آوازیں...... وہ تصویر کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا۔ الف ننگا۔ جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا اور باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل کے اندر بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جو کافی تیز تھی...... بھولو کی نگاہیں کونے کی طرف مڑیں کلن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ دھڑنگ لیٹا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر چلتی چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کر ناچنے لگے۔

بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگزشت پوچھی چھوجے درزی نے اس کو دور ہی سے آواز دی ”کیوں استاد بھولو کیسے رہے کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگا دیا تم نے“۔

چھاگے ٹین باز نے اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا ”دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے“۔

بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپا مارا ”کیوں پہلوان کیسا رہا دنگل؟“

بھولو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز بعد آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا

سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموشی رہی تھی لیکن جب وہ اوپر سوئے تو پھر وہی کھسر پھسر وہی چر چوں چر چوں وہی کھانسنا کھنکارنا...... وہی گھڑے کے ساتھ گلاس ٹکرانے کے چھناکے...... کروٹوں پر کروٹیں۔ دبی دبی ہنسی...... بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دلہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا "مجھے کیا ہو گیا ہے...... یہ مجھے کیا ہو گیا ہے...... یہ مجھے کیا ہو گیا ہے"۔

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا۔ آخر تنگ آ کر بھولو نے اپنی دلہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچیس دن گزر گئے تو گاما نے بھولو سے کہا "یار تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہو نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ تم اکیلے سوتے کیسے ہو؟"

بھولو نے صرف اتنا کہا "ٹھیک ہے"۔

گاما نے پوچھا "ٹھیک کیا ہے...... جو بات ہے بتاؤ کیا تمہیں پسند آئی ہے عائشہ؟"

"یہ بات نہیں"

"یہ بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟"

بھولو بات گول کر گیا مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی "تم جو کہتے ہو نا کہ

بھولو کو عائشہ پسند نہیں آئی غلط ہے''۔

گاما کی آواز آئی ''تو اور کیا بات ہے...... بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں''۔

''دلچسپی کیا ہو''۔

''کیوں؟''

گاما کی بیوی کا جواب بھولو نہ سن سکا مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا ''نہیں...... نہیں...... یہ تم سے کس نے کہا؟''

گاما کی بیوی بولی ''عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا...... بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی''۔

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا ''یہ تو بہت برا ہوا''۔

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ تھے اکھیڑنے شروع کر دیے۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلن نے بانس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بھولو چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔

اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

☆☆☆

نیا سال

کیلنڈر کا آخری پتا جس پر موٹے حروف میں 31 دسمبر چھپا ہوا تھا ایک لمحہ کے اندر اس کی پتلی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ اب کیلنڈر ایک ٹنڈ منڈ درخت سا نظر آنے لگا۔ جس کی ٹہنیوں پر سے سارے پتے خزاں کی پھونکوں نے اڑا دیے ہوں۔

دیوار پر آویزاں کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کیلنڈر کا آخری پتا جو ڈیڑھ مربع انچ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا اس کی پتلی انگلیوں میں یوں کانپ رہا تھا گویا سزائے موت کا قیدی پھانسی کے سامنے کھڑا ہے۔

کلاک نے بارہ بجائے پہلی ضرب پر انگلیاں متحرک ہوئیں اور آخری ضرب پر کاغذ کا وہ ٹکڑا ایک ننھی سی گولی بنا دیا گیا۔ انگلیوں نے یہ کام بڑی بے رحمی سے کیا اور جس شخص کی یہ انگلیاں تھیں اور بھی زیادہ بے رحمی سے اس گولی کو نگل گیا۔

اس کے لبوں پر ایک تیزابی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے خالی کیلنڈر کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور کہا ''میں تمہیں کھا گیا ہوں......بغیر چبائے نگل گیا ہوں''۔

اس کے بعد ایک ایسے قہقہے کا شور بلند ہوا جس میں ان توپوں کی گونج دب گئی جو نئے سال کے آغاز پر داغی جا رہی تھیں۔

جب تک ان توپوں کا شور جاری رہا اس کے سوکھے ہوئے حلق سے قہقہے آتشیں لاوے کی طرح نکلتے رہے وہ بے حد خوش تھا بے حد خوش یہی وجہ تھی کہ اس

پر دیوانگی کا عالم طاری تھا۔ اس کی مسرت آخری درجہ پر پہنچی ہوئی تھی وہ سارے کا سارا ہنس رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں رو رہی تھیں اور جب اس کی آنکھیں ہنستیں تو آپ اس کے سکڑے لبوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے کہ اس کی روح کسی نہایت ہی سخت عذاب میں سے گزر رہی ہے۔

بار بار وہ نعرہ بلند کرتا "میں تمہیں کھا گیا ہوں...... بغیر چبائے نگل گیا ہوں۔ ایک ایک کر کے تین سو چھیاسٹھ دنوں کو لپ دن سمیت"۔

خالی کیلنڈر اس کے اس عجیب و غریب دعوے کی تصدیق کر رہا تھا۔

آج سے ٹھیک چار برس پہلے جب وہ اپنے کاندھوں پر مصیبتوں کا پہاڑ اٹھا کر اپنی روٹی آپ کمانے کے لیے میدان میں نکلا تو کتنے آدمیوں نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا...... کتنے لوگ اس کی ہمت پر زیر لب ہنسے تھے۔ مگر اس نے ان باتوں کی کوئی پروا نہ کی تھی۔ اور اسے اب بھی کسی کی کیا پروا تھی اس کو صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔ اور اب بھی اسی چیز پر پابند تھا۔ وہ ان دنوں گدھوں کی سی مشقت کر رہا تھا۔ کتوں سے بڑھ کر ذلیل زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر یہ چیزیں اس کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھیں۔

کئی بار اسے ہاتھ پھیلانا پڑا...... اس نے ہاتھ پھیلایا لیکن ایک شان کے ساتھ...... وہ کہا کرتا تھا "یہ سب بھکاری جو سڑکوں پر جھولیاں پھیلائے اور کشکول بڑھائے پھرتے ہیں گولی مار کر اڑا دینے چاہئیں...... بھیک لے کر یہ ذلیل کتے شکر گزار نظر آتے ہیں۔ حالانکہ انہیں شکریہ گالیوں سے ادا کرنا چاہیے۔ جو بھیک

مانگتے ہیں وہ اتنے لعنتی نہیں جتنے کہ یہ لوگ جو دیتے ہیں۔ دان پن کے طور پر...... جنت میں ایک ٹھنڈی کوٹھڑی بک کرنے والے سوداگر!

اس کو کوئی مرتبہ روپے پیسے کی امداد حاصل کرنے کی خاطر شہر کے دھنوانوں کے پاس جانا پڑا...... اس نے ان دولتمندوں سے امداد حاصل کی...... ان کی کمزوریاں انہی کے پاس بیچ کر...... اور اس نے یہ سودا کبھی اناڑی دکاندار کی خاطر نہیں کیا۔

آپ شہر کی صحت کے محافظ مقرر کیے گئے ہیں لیکن درحقیقت آپ بیماریاں فراہم کرنے کے ٹھیکیدار ہیں۔ حکومت کی کتابوں میں آپ کے نام کے سامنے ہیلتھ آفیسر لکھا جاتا ہے۔ مگر میری کتاب میں آپ کا نام امراض فروشوں کی فہرستوں میں درج ہے...... پرسوں مارکیٹ میں آپ نے سنگتروں کے دوسو ٹوکرے پاس کر کے بھجوائے جو طبی اصول کے مطابق صحت عامہ کے لیے سخت مضر تھے۔ دس روز پہلے آپ نے قریباً دو ہزار کیلوں پر اپنی آنکھیں بند کرلیں جن میں سے ہر ایک ہیضہ کی پڑیا تھا اور آج آپ نے اس بوسیدہ اور غلیظ عمارت کو بچالیا جہاں بیماریاں پرورش پاتی ہیں اور......

اسے عام طور پر آگے کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی اس لیے کہ اس کا سودا بہت کم گفتگو ہی سے طے ہو جاتا تھا۔

وہ ایک سستے اور بازاری قسم کے اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ جس کی اشاعت دوسو سے زیادہ نہ تھی...... دراصل وہ اشاعت کا قائل ہی نہ تھا...... وہ کہا کرتا تھا ''جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں بے وقوف ہیں اور جو لوگ اخبار پڑھ کر اس میں لکھی باتوں پر

یقین کرتے ہیں۔ سب سے بڑے بے وقوف ہیں۔ جن لوگوں کی اپنی زندگی ہنگامے سے پر ہو ان کو ان چھپے ہوئے چیتھڑوں سے کیا مطلب؟''

وہ اخبار اس لیے نہیں نکالتا تھا کہ اسے مضامین لکھنے کا شوق تھا یا وہ اخبار کے ذریعے سے شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نہیں بالکل نہیں...... ایک دو گھنٹے کی مصروفیت کے سوا جو اس کے اخبار کی اشاعت کے لیے ضروری تھی وہ اپنا بقایا وقت ان خوابوں کی تعبیر دیکھنے میں گزارا کرتا تھا جو ایک زمانے سے اس کے ذہن میں موجود تھے۔ وہ اپنے لیے ایک ایسا مقام بنانا چاہتا تھا جہاں اسے کوئی چھیڑ نہ سکے...... جہاں وہ اطمینان حاصل کر سکے۔ خواہ وہ دو سیکنڈ ہی کا کیوں نہ ہو۔

''جنگ کے میدان میں فتح برلب گور ہی نصیب ہو۔ مگر ہو ضرور...... اور اگر شکست ہو جائے تو پٹنا پڑے تو بھی کیا ہرج ہے...... شکست کھائیں گے لیکن فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے...... موت ان کی ہے جو موت سے ڈر کر جان دیں اور جو زندہ رہنے کی کوشش میں موت سے لپٹ جائیں زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے کم از کم اپنے لیے''۔

دنیا اس کے خلاف تھی۔ جو شخص بھی اس سے ملتا تھا اس سے نفرت کرتا تھا۔ وہ خوش تھا۔ نفرت میں محبت سے زیادہ تیزی ہوتی ہے...... اگر سب لوگ مجھ سے محبت کرنا شروع کر دیں گے تو میں اس پہیے کی مانند ہو جاؤں جس میں اندر باہر اوپر نیچے سب جگہ تیل دیا گیا ہو...... میں کبھی اس گاڑی کو آگے نہ دھکیل سکوں گا جسے لوگ زندگی کہتے ہیں۔

قریب قریب سب اس کے خلاف تھے اور وہ اپنے ان مخالفین کی طرف یوں

دیکھا کرتا تھا گویا وہ موٹر کے انجن میں لگے ہوئے پرزوں کو دیکھ رہا ہے۔

"یہ کبھی ٹھنڈے نہیں ہونے چاہئیں"۔

اور اس نے اب تک ان کو ٹھنڈا نہ ہونے دیا تھا۔ وہ اس الاؤ کو جلائے رکھتا تھا۔ جس پر وہ ہاتھ تاپ کر اپنا کام کیا کرتا تھا۔ جس روز وہ اپنے مخالفین میں کسی نئے آدمی کا اضافہ کرتا تو اپنے دل سے کہا کرتا تھا "آج میں نے الاؤ میں ایک اور سوکھی لکڑی جھونک دی ہے جو دیر تک جلتی رہے گی"۔

اس کے ایک مخالف نے جلسے میں اس کے خلاف بہر زہر اگلا اس کو بہت برا بھلا کہا۔ حتیٰ کہ اسے ننگی گالیاں بھی دیں۔ اس کے مخالف کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ سن کر اسے نیند نہ آئے گی مگر اس کے برعکس وہ تو اس روز معمول کے خلاف بہت آرام سے سویا اور اسے خود ساری رات آنکھوں میں کاٹنا پڑی۔ شب بھر اس کا ضمیر اسے ستاتا رہا حتیٰ کہ صبح اٹھ کر وہ اس کے پاس آیا اور بڑے ندامت بھرے لہجہ میں اس سے معذرت طلب کی۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ جیسے بلند اخلاق انسان کو برا بھلا کہا۔ گالیاں دیں...... دراصل...... دراصل میں نے یہ سب کچھ جلد بازی میں کیا۔ سوچے سمجھے بغیر...... مجھے اکسایا گیا تھا۔ میں اپنے کیے پر نادم ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی"۔

بلند اخلاق...... اسے اس لفظ اخلاق سے بہت چڑ تھی...... اخلاق...... رخ انسانیت کا غازہ...... اخلاق...... اخلاق' اخلاق...... یعنی چہ؟ یہ نہ کر وہ نہ کرو کی بے معنی گردان...... انسان کی آزادانہ سرگرمیوں پر بٹھایا ہوا سنسر۔

اس کو معلوم تھا کہ اس کے کمزور دل مخالف نے جھوٹ بولا ہے۔ مگر نا معلوم اس کے دل میں کیوں غصہ پیدا نہ ہوا...... بخلاف اس کے اسے ایسا محسوس ہوا کہ جو شخص اس کے سامنے بیٹھا معافی مانگ رہا ہے اس کی کوئی نہایت ہی عزیز شے فنا ہوگئی ہے۔ وہ غایت درجہ بے رحم تصور کیا جاتا تھا اور اصل میں وہ تھا بھی بے رحم زم و نازک جذبات سے اس کا سینہ بالکل پاک تھا۔ مگر آج اس پتھر پر اسے کوئی چیز رینگتی ہوئی نظر آئی۔ اسے اس شخص پر رحم آنے لگا۔

"آج تم روحانی طور پر مر گئے ہو...... اور مجھے تمہاری اس موت پر افسوس ہے"۔

یہ سن کر اس کے مخالف کو پھر گالیاں دینا پڑیں مگر اس کے کانوں تک کوئی آواز نہ پہنچ سکی۔ مدت ہوئی وہ اس کو کسی دور دراز قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔

چار برس سے وہ اسی طرح جی رہا تھا زبردستی دنیا کی مرضی کے خلاف...... بہت سی قوتیں اس کو پسپا کر دینے پر تلی رہتی تھیں مگر وہ اپنے وجود کا ایک ذرہ بھی جنگ کے بغیر ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جنگ...... جنگ...... ہر مخالف قوت کے خلاف جنگ۔ رحم و ترحم سے نا آشنائی۔ عشق و محبت سے پرہیز۔ امید خوف اور استقبال سے بیگانگی...... اور پھر جو ہو سو ہو۔

چار برس سے وہ زمانے کی تیز و تند ہوا میں ایک تناور اور مضبوط درخت کی طرح کھڑا تھا۔ موسموں کے تغیر و تبدل نے ممکن ہے اس کے جسم پر اثر کیا ہو مگر اس کی روح پر ابھی تک کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکی تھی...... وہ ابھی تک ویسی ہی تھی...... جیسی کہ آج سے چار برس پہلے تھی فولاد کی طرح سخت یہ سختی قدرت کی طرف سے

عطا کی گئی تھی بلکہ خود اس نے پیدا کی تھی۔

وہ کہتا تھا "نرم و نازک روح کو اپنے سینے میں دبا کر تم زمانے کی پتھریلی زمین پر نہیں چل سکو گے۔ جو پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنا چاہے اسے پاگل خانے میں بند کر دینا چاہیے"۔

شاعرانہ خیالات کو اس نے اپنے دماغ میں کبھی داخل نہ ہونے دیا تھا اور اگر کبھی کبھار غیر ارادی طور پر وہ اس کے دماغ میں پیدا ہو جاتے تھے تو وہ ان "حرامی بچوں" کا فوراً گلا گھونٹ دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "میں ان بچوں کا باپ نہیں بننا چاہتا جو میرے کاندھوں کا بوجھ بن جائیں"۔

اس نے اپنے ساز حیات سے ساری طربیں اتار دی تھیں۔ اس نے اس میں سے وہ تمام تار نوچ کر باہر نکال دیے تھے جن میں سے نرم و نازک سر نکلتے ہیں۔

زندگی کا صرف ایک راز ہے اور وہ رجز ہے...... جو آگے بڑھنے حملہ کرنے مرنے اور مارنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام راگنیاں فضول ہیں جو اعضا پر تھکاوٹ طاری کرتی ہیں"۔

اس کا دل شباب کے باوجود عشق و محبت سے خالی تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ہزارہا خوبصورت لڑکیاں اور عورتیں گزر چکی تھیں مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس کے دل پر اثر نہ کیا تھا وہ کہا کرتا تھا "اس پتھر میں عشق کی جونک نہیں لگ سکتی"۔

وہ اکیلا تھا...... بالکل اکیلا...... کھجور کے درخت کی مانند جو کسی تپتے ہوئے ریگستان میں تنہا کھڑا ہو...... مگر وہ اس تنہائی سے کبھی نہ گھبرایا تھا۔ دراصل وہ کبھی تنہا

رہتا ہی نہ تھا۔

"جب کام میں مشغول ہوتا ہوں تو وہی میرا ساتھی ہوتا ہے اور جب میں اس سے فارغ ہو جاتا ہوں تو میرے دوسرے خیالات و افکار میرے گرد و پیش جمع ہو جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ اپنے دوستوں کے جھمگٹے میں رہتا ہوں"۔

وہ اپنے دن یوں بسر کرتا تھا جیسے آم کھا رہا ہے۔ شام کو جب وہ بستر پر دراز ہوتا تو تو ایسا محسوس کیا کرتا تھا کہ اس نے دن کو چوسی ہوئی گٹھلی کے مانند پھینک دیا ہے۔ اگر آپ اس کے کمرے کی ایک دیوار ہوتے تو کئی بار آپ کے ساتھ یہ الفاظ ٹکراتے جو کبھی کبھی سوتے وقت اس کی زبان سے نکلا کرتے تھے "آج کا دن کتنا کھٹا تھا اس برس کے ٹوکرے میں اگر بقایا دن بھی اس قسم کے ہوئے تو مزہ آ جائے گا"۔

اور راتیں...... خواہ تاریک ہوں یا منور اسکی نظر میں داشتائیں تھیں۔ جن کی وہ روز طلوع آفتاب کے ساتھ ہی بھول جاتا تھا۔

چار برس سے وہ اسی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں ہتھوڑا لیے۔ زمانے کا آہنی فیتہ اس کے سامنے سے گزر رہا ہے اور وہ اس فیتے پر ہتھوڑے کی ضربوں سے ٹھپہ لگائے جا رہا ہے۔ ایک دن جب گزرنے لگتا ہے تو وہ فیتے کو تھوڑی دیر کے لیے تھام لیتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر کہتا ہے "اب جاؤ میں تمہیں اچھی طرح استعمال کر چکا ہوں"۔

بعض لوگوں کو افسوس ہوا کرتا ہے کہ ہم نے فلاں کام فلاں وقت پر کیوں نہیں کیا اور یہ پچھتاوا وہ دیر تک محسوس کیا کرتے ہیں۔ مگر اسے آج تک اس قسم کا

افسوس یا رنج نہیں ہوا...... جو وقت سوچنے میں ضائع ہوتا ہے۔ وہ اس سے بغیر سوچے سمجھے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ خواہ انجام کار اسے نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ اگر سوچ کر چلنے ہی میں فائدہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نیکوکاروں کی زندگی تکلیفوں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی ہرگز نہ ہوتی جو ہر کام بڑے غور وفکر سے کیا کرتے تھے۔ اگر سوچ بچار کے بعد بھی نقصان ہو۔ یا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ غور وفکر میں پڑنے کے بغیر ہی نتائج کا سامنا کر لیا جائے۔

اسے ان چار برسوں میں ہزار ہا ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ صرف منہ ہی نہیں بلکہ ان کو سر سے پیر تک دیکھنا پڑا تھا۔ مگر وہ اپنے اصول پر اسی طرح قائم تھا جس طرح تند لہروں میں ٹھوس چٹان کھڑی رہتی ہے۔

آج رات بارہ بجے کے بعد نیا سال اس کے سامنے آ رہا تھا اور پرانے سال کو وہ ہضم کر گیا تھا بغیر ڈکار لیے۔

نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدمقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔ اسی طرح وہ نئے سال کے مقابلے میں اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا ”میں تم جیسے چار پہلوانوں کو پچھاڑ چکا ہوں۔ اب تمہیں بھی چاروں شانے چت گرا دوں گا“۔

جی بھر کر خوشیاں منانے کے بعد وہ نئے کیلنڈر کی طرف بڑھا جو میلی دیوار پر اوپر کی طرف سمٹ رہا تھا۔ تاریخ نما سے اس نے اوپر کا کاغذ ایک جھٹکے سے علیحدہ

کر دیا اور کہا۔ ''ذرا نقاب ہٹاؤ تو...... دیکھوں تمہاری شکل کیسی ہے...... میں ہوں تمہارا آقا...... تمہارا مالک...... تمہارا سب کچھ''۔ یکم جنوری کی تاریخ کا پتا عریاں ہو گیا۔ ایک قہقہہ بلند ہوا اور اس نے کہا۔

''کل رات تم فنا کر دیے جاؤ گے''۔

☆☆☆

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بڑا عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اسکی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی سکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی ''دیکھ لینا چودھری! تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی''۔

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا ''ولایت میں اور کہاں؟''

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے پر آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو

نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے متفکرانہ انداز میں کہا:
''یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو' چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی کہ جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی ''یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو بھی کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے''۔

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آ کر ہل مار کہ سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کا سنایا کرتا۔

"......" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا " آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن کے بیٹھ گئے۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں......"۔

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی......جیسے کوڑھ ہو رہا ہے...... بالکل مردار ایک دھپے کی مار اور پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے......" یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا:

"قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں تو رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آئے"۔

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

''سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا...... کیا ہر چیز بدل جائے گی؟''

''ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی''۔

''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا''؟

''یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے''۔

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھتی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا ''چل بیٹا! چل بیٹا...... ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا''۔

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان

پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا ''ہٹ تیری ایسی کی تیسی''۔

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب وغریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا...... بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے سٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور وفکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟'' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی...... ''غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل...... نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہو گا''۔

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا کہ گوروں...... سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون میں آتے ہی ہمیشہ کے لیے بلوں میں غائب ہو

جائیں گی۔

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ لا ہاتھ ادھر...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے...... تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں"۔

یہ کہہ کر منگو نے بڑے...... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دی دوران گفتگو اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے سر پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا"۔

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انہیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں روس والے بادشاہ اور پھر نئے قانون کے ساتھ غلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کا الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی

دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:

''جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں''۔

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی میں تھے اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے کملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے ہیں ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا ''ٹوڈی بچے!''۔

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ''ٹوڈی بچہ'' کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ''ٹوڈی بچے'' میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا:

''نئے آئین نے میری امید بڑھا دی ہے...... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو

کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی“۔

”ویسے بھی بہت سی جگہیں نکلیں گی۔شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ساتھ کبھی کچھ آجائے“۔

”ہاں......ہاں......کیوں نہیں“۔

وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی“۔

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی چیز سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔”نیا قانون......“ وہ دن میں کئی بار سوچتا۔”یعنی کوئی نئی چیز!“ اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا۔وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی ”نئے قانون“ کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔بدل نہ سکا۔وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی۔ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی

تھی۔پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی...... وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی...... آسمان کی طرح پرانی۔اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ رنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے دکانوں کے بورڈ اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ بازار میں چلتے پھرتے آدمی...... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

''ابھی بہت سویرا ہے دکانیں بھی تو سب بند ہیں''۔اس خیال سے اسے تسکین تھی۔اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا''ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟''

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے۔مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے

سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی...... وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا۔ مگر وہ انتظار کی بے قراری نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مطلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا۔

"تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی شکل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دائی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی ”ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو“۔

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ اس نے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن میں اسی ترازو سے تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا:

”چلو یہ بھی اچھا ہوا...... شاید چھاؤنی سے ہی کچھ نئے قانون کا پتہ چل جائے“۔

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا...... جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ کے خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسیات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابل غور بات کو آئین کی جدید روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اسکے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ

کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں ان کی جیب سے ہی وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں"۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھار ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود

کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا ''جانا مانگٹا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟''

''وہی ہے'' یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

''وہی ہے''۔ اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے۔ جس نے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیے ہوتے۔ مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں پر ہی گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا ''کہاں جانا مانگٹا ہے؟''

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا ''ہیرا منڈی''۔

''کرایہ پانچ روپے ہو گا'' استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا ''پانچ روپے..... کیا تم.....؟''

''ہاں..... ہاں..... پانچ روپے'' یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا ''کیوں جاتے ہو یا بیکار کی باتیں بناؤ گے؟''

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح اوپر اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے اور اس کی آنکھوں میں شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:

''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں...... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں...... اب ہمارا راج ہے بچہ!''

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی اور پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے...... اب نیا قانون ہے میاں نیا قانون!''

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ نیا قانون...... نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

''نیا قانون...... نیا قانون...... کیا بک رہے ہو...... قانون وہی ہے پرانا!''

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

وہ لڑکی

سوا بارہ بج چکے تھے لیکن دھوپ میں وہی تمازت تھی جو دوپہر کو بارہ بجے کے قریب تھی۔ اس نے بالکنی میں آ کر باہر دیکھا تو اسے ایک لڑکی نظر آئی جو بظاہر دھوپ سے بچنے کے لیے ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اتنا سانولا کہ وہ درخت کی چھاؤں کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ سریندر نے جب اس کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی قربت چاہتا ہے حالانکہ وہ اس موسم میں کسی کی قربت کی بھی خواہش نہ کر سکتا تھا۔

موسم بہت واہیات قسم کا تھا۔ گرمی تھی۔ سوا چار بج چکے تھے۔ سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن موسم نہایت ذلیل تھا۔ پسینہ تھا کہ چھوٹا جا رہا تھا۔ خدا معلوم کہاں سے مساموں کے ذریعے اتنا پانی نکل رہا تھا۔

سریندر کے کئی مرتبہ غور کیا تھا کہ پانی اس نے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹوں میں صرف ایک گلاس پیا ہو گا مگر پسینہ بلا مبالغہ چار گلاس نکلا ہو گا آخر یہ کہاں سے آیا؟''

جب اس نے اس لڑکی کو درخت کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے دیکھا تو اس نے سوچا کہ دنیا میں سب سے خوش یہی ہے۔ جسے دھوپ کی پروا ہے نہ موسم کی۔

سریندر پسینے میں لت پت تھا۔ اس کی بنیان اس کے جسم کے ساتھ بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ وہ کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بدن پر کسی نے موبل

آئل مل دیا ہے۔لیکن اس کے باوجود جب اس نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اس کے جسم میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کے پسینے کے ساتھ گھل مل جائے اس کے مساموں کے اندر داخل ہو جائے۔

آسمان خاکستری تھا۔کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ بادل ہیں یا محض گرد و غبار...... بہر حال اس گرد و غبار یا بادلوں کے باوجود دھوپ کی جھلک موجود تھی اور وہ لڑکی بڑے اطمینان سے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ستا رہی تھی۔

سریندر نے اب کی غور سے اس کی طرف دیکھا۔اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ مگر نقش بہت تیکھے تھے۔اس قدر تیکھے کہ وہ سریندر کی آنکھوں میں کئی مرتبہ چبھے۔ مزدور پیشہ لڑکی معلوم ہوتی تھی۔یہ بھی ممکن تھا کہ بھکارن ہو لیکن سریندر اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔اصل میں وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ آیا اسے اس لڑکی کو اشارہ کرنا چاہیے یا نہیں۔

گھر میں وہ بالکل اکیلا تھا۔اس کی بہن مری میں تھی۔ماں بھی اس کے ساتھ تھی باپ مر چکا تھا۔ایک بھائی تھا اس سے چھوٹا وہ بورڈنگ میں رہتا تھا۔سریندر کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے قریب تھی۔اس سے قبل وہ اپنی دو ادھیڑ عمر نوکرانیوں سے دو تین مرتبہ سلسلہ لڑا چکا تھا۔

معلوم نہیں کیوں لیکن موسم کی خرابی کے باوجود سریندر کے دل میں خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس جائے یا اسے اوپر ہی سے اشارہ کر دے تاکہ وہ اس کے پاس آ جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پسینے میں غوطے لگائیں اور کسی نامعلوم جزیرے میں پہنچ جائیں۔

سریندر نے بالکنی کے کٹہرے کے پاس کھڑے ہو کر زور سے کھنکارا مگر لڑکی متوجہ نہ ہوئی۔سریندر نے جب کئی مرتبہ ایسا کیا اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے آواز دی ”ارے بھئی...... ذرا ادھر دیکھو“۔

مگر لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔وہ اپنی پنڈلی کھجاتی رہی۔

سریندر کو بہت الجھن ہوئی۔اگر لڑکی کے بجائے کوئی کتا ہوتا تو وہ یقیناً اس کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتا۔اگر اسے اس کی یہ آواز ناپسند ہوتی تو بھونکتا مگر اس لڑکی نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔اگر سنی تھی تو ان سنی کر دی تھی۔

سریندر دل ہی دل میں بہت خفیف ہو رہا تھا۔اس نے ایک بار بلند آواز میں اس لڑکی کو پکارا ”اے لڑکی!“

لڑکی نے پھر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔جھنجھلا کر اس نے اپنا ململ کا کرتہ پہنا اور نیچے اترا۔جب اس لڑکی کے پاس پہنچا تو وہ اپنی ننگی پنڈلی کھجا رہی تھی۔

سریندر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور شلوار نیچی کر کے اپنی ننگی پنڈلی ڈھانپ لی۔

سریندر نے اس سے پوچھا ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

لڑکی نے جواب دیا ”بیٹھی ہوں“۔

”کیوں بیٹھی ہو؟“

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی ”لو اب کھڑی ہو گئی ہوں“۔

سریندر بوکھلا گیا ”اس سے کیا ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“

لڑکی کا چہرہ اور زیادہ سنولا گیا ''تم چاہتے کیا ہو؟''

سریندر نے تھوڑی دیر اپنے دل کو ٹٹولا ''میں کیا چاہتا ہوں...... میں کچھ نہیں چاہتا...... میں گھر میں اکیلا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو بڑی مہربانی ہو گی''۔

لڑکی کے گہرے سانولے چہرے پر عجیب و غریب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی

''مہربانی...... کاہے کی مہربانی...... چلو!''

اور دونوں چل دیے۔

جب اوپر پہنچے تو لڑکی صوفے کے بجائے فرش پر بیٹھ گئی اور اپنی پنڈلی کھجانے لگی۔ سریندر اس کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن اس میں وہ تمام قوسیں اور تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں ہوتے ہیں۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا مضبوط جسم اس سے باہر جھانک رہا تھا۔

سریندر نے اس سے کہا ''یہاں کیوں بیٹھی ہو...... ادھر صوفے پر بیٹھ جاؤ''۔

لڑکی نے جواب میں صرف اس قدر کہا ''نہیں''۔

سریندر اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا ''تمہاری مرضی...... لو اب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور درخت کے نیچے تم اتنی دیر سے کیوں بیٹھی تھیں؟''

''میں کون ہوں اور درخت کے نیچے کیوں بیٹھی تھی...... اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں''۔ لڑکی نے یہ کہہ کر اپنی شلوار کا پائنچہ نیچے کر دیا اور پنڈلی کھجانا بند کر دی۔

سریندر اس وقت اس لڑکی کی جوانی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اس کا اور ان دو ادھیڑ عمر نوکرانیوں کا مقابلہ کر رہا تھا جن سے دو تین مرتبہ سلسلہ ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی تھیں۔ جیسے برسوں کی استعمال کی ہوئی سائیکلیں لیکن اس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کسا ہوا تھا۔

سریندر نے ان ادھیڑ عمر نوکرانیوں سے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود اس کو کھینچ کر اپنی کوٹھڑیوں میں لے جاتی تھیں۔ مگر سریندر اب محسوس کرتا تھا کہ یہ سلسلہ اس کو اب خود کرنا پڑے گا حالانکہ وہ اس کی تکنیک سے قطعاً ناواقف تھا۔ بہر حال اس نے اپنے ایک بازو کو تیار کر لیا اور اسے لڑکی کی کمر میں حائل کر دیا۔

لڑکی نے ایک زور کا جھٹکا دیا ''یہ کیا کر رہے ہو تم؟''

سریندر ایک بار پھر بوکھلا گیا ''میں...... میں...... کچھ بھی نہیں''۔

لڑکی کے سانولے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی ''آرام سے بیٹھے رہو''۔

سریندر آرام سے بیٹھ گیا مگر اسکے سینے میں ہلچل اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے ہمت سے کام لے کر لڑکی کو پکڑ کر اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

لڑکی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن سریندر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ فرش پر چت گر پڑی۔ سریندر اس کے اوپر تھا۔ اس نے دھڑا دھڑ اس کے گہرے سانولے ہونٹ چومنے شروع کر دیے۔

لڑکی بے بس تھی۔ سریندر کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر پھینک نہیں سکتی تھی۔

بدرجہ مجبوری وہ اس کے بوجھل گیلے بوسے برداشت کرتی رہی۔

سریندر نے یہ سمجھا کہ وہ رام ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس نے مزید رازدستی شروع کی اس کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلانے بند کردیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مدافعت کو اب فضول سمجھا ہے۔

سریندر کو اب یقین ہوگیا کہ میدان اس کے ہاتھ رہے گا۔ چنانچہ اس نے درازدستی چھوڑ دی اور اس سے کہا ''چلو آؤ پلنگ پر لیٹتے ہیں''۔

لڑکی اٹھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ وہ دونوں پلنگ پر لیٹ گئے...... ساتھ ہی تپائی پر ایک طشتری میں چند مالٹے اور ایک تیز چھری پڑی تھی۔ لڑکی نے ایک مالٹا اٹھایا اور سریندر سے پوچھا ''میں کھالوں؟''

''ہاں ہاں...... ایک نہیں سب کھالو''۔

سریندر نے چھری اٹھائی اور مالٹا چھیلنے لگا مگر لڑکی نے اس سے یہ دونوں چیزیں لے لیں۔

''میں خود چھیلوں گی''۔

اس نے بڑی نفاست سے مالٹا چھیلا۔ اس کے چھلکے اتارے پھانکوں پر سے سفید سفید جھلی ہٹائی۔ پھر پھانکیں علیحدہ کیں۔ ایک پھانک سریندر کو دی دوسری اپنے منہ میں ڈالی اور مزہ لیتے ہوئے پوچھا ''تمہارے پاس پستول ہے؟''

سریندر نے جواب دیا ''ہاں...... تمہیں کیا کرنا ہے؟''

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر پھر وہی عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"میں نے ایسے ہی پوچھا تھا...... تم جانتے ہونا کہ آج کل ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں"۔

سریندر نے دوسرا مالٹا طشتری سے اٹھایا "آج سے ہو رہے ہیں...... بہت دنوں سے ہو رہے ہیں...... میں اپنے پستول سے چار مسلمان مار چکا ہوں...... بڑے خونی قسم کے"۔

"سچ؟" یہ کہہ کر لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی "مجھے ذرا وہ پستول تو دکھانا"۔

سریندر اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اپنے میز کا دراز کھولا اور پستول لے کر باہر آیا "یہ لو...... لیکن ٹھہرو"۔ اس نے پستول کا سیفٹی کیچ ٹھیک کر دیا۔ کیونکہ اس میں گولیاں بھری تھیں۔

لڑکی نے پستول پکڑا اور سریندر سے کہا "میں بھی آج ایک مسلمان کو ماروں گی یہ کہہ کر اس نے سیفٹی کیچ کو ایک طرف کیا اور سریندر پر پستول داغ دیا...... وہ فرش پر گر پڑا اور جان کنی کی حالت میں کراہنے لگا "یہ تم نے کیا کیا؟"

لڑکی کے گہرے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "وہ چار مسلمان جو تم نے مارے تھے ان میں میرا باپ بھی تھا"۔

☆☆☆

وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے

حوا کی ایک بیٹی کے چند خطوط جو اس نے فرصت کے وقت محلے کے چند لوگوں کو لکھے۔ مگر ان وجوہ کی بنا پر پوسٹ نہ کیے گئے جو ان خطوط میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

(نام اور مقام فرضی ہیں)

پہلا خط مسز کرپلانی کے نام

خاتون مکرم

آداب عرض۔ معاف فرمائیے گا۔ میں یہ سطور بغیر تعارف کے لکھ رہی ہوں۔ مگر مجھے چند ضروری باتیں آپ سے کہنا ہیں۔ آپ کو میں ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ہر روز صبح ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر جب میں بستر سے بالکنی میں آتی ہوں تو آپ کو بازار میں سیر سے واپس آتے دیکھا کرتی ہوں۔ مجھے تعجب ہے مسز کرپلانی جنہیں ساڑھے آٹھ بجے گھر سے دفتر پہنچنے کے لیے نکل جانا ہوتا ہے۔ صرف ایک بڈھی نوکرانی کی موجودگی اور آپ کی غیر حاضری میں ناشتہ کیسے کرتے ہیں۔ کپڑے کیوں کر تبدیل کرتے ہیں اور پھر آپ کا بچہ بھی تو ہے ان کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیر آپ کی صحت کے لیے مفید ہے۔ مگر اس سیر کا اثر آپ کے شوہر پر کیا پڑے گا۔ کیا آپ نے اس کی بابت کبھی غور کیا ہے......؟ میں نے پرسوں مسٹر کرپلانی کو دیکھا۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ آپ نے سر پر ہیٹ

الٹا لگا رکھا تھا۔ اور اگر میری نگاہوں نے دھوکا نہیں کھایا تو ان کے بوٹ کا ایک تسمہ کھلا ہوا تھا۔ جو بار بار ان کے پاؤں میں الجھ رہا تھا۔ کل بھی آپ کی حالت ایسی ہی تھی۔ ان کی پتلون شکنوں سے بھرپور تھی اور ٹائی کی گرہ بھی درست نہیں تھی۔

اگر آپ کی صبح کی سیر اسی طرح جاری رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ ایک روز مسٹر کرپلانی اس افراتفری میں دفتر کا رخ کریں گے کہ سر راہ چلتی عورتوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔

اور ہاں دیکھیے کل آپ نے جو ساڑھی پہن رکھی تھی وہ آپ کی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسز اڈوانی نے یہ ساڑھی پچھلی دیوالی پر خریدی تھی۔ دوسروں کے کپڑے پہننا بہت معیوب ہے۔ آپ کے پاس کم از کم بیس ساڑھیاں موجود ہیں۔ مسز اڈوانی کی ساڑھی مستعار لے کر آپ نے کیوں پہنی۔ یہ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکی۔

ایک بات اور وہ یہ کہ آپ کو بغیر آستینوں کا بلاؤز اچھا معلوم نہیں ہوتا آپ کے کاندھوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت ہے۔ جس کی نمائش آنکھوں پر بہت گراں گزرتی ہے۔ آپ کے جسم کا یہ عیب آستینوں والے بلاؤز میں چھپ جاتا ہے۔ اس لیے آپ کو ہمیشہ اسی تراش کا بلاؤز پہننا چاہیے......

اونچی ایڑھی کا شو آپ کیوں پہنتی ہیں؟...... آپ کا قد ماشاءاللہ کافی اونچا ہے۔ پرسوں آپ نے غیر معمولی اونچی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا۔ معاف فرمائیے معلوم ہوتا تھا آپ کے پیروں کے ساتھ سٹول بندھے ہوئے ہیں۔ اونچی ایڑھی کا جوتا پہن کر آپ آسانی سے چل بھی نہیں سکتیں۔ خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو تکلیف

دیتی ہیں۔

آپ کی ....

دوسرا خط مسز اڈوانی کے نام

محترم بہن

تسلیمات! میں نے پچھلے دنوں آپ کو باندرہ کے میلے پر چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ آپ نے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بارڈر کے بغیر بلاوز کالی ساٹن کا تھا۔ کھلے گلے کا آستینوں کے بغیر۔ گلے پر زرد رنگ کی ساٹن کا پائپنگ تھا اور سامنے سینے پر اسی رنگ کا پھول۔ پاؤں میں آپ کے سنہری سینڈل تھیں۔ چھاتا سیاہ رنگ کا تھا اور جس کی موٹھ زرد رنگ کے سلولائیڈ کی تھی۔ کالے بالوں میں پیلا ربن تھا۔ سیاہی اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ کے ذوق کی میں بے حد معترف ہوں۔ رنگوں کے صحیح التزام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر کل آپ جب بس پر سے اتریں تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی ساڑھی کے ساتھ بھوسلے رنگ کا بلاوز پہن رکھا ہے۔ آپ کے بالوں میں نیلا ربن گندھا ہے۔ اور جوتا سفید کینوس کا پہن رکھا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون نے کیونکر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلنا گوارا کیا اور پھر غضب یہ ہے کہ آپ بس میں کہیں دور گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکے لباس میں دیکھا تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا کہ میں بیان نہیں کرسکوں گی۔

ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کی نوکرانی اتنا بناؤ سنگھار کیوں

کرتی ہے؟ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ برس ہے۔ بظاہر وہ کنواری ہے۔ اس عمر میں اور خاص کر کنوارپنے میں اس کا یوں بن سنور کر سودا سلف لینے باہر بازار میں نکلنا اتنا خطرناک نہیں۔ جتنا کہ آپ کا آپ کے گھر میں اپنے بناؤ سنگھار پر توجہ دینا ہے۔ آپ عموماً گھر سے باہر رہتی ہیں اور مسٹر اڈوانی چونکہ دفتر نہیں جاتے۔ اس لیے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں...... آپ کی غفلت حد سے بڑھ گئی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

میرا خیال ہے کہ آپ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے چھوٹی ہے...... اگر آپ چشمہ پہنا کریں تو یہ عیب بالکل دور ہو جائے گا۔ کیونکہ شیشوں میں سے یہ معمولی فرق نظر نہ آئے گا۔

ہاں یہ آپ نے اپنی سہیلیوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لیے کیوں دے دیا کرتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بدعت معاشرتی نقطۂ نظر سے بہت بری ہے۔ اس کے علاوہ سہیلیاں خواہ کتنی محتاط ہوں۔ مستعار کپڑے کو نہایت بے دردی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو اپنی ساڑھی کو غور سے دیکھیے جو آپ نے ایک روز مسز کرپلانی کو پہننے کے لیے دی تھی۔ اس کا تلے کا کام کئی جگہ سے اکھڑ گیا ہے۔

بازار میں چلتے وقت آپ بار بار ساڑھی کا پلو نہ سنبھالا کریں۔ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

آپ کی......

تیسرا خط مسٹر ایوب خاں انسپکٹر پولیس کے نام

مکرمی محترمی ...... سلام مسنون

کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ دن میں دوبار اپنی ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیں ...... میں سمجھتی ہوں کہ نارمل آدمی کی ڈاڑھی کے بال نارمل حالت میں اتنی جلدی نہیں اگ سکتے۔

پولیس سٹیشن جاتے ہوئے اور وہاں سے شام کو آتے ہوئے آپ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ سیلون میں داخل ہو جائیں ...... میرا خیال ہے کہ آپ کو MANIA ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا دماغی توازن درست ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دن میں دوبار صبح و شام اپنی ڈاڑھی پر استرا پھرائیں ...... کیا سیلون کا نائی آپ کی اس عجیب و غریب عادت پر زیر لب کبھی نہیں مسکرایا؟

اور پھر آپ اپنے سر کے بال کس طور سے کٹواتے ہیں ......؟ واللہ بہت برے معلوم ہوتے ہیں۔ گردن سے لے کر کھوپڑی کے بالائی حصے تک آپ بالوں کا بالکل صفایا کرا دیتے ہیں ارو کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن بہت بھدی ہے اور آپ کے سر کے نچلے حصے پر پھوڑوں کے نشان ہیں جو صرف بال ہی چھپا سکتے ہیں۔ اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ بار بار بال مونڈنے سے آپ کی گردن موٹی ہو جائے گی۔

آپ کے کان بہت بڑے ہیں جس فیشن کی حجامت کا آپ کو شوق ہے۔ اس سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ قلمیں رکھیں

اور کانوں کے قریب سے بال زیادہ نہ کٹوائیں۔ گردن پر اگر آپ تھوڑے سے بال اگنے دیں تو کوئی حرج نہیں۔ اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ہاتھ میں چھڑی لے کر جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو دماغ میں اس خیال کو جگہ جگہ نہ دیا کریں کہ ہر سکول جانے والی لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے...... کسی شائستہ مذاق لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اٹھ سکتیں۔ اس لیے کہ آپ کے کاندھوں پر ایسا بھونڈا سر اٹھائے پھرتے ہیں۔ جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بدنما بنا رکھا ہے۔

بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گرد و غبار کے ذرے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آ بیٹھتے ہیں...... یا پھر آپ حد سے زیادہ نفاست پسند ہیں؟

کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ میرا مشورہ لیجیے اور دن میں دو بار سیلون میں جا کر ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیجیے۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کی مخلص......

چوتھا خط مس ڈی سلوا کے نام

ڈیئر مس ڈی سلوا

تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ تم روز بروز موٹی ہوتی جا رہی ہو۔ اگر تمہارا موٹاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی مرد کے قابل نہ

رہو گی۔ سکول جانے کے لیے جب تم ''جم'' پہن کر گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اس کرسمس پر تم ڈانس کیسے کر سکو گی۔ ایک دو قدموں میں ہی تمہارا پسینہ چھوٹ جائے گا اور تمہارا ساتھی کیوں کر تمہاری بانہوں کو حسب منشا حرکت میں لا سکے گا۔ تمہاری بغلوں کے نیچے اس قدر گوشت جمع ہو رہا ہے کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو۔ خدا کے لیے اپنا علاج کرو اور اس موٹاپے کو جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔

ایک نصیحت میری اور سن لو۔ شام کو تم ہر روز ٹیرس پر اکیلی جاتی ہو اور سامنے والے مکان پر ڈی کوسٹا کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی ہو۔ اول تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں دوسرے یہ اشارے چربی بھرے گوشت کے مانند بھدے اور بے لذت ہوتے ہیں تم جیسی موٹی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے۔ تمہارے اشارے اشارے نہیں ہوتے۔ ان کے لیے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہو گا۔

جس لونڈے کے ساتھ تم رومان لڑانا چاہتی ہو۔ اس کے متعلق بھی سن لو۔ وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مبتلا ہے۔ ماں باپ نے ناقابل اصلاح سمجھ کر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے پاس صرف تین پتلونیں ہیں۔ جن کو بدل بدل کر پہنتا ہے۔ ہر روز اپنی قمیص اور پتلون پر وہ دو بار استری کرتا ہے۔ تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اس کی وضع داری قائم رہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے سخت نفرت ہے۔

تم اپنی پنڈلیوں کے بال استرے سے نہ مونڈا کرو۔ بال اڑانے کے سب

پاؤڈر اور سب کریمیں بھی فضول ہیں۔ بال ہمیشہ کے لیے کبھی غائب نہیں ہو سکتے اس لیے کہ تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو۔ بال رہنے دو اور لمبی جرابیں پہنا کرو۔

تمہارا دوست آج دوپہر کو اپنا پھٹا ہوا جوتا خود مرمت کر رہا تھا۔

تمہاری خیر خواہ......

پانچواں خط کوشلیا دیوی کے نام

شریمتی کوشلیا دیوی نمسکار

اس میں کوئی شک نہیں اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ آرام دہ سے آرام دہ لباس پہنے اور تکلفات سے آزاد رہے۔ مگر دیوی جی آپ ململ کی باریک دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ اور پھر یہ دھوتی آپ کچھ اس بے تکلفی سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آ جائیں تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپ کی ململ کی دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ آپ کی عمر اس وقت چوالیس برس کے قریب ہے۔ عمر کی اس زیادتی نے آپ کے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں آپ کی بھدی ٹانگوں کی نمائش آنکھوں پر گویا نجنی بن کر رہ جاتی ہے۔

آپ کے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کھلا رہتا ہے اور میں نے اکثر آپ کو باورچی خانہ کے پاس یہی باریک دھوتی پہنے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اس کا استعمال ترک نہیں کرنا ہے تو براہ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ بند رکھا کریں۔

آپ کی.......

چھٹا خط مسٹر سعید حسن جرنلسٹ کے نام

جناب من.......تسلیم

آپ ہر روز صبح بالکونی میں پتلون پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کمیونزم کی بدترین مثال ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ ضرور شرمسار ہوں گے اور آئندہ سے پتلون شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کریں گے۔

مخلص

....

مکرر: آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ سیلون آپ کے گھر کے نیچے ہے۔ ہمت کرکے آج ہی کٹوا دیں۔

ساتواں خط مسز قاسمی کے نام

خاتون مکرم السلام علیکم

میں بہت عرصے سے آپ کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سنا ہے کہ دو گھروں میں نفاق پیدا کرنے کے لیے آپ کو بہت سے گر زبانی یاد ہیں۔ مسز اڈوانی اور مسز کرپلانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہوئی تھی۔ اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی لڑکی پشپا کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں۔ ان سے سیٹھ گوپال داس اور سیٹھ رام داس کے خاندانوں میں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے مگر میں سوچتی ہوں۔ ابھی تک آپ کے اور مسز قانونگو کے درمیان کشیدگی پیدا کیوں نہ ہوئی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو

اپنی سہیلی بنایا ہے اس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تو تو میں میں ضرور ہوئی ہے لیکن مسز قانونگو سے آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ جو کئی برسوں کے برابر ہیں۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ اس مہینے میں مسز قانونگو سے آپ کی چخ ضرور ہو جانی چاہیے۔ آپ کو اپنی روایات برقرار رکھنی چاہئیں۔

ہاں یہ ضرور بتائیے کہ آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ پنجاب کی رہنے والی ہیں۔ مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں ملتا جلتا ہے؟...... آپ کی ناک بالکل نیپالیوں جیسی چپٹی ہے اور گالوں کی ہڈیاں بھی انہی کی طرح ابھری ہوئی ہیں البتہ آپ کا قد ان کی طرح پست نہیں ہے۔

آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی۔ مجھے پسند نہیں آئی۔ آپ کا ذوق نہایت فضول ہے۔ اگر آپ بھڑ کیلے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے انتخاب کیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ لمبے قد کی عورتوں کو کھڑی لکیروں کی قمیص نہیں پہننی چاہیے۔ کیونکہ لمبے قد کی عورتوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ تو ویسے بھی دبلی پتلی ہیں۔ آپ کے کندھے پر بلاوز کے اٹھے ہوئے پف بہت برے معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کی خیر اندیش......

آٹھواں خط مس راجکماری ایکٹرس کے نام

مس راجکماری

مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم عورت نہیں ہو سوٹ کیس ہو۔

تم سے نفرت کرنے والی......

نواں خط مسٹر صالح بھائی کنٹریکٹر کے نام

جناب صالح بھائی صاحب ...... تسلیم

مجھے آپ کے خلاف کوئی شکایت نہیں لیکن پھر بھی میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔ نامعلوم کیا وجہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں غیض و غضب پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی شکل و صورت بھی کوئی خاص بری نہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ کو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہوں...... آپ کے چہرے پر یتیمی برتی ہے۔ آپ کی چال بھی نہایت واہیات ہے۔

آپ کی ہمدرد......

دسواں خط مس رضیہ صلاح الدین کے نام

ڈیئر مس رضیہ...... سلام مسنون

تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت اختیار کرو پھر اس لباس میں باہر نکلو۔ تمہیں یہ لباس پہننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو تماشہ نہ بناؤ۔

تمہاری خیر خواہ......

☆☆☆

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا...... وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت زیادہ خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے۔ اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی تو کچھ اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ ساتھ لایا تھا اور کچھ اس بیوڑا کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو اس کے کاندھوں تک ننگی تھیں پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے...... دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر

گیا تھا۔ جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کو منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا ایک پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوارگیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کی پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ میں کچے امرود کے ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت پر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹر وائس کا پورٹ ایبل گراموفون رکھا تھا۔ گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں

طرف کی دیوار کے کونے میں شوخ رنگ کے گنیش جی کی تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے ایک دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا تیل کی پیالی دھری تھی جو دیے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھول کی چھوٹی بڑی مروڑیاں کبھی کی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں کیونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے رکھنے کا یہ سلیقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا ''اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے...... یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے...... سالا ایک پیسہ بھی جیب سے نہیں نکالتا اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے...... سوگندھی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے...... سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں تم

چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں''۔

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا...... سوگندھی کو بتایا...... ''سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! اس پلنگ کے پائے کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر ...... تیری جان کی قسم مادھو آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں...... سمجھیں؟ بہت نازک وقت آ گیا ہے میری جان...... اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں''۔

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا ''نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو اس کی سختائی ٹھیک رہے گی''۔

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی ''جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں نوچ کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ...... ارے ہاں کل کی بات تجھے

سناؤں رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا...... جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھادی...... ارے وہ تو ڈرنے لگا...... سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا...... وہ ڈر گیا۔ میں نے کہا چلو دیر کیوں کرتے ہو تین بجنے والے ہیں۔ ابھی دن چڑھ آئے گا ...... بولا...... روشنی کرو...... روشنی کرو...... میں نے کہا یہ روشنی کیا ہوا...... بولا لائٹ ...... لائٹ......

اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی "بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی"۔ اور یہ کہہ کر میں نے اس کی پر گوشت ران پر چٹکی لی...... تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا تجھے شرم نہیں آتی ہے مردود ے!" وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھادی...... وہ پھر گھبرانے لگا...... تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی...... کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔ کا بھی اجالا کبھی اندھیرا...... ٹرام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا...... سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا...... جمنا تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے"۔

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے جو اس نے اپنی دو ایک سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی "اگر شریف آدمی ہو زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو ان گنت باتیں کرو اسے چھیڑو ستاؤ اس کے گدگدی کرو اس سے کھیلو...... اگر ڈاڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ...... اس کو اتنی

مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے...... وہ خوش خوش چلا جائے اور تم بھی بچی رہو گی...... ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن...... ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے''۔

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غائت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے۔ اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے جس پر ایک بچہ ہونے سے کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خرش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیے ہیں...... جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات...... کوئی کومل بول اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے وہ تھکن چاہتے تھے...... ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر...... انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے۔ کتنی مزیدار ہوتی ہے...... وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر ہو جاتی ہے۔ کتنا آنند دیتی ہے...... کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں

بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا نیچے ہوا دائیں ہوا بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزہ دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ ساری عمر اس صندوق میں چھپ کر گزر دے جس کے باہر ڈھونڈ نے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈ نے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی۔ آنکھ مچولی ہی تو تھی کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا......بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ وہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوان کے پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی ایسی ویسی کوئی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی۔ اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا "سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں"۔ اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے...... پریم...... کتنا سندر بول ہے وہ چاہتی تھی کہ اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے...... یا

پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود ہی میں سلا دے۔

پریم کرنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے تو اپنا پریم نباہ رہی تھی۔ جن کی تصویریں سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی .... ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا ''سوگندھی تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا''۔

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے اور جب مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال سوگندھی پر

دھاوے بولنے کے لیے آتا تو وہ دس پندرہ روپیہ خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے بتا ہی کیوں نہ دیں ...... سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے۔ جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ ...... اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ ...... چھی چھی چھی ...... دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلالی کے باقی رہے ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ...... مجھے عورت چاہیے پر تجھے کیا اس وقت اسی گھڑی مرد چاہیے۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے چتا ہوں ...... تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں ...... بس یہ دس روپے جن میں ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ...... تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ...... کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لیے ...... یہ دھندا چھوڑ ...... میں تجھے خرچ دیا کروں گا ...... کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے

اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں...... اور کہا تھا ......سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں نہیں رکھنے دوں گا......اور یہ پانی کا گھڑا...... دیکھا کتنا میلا ہے اور یہ...... یہ چیتھڑے...... یہ چندیاں...... اف کتنی بری باس آتی ہے اٹھا کر باہر پھینک ان کو......اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیا ناس کر رکھا ہے......اور......

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک اس نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں رکھا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظتیں محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندی سے یہ نہیں کہتا تھا کہ ”دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے...... ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں“۔ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو...... اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا ”دیکھ سوگندھی اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی...... اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا

سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا...... دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا سے منی آرڈر کر دوں گا...... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا......"

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے کہا تھا "تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟" اور نہ مادھو نے سوگندھی سے پوچھا تھا "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں......" دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے...... لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کا اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں پر ہی راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی اسکے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی...... رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی...... دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا

تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا ''رام لال؟''

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا ''تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کارک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کیا مر گئی تھی؟''...... پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا تھا ''اندر کوئی ہے تو نہیں؟''

جب سوگندھی نے کہا ''نہیں'' تو رام لعل کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ ''تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟...... بھئی حد ہو گئی۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا...... اب تو میری منہ کیا دیکھتی ہے جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن پاؤڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ...... باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں...... چل چل ایک دم جلدی کر''۔

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا ''رام لال آج میرا جی اچھا نہیں''۔

رام لال نے کنگھی دیوار پر رکھ دی اور مڑ کر کہا ''تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا''

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔

''وہ بات نہیں رام لال...... ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں...... بہت پی گئی''۔

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا ''تھوڑی بچی ہو تو لا...... ذرا ہم بھی منہ کا مزہ ٹھیک کر لیں''۔

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا ''بچائی ہوتی تو یہ موا سر درد ہی کیوں ہوتا...... دیکھو رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ''۔

رام لال نے جواب دیا ''نہیں بھئی! وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹل مین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل...... سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے پاس والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا ''بہن تو چنتا نہ کر میرا مردپونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی''۔ مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی سے کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس

نے دھوتی اتاری اور پھولوں والی ساڑھی پہنی اور سرخ گالوں پر سرخ پاؤڈر لگا کر تیار ہوگئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کہ کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی مین گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی...... سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال ایک طرف ہٹ کر کہا ''لیجیے وہ آ گئی...... بڑی اچھی چھوکری ہے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کیے''۔ پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا ''سوگندھی ادھر آ سیٹھ جی بلاتے ہیں''۔

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی میں لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں

چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ صاحب کے منہ سے اونہہ نکلا پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا......

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس اونہہ کا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی کیا؟...... کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی ''پسند نہیں کیا تجھے؟...... اچھا بھئی میں چلتا ہوں دو گھنٹے مفت میں ہی برباد کیے''۔

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں اس کی بانہوں میں اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر...... کہاں ہے وہ سیٹھ......تو اونہہ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا...... اس کی

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی تھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لال لال انگارہ اونہہ ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے ''او سیٹھ...... او سیٹھ...... ذرا موٹر روکنا اپنی...... بس ایک منٹ کے لیے''۔ پر وہ سیٹھ تھڑ ی ہے اس کی ذات سے بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں

پر پہنا کرتی تھی رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے۔ کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر اونہہ اونہہ کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پاؤڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کچھ نہ سوچا...... ''میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے...... میری کیا سب کی یہی عادت ہے...... پر...... پر...... یہ رات کے دو بجے رام لال دلال اور...... یہ بازار...... اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک''۔ یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حد نگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہونے لگا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا۔ مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس کے درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہو اس کی

ٹانگوں میں درد ہو۔ اس کے پیٹ میں درد ہو اس کی بانہوں میں درد ہو ...... ایسا درد کہ صرف وہ درد کا ہی خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا ...... کیا یہ درد تھا؟ ...... ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا ...... یہ کیا تھا؟ ...... لعنت! یہ تو وہی اونہہ تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا "سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا۔ اسے ...... اسے ...... صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی ...... نہیں آئی تو کیا ہوا؟ ...... مجھے تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی ...... وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی ...... کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ ...... کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ...... ٹھیک ہے پر سوگندھی ...... تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا ...... اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے ...... اونہہ ...... اس اونہہ کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ ...... یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل ...... اور ...... یہ منہ اور مسور کی دال ...... ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے ...... اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو ...... دس روپے اور یہ عورت ...... خچر کیا بری ہے ......"

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر چوٹی تک گرم

لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس کے خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں۔ اس کے کان' اس کی باہیں' اس کی ٹانگیں' اس کا سب کچھ مڑتا تھا' کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے...... اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو...... صرف ایک بار...... وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے اونہہ کی آواز آئے اور وہ...... سوگندھی...... اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور...... اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے...... بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے...... جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا کہ "تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟" آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے سوگندھی ان آنسوؤں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ...... یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟...... سوندھی نے چونک کر ادھر

ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا...... ارے یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑا یا ہے۔ وہ سمجھی تھی کہ موٹر کا انجن بولا ہے...... اس کا دل...... یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو...... آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے...... اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑ ادھڑ کیوں کرتا تھا...... بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ رک جاتا تھا ''رات کٹی گن گن تارے'' کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا ''کتنے سندر ہیں''...... وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے۔ پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا ''یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔ کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟''

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کر دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد ایک عورت کے لیے ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضاء متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ

خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔۔۔۔۔ بڑی ملنسار تھی بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرمس مین جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اس کے دس روپے واپس کر دیے تھے۔۔۔۔۔ ''مجھ میں کیا برائی؟'' سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ لوہے کے کھمبے فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک پر اکھڑی ہوئی بجری۔۔۔۔۔ ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔۔۔۔۔ کوئی۔۔۔۔۔ کوئی۔۔۔۔۔ اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے ''سوگندھی کون کہتا ہے تو بری ہے جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے'' نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا ''سوگندھی! تو بہت اچھی ہے''۔

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا

احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ماں بن رہا تھا......وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟......

اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے......اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ لوہے کے کھمبے فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا ہے جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے......لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی......وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آتا ہے......اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے ان کے رستے سے باہر نکل جائے۔پر یہ کیسے ہو......کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی......ہوا کے تیز جھونکے نے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے منہ میں لٹکتی رہتی ہے لڑکھڑاتی ہوئی سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر ایک بار پھر آئے اور......

اور......

"نہ آئے..... بلا سے..... میں جان کیوں بیکار ہلکان کروں..... گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے۔ چل سوگندھی گھر چل..... ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا..... فرسٹ کلاس نیند آئے گی سب ٹھیک ہو جائے گا..... سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی تیسی"۔

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا..... قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر باہر بازار میں منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ابھی ابھی اس کی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں..... اس سیٹھ نے..... پرماتما کرے..... سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزہ تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی..... اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا..... کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نہ تو؟..... لے

دام دے بنالے جا اسے ...... پر جو کچھ میں ہوں جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا"۔

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار ...... صرف ایک بار ...... اس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے ...... یوں اس سے انتقام لے نہیں یوں نہیں یوں ...... لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے پر خود کو راضی کر لیتی ...... بس صرف ایک چھوٹی سی گالی جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل میں اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ کے اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے پر جمائی لی ...... سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ...... صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز صبح اٹھ کر اس طرح گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے ...... وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟ ...... کیوں؟

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔

دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا۔ اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی ''میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی''۔

مادھو بڑا اسٹپٹایا ''انتظار؟...... تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آنے والا ہوں؟''

سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی ''میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا...... اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا سوجی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں اور......''

مادھو خوش ہو کر بولا اور میں آ گیا...... بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے دل کو دل سے راہ ہے...... تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟''

سوگندھی نے جواب دیا ''چار بجے کے قریب''۔

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا ''اور میں نے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا...... جیسے تو پھولوں والی ساڑھی...... ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے

میرے پاس کھڑی ہے۔تیرے ہاتھوں میں...... کیا تھا تیرے ہاتھوں میں...... ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا "مادھو تو چنتا کیوں کرتا ہے...... لے یہ تھیلی...... ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟"...... سوگندھی تیری جان کی قسم میں فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا...... کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے...... بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے اب بیس تیس روپے ہوں تو...... انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے...... تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے کو دبا دوں۔سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے...... ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا"۔

سوگندھی لیٹ گئی۔دونوں باہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اسی لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔مادھو سے کہنے لگی "مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟...... جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے...... بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے...... جان بچی لاکھوں پائے...... بس بس اب جانے دے...... تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا...... کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے...... واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو...... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ پچاس میں کام چل جائے گا"۔

"پچاس" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف والے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اتروانے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل کر گویا پکار رہی تھی "ہمارا فوٹو اترے گا ہمارا فوٹو اترے گا"۔

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی...... اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی "منشی پالٹی کے اس داروغہ کی...... دیکھو تو اس کا تھوبڑا...... کہتا تھا ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی...... اونہہ یہ منہ اور مسور کی دال"۔ یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ کے ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا "رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے

اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی''۔

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں پر گرنا شروع ہوئی۔ جیسے وہ ان پر چاقو چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا پھر ہنسا ''ہی ہی ہی''۔

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھ کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے اونہہ کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ کے ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر کہا کہ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھے''۔

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی ''تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا ......پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں کون سی ایسی چیز ہے جو کسی کو پسند آسکتی ہے...... یہ تیری پکوڑا ایسی ناک' یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا' یہ تیرے سوجھے ہوئے نتھنے یہ تیرے مڑے ہوئے کان یہ تیرے منہ کی باس یہ تیرے بدن کا میل؟...... تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا اونہہ...... پسند کیوں ہوتا تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے ......آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی برا''۔

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا ''دیکھ سوگندھی مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے...... اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں......''

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا ''اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے ہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا...... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟''

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا ''میں بتاتی ہوں...... پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا...... اور دس روپے بھاڑا ہے میرا...... اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات رہے نہ ساڑھے سات! ساڑھے سات روپوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا...... تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری...... پہلے میرے اور تیرے بیچ دس روپے بجتے تھے آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں...... یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس مار رکھا ہے؟''

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا ''سوگندھی''۔

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا ''یہ چیتھڑے' یہ چندیاں...... اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کے باہر پھینک ان

کو......‘‘

مادھو چلایا ’’سوگندھی‘‘۔

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا ’’سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گھبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں...... کتے کمینے مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟...... بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟...... میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟...... چور یا گرہ کترا؟...... اس وقت تو میرے مکان میں کیا کرنے آیا ہے؟...... بلاؤں پولیس کو؟...... پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو۔ یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں......‘‘

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں صرف اس قدر کہہ سکا ’’سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے؟‘‘

’’تیری ماں کا سر...... تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا...... بھاگ یہاں سے ورنہ......‘‘ سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں میں منہ رکھے سو رہا تھا۔

ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کے بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی ’’خبردار!...... پڑی رہنے دے وہیں...... تو جا تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی‘‘۔ یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی دم ہلاتا ہوا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی...... اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا...... ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے...... جیسے مسافروں سے لدی گاری اسٹیشنوں پر مسافر کو اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔

یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پر کرتی تھی ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

☆☆☆

یزید

سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح موسم میں خلاف معمول چند دن خراب آئیں اور چلے جائیں۔ یہ نہیں کہ کریم داد مولا کی مرضی سمجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے اس طوفان کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ مخالف قوتوں کے ساتھ وہ کئی بار بھڑا تھا۔ شکست دینے کے لیے نہیں صرف مقابلہ کرنے کے لیے۔ اس کو معلوم تھا کہ دشمنوں کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ مگر ہتھیار ڈال دینا وہ اپنی ہی نہیں ہر مرد کی توہین سمجھتا تھا۔ سچ پوچھیے تو اس کے متعلق یہ صرف دوسروں کا خیال تھا ان کا جنہوں نے اسے وحشی نما انسانوں سے بڑی جاں بازی سے لڑتے دیکھا تھا۔ ورنہ اگر کریم داد سے اس بارے میں پوچھا جاتا کہ مخالف قوتوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنا کیا وہ اپنی یا مرد کی توہین سمجھتا ہے۔ وہ یقیناً سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسے آپ نے اس سے حساب کا کوئی بہت ہی مشکل سوال کر دیا ہے۔

کریم داد جمع تفریق اور ضرب تقسیم سے بالکل بے نیاز تھا۔ سن سینتالیس کے ہنگامے آئے اور گزر گئے۔ لوگوں نے بیٹھ کر حساب لگانا شروع کیا کہ کتنا جانی نقصان ہوا ہے کتنا مالی مگر کریم داد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ رحیم داد اس جنگ میں کام آیا ہے۔ اس کی لاش خود کریم داد نے اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی اور ایک کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر دفنائی تھی۔

گاؤں میں اور بھی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ سینکڑوں جوان اور بوڑھے قتل

ہوئے تھے کئی لڑکیاں غائب ہوئی تھیں۔ کچھ کہ بہت ظالمانہ طریقے سے بے آبروئی ہوئی تھی۔ کس کے بھی یہ زخم آئے تھے روتا تھا۔ اپنے چھوٹے نصیبوں اور دشمنوں کی بے رحمی پر مگر کریم داد کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ اپنے باپ رحیم داد کی شہ زوری پر اسے ناز تھا جب وہ پچیس تیس برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح بلوائیوں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا اور کریم داد کو اس کی موت کی خبر ملی تو اس نے اس کی روح کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا تھا "یار تم نے یہ ٹھیک نہ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ہتھیار اپنے پاس ضرور رکھا کرو"۔

اور اس نے رحیم داد کی لاش اٹھا کر کنوئیں کے پاس گڑھا کھود کر دفنا دی تھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ کے طور پر صرف یہ چند الفاظ کہے تھے "گناہ ثواب کا حساب خدا جانتا ہے اچھا تجھے بہشت نصیب ہو"۔

رحیم داد جو نہ صرف اس کا باپ تھا بلکہ ایک بہت بڑا دوست بھی تھا بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ لوگ جب اس کی افسوس ناک کا ذکر کرتے تھے تو قاتلوں کو بڑی گالیاں دیتے تھے مگر کریم داد خاموش رہتا تھا۔ اس کی کئی کھڑی فصلیں تباہ ہوگئی تھیں۔ دو مکان جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ مگر اس نے اپنے ان نقصانوں کا کبھی حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ کبھی کبھی صرف اتنا کہا کرتا تھا "جو کچھ ہوا ہماری اپنی غلطی سے ہوا ہے"۔ اور جب کوئی اس سے اس غلطی کے متعلق استفسار کرتا تو وہ خاموش رہتا۔

گاؤں کے لوگ ابھی سوگ میں مصروف تھے کہ کریم داد نے شادی کر لی۔ اسی مٹیار جیناں سے ساتھ جس پر ایک عرصے سے اس کی نگاہ تھی۔ جیناں سوگوار تھی۔

اس کا شہتیر جیسا کڑیل جوان بھائی بلووں میں مارا گیا تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد ایک صرف وہی اس کا سہارا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیناں کو کریم داد سے بے پناہ محبت تھی مگر بھائی کی موت کے غم نے یہ محبت اس کے دل میں سیاہ پوش کر دی تھی اب ہر وقت اس کی سدا مسکراتی آنکھیں نمناک رہتی تھیں۔

کریم داد کو رونے دھونے سے بہت چڑ تھی ۔ وہ جیناں کو جب بھی سوگ زدہ حالت میں دیکھتا تو دل ہی دل میں بہت کڑھتا۔ مگر وہ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا نہیں تھا۔ یہ سوچ کر کہ عورت ذات ہے۔ ممکن ہے اس کے دل کو اور زیادہ دکھ پہنچے مگر اس روز اس سے رہا نہ گیا۔ کھیت مین اس نے جیناں کو پکڑ لیا اور کہا......

"مردوں کو کفنائے دفنائے پورا ایک سال ہو گیا ہے اب تو وہ بھی اس سوگ سے گھبرا گئے ہوں گے...... چھوڑ میری جان! ابھی زندگی میں جانے اور کتنی موتیں دیکھنی ہیں۔ کچھ آنسو تو اپنی آنکھوں میں جمع رہنے دے"۔

جیناں کو اس کی یہ باتیں بہت ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی اس لیے اکیلے میں اس نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر اس کی باتوں میں معنی پیدا کیے اور آخر خود کو یہ سمجھنے پر آمادہ کر لیا کہ کریم داد جو کچھ کہتا ہے ٹھیک ہے۔

شادی کا سوال آیا تو بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی مگر یہ مخالفت بہت ہی کمزور تھی۔ وہ لوگ سوگ منا منا کر اتنے نحیف ہو گئے تھے کہ ایسے معاملوں می سو فیصدی کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک نہ جمے رہ سکے...... چنانچہ کریم داد کا بیاہ ہو گیا۔ باجے گاجے آئے ہر رسم ادا ہوئی اور کریم داد اپنی محبوبہ جیناں کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔

فسادات کے بعد قریب قریب ایک برس سے سارا گاؤں قبرستان سا بنا تھا۔ جب کریم داد کی برات چلی اور خوب دھوم دھڑ کا ہوا تو گاؤں کے کئی آدمی سہم گئے ۔ان کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ کریم داد کی نہیں کسی بھوت پریت کی برات ہے۔ کریم داد کے دوستوں نے جب اس کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسا۔ ہنستے ہنستے ہی اس نے ایک روز اس کا ذکر اپنی نئی نویلی دلہن سے کیا تو وہ ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔

کریم داد نے جیناں کی سوہے چوڑے والی کلائی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا ''یہ بھوت تو اب ساری عمر تمہارے ساتھ چمٹا رہے گا...... رحمان سائیں کی جھاڑ پھونک بھی اتار نہیں سکے گی''۔

جیناں نے اپنی مہندی میں رچی ہوئی انگلی دانتوں تلے دبا کر اور ذرا شرما کر صرف اتنا کہا ''کیمے تجھ کو کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا''۔

کریم داد نے اپنی ہلکی ہلکی سیاہی مائل بھوری مونچھوں پر زبان کی نوک پھیری اور مسکرا دیا...... ''ڈر بھی کوئی لگنے کی چیز ہے''؟

جیناں کا غم اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ کریم داد کی جوانی کا نکھار دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور جیناں سے کہتا ''خدا کی قسم جیناں تو پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ اگر تو اتنی خوبصورت اپنے ہونے والے بچے کے لیے بنی ہے تو میری اس سے لڑائی ہو جائے گی''۔

یہ سن کر جیناں شرما کر اپنا تھلیا سا پیٹ چادر میں چھپا لیتی کریم داد ہنستا اور اسے چھیڑتا ''چھپاتی کیوں ہو اس چور کو...... میں کیا جانتا نہیں کہ یہ سب بناؤ سنگھار صرف تم نے اسی سور کے بچے کے لیے کیا ہے''۔

جیناں ایک دم سنجیدہ ہو جاتی ''کیوں گالی دیتے ہو اپنے کو؟''
کریم داد کی سیاہی مائل مونچھیں ہنسی سے تھرتھرانے لگتیں ''کریم داد بہت بڑا سور ہے''۔

چھوٹی عید آئی۔ بڑی عید آئی۔ کریم داد نے یہ دونوں تہوار بڑے ٹھاٹ سے منائے۔ بڑی عید سے بارہ روز پہلے اس کے گاؤں پر بلوائیوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا باپ رحیم داد اور جیناں کا بھائی فضل الٰہی قتل ہوئے تھے جیناں ان دونوں کی موت کو یاد کر کے بہت روئی تھی مگر کریم داد کی صدموں کو یاد رکھنے والی طبیعت کی موجودگی میں اتنا غم نہ کر سکی جتنا اسے اپنی طبیعت کے مطابق کرنا چاہیے تھا۔

جیناں کبھی سوچتی تھی تو اس کو بڑا تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی زندگی کا اتنا بڑا صدمہ کیسے بھولتی جا رہی ہے۔ ماں باپ کی موت تو اس کو قطعاً یاد نہیں تھی۔ فضل الٰہی اس سے چھ سال بڑا تھا۔ وہی اس کا باپ تھا وہی اس کی ماں اور وہی اس کا بھائی۔ جیناں اچھی طرح جانتی تھی کہ صرف اسی کی خاطر اس نے شادی نہیں کی اور یہ تو سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ جیناں ہی کی عصمت بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دی تھی۔ اس کی موت جیناں کی زندگی کا یقیناً بہت ہی بڑا حادثہ تھا۔ ایک قیامت تھی جو بڑی عید سے ٹھیک بارہ روز پہلے اس پر یکا یک ٹوٹ پڑی تھی۔ اب وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو اس کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس کے اثرات سے کتنی دور رہوتی جا رہی ہے۔

محرم قریب آیا تو جیناں نے کریم داد سے اپنی پہلی فرمائش کا اظہار کیا کہ اسے تعزیے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اپنی سہیلیوں سے وہ ان کے متعلق بہت کچھ سن

چکی تھی۔ چنانچہ اس نے کریم داد سے کہا "میں ٹھیک ہوئی تو لے چلو گے مجھے تعزیہ دکھانے؟"

کریم داد نے مسکرا کر جواب دیا "تم ٹھیک نہ بھی ہوئیں تو بھی لے چلوں گا...... اس سور کے بچے کو بھی"۔

جیاں کو یہ گالی بہت ہی بری لگتی تھی چنانچہ وہ اکثر بگڑ جاتی تھی۔ مگر کریم داد کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا پرخلوص تھا کہ جیناں کی تلخی فوراً ہی ایک ناقابل بیان مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی تھی اور وہ سوچتی تھی کہ سور کے بچے میں کتنا پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کی افواہیں ایک عرصے سے اڑ رہی تھیں۔ اصل میں تو پاکستان بنتے ہی یہ بات گویا ایک طور پر طے ہو گئی تھی کہ جنگ ہو گی۔ اور ضرور ہو گی۔ کب ہو گی اس کے متعلق گاؤں میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ کریم داد سے جب کوئی اس کے متعلق سوال کرتا تو وہ یہ مختصر سا جواب دیتا "جب ہونی ہو گی ہو جائے گی فضول سوچنے سے کیا فائدہ!"

جیناں جب اس ہونے والی لڑائی بھڑائی کے متعلق سنتی تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ وہ طبعاً بہت ہی امن پسند تھی۔ معمولی تو تو میں میں سے بھی سخت گھبراتی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ بلووں میں اس نے کئی کشت و خون دیکھے تھے اور انہیں میں اس کا پیارا بھائی فضل الٰہی کام آیا تھا۔ بے حد سہم کر وہ کریم داد سے اتنا کہتی "کیسے کیا ہو گا"؟

کریم داد مسکرا دیتا "مجھے کیا معلوم لڑکا ہو گا یا لڑکی؟"

یہ سن کر جیناں بہت ہی زچ ہوتی مگر فوراً ہی کریم داد کی دوسری باتوں می لگ کر ہونے والی جنگ کے متعلق سب کچھ بھول جاتی۔ کریم داد طاقتور تھا نڈر تھا جینان سے اسکو بے حد محبت تھی۔ بندوق خریدنے کے بعد وہ تھوڑے ہی عرصے میں نشانے کا بہت پکا ہو گیا تھا۔ یہ سب باتیں جیناں کو حوصلہ دلاتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود تنجنوں میں جب وہ اپنی کسی خوف زدہ ہجولی سے جنگ کے بارے میں گاؤں کے آدمیوں کی اڑائی ہوئی ہولناک افواہیں سنتی تو ایک دم سن سی ہو جاتی۔

بختو دائی جو ہر روز جیناں کو دیکھنے آتی تھی ایک دن یہ خبر لائی کہ ہندوستان والے دریا بند کرنے والے ہیں۔ جیناں اس کا مطلب نہ سمجھی۔ وضاحت کے لیے اس نے بختو دائی سے پوچھا ''دریا بند کرنے والے ہیں؟ یہ کون سے دریا بند کرنے والے ہیں؟''

بختو دائی نے جواب دیا ''وہ جو ہمارے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں''۔

جیناں نے کچھ دیر سوچا اور ہنس کر کہا ''موسی کیا تم بھی پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو دریا کون بند کر سکتا ہے وہ بھی کوئی موریاں ہیں''۔

بختو نے جیناں کے پیٹ پر ہولے ہولے مالش کرتے ہوئے کہا۔

''بی بی مجھے معلوم نہیں جو کچھ میں نے سنا تھا تمہیں بتا دیا یہ بات اب تو اخباروں میں بھی آ گئی ہے''۔

''کون سی بات؟'' جیناں کو یقین نہیں آتا تھا۔

بختو نے اپنے جھریوں والے ہاتھ سے جیناں کا پیٹ ٹٹولتے ہوئے کہا ''یہ

دریا بند کرنے والی'' پھر اس نے جیناں کے پیٹ پر اس کی قمیص کھینچی اور اٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز میں کہا'' اللہ خیر رکھے بچہ آج سے پورے دس روز کے بعد ہو جانا چاہیے''۔

کریم داد گھر آیا تو سب سے پہلے جیناں نے اس سے دریاؤں کے متعلق پوچھا اس نے پہلے بات ٹالنی چاہی پر جب جیناں نے کئی بار اپنا سوال دہرایا تو کریم داد نے کہا ہاں کچھ ایسا ہی سنا ہے''۔

جیناں نے پوچھا'' کیا؟''

'' یہی کہ ہندوستان والے ہمارے دریا بند کر دیں گے''۔

'' کیوں؟''

کریم داد نے جواب دیا کہ ہماری فصلیں تباہ ہو جائیں۔

یہ سن کر جیناں کو یقین ہو گیا کہ دریا بند کیے جا سکتے ہیں چنانچہ نہایت بے چارگی کے عالم میں اس نے صرف اتنا کہا'' کتنے ظالم ہیں یہ لوگ''۔

کریم داد اس دفعہ کچھ دیر کے بعد مسکرایا'' ہٹاؤ اس کو یہ بتاؤ موسی بختو آئی تھی''۔

جیناں نے بے دلی سے جواب دیا...... '' آئی تھی''۔

'' کیا کہتی تھی؟''

'' کہتی تھی آج سے پورے دس روز کے بعد بچہ ہو جائے گا''۔

کریم داد نے زور کا نعرہ لگایا'' زندہ باد''۔

جیناں نے اسے پسند نہ کیا اور بڑبڑائی'' تمہیں خوشی سوجھتی ہے جانے یہاں

کیسی بلا آنے والی ہے"۔

کریم داد چوپال چلا گیا۔ وہاں قریب قریب سب مرد جمع تھے چودھری نتھو کو گھیرے اس سے دریا بند کرنے والی خبر کے متعلق باتیں پوچھ رہے تھے۔ کوئی پنڈت نہرو کو پیٹ بھر کے گالیاں دے رہا تھا۔ کوئی بد دعائیں مانگ رہا تھا کوئی یہ ماننے ہی سے یکسر منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ بدلا جا سکتا ہے۔

کچھ ایسے بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے سب سے بہت طریقہ یہی ہے کہ مل کر مسجد میں دعا مانگی جائے۔

کریم داد ایک کونے میں بیٹھا خاموش سنتا رہا۔ ہندوستان والوں کو گالیاں دینے میں چودھری نتھو سب سے پیش پیش تھا۔ کریم داد کچھ اس طرح سے بار بار اپنی نشست بدل رہا تھا جیسے اسے بہت کوفت ہو رہی ہے۔ سب یک زبان ہو کر یہ کہہ رہے تھے کہ دریا بند کرنا بہت ہی اوچھا ہتھیار ہے۔ انتہائی کمینہ پن ہے۔ رزالت ہے۔ عظیم ترین ظلم ہے۔ بدترین گناہ ہے یزید پن ہے۔

کریم داد دو تین مرتبہ اس طرح کھانسا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ چودھری نتھو کے منہ سے جب ایک اور لہر موٹی موٹی گالیوں کی اٹھی تو کریم داد چیخ پڑا "گالی نہ دے چودھری کسی کو"۔

ماں کی ایک بہت بڑی گالی چودھری نتھو کے حلق مین پھنسی کی پھنسی رہ گئی اس نے پلٹ کر ایک عجیب انداز سے کریم کی طرف دیکھا جو سر پر اپنا صافہ ٹھیک کر رہا تھا "کیا کہا؟"

کریم داد نے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا ''میں نے کہا گالی نہ دے کسی کو''۔

حلق میں پھنسی ہوئی ماں کی گالی بڑے زور سے باہر نکال کر چودھری نتھو نے بڑے تیکھے لہجے میں کریم داد سے کہا ''کسی کو؟ کیا لگتے ہیں وہ تمہارے؟'' اس کے بعد وہ چوپال میں جمع شدہ آدمیوں سے مخاطب ہوا ''سنا تم لوگوں نے...... کہتا ہے گالی نہ دو کسی کو...... پوچھو اس سے وہ کیا لگتے ہیں اس کے؟''۔

کریم داد نے بڑے تحمل سے جواب دیا ''میرے کیا لگتے ہیں؟ میرے دشمن لگتے ہیں''۔

چودھری کے حلق سے پھٹا پھٹا سا قہقہہ بلند ہوا۔ اس قدر زور سے کہ اس کی مونچھوں کے بال بکھر گئے۔ ''سنا تم لوگوں نے دشمن لگتے ہیں...... اور دشمن کو پیار کرنا چاہیے کیوں برخوردار''۔

کریم داد نے بڑے برخوردارانہ انداز میں جواب دیا ''نہیں چودھری...... میں یہ نہیں کہتا کہ پیار کرنا چاہیے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گالی نہیں دینی چاہیے''۔

کریم داد کے ساتھ ہی اس کا لنگوٹیا دوست میراں بخش بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا ''کیوں؟''

کریم داد صرف میراں بخش سے مخاطب ہوا ''کیا فائدہ ہے یار...... وہ پانی بند کر کے تمہاری زمینوں کو بنجر بنانا چاہتے ہیں۔ اور تم انہیں گالی دے کر یہ سمجھتے ہو کہ حساب بے باق ہوا۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ گالی تو اس وقت دی جاتی ہے جب اور کوئی جواب پاس نہ ہو''۔

میراں بخش نے پوچھا ''تمہارے پاس کوئی جواب موجود ہے؟''

کریم داد نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ''سوال میرا نہیں ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کا ہے۔ اکیلا میرا جواب سب کا جواب نہیں ہو سکتا...... ایسے معاملوں میں سوچ سمجھ کر ہی کوئی پختہ جواب تیار کیا جا سکتا ہے...... وہ ایک دن میں دریاؤں کا رخ نہیں بدل سکتے۔ سال لگیں گے لیکن یہاں تو تم لوگ گالیاں دے کر ایک منٹ میں اپنی بھڑاس نکال باہر کر رہے ہو''۔ پھر اس نے میراں بخش کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا ''میں تو اتنا جانتا ہوں یار کہ ہندوستان کو کمینہ رذیل اور ظالم کہنا بھی غلط ہے''۔

میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو چلایا ''لو اور سنو''۔

کریم داد میراں بخش ہی سب سے مخاطب رہا ''دشمن سے میرے بھائی رحم و کرم کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ لڑائی شروع ہو اور یہ رونا رویا جائے کہ دشمن بڑے بور کی رائفلیں استعمال کر رہا ہے ہم چھوٹے بم گراتے ہیں وہ بڑے گراتا ہے۔ تم اپنے ایمان سے کہو یہ شکایت بھی کوئی شکایت ہے چھوٹا چاقو بھی مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بڑا چاقو بھی...... کیا میں جھوٹ کہتا ہوں''۔

میراں بخش کی بجائے چودھری نتھو نے سوچنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی جھنجھلا گیا۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ وہ پانی بند کر رہے ہیں...... ہمیں بھوکا پیاسا مارنا چاہتے ہیں''۔

کریم داد نے میراں بخش کے کاندھے سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور چودھری نتھو سے مخاطب ہوا ''چودھری جب کسی کو دشمن کہہ دیا تو پھر یہ گلہ کیسا کہ وہ ہمیں بھوکا

پیاسا مارنا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بھوکا پیاسا نہیں مارے گا۔ تمہاری ہری بھری زمینیں ویران اور بنجر نہیں بنائے گا تو کیا وہ تمہارے لیے پلاؤ کی دیگیں اور شربت کے مٹکے وہاں سے بھیجے گا تمہاری سیر تفریح کے لیے یہاں باغ بغیچے لگائے گا"۔

چودھری نتھو بھنا گیا۔ "یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟"

میراں بخش نے ہولے سے کریم داد سے پوچھا "ہاں یار یہ کیا بکواس ہے؟"

"بکواس نہیں ہے میراں بخشا" کریم داد نے سمجھانے کے انداز میں میراں بخش سے کہا "تو ذرا سوچ تو سہی کہ لڑائی میں دونوں فریق ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے پہلوان جب لنگر لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں اتر آئے تو اسے ہر داؤ استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے"۔

میراں بخش نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلایا "یہ تو ٹھیک ہے"۔

کریم داد مسکرایا "تو پھر دریا بند کرنا بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے یہ ظلم ہے مگر ان کے لیے روا ہے"۔

"روا کیا ہے...... جب تیری جیب پیاس کے مارے لٹک کر زمین تک آ جائے گی تو میں پھر پوچھوں گا کہ ظلم روا ہے یا نا روا...... جب تیرے بال بچے اناج کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے تو پھر بھی یہی کہنا کہ دریا بند کرنا بالکل ٹھیک تھا"۔

کریم داد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا "میں جب بھی یہی کہوں گا چودھری...... تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ صرف وہ ہمارا دشمن نہیں ہے کیا ہم اس کے دشمن نہیں۔ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم نے بھی اس کا دانہ پانی بند کیا ہوتا...... لیکن اب کہ وہ کر سکتا ہے اور کرنے والا ہے تو ہم ضرور اس کا کوئی توڑ

سوچیں گے...... بیکار گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے...... دشمن تمہارے لیے دودھ کی نہریں جاری نہیں کرے گا چودھری نتھو...... اس سے ہو سکا تو وہ تمہارے پانی کی ہر بوند میں زہر ملا دے گا تم اسے ظلم کہو گے وحشیانہ پن کہو گے اس لیے کہ مارنے کا یہ طریقہ تمہیں پسند نہیں...... عجیب سی بات ہے کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے دشمن سے نکاح کی سی شرطیں پڑھوائی جائیں...... اس سے کہا جائے کہ دیکھو مجھے بھوکا پیاسا نہ مارنا بندوق سے اور وہ بھی اتنے بور کی بندوق سے البتہ تم مجھے شوق سے ہلاک کر سکتے ہو۔ اصل بکواس تو یہ ہے...... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو"۔

چودھری نتھو جھنجھلاہٹ کی آخری حد تک پہنچ گیا "برف لا کے رکھ میرے دل پر"۔

"یہ بھی میں ہی لاؤں" یہ کہہ کر کریم داد ہنسا۔ میاں بخش کے کاندھے پر تھپکی دے کر اٹھا اور چوپال سے چلا گیا۔

گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر سے بختو دائی نکلی۔ کریم داد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پوپلی مسکراہٹ پیدا ہوئی......

مبارک ہو کیسے چاند سا بیٹا ہوا ہے اب کوئی اچھا سا نام سوچ اس کا"۔

"نام؟" کریم داد نے ایک لحظے کے لیے سوچا "یزید...... یزید!"

بختو دائی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کریم داد نعرے لگاتا گھر میں داخل ہوا۔ جیناں چارپائی پر لیٹی تھی۔ پہلے سے کسی قدر زرد اس کے پہلو میں ایک گل گوتھنا سا بچہ چپڑ چپڑ اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور اس کے گال کو ایک انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا "اوئے

میرے یزید!‘‘

جیناں کے منہ سے ہلکی سی متعجب چیخ نکلی ’’یزید؟‘‘

کریم داد نے غور سے اپنے بیٹے کا ناک نقشہ دیکھتے ہوئے کہا ’’ہاں یزید…… یہ اس کا نام ہے‘‘۔

جیناں کی آواز بہت نحیف ہوگئی ’’یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیمے…… یزید؟‘‘

کریم داد مسکرایا ’’کیا ہے اس میں؟ نام ہی تو ہے؟‘‘

جیناں صرف اس قدر کہہ سکی ’’مگر کس کا نام؟‘‘

کریم داد نے سنجیدگی سے جواب دیا ’’ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو…… اس نے دریا کا پانی بند کیا تھا…… یہ کھولے گا!‘‘

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۱ء

☆☆☆